WWW.PAKSOCIETY.COM
آندھی
طاہر جاوید مغل
1
Scanned By Waqar Azeem

پیش لفظ

میری پہلی کتاب "پرستش" کی آپ نے جس طرح پذیرائی کی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ "پرستش" کے بعد "آندھی" کے عنوان سے یہ دوسری کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک طویل ناول ہے۔ ہمارے اور آپ کے آس پاس کی کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پنجاب کے دیہی ماحول میں پروان چڑھتی ہوئی یہ داستان آپ کو اپنے سحر میں گرفتار رکھے گی۔ آپ خود کو مرکزی کردار ثناء محمود کا ہمسفر پائیں گے۔ آپ اُس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں سے گزریں گے' پگڈنڈیوں پر دوڑیں گے اور پُراسرار حویلیوں میں اُتریں گے......... آپ کو اِس کہانی میں حیوان صفت جاگیردار بھی نظر آئیں گے۔ دُہرے چہروں والے سیاستدان بھی ملیں گے' عیار صنعت کار بھی اور وہ لوگ بھی جو کچھ نہیں ہوتے صرف انسان ہوتے ہیں۔

یہ اُس لڑکی کی کہانی ہے جو پُرسکون زندگی گذار رہی تھی مگر آناً فاناً آندھیوں کی زد میں آ گئی۔ واقعات اور حادثات کے تند بگولے اُسے تنکے کی طرح اڑاتے چلے گئے.......... وہ اُڑتی رہی' بھٹکتی رہی' یہاں تک کہ خود بھی آندھی بن گئی......... اور کیوں نہ بنتی......... وہ ایک بچے کی ماں تھی اور اُس کے دل پر پاتال سے گہرا زخم تھا۔

ماں اور بچے کا اٹوٹ رشتہ اِس کہانی کا محور ہے.......... عورت کتنی بھی کمزور ہو لیکن ماں کبھی کمزور نہیں ہوتی اور جب سوال اُس کے بچے کا ہو تو وہ فولاد سے سخت اور ہمالیہ سے زیادہ ثابت قدم ہو جاتی ہے۔ وہ وقت کے بڑے سے بڑے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے اور کہتی ہے "مجھے معمولی مت سمجھو' میں غیرمعمولی ہوں' میں ماں ہوں۔"

یہ کہانی لکھتے ہوئے کئی بار میری آنکھیں بھیگی ہیں۔ میں نے اُس درد کو دل کی انتہائی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے جو ثناء محمود کے حصے میں آیا تھا۔ اُس بے کراں درد کو اپنے سینے میں سمیٹ کر وہ نازک اندام لڑکی' انسانوں کے جنگل میں برہنہ پا بھٹکتی رہی اور مجھے بھی بھٹکاتی رہی۔ وہ کہاں کہاں نہیں گئی؟ اُس نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے۔ وہ

ضرورت کے تحت مسکرائی بھی، ہنسی بھی، زندہ لوگوں سے مل کر "زندوں" کی طرح نظر بھی آئی بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اُسے اپنے محبوب سلیم کے زخموں پر مرہم رکھنا پڑا.......... لیکن پھر بھی اُس کے روز و شب پر وہی ایک دلخراش لمحہ محیط رہا جس کا تعلق اُس کے معصوم فرحان سے تھا.......... ہاں یہ اُس لمحے کی کہانی بھی ہے جب انسان ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور اُس کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہوتا ہے۔

قارئین کرام! یہ کہانی فیملی میگزین میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے۔ کتابی شکل میں اِس کی اشاعت کی اجازت دینے پر میں فیملی میگزین کے محترم مدیر اعلیٰ جناب مجید نظامی اور مدیر جناب علی سفیان آفاقی کا شکر گزار ہوں۔

اِس کہانی کے آغاز سے لے کر کتابی شکل میں آنے تک آفاقی صاحب کے قیمتی مشورے میرے شاملِ حال رہے ہیں۔

بھائی غفار صاحب نے اِس کہانی کو کتابی شکل دینے اور سجانے سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ایک اچھی کہانی ایک اچھی کتاب میں محفوظ ہو کر قاری کے لئے مستقل ساتھی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اِس اُمید کے ساتھ یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے کہ یہ آپ کے "مستقل ساتھی" کی حیثیت اختیار کرے گی اور آپ اِسے شیلف میں جگہ دے کر خوشی محسوس کریں گے۔

طاہر جاوید مغل

سلیم سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں مقامی گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ کالج کی عمارت کے سلسلے میں انتظامیہ سے ہمارے کچھ مطالبات تھے جن کے لئے ہم نے کلاسوں کا بائیکاٹ کرتے ہوئے گیٹ پر ایک چھوٹا سا احتجاجی مظاہرہ کیا۔ مظاہرے کے سلسلے میں ہم نے سڑک بلاک کر رکھی تھی۔ دفعتاً اینٹیں ڈھونے والا ایک ٹرک آیا اور ہم سے راستہ مانگنے لگا۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ متبادل راستہ اختیار کرے لیکن وہ بھی کوئی خردماغ شخص تھا۔ اڑ گیا کہ گزرے گا تو یہیں سے گزرے گا۔ میں نے اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ ایک قطار بنائی اور ہم ٹرک کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ صورت حال ایک دم ہی ڈرامائی ہوگئی تھی۔ ٹرک والا ہارن کے ساتھ مسلسل انجن کو ریس دے رہا تھا اور ہم چھ سات لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ڈرائیور ٹرک کو کھسکاتا عین ہمارے اوپر لے آیا۔ ایک دو لڑکیوں نے ذرا کمزوری دکھائی اور پیچھے کو سرکیں۔ ٹرک والے کو حوصلہ ہوا اور وہ ٹرک ایک دم بڑھا کر ہمارے اوپر لے آیا۔ لڑکیاں چیختی ہوئی دائیں بائیں بھاگیں اور وہ ہمارے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ لڑکیاں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگیں کچھ ٹرک ڈرائیور کو صلواتیں سنانے لگیں۔ اپنے طور پر ہمیں سخت پشیمانی بھی ہو رہی تھی کہ سڑک کے اطراف کھڑے کافی لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ٹرک والا فاتحانہ انداز میں چند ہی گز آگے گیا ہوگا کہ ایک نوجوان لڑکا سڑک کے کنارے سے کود کر اس کے سامنے آگیا۔ ٹرک والے کو مجبوراً بریک لگانا پڑے۔ وہ ایک بیس بائیس سالہ دبلا پتلا لیکن غیر معمولی چوڑے کندھوں والا لڑکا تھا۔

اس کے لمبے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ وہ اچک کر کیبن کے پائیدان پر چڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ زندگی کے ایک موڑ پر یہ لڑکا میرے لئے ان گنت ہنگاموں کا سبب بننے والا ہے۔ ڈرائیور اور لڑکے میں تلخ کلامی ہوئی پھر میں نے دیکھا کہ اچانک لڑکے نے ڈرائیور کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے ڈرائیونگ سیٹ سے سڑک پر لے آیا۔ اس سے پہلے کہ فربہ اندام ڈرائیور اپنے دفاع میں کچھ کرتا دو زوردار گھونسے اس کے منہ پر پڑے اور وہ حواس باختہ ہوگیا۔ لوگ جو ابھی تک خاموش تماشائیوں کی طرح کھڑے تھے ڈرائیور کو پٹتے دیکھ کر لڑکے کے حمائتی بن گئے۔ ٹرک کے وہ مزدور جو ڈرائیور کی اعانت کے لئے آگے بڑھے تھے مخالفین کا جمگھٹا دیکھ کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ سب لوگوں نے حسب توفیق ٹرک ڈرائیور کو برا بھلا کہا کہ وہ اپنی "پھنے خانی" میں لڑکیوں کی جان سے کھیلنے لگا تھا۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں نے معذرت کی اور بمشکل جان بچا کر وہاں سے نکل سکے۔

ٹرک روکنے والا لڑکا سلیم تھا۔ یہ واقعہ اسی محلے کا ہے جہاں میں رہتی تھی۔ ہمارا کالج گھر سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک ملی جلی آبادی ہے۔ موہنی روڈ کی ایک ذیلی سڑک اس آبادی کو دو واضح حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جنوبی حصہ زیادہ گنجان آباد ہے اور یہاں نسبتاً کم آمدنی والے لوگ رہتے ہیں۔ شمالی حصہ متوسط لوگوں کا ہے۔ یہاں کوٹھی نما مکانوں کی کثرت ہے۔ دو تین کوٹھیاں گلبرگ اور شاہ جمال کے پائے کی ہیں اور اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق' کچھ زیادہ ہی عالی شان نظر آتی ہیں۔ ہماری کوٹھی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ہمارے والد مرحوم نے یہ کوٹھی بڑے اہتمام اور شوق سے بنوائی تھی۔

میں سلیم کا ذکر کر رہی تھی۔ سلیم کے متعلق میں نے پہلے بھی ایک دو دفعہ سنا تھا۔ آبادی کے جنوبی حصے میں لوکل روٹ پر چلنے والی ویگنوں کا ایک اڈا تھا۔ سلیم کے والد کی چند ویگنیں تھیں اور ان کی رہائش بھی اسی علاقے میں تھی۔ محلے میں کہا جاتا تھا کہ رفیق لوہار کا لڑکا سلیم بڑا تیز نکلا ہے۔ بہت ہتھ چھٹ اور لڑاکا ہے۔ ہماری نوکرانی نوری اکثر اس کی مار دھاڑ کی خبریں سناتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ سودا لینے بازار گئی۔

دکانوں پر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں پہنچانے والا ایک ٹرک مسجد والے چوک میں کھڑا تھا۔ جولاہوں کے دو لڑکے بوتلیں اٹھا کر بھاگ نکلے۔ سلیم نے انہیں پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا ٹرک والوں کے پاس لے آیا۔ بوتلیں برآمد کروادیں اور لڑکوں کو پکڑ کر بٹھالیا۔ اتنے میں ٹرک والوں میں سے ایک کی زبان سے نکل گیا کہ یہ محلہ ہی چوروں کا ہے۔ بس اس بات پر سلیم سیخ پا ہوگیا۔ اس نے نہ صرف لڑکوں کو چھوڑ دیا بلکہ ٹرک والوں کی خوب دھنائی کی اور طیش میں ان کی دس بیس بوتلیں بھی توڑ ڈالیں........... ایک روز نوکرانی نے بتایا کہ آج ویگنوں کے اڈے پر ایک لڑکی کو چھیڑ خانی کرنے پر جھگڑا ہوگیا۔ سلیم نے دو آدمیوں کو بری طرح مارا۔ وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولی۔

"توبہ باجی! وہ کوئی لڑکا ہے۔ مجھے تو طوفان لگتا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے' دونوں یہ اتنے بڑے بڑے ڈشکرے تھے۔ پہلے تو میں سمجھی آج سلیم کی خیر نہیں لیکن جب ان میں سے ایک نے سلیم کو مکا مارا تو اس نے اپنی بکل اتار کر ایک طرف پھینکی اور دونوں کے گریبان پکڑ لئے۔ پھر بڑی تسلی سے انہیں ایک طرف لے گیا اور دھاں دھاں ٹکریں مارنے لگا۔ قسم خدا کی دونوں بچوں کی طرح رونے لگے۔ لوگوں نے مشکل سے جان چھڑائی ان کی۔"

ایسی باتیں نوری عموماً سناتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کالج کے سامنے سلیم کو ڈرائیور سے الجھتے دیکھا تو مجھے لگا جیسے میں اسے پہلے سے جانتی ہوں۔ اس کی دلیری نے دل پر عجیب سا اثر کیا۔

میرا خیال ہے میں کچھ بھی آگے کہنے سے پہلے آپ کو اپنے بارے میں بتادوں۔ میں نے امتیازی حیثیت سے گریجویشن کی ہے۔ نفسیات اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کالج کے ابتدائی زمانے میں بھی میرا شعور عام لڑکیوں کی نسبت پختہ تھا۔ اچھے برے کی تمیز تھی اور سب سے اہم یہ کہ اپنے بزرگوں کی عزت کا پاس تھا۔ مگر جو کچھ ہوا وہ اتنا بتدریج اور غیر محسوس تھا کہ ناقابل مزاحمت بن کر رہ گیا۔ میں سیدھے سیدھے لفظوں میں آپ سے بات کروں گی کیونکہ منافقت مجھے ہمیشہ ناپسند رہی ہے۔ کالج کے سامنے پیش آنے والے واقع کے بعد میں سلیم میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔ وہ منظر بار بار میرے تصور میں آجاتا جب وہ ہماری توہین پر غصے سے بے قابو ہو کر

ٹرک پر چڑھا تھا اور ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں پھر سلیم کو دیکھوں۔ آخر چوتھے پانچویں روز میں اس کوشش میں کامیاب رہی۔ میں چھت پر کھڑی تھی کہ وہ چند لڑکوں کے ساتھ سڑک سے گزرا۔ لمبا نکلتا ہوا قد' کھلے ہاتھ پاؤں اور چال میں عجیب بانکپن ۔ وہ ساتھی لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہمارے دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔

اس روز مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے دل میں کوئی چور دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا ہے۔ مجھے اپنے رویئے پر از حد پشیمانی ہوئی۔ میں کیوں ایک ناپختہ ذہن لڑکی کی طرح چھپ چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ میں جانتی بھی تھی کہ ایسے مشغلے اکثر اوقات سنگین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اب کبھی اس طرح کا خیال دل میں نہ لاؤں گی۔ اس کے بعد میں کبھی سلیم کو دیکھنے چھت پر نہیں گئی۔ مگر اس کے باوجود اس سے اکثر آمنا سامنا ہوتا رہا۔ ہمارے کالج کے راستے میں ایک نیا وڈیو سنٹر کھلا تھا۔ وہ اکثر وہاں کھڑا ملتا تھا۔ میرے بڑے بھائی جو اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔ ہاسپٹل جاتے ہوئے مجھے گاڑی پر کالج چھوڑ جاتے تھے۔ واپسی پر میں کلاس فیلوز کے ساتھ پیدل آجاتی تھی۔ عموماً میں کن انکھیوں سے سلیم کو دیکھتی۔ وہ حسب عادت ساتھی لڑکوں سے دھول دھپے میں مصروف ہوتا تھا۔ اس کے اندر جیسے ہر دم کوئی پارہ مچلتا رہتا تھا مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے کبھی اسے سکون سے کھڑے پایا ہو۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سلیم کو میرے ذہن پر بری طرح سوار کر دیا۔ جہاں سے ہماری آبادی کا گنجان آباد حصہ شروع ہوتا تھا وہاں ایک میدان تھا۔ عموماً لڑکے بالے یہاں کرکٹ کھیلتے نظر آتے تھے۔ ایک روز میں چھت پر گئی تو وہاں ٹینٹ لگا دیکھا۔ ٹینٹ کے گرد ایک دائرے کی شکل میں تماشائی کھڑے تھے۔ ایمپلی فائر پر انڈین اور پاکستانی گانے بھی بجائے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایک سائیکلسٹ چھ روز مسلسل سائیکل چلائے گا۔ محلے والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ بچے بوڑھے ذوق و شوق سے یہ تماشا دیکھنے آنے لگے۔ ان میں اکثریت جنوبی حصے کے رہائشیوں کی ہوتی تھی۔ ایک روز میں صحن میں امی کے ساتھ بیٹھی تھی کہ باہر سے بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ہماری نوکرانی باہر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ میدان میں لڑائی ہوگئی ہے۔ میں امی جی کے

آگے آگے سیڑھیاں چڑھتی چھت پر پہنچی تو ٹینٹ کے اردگرد زبردست ہلچل نظر آئی۔ تین چار آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ تب میری نظر سلیم پر پڑی اور جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس ہلچل کا مرکز وہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ لڑائی ہمارے پڑوسی "اعوانوں" سے ہوئی تھی۔ وہ پانچ بھائی تھے اور پانچوں ایک سے ایک بڑھ کر گورے چٹے اور صحت مند' محلے میں ان کا کافی رعب تھا۔ میرا چھوٹا بھائی پرویز جس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی ان کا گہرا دوست تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اعوانوں کے ایک لڑکے "مانی" نے سائیکل سوار کو تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تماشائیوں کے پیچھے چھپ کر اسے کنکریاں مارتا رہا تھا۔ اس بات پر جھگڑا بڑھ گیا۔ سلیم بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے مانی کو منع کیا کیوں غریب کو تنگ کرتے ہو' اس کی روزی کا معاملہ ہے۔ جہاں پانچ روز اسے برداشت کیا ہے ایک روز اور کر لو۔ سلیم کی سرزنش پر مانی آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے کہا میں یہ سائیکل یہاں نہیں چلنے دوں گا۔ اتنے میں مانی کے دو بڑے بھائی بھی آگئے۔ انہوں نے سائیکل سوار کو دھکا دے کر نیچے گرادیا۔ معاملہ بگڑ گیا۔ سلیم' مانی اور اس کے بھائیوں عاصم' قاسم وغیرہ سے الجھ گیا۔ جب میں نے چھت سے دیکھا کم از کم پانچ لڑکے سلیم سے گتھم گتھا تھے۔ ان میں میرا بھائی پرویز بھی شامل تھا۔ شاید آپ کو محسوس ہو کہ میں کسی فلم کا سین بیان کر رہی ہوں لیکن یقین جانیئے میں وہی کہوں گی جو میں نے اس روز اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اکیلے سلیم نے اپنے پانچ مدمقابل لڑکوں کی اس بری طرح پٹائی کی کہ موقع پر موجود بیسیوں افراد دنگ رہ گئے۔ اس کی خوفناک ٹکر جس کو لگ جاتی اس کے سارے کس بل نکل جاتے۔ میرے سامنے میرے بھائی پرویز نے ہاکی سے اس پر حملہ کرنا چاہا مگر پرویز کی ہاکی ابھی ہوا میں تھی کہ وہ کسی تیندوے کی طرح جھپٹا اور کھٹاک کی آواز سے ایک ساتھی پر جا گرا۔ میرے اور امی کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ اس دوران عاصم اور قاسم خون تھوکتے اور گالیاں نکالتے ہوئے کوئی ہتھیار لینے کے بہانے گھر کی طرف بھاگ آئے۔ سلیم نے باقی ماندہ دو بھائیوں کو گریبانوں سے پکڑ لیا اور اتنی تیزی اور پھرتی سے انہیں ٹکریں ماریں کہ انہیں جان بچانا مشکل ہوگئی۔ انجام کار وہ بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ کچھ لوگوں نے بپھرے ہوئے سلیم کو پکڑ لیا اور اسے کھینچتے ہوئے موقع پر سے ہٹا لے گئے۔

ہمارے پڑوس میں کہرام مچا ہوا تھا۔ قاسم اور اس کے بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ سلیم کو مزا چکھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کبھی کوئی بھائی اندر سے پستول نکال لاتا' کبھی کوئی ہاکیاں تھامے باہر نکل آتا تھا۔ ان کی والدہ اور بہنیں چیخ چیخ کر انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ میرا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا آج کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم چھت سے دیکھ رہے تھے کہ قاسم' اس کے بھائی اور دوست ایک بڑے جلوس کی شکل میں جنوبی آبادی کی طرف جا رہے ہیں سائیکلسٹ کو دیکھنے والے تماشائیوں کی شمولیت سے یہ جلوس اور بھی بڑا ہو گیا تھا۔ ہر ایک چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات میری نظروں سے اوجھل رہے جو کچھ سنا اس سے پتہ چلا کہ جب قاسم وغیرہ پستولوں اور خنجروں سے مسلح سلیم کے گھر پہنچے تو اتفاقاً وہ اندر موجود نہیں تھا۔ اس وقت وہ ایک قریبی مسجد کے غسل خانے میں اپنے خون آلود کپڑے دھو رہا تھا۔ قاسم اور اس کے ساتھیوں نے اس کے گھر کا دروازہ توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ گھر میں صرف عورتیں تھیں یا سلیم کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ اعوانوں نے اس کے بھائی کو اتنا مارا کہ اس کا بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا۔ عورتوں کو بھی پتھر مارے گئے اور گالیاں دی گئیں۔ اس کے بعد یہ لوگ للکارتے اور خنجر لہراتے ہوئے واپس آ گئے۔ لیکن یہ لڑائی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ سلیم کے بھی چار پانچ بھائی تھے۔ انہیں اپنی عورتوں کی بے عزتی اور بھائی کی حالت پر کوفت ہونا لازمی تھی۔ وہ اکٹھے ہوئے اور اعوانوں پر جوابی حملے کا پروگرام بنانے لگے۔

اسی شام سلیم پھر سائیکل کا تماشا دیکھنے جا پہنچا۔ اعوانوں کے لڑکے اس کی تاک میں تھے انہیں معلوم ہوا کہ سلیم تماشائیوں میں کھڑا ہے تو وہ اکٹھے ہو کر پہنچ گئے۔ ان کا بڑا بھائی ہاشم جو دوپہر کی لڑائی میں شریک نہیں تھا۔ کچھ زیادہ ہی غصیلا اور خردماغ تھا۔ ویسے بھی بھائیوں میں اس کا ڈیل ڈول سب سے اچھا تھا۔ وہ عقب سے گیا اور اس نے سلیم کو پیچھے سے اس طرح جکڑا کہ اس کے بازو بھی گرفت میں آ گئے۔ باقی اسے مارنے لگے۔ شور غل سن کر جب ہم چھت پر پہنچے تو لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ ہاشم نے سلیم کو عقب سے جکڑ رکھا تھا اور دوسرے اسے آہنی مکوں اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے' وہ ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ معافی مانگو زمین پر ناک رگڑ کر لکیریں نکالو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ

تو سہی' جو تم کہتے ہو وہی کرتا ہوں۔ لیکن وہ اسے چھوڑ بھی نہیں رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں کس طرح وہ خود کو ہاشم کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ یکایک دوپہر والا منظر پھر دوہرایا جانے لگا اتنے میں سلیم کا والد اس کے بھائی اور دوسرے رشتے دار چھریوں سے مسلح ہو کر موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے ہاشم' قاسم اور مانی کو پکڑ لیا اور چھریوں کے زور پر دھکیلتے ہوئے اپنے محلے کی طرف ہانک لے گئے۔ پھر گھر کے سامنے بجلی کے ایک پول سے باندھ کر ان کی زبردست پٹائی کی گئی۔ ہاشم کا سر پھٹا اور کندھا اتر گیا جبکہ قاسم کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ یہ تمام باتیں ہماری گلی کے ہی ایک شخص نے آ کر بتائیں۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو اعوان خود اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لئے جائیں یا پولیس کی مدد حاصل کریں کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لئے انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ویسے بھی یہ لوگ بااثر تھے پولیس کے ذریعے انہوں نے اپنے آدمی برآمد کروائے اور سلیم اور اس کے دو بھائیوں کو گرفتار کروایا۔ بعد میں ساتویں آٹھویں روز ان کی ضمانتیں ہو سکیں۔ معلوم ہوا کہ تھانے میں سلیم کو بری طرح مارا گیا تھا۔ اس جھگڑے میں میرا چھوٹا بھائی پرویز بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کی پیشانی اور ابرو پر دو گہری چوٹیں آئیں۔ میں اپنے ہاتھ سے دو روز اسے ٹکور کرتی رہی اور دل ہی دل میں سلیم کو بددعائیں دیتی رہی' لیکن ذہن کا ایک گوشہ ایسا بھی تھا جہاں اس کی پسندیدگی جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ جب آٹھ دس روز بعد معلوم ہوا کہ تھانے میں سلیم کو بری طرح مارا گیا ہے تو اس کے لئے ایک بے نام سی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ بہرحال میں خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی کہ یہ کیفیت کچھ میری ہی نہیں ہے۔ اس واقعہ نے سلیم کو چپکے سے پوری آبادی کا ہیرو بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ میری امی بھی جو پڑوسیوں کے غم میں برابر کی شریک رہتی تھی دبے لفظوں میں سلیم کی طرف داری کر چکی تھیں۔ وہ لڑکا مانی' جس کے کنکریاں پھینکنے کی وجہ سے یہ جھگڑا کھڑا ہوا واقعی بے حد جھگڑالو تھا۔ میری والدہ پرویز کو اس کے ساتھ گھومنے سے اکثر منع کیا کرتی تھیں۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ جو کچھ کہوں گی برملا کہوں گی۔ میری جو بھی ذہنی کیفیات تھیں میں درجہ بدرجہ آپ کو بتاتی جا رہی ہوں۔ اس واقع کے بعد میں سلیم کے لئے دل میں ہلکی سی آنچ محسوس کرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک روز جو چور دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اس کے راستے ایک اجنبی دل کی زمین پر قدم رکھ چکا ہے۔ میں نے

تنہائی میں بیٹھ کر اپنے ذہنی رویے کا تجزیہ کیا اور لرز گئی۔ نادیدہ ڈور مجھے کھینچ کر کس طرف لے جا رہی تھی۔ سلیم ایک ان پڑھ' بے کار اور کسی حد تک آوارہ لڑکا تھا۔ اس کی اور میری معاشرتی حیثیت میں ناقابل عبور فاصلے حائل تھے۔ نہ ہمارا ماضی ایک تھا' نہ حال اور نہ مستقبل ہو سکتا تھا۔ اس کے بارے سوچنا ایسا ہی تھا جیسے کسی ایسے شخص کی رفاقت کے بارے میں سوچا جائے جو سینکڑوں برس قبل پیدا ہو چکا ہو یا سینکڑوں برس بعد پیدا ہونے والا ہوا۔ ہم دونوں ہم عصر ہونے کے باوجود ہم عصر نہیں تھے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میری جذباتی کشمکش سراسر نادانی کے زمرے میں آتی ہے اور کسی طور قابل معافی نہیں۔ خود کو اس گمراہ کن اور شرمناک کیفیت سے نکالنے کے لئے میں نے نفسیاتی حوالے سے منصوبہ بندی کی اور فیصلہ کیا کہ اپنے کزن میں دلچسپی لوں گی جو کہ اسی میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کا طالب علم تھا اور جس سے میری منگنی متوقع تھی۔ وہ عموماً ہمارے گھر آتا تھا۔ اشاروں کنایوں میں وہ بار بار مجھ میں دلچسپی کا اظہار کر چکا تھا۔ چند لفظوں میں اس کی شخصیت کا احاطہ کرنا ہو تو میں کہوں گی کہ وہ ایسا لڑکا تھا جس کی دلچسپی کا مرکز بننا ہر لڑکی اپنے لئے باعث فخر سمجھ سکتی تھی۔ پہلے پہل اُسی کی آنکھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ لوگ میرے بارے میں جو کہتے ہیں وہ درست ہے۔ میں واقعی پرکشش شخصیت کی مالک ہوں۔

وہ مجھ سے بے تکلفی چاہتا تھا مگر ایسی باتوں کا سوچ کر میری طبیعت الجھ سی جاتی تھی امی کے بہت کہنے کے باوجود میں نے کبھی اس سے ہنس کر بات نہیں کی۔ مگر اب میں نے سوچا کہ اس کی حوصلہ شکنی نہ کروں گی۔ اس کے علاوہ دلی سکون کے لئے میں نے نماز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی اور قرآن شریف بھی پڑھنے لگی۔ اب میں اپنا تجزیہ کرتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں کسی بے نام خوف کے تحت ایک خول میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے سلیم کو دوبارہ اپنے سامنے پایا۔ زندگی کی شاہراہ پر اتفاقات کے ایسے اندھے موڑ آتے رہتے ہیں۔ جن حالات کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا انہیں ہم روبرو پاتے ہیں۔ وہ ستمبر کی ایک خنک دوپہر تھی۔ ہم اپنے تفریحی دورے کے آخری مرحلے میں ایبٹ آباد سے "ٹھنڈیانی" روانہ ہوئے۔

"ٹھنڈیانی" کا فاصلہ ایبٹ آباد سے شاید بیس پچیس میل ہے۔ یہ بلندی پر واقع ایک پرفضا قصبہ ہے۔ میرے بہنوئی جو لاہور میں قالینوں کا کام کرتے ہیں اپنی نئی سوک ہنڈا کو خطرناک ترین چڑھائیوں پر آزمانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔ ایبٹ آباد میں انہیں کسی نے بتایا کہ ٹھنڈیانی دیکھنے کے لائق جگہ ہے۔ وہ مکمل معلومات حاصل کئے بغیر ہمیں لے کر روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ تین چار روز وہاں قیام کریں گے۔ جب ہم ٹھنڈیانی پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایک سرد کہرا دھیرے دھیرے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم پر انکشاف ہوا کہ ادھر ہوٹلوں کا رواج نہیں۔ مختلف محکمہ جات کے ریسٹ ہاؤس ہوتے ہیں جہاں قیام کرنے کے لئے ایبٹ آباد سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے کہ اس تاریکی میں انتہائی خطرناک اترائیوں میں سفر کرتے ہوئے ہمیں واپس جانا پڑے گا۔ ہمارے مختصر قافلے میں میری بہن' بہنوئی والدہ اور میرے منجھلے بھائی تنویر بھی شامل تھے۔ ہم سب سخت پریشان تھے۔ اس وقت اچانک ایک کار ہمارے پاس آ کر رکی اور اس میں سے سلیم برآمد ہوا۔ میرے بھائی تنویر اسے پہچانتے تھے۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور بات چیت کرنے لگے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے سیٹھ منان نامی ایک معروف کاروباری شخص کی ملازمت اختیار کر لی ہے اور اسی ملازمت کے سلسلے میں وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ کوئی پراپرٹی کی خرید و فروخت کا جھگڑا نبٹانا تھا اسے۔ وہ بے حد اصرار کے ساتھ ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ یہ اس کے سیٹھ کی کوٹھی تھی مگر سیٹھ چونکہ وہاں نہیں تھا لہٰذا ہم تین چار روز اطمینان سے وہاں قیام کر سکتے تھے۔ میں نے سلیم کو پہلی دفعہ اتنے قریب سے دیکھا۔ وہ اب بہت بدل چکا تھا۔ لباس ڈھنگ کا تھا اور ہونٹ بھی پان سے رنگے ہوئے نہیں تھے۔ چہرا تو اس کا پہلے بھی درشت نہیں تھا۔ ایک شریر سی مسکراہٹ ہمہ وقت اس کی آنکھوں کو روشن رکھتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مسکراہٹ اس وقت کافور ہوتی تھی جب اسے کسی بات پر طیش آتا تھا اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ہم نے اس نہایت پرفضا اور حسین ماحول میں کوئی تین دن گزارے۔ سلیم ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے خود کو پابند کیا ہے کہ ہر قلبی واردات کھول کر آپ کے سامنے بیان کروں گی۔ لہٰذا یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان چند دنوں

میں سلیم سے میری پرانی وابستگی پھر تازہ ہوگئی اور میں بتدریج اور غیر محسوس طور پر اس کی شاندار مردانہ شخصیت کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ تاہم یہ ساری کشمکش میرے دل ودماغ تک محدود تھی اور میں نے سلیم پر اپنی کسی کمزوری کا مطلق اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں کوئی نادان بچی نہیں تھی۔ میں خود کو سنبھالنے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی مگر سنبھالنے سے کوئی خود کو سنبھال سکتا تو لوگ پاگل نہ ہوتے' خودکشی نہ کرتے' سنگین جرائم کی سزا میں پھانسی نہ پاتے۔ حالات انسان کا "ہانکا" کرتے ہیں۔ کسی کی عجیب وغریب شخصیت میرا بھی "ہانکا" کر رہی تھی۔ مجھے لگتا سلیم دنیا کا سب سے قابل اعتماد شخص ہے' اس کا ہاتھ تھام کر میں ہر مصیبت سے ٹکرا سکتی ہوں۔ ہر حادثے کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ اب سوچتی ہوں شاید......... شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارا خاندان شرافت آمیز بزدلی کا امین تھا۔ ہم پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ہوشیار سمجھدار مگر فطرتاً بزدل بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ بزدلی ہمارے خاندان میں فیشن سمجھی جاتی تھی۔ جو مرد جتنا نازک اندام اور "دابو" ہوتا تھا اتنا ہی لائق فائق سمجھا جاتا تھا۔ خدا نے فطری طور پر مرد کو محافظ بنایا ہے۔ وہ اپنے اہل خانہ کی حفاظت کرتا ہے اور حفاظت کے لئے طاقت و جرات درکار ہوتی ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ یہ طاقت و جرات ضروری نہیں کہ جسمانی ہو' اخلاقی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں لیکن زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں جب صرف اور صرف جسمانی طاقت ہی کام دیتی ہے۔ دنیا میں برائی زیادہ ہے اور اچھائی کم۔ افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے والے تھوڑے ہیں اور زور آزمائی کرنے والے زیادہ اور اس کا ثبوت وہ کھربوں روپے کے دفاعی بجٹ ہیں جو دنیا کی حکومتیں ہر سال پاس کرتی ہیں۔ بات اور طرف نکل گئی۔ میں کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ میرے اندر جیسے سلیم جیسے شخص کے لئے ایک خلا تھا اور ٹھنڈیانی میں گزارے ہوئے چند سازگار دنوں نے اس خلا کو وسیع کر کے میرے وجود کو ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیا۔

لاہور آکر عجیب عجیب سوچیں آٹھوں پہر مجھے گھیرے رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ میں بیمار ہوگئی۔ کھلے لفظوں میں کہوں گی کہ سلیم کی جان لیوا محبت نے مجھے چارپائی سے لگا دیا۔ گھر والے پریشان ہوگئے۔ امی کی تو مجھ میں جان تھی۔ ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھرتی رہیں لیکن روگ کچھ اور تھا۔ میری ایک ہمراز سہیلی فرخندہ تھی۔ میری کلاس فیلو

بھی تھی۔ ایک متمول اور آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہ بیماری کے دنوں میں اکثر میرے پاس آتی تھی۔ تنہائی میں گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے سلیم سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے وہ کہتی۔

"جان! اپنی ہی نانی اماں نہ بن جاؤ۔ اتنی دقیانوسیت ٹھیک نہیں۔ زمانے کے ساتھ چلو۔ تمہارا اور سلیم کا ملن کوئی ایسی بعید از قیاس بات بھی نہیں۔ اور اب تو وہ کافی بدل چکا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ اسکوٹر پر گھومتا ہے۔ ایک بڑی فرم کا ریکوری مینیجر بن گیا ہے۔ شکل سے نہیں لگتا تو کیا ہوا' ذرا عمر ہو جائے گی تو مینیجر بھی لگنے لگے گا۔ تیرے عشق کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو گیا تو دیکھنا ایک دم جنٹل مین بن جائے گا........."

میں ایسی باتوں کے جواب میں اکثر فرخندہ کو جھڑک دیتی لیکن وہ بھی ہٹ کی پکی تھی۔ اس سے میرا دن بدن کمزور ہونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے کہیں سے ایک ہومیوپیتھک معالج کا کھوج لگایا۔ اس کی دوائی سے مجھے نیند آنے لگی اور بخار میں بھی افاقہ ہوا۔ ایک روز میں لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ اپنی سفید سوزوکی کار پر آگئی کہنے لگی "چلو' کہیں گھومنے چلتے ہیں" میرے انکار کے باوجود وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئی اور باتھ روم میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا اس نے خود ہی میرے لئے ڈریس منتخب کیا اور بنا سنوار کر گاڑی میں بٹھالیا۔ پروگرام تھا کہ نہر کے کنارے کنارے ڈرائیونگ کریں گے لیکن وہ گاڑی لبرٹی کی طرف لے گئی اور کہنے لگی کہ پہلے کسی ریسٹورنٹ میں ٹھنڈا پی لیں۔ ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئیں۔ ایک فیملی کیبن کا پردہ ہٹا کر جب میں اندر داخل ہوئی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ میری پھٹی پھٹی نگاہیں سلیم پر جمی تھیں جو میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا پھر تعظیماً اٹھ کر اس نے مجھے نشست پیش کی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ فرخندہ مجھے کیبن میں پہنچا کر غائب ہو چکی تھی۔ ایک لمحے میں اس کی سازش مجھ پر کھل گئی۔ میں نے "شکریہ" کہہ کر واپس مڑنا چاہا لیکن سلیم کی پراعتماد آواز نے جیسے قدم پکڑ لئے۔ وہ بولا۔

"ثناء صاحبہ! اس ہل اسٹیشن پر ہم ایک گھر کے افراد کی طرح رہ چکے ہیں۔" میں خیالوں میں گم تھی کہ سلیم کی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔

"ثناء صاحبہ! آپ کا یوں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ بیٹھ جائیے۔"

اس کی آواز نے جیسے مجھے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میرا دل نہایت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ میں نے خود کو کسی شرمیلی لڑکی کی طرح انگلیاں مروڑتے ہوئے پایا۔ سلیم نے ویٹر کو بلا کر کسی چیز کا آرڈر دیا پھر وہ سگریٹ سلگا کر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا اس کی باتیں کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھیں۔ ان میں ترتیب تھی اور نہ پڑھے لکھوں والی شائستگی لیکن وہ باتیں تصنع اور منافقت سے پاک تھیں۔ وہ کھرے دل اور بے تکلف لہجے میں بول رہا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ کسی خواب کی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا۔

"ثناء صاحبہ! مجھے یاد ہے جس روز لڑکیوں نے کالج کے سامنے سڑک بند کی تھی آپ بھی موجود تھیں۔ جب ٹرک والا اوپر چڑھ آیا تھا تو آپ ہی آخر تک اس کے سامنے کھڑی رہی تھیں۔ شاید ٹرک کا بمپر آپ کے گھٹنے سے ٹکرایا تھا۔ آپ واقعی.......... دلیر ہیں۔"

میں کہنا چاہتی تھی کہ اپنی دلیری کا حال اس وقت کچھ مجھے ہی معلوم ہے' لیکن خشک گلے نے مجھے بولنے سے باز رکھا۔ میرے ہاتھ میز پر تھے اور ان ڈرے ہوئے کبوتروں کی طرح نظر آرہے تھے جو خود بلی کو دعوت دے رہے ہوں کہ وہ انہیں دبوچ لے۔ اگر سلیم ان ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتا تو شاید میں معقول مزاحمت بھی نہ کرسکتی۔ کسی ایسی صورت حال سے بچنے کے لئے میں نے ان ہاتھوں کو گود میں سمیٹ لیا۔

نہ جانے سلیم کے انداز گفتگو یا اس کی قربت میں کیا بات تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں میرا خوف زائل ہوگیا اور میں اس کی کمپنی میں خود کو نسبتاً پرسکون محسوس کرنے لگی۔ میں نے "نسبتاً" کا لفظ استعمال کیا ہے ورنہ گھر پہنچنے تک یہ حالت تھی کہ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور ہتھیلیاں پسینے میں تر تھیں۔ وقت رخصت سلیم نے مجھ سے وعدہ لینا چاہا کہ اگلی جمعرات ٹھیک اسی وقت میں اس سے اس جگہ ملوں گی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی اور بمشکل خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ باہر پہنچی تو فرخندہ کو ائر کنڈیشنڈ سوزوکی میں آئس

کریم کھاتے پایا اسے دیکھ کر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں اس سے بغیر کچھ کہے چپ چاپ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ راستے بھر مجھے منانے کی کوشش کرتی رہی مگر میرا موڈ آف ہی رہا۔

دوسرے تیسرے روز وہ پھر گھر پہنچ گئی اور مختلف حیلے بہانوں سے مجھے منا کر ہی چھوڑا۔ ملاقات کا حال پوچھنے لگی۔ میں نے مختصراً بتایا اور یہ ذکر گول کردیا کہ اگلی جمعرات سلیم نے پھر آنے کو کہا ہے۔ دراصل میں ابھی تک خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن وہ بھی ایک آفت کی پرکالی تھی۔ کہنے لگی۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اتنے اہم مذاکرات ہوں اور کسی مشترکہ اعلامیے کے بغیر ختم ہو جائیں۔ آئندہ کی کچھ منصوبہ بندی تو ہوئی ہوگی۔

وہ کسی بلا کی طرح مجھے چمٹ گئی۔ آخر مجھے بتانا پڑا کہ سلیم نے اگلی جمعرات ملنے کو کہا ہے۔ بس پھر تو اس نے گردان ہی شروع کردی کہ مجھے ضرور جانا چاہئے۔ ہماری اس انتہائی پرائیویٹ گفتگو کے دوران امی جی اندر چلی آئیں۔ فرخندہ سے بولیں۔

"بیٹی کیا رازونیاز ہو رہے ہیں؟"

فرخندہ کسی ڈیبیٹر کی طرح بولی "سیاست کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دیکھیں خالہ جان دونوں سپر پاورز جب تک ایک دوسرے سے دور رہیں گی' ایک دوسرے کے بارے میں ان کے وسوسوں میں اضافہ ہوگا.......... دونوں سوچیں گی۔ فریق ثانی کے پاس نہ جانے کون کون سے ہتھیار ہیں ان کے ماہرین کیا کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں طاقتیں آپس میں مل بیٹھیں ایک دوسرے کی بات اطمینان اور تحمل سے سنیں تو یقیناً دونوں کے اندیشے دور ہوں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ عزت اور زندگی کی خواہش تو دونوں طرف سے ہے۔ رسوائی اور موت کا خریدار کوئی بھی نہیں۔ کیا اس سے بقائے باہمی کے جذبے کو فروغ نہیں ملے گا؟"

"یقیناً ملے گا" امی جی نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

فرخندہ بولی۔ "اب آپ بتائیے اگر ایک سپر پاور باہمی گفت و شنید سے گریز کرے اور دعوت کے باوجود مذاکرات کی میز پر نہ بیٹھے تو کیا ہوگا؟"

امی جی نے کہا.......... "بھئی جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس سے تو ظاہر ہے' بدگمانی بڑھے گی ایک دوسرے کے بارے میں خوف پیدا ہوگا اور امن وامان کی حالت سدھر

نہیں سکے گی۔"

فرخندہ نے میرا منہ ہاتھ میں لیا اور بولی "اور نہ ماننے والی سپر طاقت کی حالت جل جل کر اور سڑ سڑ کر ایسی ہو جائے گی۔"

امی جی نے کہا! "ہائے ہائے اسے کیا ہوا۔ اب تو اللہ کے کرم سے کافی بہتر ہے چہرا ابھی بھرنے لگا ہے۔"

"نہیں بھرے گا.......... نہیں بھرے گا خالہ جان' اگر یہ ایسے ہی چارپائی توڑتی رہی تو ایک چارپائی بھی نہیں رہے گی آپ کے گھر۔ پلیز اس کا علاج دواؤں سے نہیں ہواؤں سے کریں' کھلی اور تازہ ہواؤں سے۔ اسے نکالئے باہر گھر سے' اور اپنی دوائیاں اور چارپائیاں بچائیے۔"

آخری الفاظ فرخندہ نے بھاگتے ہوئے کہے کیونکہ میں جوتی لے کر اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اگلے تین چار روز میں نے اذیت ناک کشمکش میں گزارے۔ سارا سارا دن کمرے میں بند سوچتی رہتی کہ کیا کروں۔ دل ودماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ بہرحال مجھے اطمینان تھا کہ دماغ کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ سب کچھ نہ کرسکوں گی۔ بدھ کے روز حسب توقع فرخندہ پھر آدھمکی۔ اس نے جیسے پہلے سے کیا ہوا فیصلہ مجھ پر تھوپ دیا۔

"دیکھو جان! میں تمہاری "ایفی شینسی" جان گئی ہوں تم اکیلی اس سے ملنے نہ جاسکو گی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مشیر خاص کی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے تمہارے ساتھ رہوں گی۔ بس اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ کل ٹھیک تین بجے میں گھر پر تمہارا انتظار کروں گی۔ میں نے پرویز سے کہہ دیا ہے وہ گاڑی پر تمہیں میرے ہاں لے آئے گا۔ وہاں سے چائے وغیرہ پی کر پانچ بجے روانہ ہوں گے۔"

پورا پروگرام خود ہی بتا کر اور خود ہی فائنل کرکے وہ واپس چلی گئی۔ میں ایک بار پھر سوچ کی سولی پر لٹک گئی۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ رات ہوئی اور پھر جمعرات کا مضطرب دن طلوع ہوا' میں اب کافی حد تک مطمئن تھی۔ کیونکہ آج گھر سے کہیں نہ جانے کا میں حتمی فیصلہ کرچکی تھی۔ دل ودماغ میں ہونے والی جنگ کا فیصلہ دماغ کے حق میں ہوچکا تھا۔ دماغ اپنی فتح پر مطمئن ہتھیار کھولے بیٹھا تھا اس لئے جب دل نے کلاوا

کاٹ کر اچانک حملہ کیا تو اس کا دفاع لرزا بہ اندام ہوگیا۔ یہ ساڑھے چار کا وقت تھا۔ میں کمرا بند کئے لیٹی تھی۔ چھوٹا بھائی پرویز دو دفعہ آکر پوچھ چکا تھا کہ مجھے فرخندہ کے ہاں کیوں نہیں جانا؟ میں نے کہا تھا' بس میری طبیعت خراب ہے۔ امی جی کی خواب آور گولیاں کھا کر میں ساڑھے چار بجے تک سونے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اچانک میں نے فیصلہ کیا کہ فرخندہ کے پاس چلوں گی.......... صرف فرخندہ کے پاس' اس سے آگے نہیں۔ اگر یہ دل کا فیصلہ تھا تو دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ہوشیار ثناء بی بی! تمہیں ورغلایا جا رہا ہے۔ تم فرخندہ کے پاس نہیں' اس سے آگے بھی جاؤ گی" لیکن یہ آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ میں نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے بال سنوارے اور چادر لے کر باہر نکل آئی۔ پرویز وڈیو پر کوئی تازہ فلم دیکھنے کی تیاری کر رہا تھا' میرے کہنے پر اس نے گاڑی نکالی اور مجھے فرخندہ کے ہاں اتار آیا۔

فرخندہ بالکونی میں کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نیچے آکر دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے دھکیلتی ہوئی باہر لے آئی۔

"کہاں؟" میں نے نے حیرت سے پوچھا۔

"بس اب چپ رہو" وہ سرگوشی میں غرائی "پہلے ہی اتنی دیر کردی۔"

"فرخندہ میری بات تو سنو" میں روہانسی ہو کر بولی۔ لیکن اتنی دیر میں وہ ایک رکشے کو رکنے کا اشارہ کر چکی تھی۔ دو جوان لڑکیوں کو دیکھ کر رکشے والے نے بڑے اسٹائل سے بریک لگائے اور عین ہمارے سامنے رکا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمیں لے کر لبرٹی کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

بعض واقعات بڑے معمولی ہوتے ہیں لیکن مخصوص حالات میں ان کی اہمیت غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ اگر پہاڑی ڈھلوان پر رکی ہوئی ایک چٹان شدید عدم توازن کا شکار ہو تو ایک ننھے بچے کی ٹھوکر بھی اسے نیچے لڑھکا سکتی ہے۔ کئی ٹن وزن اٹھانے والے ویٹ لفٹر کے لئے ایک مرحلے پر مزید ایک گرام وزن اٹھانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈوبنے والا بعض اوقات گھاس کی چند پتیوں سے سہارا پا جاتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا شاید اس روز اگر جین مندر سے مزنگ چونگی پہنچانے والی

سڑک خراب نہ ہوتی اور رکشے والا ہمیں بہاول پور روڈ سے مزنگ چونگی کی طرف نہ لے جاتا تو صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ ممکن تھا کہ راستے کی یہ غیر اہم تبدیلی میری زندگی کے راستوں کو کتنا مختلف کر دیتی جو ہونا تھا اس کے بارے تو قیاس ہی کیا جاسکتا ہے مگر جو ہوا وہ ٹھوس حقیقت ہے اور میں اسے بیان کر سکتی ہوں۔ رکشا مزنگ چونگی سے کچھ فاصلے پر تھا کہ میری نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی یکایک جیسے کسی نے میرا کلیجہ مٹھی میں لے لیا سڑک سے چند گز کے فاصلے پر میرے والد کی قبر تھی ان کی وفات کے تین چار سال بعد تک ہم اکثر یہاں آیا کرتے تھے مگر اب انہیں دیکھے ایک برس بیت گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں موت وحیات کا تذکرہ کرتے اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے کہتے تھے میں لوگوں کی لاپرواہی پر حیران ہوتا ہوں۔ یہ جو شہر کے درمیان میانی صاحب کے نام سے ایک شہر خموشاں آباد ہے اس میں روزانہ کچھ نہیں تو پندرہ بیس جنازے تو آتے ہوں گے۔ سوچتا ہوں پرسوں جو پندرہ بیس افراد لوگوں کے کندھوں پر سوار اس گورستان میں پہنچیں گے وہ آج اس وقت زندہ ہوں گے کوئی چارپائی پر ہوگا۔ کوئی دفتر یا کارخانے میں ہوگا کوئی کسی میلے ٹھیلے میں ہوگا۔ سب زندہ ہوں گے۔ رکشے کے دروازے سے میری نگاہ ابو کی سفید سنگی قبر پر پڑی اور دل سے ہوک نکل گئی۔ باپ کو بے بس جان کر میں کتنی دلیری سے اپنے راستے پر گامزن تھی۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے اجالے کی چادر تن گئی۔

"رکشا روکو" میں نے نہایت مستحکم لہجے میں کہا۔

رکشے والے کے ساتھ ساتھ فرخندہ بھی مجھے گھوم کر دیکھنے لگی۔ میرے لہجے نے اسے چونکا دیا تھا۔ رکشا روکو میں نے پھر کہا رکشا آہستہ ہوا اور سڑک کے کنارے رک گیا رکشے والے واپس چلو میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ثناء!" فرخندہ بولی۔

"فرخندہ مجھے کچھ نہیں سننا اگر میری دوست ہو تو پلیز کوئی ضد نہ کرنا۔" میرے تیور دیکھ کر فرخندہ کو چپ لگ گئی۔ رکشے والے نے رکشا موڑا اور مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ہمیں گھر واپس لے آیا۔

وہ اکتوبر کی ایک چمکدار صبح تھی میں کمرے میں بیٹھی اپنے چھوٹے بھتیجے کو لوڈو کھیلنا سکھا رہی تھی فرخندہ کمرے میں آدھمکی اسے دیکھ کر میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری

کرلی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بے حد سنجیدہ ہوگی لیکن یہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ اس کا موڈ خوشگوار ہے۔ ذرا ہی دیر میں ہم کھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ فرخندہ نے تنہائی ملتے ہی کہا۔

"تم تو مجھے ولی اللہ لگتی ہو پرسوں تم واپس نہ آتیں تو غضب ہو جاتا تھا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔

"ہوا کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہو جاتا میری پھوپھو نادرہ ہیں نا پرسوں گاڑی پر ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ انہیں شک ہو گیا تھا کہ لڑکیاں کوئی گل کھلانے جا رہی ہیں" فرخندہ نے یہ بات آسانی سے کہہ دی تھی لیکن میرے ہوش اڑ گئے۔ یہاں میں آپ کو فرخندہ کی پھوپھو کے بارے میں بتا دوں۔ وہ ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم سکول کی پرنسپل ہیں درحقیقت یہ ان کا اپنا ہی سکول ہے برسوں پہلے انہوں نے اپنے خاوند سے طلاق لے لی تھی اور میکے میں رہتی تھیں۔ خاوند جھنگ کا ایک زمیندار تھا حق مہر میں کافی رقم نکلی تھی اس سے انہوں نے سکول شروع کر دیا تھا۔ مزاج کی خاصی تیز تھیں۔ فرخندہ گھر بھر میں صرف انہی سے ڈرتی تھی۔ فرخندہ نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں مگر جب ہم راستے سے مڑ گئے تو وہ بھی گھر واپس آگئیں تمہارے جانے کے بعد مجھ سے کہنے لگیں تمہاری مصروفیات آج کل کچھ زیادہ ہی پراسرار ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ فرمانے لگیں اگر ایسی بات نہ تھی تو مجھے پیچھے دیکھ کر تم واپس کیوں مڑ آئیں۔ یعنی بزرگوار کا خیال ہے کہ ہم انہیں تعاقب میں دیکھ کر واپس مڑی تھیں جبکہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی"

فرخندہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا میں نے کہا فری کہیں کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔ کہنے لگی نہیں یار سب سے بڑی مصیبت تو تمہارا یہ چڑی سا دل ہے اسے معقول سائز میں کر لو تو سب ٹھیک ہے پھر مجھ سے پوچھنے لگی اب تک کیا کرتی رہی ہو اور اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں تمہارے دونوں سوالوں کا جواب تفصیل سے دیتی ہوں۔ پرسوں گھر آکر سب سے پہلے میں نے وضو کیا پھر دو رکعت نماز نفل پڑھی اس کے بعد کمرے میں آئی اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر یہ قسم کھائی کہ اب کبھی اس سے

نہ ملوں گی اور نہ کبھی تمہیں اس کے بارے میں بات کرنے کی اجازت دوں گی اگر تم میرے روکنے کے باوجود باز نہ آئیں تو تمہاری دوستی چھوڑ دوں گی۔" فرخندہ کا چہرہ ایک دم بجھ گیا میں اسکی کیفیت نظرانداز کرتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولتی رہی "دوسرا سوال تم نے پوچھا ہے کہ آئندہ کیا ارادہ ہے اسکا جواب ہے کہ میں اس ماہ راولپنڈی شفٹ ہو رہی ہوں" تمہیں معلوم ہے کہ باجی حنا کے خاوند وہاں ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں ہیں باجی پہلی بچی کی وفات کے بعد اکثر اداس رہتی ہیں انہوں نے کئی بار مجھے کہا ہے کہ میں ان کے پاس آجاؤں ان کا دل بھی لگا رہے گا میں ایم اے کی تیاری بھی اطمینان سے کر سکوں گی۔ میں نے کل ہی انہیں خط پوسٹ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اگلے ویک اینڈ تک آجائیں گے ایک دو ہفتے وہ یہاں رہیں گی پھر میں بھی ان کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔"

میری بات مکمل ہوتے ہوئے فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے میں جانتی تھی میرے ان فیصلوں سے اسے دکھ ہوگا وہ ایک من موجی لڑکی تھی اس کا دل چاہتا تھا ہم دونوں مل کر زندگی کو انجوائے کریں۔ لائبریریز میں جائیں لمبی ڈرائیوز کریں رومانس کریں ایک دوسرے کو اپنے بوائے فرینڈز کے قصے سنائیں بلکہ ہو سکے تو کوئی فارن کا ٹور بھی لگائیں لیکن وہ بھول جاتی تھی۔ میرے اور اس کے ماحول میں بہت فرق ہے وہ ایک مخلص اور پیاری دوست تھی لیکن کبھی کبھی میرے مجبوریوں کو نظرانداز کر دیتی تھی میں نے جانے کا فیصلہ سنایا تو اس نے سامنے رکھی ہوئی چائے بھی نہیں پی اور گلوگیر آواز میں خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے منانے ضرور آؤں گی کیونکہ یہ ہو ہی نہ سکتا تھا میں اسے روتا ہوا چھوڑ کر راولپنڈی سدھار جاؤں۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ نہ صرف میرا راولپنڈی کا پروگرام دھرا رہ گیا بلکہ حالات کے تھپیڑوں نے مستقبل کی پوری ہیئت ہی بگاڑ کر رکھ دی۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ فرخندہ کی پھوپھو نے نجانے کس انتقامی جذبے کے تحت بات دور تک پہنچا دی اور اس شکی مزاج خاتون نے ہماری "سرگرمیوں" کا پورا کھوج لگایا اور ایک روز ہمارے گھر آدھمکی میں نے جب اسے دیکھا وہ اپنا بیگ سنبھالے امی جی کے کمرے سے نکل رہی تھی میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا پتہ نہیں وہ کب سے وہاں بیٹھی تھی اور کیا آگ لگا گئی تھی جلد ہی امی جی کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس آگ کی شدت کا اندازہ ہوگیا۔ امی میرے کمرے میں آئیں اور دروازہ بند کر کے

بولیں۔

"ثناء ہمارے سر پر کیا قیامت توڑنے لگی ہے تو؟"

میں سرتاپا ایک سہا ہوا سوال بن گئی امی جی نے مجھے قہر بھری نظروں سے گھورا اور پھر سر پکڑ کر رونے لگیں۔ جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو کہنے لگیں۔ "فرخندہ کی پھوپھو نے بتایا ہے کہ تم فرخندہ کو لے کر گلبرگ کے ایک ہوٹل میں کسی ویگن ڈرائیور کو ملنے جاتی ہو۔" میں حیرت اور صدمے سے گنگ تھی امی جی نے کہا۔ "ثناء میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میری بیٹی اتنی گر سکتی ہے یہ خبر سننے سے پہلے میں تیرے باپ کے پاس کیوں نہ چلی گئی۔"

وہ روتی رہیں اور مجھے لعنت ملامت کرتی رہیں وہ خاموش ہوئیں تو میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی صفائی پیش کی میرا بیان میرے دل کی آواز تھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ بیٹی کے دل سے نکلنے والی آواز ماں کے دل نے سنی ہے۔ مگر اُن کے چہرے پر رنج وملال کی پرچھائیاں سمٹ نہ سکیں۔ آنکھوں میں پرتشویش سائے لہرا رہے تھے گھمبیر لہجے میں بولیں۔

"میں بازار گئی ہوئی تھی میرے آنے سے پہلے فرخندہ کی پھوپھو یہی باتیں تیری بھابھی سے بھی کر چکی ہے اب یہ بات تیرے بھائیوں تک بھی ضرور پہنچے گی میرا تو دل ڈول رہا ہے نجانے کیا ہوگا" مجھے خود تسلی کی ضرورت تھی ماں کو دلاسہ کیا دیتی خوف کی دھند میں ہم ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ خوف اور عورت کتنا گہرا رشتہ ہے ان دونوں لفظوں میں۔

دوسرے روز شام تک ہمارے گھر دبی دبی سرگوشیاں گونجنے لگیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ بات کانوں کان پورے گھر میں پھیل گئی ہے۔ بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں پہلے ہی ذرا خشک مزاج واقع ہوئے ہیں لیکن منجھلے بھائی تنویر کی آنکھوں سے بھی میرے لئے محبت کی چمک مفقود ہوگئی۔ بھابیوں کی آنکھیں تو شاید ہوتی ہی بدلنے کے لئے ہیں اس ماحول میں مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا ٹیلی فون کی گھنٹی دروازے کی ہر دستک اور قدم کی ہر چاپ پر ڈر جاتی کہ شاید میری جان کے لئے کوئی مصیبت آئی ہے دل پتے کی طرح ہلکا ہو گیا تھا لیکن ابھی پردہ غیب سے بہت کچھ ظہور میں آنا باقی تھا۔ دوسرے یا تیسرے

روز چھوٹے بھائی پرویز کی باتوں سے پتہ چلا کہ ویگنوں والے رفیق کا لڑکا سلیم پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اس واقع کی تفصیل کچھ یوں تھی۔ کل سہ پہر اس نے ''ٹل سکالرز'' سکول کی پرنسپل نادرہ کی کار کو اپنے سکوٹر سے اس وقت ٹکر ماری جب وہ چھٹی کے بعد گھر واپس جا رہی تھیں۔ گاڑی کو نقصان پہنچنے پر تکرار ہوئی جس کے نتیجے میں سلیم نے مشتعل ہو کر سکوٹر کی ڈگی سے ایک آہنی راڈ نکال لیا اور اس کی ضربوں سے نہ صرف کار کے تمام شیشے چکنا چور کر دیئے بلکہ باڈی کو بھی نقصان پہنچایا کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے پرنسپل کو بھی دھکے دیئے جس سے ان کی عینک گر کر ٹوٹ گئی۔ اس دوران سکول کا چوکیدار ایک دو مرد ملازموں کے ساتھ بھاگتا ہوا آگیا انہوں نے پرنسپل کی حمایت میں سلیم سے الجھنا چاہا تو اس نے انہیں بھی بری طرح زدوکوب کیا۔ سکول چوکیدار کے سر پر شدید چوٹ آئی اور وہ سڑک پر ہی بے ہوش ہوگیا بعد ازاں پرنسپل کی رپورٹ پر متعلقہ پولیس نے سلیم کو پکڑ لیا۔

یہ واقعہ بظاہر ایک حادثے کے نتیجے میں ہوا لیکن کسی تبصرے کے بغیر ہی ہم سب جانتے تھے کہ اس کا محرک کیا ہوگا یقیناً سلیم کو معلوم ہوگیا تھا کہ پرنسپل نادرہ ہمارے گھر پہنچی تھی اور اس نے مجھ پر بڑھا چڑھا کر الزامات لگائے تھے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میرے وعدے کے مطابق نہ ملنے کو بھی پرنسپل نادرہ کی کوشش پر محمول کر رہا ہو۔ بہرطور اس نے اپنے غم غصے کا اظہار پرنسپل نادرہ کی نئی گاڑی توڑ کر کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے گھر کی فضا اور مکدر ہوگئی ایک دن فرخندہ کی دو رشتے دار خواتین ہمارے گھر آئیں زیورات سے لدی پھندی یہ عورتیں کسی جاگیردار گھرانے سے لگتی تھیں۔ فرخندہ کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں ان عورتوں کی وجۂ آمد مجھے اگلے روز معلوم ہوئی۔ رات بارش ہو جانے کی وجہ سے میں برآمدے میں سو رہی تھی۔ ہر گھر میں کچھ مقامات حساس نوعیت کے ہوتے ہیں گھر کے افراد کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مقام پر کی جانے والی گفتگو کسی دوسرے مقام سے باآسانی سنی جا سکتی ہے۔ ان مقامات کی نشاندہی طویل تجربے اور ایک دو حادثات کے بعد ہو پاتی ہے۔ اس روز میں برآمدے میں جس جگہ لیٹی تھی وہاں سے امی کے کمرے میں ہونے والی گفتگو واضح سنائی دے رہی تھی موضوع گفتگو میں ہی تھی بڑے بھائی جان کہہ

رہے تھے۔

''لوگ تو اچھے ہیں میرا خیال ہے بات آگے بڑھائی جائے۔'' منجھلے بھائی تنویر بولے ''اس کے سوا چارہ بھی نہیں عدنان (میرا کزن) ابھی نفتھ ائر میں ہے اس کی امی کہہ رہی تھیں کہ ایم ڈی کے لئے امریکہ جائے گا اس کی شادی تو چار پانچ سال کی بات ہے۔''

بڑے بھائی نے کہا ''اور میرا تو خیال ہے یہ رشتہ کسی طرح عدنان سے کم نہیں۔ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں' زمینداری ہے' مرتبہ ہے۔''

امی نے پوچھا کہ لڑکا کتنا پڑھا ہوا ہے۔ بڑے بھائی جھلا کر بولے ''امی جی پڑھائی کو چھوڑیں رکھ رکھاؤ والا اور ملنسار ہے گریجویشن نہیں تو انٹر ضرور کیا ہوگا۔'' چھوٹے بھائی نے کہا ''اصل مسئلہ یہ ہے ہمیں کسی بھی طرح صورت حال کو بگڑنے سے بچانا ہے۔ سلیم ایک خطرناک شخص ہے اب تو وہ جیل میں ہے اور پانچ چھ ماہ سے پہلے باہر نہیں آئے گا اس دوران یہ بیل منڈھے چڑھ جائے تو ہم سب کی بھلائی ہے'' الفاظ پگھلے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر رہے تھے جب اپنے بارے میں کسی کا ایسا انداز فکر معلوم ہو تو دل ودماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ ایک دم ہی میں اپنی نظروں میں حقیر ہو کر رہ گئی۔ بھائیوں کی پراندیش آوازیں بار بار کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ انہیں اپنی عزت وناموس کا خوف تھا۔ ان الجھنوں کا خوف تھا جو سلیم کی صورت میں انہیں پیش آسکتی تھیں اس دنگے فساد کا خوف تھا جو سلیم کے حوالے سے ان کی پرسکون زندگیوں کو دھمکا رہا تھا اور وہ شریف لوگ تھے ان بکھیڑوں کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لئے فوراً اس معاملے کو سلجھا دینا چاہتے تھے۔ میں سوچنے لگی کیا یہی چادر اور چاردیواری ہے کیا بھائی اپنی بہنوں کے لئے یہی کر سکتے ہیں کہ جونہی کوئی بدخواہ انہیں میلی آنکھ سے دیکھے وہ اس کی آنکھ جھکانے کی بجائے بہن کو جیسے تیسے گھر سے رخصت کر دیں۔ یہ کیسی شریف النفسی تھی کہ بیری پر پتھر پھینکنے والے ہاتھ کو نہ روکا جائے بیری کاٹ دی جائے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن ان اشکوں کے پیچھے ایک اطمینان بھی تھا جو کچھ ہو رہا تھا ٹھیک ہو رہا تھا شادی ایک نہ ایک دن تو ہونا ہی تھی ابھی ہو جاتی تو بہتر تھا بہت سے مسئلے سلجھ جاتے اور اس نفس کو سزا بھی ملتی جس نے کچھ دیر کے لئے ہی سہی ایک بے ہودہ سپنا دیکھا تھا۔ امی جی کے کمرے میں ہونے والی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کل جو عورتیں آئیں وہ درحقیقت ہمارا

گھر دیکھ کر گئی تھیں اور اب چار پانچ روز تک انہیں پھر آنا تھا۔ آخر یہ چار پانچ روز بھی گزر گئے ایک دن امی جی نے کہا کہ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لو کچھ مہمان آرہے ہیں۔ میں نے جی اچھا کہہ کر سر جھکا دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک مجرم ہوں اور پورا گھر منصف ہے جو باہمی مشورے سے میرے لئے کوئی سزا تجویز کر رہا ہے۔ سہ پہر کے وقت مہمانوں نے گھر میں قدم رکھا سب اہل خانہ ان کے آگے بچھ بچھ گئے۔ وہ پانچ عورتیں تھیں خوب صحت مند اور پاٹ دار آواز والی۔ امارت کی نشانیاں جا بجا ان کے جسموں پر سجی ہوئی تھیں وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میری پیشانی پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہے۔ فرخندہ کی پھوپھو پرنسپل نادرہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ انہوں نے ہی یہ رشتہ میرے گھر والوں کو بتایا تھا۔

آخر کئی تکلیف دہ اور دل سوز مرحلوں سے گزرنے کے بعد منگنی کی رسم انجام پائی۔ لڑکے والوں کو میں پسند آگئی تھی اور میرے گھر والوں کو میرا نیا گھر پسند آگیا تھا شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ اس دوران میرے ہونے والے شوہر کی ایک تصویر بھی ہمارے گھر پہنچی۔ وہ گھنی مونچھوں والا ایک صحت مند نوجوان تھا شکل و صورت اچھی تھی۔ اس دوران اپنے خاوند کے مشغلوں اور عادات کے بارے میں مجھے بتایا جاتا رہا۔ وہ گھڑ سواری اور شکار کے شوقین تھے زمینوں کی تمام دیکھ بھال انہی کے سپرد تھی کیونکہ ان کے بڑے بھائی ایک عرصے سے کینیڈا میں مقیم تھے اور وہیں پر شادی کر لی تھی۔ میرے شوہر کو امپورٹڈ لباس پسند تھے کھانوں میں انہیں مچھلی بھنا ہوا بٹیر اور ماش کی دال بھاتی تھی۔ پھول انہیں گلاب کا اچھا لگتا تھا لیکن بالکل تر و تازہ۔ یہ باتیں بتدریج اور غیر محسوس طریقے سے مجھے ذہن نشین کرا دی گئیں میرے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے بھابیوں کے لہجے میں عجیب طرح کا تفاخر آجاتا جیسے وہ احسان جتا رہے ہوں کہ دیکھو ہم نے تمہارے لئے کیسا بر ڈھونڈا ہے ساری زندگی راج کرو گی کون کہتا ہے کہ بھابیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ در حقیقت میرا بیاہ جھنگ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہو رہا تھا بہت سکھی لوگ تھے انہیں صرف اپنی پسند کی لڑکی چاہئے تھی اور یہ میری قسمت کہ انہیں میں پسند آگئی۔ امی جی تو میرا منہ چوم چوم نہ تھکتی تھیں کہتی تھیں میری بیٹی کے نصیب جاگ اٹھے لاکھوں میں ایک گھرانہ ملا ہے برادری والے دانتوں میں انگلیاں دباتے ہیں۔ منگنی کے بعد

شادی کے دن طے ہوئے اور ہمارے آنگن ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی۔ خاندان کی لڑکیاں دن بھر گیت گاتیں اور چھیڑ چھاڑ جاری رہتی۔ فرخندہ بھی ڈھولک پر آنے لگی پہلے دن تو وہ بجھی بجھی سی رہی پھر اس نے بھی خود کو شادمانی کے اس دھارے میں شامل کر لیا۔ اسے میری قسم یاد تھی اس لئے کبھی اس نے سلیم کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ میں نے بھی دل کے چور دروازے کو دیوار کر دیا تھا ہاں کبھی کبھی یہ خیال ذہن میں ضرور آتا کہ سلیم کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ آخری ملاقات میں میرے الاؤ کی کچھ چنگاریاں اڑ کر اس کے خرمن میں بھی آگ جگا گئی ہوں اور اب وہ بھی سلگ رہا ہو۔ اس شبے کو یوں بھی تقویت ملتی تھی کہ مجھ سے ملاقات میں ناکامی کے بعد اس نے فرخندہ کی پھوپھو کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پھر فرخندہ کا ایک فقرہ بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگتا سلیم سے پہلی اور آخری ملاقات کے بعد اس نے شوخی سے کہا تھا "تیری صورت ایسی ہے کہ راہ چلتے کو دشمن بنا لیتی ہے اور جس کے ساتھ تو آدھ گھنٹا کیبن میں باتیں کرتی رہی اس کی وحشتوں کا تو کیا پوچھنا؟"

میں اس پہلو سے سوچتی تو تصور عجیب عجیب ہیولے بنا کر ڈرانے لگتا کبھی میں سوچتی ایسا نہ ہو کہ سلیم جیل سے بھاگ نکلے اور شادی سے پہلے یہاں پہنچ کر کوئی ہنگامہ کر دے۔ فلموں اور کہانیوں کے سین میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ سلیم غصے سے پھنکارتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے اور وہ مہمانوں سے لڑتا بھڑتا میرے کمرے تک پہنچتا ہے اور مجھے اپنے کندھے پر اٹھا کر للکارتا ہے کس میں اتنی جرات ہے کہ مجھے روک سکے؟ کبھی میں تصور میں اس کی خون میں نہاتی ہوئی لاش دیکھتی کبھی بھائیوں کی رسوائی کا منظر ذہن میں آتا۔ جب ذہن پر ایسی پاگل کرنے والی سوچوں کی یلغار ہوتی تو میں نوافل پڑھنے شروع کر دیتی اور کبھی سارا سارا دن مصلے پر گزر جاتا۔

پھر میری شادی کا دن آن پہنچا ہر گھڑی ایک تلوار میرے سر پر لٹکتی رہی۔ یوں لگتا ابھی کوئی ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ دل کہتا ثناء محمود تیری سوچوں کی گمراہی تجھے معاف نہیں کرے گی۔ بالآخر اذیت ناک گھڑیاں گزر گئیں نکاح کی رسم ادا ہو گئی میں ثناء محمود سے ثناء واصف چنگیزی بن گئی۔ مبارک باد اور سسکیوں کے ملے جلے شور میں پیلی دھات کے بوجھ سے جھکی لرزتی کانپتی گل پوش مرسیڈیز میں جا بیٹھی۔ میرا دولہا زر تار کلاہ پہنے گھوڑے پر

سوار آگے آگے جا رہا تھا آسمان سے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی میں نے مندھی ہوئی آنکھوں سے دیکھا یہ وہی گلی تھی جہاں سے میں سینکڑوں بار گزر کر سکول اور کالج گئی تھی لیکن آج یہ گلی کتنی اجنبی لگ رہی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ میرا سر گھومنے لگا شاید میں میکے اور سسرال کے درمیان معلق ہو گئی تھی۔ میں نے پہلو میں بیٹھی فرخندہ کا ہاتھ تھام لیا فرخندہ نے میرا ہاتھ دبایا اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے گفتگو کر رہا تھا "جان مستقبل پر نظر رکھو ماضی کو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ کہ کبھی ہم ان گلیوں میں کھیلے تھے اس شہر کی سڑکوں پر گھومے تھے یہاں کے سبزازاروں میں شامیں گزاری تھیں اور تہوار منائے تھے۔ بھول جاؤ لائبریریوں کو کیٹس اور روز ورتھ کی شاعری کو اور منٹو کرشن چندر اور ابن انشا کی کتابوں کو بھول جاؤ سوالاز' راجر مور اور جین فونڈا کی فلموں کو بھول جاؤ ان دنوں اور راتوں کو جب ہم سارا سارا دن کرکٹ دیکھتے تھے اور رات رات بھر تبصرے کرتے تھے اور ان سب کے ساتھ ساتھ اس چھت کو بھی بھول جاؤ جس پر کھڑی ہو کر تم کسی کے گزرنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔"

میری سسرال جھنگ کے مضافات میں واقع تھی۔ اس عالیشان حویلی میں میری ازدواجی زندگی کا آغاز گو معمول کے مطابق تھا لیکن دوسرے ہی دن ایک بدمزگی پیدا ہوگئی۔ دوسرے روز ولیمہ تھا اور لاہور سے ہمارے خاندان کی عورتیں بارات کے ساتھ ہی جھنگ چلی آئی تھیں۔ یہاں ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہوا جس کی انہیں توقع تھی بہرحال شادی کے ہنگاموں میں بعض اوقات مہمانوں کو انفرادی توجہ نہیں دی جاسکتی لیکن اس پر مستزاد یہ کہ میری سسرالی عورتوں نے باتیں بنائیں اور کہا کہ ہم نے ان کا شایان شان استقبال نہیں کیا اور دوسری رسومات پوری کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ یہ سب کچھ قطعی غیر متوقع تھا میرے گھر والوں نے مہمانوں کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور مقدور سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ اس نوک جھونک کی وجہ سے ولیمے کا اختتام خاصی بدمزگی میں ہوا میرے عزیز پروگرام مختصر کرکے اس رات لاہور واپس آجانا چاہتے تھے لیکن میرے چچا سسر نے انہیں روک لیا دوسرے روز وہ مجھے لاہور واپس لے آئے۔

دستور کے مطابق میرے شوہر بھی ساتھ تھے ہمیں تین چار روز یہاں رہنا تھا۔ ان کی خدمت میں میرے گھر والے اور خاص طور پر امی جان قدموں میں بچھی جا رہی تھیں۔

کوٹھی کا ایک حصہ ہمارے استعمال کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ ایک ملازم ہر وقت دروازے پر موجود رہتا تھا۔ دو دن تو ٹھیک گزرے لیکن تیسرے روز واصف اپنی اکتاہٹ کا اظہار کرنے لگے کہنے لگے۔

"ثناء جی یہاں گھٹن بہت زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "جناب یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہم دوسری منزل پر زیادہ ہوا دار کمروں میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔"

وہ بولے "یہ بات نہیں دراصل تمہارے گھر والے اور خاص طور پر امی جان اس قدر خوشامدانہ میرا مطلب ہے عزت افزائی کا رویہ اختیار کرتی ہیں کہ الجھن ہونے لگی ہے۔"

مجھے واصف کی بات پر جھٹکا سا لگا لیکن پھر سنبھل کر بولی "آپ چاہتے ہیں کہ جہاں ہم ہوں وہاں صرف ہم ہوں۔"

میری بات سمجھتے ہوئے انہوں نے مجھے بانہوں میں لے کر ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ ہمارے گھر میں شاید ان کا پہلا اور آخری قہقہہ تھا۔

پانچویں روز جب میں باتھ روم میں تھی امی جان نے ان کے سامنے چائے رکھنی چاہی جو ان کے پاؤں پر گر گئی وہ ایک دم بھڑک اٹھے "کیا کر رہی ہیں آپ؟ نوکر مر گیا تھا کہیں!" ان کی گرج سن کر میں سر پر تولیہ لئے باہر نکلی وہ قالین پر کھڑے تھے اور امی جھکی ہوئی اپنے دوپٹے سے ان کے پاؤں صاف کر رہی تھیں۔ ان کا چہرہ پھر بھی غصے سے تمتما رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد ہمارے گھر والوں میں واصف کے لئے جھجک سی پیدا ہو گئی شادی کے بعد دو مہینوں میں میں تین چار دفعہ میکے آئی سب واصف سے دبے دبے رہے۔ قدرتی بات ہے کہ آدمی جس سے خائف ہو اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی حرکت سرزد ہو جاتی ہے اس سے فریق ثانی اور مشتعل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو "چین" کی صورت آگے بڑھتی ہے ویسے بھی واصف کی شخصیت میں بے پناہ دبدبہ اور تحکم تھا انہیں ہمارے گھرانے پر واضح معاشی اور سماجی برتری بھی حاصل تھی وہ میرے میکے والوں سے کبھی گھل مل نہ سکے۔ میرے میکے میں ہر وقت ان پر ایک خشک

سا موڈ طاری رہتا تھا میرے ساتھ ان کا رویہ اول اول ٹھیک تھا مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی گرمجوشی کم ہو رہی ہے۔ پہلے پہل میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ان پر بے پناہ ذمہ داریاں ہیں زمینوں اور کارخانوں کی دیکھ بھال اور مزارعوں کے معاملات ہیں پھر کچھ مقدمے بھی چل رہے ہیں ان سب بکھیڑوں کے باوجود اگر وہ میرے پاس آجاتے ہیں تو کیا کم ہے لیکن جب پانچویں چھٹے مہینے میری طبیعت خراب رہنا شروع ہوئی تو واصف مجھے بالکل نظرانداز کرنے لگے۔ میں اتنی بڑی حویلی میں نوکروں کے آسرے پر تھی۔ ایسے موقعوں پر ساس بڑا مشفق کردار ادا کرتی ہے بہو کو اونچ نیچ سمجھاتی ہے اور خوراک لباس کا خیال رکھتی ہے لیکن میری ساس خود بیمار رہتی تھیں۔ دیسی دوائیاں ان کی کمزوری بن چکی تھیں۔ ان کی الماری ہر وقت معجونوں کشتوں اور خمیروں سے بھری رہتی تھی۔ شروع شروع میں میں نے ان کے علاج معالجے کی طرف توجہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہ کرتیں تھیں۔ رہیں نندیں تو وہ ہمیشہ مجھ سے دور دور رہیں انہوں نے پہلے دن سے تصور کر لیا تھا کہ میں شہر کی ایک آزاد طبع لڑکی ہوں جس کی دلچسپیاں اور رجحانات ان سے قطعی مختلف ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میری نوکرانی سکینہ نے مجھے بتایا کہ حویلی کے مردانے میں "مجرا" ہو رہا ہے۔ مجرے کا لفظ میں نے پہلی بار سنا تھا اس لئے تعجب سے سکینہ کا منہ تکنے لگی۔ تب اس نے مجھے سمجھایا کہ شہر سے آئی ہوئی ایک کنجری آج حویلی میں ناچ رہی ہے۔ یک لخت جیسے آسمان ٹوٹ کر میرے سر پر آن پڑا اندیشوں کے دیو خوش فہمی کے پردے چاک کرکے میرے سامنے آکھڑے ہوئے یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ میرے شوہر کے مشاغل میں طوائف نوازی بھی شامل ہے مگر وہ حویلی میں رقص و سرود کی محفل جمائیں گے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا انہیں میری ذرہ پرواہ نہ رہی تھی۔ رات گئے تک میں انگاروں پر لوٹتی رہی جب وہ شراب کے نشے میں دھت کمرے میں داخل ہوئے تو وال کلاک کا گھنٹا دو بجے کا اعلان کر رہا تھا میں نے روشنی کی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے جیسے انہیں توقع ہو کہ میں کچھ کہوں گی۔

میں دبے لہجے میں بولی "اگر آپ اپنی دلچسپیاں حویلی کی چار دیواری سے دور رکھیں تو زیادہ مناسب ہے۔"

وہ جیسے بہانہ ڈھونڈ رہے تھے پھٹ پڑے "تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی؟"

"آپ کی بیوی" میں نے مستحکم لہجے میں کہا

"بند کرو یہ بکواس تو بیوی کہلانے کے لائق نہیں تجھ میں اور اس طوائف میں اگر کوئی فرق ہے تو اتنا کہ وہ جھوٹی نہیں۔"

میری نگاہوں میں کمرا گھومنے لگا خود کو گرنے سے بچانے کے لئے جلدی سے ان کی پائنتی بیٹھ گئی۔ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میرے ہونٹوں سے نکلی۔ "واصف آپ اپنے حواس میں نہیں جو اپنی بیوی کو طوائف کہہ رہے ہیں۔"

وہ چیخے "ہوش میں ہی تو آیا ہوں ثناء بی بی' کیا معلوم تھا کہ جسے ہیرا سمجھ کر گندی نالی سے اٹھایا ہے وہ گندی نالی ہی کی چیز ہے۔"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا چیخ کر بولی "خدا کے لئے واصف اب ایک لفظ اور نہ کہنا ورنہ............"

"ورنہ کیا؟" وہ مجھ سے بھی بلند آواز میں گرجے "یہی کرو گی نا کہ اپنے اس یار کے ساتھ بھاگ جاؤ گی جس کی جدائی تم اس گھر میں قید کی طرح کاٹ رہی ہو۔"

خدا جانے کیسے میں نے اپنے اندر وہ سب کچھ سننے کا حوصلہ پیدا کر لیا۔ وہ کہتے گئے اور میں سنتی گئی الفاظ کو اس قدر سفاک اور سماعت کو اس قدر گھائل میں نے کبھی نہیں پایا۔

واصف نے نہایت زہریلے لہجے میں مجھ پر بدکرداری کا الزام لگایا اور کہا کہ نہ صرف میرا ماضی گناہ آلود تھا بلکہ حال بھی اس کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے۔ میں اب بھی لاہور جاتی ہوں تو اپنے پرانے عاشق کو داد عیش کا موقع فراہم کرتی ہوں۔ انسان واقعی سخت جان ہے یہ سب کچھ سن کر بھی میں زندہ رہی یہ اور بات ہے کہ یہ زندگی ایک سسکتے کی سی تھی بے رنگ و بو بے لمس و بے صدا کئی روز میں اس سکتے سے باہر نہ نکل سکی۔ تیر تو ایک ہی بار سینہ چھلنی کر دیتے ہیں لیکن الفاظ کے تیر خیال کی کمان سے نکل کر بار بار روح کو

چھیدتے رہتے ہیں۔ میں بیٹھی رہتی اور سوچتی رہتی واصف نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ واقعی ایسا ہوا ہے یا میں محض ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں جانتی تھی واصف نے میرے جس عاشق کا ذکر کیا ہے وہ سلیم ہے۔ سلیم کے نام کے سوا میرے ماضی کی چادر پر نام لینے کو آلائش نہیں تھی۔ جہاں تک عدنان کا تعلق ہے وہ میرا ماموں زاد تھا اور اس سے میری منگنی متوقع تھی لیکن میں کوشش کے باوجود کبھی اس سے بے تکلف نہ ہو سکی اس سے ملتے وقت مجھ پر ہمیشہ ایک ناروا سنجیدگی طاری رہی۔ کسی کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ ایک وقت آیا تھا میں نے عدنان کی حوصلہ افزائی کی شعوری کوشش کی لیکن فطرت کے دھارے میں اکتسابی دلچسپی کے اس پتھر کا کچھ پتہ نہ چلا۔ "سلیم اور صرف سلیم" میرے دل کی گواہی تھی کہ میرے آشیاں میں بھڑکنے والی آگ کی چنگاری اسی نام سے اڑی ہے۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے واصف کے اپنے ذرائع تھے یقیناً کسی طرح اسے پتہ چل گیا تھا کہ شادی سے پہلے میرا نام سلیم کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اس کے شکی ذہن نے اس واقع کو مخصوص پس منظر میں دیکھا تھا اور بالآخر مجھے ایک طوائف کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ اگر اس واقع میں میرے لئے کوئی پہلو کم ترین سطح پر مثبت ہو سکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ میری بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر واصف نے رقص و سرود کی محفل میں غم غلط کرنا چاہا تھا اور میری بے راہروی کا صدمہ اسے ایک طوائف کے پہلو میں لے گیا تھا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا تھا واصف کا انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اسے میرے "گھناؤنے" ماضی سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اس الزام کو اپنی عیاشیوں کے لیے جواز بنا رہا تھا۔ اس واقعہ کا یہی پہلو میرے لئے سب سے اذیت ناک تھا۔ اس بے حسی پر میں جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ کوئی ایک ماہ بعد کی بات ہے میرا بھائی پرویز مجھے لینے کے لئے جھنگ آیا اس نے بتایا کہ امی جان بیمار ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو میں آپ کو لے کر آؤں۔ میں نے شام کو واصف سے ذکر کیا اور انہیں کہا کہ وہ مجھے لاہور لے جائیں انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے کہ لاہور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی اور پرویز کو واپس بھیج دیا۔ آٹھ دس روز بعد پھر ٹیلی گرام آگیا کہ امی جی کی حالت بہت خراب ہے وہ بار بار مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں نے ٹیلی گرام واصف کے سامنے رکھ دیا انہوں نے ناک بھوں

چڑھاتے ہوئے کہا "میری ماں بھی تو بیمار ہے تمہارے گھر والے کہتے ہیں مکر کئے پڑی رہتی ہے ان کو ذرا احساس ہونا چاہئے کہ بیماری سب کو آسکتی ہے" میں نے تعجب سے کہا "واصف اس گھر میں کسی نے ایسی بات نہیں کی آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ دھاڑے "کچھ بھی ہے تم لاہور نہیں جاؤ گی بلکہ اس حویلی سے باہر نہیں جاؤ گی یہ میرا حکم ہے۔"

واصف کا لہجہ اور انداز مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا مجھ پر دھیرے دھیرے اور بتدریج یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ میں اس چاردیواری میں قید کر دی گئی ہوں اور پھر میری زندگی کا وہ منحوس ترین دن طلوع ہوا جب میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ ہاں وہ میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔ ایک طرف میں اپنی ایک عزیز ترین ہستی سے محروم ہوئی دوسری طرف میرے اختیار مان اور وقار کا خون ہو گیا۔ میں اس حویلی میں ایک دھتکاری پھٹکاری ہوئی بے وقعت شے بن کر رہ گئی۔ صبح نو بجے کے قریب ملازمہ ایک ٹیلی گرام لے کر آئی۔ ٹیلی گرام دیکھتے ہی جیسے میرا دل رونے لگا میری نظر ٹیلی گرام کی تحریر سے ملی اور میں اپنی پیاری امی جی سے بچھڑ گئی وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ آنے کے لئے جا چکی تھیں۔ میرے سر اور ان کی گود کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روئی اور بہت روئی لیکن ابھی مجھے اور بھی رونا تھا۔ میں ماں کا آخری پیار نہ لے سکی تھی ان کی منتظر آنکھوں کو اپنی صورت نہ دکھا سکی تھی مگر یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ میں انہیں سفر آخرت پر رخصت بھی نہ کر سکوں گی ان کی پیشانی کو الوداعی بوسہ بھی نہ دے سکوں گی۔

یہ جان کر مجھے تکلیف اور حیرت ہوئی کہ حویلی میں سے کوئی بھی لاہور جانے کا پروگرام نہیں رکھتا۔ واصف اس روز کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے دیور شجاع سے کہا کہ وہ مجھے لاہور لے جائے مگر اس نے کہا کہ امی جان کی طبیعت آج خراب ہے اس کا ان کے پاس رہنا ضروری ہے۔ میں نے واصف کے ملازم خاص اور ذاتی محافظ رب نواز کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ مجھے جیپ پر سٹیشن تک چھوڑ آئے اس نے دبے لہجے میں کہا "بیگم جی جیپ دو دن سے خراب پڑی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا کسی تانگے کا انتظام کر دو۔"

وہ بولا "بیگم جی بات دراصل یہ ہے کہ زمیندار شباب کے بندے آج کل جیل

توڑ کر بھاگے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب بڑی احتیاط کر رہے ہیں' انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہ جائے۔"

میں نے غور سے رب نواز کی طرف دیکھا' وہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا "بیگم جی! میں مجبور ہوں' چودھری صاحب کی اجازت کے بغیر آپ اس حویلی سے باہر نہیں جاسکتیں۔ اگر آپ ایسا کریں گی تو مجھے آپ کو روکنا پڑے گا۔"

میں نے چیختے ہوئے کہا "رب نواز' کہاں ہیں تمہارے چودھری صاحب؟"

رب نواز نے اپنی افسردہ نگاہیں اٹھائیں اور بولا "مجھے معلوم نہیں بیگم جی" اس روز مجھے اندازہ ہوا قفس اور پرندے کا استعارہ کیا ہے' صیاد اور زنجیر کی تشبیہیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ میں اس سنگی حویلی میں اپنی ماں کے آخری........ قطعی آخری دیدار کے لئے تڑپ تڑپ گئی۔ ایک ایک شخص کو واسطہ دیا' ایک ایک دیوار سے سر ٹکرایا لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہیں۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوئی لیکن واصف واپس نہیں آئے۔ جو شخص میرے زنداں کی کلید رکھتا تھا نہ جانے کن مصروفیتوں میں کھو گیا تھا.........

آخر وہ دن گزر گیا اگلے روز میں اپنی خواب گاہ میں نیم جان پڑی تھی کہ باہر سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں۔ یہ میرے بھائی تنویر کی آواز تھی۔ میں جلدی سے باہر نکلی۔ بھائی کی صورت دیکھ کر چیخ نکل گئی ایک دوسرے سے لپٹ کر ہم خوب روئے۔ تنویر غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آنے سے زبردستی روکا گیا ہے۔ وہ بلند آواز سے کہنے لگا۔

"چل مری بہن' میں تجھے لے کر جاؤں گا' دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے۔"

"بابو تنویر صاحب' ہمارے لئے آپ بھی اتنے ہی قابل عزت ہیں جتنے چودھری صاحب۔ خدا کے لئے مسئلہ کھڑا نہ کیجئے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ بیگم جی اپنی والدہ کی شکل نہ دیکھ سکیں' یہ ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ اب آپ انہیں لے جانے کی ضد نہ کریں چودھری صاحب نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ........"

"کیا چودھری صاحب........ چودھری صاحب" تنویر غصے سے بولا "اس شخص کی ہٹ دھرمی ہماری ماں کی جان لے گئی۔ وہ اپنی بیٹی کی صورت کو ترستی ہوئی مر گئی۔ اب کیا

چاہتا ہے وہ؟"

تنویر کی بلند آواز کے ساتھ ہی مردانے کی طرف بالکونی کا دروازہ کھلا اور میں وہاں واصف کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ نہ صرف گھر تھے بلکہ یہاں ہونے والی ساری گفتگو بھی سن رہے تھے۔ سگار پیتے دھیمے قدموں سے نیچے اتر آئے اور بغیر کسی علیک سلیک کے تنویر سے بولے "کیا بات ہے؟"

تنویر نے غصے سے کہا "واصف صاحب آپ گھر میں تھے؟"

"ہاں گھر میں تھا" انہوں نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"کب سے؟"

"کل شام سے۔" وہ طیش آمیز لاپرواہی سے بولے۔

"اس کے باوجود آپ........ ثناء کو لے کر نہیں آئے۔"

"تو تم اسے لینے آئے ہو!" انہوں نے حد درجہ غیریت سے کہا۔

"جی ہاں۔"

وہ تنویر کی طرف انگلی اٹھا کر سرد لہجے میں بولے "چلے جاؤ یہاں سے' میں کہتا ہوں نکل جاؤ میرے گھر سے' میں اس طرح بولنے والوں کی زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔"

تنویر نے کہا "اگر میں نہ جاؤں تو؟"

وہ روانی سے بولے "تو میں تمہاری ٹانگیں تڑوا کر سڑک پر پھنکوا دوں گا۔"

"واصف صاحب' آپ ہوش میں تو ہیں؟" تنویر غصے سے بری طرح لرز رہا تھا۔

واصف دھاڑے میں کہتا ہوں "چلے جاؤ' گیٹ آؤٹ........ اور پھر تمہارے گھر کے کسی فرد نے اس حویلی کی طرف منہ کیا تو جان سے جائے گا۔"

واصف کے لہجے نے میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ کچھ کہنا چاہا لیکن فرط جذبات سے زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ نہ جانے کب تک وہاں پڑی سسکتی رہی آخر دوپہر کے وقت ملازمہ نے آکر اٹھایا اور اس کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ واصف نے تنویر کو دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔

میکے سے اب میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی وہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں کیا کر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی جھنگ پہنچا بھی تو واصف نے

اسے مجھ سے ملنے نہیں دیا۔ حویلی میں میری زندگی دن بدن اجیرن ہوتی جا رہی تھی۔ اگر کہیں کہ میں ایک قابل نفرت قیدی کی زندگی بسر کر رہی تھی تو بے جا نہ ہو گا۔ واصف کا کردار اب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ان کا رویہ مجھ سے زر خرید کنیز کا سا تھا۔ مجھے ان سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ دن کیسے گزارتے ہیں رات کہاں بسر کرتے ہیں اگر وہ کسی رات میرے پاس چلے آتے تو یہ ان کی عنایت ہوتی ورنہ میں تنہا سوچوں کی سولی پر لٹکتی رہتی۔

میں سوچتی تھی ابھی میں جوان ہوں پر کشش ہوں شادی کو صرف آٹھ دس ماہ ہوئے ہیں۔ جب حالات بدل جائیں گے واصف کے غضب اور میرے جرم بے گناہی کے درمیان میری جسمانی دلکشی بھی حائل نہ رہے گی تو میرا انجام کیا ہو گا۔ پھر میرے ذہن میں جاگیرداروں اور وڈیروں کے وہ روایتی قصے گردش کرنے لگتے جن میں بتایا جاتا ہے کہ ایسے لوگ جب اپنی عورتوں سے اکتاتے ہیں تو انہیں سوکنوں کا زہر پلا دیتے ہیں۔ وہ گھٹ گھٹ کر اور سسک سسک کر مرجاتی ہیں یا زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو سچ مچ انہیں زہر دے دیتے ہیں اور ان کی لاش کو پورے خاندانی اعزاز کے ساتھ آبائی قبرستان کی زینت بنا دیتے ہیں۔ میں ڈر کر سوچنے لگتی کیا میرے ساتھ بھی عنقریب ایسا ہی ہونے والا ہے.......... دھیرے دھیرے بے خبری کے پردے چاک ہو رہے تھے۔ درحقیقت میری شادی نہیں ہوئی تھی' میری بدقسمتی مجھے رشتے کی زنجیر سے باندھ کر ایک عیاش اور بے رحم شخص کے حرم میں لے آئی تھی۔ درست ہے کہ میں اس حرم کی پہلی عورت تھی لیکن آخری نہیں تھی۔ عنقریب کوئی رقاصہ کوئی اداکارہ کوئی نوخیز طالبہ کوئی ماڈل گرل یا کوئی بھی خوش جمال عورت اس حرم میں قدم رنجہ فرمانے والی تھی۔ ابھی کچھ نہیں ہوا تھا لیکن میرے احساس کے آئینے میں آنے والے دنوں کی ہولناکی اور حرماں نصیبی جھلک رہی تھی۔

ایک روز ملازمہ سکینہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک "بیلف" چند پولیس والوں کے ہمراہ مجھے حویلی سے برآمد کرنے آیا ہے۔ میں حیران و پریشان سکینہ کی باتیں سنتی رہی اس نے بتایا "بیگم جی! آپ کے بھائیوں نے عدالت میں کیس کیا ہے کہ ان کی بہن کو اس کے سسرال نے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ اب عدالت کے حکم پر بیلف آپ کو لینے آیا ہے'

تاکہ جج کے سامنے آپ کا بیان لیا جائے۔ وہ لوگ بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ بیلف کہتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ لاہور جائیں گی' کل رات دارالامان میں رہیں گی اور پرسوں صبح عدالت میں آپ کا بیان ہو گا' چودھری صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس طرح ہماری بدنامی ہے میں خود بیوی کو لے کر لاہور پہنچتا ہوں' آپ مجھ پر بھروسا کر کے واپس چلے جائیں۔ بیلف مانتا نہیں۔ اس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔"

پھر سکینہ نے ادھر ادھر دیکھا اور اچانک آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "بیگم جی رب کا واسطہ اس حویلی سے اپنی جان چھڑا لیں' بھوک ننگ میں گزارا کر لیں بھائیوں کی باتیں سن لیں لیکن اس قید سے نکل جائیں۔ آپ بڑی معصوم ہیں ان لوگوں میں بے موت ماری جائیں گی۔"

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ابھی ہم باتیں کر رہی تھیں کہ واصف آ گئے۔ سکینہ کو باہر بھیج کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ میں "صم بکم" کی تفسیر بنی پلنگ پر بیٹھی رہی۔ کوئی سوال پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کوئی پر جلال حاکم کسی مجرم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ آخر ان کے بے قرار قدم رکے اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولے۔

"ثناء تمہیں معلوم ہے تمہارے بھائیوں نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں رٹ کی ہے کہ میں نے تمہیں حبس بیجا میں رکھا ہوا ہے' اب کورٹ نے تمہارا بیان لینے کے لئے تمہیں جج کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "اب کیا چاہتے ہیں آپ؟"

وہ سگار سلگا کر بولے "یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر تم آزاد ہونا چاہو تو ہو سکتی ہو..........؟"

میرے سر پر جیسے بجلی گر پڑی "طلاق.......... کیا میں واصف سے طلاق لوں گی؟" نہیں.......... ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ طلاق میرے لئے موت سے بدتر تھی۔ شاید ہر مشرقی عورت ایسا ہی سوچتی ہے کم از کم میرے لئے تو طلاق اور موت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ کہ اول الذکر موت ذلت آمیز تھی' اور میں یہ ذلیل موت مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ٹھیک تھا کہ یہ گھر میرے لئے جہنم تھا لیکن میرا گھر تو

تھا.......... کبھی کبھار ہی سہی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا ادھر آنکلتا تھا اور کیا معلوم تھا کب میرا مجازی خدا مجھ پر مہربان ہو جاتا اور مجھے اس جہنم سے نکال دیتا۔ امکانات کم ضرور تھے لیکن معدوم نہیں ہوئے تھے.......... اس رات میں نے بہت سوچا اور آخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اپنے مجازی خدا کو اسی وقت چھوڑوں گی جب حقیقی خدا کا بلاوا آئے گا۔

اگلے روز ہم بذریعہ سڑک جھنگ سے لاہور روانہ ہوئے۔ ہماری مرسڈیز میں بیلف اور میرا ایک چچازاد بھائی بھی موجود تھا۔ وہ بیلف کے ساتھ ہی آیا تھا۔ غالباً بیلف کی جیب گرم کی جاچکی تھی ورنہ وہ مجھے اپنے طور پر لاہور لے جانے کا پابند تھا۔ یہ رات ہم نے لاہور میں واصف کے ایک دوست کے گھر گزاری۔ اگلے روز مجھے کورٹ میں پیش کیا گیا۔ میرے بھائی ماموں نانا اور دوسرے قریبی عزیز وہاں موجود تھے ان سب کی نگاہیں میرے چہرے پر لگی تھیں۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ میرے شریک غم ہیں۔ مجھے آزاد کروانے کے لئے انہوں نے جدوجہد کی ہے۔ بھاگے دوڑے ہیں' پیسہ خرچ کیا ہے اپنی راتوں کی نیند حرام کی ہے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ میرے ہونٹ اس انداز سے ہلیں کہ میرے پاؤں کی زنجیریں پگھل جائیں۔ مَیں ایک بااثر جاگیردار کی قید سے آزاد ہو کر ان کے درمیان آجاؤں.......... لیکن دل کی عدالت میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہ زنجیریں ہی میرا گہنا تھیں۔ میں نے بھری عدالت میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہا کہ میں یہ بیان بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اپنی مرضی سے دے رہی ہوں۔ میرا شوہر مجھ پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔ میں اپنے گھر خوش ہوں۔ اور علیحدگی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ ایک عاقل وبالغ لڑکی کا بیان تھا۔ جج نے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میں چادر کے پلو میں آنسو چھپاتی اپنے خیرخواہوں کے ستے ہوئے چہروں سے نظر چراتی واصف کے ساتھ کورٹ سے باہر آگئی۔

میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دئے تھے۔ اپنے حق مزاحمت سے دستبردار ہو گئی تھی.......... اس امید پر اپنی ناؤ جلا دی تھی کہ سمندر میں واپس دھکیلنے والے کو مجھ پر رحم آجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ واصف کا رویہ کچھ دن ہی مجھ سے ٹھیک رہتا تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتی کہ وقتی طور پر سہی اسے میری وفاداری کا یقین آیا ہے اور اس کے دل میں میرے لئے رحم جاگا ہے لیکن اس کی بے مہریوں کا تو ٹھکانا ہی نہ تھا۔ حویلی

پہنچتے ہی اس نے آنکھیں بدل لیں۔ جیسے یہ سب کچھ میرا مقدر ہو۔ اس نے اس بات کو ذرا بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ تہہ دل سے مجھے حقیر جانتا ہے اور جانتا رہے گا۔

میرے ساتھ اس کا رویہ سخت تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے جھڑکیوں سے آگے بڑھ کر مجھے مارنے کی ابتدا کر دی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سہتی رہی اور رات کی تنہائیوں میں رو رو کر قادر مطلق سے مشکل کشائی کی دعائیں کرتی رہی۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ شاید میں نے بھائیوں کو جھٹلا کر اور خاوند کے حق میں بیان دے کر غلطی کی ہے۔ پتہ نہیں وہ میرے لئے کیا کیا کوششیں کرتے رہے تھے۔ وہ واصف کے مقابلے میں کمزور تھے اس لئے انہوں نے قانون کا سہارا لیا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے ساتھ انہوں نے واصف کے لامحدود وسائل سے ٹکرانے کی کمزور سی کوشش کی تھی جسے میں نے اپنے بیان سے بے اثر کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں سچے قرار پا گئے تھے۔ ممکن ہے اب بھی کبھی کبھی ان کے دل میں آتا ہو کہ میں نے جو کچھ کہا بہ امر مجبوری کہا اور انہیں میرے لئے مزید کوشش کرنا چاہئے لیکن ان میں اتنی استطاعت تھی اور نہ طاقت کہ وہ ضمیر کو اور مطمئن کر سکتے۔ اس لئے انہوں نے اتنے ہی "اطمینان" پر اکتفا کر لیا تھا اور خاموش ہو گئے تھے۔ سوچوں کی یلغار ہوتی تو دل بے قرار ہو کر گھائل پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ جی چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بابل کے آنگن میں پہنچ جاؤں اپنے ماں جایوں کی صورتیں دیکھوں۔ ان کے بچوں کے منہ چوموں' ان گلیوں کو دیکھوں جہاں بچپن گزارا تھا۔ ان سہیلیوں سے ملوں جن سے بچھڑے زمانہ ہو گیا.......... لیکن پھر حویلی کی بلندوبالا دیواریں اور ان کے باہر کھڑے مسلح پہریدار نگاہوں میں گھوم جاتے۔ وسیع وعریض خواب گاہ میں دم گھٹنے لگتا اور میں گھبرا کر اس کھڑکی کے پٹ کھول دیتی جو مشرق کی طرف کھلتی تھی.......... میرے میکے کی طرف' میری جنم بھومی کی طرف..........

وہ بہار کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ وسیع لان کے پھول بوٹوں پر نرم دھوپ کی مہربان انگلیاں سرسرا رہی تھیں۔ میں خیالوں میں گم خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اچانک میری نظر سلیم پر پڑی.......... ہاں میں نے سلیم کو دیکھا وہ مجھ سے صرف دس گز کے فاصلے پر کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں

آیا۔ میں نے گھبرا کر پیشانی مسلی اور دوبارہ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا قریب آکر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے ایک دم چکر سا آگیا۔ کھڑکی بند کر کے میں حیران و پریشان صوفے پر آبیٹھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی' میری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے۔ کیا وہ سلیم کا کوئی ہم شکل تھا۔ مگر اس کے دیکھنے کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ سلیم ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کھڑکی کے پٹ ملے اور میں نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا کہ سلیم کود کر کمرے میں آگیا۔

"کک.......... کون ہو تم؟" میں نے شدید خوف کے عالم میں پوچھا۔

وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکی کی چٹخنی وہ پہلے ہی چڑھا چکا تھا۔ اب میں اور وہ اس خواب گاہ میں بالکل تنہا تھے۔

"تت.......... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے خوف کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے کندھے کے نیچے سے تھام لیا۔ گرفت میں ایسی بات تھی کہ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مجھے بے حرکت دیکھ کر اس نے گرفت ختم کی اور اپنی بڑی بڑی ناراض آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر بولا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" میں جیسے ہوش میں آتی ہوئی بولی۔

وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "مجھے سب معلوم ہے ثنا" وہ عجیب بے تکلفی سے بولا "تم اس گھر میں بیوی کی نہیں' قیدی کی زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں اس چودھری کی جیل سے نکالنے آیا ہوں.......... اور نکال کر رہوں گا.......... چلو میرے ساتھ۔"

اچانک میرے جسم پر طاری لرزا معدوم ہوگیا اور میں خود کو ایک مضبوط عورت محسوس کرنے لگی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں میں نے کہا "تم مجھے یہاں سے لے جاسکو گے؟"

وہ قہر بھرے انداز میں بولا "میں دیکھتا ہوں' تمہیں لے جانے سے مجھے کون روکتا ہے؟ آج تک ان چودھریوں کو کسی بندے سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ ایک ایک کو سبق نہ

سکھادوں تو نام نہیں" سلیم کا لہجہ خوفناک حد تک سچا تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس حویلی میں ایک طوفان کھڑا کر دے گا اور وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ میں جانتی تھی وہ خالی ہاتھ بھی بہت کچھ کر سکتا ہے اور اس وقت تو اس کے نیفے میں پستول بھی تھا جس کی ایک جھلک میں نے اس وقت دیکھی تھی جب وہ کھڑکی سے کودا تھا۔

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے" میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم مجھے یہاں سے نہیں لے جاسکتے۔ کیونکہ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی.......... اور اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً" یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو میں ملازموں کو آواز دوں گی اور ان کے حصے میں تمہارا ایک ایک ٹکڑا بھی نہیں آئے گا۔ اس کو لاہور نہ سمجھنا۔ یہ جاگیردار واصف کی حویلی ہے۔ یہ لوگ ٹانگیں چیر کر شکاری کتوں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔"

میرے مخالفانہ رویئے اور تند لہجے نے سلیم کو ششدر کر دیا لیکن صرف ایک لمحے کے لئے' دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا غصیلا پن پھر عود کر آیا۔ اس نے مخصوص انداز میں گردن جھٹک کر بال پیشانی سے ہٹائے اور بولا "تم زیادہ نیک پروین نہ بنو اور چلو میرے ساتھ۔ مجھے سب پتہ ہے یہاں تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ کسی دن چودھری گلا گھونٹ کر تمہیں صحن میں گاڑ دے گا۔"

میں پھنکاری "وہ میرا گلا گھونٹے یا ٹکڑے کرے' میرا شوہر ہے اور خبردار اب اس کے متعلق ایک لفظ کہا تو.......... میں آخری بار کہہ رہی ہوں اپنی یہ منحوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میرا تم سے واسطہ نہ کبھی تھا اور نہ ہے۔ اور اگر اتفاقاً کوئی رسمی تعلق پیدا ہوا بھی تھا میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔ اب چلے جاؤ یہاں سے" آخری فقرے کے بعد میری انگلی کھڑکی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر مڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور اسے کھول کر باہر نکل گیا۔ جب تک وہ سر جھکائے صحن سے باہر نہیں نکلا میری نظریں اس پر لگی رہیں۔ اس کے جانے کے بعد میں کمرا بند کر کے دیر تک روتی رہی۔ پردیس میں دیس کو جانے والے راستے بھی اچھے لگتے ہیں' یہ تو پھر جیتا جاگتا شخص تھا۔ یہ شخص میرا کچھ نہیں تھا لیکن ان گلیوں سے آیا تھا جہاں میرا گھر تھا اور میری زندگی کے بیس برس تھے۔ وہ اکیلا آیا تھا لیکن اس کے ساتھ ایک پورا شہر اور پورا دور چلا

آیا تھا۔ ان گنت زخموں کے منہ کھول گیا تھا یہ شخص۔ میں سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی کہ وہ مالی کے بھیس میں کیونکر حویلی کے اندر پہنچ سکا۔

وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ دن چڑھے نیند آئی اور پھر میں دوپہر تک سوتی رہی۔ جاگی تو کل کی ساری باتیں خواب لگ رہی تھی۔ اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے' باتھ روم سے باہر نکلی تو سکینہ کمرے کی صفائی کرکے چیزوں کو قرینے سے رکھ رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں اس نے کھول دی تھیں۔ میری نظر سب سے پہلے مشرقی کھڑکی کی طرف گئی اور یہ دیکھ کر میں مبہوت رہ گئی کہ سلیم کل والے لباس میں کھڑا اطمینان سے پودوں کی تراش خراش میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ حویلی کا سب سے پرانا مالی بابا فخری بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا بابا اسے باغبانی کے گر سکھا رہا تھا۔ میں نے سکینہ سے کہا کہ بابا فخری کو بلا۔ سکینہ کی آواز پر بابا بھاگتا ہوا آیا۔ مجھے کھڑکی میں کھڑے دیکھ کر اس نے جھک کر سلام کیا اور اپنے مخصوص انداز میں ناف پر ہاتھ رکھ کھڑا ہوگیا۔ میں نے کہا۔

"بابا یہ نیا مالی کون ہے؟"

بابا نے بتایا "بیگم جی! بڑا بھلا مانس لڑکا ہے۔ پندرہ بیس روز سے ڈیرے پر کام کر رہا تھا۔ گھوڑوں کو دانا پٹھا ڈالتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اپنے ساتھ مالی کے کام پر لگالو۔ میں نے کہا چلو۔ ہمت والا لڑکا ہے' ہاتھ بٹائے گا۔ بیگم جی' کل اس اکیلے نے پچھواڑے کی ساری گراؤنڈ کاٹی ہے۔ بیل کی طرح کام کرتا ہے جی........"

بابا فخری دیر تک سلیم کی تعریفیں کرتا رہا۔ سلیم ایک دوبار کن انکھیوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میرے دل میں آئی کہ بابا فخری سے کہوں کہ اس لڑکے کو یہاں نہ لایا کرے لیکن پھر مختلف اندیشوں نے مجھے یہ بات کہنے سے روکے رکھا۔

اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے روز سلیم زنان خانے کے لان میں نظر آنے لگا۔ اس کا لباس ایک میلے سے دھوتی کرتے پر مشتمل تھا۔ ویسا ہی میلا سا صافہ اس کے گلے میں جھولتا رہتا۔ میں نے اس کے چہرے پر ہر وقت گہری سنجیدگی طاری دیکھی۔ لگتا تھا وہ اپنے غضب کا آتش فشاں چھپائے پھر رہا ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ اس کا

سامنا نہ ہو۔ ہاں کبھی کبھی کھڑکی یا دروازے کی اوٹ سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی۔ ایک روز میں نے اسے لان کی گھاس کاٹتے دیکھا۔ دستی مشین وہ اتنی جھلاہٹ کے ساتھ دھکیل رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر رب نواز اس کی طرف نکل آیا۔ اس نے سلیم کو ڈانٹ کر کہا۔

"تمہیں گھاس کاٹنے کا بھی ڈھنگ نہیں۔ زور لگا کر ولایتی مشین کا ستیاناس کر رہے ہو۔"

اتنے میں واصف بھی مردانے کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آج تعطیل تھی اور وہ ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھے۔ "کیا بات ہے؟" انہوں نے رب نواز سے پوچھا؟

رب نواز نے وہی کہا جو ابھی سلیم سے کہا تھا۔ واصف نے بازپرس کے انداز میں سلیم سے کچھ کہا' جس کا جواب سلیم نے نجانے کیا دیا کہ واصف حسب عادت پھٹ پڑے۔ "الو کے پٹھے جواب دیتا ہے' آگے سے بحث کرتا ہے" ایک قدم بڑھ کر انہوں نے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ میں نے دیکھا سلیم کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ صافہ جو اس نے سر پر باندھ رکھا تھا کھل کر گھاس پر جاگرا۔ واصف بدستور گرج رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے' دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

اتنے میں بابا فخری ایک طرف سے بھاگتا ہوا آگیا اور واصف کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا کہ ناسمجھ لڑکا ہے۔ اسے معاف کر دیں' پھر وہ سلیم کو ڈانٹتا پھٹکارتا باہر لے گیا۔

مجھے اس واقعہ سے دکھ ہوا کیونکہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا' مگر عجیب طرح کی خوشی بھی ہوئی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ شاید اب سلیم یہاں سے واپس چلا جائے۔ اس کی موجودگی مجھے ہر وقت بے نام اندیشوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ کبھی اس خیال سے دل میں ہول اٹھتا کہ سلیم' واصف کو کوئی نقصان نہ پہنچا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرسکتی کیونکہ میں حویلی میں اس کی موجودگی کے باوجود چپ تھی۔ پھر دل کہتا' نہیں سلیم ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ کبھی سوچتی کہ سلیم کا راز کھل گیا تو بات نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ ایسی صورت میں سلیم کے ساتھ ساتھ میں بھی واصف کے عتاب کا

شکار ہوتی۔ کسی وقت میں یہ فیصلہ کرلیتی کہ اپنا اختیار استعمال کرکے سلیم کی یہاں سے چھٹی کروا دوں گی۔ تب مجھے اس کے غصیلے پن کا خیال آتا اور سوچتی نہ جانے وہ طیش میں کیا کرے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد مجھے امید پیدا ہو چلی کہ سلیم یہاں سے چلا جائے گا۔

انہی دنوں میرے پہلے بچے کی پیدائش کا وقت قریب آگیا اور میں زچگی کے لئے ایک دوسرے کمرے میں منتقل ہوگئی۔ ایک اسپیشلسٹ لیڈی ڈاکٹر ہر وقت میرے پاس رہتی تھی۔ اس نے مجھے بستر اور باتھ روم تک محدود کر چھوڑا تھا۔ ان دنوں حویلی میں کیا ہوتا رہا مجھے معلوم نہیں۔ یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ سلیم یہاں سے جاچکا ہے یا نہیں........

ایک تکلیف دہ رات کی صبح' میرے وجود کی وساطت سے ایک نیا وجود دنیا میں آیا۔ یہ میرا بیٹا فرحان تھا۔ جب اپنے پہلو میں میں نے اس کا ننھا سا وجود دیکھا اور اس کے ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما تو تحفظ اور اعتماد کے احساس سے روح سرشار ہوگئی۔ فخروانبساط کی غیر مرئی لہروں نے جسم کے ریشے ریشے کو چھولیا اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ جو ایک ایسی بیوی کی آنکھ سے ٹپکے تھے جو آبلہ پا بھاگتی ہوئی "ماں" کی منزل تک پہنچی تھی۔ میں نے اپنے بچے کو پہلو سے لگا کر بھینچ لیا۔

فرحان کی پیدائش پر حویلی میں حسب رواج خوشی کا اظہار کیا گیا۔ دیگیں پکائی گئیں........ خیرات تقسیم ہوئی اور رقص و سرود کی محفلیں بھی جمیں لیکن خوشی وشادمانی کے ان تمام ہنگاموں میں کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جس کا تعلق میرے بیس سالہ ماضی سے ہو۔ سب چہرے اپنے تھے لیکن سب غیر تھے........ ہاں ایک چہرہ........ صرف ایک چہرہ ان میں مختلف تھا۔ چہروں کی اس تاریک بھیڑ میں وہ چہرہ کبھی کبھی روشن لکیر کی طرح چمک جاتا تھا۔ یہ سلیم کا چہرہ تھا۔ یہ چہرہ اس لئے مختلف تھا کہ اس پر نمائشی مسرت کی مٹھاس نہیں تھی۔ حقیقی اندوہ کی تلخی تھی۔ وہ اپنی تمام تر تلخی اور اسراریت کے ساتھ ابھی تک حویلی میں موجود تھا۔ پوری حویلی میں صرف میں جانتی تھی کہ وہ موجود ہے اور صرف وہ جانتا تھا کہ میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہوں۔

بچے کی پیدائش کے بعد حالات قدرے تبدیل ہوئے۔ میری ساس نندوں کے رویئے میں مثبت تبدیلی آئی۔ نئے فرد کی آمد سے گھر میں رونق سی ہوگئی مگر واصف کا رویہ

جوں کا توں رہا۔ قدرت کا یہ خوبصورت انعام پا کر بھی اس نے کسی خاص مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس فرحان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری کا ایک رنگ سا گزر جاتا تھا۔ شاید کسی اور نے محسوس نہ کیا ہو لیکن میں ایک ماں کا دل رکھتی تھی۔ اپنے بچے کی طرف اٹھنے والی مہربان اور نامہربان نگاہ کا فرق فوراً محسوس کرسکتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ واصف کے انداز میں کیا بات ہے جو ایک مطمئن ومسرور باپ کے انداز میں نہیں ہونی چاہئے۔ اگر اس کو رنجشیں تھیں تو مجھ سے تھیں' یہ تو اس کا خون تھا۔ معصوم اور بے گناہ۔ وہ اس سے کھچا کھچا کیوں تھا؟ میرا سیدھا سادھا ذہن سیدھے سادھے انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں ان اندیشوں سے قطعی بے خبر تھی جو عنقریب میری سوچوں پر شب خون مارنے والے تھے۔

ایک دوپہر کی بات ہے' فرحان کو دودھ پلا کر اور سلا کر میں برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ موسم خوشگوار تھا۔ شمال سے چلنے والی مدھم ہوا نہ جانے کہاں سے گہرے سیاہ بادلوں کو ہانک لائی تھی۔ بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی مگر امید تھی کہ جلد ہی ہونے لگے گی۔ میں چہل قدمی کرتی برآمدے کے اس حصے میں چلی گئی جہاں دو اطراف جالی دار پودہ لگا کر برآمدے کو ٹی وی لاؤنج کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس جانب ایک کھڑکی بھی تھی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو سلیم لان کے باغیچے میں گھومتا نظر آیا۔ لباس حسب سابق تھا۔ پانی کے دو بھرے ہوئے ڈول اس کے قریب رکھے تھے۔ وہ کسی دہقان کی طرح بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ پودوں کو پانی دے یا نہ دے اچانک میں نے اسے ٹھٹکتے دیکھا۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ایک فیشن ایبل عورت ایک ملازم کے ساتھ' جو غالباً اس کا ڈرائیور تھا' پورچ سے انیکسی کی طرف جا رہی تھی۔ زاویہ ایسا تھا کہ میں عورت کی شکل نہ دیکھ سکی۔ ہاں سلیم نے یقیناً اسے دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر مالٹے کے پودے کے پیچھے ہوگیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ نہایت واضح طور پر نوٹ کیا۔ سلیم اب بھی پودے کے عقب میں کھڑا تھا۔ میں اتنی دور سے اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ حیران سا ہے۔ جب تک عورت انیکسی کے ایک دروازے سے اندر نہیں چلی گئی وہ وہیں کھڑا رہا پھر اس نے جلدی

جلدی دونوں ڈول گھاس میں الٹائے اور انہیں ہاتھوں میں لٹکائے باہر نکل گیا۔

میں اپنی جگہ کھڑی سوچنے لگی یہ کون عورت ہے جس نے سلیم کو اس طرح چونکنے اور چھپنے پر مجبور کیا ہے۔ پہلا خیال تو یہ آیا کہ شاید یہ واصف کی کوئی ایسی مہمان ہے جس سے پہلے بھی سلیم کا آمنا سامنا ہوچکا ہے۔ وہ کسی تلخ تجربے کے سبب اس کے سامنے نہیں آیا۔ مگر یہ خیال دل کو بھایا نہیں۔ ایک مالی اور واصف کی مہمان عورت کے درمیان کیا ربط ہوسکتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی اور چکر تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کی ٹوہ نہیں لگائی اور نہ دیواروں سے کان لگانے کی عادت رہی مگر اس روز اتفاقاً ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ بہت سی باتیں جو مجھے نہ سننا چاہئیں تھیں میرے کانوں میں پڑگئیں۔ میں دراصل اس عورت کی شکل دیکھنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سٹنگ روم میں گئی ہے۔ سٹنگ روم کے ساتھ ہی ڈرائینگ روم تھا بلکہ یہ دونوں ایک بڑے ہال کی صورت میں مشترک تھے۔ ڈائننگ روم کے ساتھ ہی کچن تھا' جس کا ایک دروازہ اور چھوٹی سی کھڑکی ڈائننگ روم میں کھلتی تھی۔ یہ کچن عام طور پر مقفل رہتا تھا کبھی کوئی خاص مہمان آتے اور ان کے لئے علیحدہ کھانا پکانا مقصود ہوتا تو یہ کچن کھولا جاتا۔ واصف کی الماری کے ایک خانے میں چابیوں کا ایک گچھا پڑا رہتا تھا' میرا خیال تھا کہ اس گچھے میں ایک چابی اس کچن کی بھی ہے۔ اس کچن میں داخل ہو کر سٹنگ روم میں دیکھنا چنداں مشکل نہیں تھا' بشرطیکہ سٹنگ روم اور ڈائننگ روم کو علیحدہ کرنے والا پردہ کھینچانہ گیا ہو۔ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے چابیوں کا گچھا لیا اور ایک طویل راہداری سے ہوتی ہوئی انیکسی کی طرف آگئی۔ تھوڑی سی کوشش سے میں کچن میں داخل ہوگئی۔ اندر تاریکی تھی اور نشست گاہ کی طرف سے باتوں کی آوازیں آرہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دل نے ملامت کی کہ میں کیوں چوری چھپے یہاں چلی آئی ہوں۔ لیکن اس خیال نے سہارا دیا کہ اپنے ماحول سے آگاہی حاصل کرنا میرا حق ہے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اس حویلی میں میرے اردگرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ میرا بچہ ہے۔ اس کی اور اپنی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ میں اطراف سے باخبر رہوں۔

میں یہاں اس عورت کی شکل دیکھنے آئی تھی مگر اندر ہونے والی گفتگو نے میرے قدم پکڑ لئے۔ مجھے کھڑکی کی سلائیڈنگ ڈور کو ہلا کر نشست گاہ میں جھانکنے کی صورت پیش

نہیں آئی کیونکہ تھوڑی سی کوشش سے میں عورت کی آواز پہچاننے میں کامیاب ہوگئی۔ اور اسے پہچاننے کے ساتھ ہی میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ وہ فیشن ایبل فربہ اندام عورت' جسے میں نے ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے دیکھا تھا......... فرخندہ کی پھوپھو نادرہ تھی......... پرنسپل نادرہ' جس کی گاڑی سلیم نے توڑی تھی اور آٹھ ماہ کے لئے جیل چلا گیا تھا۔

یہاں میرا رشتہ درحقیقت میڈم نادرہ ہی کی کوششوں سے ہوا تھا مگر شادی کے بعد جب ہم میاں بیوی میں تنازعہ پیدا ہوا تو میڈم نادرہ نے کسی قسم کا مصالحتی کردار ادا نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتی تو یقیناً مجھے خبر ہوتی لیکن اسے میں شادی کے بعد پہلی بار حویلی میں دیکھ رہی تھی اور وہ بھی واصف کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے۔ اس نے مجھ سے ملنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی......... اندر ہونے والی گفتگو اہم مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ میڈم نادرہ کہہ رہی تھی۔

"چودھری صاحب' آفت لڑکا ہے جی آفت اچھی بھلی شریف گھرانے کی لڑکی کو ورغلالیا۔ سب جانتے ہیں ثنا میں کوئی عیب نہیں۔ یہ وہی حرامزادہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔"

واصف کی آواز آئی "خالہ یہ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ تم نے یہ رشتہ کروایا ہے۔ ورنہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میں کیسے مان لوں کہ جو لڑکی ہوٹلوں میں لڑکوں سے ملتی ہے وہ پاک صاف ہے۔"

میڈم نادرہ نے کہا "سلیم نام ہے اس کمبخت کا' ویگن بھی چلاتا رہا ہے۔ اس کے باپ کی دو تین ویگنیں ہیں۔ ایک نمبر کا آوارہ گرد ہے۔ بلکہ اب تو خطرناک غنڈہ بن چکا ہے۔"

"تم اسے کیسے جانتی ہو؟" واصف کی آواز آئی۔

میڈم نادرہ کی آواز آنے سے پہلے ایک چھوٹا سا وقفہ تھا۔ غالباً اس نے ایک گہری سانس لے کر خیالات مجتمع کئے تھے۔ اس کے بعد وہ واصف کو تفصیل سے سلیم کے متعلق بتانے لگی۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ میڈم نادرہ کی آواز کی مصور کے برش کی طرح دھیرے دھیرے میرے ذہن کے کینوس پر ایک تصویر مکمل

کر رہی تھی۔ واقعات کا تسلسل ایک مکمل کہانی کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔ یہ تلخ کہانی کچھ اس طرح تھی۔

میڈم نادرہ کی گاڑی توڑنے کے واقعہ سے پہلے سلیم میڈم سے اس کے آفس میں ملا تھا۔ وہاں ان دونوں میں تلخ کلامی ہوئی تھی۔ سلیم نے اسے فتنہ پرور عورت قرار دیا تھا' جواب میں میڈم نادرہ نے اسے بے نقط سنائیں تھیں۔ سلیم نے غصے سے بپھر کر کہا تھا "ہاں میں کرتا ہوں پیار اس سے۔ میں دیکھتا ہوں مجھے اس کے ساتھ ملنے سے کون روکتا ہے۔ اسے ڈنکے کی چوٹ پر ملوں گا اور جو میرے رستے میں آئے گا اس سے بھی نپٹ لوں گا۔"

بات بڑھنے سے پہلے اسکول کے ملازمین نے اسے سمجھا بجھا کر دفتر سے نکال دیا تھا۔

درحقیقت سلیم اور پرنسپل نادرہ کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ صورت احوال یہ تھی کہ میڈم نادرہ کا ایک ایسے شخص سے ملنا جلنا تھا جو سلیم کا گہرا دشمن تھا۔ یہ شخص قاسم اعوان تھا۔ قاسم اعوان اور اس کے بھائیوں کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ یہ بہت کینہ پرور لوگ تھے۔ سلیم سے لڑائی کے بعد جب تھانے کچہری تک نوبت پہنچی تھی تو میڈم نادرہ نے اعوانوں کی حمایت میں بہت بھاگ دوڑ کی تھی.......... اس طرح میڈم اور سلیم میں رنجش چلی آرہی تھی۔ لہٰذا جب میڈم نادرہ کو پتہ چلا کہ ثنا سے یعنی مجھ سے آشنائی پیدا کرنے والا لڑکا یہی سلیم ہے تو وہ ضرورت سے زیادہ فعال ہوگئی۔ وہ قاسم اعوان سے مشورے کے بعد ہمارے گھر پہنچی اور امی جی اور بھائیوں کو اس بارے میں بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بعد ازاں اسکول آفس میں اس کی سلیم سے تلخ کلامی ہوئی اور اس تلخ کلامی کے نتیجے میں وہ واقعہ پیش آیا جس میں جزوی طور پر میڈم نادرہ کی گاڑی تباہ ہوگئی اور اس کا ایک ملازم بے ہوش ہو کر ہسپتال جا پہنچا۔ اس جرم کی پاداش میں سلیم گرفتار ہو کر جیل چلا گیا لیکن میڈم نادرہ اور قاسم اعوان کے غصے کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے دیرینہ دشمن کو یادگار سبق سکھانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے گھر والے جلد سے جلد میری شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ میڈم نادرہ میرے گھر والوں کی ہمدرد بن کر آگے آئی اور میرے لئے یہ جاگیردار گھرانہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ اس خاندان کے اثرورسوخ اور مزاج سے آگاہ تھی۔ اسے امید تھی

کہ اگر میری شادی یہاں ہوگئی تو سلیم جو میرے ساتھ جینے مرنے کی باتیں کر رہا ہے' جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور اگر اس نے جوانی کے جوش میں کوئی دلیری دکھانے کی کوشش کی تو ایسی مصیبت میں پھنسے گا کہ کہیں کا نہ رہے گا۔

یہ اتفاق تھا کہ اب تک سب کچھ میڈم نادرہ کی منشا کے مطابق ہوا تھا۔ نہ صرف میری شادی یہاں ہوئی تھی بلکہ مجھ پر خاوند کے ظلم و ستم کا سن کر اور میری مشکلات سے آگاہ ہو کر وہ میرا خیرخواہ بن کر یہاں چلا آیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میڈم نادرہ کو ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ سلیم حویلی پہنچ چکا ہے اور اس کی پلاننگ اس حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ تو صرف واصف کو متوقع خطرے سے آگاہ کرنے آئی تھی۔ اس نے واصف سے کہا۔

"چودھری جی! وہ بڑا خطرناک لڑکا ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ حویلی کا رخ ضرور کرے گا۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتی ہوں کہ ان دنوں اس کی طرف سے محتاط رہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔ میں نے سنا ہے پچھلے دنوں اس نے ایک پستول بھی خریدا ہے" میں اندر ہونے والی گفتگو میں اس بری طرح کھو چکی تھی کہ جب ہوا کے ایک جھونکے نے کچن کے بند دروازے میں ایک جھری کھولی تو مجھے بالکل پتہ نہ چلا۔ کچن کے ہمیشہ مقفل دروازے کو نیم وا دیکھ کر کوئی بھی شک میں پڑ سکتا تھا.......... میں اس وقت چونکی جب واصف کا ایک کارندہ کندھے سے پستول لٹکائے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ دروازے سے داخل ہونے والی روشنی میں اس نے میرا چہرہ دیکھا اور حیرت سے بولا "بیگم جی آپ؟"

میں آنچل سنبھالتی پریشانی کے عالم میں باہر نکل آئی اور ہفضی قفل میں چابی گھما کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

ذہن خدشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جو کچھ میں نے نشست گاہ سے سنا تھا وہی کچھ کم نہیں تھا' اب یہ دوسرا اندیشہ جان کو لگ گیا تھا کہ واصف کا ملازم اسے میری کچن میں موجودگی سے آگاہ کردے گا۔ واصف کے ملازم اس سے وفاداری ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور یہ تو اس کا خاص ملازم تھا۔ دوسری طرف میڈم نادرہ اور سلیم کے چہرے رہ رہ کر نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ذہن میں جیسے

ایک گھڑ دوڑ جاری تھی۔ کبھی ایک خطرہ شدید تر محسوس ہوتا اور کبھی دوسرا۔ میڈم نادرہ کا سازشی کردار اب کھل کر سامنے آگیا۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے بے پناہ نفرت محسوس کی۔ شدید ڈپریشن کے عالم میں ایک بار تو میں نے یہ بھی سوچا کہ سب کچھ سلیم کو بتادوں اوراسے کہوں کہ تیری اصل دشمن میڈم نادرہ ہے۔ جا اور اس سے اپنے بدلے چکا۔ میرا اور میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دے۔ ہمیں تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں۔

بستر پر پڑی میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور واصف اندر آگیا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی اوراس وقت واصف کا آنا قطعی خلاف معمول تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میرا ستم گر آج بھی ستم گری کے موڈ میں تھا۔ میرے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ واصف کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ میرے جرم سے آگاہ ہوگیا ہے۔ اس نے دروازے کو کنڈی لگائی اور دانت پیس کر غرایا۔

”کم بخت اب تو میری جاسوسی بھی کرنے لگی۔ کیوں گئی تھی انیکسی میں؟“

میرا گلا خشک ہوگیا اور زبان جیسے منہ میں بل کھا کر رہ گئی۔ واصف کو غضب ناک پاکر ایسی کیفیت سے میں پہلے بھی دوچار ہوچکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جسم سے ذہن کا رابطہ منقطع ہوگیا ہو۔ اگر اسے خودپسندی نہ سمجھا جائے تو کہوں گی کہ میں ذہنی وجسمانی خوبیوں کی مالک ایک پرکشش عورت تھی۔ میری ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف پنجاب یونیورسٹی کی دی ہوئی اے گریڈ ڈگری میں کیا گیا تھا۔ اور جسمانی خوبیوں کی پاداش میں میں خود اس حویلی میں موجود تھی۔ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود میں واصف کے غضب کے سامنے ایک احمق اور معمولی عورت بن کر رہ جاتی تھی.......... میری خاموشی کے جواب میں واصف پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا اور اس کا بھرپور تھپڑ میرے گال پر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ واصف کے تھپڑوں اور مکوں کے درمیان کبھی کبھی اس کی چنگاڑتی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ میرے والدین اور بہن بھائیوں کے لئے غلیظ القابات استعمال کر رہا تھا۔ آخر اس نے مجھے زور دار دھکا دیا اور میں پلنگ کے پاس جا گری۔ وہ بدستور گرج رہا تھا۔

”تو بالکل پاگل ہو جائے گی جلد ہی تجھے پاگل خانے بھیجنا پڑے گا۔ بتا کیوں گئی تھی

کچن میں۔ میں پوچھتا ہوں کس سے پوچھ کر گئی تھی وہاں؟“

میں پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا واقعی میں پاگل ہونے والی ہوں؟ آخر میں واصف کی بات کا جواب کیوں نہیں دے پاتی۔ کیوں اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کرتی۔ کیوں اپنی صفائی پیش نہیں کرسکتی۔ واصف نے مجھے بالوں سے پکڑ کر زور دار جھٹکے دیئے۔ وہ غصے میں آپے سے باہر تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور پلنگ کا پایہ اٹھا کر نیچے رکھ دیئے۔ پھر خود پلنگ پر بیٹھ گیا.......... میں جانتی تھی اب میں ساری رات اسی طرح بیٹھی رہوں گی اور وہ پلنگ پر پڑا سویا رہے گا۔ وہ میرے ہاتھ پائے کے نیچے سے اسی صورت میں نکالے گا جب فرحان بھوک کی وجہ سے جاگ جائے گا اور رورو کر اس کی نیند خراب کردے گا۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہوچکا تھا اور اب تو میری ہتھیلیوں کو کچھ خاص درد بھی نہ ہوتا تھا۔ ان پر سیاہ نشان پڑ گئے تھے۔ تب ہی تو یہ ذلت اور تکلیف برداشت کر کے میں بدمزہ نہ ہوتی تھی اور صبح حسب سابق واصف سے پوچھتی تھی آپ ناشتے میں دودھ لیں گے یا چائے؟ آہ.......... انسان کس قدر بدلتا ہے اور کتنی جلد بدلتا ہے جیسے کسی الیکٹرانک پرزے کی ویلیو چینج ہوتی ہے‘انسان کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔

میرا ادراکی عمل کس قدر تبدیل ہو چکا تھا اب یہ سب کچھ میرے لیے حیران کن نہیں رہا تھا۔ میں نے اس رات دیر تک سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید حالات جوں کے توں رہے تو میری ذہنی صحت واقعی برباد ہو جائے گی۔

اگلے روز کی بات ہے میں کمرہ بند کئے ربڑ کی بوتل سے اپنی چوٹوں پر ٹکور کر رہی تھی۔ ننھا فرحان خوبصورت پالنے میں لیٹا اپنی گول گول آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے زبان بے زبانی میں مجھ سے اچھے دنوں کا وعدہ کر رہا ہو۔ میرے دودھ کی نمی اس کے نازک ہونٹوں پر تھی۔ یہ مسکراتے ہوئے ہونٹ مجھے بھی مسکرانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ”مسکراؤ ماں! میں سب جانتا ہوں‘ تمہارے دکھوں کو سمجھتا ہوں‘ لیکن پھر بھی مسکراؤ ماں۔ مسکراتی رہو‘ یہاں تک کہ میں جوان ہو جاؤں۔ میری پیشانی چوڑی اور آنکھیں روشن تر ہو جائیں میرے بازو مضبوط اور سینا کشادہ ہو جائے.......... پھر میں تمہیں تمہارے دودھ کا حساب دوں گا۔ ایک ایک بوند کے بدلے ایک ایک جنت

تمہارے قدموں میں نچھاور کردوں گا۔"

میں خیالوں میں گم تھی' جب اچانک کمرے کی مشرقی کھڑکی کھلی اور سلیم دھڑم سے اندر آگیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے اس طرح میری خوابگاہ میں گھسنے کی ہمت کی تھی۔ میں سرتاپا لرز کر جلدی سے کھڑی ہوگی۔ دروازے کی چٹخنی میں نے پہلے ہی چڑھا رکھی تھی کھڑکی کی کنڈی سلیم نے لگادی تھی۔ آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے چاہا کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ کال بیل بجادوں جو واصف کے پلنگ کے ساتھ موجود تھی۔ مگر پھر سلیم کی کرخت آواز نے میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ بولا "ثناء کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں آج کل میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا تم سے آخری بات کرنے آیا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے آنچل سینے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

اس نے کہا "کیا تم نے آج آئینہ دیکھا ہے' نہیں دیکھا تو دیکھ لو۔ کل چودھری نے تمہاری جو درگت بنائی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ کل تمہاری چیخیں لان تک پہنچ رہی تھیں۔ نوکر چاکر کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ کسی دن یہی نوکر چودھری کے حکم پر تمہاری لاش کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں پھینک آئیں گے۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہو۔ چلو آؤ میرے ساتھ میں تمہیں اس دلدل سے مکھن کے بال کی طرح نکال لے جاؤں گا' خدا کی قسم چودھری کے یہ پالتو غنڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم اتنی دور چلے جائیں گے چودھری کا باپ بھی ہمارا پتہ نہ چلا سکے گا.......... چلو آؤ' ہمت کرو' اپنے لئے نہیں تو اپنے بچے کے لئے سوچو۔"

میں نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا "سلیم! میں تجھے آخری موقعہ دے رہی ہوں' جس راستے سے آیا ہے اسی سے نکل جا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک تیری شکل دیکھنا نہیں چاہتی.......... چلا جا یہاں سے ورنہ خود بھی مرے گا اور مجھے بھی برباد کرے گا۔ تجھے کچھ معلوم نہیں یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

سلیم بولا "میں صرف اتنا جانتا ہوں ثناء کہ میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔"

میں بھڑک کر بولی "مجھے نہیں چاہیے تیری یہ خیر خواہی۔ میری بربادیوں کا ذمہ دار

تو ہے' صرف تو۔ یہاں سے چلا جا ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی.........."

میں محسوس کر رہی تھی کہ طیش میں میری آواز بلند ہوتی جا رہی ہے لیکن مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی۔ سلیم نے میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھے تو ایک دم اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ کچھ دیر عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ ان نگاہوں میں حسرت بھی تھی' شکوے بھی تھے' غصہ بھی تھا اور ایک بار پھر سوچ لینے کی دعوت بھی تھی' مگر میں اپنے اٹل فیصلے کے ساتھ کھڑی اس کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے پیشانی کے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور عجب جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اچھا.......... مرتی رہو یہاں" اور منہ پھیر کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نظر باہر کا جائزہ لے کر وہ چوکھٹ پر چڑھا اور کود کر باہر نکل گیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کردی اور فرحان کو سینے سے بھینچ کر رونے لگی "اچھا مرتی رہو یہاں" سلیم کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور دل کہہ رہا تھا کہ یہ اس کے آخری الفاظ ہیں اتنا درد کرب اور غصہ اس کے آخری الفاظ میں ہی ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے زندگی کے بھنور سے نکالنے کی آخری کوشش کر چکا تھا اور اب ناکام واپس جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ آج تک ایک بیتی ہوئی شام کے اثر میں تھا۔ ریسٹورنٹ کے اس فیملی کیبن میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا اور آج اس کی موہوم ترین امید بھی دم توڑ گئی تھی اور وہ ہونٹوں پر ایک سوال لئے واپس چلا گیا تھا۔

......یہ تیسری رات کا واقعہ تھا' دو ڈھائی کا وقت تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ شاید ماؤں کی آنکھ ایسے موقعوں پر کھل ہی جایا کرتی ہے۔ نو دس ماہ کا فرحان میرے پہلو میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ خوابگاہ میں ٹیبل لیمپ کی روشنی ایک محدود حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لیمپ واصف کے سرہانے پڑا رہتا تھا۔ کبھی رات کو سگار کی طلب ہوتی تو وہ یہ لیمپ جلا لیتا تھا۔

میں نے واصف کے پلنگ کی طرف دیکھا' مگر وہ وہاں نظر نہیں آیا۔ تب میری نگاہ سامنے نیم تاریکی کی طرف اٹھ گئی.......... اور یکایک جیسے حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ واصف.......... میرے پلنگ سے صرف دو گز کے فاصلے پر کھڑا عجیب نظروں سے فرحان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شراب کے نشے مندھی ہوئی تھیں اور

چہرے پر سنسنی خیز تاثر تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا ایک بازو غیرارادی طور پر فرحان کے گرد لپٹ گیا۔ میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ایک پرہول چیخ ابھری "ثناء اپنے بچے کو بچاؤ' ثناء اپنے بچے کو بچاؤ" میری آنکھیں واصف کے چہرے پر تھیں جو اب میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر فرحان کو گود میں چھپالیا۔ وہ جو کلکاریاں مار رہا تھا اس اچانک جھٹکے سے سہم کر رونے لگا۔ واصف کی شیطانی سرگوشی کمرے میں گونجی' اس کی سانسوں سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے "میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تیرے اس حرامی بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا" میں جیسے اچانک ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی۔ دفعتاً وہ کسی درندے کی طرح فرحان پر جھپٹا۔ میں نے پہلو بچایا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"خدا کے لئے واصف۔ ہوش کرو' یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

"بکواس بند کر کتیا" وہ دانت پیس کر غرایا "میں گناہ کی اس نشانی کو ختم کر دوں گا۔ اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹوں گا..........چھوڑ دے اسے۔"

میں نے گڑگڑاتے ہوئے واصف کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "تمہیں خدا رسول کا واسطہ واصف۔ میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ یہ ہم دونوں کا بچہ ہے۔ ہمارا خون ہے" ایک زوردار تھپڑ میرے رخسار پر پڑا اور میں بچے سمیت فرش پر گر گئی۔ واصف مجھ پر جھپٹا میں نے دوبارہ کروٹ بدل کر بچے کو بچایا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا "ثناء میں کہتا ہوں چھوڑ دے اس بچے کو' ورنہ برا حشر کروں گا۔"

پہلی بار واصف کے خوفناک لہجے نے میرے جسم پر کپکپی طاری نہیں کی۔ میں نے بچے کو بازوؤں میں چھپایا اور دروازے کی طرف لپکی۔ مگر دروازہ بند تھا اور میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے کھول کر باہر نکل جاؤں۔ واصف نے پھر پیچھے سے آکر مجھے چھاپ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال جکڑ لئے اور دوسرے سے فرحان کو چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جیسے ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ میری اور فرحان کی چیخوں نے خوابگاہ میں کہرام مچا رکھا تھا مگر باہر موجود مسلح محافظ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کسی کو حرکت کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی ایسی چیخ و پکار تو اس کمرے سے بلند ہوتی رہتی تھی۔ میری ہتھیلیوں کی طرح شاید یہاں کے ملازمین کے ذہنوں پر بھی سیاہ داغ پڑ چکے تھے۔ یا ان کی

سماعت پر مہریں لگ چکی تھیں..........کمرے سے باہر خاموشی تھی اور اندر ایک ماں اپنے بچے کی بقاء کی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھی..........یکسر اکیلی۔

لیکن نہیں..........دفعتاً میرے حلق سے چیخ نکلی "سلیم..........سلیم..........بچاؤ" میں جانتی تھی میری یہ صدا' لاحاصل ہے کیونکہ سلیم یہاں سے جا چکا ہے لیکن فرض محال اگر وہ یہاں تھا بھی تو اس کے کوارٹر تک یہ چیخ کیونکر پہنچ سکتی تھی۔ پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر میں پھر بھی اس کا نام پکار رہی تھی کیونکہ اس نام کے شخص کے سوا یہاں کوئی میرا غمگسار نہ تھا..........اچانک واصف نے مجھے چھوڑا اور لپک کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے پستول نکال لیا۔ پھر اس نے میری گود میں روتے بلکتے فرحان کو بے دریغ نشانہ بنانا چاہا مگر گولی میرے کندھے میں لگی۔ وہ جھلا کر ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا۔ گولی لگنے کے بعد میری قوت مزاحمت یکدم کمزور پڑ گئی لیکن میں صرف ایک عورت ہی نہیں تھی' ایک ماں بھی تھی اور ماں بہت سخت جان ہوتی ہے۔ میں نے فرحان کو اپنی بانہوں میں اس طرح سمیٹا تھا کہ وہ میرے ہی جسم کا ایک حصہ بن گیا تھا' میری ہی جان سے پیوست ہو گیا تھا' جیسے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا' جیسے وہ میں تھی۔ اور میں وہ تھا۔

زندگی و موت کی اس کشمکش کے دوران اچانک مجھے اپنی بائیں جانب ایک کڑاکا سنائی دیا۔ مشرقی دیوار کی کھڑکی زور سے ہلی' پھر ویسا ہی دوسرا کڑاکا ہوا اور چوبی کھڑکی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر کمرے میں آن گری۔ میں نے سلیم کو دیکھا وہ کھڑکی سے اندر آرہا تھا (یہ چوبی کھڑکی سلیم نے اپنے سر کی ضربوں سے توڑی تھی) میں ڈوبتی ہوئی آواز میں چیخی۔

"سلیم..........سلیم۔ اس موذی کو جان سے مار دو' قتل کر دو اسے......" سلیم تند بگولے کی طرح واصف کی طرف لپکا اور اسے بالوں سے پکڑ کر میرے اوپر سے کھینچ لیا۔ مجھ سے ہاتھا پائی کے دوران واصف کا پستول ٹیبل لیمپ کے پاس گر چکا تھا۔ اس نے لپک کر وہ پستول اٹھانا چاہا مگر میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے پلنگ کے نیچے دھکیل دیا۔ اسی دوران سلیم کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور واصف جو اپنے پستول پر جھپٹ رہا تھا لڑکھڑا کر ٹیبل لیمپ پر گرا۔ کمرے میں یکلخت گہری تاریکی پھیل گئی۔ فائرنگ کی آواز سن کر باہر کھڑے پہریدار خاموش نہیں رہ سکتے تھے اس لئے اب وہ

"چودھری صاحب.........چودھری صاحب" کی آوازیں دے رہے تھے اور دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

سلیم مجھے اور فرحان کو لے کر کھڑکی کے راستے باہر نکل آیا۔ ابھی ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے کہ بائیں جانب تاریکی سے واصف کا ایک آدمی رائفل تانے سامنے آگیا۔ شاید دروازے سے مایوس ہو کر وہ کھڑکی پر زور آزمائی کرنے آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ اس نے چلانے کی لئے منہ کھولا مگر اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے آواز نکلتی سلیم کے سر کی نہایت زور دار ضرب اس کی پیشانی پر پڑی۔ مجھے یاد ہے وہ چکرا کر گرا تھا اور گرتے ہوئے اس کا سر پختہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہ سب کچھ اسے بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس دوران کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا اور رب نواز "ایم جی" سنبھالے اندر گھس آیا۔ اس کی نظر کھلی کھڑکی میں کھڑے سلیم پر پڑی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے پہچان کر فائر کرتا۔ سلیم کے پستول نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے۔ میں نے رب نواز کو پیٹ پکڑ کر لڑکھڑاتے دیکھا' پھر اس کی رائفل فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ سلیم نے فرحان کو مجھ سے چھینا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مخالف سمت میں بھاگا۔ رکھوالی کرنے والے دو جسیم تازی کتے ایک جانب سے نکل کر ہم پر جھپٹے۔ سلیم پر جیسے وحشت سوار ہو چکی تھی۔ اس نے مڑ کر یکے بعد دیگرے تین فائر کئے اور کتوں کی غراہٹیں لرزہ خیز دھماکوں میں دم توڑ گئیں۔ اب ہم احاطے کے مشرقی کونے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں نیم کے گھنے پیڑوں تلے واصف کی جیپ کھڑی تھی۔ حویلی کے شمالی حصے سے بھاگو دوڑو کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیپ کا ڈرائیور جو جیپ کے قریب ہی چارپائی ڈالے لیٹا تھا' شور سے بیدار ہوگیا تھا اور اب آنکھیں ملتا ہماری طرف بھاگا آرہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے سلیم سے پوچھا۔

نہ جانے سلیم نے ایسی صورت حال کے لئے پہلے سے سوچ بچار کر رکھی تھی یا اس کے ذہن نے فوری طور پر کام کیا وہ بولا "خان محمد! جلدی کرو' جیپ نکالو۔ زمیندار شہاب کے آدمیوں نے حملہ کردیا ہے۔ چودھری جی مارے گئے ہیں۔ وہ بیگم جی اور بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ان دنوں ایک قریبی زمیندار شہاب کے کچھ خطرناک پالتو آدمی جیل سے مفرور

تھے اور حویلی میں خطرہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ وہ پرانی دشمنی چکانے کے لئے چودھری صاحب کے گھرانے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ڈرائیور نے نیم غنودگی اور نیم بیداری کے عالم میں جو زمیندار شہاب کا نام سنا تو اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ ہم سے بھی پہلے جیپ میں آبیٹھا فوراً انجن اسٹارٹ کردیا۔ سلیم نے مجھے اور فرحان کو پیچھے بٹھایا اور خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ جیپ طوفانی رفتار سے حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ پر موجود مسلح پہریدار بھی رہائشی حصے میں فائرنگ کی آوازیں سن چکے تھے۔ جیپ کو دیکھ کر وہ اس کے سامنے آگئے۔ ڈرائیور کڑک کر بولا "تم یہاں کھڑے ہو۔ ادھر شہاب کے آدمیوں نے حملہ کرکے چودھری صاحب کو مار ڈالا ہے" دونوں پہریدار رائفلیں تھامے بگٹٹ رہائشی حصے کی طرف بھاگے اس دوران سلیم اتر کر گیٹ کھول چکا تھا۔ جیپ گیٹ سے نکلی اور ہمیں لے کر آندھی کی طرح بڑی سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔

بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی سلیم نے ڈرائیور سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ ویسے بھی اب وہ خوف اور غنودگی کے اثر سے نکل کر سوچ بچار میں مصروف ہوگیا تھا۔ ہم اس کی نظروں میں عنقریب مشکوک ٹھہرنے والے تھے۔ سلیم نے اسے ایک جگہ جیپ روکنے کو کہا اس نے جیپ روکی تو سلیم نے پستول سے پورے زور سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ سلیم اسے اٹھا کر درختوں میں لے گیا اور اس کی شلوار کے آزار بند سے اس کی مشکیں کس کر واپس آگیا۔ یہاں ہم نے اپنی حالت کا بھی جائزہ لیا۔ گولی میرے کندھے کا گوشت چیرتی ہوئی گزر گئی تھی زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ سلیم نے اپنا صافہ پھاڑ کر پٹی باندھی جس سے خون کا اخراج کم ہوگیا میری قمیض جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ ڈرائیور کی ایک گرم چادر جو ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں پڑی تھی' دیہاتی عورتوں کے انداز میں جسم اور سر پر لپیٹ لی۔ ننھے فرحان کی حالت بھی قابل ترس تھی۔ غضبناک باپ کے ہاتھوں معصوم بیٹے کے کپڑے بھی سلامت نہیں رہے تھے۔ اس کے فراک کی ایک آستین غائب تھی۔ گریبان دھجیوں کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ کھینچاتانی میں اس کی کہنی کا جوڑ اکھڑ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی اپنی چادر میں چھپا لیا۔ ہوا

میں کافی خنکی تھی اور اوس سے ہمارے جسم بھیگ رہے تھے۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ اس روز حویلی میں جیپ کے علاوہ اور کوئی گاڑی موجود نہیں تھی ورنہ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دے کر اتنی دور تک نہ آسکتے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کدھر کا رخ اختیار کیا جائے۔ اس پورے علاقے میں جاگیرداروں کا تسلط تھا اور یہاں محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنا بیوقوفی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کسی طرح یہاں سے نکل کر جھنگ پہنچ جائیں اور وہاں رکے بغیر فیصل آباد کا رخ کرلیں۔ جیپ میں اتنا پٹرول موجود تھا کہ ہم جھنگ تک پہنچ سکتے تھے۔ جھنگ کے مضافات میں کسی ویران جگہ جیپ چھوڑ کر ہم بس پر سوار ہوسکتے تھے.......... حتمی فیصلہ کرنے کے بعد سلیم تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھنے لگا۔

اس وقت ہم جھنگ سے کوئی پندرہ میل دور ایک دشوار گزار راستے سے گزر رہے تھے جب اچانک جیپ کا انجن بند ہوگیا۔ سلیم نے نیچے اتر کر کل پرزے چیک کئے بہت دیر تک سیلف مارتا رہا مگر گاڑی سٹارٹ نہیں ہوئی۔ یہ ایک تشویشناک صورت حال تھی۔ جاگیرداروں کے آدمی کسی بھی وقت ہماری بو سونگھتے ہوئے پہنچ سکتے تھے۔ اس وقت سلیم پر انکشاف ہوا کہ کسی وجہ سے انجن کا سارا موبل آئل ضائع ہوگیا ہے اور انجن سیل ہوچکا ہے اب جیپ چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم نے کچھ ضروری چیزیں جن میں ایک ٹارچ بھی شامل تھی جیپ سے نکال لیں اور گھنے درختوں میں پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی جانور یا انسان ایک دم بدک کر بھاگا ہو۔ ہم دونوں ٹھٹھک گئے۔ سلیم نے اپنی ڈب میں سے پستول نکالا اور آواز کے پیچھے لپکا۔ تاریکی گہری تھی مگر بھاگنے والے کے قدموں کی آواز اس کی رہنمائی کررہی تھی۔ جلد ہی اس نے اسے جالیا۔ میں بھی تیزی سے سلیم کے پیچھے آرہی تھی۔ جھاڑی سے ایک ڈری ہوئی نسوانی آواز آئی۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے گھر جانے دو۔"

بولنے والی کے لہجے میں ایسی فریاد تھی کہ میں کانپ اٹھی۔ قریب جا کر دیکھا تو ٹارچ کی روشنی میں ایک عورت کانٹے دار شاخوں میں الجھی پڑی تھی اور اس نے سلیم کے سامنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ عورت کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل

وصورت عام اور لباس پھٹا پرانا تھا۔ سردی اور خوف سے وہ بے حال تھی۔ عورت دوسری عورت کا دکھ بہت جلد سمجھ لیتی ہے۔ اس عورت کو دیکھتے ہی میرا پورا جسم سنسنا اٹھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ اس بدنصیب کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے کسی مرد کی طرف سے نہایت ناروا سلوک ہوچکا ہے۔ اس کی میلی آنکھوں کے آنسو چیخ چیخ کر اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا اعلان کررہے تھے۔ وہ سلیم کو دیکھ کر ڈر گئی تھی لیکن جب اس نے سلیم کے عقب میں مجھے اور میری گود میں بچہ دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پوچھنے لگی "کون لوگ ہو تم؟"

سلیم نے کہا "یہی سوال ہم تم سے پوچھ سکتے ہیں۔"

وہ بولی "کسی کے گھر مہمان آئے ہو؟"

سلیم نے کہا "مسافر ہیں۔"

اس نے ایک نظر سلیم کے تومند جسم کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "ویرا۔ مجھ پر ایک احسان کر۔ مجھے کسی طرح میرے گھر تک پہنچادے"

اس وقت میری اور سلیم کی نگاہیں بیک وقت عورت کے پاؤں کی طرف جھک گئیں اور پہلی بار ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا ایک پیر شدید زخمی ہے۔ سلیم نے ٹارچ کی روشنی پیر پر مرکوز کی۔ وہ بری طرح سوجا ہوا تھا اور ٹخنے کے قریب گہرا زخم نظر آرہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سسکی روکی اور بولی "کچھ نہ پوچھ بہن۔ کچھ نہ پوچھ۔ زندگی تھی جو بچ گئی ہوں۔ بس تم دونوں اتنا احسان کرو کہ مجھے کسی طرح گھر تک پہنچادو۔"

عجب صورت حال تھی۔ ہم خود مصیبت کے مارے تھے اور وہ ہم سے مدد طلب کر رہی تھی۔ اس کا ہمارے راستے میں آنا بھی نہایت ڈرامائی تھا۔ شاید رات کی تاریکی ہوتی ہی ایسی کہانیوں کو جنم دینے کے لئے ہے۔ سلیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عورت کو سہارا دیا۔ دوسری طرف سے سلیم نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ اپنے مفلوج پاؤں کو گھسیٹتی ہوئی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ ہر قدم پر اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل جاتی تھی کوئی سو گز درختوں میں چلنے کے بعد کچے پکے مکانوں کے آثار نظر آئے۔ ڈیک نالے کے کنارے یہ ایک کافی بڑا گاؤں تھا۔ ابھی تک ہم راستے کی تمام

آبادیوں سے بچ کر نکلے تھے۔ حویلی سے فرار ہونے کے بعد پہلا موقعہ تھا کہ ہم کسی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ ہمیں اس وقت پناہ کی شدید ضرورت تھی اور اس عورت کا گھر ہماری وقتی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی۔ آخر یہی بات میری زبان پر آگئی۔ میں نے چلتے چلتے کہا۔

"بہن! میرا بچہ بیمار ہے۔ ہماری گاڑی راستے میں خراب ہوگئی ہے۔ صبح تک کے لئے ہمیں چھت کی ضرورت ہے۔"

میرے سوال پر عورت نے رک کر مشکوک نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔ وہ کچھ بولی نہیں.........اور خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ اس کی خاموشی نے جیسے ہمارے اوپر گھڑوں پانی ڈال دیا تھا۔ دل ایک دم کانپ سا گیا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی۔ اس نے لکڑی کا لٹو گھما کر دروازہ کھولا اور بغیر کچھ کہے اندر داخل ہوگئی۔ اندر سے زنجیر چڑھنے کی آواز آئی اور ہم دونوں سمجھ گئے کہ ہماری "درخواست" کے سلسلے میں عورت کا جواب کیا ہے۔ بوجھل قدموں سے ہم واپس مڑے تو ایک قریبی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہی عورت مٹی کا دیا لئے سامنے کھڑی تھی۔ سرگوشی میں بولی "بہن اندر آجاؤ" اب میں نے دیکھا کہ یہ دوسرا دروازہ بھی اسی مکان کا تھا۔ شاید یہ بیٹھک قسم کا کوئی کمرہ تھا۔ میں اور سلیم جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں دو جھلنگا چارپائیوں اور ٹوٹے ہوئے موڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مٹی سے پوتی ہوئی الماریاں برتنوں سے خالی تھیں اور اناج رکھنے والی مٹی کی بڑی سی ناند میں خاک اڑ رہی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی عورت نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ دیئے کی روشنی میں میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر نیلگوں خراشیں تھیں اور لباس بھی ادھڑا پہنا ہوا تھا۔ اس کا سارا وجود ابھی تک کانپ رہا تھا۔ سرگوشی میں بولی۔

"ساتھ والے کمرے میں میرے بچے سو رہے ہیں۔ اونچی آواز میں نہ بولنا۔ میں ابھی آتی ہوں" میری گرم چادر کے نیچے فرحان پھر کسمسانے اور "ریں ریں" کرنے لگا تھا۔ اس کے بازو کی چوٹ اسے بے چین کر رہی تھی۔ عورت لنگڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کی واپسی کوئی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھدر کی ایک بڑی سی پٹی تھی۔

کچھ روئی تھی جسے وہ نمک اور ہلدی میں سینک کر لائی تھی۔ اس کے علاوہ ایک پیالے میں اپلوں کی راکھ اور اس میں ایک پوٹلی رکھی تھی۔ اس نے میرے قیمتی لباس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر کہا۔

"بی بی جی' آپ کا کندھا سخت زخمی ہے۔ آپ کے بچے کا ایک بازو بھی ٹھیک نہیں لائیے میں آپ دونوں کو پٹی کر دوں......"

میں حیرانی سے عورت کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہوشیار اور تیز نظر تھی۔ ہمارے کچھ بتائے بغیر ہی کافی کچھ جان گئی تھی۔ غالباً اسے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم کہیں سے بھاگے ہوئے ہیں اور ہمارے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے گرم چادر میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا کندھا دیکھنے لگی۔ اس وقت میری نگاہ اپنی گرم چادر پر پڑی اس پر خون کا چھوٹا سا دھبا نظر آرہا تھا۔ شاید اس دھبے کی وجہ سے عورت کو میرے زخمی ہونے کا علم ہوا تھا۔ مگر اس نے فرحان کے زخمی ہونے کا جو قافیہ لگایا تھا وہ واقعی اس کے ذہین ہونے کا ثبوت تھا۔ اس نے احتیاط سے میری پٹی کھولی اور ماہر جراح کی طرح زخم دیکھنے لگی۔ پھر اس نے پوٹلی میں سے ایک خاکستری سفوف نکالا اور زخم پر اچھی طرح لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی بڑے اعتماد سے بولی۔

"اب آپ کا خون رک جائے گا۔ چودھرانی جی۔"

"چودھرانی جی" کے الفاظ میرے اور سلیم کے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوئے۔ ہم دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ بولی "حیران نہ ہوں جی۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میرا نام زینب ہے۔ میں پچھلی گرمیوں میں آپ کی بڑی جٹھانی فاطمہ بی بی کے پاس گئی تھی۔ ان سے زکوۃ کے پیسے لینے کے لئے۔ وہیں پر آپ کو دیکھا تھا۔ اس وقت آپ کا یہ بچہ گود میں نہیں آیا تھا۔"

میری رگوں میں خون کی گردش تھمنے لگی۔ ہم نے پناہ ڈھونڈی بھی تو کہاں۔ زینب نامی یہ عورت میرے بارے سب کچھ جانتی تھی.........میری پٹی کرنے کے بعد اب وہ بڑی احتیاط سے فرحان کی کہنی کا جوڑ دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ جراحی کا کام جانتی ہے۔ ہمارے کچھ پوچھے بغیر وہ بولنے لگی۔

"چودھرانی جی.........اللہ بخشے میرا شوہر دین محمد بڑا اچھا جراح تھا۔ اس سے یہ

كسب میرے ہاتھ آیا۔ اب تو یہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ تھوڑی بہت حکیم گیری بھی کر لیتی ہوں۔ یہ موت جوگا ڈاکٹر گاؤں میں نہ آتا تو آٹا دال چل ہی رہا تھا۔ اب تو کئی کئی روز گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ اللہ کرے کسی کی آئی اس کو آئے۔ میرے بچوں کی تو روٹی چھین لی ہے اس نے۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ فرحان کے بازو کی مالش بھی کرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک مخصوص جھٹکا دیا۔ فرحان ذرا سا مچلا۔ زینب نے فوراً روئی رکھ کر پٹی باندھنی شروع کر دی۔

"بس جی۔ بالکل ٹھیک ہو گیا کاکا.......... ہڈی کو کچھ نہیں ہوا۔ صرف جوڑ ہل گیا تھا" اچھی طرح پٹی کرنے کے بعد اس نے پوٹلی میں سے افیم کی ایک ڈلی نکالی اور تھوڑی سی توڑ کر مجھے دیتی ہوئی بولی "کاکے کو کھلا دیں صبح تک آرام سے سویا رہے گا۔ درد بھی نہیں مانے گا" زینب کی ہدایات پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے فرحان کو افیم کی ڈوز دے دی۔ وہ ساتھ والے کمرے سے ایک بوسیدہ لحاف لائی اور چارپائی پر ڈال دیا، بولی "اب آپ دونوں آرام کریں۔ مَیں اپنے موت جوگے پیر کی بھی خبر لے لوں" لگتا تھا موت جوگا اس کا تکیہ کلام ہے۔ وہ اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی بغلی دروازے کی طرف بڑھی۔ محسوس ہوتا تھا وہ اپنے ساتھ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے حادثے کو بالکل فراموش کر چکی ہے۔ عجیب عورت تھی وہ۔ سلیم کی آنکھوں میں اس کی طرف سے شکوک تھے۔ میں خود بھی تذبذب میں تھی اس چالاک عورت پر قطعی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ جاگیردار گھرانے سے واقف تھی تو ہمیں پناہ دینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ فوراً کسی ذمے دار شخص یعنی گاؤں کی چودھری یا نمبردار وغیرہ کو ہماری موجودگی سے باخبر کرے اور اپنے پر آنے والی مصیبت ٹالے۔ اس صورت میں ہو سکتا تھا اسے کچھ انعام وغیرہ بھی مل جاتا.......... وہ دروازے سے نکلنے لگی تو میں نے آہستگی سے کہا۔

"زینب ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

اس نے میری بات کا دوسرا مطلب لیا اور بولی "بہت شرمندہ ہوں۔ گھر میں صرف دو ہی لحاف تھے۔ دوسرا میرے بچوں پر ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں تھوڑی رات رہ گئی ہے۔ میں لحاف کے بغیر بھی گزارہ

کر سکتی ہوں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آئی۔ یہاں چار بچے ایک ہی لحاف میں سوئے ہوئے تھے۔ دیئے کی مدھم روشنی میں ان کے چہرے کچھ اور بھی مدقوق اور زرد نظر آتے تھے۔ بڑی بچی کی عمر کوئی آٹھ سال اور سب سے چھوٹے لڑکے کی عمر ڈیڑھ دو سال تھی بچوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتی ہوئی میں زینب کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوٹھے میں آ گئی۔ یہ کوٹھا (ڈھارا) باورچی خانے، اسٹور اور شاید کبھی کبھار بیڈ روم کا کام بھی دیتا تھا۔ زینب نے چولہے میں اپلوں کی آگ جلائی مجھے بیٹھنے کے لئے لکڑی کی چوکی دی اور خود بھی ایک ایسی ہی چوکی پر بیٹھ گئی اور اپنے زخمی پاؤں کو حرارت پہنچانے لگی غالباً اسے شدید قسم کی موچ آئی تھی اور سردی کی وجہ سے پاؤں بالکل اکڑ گیا تھا۔ اس نے پوٹلی میں سے ایک تیل نکالا اور خود ہی پاؤں کے علاج معالجے میں مصروف ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ پاؤں پر پٹی کر چکی تو میں نے پوچھا "زینب کچھ بتاؤ گی نہیں۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

میرے سوال نے اسے ایکا ایکی پھر غم و اندوہ کے گرداب میں دھکیل دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تک خود پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھی اور میرے سوال نے اس کے ضبط کے تمام بند توڑ دیئے ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسکنے لگی۔ کافی دیر رو چکی تو اپنی بپتا سنانے لگی۔ اس کی روئیداد کا خلاصہ یہ ہے۔

"شوہر کی موت کے بعد اس کی معاشی حالت بہت خراب تھی اور پچھلے ماہ سے تو گھر میں مسلسل فاقے گزر رہے تھے۔ اس نے اپنے بچوں میں زندگی کی حرارت برقرار رکھنے کے لئے بہت جتن کئے۔ مزدوریاں کیں، ہاتھ پھیلائے، خیرات مانگی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہوس پرستوں کی بھوکی نگاہیں اس کے جسم پر پڑنے لگیں۔ لوگ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے پستیوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے..........اور آخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ ایک ٹھٹھری ہوئی بے مہر شام کو زینب نے روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے اپنا آپ بیچ دیا۔ اس کی مجبوری خریدنے والے شخص کا نام جان محمد تھا۔ یہ شخص فارسٹ گارڈ تھا اور کسی نزدیکی گاؤں میں رہتا تھا۔ زینب ڈیک نالے کے کنارے، گھنے درختوں میں تین چار بار اس سے مل چکی تھی.......... لیکن

آج وہ گئی تو روٹی کے ٹکڑوں کی بجائے اس کے حصے میں صرف ذلت اور زخم آئے۔ جان محمد اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی اور تھے۔ ان کے تیور دیکھ کر زینب وہاں سے بھاگی۔ وہ خبیث اس کے پیچھے لپکے۔ زینب کا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور وہ چوٹ کھا کر گر پڑی۔ ان افراد نے شیطانیت کا ثبوت دیا.........اور اسے زخمی حالت میں چھوڑ گئے۔ سفاکی ملاحظہ ہو کہ زینب کے جسم پر ایک گرم چادر تھی۔ یہ چادر وہ پڑوسن سے مانگ کر لے گئی تھی۔ انہوں نے یہ چادر بھی چھین لی۔ وہ لٹی پٹی ان درختوں میں پڑی تھی جب میں اور سلیم وہاں پہنچے۔ وہ سمجھی اسے نوچنے کھسوٹنے والے پھر آگئے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لئے درختوں میں بھاگ نکلی۔

زینب کی روئیداد سن کر میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اولاد کی بھوک ماں کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ یہ کوئی عورت ہی جان سکتی ہے۔ میں بھی چند گھنٹے پہلے اولاد کی خاطر ایک قیامت اپنے اوپر جھیل چکی تھی۔ ایک طرح ہم دونوں کا دکھ مشترک تھا۔ پچھلی رات کی ٹھٹھری ہوئی سردی میں اس چولہے کے سامنے بیٹھ کر میرے اور زینب کے درمیان تادیر گفتگو ہوئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گئی کہ زینب میرے بتائے بغیر ہی میرے بارے میں سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں جاگیردار کے ظلم سے گھبرا کر اس کی حویلی چھوڑ آئی ہوں اور میرا ساتھی میرا میکے سے تعلق رکھنے والا کوئی ہمدرد ہے۔ وہ معاملہ فہم عورت تھی۔ اس نے کہا "چھوٹی چودھرانی جی! آخر یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اگر نہ ہوتا تو آپ بھی نہ ہوتیں۔ وہ عورت خور حویلی ہے۔ آپ جیسی نہ جانے کتنی چودھرانیاں اس مقبرے میں دفن ہو چکی ہیں۔ میرا دادا بتایا کرتا تھا......"

اچانک گلی سے کچھ آوازیں آئیں اور زینب ٹھٹھک کر خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی غور سے سنا۔ یوں محسوس ہوا جیسے دس پندرہ گھڑسوار بھاگتے گلی سے گزرے ہوں۔ زینب نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک لکڑی ٹیکتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اب صبح ہونے والی تھی اور رات کی سیاہی میں دن کا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ زینب بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی تو میں بھاگتی ہوئی سلیم کے پاس پہنچی۔ لحاف اس کے کندھوں پر تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کر رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گھڑسوار گلی میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ مختلف گھروں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے

جا رہے تھے۔ گاہے گاہے کوئی اونچی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ آثار اچھے نہیں تھے۔ میں نے سلیم سے کہا۔

"زینب باہر جا چکی ہے۔ کہیں وہ کوئی..........گڑبڑ نہ کر دے۔"

سلیم نے کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ مجھ سے بولا "ثناء! تم فرحان کو لے کر چھت پر چلی جاؤ مکان کی چھتیں ملی ہوئی ہیں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم کسی دوسرے مکان میں اتر جائیں گے۔ فی الحال میں یہاں کھڑا ہو کر سن گن لیتا ہوں۔"

سلیم کی تجویز معقول تھی میں فرحان کو لے کر سیڑھیوں کے بالائی سرے پر جا بیٹھی۔ گلی سے آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ یہ تکلیف دہ سلسلہ کوئی آدھ گھنٹے بعد ختم ہوا۔ دروازے پر دستک ہوئی سلیم نے کواڑ کھولے اور زینب گھبرائی ہوئی اندر آگئی۔ اسے تنہا دیکھ کر میں بھی سیڑھیوں سے اتر آئی۔

وہ بولی "چوہدرانی جی' خدا کا لاکھ شکر کریں آپ کی اور ہم سب کی جان بچ گئی۔ یہ جاگیردار کے آدمی تھے۔ ڈیک نالے کے کنارے انہیں آپ کی خراب گاڑی ملی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ دونوں اس گاؤں میں آئے ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے ان کے ساتھ کوئی کھرا اٹھانے والا نہیں تھا ورنہ وہ سیدھے میرے دروازے تک آجاتے مگر ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں وہ آگے گئے ہیں ہو سکتا ہے دوبارہ آئیں۔"

کچھ سوچ کر میں نے اپنی ایک طلائی چوڑی اتاری اور زینب کو تھماتے ہوئے کہا۔

"زینب جہاں اتنا احسان کیا ہے' تھوڑا سا اور کر دو۔ کسی طرح اس چوڑی کو فروخت کروا کر کچھ پیسوں کا انتظام کر دو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آج اندھیرا ہوتے ہی تمہارے گھر سے نکل جائیں۔" زینب سوچ میں پڑ گئی شاید سوچ رہی تھی کہ یہ قیمتی چوڑی لے کر کس کے پاس جائے۔ پھر اس کے ذہن میں کوئی بات آئی بولی ٹھیک ہے میں اپنے بھائی کو بلواتی ہوں وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

سلیم نے کہا "اس کے علاوہ ہمیں دو جوڑے کپڑے کی بھی ضرورت ہے" زینب بولی "ایک زنانہ جوڑا تو میرے پاس ہے' اور چوہدرانی جی کو ٹھیک بھی آئے گا مردانے جوڑے کا مسئلہ ہے۔ ابھی دن چڑھتا ہے تو پڑوسن سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے کہا ”زینب تم سمجھدار ہو۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پھر بھی جو کچھ کرنا احتیاط سے کرنا۔“

سلیم نے کہا ”تمہارے گھر میں ہاون دستہ تو ہے۔ چوڑی بھائی کو دینے سے پہلے اس میں اچھی طرح کوٹ لینا۔“

وہ بولی ”آپ فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔“

اس نے مجھے اور سلیم کو گھر کی پچھلی کوٹھری میں بند کر کے باہر سے تالا لگادیا اور ہدایت کی کہ کوئی آواز نہ نکالیں اور بہتر ہے کہ بچے کو مسلسل سوتا رکھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بچوں کو بھی ہماری موجودگی کا پتہ چلے۔ دوپہر ایک بجے آکر اس نے ہمیں کپڑوں کے دو جوڑے دیئے اور بتایا کہ اس کا بھائی چوڑی لے کر جھنگ گیا ہوا ہے اور شام سے پہلے پہلے واپس آجائے گا۔ وہ ہمارے لئے کھانا بھی لے کر آئی تھی جس میں ساگ تندوری روٹی چاٹی کی لسی اور اچار شامل تھا۔ پتہ نہیں بیچاری نے یہ انتظام کیسے کیا تھا۔ ہم دونوں زینب کے لئے دل میں بہت احسان مندی محسوس کر رہے تھے اور اس کا احسان چکانے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے اس کی مالی مدد کی جائے۔ میرے جسم پر کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار کا زیور موجود تھا اور میں اس قابل تھی کہ اس کی مدد کر سکوں۔ شام سے ذرا پہلے اس نے دو تولے سونے کی قیمت جو اس وقت چار ہزار روپے تھے لاکر میرے ہاتھ رکھ دی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی وہ ایک بری خبر بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے ایک مڑا تڑا اخبار ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ یہ اخبار اس کے بھائی نے شہر سے خریدا تھا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر میری اور سلیم کی تصویر کے ساتھ یہ سنسنی خیز خبر موجود تھی۔

”بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کردیا“ تفصیلات میں درج تھا ”جاگیردار واصف چنگیزی کو کل ان کی بیوی ثناء نے اپنے آشنا سلیم کے ساتھ مل کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ واصف چنگیزی پر عقب سے گولی چلائی گئی جو ان کی گردن کو چیر کر دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ ان کے مسلح محافظ رب نواز کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ حویلی کے دو اور ملازم جن میں واصف چنگیزی کا ڈرائیور بھی شامل ہے معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ مجرموں کی تلاش میں پولیس سرگرمی سے چھاپے

مار رہی ہے۔“

یہ خبر مجھ پر سکتہ طاری کرنے کے لئے کافی تھی۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ میں جو ایک چیونٹی کی جان لینے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی تھی آج ایک قاتلہ تھی اور مجھ پر اپنے شوہر کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرسکے۔ ذہنوں میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ صورت حال سنگین تر ہوگئی تھی۔ اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ جاگیرداروں کے پالتو غنڈے ہی نہیں پولیس بھی ہمیں سرگرمی سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ اخباروں میں ہماری تصویریں شائع ہوچکی تھیں اور اب اس چار دیواری سے باہر ہمارے لئے خطرات ہی خطرات تھے۔ زینب بھی اس صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ ایک عورت ہونے کے باوجود وہ اب تک نہایت حوصلے اور جرات سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ معصوم بچوں کی ماں تھی ہماری وجہ سے اس پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ سکتے تھے۔ مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمیں تحفظ دے رہی تھی۔ اس نے کہا چوہدرانی جی! فی الحال یہاں سے جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔ اس موت جوگی اخبار نے آپ کو ہر طرف نشر کر دیا ہے۔ آپ پر الزام بھی بڑے سخت لگائے گئے ہیں۔ یہ سارا معاملہ ذرا ٹھنڈا ہولینے دیں۔ پھر یہاں سے نکلیں۔ میں اپنے دونوں بڑے بچوں کو بھی آپ کے بارے میں بتا دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ باہر بات نہیں کریں گے۔ بس آپ یہ کوشش کریں کہ کاکا زیادہ روئے نہ۔“

زینب دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلی گئی اور ہم دیئے کی مدھم روشنی میں اپنی اپنی سوچوں سے جنگ کرنے لگے۔ اور وہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ شاید اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ میں سلیم کے مزاج سے پوری طرح آگاہ نہیں تھی۔ مجھے اس آتش فشاں کی خبر نہیں تھی جو اس کے سینے کی گہرائی میں ہروقت دہکتا رہتا تھا اور جسے جگانے کیلئے صرف ایک اشارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں چونکہ اس وقت خود بھی صدمے سے دوچار تھی اس لئے میں نے سلیم کو اس گفتگو کے بارے میں بتا دیا جو چند ہفتے پہلے واصف چنگیزی اور میڈم نادرہ کے درمیان ہوئی تھی۔

میں نے سلیم پر واضح کر دیا کہ میری اور اس کی بربادیوں کی اصل جڑ میڈم نادرہ ہی ہے۔ یہی وہ عورت ہے جس نے پرانی عداوت کی وجہ سے بدنیتی کا مظاہرہ کیا اور مجھے

واصف چنگیزی کی بیوی بنا کر حویلی کے جہنم میں دھکیل دیا اور یہی وہ عورت ہے جو اب ایک گہری سازش کے تحت واصف کو اس کے (سلیم کے) خلاف بھڑکا رہی تھی۔ میں نے کہا "سلیم! اسی لئے میں تمہیں باربار حویلی سے چلے جانے کا مشورہ دیتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ بدذات میری زندگی تو برباد کر ہی چکی ہے اب تمہیں بھی جاگیرداروں کے ہاتھوں قتل کروا دے گی۔ اس کے دل میں تمہاری دشمنی کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ وہ ہر پل تمہاری خبر رکھتی تھی۔ اسے یہاں تک معلوم تھا کہ تم نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ایک پستول خریدا ہے اور اب یہ پستول واصف کے خلاف کام آئے گا۔"

میں روتی رہی اور سلیم کے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے سننے کا انداز بتا رہا تھا کہ میری باتوں سے اس کے بہت سے اندیشے درست ثابت ہوگئے ہیں۔

..........یہ اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ کوئی گیارہ بارہ کا وقت ہوگا۔ دوران نیند کندھے سے اٹھنے والی ٹیس نے مجھے جگا دیا۔ چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی لالٹین کی مدہم لو کمرے کے ایک تہائی حصے میں معمولی روشنی بکھیر رہی تھی۔ یہ لالٹین کچھ دیگر سودا سلف کے ساتھ زینب آج ہی بازار سے خرید کر لائی تھی۔ میں نے حسب عادت سر اٹھا کر دیکھا فرحان گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سلیم کی طرف اٹھ گئی۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی اور کندھے سے گولیوں کی پٹی لٹک رہی تھی۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتا تھا اور شاید چند لمحے مزید میری آنکھ نہ کھلتی تو وہ کھڑکی کے راستے باہر نکل چکا ہوتا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"کہاں جا رہے ہو سلیم؟"

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ میں سرتاپا لرز گئی۔ اس کی آنکھیں کسی درندے کی طرح روشن تھیں۔ وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اسے پہلے بار دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے کی ایک ایک رگ تنی ہوئی تھی۔ میں نے حوصلہ کر کے پھر پوچھا "کہاں جا رہے ہو سلیم؟"

وہ عجیب آواز میں پھنکارا "ایک کام سے جا رہا ہوں۔ کل رات بارہ بجے سے پہلے آجاؤں گا۔"

"ایسا بھی کیا ضروری کام ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہاں سے نکلنا کس قدر خطرناک ہے۔"

"بحث مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"کیا کام ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"اس وقت نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن میں بتا سکتی ہوں۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم.......... تم لاہور جا رہے ہو۔ میڈم نادرہ کو قتل کرنے کے لیے۔"

میں نے اس کے دل کی بات کہی تھی اور یہ وہ بات تھی جو اس کا کلیجہ ہلا سکتی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر سرگوشی کی "بتاؤ.......... بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ کسی درندے کی طرح غرایا "ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہاری زندگی برباد کرنے کے بعد اس عورت کو اب جینے کا کوئی حق نہیں۔"

نہ جانے میرے اندر اتنا حوصلہ کہاں سے آگیا۔ میں چند لمحے اس کی انگارہ آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر ایک عجیب اعتماد کے سہارے میں نے نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں سلیم! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہم اس آگ میں اور نہیں کھیلیں گے.......... ہم خاموشی سے کسی جانب نکل جائیں گے۔ ہمیں کسی سے انتقام نہیں لینا۔"

"یہ نہیں ہوگا ثناء۔ وہ عورت آج رات کی صبح نہیں دیکھے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"پھر میرا آخری فیصلہ بھی سن لو۔ اس گھڑی کے بعد تم میری صورت کبھی نہیں دیکھو گے۔"

"مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں" وہ جیسے غضب میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ میں نے لپک کر اس کا کرتہ کھینچ لیا۔

"نہیں سلیم میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔" وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے کے مختصر رقبے میں ہم دونوں کے درمیان زبردست کشمکش شروع ہوگئی۔ شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر میں پوری جسمانی قوت سے اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی

اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل نکل رہا تھا۔ اس کی قمیض پھٹ گئی تھی اور میرے بازوؤں پر بھی خراشیں آرہی تھیں۔ تاہم یہ ساری جدوجہد خاموش تھی۔ ہمارے درمیان جن تیز فقروں کا تبادلہ ہو رہا تھا وہ بھی سرگوشیوں میں تھے۔ سلیم کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح مجھے جھٹک کر کھڑکی تک پہنچ جائے اور اسے کھول کر باہر نکل جائے۔ مجھ میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں ابھی تک اس کی مزاحمت کر رہی تھی۔ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلیم کا انداز دفاعی تھی۔ وہ مجھے کوئی ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ اس جیسے طاقتور اور مشتعل مرد کا ایک ہی تھپڑ مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر سکتا تھا.......... اس کشمکش کا انجام سلیم کی پسپائی پر ہوا۔ اچانک اس نے ہمت ہار دی۔ یکایک اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ایک خوفناک ٹکر مٹی کی دیوار پر پڑی پورا کمرا جیسے ہل کر رہ گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے وہ دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔ شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں، سلیم کے سر کی ضربوں سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا کمرا دھڑام سے ہمارے اوپر آگرے گا۔ اس کے سر میں کوئی عجیب سی قوت پوشیدہ تھی۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے ہمارے گھر کے سامنے قاسم اعوان اور برادران کو ٹکریں مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ پھر حویلی میں اس نے جس طرح لکڑی کی کھڑکی توڑی تھی۔ وہ منظر مرتے دم تک میری آنکھوں میں نقش رہے گا۔ بڑا ڈرامائی منظر تھا وہ..........

میں نے سلیم کے بال کھینچ کر اسے بمشکل اس پاگل پن سے روکا۔ دھم دھم کی آوازیں سن کر زینب کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے ہلکی سی مخصوص دستک دی۔ سلیم اب ماتھا زمین پر ٹیکے ہچکیوں سے رو رہا تھا اس کا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کوئی خوفناک ترین طوفان چڑھ کر اتر گیا ہو۔ میں نے دروازے کے پاس جاکر زینب کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ جاکر سو جائے۔ زینب چلی گئی تو میں سلیم کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس گھڑی وہ مجھے ایک روٹھا ہوا بچہ محسوس ہوا۔ ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے اس کا کھردرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگی۔ ہم دونوں کے درمیان وہ اب تک ایک طویل ترین گفتگو تھی مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ ہم نے اس رات اپنے آئندہ دنوں کی منصوبہ بندی کی۔ میں نے سلیم پر یہ بات کھول دی کہ میرے لئے سب سے مقدم چیز اپنے بچے کی سلامتی ہے۔ باقی

سب کچھ اس کے بعد آتا ہے۔ میں اپنے بچے کو حالات کی اس آگ سے بچا کر کہیں دور لے جانا چاہتی ہوں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم تینوں اپنے ماضی سے ہر ناطہ توڑ لیں اور اس جاگیر کے خدائی فوجداروں کے اثر و رسوخ سے دامن بچا کر کوئی دور دراز کی پناہ گاہ ڈھونڈ لیں۔ میں نے سلیم کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی سر توڑ کوشش کی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم دونوں کراچی نکل جائیں اور وہاں فرضی میاں بیوی کی حیثیت سے کم از کم دو برس نہایت خاموشی سے گزاریں۔ میرے پاس جو زیور ہے وہ ہماری ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ اگر کوئی سبب پیدا ہوا تو چھوٹا موٹا کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران ہم یہ بھی فیصلہ کرلیں گے کہ آئندہ زندگی ہم نے کیسے گزارنی ہے۔ بحیثیت ایک عورت مجھے معلوم تھا کہ میری تجاویز میں سلیم کے لئے کافی کشش موجود ہے اور میں اس سلسلے میں مخلص بھی تھی.......... درحقیقت میں ماضی کو بھول کر ایک الگ نئی زندگی شروع کرنے کی خواہاں تھی ایسی زندگی جس میں میرا بچہ مستقبل کی آفتوں سے محفوظ رہ سکے.......... لیکن انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔ میں بھی آنے والی گھڑیوں سے یکسر بے خبر تھی۔ سلیم کو اپنی تجاویز پر نیم رضامند کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گئی۔ زینب کے گھر میں اگلا دن ہم نے روانگی کی تیاریوں میں گزارا۔ فیصلہ ہوا کہ کل صبح تین چار بجے ہم پکی سڑک کی طرف روانہ ہوں گے۔ اور چھ بجے والی پہلی بس کے ذریعے جھنگ پہنچ جائیں گے۔ زینب کے گھر میں وہ ہماری آخری رات تھی۔ سلیم سرشام ہی سو گیا تھا قریباً نو بجے بچے کو دودھ پلا کر میں بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس وقت میری نگاہ سلیم کے پستول پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے دیوار سے لٹکا ہوا یہ پستول خون میں رنگا ہوا ہے۔ اس خون میں میرے شوہر کا خون شامل تھا اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے ابھی اس پستول سے قتل ہونا تھا۔ مجھے اس خونی ہتھیار سے شدید خوف محسوس ہوا۔ یہ ہتھیار سلیم کو اور اس کے ساتھ مجھے بھی سنگین ترین مجرموں کی صف میں کھڑا کر سکتا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ اس پستول کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے اسے ہولسٹر سے نکالا۔ سوئے ہوئے سلیم پر ایک نگاہ ڈالی اور بہ آہستگی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ کھڑکی کھول کر میں نے باہر جھانکا میرے سامنے دس پندرہ فٹ چوڑی گلی تھی اور گلی کے دوسرے کنارے پر کائی جمے جوہڑ کے سطح تھی۔ اس جوہڑ

میں سارا دن گاؤں کی بطخیں قیں قیں کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت ہر سو ٹھٹھری ہوئی خاموشی طاری تھی لہٰذا جب میں نے پستول اچھال کر جوہڑ میں پھینکا تو پانی میں چھپاکے کی آواز دور تک گئی۔ میں نے کھڑکی بند کی اور واپس آکر اطمینان سے لحاف میں لیٹ گئی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنی دو طلائی چوڑیاں اتاریں اور تکیے کے نیچے رکھ دیں میں چاہتی تھی یہ چوڑیاں زینب کو میرے جانے کے بعد ملیں۔ یہ چوڑیاں میری طرف سے ان کوششوں کا اعتراف تھا جو زینب نے اپنی اور اپنے بچوں کی جان خطرے میں ڈال کر ہمارے لئے کی تھیں۔ خیالوں کے تانے بانے بنتے نہ جانے کس گھڑی آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک نامانوس شور پھیلا ہوا تھا۔ میں اور سلیم ساتھ ساتھ ہی اٹھے تھے۔ صحن میں چیخ وپکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر خوفناک دھماکے سنائی دیئے اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں آکر دروازے کو لگیں۔ میں نے آہنی قفل ٹوٹ کر نیچے گرنے کی آواز سنی۔ تب ایک کڑکدار آواز سنائی دی۔ کسی نے ہم دونوں کو مشترک گالی دی اور بولا۔

"دروازہ کھول کر باہر آجاؤ ورنہ اندر ہی بھون کر رکھ دیں گے۔"

مجھے لگا جیسے ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن نہیں یہ سب کچھ حقیقت تھا۔ سلیم نے مجھے کھڑکی کی طرف دھکیلا اور خود اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ ہولسٹر خالی تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے چکرا کر رہ گیا۔ "پستول کہاں ہے؟" وہ کراہا۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھایا' چارپائی کے نیچے دیکھا مگر وہ وہاں ہوتا تو ملتا۔ وہ چیخا "ثناء تم بھاگ جاؤ" ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو پستول بردار دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ اگلے شخص کے پستول سے شعلہ نکلا اور سلیم اپنا گھٹنا پکڑ کر دوہرا ہوگیا۔ میں نے فرحان کو سینے سے لگایا اور چیخ کر ایک کونے میں دبک گئی۔ تین افراد نے سلیم کو جکڑنا چاہا تو وہ پوری وحشت کے ساتھ ان سے بھڑ گیا۔ میں نے دو افراد کو اس کی ٹکریں کھا کر لڑکھڑاتے دیکھا۔ تیسرے نے اس کی سر پر ریوالور کا دستہ مارنا چاہا مگر اس نے سر بچا کر حملہ آور کے سینے پر ایسی ٹانگ ماری کہ وہ اچھل کر میرے قدموں میں آن گرا۔ اس وقت اس ایک شخص عقب سے آیا اور اس نے ایک فٹ لمبا چھرا نہایت بے دردی سے سلیم کی کمر میں گھونپ دیا وہ کراہ کر گھٹنوں کے بل گرا۔ میری آنکھوں کو کچھ اور دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ کھڑکی بلندی پر تھی اور میں اس میں سے کود کر باہر

نہیں نکل سکتی تھی۔ نجات کا واحد راستہ دروازہ تھا۔ میں فرحان کے ساتھ جھکتی اور لپکتی ہوئی دروازے کی طرف گئی اس سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ ابھی چند قدم آگے گئی تھی کہ کسی نے عقب سے زوردار دھکا دیا۔ میں اوندھے منہ گری۔ فرحان میری بانہوں سے نکل کر دور تک لڑھکتا اور چیختا چلا گیا اس وقت میری نگاہ اپنے دیور شجاع پر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص اور تھا دونوں کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر بے تابانہ فرحان کی طرف لپکنا چاہا لیکن تین سائے بلاؤں کی طرح مجھ پر جھپٹے اور مجھے جکڑ لیا شجاع بڑے خوف ناک انداز میں معصوم فرحان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے خونی ہاتھ اس بے گناہ کی گردن تک پہنچتے۔ اندھیرے سے ایک عورت چیل کی طرح جھپٹی اور فرحان کو سینے سے لگا کر لنگڑاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی یہ زینب تھی۔

"بھاگنے نہ پائے۔" لمبے تڑنگے شخص نے چلا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے دیور کے ساتھ خود بھی باہر کو بھاگا۔ زینب نے دروازے سے نکلتے نکلتے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والوں نے دروازہ بند پایا تو بوکھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئے۔ آخر ایک شخص دیوار پھاند کر باہر گیا اور کنڈی کھولی۔ دروازے کھلتے ہی سب کے سب بھرا مار کر باہر نکل گئے۔ مجھ پر جھپٹنے والے دو بدمعاش بھی مجھے چھوڑ کر دروازے کی طرف بھاگے۔ اب صرف ایک شخص مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں نے خود کو اس سے چھڑالیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں نے اس کی آنکھ میں انگلی ماری تھی یا اس کے پیٹ میں ضرب لگائی تھی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوگیا۔ ایک لمحے کی چھوٹ غنیمت جان کر میں اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ کان ہر لحظہ گولی کی آواز پر لگے ہوئے تھے.......... وہ گولی جو عقب سے مجھ پر چلائی جانی تھی مگر وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ عقب سے کوئی بندوق میری طرف سیدھی ہوتی اور کوئی انگلی ٹرائیگر دباتی میں بیرونی دروازہ پار کر کے سامنے مونگروں کے کھیت میں گھس چکی تھی۔ یہ کھیت گھر کے عین سامنے واقعہ تھے۔ اگلا کھیت کماد کا تھا۔ یہ کافی اونچا تھا۔ اس میں گھس کر مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی میں موت کو ٹالنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔ میری جوتی برآمدے میں میرے پاؤں سے نکل چکی تھی۔ دوپٹہ

صحن میں رہ گیا تھا اب میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھیت میں بھاگ رہی تھی۔ کھیت کے اونچے نیچے وٹوں پر تلوؤں کے زخمی ہونے کا کافی سے زیادہ سامان موجود تھا اور میرے تلوے زخمی بھی ہو رہے تھے۔ تاہم اس وقت یہ تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں اپنے عقب میں ہاہاکار سن رہی تھی۔ جاگیردار کے کارندے پھیل کر میرے تعاقب میں آ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں میں ایک اور آواز پڑی میں سرتاپا لرز گئی۔ یہ کتوں کی آواز تھی۔ حویلی کے شکاری کتوں کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ایسے ہی چند کتوں کو ہم نے حویلی سے فرار ہوتے وقت گولی ماری تھی۔ یہ تازی کتے خاص طور پر سدھائے گئے تھے اور مرتے دم تک اپنے شکار کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک دفعہ میں حویلی میں ان درندوں کی درندگی کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ انہوں نے حویلی کی ملازمہ کے ایک معصوم بچے کو جو غلطی سے کتوں کی طرف چلا گیا تھا پلک جھپکنے میں تکہ بوٹی کر دیا تھا۔ وہ خونی منظر میرے تصور میں آیا اور اپنی کٹی پھٹی لاش میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔

"اے خدا میری مدد کر......... اے مالک میری مدد کر" میں بھاگ رہی تھی اور زیرلب پکار رہی تھی۔

رات کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی اور اونچے نیچے کھیتوں میں اوس سے بھیگی ہوئی زمین پر وہ ایک جان لیوا تعاقب تھا۔ مجھے وہ سب کچھ دھندلا دھندلا یاد ہے۔ میں بھاگ رہی تھی، لڑکھڑا رہی تھی، گر رہی تھی اور اٹھ رہی تھی۔ میرے چاروں طرف موت کی پرچھائیاں تھیں۔ گولیوں کی آوازیں اور غنڈوں کے للکارے اس ہنگامے کو اور بھی خوفناک بنا رہے تھے، پتہ نہیں میں کتنی دیر تک بھاگتی رہی۔ شاید دس منٹ، شاید بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ، پھر مجھے اندازہ ہوا کہ موت کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ کتوں کی آوازیں مجھے اپنے عین عقب سے سنائی دینے لگیں۔ بس اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ایک آدھ ہانپتا غراتا کتا مجھے عقب سے دبوچنے والا تھا یا کوئی سنسناتی گولی انگارے کی طرح میری پشت میں اترنے والی تھی......... ایکاایکی پوری رات کا چاند تاریک بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا اور ہر طرف اجالا پھیل گیا۔ مجھے اپنے سامنے صرف بیس گز کی دوری پر ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ یہ جیپ صرف دو تین سیکنڈ پہلے یہاں آکر رکی تھی اور اس کے پہیوں کی اڑائی ہوئی گرد ابھی تک فضا میں تھی۔ مجھے دیکھ کر چند افراد نے چھلانگیں لگائیں اور میری

طرف لپکے۔ میں اب چاروں طرف سے گھر چکی تھی۔ چکمہ دے کر میں نے ایک چادر پوش کے پہلو سے گزرنا چاہا مگر اس نے جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔ میں نے دیوانہ وار خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہوش کر کڑیئے......... ہوش کر۔"

اس اجنبی آواز نے مجھے پہلی بار احساس دلایا کہ میں اپنے دشمنوں کے نرغے میں نہیں۔ یہ احساس اس وقت یقین میں بدل گیا جب اوپر تلے دو فائر سنائی دیئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا مجھ سے صرف دس گز کی دوری پر ایک کتا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ یہ کتا جیپ سے کئے جانے والے فائر سے زخمی ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں کھیتوں سے کئی اور کتے برآمد ہوئے مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں رخ بدلنا پڑا۔ جیپ سے تابڑ توڑ ہوائی فائرنگ کر کے انہیں دھمکا دیا گیا تھا۔ ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے کھینچ کر جیپ کے اوپر چڑھا دیا۔ کتے بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جلد ہی ان کے رکھوالے بھی ہانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں تھیں اور تیور انتہائی خطرناک نظر آتے تھے۔ ان کے عقب میں تین عدد مسلح گھڑ سوار تھے۔ ان کے کندھوں پر آویزاں گولیوں کی پیٹیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ غالباً جاگیردار کے کارندے میرا تعاقب ٹولیوں میں بٹ کر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک "خوش قسمت" ٹولی اب میرے سامنے کھڑی تھی۔ جیپ کے سواروں کو دیکھتے ہی میرے تعاقب میں آنے والے اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ رکھوالوں نے آگے بڑھ کر کتوں کو زنجیریں پہنا دیں اور گھڑ سوار گھوڑوں کو پرسکون کرنے کے لئے ان کی گردنیں تھپتھپانے لگے۔ اس دوران قریبی درختوں سے کچھ اور افراد بھی بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی تک معاملے کی نوعیت سے بے خبر ہیں۔ تاہم ان کے ہاتھ اپنی رائفلوں پر تھے اور ان کے بشروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نام پتہ پوچھے بغیر گولی مار دیتے ہیں۔ میرے تعاقب میں آنے والے گھڑ سوار اور پیدل افراد تھوڑی دیر جلتی نظروں سے جیپ والوں کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے رخ موڑا اور کھیتوں میں چلتے ہوئے اوجھل ہوگئے۔

حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے ارد گرد کے ماحول پر توجہ دی۔ میں کوئی دس عدد

مردوں کے نرغے میں تھی۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوتا۔ اگر ان کے دل بھی ان کی صورتوں کی طرح تھے تو اس ویرانے میں اور رات کے اس پہر میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص جس کا قد لمبا' شانے گول اور چہرہ بھرا ہوا تھا' میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بڑی بڑی مونچھوں نے اس کے چہرے کو اور بھی خوفناک بنا رکھا تھا۔ اس نے تہبند پر کڑھائی دار کرتا پہن رکھا تھا اور گلے میں سونے کا کینٹھا چمک رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔

"او کڑیئے! یہ لچے تیرے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟

اس کے سوال کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان لچوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ واصف چنگیزی اور اس کے گھرانے کے بارے میں جانتا ہو گا۔ گو ہم واصف چنگیزی کی حویلی اور اس کی زمینوں سے کافی دور آ چکے تھے مگر واصف کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں تھا۔ اسے اور اس کے کارندوں کو پہچاننے والے دور دور تک مل سکتے تھے۔ دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ یہ لوگ کوئی بھی ہیں بہرحال چنگیزی گھرانے سے ان کی لگتی ہے۔ غالباً کوئی پرانی عداوت وغیرہ ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتانا چاہیئے یا نہیں اور اگر بتانا چاہیئے تو کیا؟ مجھے خاموش دیکھ کر وہ شخص گرجا۔

"کڑیئے! میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا؟"

میرا دل بھر آیا اور آنسو جو میں نے بمشکل آنکھوں سے دور روک رکھے تھے حفاظتی بند توڑ کر بہہ نکلے۔ میں کوشش کے باوجود اپنی ہچکیوں پر قابو نہ رکھ سکی اور میرے رونے کی صدا سناٹے میں دور دور تک پھیلنے لگی۔

"لو بھئی! یہ نیا ڈرامہ شروع ہوگیا" کینٹھے والے شخص نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں دور کھڑا ایک شخص پکارا کر بولا "چودھری جی! چکوراں ڈگن لگ پئیاں نیں۔"

یکایک تمام افراد میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ایک ہی لمحے میں انہوں نے مجھے فراموش کر دیا اور اس واقعے کو بھی جو چند منٹ پہلے یہاں رونما ہو چکا تھا۔ چودھری نے

پکار کر اپنے ایک کارندے کو حکم دیا۔

"اس کڑی کو چڑھاؤ جیپ میں اور اس کتے کو بھی رکھ کر لے آؤ۔"

اس کا اشارہ اس کتے کی طرف تھا جو ذرا دیر پہلے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوا تھا۔ ایک شخص نے مجھے دوبارہ جیپ پر چڑھنے کا حکم دیا۔ ایک دوسرے اجڈ سے شخص نے مردہ کتے کو پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر کھٹاک سے جیپ کے فرش پر دے مارا۔ جیپ اسٹارٹ ہوگئی اور موڑ کاٹ کر نہایت تیزی سے درختوں کی طرف بڑھی۔ یہاں میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کئی افراد ٹارچیں لئے درختوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ کبھی کبھی دھپ کی آواز آتی اور کوئی پرندہ کسی درخت سے زمین پر آگرتا۔ چودھری کے کارندے اس کی طرف لپکتے اور اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیتے۔ ایک شخص ایک بھرا ہو تھیلا جیپ میں رکھنے آیا تو میں نے دیکھا یہ پرندے چکور تھے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا کیا گیا تھا کہ وہ بے دم ہو کر شاخوں سے نیچے گر رہے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں ان لوگوں نے کوئی چار تھیلے پرندوں سے بھر لئے۔ چاندنی رات میں چکور کے اس عجیب وغریب شکار سے فارغ ہو کر چودھری اور اس کے کارندوں نے شمال کا رخ کیا۔ مجھے رہ رہ کر فرحان کا خیال آ رہا تھا۔ زینب اسے لے کر بھاگی تھی۔ معلوم نہیں وہ پکڑی گئی یا نکل گئی تھی۔

اگر وہ پکڑی گئی تھی تو........ اس سے آگے میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب سلیم خنجر کا مہلک زخم کھا کر اوندھے منہ گرا تھا۔ "شاید اب تک وہ لوگ اسے دفن بھی کر چکے ہوں" آہ یہ کیا ہوگیا........ یہ سب کیا ہوگیا۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں۔ پھر میں نے اپنی خالی گود دیکھی۔ اپنی چھاتی کو اپنے بچے کے ننھے ہاتھوں کے لمس سے محروم پایا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سب خواب نہیں۔ "ہائے میرا بچہ" میرے سینے سے دلدوز سسکی نکلی اور میں ایک بار پھر رونے لگی۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے چودھری نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ذرا صبر کر کڑیئے' گھر پہنچ کر تیری ساری کہانی سنیں گے اور اگر تیری مدد کر سکے تو مدد بھی کریں گے۔"

جیپ لہراتی ہوئی برگد کے دو بڑے درختوں کے نیچے رک گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گھڑسوار بھی یہاں آکر ٹھہر گئے۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ ایک طرف چند کچے کوٹھے

تھے۔ کوٹھوں کے سامنے دھونی رچی ہوئی تھی اور ایک دروازے کے اندر سے لالٹین کی روشنی بھی نظر آرہی تھی۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور جیپ کی کھڑکھڑاہٹ سن کر ایک عمر رسیدہ شخص لالٹین تھامے کوٹھے سے باہر نکل آیا۔ اتنی سخت سردی میں بھی اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر چودھری نے اپنے ایک کارندے سے کہا۔

"ہاشو! دو تھیلے بابے جی کے لئے ہیں" پھر اس نے بوڑھے کو مخاطب کر کے ہانک لگائی "باباجی اپنا حصہ لے لیں آکر۔"

بوڑھا جھک کر چلتا جیپ کے پاس آیا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں اور حلیہ ملنگوں جیسا تھا۔ ہاشو نامی کارندے نے چکوروں سے بھرے ہوئے دو تھیلے بوڑھے کے قدموں میں رکھ دیئے۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر درویشانہ انداز میں دعا دی۔

"اللہ تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے، تو فقیروں کو خوش کرتا ہے اوپر والا تجھے خوش کرے۔"

چودھری نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور ملنگ کے ہاتھ میں تھما کر کہا "بابا! یہ لنگر کی روٹی کے لئے۔"

یہ روپے بھی فقیرانہ شان کے ساتھ رکھ لئے گئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور چند اونچے نیچے راستوں پر سفر کرنے کے بعد ایک گاؤں میں داخل ہوگئی۔ رات کے اس پہر چودھری کا استقبال کرنے کے لئے گاؤں کے آوارہ کتوں کے سوا اور کون آسکتا تھا۔ سو وہ آئے۔ اور ان کی دو رویہ قطاروں سے گزر کر جیپ پرانی طرز کی ایک حویلی کے سامنے جا رکی۔ یہ مکان نما حویلی خالص دیہاتی طرز کی تھی۔ اس کے کھلے پھاٹک سے گزر کر جیپ احاطے میں پہنچی۔ میرے ذہن میں کلبلاتے ہوئے اندیشے چیخنے چنگھاڑنے لگے۔ گاؤں سو رہا تھا اور میں اجنبی مردوں کے ساتھ ایک اجنبی چار دیواری میں تھی۔ چودھری کے کہنے پر میں جیپ سے اتر تو آئی مگر اب میرا ہر قدم من من کا ہو چکا تھا۔ چودھری کی تیز نظروں نے میری ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا۔ وہ اپنے نوکر سے بولا۔

"جا اوئے ہاشو! رضیہ کو بلا کر لا۔ وہ اسے زنان خانے میں لے جائے" رضیہ کا نام سن کر میری جان میں جان آئی۔ اس کا مطلب تھا اس چار دیواری میں عورتیں بھی موجود

ہیں۔ تاہم میرا یہ اطمینان دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ چودھری نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "میں ابھی تھانیدار کو لے آتا ہوں، اس کا بیان لینے کے لئے۔"

پولیس کا نام سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں مظلوم ہونے کے باوجود مجرم بھی تھی۔ مجھ پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام تھا اور قانون کے کاغذوں میں مفرور تھی۔ میں نے بے ساختہ کہا "نہیں چودھری صاحب! پولیس کو اطلاع نہیں دینا، میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں...... لیکن...... لیکن آپ" ایک بار پھر الفاظ میرے حلق میں گھٹ گئے اور میں ہچکیوں سے رونے لگی۔ چودھری اور موقعے پر موجود دوسرے افراد میری طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں کی چبھن میں بہت دیر پہلے سے محسوس کر رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے بتانے سے پہلے ہی یہ لوگ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہ گمان بھی ہو رہا تھا کہ چودھری نے "پولیس" کی بات صرف میرا ردعمل دیکھنے کے لئے کی ہے۔ بہرحال اس موقع پر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا یہ سب میرا وہم ہو۔ میرے جسم پر اس وقت ایک بوسیدہ سا دیہاتی لباس تھا۔ درحقیقت میں زینب کی اترن پہنے ہوئے تھی۔ اپنی بول چال سے بھی میں نے کسی طرح کے شہری پن کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ ہاتھوں کی طلائی چوڑیاں ابھی تک کسی نے نہیں دیکھی تھیں جو واحد شے ان لوگوں کو کسی شبے میں مبتلا کر سکتی تھی وہ میرے کانوں کے وزنی جھمکے تھے۔ میں انہیں بھی بار بار اپنے بالوں میں چھپانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

چودھری نے اپنی گرم چادر میرے سر پر ڈال دی اور رضیہ نامی عورت سے بولا۔

"چل اس کو اندر لے جا" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اچھا کڑیئے! چپ کر اب، ہم نہیں بتاتے پلس کو۔"

رضیہ نے میرا بازو تھاما اور ساتھ لے کر زنان خانے کی طرف چل دی۔ زنان خانہ ایک وسیع برآمدے اور پانچ چھ کمروں پر مشتمل تھا۔ برآمدے کے کچے ستونوں سے دو روشن لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ میری آمد کی خبر یہاں تک پھیل چکی تھی اور بہت سی عورتیں مجھے دیکھنے کے لیے جمع تھیں۔ یہ سب کی سب سوئی ہوئی اٹھی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے، ہونٹ اور آنکھیں سوجی سوجی، لباس شکن شکن، ان میں دو تین بوڑھی عورتیں

تھیں۔ باقی کی عمریں پندرہ اور تیس کے درمیان تھیں۔ ان سب کی نگاہوں میں بھی مجھے وہی چبھن محسوس ہوئی تھی جو اس سے پہلے میں مردوں کی نگاہوں میں محسوس کر چکی تھی۔ ایک دو کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں بھی نظر آئیں۔ پھر پچیس تیس برس کی ایک دراز قد خوبرو عورت آگے بڑھی۔ اس نے محبت سے میرا بازو تھام لیا اور بولی۔

"آ بہن! کھڑی کیوں ہے ادھر آرام سے بیٹھ جا۔"

ایک بوڑھی عورت نے کہا "حمیدہ! ادھر سردی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں ہی لے جا ویسے بھی گھبرائی ہوئی ہے بیچاری" پھر وہ دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ڈانٹ کر بولی "چلو ری چلو اپنے اپنے ٹھکانے پر چلو۔ کوئی تماشا نہیں لگا ہوا" عورتیں جن میں زیادہ تر ملازمائیں تھیں۔ مختلف کمروں کی طرف کھسک گئیں۔

بڑھیا کی آواز حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ حمیدہ نامی وہ عورت مجھے لے کر ایک کمرے میں آ گئی۔ ایک طاقدان میں لالٹین روشن تھی۔ یہ کمرہ دیہاتی انداز میں سجا ہوا تھا۔ مٹی سے پوتی ہوئی دیواروں پر رنگین نقش و نگار' الماریوں میں برتنوں کی قطاریں' ایک کونے میں اناج کا ذخیرہ کرنے والا "بھڑولا" پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں چارپائیوں کو اوپر نیچے رکھ کر چھت تک پہنچا دیا گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے کمرے میں حمیدہ کے علاوہ دو تین اور عورتیں بھی سو رہی تھیں۔ حمیدہ نے ان سب کو دوسرے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔ اب ہم دونوں تنہا تھیں۔ یہ گورے چٹے چہرے اور بھرے بھرے جسم والی عورت مجھے پہلی نگاہ میں ہی بھلی لگی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دوسری تمام عورتوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہی پوچھا "میں کہاں ہوں؟"

وہ بولی "تم پال پور گاؤں میں ہو۔ چودھری شہاب کے گھر میں۔"

چودھری شہاب کا نام سن کر میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر ایک دم سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں سکتے کی حالت میں حمیدہ کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ چودھری شہاب کا نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں حویلی میں کئی بار یہ نام سن چکی تھی۔ میری معلومات کے مطابق شہاب ایک خطرناک شخص تھا۔ چنگیزی گھرانے سے اس کی پرانی عداوت تھی۔ پچھلے دنوں حویلی میں یہ بات مشہور تھی کہ شہاب کے کچھ پالتو غنڈے جیل سے مفرور ہیں اور وارداتیں کر رہے ہیں۔ حویلی میں خطرہ

ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ لوگ حویلی کا رخ بھی کر سکتے ہیں........ اور اب میں اس چودھری شہاب کے گھر میں تھی۔ حالات کا دھارا مجھے بہا کر کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر حمیدہ نے بڑی محبت سے بالوں کی لٹ میری پیشانی سے ہٹائی اور بولی۔

"میرا خیال ہے تم بھائی شہاب کا نام پہلے سے جانتی ہو؟"

"ہاں........ بہن" میں نے گھبرا کر کہا۔

"دیکھ میری بہن" اس نے پیار سے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا "اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم کون ہو" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ حمیدہ بولی "بہرحال یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ بھائی شہاب کی مرضی کے بغیر نہ پولیس یہاں پہنچ سکتی ہے اور نہ چنگیزیوں کا کوئی بندہ........" میری پیشانی سخت سردی میں پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے میری بربادی کے افسانے یہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے چودھری شہاب اور اس کے ساتھیوں کی چبھتی ہوئی نظریں یاد آئیں۔ وہ دبی دبی سرگوشیاں یاد آئیں جو صحن میں عورتوں نے مجھے دیکھ کر کی تھیں۔ میں اپنے ہی عرق ندامت میں ڈوبنے لگی۔ آنکھوں نے ایک بار پھر ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی۔ مجھے روتا دیکھ کر حمیدہ نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "ہائے میرا بچہ........ پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا' کس حال میں ہوگا" حمیدہ مجھے پچکارنے لگی۔ کچھ دیر بعد دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو حمیدہ نے کہا۔

"حوصلہ رکھ میری بہن! بھائی شہاب سب کچھ ٹھیک کر لے گا۔"

اتنے میں دروازے پر کھنکارنے کی بھاری مردانہ آواز آئی اور چودھری شہاب لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ کچھ دیر حوصلے تسلی کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"دیکھ بی بی! ہم نے تجھے پناہ دی ہے اور تیری پوری مدد بھی کریں گے لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ تو سارا حال احوال کھول کر بیان کرے۔"

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی گود میں وہی مڑا تڑا اخبار پڑا تھا جس میں میری بربادی کا اشتہار لگا تھا۔ یعنی چند روز پہلے میرے شوہر کے قتل اور میرے فرار کی خبر چھپی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ زمیندار شہاب اور اس حویلی کے تمام مکین میرے بارے میں قریباً سب ہی کچھ جانتے ہیں اور ان سے اپنا آپ چھپا کر میں ان کی ہمدردیاں کھونے کے سوا

اور کچھ نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کیا اور حویلی سے نکلنے کے بعد کے تمام واقعات اختصار کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر ان کے گوش گزار کر دئے۔ جیپ خراب ہونے سے زینب کے گھر تک پہنچنے اور اپنے سسرالیوں کے شب خون سے لے کر فرحان کی جدائی تک سب کچھ انہیں بتا دیا۔ دونوں بہن بھائی توجہ سے سنتے رہے۔ گاہے گاہے سوال بھی پوچھتے رہے۔ میری روئیداد کے ختم ہوتے ہوتے چودھری شباب اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"بی بی! میرا خیال ہے کہ تو "ٹبے والی" گاؤں کی بات کر رہی ہے۔ میں ابھی اپنے مخبر بھیج کر پتہ کرواتا ہوں کہ تیرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا ہے۔"

میں نے التجا کے لہجے میں کہا "شباب صاحب! میرے بیٹے کا پتہ ضرور کرائیں۔ ہو سکتا ہے زینب گاؤں ہی کے کسی گھر میں گھس گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آس پاس کے کھیتوں میں کہیں چھپی ہوئی ہو۔"

یہ بات کرتے ہوئے میں نے پہلی بار نظر بھر کر چودھری شباب کی صورت دیکھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے خدوخال نمایاں تھے۔ چہرہ سخت گیر ضرور تھا مگر بدصورت نہیں تھا۔ وہ سرتاپیر ایک دیہاتی باشندہ نظر آتا تھا۔

اگلے پانچ چھ روز میرے لئے بے حد ہیجان خیز تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے پاؤں زمین سے اکھڑ چکے ہیں اور میں ذرہ ذرہ ہو کر فضاؤں میں بکھری ہوئی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ صرف دو برس قبل کالج جانے اور خواب دیکھنے والی لڑکی کن ان دیکھے راستوں پر نکل آئی تھی۔ وہ کتنی تیزی سے خانہ آبادی سے خانہ بربادی کی منزل تک پہنچی تھی اور اب.......... اس کی گود خالی تھی اور اسے سہارا دینے والے بازو بھی ٹوٹ چکے تھے۔

"ٹبے والی" گاؤں کے جو حالات چودھری شباب کی زبانی معلوم ہوئے تھے ان کے مطابق زینب کا کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا۔ گاؤں سے باہر ایک کنویں کے پاس اس کی اوڑھنی پڑی ہوئی ملی تھی جس پر خون کے دھبے تھے.......... سلیم کو شدید زخمی حالت میں جھنگ کے سرکاری ہسپتال میں پہنچایا گیا تھا جہاں اس پر پولیس کا پہرا تھا اور اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ چودھری شباب کے بندوں نے اپنے طور پر سراغ لگایا تھا کہ اس سارے واقعے کا ذمے دار زینب کا بھائی تھا۔ وہی بھائی جو میری طلائی چوڑی بیچنے شہر گیا تھا۔ زینب نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے انعام کے لالچ میں آ کر میرے سسرالی رشتے داروں کو میرے اور سلیم کے متعلق اطلاع دے دی اور وہ ہم دونوں بلکہ فرحان سمیت تینوں کا قصہ پاک کرنے کے لئے ٹبے والی گاؤں پہنچ گئے۔ چودھری شباب نے بتایا کہ میرے آدمی زینب کے بھائی کو پکڑ کر لے آتے مگر اسے کسی طرح بھنک پڑ گئی ہے اور وہ گاؤں سے غائب ہے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میرے سسرال والوں کو جو اب میرے جانی دشمن تھے

میرے نئے ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں اس وقت پال پور گاؤں میں زمیندار شہاب کی تحویل میں ہوں۔ زمیندار شہاب کوئی معمولی آدمی نہیں تھا ورنہ اب تک میرے ساتھ ساتھ اس کے ٹکڑے بھی ہو چکے ہوتے۔ میرے سسرالیوں کے سامنے اب دو راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ براہ راست جا کر پولیس میں اطلاع دیں اور انہیں بتائیں کہ ان کی مفرور قاتلہ اس وقت چودھری شہاب کی حویلی میں ہے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ پولیس کو بیچ میں لائے بغیر اپنے طور پر بزور بازو یہ معاملہ نبٹانے کی کوشش کریں۔ چودھری شہاب کو پختہ یقین تھا کہ چنگیزی دوسرا راستہ ہی اختیار کریں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ان کے خاندان کا رواج ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ پانچ روز گزرنے کے باوجود ابھی تک پولیس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ حالانکہ انہیں وقوعہ کے چار پانچ گھنٹے بعد ہی چودھری شہاب کے دروازے پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس کا مطلب تھا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بنے گی۔ تاہم چودھری شہاب ہر صورت حال کے لئے تیار تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا
"بی بی! اگر پلس آئی بھی تو اسے شہاب کی حویلی سے کچھ نہیں ملے گا۔"

اب دیکھنا یہ تھا کہ پولیس آتی ہے یا میرا دیور شجاع اپنے پالتو غنڈوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ کسی تیسری طرف کا دھیان نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ ایک سرد دوپہر تھی۔ دو تین روز بعد تھوڑی سی دھوپ نکلی تھی۔ حمیدہ نے بااصرار میرا سر دھلوایا اور چھت پر جا کر میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اس دوران اس کی والدہ نے اسے نیچے صحن سے آواز دے دی۔ وہ نیچے چلی گئی۔ میں بھی نیچے جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ جوتی تلاش کر کے پہنی تو ایک دم چونکنا پڑا۔ بائیں پاؤں کی انگلیاں جوتی کے اندر کسی شے سے ٹکرائی تھیں۔ یہ ایک بند جوتی تھی جسے عام زبان میں "پمپی" بھی کہا جاتا ہے۔ جوتی کے اندر کوئی کاغذ ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے پاؤں نکال کر یہ کاغذ باہر کھینچا۔ یہ ایک مڑا تڑا نیلا لفافہ تھا۔ اس پر نیلی سیاہی میں ثنا محمود کے الفاظ دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ یہ لفافہ یہاں کیسے آیا اور اس پر میرا نام؟ اچانک ہی مجھے کسی گھمبیر خدشے کا احساس ہوا۔ میں نے لفافہ لباس میں چھپایا اور تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے ایک کمرے میں آ گئی۔ اندر سے کنڈی چڑھا کر میں نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ اندر کاپی سائز کا

ایک کاغذ تھا اور زخموں پر باندھنے والی سوتی پٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ ٹکڑے کی چار تہیں کی گئی تھیں۔ ان تہوں میں سفید روئی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے روئی کھول کر دیکھا۔ میری آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ روئی پر خون کے سرخ دھبے تھے اور ان دھبوں کے درمیان ایک ننھے منے بچے کی انگلی کی پور رکھی تھی۔ پور کو ناخن سمیت کاٹا گیا تھا اور کٹے ہوئے کنارے ہلکے سیاہ ہو چکے تھے۔ گوشت کی سیاہی مائل سرخی کے اندر سے نرم ہڈی کی سفیدی جھانک رہی تھی۔ میں جیسے پتھر ہو گئی۔ میری آنکھیں بھی پتھرا گئیں اور میرا دماغ بھی۔ میں جسم کے اس ٹکڑے کو پہچان سکتی تھی۔ یہ تو پوری ایک پور تھی۔ اگر اس انگلی کا ہزارواں حصہ بھی ہوتا تو شاید میں اسے پہچان لیتی۔ یہ ننھی پور میرے جسم کا حصہ تھی۔ یہ بارہا میری چھاتی پر رینگی تھی اور بارہا میرے ہونٹوں نے اسے چوما تھا۔ میں اسے کیوں نہ پہچانتی؟ کیوں نیم پاگل نہ ہو جاتی؟ میری نگاہیں' میری لرزتی کانپتی نگاہیں کاپی سائز کے صفحے پر جم گئیں۔ لکھا تھا۔

ثناء محمود!

یہ تیرے بچے کی انگلی ہے۔ بڑے پیار سے کاٹی ہے۔ پھر بھی کمبخت بڑا رویا چلایا ہے۔ تین گھنٹے ہو چکے ہیں ابھی تک شیطان نے منہ میں زبان نہیں ڈالی۔ مجبوری ہے اب خواب آور انجکشن لگانا پڑے گا.......... بچے کو نہیں خود مجھے اپنے آپ کو' آخر سونا بھی تو ہے۔ ایسے ہی پانچ انجکشن میرے پاس اور رکھے ہیں شاید اگلے ہفتے تک کام آ جائیں۔ تم سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہے گا۔ شاید پرسوں تمہیں ایک ایسا ہی خط اور ملے.......... اگر یہ خط وکتابت تمہیں پسند نہیں تو کل رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان خانقاہ ڈوگراں کے سامنے روہی نالے کی دوسری پلی پر پہنچ جاؤ۔ پڑھی لکھی ہو' میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں تنہا ہونا چاہئے۔ ویسے اگر تم کسی چاچے مامے یا ڈی آئی جی' کمشنر وغیرہ کو ساتھ لانے میں انٹرسٹڈ ہو تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ تاہم اس کے بعد نتائج کی تمام ذمے دار تم پر ہوگی۔ ہو سکتا ہے ان چھوٹے چھوٹے لفافوں کی بجائے مجھے ایک بڑا پارسل ارسال کرنا پڑے۔

تمہارا خیر خواہ

نظر آنے والی ہر شے میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ذہن میں تیز آندھیاں

سی چل رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا میرا بچہ میرے سسرالی رشتے داروں کے قبضے میں ہے اور انہی میں سے کسی نے مجھے یہ خط لکھا ہے۔ لکھنے والا کون تھا؟ اور مجھے بلانے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ نیلا لفافہ میری جوتی میں پہنچا کیسے۔ غالباً یہ گھر ہی کے کسی ملازم یا ملازمہ کا کام تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی آنے جانے والے نے ہوشیاری سے یہ لفافہ میری جوتی میں رکھ دیا ہو۔ اس گھر کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت زنان خانے میں لسی کی چار پانچ بھری ہوئی چاٹیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ زنان خانے کی سب سے عمر رسیدہ عورت جو رشتے میں چودھری شہاب کی پھوپھی لگتی تھی ان چاٹیوں پر بیٹھ جاتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اور بچے قطار اندر قطار زنان خانے میں آنے لگتے تھے ان کے ہاتھوں میں ڈول' بالٹیاں اور گڑوے وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ دس گیارہ بجے تک لسی کے لئے آتے رہتے تھے ممکن تھا ان میں ہی سے کسی نے یہ لفافہ جوتی میں گھسیڑ دیا ہو.......... میں نے روتے ہوئے اس چھوٹی سی پور کو سینے سے لگایا اور نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑی۔

میرے سینے میں ماں کا دل تھا اور ماں کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں نے اس سانحے سے چودھری شہاب یا اپنے کسی اور خیرخواہ کو آگاہ کیا تو میرا فرحان زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس شقی القلب شخص کی بات مان لینی چاہئے۔ اس سوال کا جواب آسان نہیں تھا' میں مکمل طور پر اندھیرے میں تھی۔

میں ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کائنات میں صرف ایک ہی منظر اور ایک ہی آواز رہ گئی تھی۔ یہ منظر میرے فرحان کی سربریدہ انگلی کا منظر تھا اور یہ آواز اس کی روتی بلکتی صدا تھی۔ وہ اپنے سینے کی گہرائیوں سے رو رہا تھا اور مجھے پکار رہا تھا۔ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک ماں کے لئے یہ دنیا کس قدر عبرت ناک مقام بن چکی تھی۔ صبح ہوئی تو میرا پورا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ دوپہر تک بخار اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ میں قریباً بے ہوش ہو گئی۔ بے ہوشی کی حالت میں نے خود کو فرحان کا نام پکارتے سنا۔ پھر میں نے حمیدہ کو دیکھا جو میری پیشانی پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ رات کسی وقت میں نے دیکھا ایک کمپاؤنڈر نما شخص مجھ پر جھکا ہوا میرے بازو میں انجکشن لگا

رہا ہے۔ پورے دو روز میں بخار میں بے حال رہی۔ تیسرے روز صبح کے وقت قدرے افاقہ ہوا اور اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ہلکا ناشتہ کیا اور تھوڑی سی چہل قدمی کرنے کے بعد دوبارہ بستر پر آلیٹی۔ ذہن پر ایک بار پھر خوفناک اندیشوں کی یلغار ہونے لگی تھی۔ یکایک مجھے اپنے سر کے نیچے تکئے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی کاغذ غلاف کے اندر رکھا ہو۔ جسم جیسے اچانک بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھی اور خوفزدہ نظروں سے تکئے کی طرف دیکھنے لگی۔ اتفاقاً اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے لرزتا کانپتا ہاتھ تکئے کے غلاف میں ڈالا اور ایک کاغذ باہر نکال لیا۔ یہ ویسا ہی نیلا لفافہ تھا۔ اس کا ابھار محسوس کر کے دل میرے سینے میں پور پور کٹنے لگا۔ میں نے لفافہ چاک کیا وہی کاپی سائز کا منحوس صفحہ اور وہی خون کے دھبوں والی سفید روئی۔ اس دفعہ مجھے روئی کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میرے سینے سے ایک خاموش چیخ بلند ہوئی اور میں چکرا کر اوندھے منہ تکئے پر گر گئی۔ آپوں آپ میری ہچکیاں بلند ہونے لگیں اور آنسو آبشاروں کی طرح رخساروں پر بہنے لگے۔ اپنے بچے کی کٹی ہوئی پور میری مٹھی میں دبی تھی اور کانوں میں اس کی ہولناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ حالات اس قدر کٹھن اور انسان اتنا سفاک و بے رحم ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے حیوان تھے یہ کیسے شیطان تھے جو ایک دودھ پیتے بچے کو تڑپا تڑپا کر مار رہے تھے۔ میرے دل میں آئی کہ سب نتائج سے بے پرواہ ہو کر پولیس سٹیشن پہنچ جاؤں اور جھولی پھیلا کر قانون سے "مدد" کی بھیک مانگوں۔ مگر پھر منحوس خط کے منحوس الفاظ میری نگاہوں میں گھوم گئے "پڑھی لکھی ہو میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں تنہا ہونا چاہئے.........." اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ حمیدہ دوائی لے کر میری طرف آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے لفافہ اور روئی کا پنبہ لحاف میں چھپالیا۔ میرے آنسو پونچھتے پونچھتے حمیدہ آن وارد ہوئی۔

"ہائے! تم تو رو رہی ہو۔ بخار کی بے ہوشی میں تو خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ اب بخار اتر گیا تو رونا شروع کر دیا ہے۔ قسم ہے عجیب لڑکی ہو تم بھی۔" اس نے مجھے دوا پلائی اور پائنتی کی طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ "تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ میں آج صرف تمہارے واسطے "بابے بوہڑ والے" کے پاس گئی تھی۔ بابے بوہڑ والے کو تم نہیں

جانتیں۔ بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے۔ اسے بابا باز والا بھی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے شکاری آتے ہیں اس کے پاس۔ سنا ہے اسے سو کوس دور سے باز کا گھونسلہ نظر آجاتا ہے۔ بھائی شہاب کو بڑا یقین ہے بابے پر۔ پچھلے موسم میں اس نے دو باز پکڑے تھے بابے کے "ٹیوے" پر۔ میں نے بابے سے تمہارے فرحان کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس نے عمل کرکے بتایا ہے کہ کاکا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور زینب کی گودی میں کھیل رہا ہے۔ چاند کی ستائیس تاریخ سے پہلے پہلے اس کی خیر خبر تمہیں مل جائے گی۔ یہ دیکھو بیس روپے میں اس نے کتنا اچھا تعویذ لکھ کر دیا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بیس ہزار میں بھی لکھ کر نہ دیتا۔ اسے دستی چکی کے ہتھے کے ساتھ باندھنا ہے۔ زینب جہاں بھی ہے کاکے کے ساتھ تمہاری طرف کھنچی چلی آئے گی" میں حمیدہ کی باتیں سن رہی تھی اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس پگلی کو کیا پتہ تھا کہ اس کے "بابے بوہڑ والے" کا علم ناقص اور محدود ہے۔ بیس روپے کے پر لگا کر بھی یہ علم اس عقوبت خانے تک پرواز نہیں کرسکا جہاں کچھ درندہ صفت انسان ایک معصوم بچے کو اپنی وحشت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ حمیدہ کہہ رہی تھی "اللہ کرے کبھی بابے کے منہ سے میرے لئے بھی ایسی ہی خوشخبری نکلے۔ پچھلی گرمیوں میں کہا تھا کہ اس عید پر یوسف تجھے منا کرلے جائے گا مگر اس عید پر ڈیک نالے میں ایسا سیلاب آیا کہ پانچ روز سارے راستے بند پڑے رہے۔ اب اس میں "بابے" کا بھی کیا قصور تھا۔ اس نکھتے سیلاب کو بھی عین موقعے پر آنا تھا۔ اب اگلی عید پر بات پڑی ہے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے"۔

حمیدہ شہاب کی سگی بہن تھی اس کی شادی چار سال پہلے اپنے چچازاد سے ہوئی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی میاں بیوی میں ناچاقی ہوئی اور وہ میکے آبیٹھی۔ یہ تنازعہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ کی خوبصورت جوانی ایک بے معنی ضد کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔ حمیدہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ وہ بابے بوہڑ والے کی باتیں کر رہی تھی۔ (یہ وہی شخص تھا جسے چند روز پہلے شہاب نے پرندوں سے بھرے تھیلے دیئے تھے) میں سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہی تھی اور سنتی بھی کیسے۔ میری سماعت میں تو طوفان کے شور' بجلی کے کڑاکوں اور ایک معصوم کی چیخوں کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ حمیدہ کے جانے کے بعد مجھے تنہائی ملی تو میں نے لیٹے لیٹے لحاف کی اوٹ لے کر لفافے میں سے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ وہی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔

"ثنا محمود! وعدے کے مطابق تمہیں دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔ شاید خط ملنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو جائے لیکن مل جائے گا۔ تمہارا بچہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے بس تھوڑی دیر کے لئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اب ہوش میں ہے اور کلکاریاں مار رہا ہے۔ اس کی کلکاریاں تم آکر سن لو تو خدا کی قسم تمہارا دل باغ باغ ہو جائے۔ ابھی اس کے ہاتھوں پر آٹھ انگلیاں باقی ہیں۔ انگلیوں کی حد تک تمہارے پاس سوچنے کے لئے کافی وقت ہے۔ ویسے اگر کسی دفعہ خط نہ بھی مل سکے تو یہ نہ سمجھنا کہ انگلیوں کی تعداد میں گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ ہر دو روز بعد تم ایک انگلی اپنے حساب میں سے کم کر سکتی ہو۔ باقی میری پیشکش اپنی جگہ برقرار ہے۔ تم کل یعنی بروز جمعرات آٹھ اور دس بجے کے درمیان روہی کی پلی پر آسکتی ہو۔ اس کے علاوہ میری وارننگ بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ ان خطوط کے بارے میں کسی کو بتانے کا صرف ایک ہی مطلب ہوگا۔ اس کی موت............ گڈبائے۔

تمہارا خیر خواہ

میں نے خط مٹھی میں بھینچ لیا اور اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

رات ابر آلود اور تاریک تھی۔ کماد اور مونجی کے کھیتوں کے درمیان میں پگڈنڈی پگڈنڈی آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے جسم پر عام لباس کے علاوہ صرف ایک گرم چادر تھی۔ یہ چادر حمیدہ کی تھی اور میں اس کے سرہانے سے اٹھا کر لائی تھی۔ حمیدہ میرے ساتھ کی چارپائی پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کیا پوری حویلی ہی سو رہی تھی۔ صرف مردانے حصے کے سامنے دو بندوق بردار پہرہ دے رہے تھے۔ یہ پہریدار بھی چودھری شہاب نے میری حفاظت کی خاطر مقرر کئے تھے۔ خود وہ کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا یہ پورا گاؤں ایک دوسرے کا پہریدار ہے اور ہمیں کسی کی چوکیداری کی ضرورت نہیں۔ ان ہی پہریداروں سے نظر بچا کر جو میری حفاظت میں مقرر تھے میں مردانے کے عقبی حصے میں چلی آئی تھی اور ایک چھوٹے سے دروازے کی کنڈیاں گرا کر باہر نکل آئی تھی۔ اب میرا رخ روہی نالے کی دوسری پلی کی طرف تھا۔ میں جانتی تھی کہ میں ایک محفوظ پناہ سے نکل کر ایک سفاک دشمن کا لقمہ بننے کے لئے جا رہی ہوں لیکن اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے جسم میں میری زندگی ہی کہاں تھی جو

میں خود کو کسی پناہ گاہ میں محفوظ کرتی۔ میری زندگی تو دشمنوں کے قبضے میں تھی۔ میرا بچہ............ جسے وہ درندے لخت لخت کر کے میری ماما کا امتحان لے رہے تھے اور میری سخت جانی کی آزمائش کر رہے تھے۔ اس تاریک اور پر خطر رات میں اپنے دس ماہ کے معصوم کی ادائیں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ اس کی چمکیلی مسکراہٹ مجھے رستہ دکھا رہی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے زخمی ہاتھ اٹھا اٹھا کر مجھے بلا رہا تھا۔ میں سر تاپا ماں تھی اور اس ان دیکھے تاریک رستے پر میرا ہر عضو آنکھ بن گیا تھا۔ آوارہ کتوں سے بچتی اور کہیں کہیں کھیتوں میں گھومنے پھرنے والے کسانوں سے کنی کتراتی میں روہی نالے پر پہنچ گئی اور پھر نالے کے ساتھ ساتھ پلی کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی میں پلی سے کوئی ایک فرلانگ دور ہی تھی کہ ایک ڈھیلی ڈھالی پگڑی والا شخص لالٹین تھامے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔

"کہاں جانا ہے بہن!" اس نے دیہاتی انداز میں پوچھا۔ میں چادر کی اوٹ سے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری "بال پور سے آئی ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ بولا "میں آپ کو پہچان گیا ہوں چھوٹی جاگیردارنی' جاگیردار جی نے مجھے آپ کو لانے کے لئے بھیجا ہے"

"کون سا جاگیردار؟" میں نے رک کر پوچھا۔

"چودھری وہاب علی صاحب۔"

وہاب علی کا نام سن کر میں چکرا گئی۔ یہ میرے جیٹھ کا نام تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں۔ یہ شخص بیرون ملک مقیم تھا اور وہیں اس نے شادی کر لی تھی۔ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے یہ میری شادی پر بھی نہیں آسکا تھا۔ ہاں اس کی تصویر میں نے حویلی کے البم میں اور کئی کمروں میں دیکھی تھی۔ اس کی شکل میرے مرنے والے شوہر سے بہت ملتی تھی۔ ہاں چہرہ کچھ فربہ اور مونچھیں کچھ مختصر تھیں۔ اس کی مکمل شبیہہ میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ تو کیا یہ وہ شخص تھا جو درندگی کی ہر انتہا پار کر کے میرے معصوم بچے پر قیامت توڑ رہا تھا۔

"کہاں ہے یہ شخص؟" میں نے بے پناہ نفرت سے پوچھا۔

"آپ کو سامنے والے کنویں تک چلنا ہوگا" اس نے مختصر جواب دیا۔ میں نے چند

لمحے سوچا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے کنویں پر لے آیا یہاں بگڑی تگڑی شکلوں والے تین "چادر پوش" اور موجود تھے ان میں سے دو کو میں پہچان گئی۔ وہ حویلی کے ہی آدمی تھے۔ ان کے پیچھے جو پرانی شیورلیٹ کار کھڑی تھی وہ بھی حویلی ہی کی تھی۔ کم ظرف مردوں کی مخصوص عادت کے مطابق انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر ایک شخص جس کا نام شاید سراج تھا مصنوعی احترام سے بولا۔

"مالکن! جاگیردار جی کو یقین تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گی۔ چلئے وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"زیادہ لمبا سفر نہیں' آدھ پون گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"کہاں پہنچ جائیں گے' میرا بچہ کہاں ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ سراج نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے بتانا چاہتا ہو کہ دوسرے افراد کے سامنے یہ ذکر مناسب نہیں۔ دبے ہوئے لہجے میں بولا "مالکن! ہمیں اوپر سے جو حکم ملا ہے آپ کو بتا دیا ہے۔ اب ہم حاضر ہیں۔ اگر آپ جانا چاہیں تو گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

میرے چاہنے یا نہ چاہنے کا تو سوال ہی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لخت جگر کا نام لے کر خود کو حالات کے تیز دھارے پر پھینک دیا تھا۔ اب یہ دھارا مجھے کہیں بھی لے جاتا۔ میں گاڑی میں آ بیٹھی۔ تینوں افراد سمٹ سمٹا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

اونچے نیچے کچے راستوں پر یہ سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں دوبارہ اپنے سسرالی گاؤں کے قرب وجوار میں پہنچ چکی ہوں۔ گاڑی ایک جوہڑ کے سامنے سنگتروں اور کنوؤں کے باغ میں رکی۔ بہت گھنا باغ تھا۔ جگہ جگہ ڈھیروں کی صورت میں بہت سا پھل پڑا تھا۔ ہر طرف خوشبو ہی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم گاڑی سے اترے اور پیدل چلتے ہوئے ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ پختہ اینٹوں کی یہ خوبصورت عمارت ڈیڑھ دو کنال رقبے میں واقع تھی۔ کہیں قریب ہی کوئی مشین سی چل رہی تھی۔ عمارت کے اندرونی حصے میں بجلی کی روشنی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ یہ "مشین" جنریٹر ہے۔ ہم دروازے کے سامنے پہنچے۔ دستک پر ایک خوابیدہ ملازم نے دروازہ کھولا۔ وسیع صحن

سے گزار کر مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ میرے کان اپنے بچے کی آواز سننے کے لئے بے قرار ہو گئے مگر کیا پتہ وہ یہاں تھا بھی یا نہیں؟ سبزی کاٹنے والی وہ تیز چھری جو میں نے اپنے لباس کے نیچے چھپا رکھی تھی' بری طرح میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ پال پور کی حویلی سے نکلتے ہوئے نہ جانے کیوں میں نے یہ چھری پاس رکھ لی تھی۔ کس قدر حیرت کی بات تھی کہ میں جو چند ہفتے پہلے تک ایک مرغی ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی اور ایک مچھر کو انگوٹھے تلے دبانا میرے بس میں نہیں تھا کسی کو زخمی کرنے' دھمکانے یا مارنے کے لئے ایک چھری اپنے ساتھ لئے پھرتی تھی۔ درست تھا کہ ابھی تک میں نے کسی کو مارا یا زخمی نہیں کیا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی لیکن میں نے ایک نیت تو کی تھی۔ ایک قدم تو اٹھایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چند روز پہلے میں نے نہتے سلیم کو قاتلوں کے نرغے میں بے بسی سے ڈھیر ہوتے دیکھا تھا اور اس سانحے نے مجھے لاشعوری طور پر ہتھیار کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ اس سانحے کا سبب میں ہی تو تھی جس نے اس کا پستول جوہڑ میں پھینک کر اسے ننگی جارحیت کے خونی جبڑوں میں دیدیا تھا۔ پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ فرحان کے غم میں سے سلیم کی مظلومیت کا دکھ کونپلوں کی طرح پھوٹنے لگا۔ آہ........... میں نے اسے چاہ کر برباد کر دیا تھا۔ انتظار کی وہ شام جو اس نے ایک ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر گزاری تھی اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی ہی اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔ اسے اس شام تک لانے والا کون تھا؟ میں ہی تو تھی۔ میں ہی تو تھی جس نے اس سیدھے سادھے انسان کو اتنا پوجا تھا کہ ظلم اور قہر کے سارے دیوتا اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔

دفعتاً مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ دروازہ کھلا اور چھ فٹ قد کا ایک لحیم شحیم شخص اندر آگیا۔ میں اپنے جیٹھ وہاب علی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اپنی تصویروں سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ امریکہ میں رہ کر مشرقی روایات اور رہن سہن کو قطعی فراموش کر چکا ہے۔ اگر اس کا رنگ تھوڑا سا صاف ہوتا تو شاید مجھے اسے بطور پاکستانی پہچاننے میں بھی دشواری ہوتی۔ اس کی مونچھیں بالکل صاف ہو چکی تھیں۔ بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے فربہ جسم کو نیلی جین اور سرخ شرٹ میں سمیٹ رکھا تھا۔ صرف اس کی ہلکی براؤن آنکھیں مجھے جانی پہچانی لگیں۔ کیونکہ ان میں

واصف کی طرح نفرت اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے بے تاثر چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا "بیٹھ جاؤ" میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل سے گلاس بھرنے کے بعد اسے بے تکلفی سے میز پر رکھ دیا "بچہ لینے آئی ہو؟" اس کے لہجے کی نفرت اور تیزی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ "ہاں" میں نے حوصلہ جمع کر کے کہا۔

"کس کا بچہ ہے وہ؟"

"آپ کے چھوٹے بھائی کا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"جسے تم نے اپنے کسی لگتے کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

"تو پھر سچ کیا ہے؟"

"اگر میں سب کچھ سچ سچ بتادوں تو آپ انصاف کریں گے؟"

"انصاف چاہنے والے بھاگتے نہیں' قانون سے چھپتے نہیں پھرتے۔"

"قانون کو یہاں تک پہنچنے کون دیتا ہے۔ یہاں کا قانون تو یہی ہے نا۔"

میں نے اپنے بچے کی کٹی ہوئی پوریں روئی سمیت صوفے پر رکھ دیں۔ یکایک وہاب علی کسی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ اس کا زور دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا اور میں ٹھنڈے فرش پر دور تک لڑھک گئی۔ "انصاف مانگتی ہے بدذات کمینی' انصاف مانگتی ہے" وہ غرایا اور لاتوں گھونسوں سے مجھے بری طرح پیٹنے لگا۔ وہ غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا اور نشے نے اس کی ہر ضرب کو شدید تر بنا دیا تھا۔ سبزی کاٹنے والی چھری بے وقعت شے کی طرح میرے لباس کے نیچے سے پھسل کر فرش پر لڑھک گئی۔ میں جیسے تند و تیز لہروں کی زد میں تھی۔ بخار کی شدید نقاہت کے بعد یہ تشدد مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نیم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ رات کسی پہر ہوش آیا۔ کمرے میں زیرو کا مدھم بلب جل رہا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں۔ میں دروازہ پیٹنے لگی اور چلانے لگی "کوئی ہے....... کوئی ہے" کوئی نہیں تھا یا کوئی سننا نہیں چاہتا تھا۔ تھک ہار کر میں کمرے کی اکلوتی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میرے پورے جسم پر چوٹیں آئیں تھیں لیکن کندھے کی ضرب شدید تھی۔ گوشت پھٹ گیا تھا اور خون نے پوری

آستین بھگو رکھی تھی۔ کمرے کی سخت سردی میں اس تکلیف نے مجھے کراہنے پر مجبور دیا۔ وہ ساری رات میں نے اسی طرح جاگتے سوتے میں گزاری۔ اگلے روز ایک ملازم شخص نے آکر میری مرہم پٹی کی اور ناشتہ دیا۔ میں اس سے وہاب علی کے بارے اور ا بچے کے بارے پوچھتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ شخص مجھے یہاں لا والوں میں شامل تھا۔ راستے میں ان لوگوں کا رویہ مختلف تھا لیکن یہاں پہنچتے ہی سب آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

شام تک میں اس کمرے میں بند رہی۔ وہ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ت میری پیاسی نگاہیں اپنے بچے کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔ وہ کہاں تھا' کس دیوار پیچھے تھا' کس چھت کے نیچے تھا' میں اس سے قریب رہ کر بھی اس سے بہت دور تھی کیسا امتحان تھا' یہ کیسی آزمائش تھی...... شام کے وقت سراج مجھے کھڑکی کے پاس نظر آیا۔ میں نے اسے پاس بلایا اور اس کی منتیں کرنے لگی کہ وہ ایک بار مجھے میرے کی شکل دکھا دے۔ اس نے پہلے تو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی بچہ اس عمارت میں مو ہی نہیں۔ پھر میرے بڑھتے ہوئے اصرار اور منت سماجت کے پیش نظر اس کے رو میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس نے میرے بندھے ہوئے ہاتھوں پر ایک نظر اور بولا۔

"میں مالک کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے روتے ہوئے کہا "اپنے مالک کو اس کے بچوں کا واسطہ دو اور اس سے مجھ پر اور ظلم نہ کرے۔"

سراج سوچتا ہوا اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے یا کہ وہاب علی کا تو کوئی بچہ ہی نہیں' میں اسے کس کا واسطہ دے رہی ہوں۔ حویلی میں ا باتیں ہوا کرتی تھیں کہ وہاب علی بے اولاد ہے۔ یہ اس کی محرومی نہیں آئیڈیالوجی تھ میں نے اس کے ایک خط میں خود پڑھا تھا جو اس نے اپنی ماں کے نام کینیڈا میں لکھا تھ وہ بچوں کو جھنجھٹ سمجھتا ہے اور اسے فی الحال ان کی خواہش بھی نہیں۔ وہ ان مذ زدہ لوگوں میں سے تھا جو صرف اپنی ذات کے لئے جینا چاہتے ہیں...... اور آج میرا اس بے حس و بے درد شخص کے قبضے میں تھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا یہ اس جیسا سنگ

شخص ہی کر سکتا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میری رحم کی کوئی درخواست اس کے لئے قابل قبول ہو گی مگر تھوڑی دیر بعد میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سراج کوئی چیز کمبل میں لئے میری طرف چلا آ رہا ہے۔ میری حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئیں۔ میں کھڑکی کی آہنی گرل سے چپک کر کمبل کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھ سے کوئی دس فٹ دوری پر سراج ایک بلب کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک جانب سے کمبل ہٹایا۔ میرے فرحان کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ میرا پھول' میرا چاند میرا شہریار سو رہا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ پتلے ہونٹ' ننھی سی ناک اور لانبی پلکیں میرا دل سو ٹکڑے ہو گیا۔ جی چاہا ہوا بن کر گرل کے آہنی پیچ و خم سے گزر جاؤں اور اپنے لال کو سینے سے چمٹا لوں۔ میں نے اپنی دونوں بانہیں گرل میں سے نکال دیں اور بے حد عاجزی سے کہا۔

"اسے میرے پاس لاؤ' خدا کے لئے میرے پاس لاؤ۔"

"نہیں بی بی! صاحب کا حکم نہیں" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

اس عمارت میں آنے کے بعد سراج نے مجھے مالکن یا چھوٹی چودھرانی کی بجائے بی بی کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے نالوں کو سینے میں دبائے یک ٹک فرحان کو دیکھتی رہی۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ سویا ہوا تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا اور اپنی معصوم آنکھوں میں "حسرت" بھر کر میری طرف دیکھتا' منہ بسورتا اور سراج کی بانہوں میں مچلتا تو میں مر نہ جاتی؟ اس جگہ میری موت واقع نہ ہو جاتی؟ کچھ دیر بعد سراج اسے لے کر واپس چلا گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے دروازے پر بے تحاشہ مکے برسائے اور وہاب علی کو خدا رسول ﷺ کے واسطے دیئے کہ وہ میرے بچے کو چھوڑ دے۔ میری ہر فریاد سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ آخر میں بے دم ہو کر مسہری پر گر پڑی اور درد کی ان لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی جو میرے زخمی کندھے سے اٹھ رہی تھیں۔ درحقیقت یہ وہی زخم تھا جو کوئی ڈیڑھ ہفتہ پہلے میرے شوہر کی چلائی ہوئی گولی سے آیا تھا۔ فرحان کو بچانے کی کوشش میں میں ریوالور کی زد میں آ گئی تھی اور گولی کندھے کا گوشت پھاڑتی گزر گئی تھی۔ یہی زخم رات وہاب علی کے ہاتھوں کھل گیا تھا......

اچانک دروازے کے پاس آہٹ ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیوار گیر کلاک پر دوڑائی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ دروازے کے ہاضمی قفل میں دو دفعہ چابی گھو اور وہاب علی اندر آگیا۔ اندر آکر اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر دیر عینک کے پیچھے سے مجھے گھورتا رہا' پھر بولا۔

"ہیلو شا محمود کیسی ہو؟" اس کی آواز میں آج عجیب طرح کا لوچ تھا۔ اس سے پ کہ میں کچھ بولتی اسے جیسے کچھ یاد آیا۔

"ہاں یہ تمہاری چھری کل رات گر گئی تھی" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈ اور چھری نکال کر میرے سامنے تپائی پر رکھ دی۔

میرے اور اس کے درمیان پڑی یہ چھری بالکل بے کار چیز لگ رہی تھی۔ اگر مجھے قتل کرنا چاہتا تو شاید ایک ہاتھ سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر سکتا تھا اور اگر میں اسے کو نقصان پہنچانا چاہتی تھی تو یہ چھری اس کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔ یہ تو ایسا ہی تھا' گرانڈیل ہاتھی کو اعشاریہ پچیس کی گولی سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں ا بے بسی پر سسک اٹھی۔

اس نے اطمینان سے اپنی دونوں ٹانگیں تپائی پر رکھیں اور بولا "قتل تو تم چھر کے بغیر بھی کر سکتی ہو۔"

اس کے لہجے میں نہایت سفاک قسم کا طنز پوشیدہ تھا۔ میں نے ٹھٹھک کر اس انسا نما حیوان کی طرف دیکھا اور ذہن میں خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہاب علی۔ اپنی جیکٹ کی جیب سے چھوٹی بوتل برآمد کی اور سیاہی مائل ہونٹوں سے لگا کر گھون گھونٹ پینے لگا۔ وہ شکل سے ہی بلا نوش دکھائی دیتا تھا۔ وہ انسان کی کھال میں درندہ اور میں ممتا کی ڈور سے بندھ کر اس کی کچھار میں چلی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں اچانک پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی جو واصف کو اپنے سامنے غضب ناک دیکھ کر طاری ہو کرتی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کی سکت جاتی رہی اور میں خود کو ایک احمق اور کمزور عور محسوس کرنے لگی۔ مجھے لگا جیسے واصف دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور مجھے جرم بے گناہی سزا دینے کے لئے سرتاپا عتاب بنا ہوا ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھا اور میں چارپائی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ چٹخنی تک پہنچتا' وہاب

لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"خدا کے لئے مجھے جانے دو........ مجھے اپنے بچے کے پاس جانے دو" میں نے فریاد کی۔

اس نے جھومتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا "یہ معاملہ اتنا آسان نہیں' مجھے سوچنے کا موقع دو۔"

اس کا طرز تخاطب' بے غیرتی کا تیر تھا جو میرا سینہ چھلنی کر گیا۔ میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ ہاتھ لہرا کر بولا "ٹرائی ٹو انڈر سٹینڈ' ڈونٹ بی فلش' او کم آن........ کم آن" اس کے اندر مغرب بول رہا تھا۔ موقع پرست' ننگا اور وحشی مغرب۔ یہ "مغرب" کسی کا بھائی نہیں تھا' کسی کا غم خوار نہیں تھا' اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میرے اندر مزاحمت کرنے والی عورت جاگ اٹھی۔ میں نے قوت صرف کر کے اپنا بازو وہاب کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اسے جھٹکا لگا اور بوتل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور صوفے پر جا گری۔ اس کا نشہ جیسے ہرن ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر خونی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر دروازہ کھول کر اور اسے باہر سے مقفل کر کے چلا گیا۔

جاتے جاتے وہ تپائی پر رکھی ہوئی چھری بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ میں بے دم ہو کر چارپائی پر گر گئی۔

شاید دس پندرہ منٹ گزرے تھے جب مجھے فرحان کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً وہ کسی نزدیکی کمرے میں تھا۔ میرے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیلا جانے لگا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر یہ آواز تو ہر رکاوٹ کو پار کر کے براہ راست میرے دل میں گونج رہی تھی۔ میں بے قرار ہو کر اٹھی اور ایک بار پھر دروازہ پیٹنے لگی۔ مجھ پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ میں کتنی زور سے دروازے پر مکے برسا رہی ہوں۔ دروازے کے سفید تختے پر خون کے دھبے نمودار ہوئے تو پتہ چلا کہ انگلیوں سے کھال چھل گئی ہے۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا اور میں چکرا کر ٹھنڈے فرش پر گر گئی۔

وہ رات میری زندگی کی بھیانک ترین رات تھی۔ فرحان رہ رہ کر ساری رات

روتا رہا اور میں اس کمرے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ میں نے آہ و پکار کی
روئی چلائی' دیواروں سے سر ٹکرایا لیکن کسی نے مجھ بدنصیب پر رحم نہیں کھایا۔ لگتا تھا
ان دیواروں میں رہنے والا ہر شخص گونگا اور بہرہ ہے۔ کہتے ہیں جہنمی جہنم میں ہزار ہا سال
خدا کو پکارتا رہے گا اور نامعلوم زمانوں بعد باری تعالیٰ ایک بار اس پکار کا جواب دے گا۔
میری وہ رات بھی ایک ایسے ہی جہنم میں گزری تھی۔ میں پکار پکار کر ہار جاتی تھی تو دل
ہی دل میں کہتی تھی۔

"میرے لال! میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتی' مجھے معاف کر دے' میں مجبور
ہوں' خدا کے لئے چپ ہو جا...... خدا کے لئے سو جا۔"

.... اور پھر صبح ہوئی۔ اس رات کی صبح جو ہزاروں راتوں پر بھاری تھی۔ فرحان
تھک کر سو گیا یا شاید میری طرح اس کا بھی گلا بیٹھ چکا تھا۔ آج مجھے ناشتہ دینے کے لئے
دروازہ بھی نہیں کھولا گیا۔ کھڑکی کی گرل کے اندر سے ہی کچھ ڈبل روٹی اور چائے کمرے
کے اندر رکھ دی گئی۔ ناشتے کا ہوش کسے تھا اور میں کیوں کرتی ناشتہ؟ جب میرے دودھ پر
کسی کا حق باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سراج نظر آیا۔ کھڑکی کے پاس پہنچا تو ادھر
ادھر دیکھ کر گرل کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "بی بی! یہ نیا مالک بڑا ظالم ہے۔ اگر آپ کسی طرح
اپنے بچے کی جان بچا سکتی ہیں تو بچا لیں' جو بھی یہ کہتا ہے مان لیں۔ مجھ سے تو اب یہ
سب کچھ دیکھا نہیں جاتا۔ میں تو بیماری کا بہانہ کر کے جا رہا ہوں یہاں سے۔"

میں نے کہا "سراج! اتنے بے غیرت کیوں ہو گئے ہو تم سب' کیا تم نے خدا کو جان
نہیں دینی' تمہارے بھی تو بچے ہوں گے۔ کس طرح برداشت ہو رہا ہے تم سے یہ ظلم؟"

"نہیں ہوتا بی بی' اسی لئے تو جا رہا ہوں۔"

میں نے روتے ہوئے کہا "کچھ اور نہیں کر سکتے تو........ پولیس کو ہی اطلاع دے
دو۔ میرے میکے تک ہی خبر پہنچا دو........"

وہ سر تاپا کانپ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو پہلے کبھی اتنا خوفزدہ نہیں دیکھا تھا۔
"نہیں بی بی جی' یہ نیا مالک کسی اور ہی ٹائپ کا شخص ہے' بس کچھ نہ پوچھیں جی" سراج
کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا "پرسوں میرے چچازاد بھائی رحمت
نے آپ کے بچے کی انگلی کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ظالم نے اس کا پورا پنجہ ٹوکے سے

دے کر کٹوا دیا۔ وہ دیکھیں' کیاری کے پاس ابھی تک پڑا ہوا ہے۔"

میں نے سراج کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ دور صحن کے کونے میں ایک بلی کسی کالی سی
چیز پر منہ مار رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا اور نگاہ خود بخود اس شے سے ہٹ گئی۔
سراج کہہ رہا تھا "اس نے اٹھانے کی اجازت بھی نہیں دی۔ کہہ رہا تھا' یہیں پڑا رہنے دو'
خود ہی کتے کھا جائیں گے" سراج کی باتیں سن کر میرا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بولا

"بی بی جی! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ ہی بتائیں میں آپ کی کیا مدد
کروں!"

میرے سینے میں کوئی گولا سا گھومنے لگا۔ میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"اچھا جی رب راکھا" سراج نے آزردہ لہجے میں کہا اور برتن اٹھا کر تیز قدموں
سے واپس چلا گیا۔

وقت پل پل سرکتا رہا۔ سہ پہر تین بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر پٹ
کھلے اور کوئی عورت جلدی سے اندر آ گئی۔ یوں لگا جیسے اسے کسی نے دھکا دیا ہے۔ اس
کے پیچھے دروازہ فوراً ہی مقفل ہو گیا۔ عورت نے رخ میری طرف کیا تو میں اس کی
صورت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ زینب تھی۔ اس کے سر پر ایک سفید پٹی بندھی تھی اور
کپڑے بے حد میلے ہو رہے تھے۔ میں حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زینب کے
ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے اور صابن کی ایک ٹکیہ تھی۔ اس نے یہ چیزیں تپائی پر رکھیں اور
بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کتنی ہی دیر مجھ سے چمٹی وہ اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی
رہی۔ اس کے ایک پاؤں پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"بہن! مجھے معافی دے دے' میں مرن جوگی تیرے کاکے کو بچا نہیں سکی۔ میں نے
تیرے کاکے کو لے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مسجد کے پیچھے والی گلی سے ہو کر میں
نمبردار مشتاق کے کھیتوں میں نکل گئی تھی۔ غنڈے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میرا پیر زخمی نہ
ہوتا تو شاید میں ان کی پہنچ سے نکل جاتی۔ اشفاق کے کھیتوں میں انہوں نے مجھے جا لیا۔
ایک نے پورے زور سے میری سر پر لاٹھی ماری۔ میں چکر کھا کر گر گئی۔ انہوں نے مجھے
گالیاں دیں اور بچہ مجھ سے چھین لیا۔ اتنے میں ایک کار میرے پاس آ کر رکی۔ انہوں نے
بچے کو کار کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ میں تو بس بے ہوش ہی ہو چکی تھی۔ مجھے بھی

گھسیٹ گھساٹ کر انہوں نے کار میں ڈال دیا۔ کافی دیر چلنے کے بعد کار اس باغ میں داخل ہوئی اور کوٹھی کے سامنے آکر رک گئی۔ اب پچھلے چھ دنوں سے میں یہاں ہوں.........."

زینب یوں بات کر رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ ابھی ابھی اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رنگ مٹی کی طرح ہو رہا تھا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا وہ ایک بہادر عورت تھی۔ چند روز پہلے اپنے گھر میں اس نے جس طرح اپنی اور ہماری مرہم پٹی کی تھی اور ایک انسانیت سوز المیے کا شکار ہونے کے باوجود جس طرح اپنے ماتھے پر بل نہیں آنے دیا تھا وہ سب مجھے یاد تھا.......... مگر آج یہ بہادر عورت پتے کی طرح لرز رہی تھی اور اس کی میلی آنکھوں میں خوف کے آنسو تھے۔ وہ بولی "یہ لوگ بڑے سخت ہیں بہن! بالکل جانور ہیں.......... اور.......... اور کاکے کے ساتھ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے.......... بس کچھ نہ پوچھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی' پتہ نہیں وہ اسے کیا کرتے ہیں۔ وہ معصوم ساری ساری رات چیختا رہتا ہے۔ میرا تو کلیجہ ٹکڑے ہو گیا ہے ان چھ دنوں میں۔"

اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے باندھ دیئے "یہ دیکھ بہن! میرے جڑے ہوئے ہاتھ' مجھے نہیں پتہ کیا ہو جائے گا؟ یہ تیرے سسرال والے بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان میں ایک سے بڑھ کر ایک جلاد ہے۔ کاش تو ان لوگوں میں نہ آئی ہوتی۔ اب تو جو بھی ہے بھگتنا پڑے گا۔ جو یہ کہتے ہیں مان لے اور اگر بچا سکتی ہے تو اپنی اور اپنے بچے کی جان بچا لے.........."

زینب مجھے یہاں کے حالات سے باخبر کر رہی تھی اس نے بتایا کہ "وہاب نامی شخص اس مکان کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ یہاں آٹھ دس مسلح آدمی اور ہیں۔ اسے روزانہ ان کے لئے کوئی سو روٹیاں پکانی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پورا دن بیل کی طرح مصروف رہتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے۔ یہاں ایک خانساماں اور دو ملازم بھی ہیں لیکن وہ صرف چودھری وہاب کا کام کرتے ہیں۔ زنیب نے روتے ہوئے بتایا "چودھری وہاب کہتا تھا ہماری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو اسی طرح محنت سے کام کرتی رہی تو دو تین ہفتے بعد تجھے چھوڑ دیں گے.......... پر ان کا کوئی اعتبار نہیں بہن! نشہ کر لیتے ہیں تو ان کی آنکھیں بڑی خوفناک ہو جاتی ہیں۔"

میں نے کہا "زینب! تو مجھ سے بڑی ہے اور عقل والی بھی۔ ہے تو ہی بتا میں کیا کروں' کہاں جاؤں؟"

میرے پاس بھی سوال تھے اور زینب کے پاس بھی' جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

زینب نے کپڑوں کا جوڑا میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا "منہ ہاتھ دھو کر پہن لے" تین چار دنوں سے مجھے اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا۔ بال پریشان تھے۔ لباس جگہ جگہ سے ادھڑا اور پھٹا ہوا تھا۔ کندھے سے بہنے والا خون کپڑوں پر اکڑ کر رہ گیا تھا۔ زینب کے اصرار پر میں نے ملحقہ غسل خانے میں جاکر منہ پر چند چھینٹے مارے اور بال باندھ کر لباس بدل لیا۔ قمیض بدلتے ہوئے کندھے کے زخم نے خون کے آنسو رلا دیئے۔ بہرحال جیسے تیسے یہ بھی کر گزری۔

اس دوران دروازے پر زور سے دستک ہونے لگی۔ کسی نے زینب کو مخاطب کر کے کہا۔

"او لنگڑی! کیا اندر الف لیلیٰ شروع کر دی ہے۔ چل باہر آجا فافٹ۔"

زینب نے گھبرا کر میرے خون آلود کپڑے سمیٹے اور چہرے پر ان گنت خدشے سجائے باہر نکل گئی۔ دروازہ پھر مقفل ہو گیا۔

اور پھر دوسری رات آگئی۔ یہ رات میرے مقدر کی طرح تاریک تھی۔ میں نے آج زیرو کا بلب بھی روشن نہیں کیا تھا اور گہری تاریکی میں چارپائی پر لیٹی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خوفناک جنگ جاری تھی۔ یہ جنگ ایک ماں اور ایک عورت کے درمیان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک شام میرے نیم مردہ جسم کو ایسے خوفناک فیصلے کی سولی پر لٹکنا ہو گا۔ کاش میں مشت خاک ہوتی۔ نہ مجھ میں شعور ہوتا نہ میرا کسی سے رشتہ ہوتا۔ رات سر پر تھی اور مجھے ڈرا رہی تھی۔ کیا آج رات پھر میرے کانوں کو فرحان کی چیخوں کا عذاب سہنا ہو گا۔ کیا آج کی رات پھر ہزار راتوں کو اپنے اندر سمیٹ لے گی۔ میری سماعت ڈری اور سہمی ہوئی تھی.......... آخر بھاری قدموں کی مخصوص آواز آئی۔ دروازے کے قفل میں چابی گھومی اور وہاب علی اندر آگیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے لائٹ آن کی۔ کچھ دیر مخمور نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ یہ نظریں مجھ سے کہہ رہی تھیں "اے بے وقوف عورت! میری مٹھی

میں تیرے بچے کا سکون بند ہے۔ یہ مٹھی کھولوں گا تو ہر طرف آہ و پکار گونجنے لگے گی اور تو جانتی ہے سفاکی میں میرا نام ہے۔ میں شیطان مردود ہوں اور میرے شر کی انتہا تیرے تصور کی پرواز سے بہت اونچی ہے" کمرے کی خاموشی نہایت معنی خیز تھی۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا.........

اب آگے اور کیا لکھوں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہیں چھپاؤں گی اور میں آپ سے کچھ چھپا بھی نہیں رہی۔ لیکن قلم میں اتنی ہمت نہیں کہ مزید تفصیلات بیان کر سکوں......... ایسی پستی میں گرنا کون گوارا کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے جس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا جو چاروں طرف سے گھر جاتا ہے' جس کے لئے زندگی اور موت برابر ہو جاتی ہے۔ وہ سب کچھ مجھے ایک دہشت ناک خواب کی طرح یاد ہے۔ نہ میں زندوں میں تھی اور نہ مردوں میں۔ پھر وہاب نے ہوس کے بستر پر مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ پھر ایک دوپہر میں نے وہاب سے کہا تھا۔

"وہاب! اپنا وعدہ پورا کرو' میرا بچہ مجھے لوٹا دو۔"

وہی سفاک مسکراہٹ وہاب کے چہرے پر ابھری جو اسے انسان سے زیادہ ایک حیوان سے مشابہہ کرتی تھی۔ سگار کا ایک گہرا کش لے کر اس نے کہا۔

"ڈونٹ وری ثنا محمود! میں وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہوں نہ کسی کو کرنے دیتا ہوں۔ مغرب میں یہی تو چند ایک اصول ہیں جو اسے مشرق سے ممتاز کرتے ہیں۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"کل کسی وقت" اور وہ بھاری قدموں سے ٹھک ٹھک فرش بجاتا باہر چلا گیا۔

اپنے بچے کی صورت دیکھنے کے لئے اب مجھے کل تک اور انتظار کرنا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے انتظار کی گھڑیاں جب مختصر رہ جاتی ہیں تو اور بھی کٹھن ہو جاتی ہیں۔ جیسے جیسے شام ہوئی اور پھر گھٹا ٹوپ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ میں اب کمرے کا بلب روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی سے مجھے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ بڑا سکون ملتا تھا مجھے تاریکی کا حصہ بن کر......... دیوار گیر کلاک کی ٹک ٹک سست گام اڑیل لمحوں کو آگے کی طرف دھکیلتی رہی۔ غالباً دس گیارہ کا وقت تھا جب کسی نے دروازے کے قفل میں بے آواز چابی گھمائی اور آہستگی سے اندر آگیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ وہاب ہرگز

نہیں تھا۔ شاید اس کا کوئی کارندہ تھا یا دوست۔ اس نے دروازہ اندر سے مقفل کیا تو میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ انجانے خدشے جاگ اٹھے۔

"کون؟" میں نے زخمی لہجے میں ڈوبی ہوئی سرگوشی کی۔

"شی" کی طویل آواز آئی۔ نووارد مجھے خاموش ہونے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس نے چند قدم بڑھا کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور پھر لائٹ آن کر دی۔ مجھ سے دو فٹ کی دوری پر ایک چادر پوش شخص کھڑا تھا۔ چادر کے نیچے سے اس کی سفید شلوار اور کالی جوتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے درمیان تھی۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اپنا خوف کم ہوتا محسوس ہوا۔ وہاب کے قہرناک چہرے کی دھوپ میں جلنے کے بعد یہ چہرہ مجھے چاند کی مانند ٹھنڈا اور مہربان لگا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی" اس نے دیہاتی لہجے میں کہا "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں بیٹھ گئی۔ وہ ایک کرسی تک گیا اور اسے گھسیٹنے کی بجائے بڑے آرام سے اٹھا کر چارپائی کے پاس لے آیا۔ اس پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بولا "میرا نام رحمت ہے جی' اگر آپ کو ڈر نہ لگے تو میں یہ بتی بجھا دوں!"

ایک اجنبی مرد کے ساتھ اندھیرے مقفل کمرے میں بیٹھنا ایک جوان عورت کے لئے کتنا دشوار تھا۔ مگر میں ایسے حالات سے گزر چکی تھی کہ اب کچھ بھی میرے لئے عجیب نہیں رہا تھا۔ دوسرے رحمت کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش ہو کر رہ گئی۔ خاموشی کو نیم رضامندی جان کر اس نے بتی بجھا دی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی لرزاں سرگوشی فضا میں ابھری۔

"بی بی جی! میں نے زینب کو یہاں سے نکال دیا ہے۔ اب آپ کو نکالنے آیا ہوں۔ بس تھوڑی دیر ٹھہر جائیں۔ منشی خاں ٹھیک گیارہ بجے افیم کا سوٹا لگا کر سو جائے گا۔ میں کمرے میں جا کر آپ کے بچے کو اٹھا لاؤں گا۔ پھر آپ پچھلے دروازے سے باہر نکل جانا۔"

میں نے بے پناہ حیرت سے رحمت کی بات سنی۔ زینب کی رہائی کی خبر میرے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں نے پوچھا "اب کہاں ہے زینب؟"

وہ بولا "بی بی جی! ذرا آہستہ بولیں........ زینب اس وقت باغ سے باہر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے کہ آپ کو لے کر کہاں جانا ہے اور کیسے جانا ہے۔"

"کک........ کوئی خطرہ تو نہیں؟" میرے اندر ممتا کی بزدلی عود کر آئی۔

"خطرہ تو ہے بی بی جی' مگر جان بچانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔"

رحمت نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے کہی تھی کہ میرے اندر بے نام وسوسے جاگ اٹھے۔ میں نے کہا "مگر چودھری وہاب نے تو مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کل تک مجھے اور میرے بچے کو چھوڑ دے گا۔ ہم دونوں کے درمیان سب کچھ طے ہو چکا ہے۔"

"بڑی بھولی ہیں بی بی جی آپ........ آپ کو کچھ پتہ نہیں' یہ وہاب کس شیطان کا نام ہے۔ میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا لیکن یہ آپ سوچیں بھی نہ کہ یہ شخص آپ کو یہاں سے زندہ نکال دے گا۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ننھے فرحان کی صورت آنکھوں میں گھومنے لگی۔ رحمت بولا "یہ نیا مالک بڑی کتی شے ہے بی بی جی' ہم تو حیران ہو رہے ہیں اس کے کرتوت دیکھ دیکھ کر۔"

میں نے کہا "لیکن اس نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میرا بچہ مجھے دے دے گا۔"

"ضرور دے دے گا' لیکن اس نے یہ وعدہ تو نہیں کیا کہ آپ کی جان بخشی بھی کر دے گا۔؟..... زینب تو شاید آٹھ دس دن اور جی لیتی لیکن آپ........ خیر چھوڑیں اس بات کو" ایک لحہ خاموش رہ کر اس نے کہا۔

"آپ زخمی تو نہیں؟" میرا مطلب ہے آپ کو تین چار کوس پیدل چلنا ہوگا۔ یہ ایک گرم چادر میں ساتھ ہی لے آیا ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈا سا وزنی کپڑا میری جھولی میں رکھ دیا۔

رحمت کی باتیں نہایت خوفناک تھیں مگر اس سے بھی خوفناک بات یہ تھی کہ ان باتوں میں سچائی کی جھلک تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہاب جھوٹا ہے اور یہ شخص سچا۔ اگر یہ سچا نہ ہوتا تو میرے بچے کے لئے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے محروم نہ ہوتا۔ سراج نے اسی کے بارے میں بتایا تھا کہ اس نے وہاب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور وہاب

نے ٹوکے میں دے کر اس کا پنجہ کٹوا دیا تھا۔ بعد میں زینب نے بھی یہی بات بتائی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ شخص رحمت ہی نہیں' رحمت کا فرشتہ بھی ہے جو مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے حکم ربی سے یہاں پہنچا ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ تاریکی ہم دونوں کے درمیان ایک بلند و بالا دیوار کی طرح حائل تھی۔ اس دیوار کی دونوں طرف ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ آئندہ لمحوں سے وابستہ اندیشے خوفناک دیوزادوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے۔ دیوار گیر کلاک کی چمک دار سوئیاں دھیرے دھیرے گیارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اچانک اندھیرے میں رحمت کی آواز ابھری۔

"بی بی جی! یہ........ یہ زینب سے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

رحمت کے سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زینب کو بہت پہلے سے جانتا ہے۔

زینب کا لفظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں جو ہلکی سی جھجک نمودار ہوئی اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا تم زینب کو جانتے ہو؟" میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"جی ہاں!" اس نے کراہ کر کہا "پیچھے سے ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں بلکہ ہمارے گھر ایک ہی گلی میں تھے۔"

میں نے پوچھا "زینب نے تم سے میرا ذکر کیا تھا؟"

"کچھ زیادہ بات نہیں ہو سکی جی بس اس نے ایک دن چلتے چلتے اتنا بتایا تھا کہ آپ اس کی گہری سہیلی ہیں۔ چودھری وہاب علی سے آپ کے رشتے داری ہے۔ اس وقت آپ یہاں آئی بھی نہیں تھیں۔ پانچ چھ دن پہلے کی بات ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری کے قبضے میں جو بچہ ہے وہ آپ کا ہے اور میں اسے کسی طرح بچانے کی کوشش کروں۔"

"میرا بچہ کیسا ہے رحمت!؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے جی' ہاتھ کے زخم اب ٹھیک ہیں۔ سارا دن سویا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اور تمہارے ہاتھ کا کیا حال ہے؟"

"یہ........ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو کس نے بتایا؟"

"زینب نے اور اس سے پہلے تمہارے بھائی سراج نے' تم نے میرے فرحان کی ایک انگلی بچانے کے لئے اپنی پانچوں انگلیاں کٹوالیں رحمت........ میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں!" میں ہچکیوں سے رونے لگی۔

وہ میرے رونے سے گھبرا کر بولا "آہستہ بی بی جی........ آہستہ........ کوئی سن لے گا۔"

میں نے دوپٹہ منہ میں دبا کر آواز روک لی۔ رحمت جذباتی لہجے میں بولا "میں نے اپنی مری ماں کی قسم کھائی ہوئی ہے کہ آپ تینوں کو یہاں سے نکال کر چھوڑوں گا۔ اس کے بعد یہ حرامزادہ انگریز میرے ٹوٹے بھی کروا دے تو پرواہ نہیں" رحمت کی باتوں میں کسی پرانی کہانی کے زخم مہک رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑی کی بڑی سوئی چھوٹی پر سبقت لے گئی اور بارہ کے ہدف کو چھونے لگی۔ رحمت اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جوتی پہن لوں اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر گرہ دے لوں۔ میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا یہ قدم میری مصیبتوں میں اضافہ کرے گا یا کمی۔ رحمت دروازے سے کان لگا کر کچھ دیر سن گن لیتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بتی جلا دی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا' وہ خاصا پر اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چادر کے نیچے بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال لی۔ اس کا دوسرا ہاتھ گردن سے بندھی پٹی میں جھول رہا تھا۔ اس نے چابی سوراخ میں ڈالی اور آواز پیدا کئے بغیر قفل کھول دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر سے آستین تھوڑا سا کھسک گئی۔ میں اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ قریباً تین فٹ کی دوری پر۔ بلب کی روشنی میں اتفاقاً میری نگاہ اس کی کلائی پر پڑ گئی۔ وہاں پکی نیلی روشنائی سے ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسے الفاظ عموماً میلوں ٹھیلوں میں لوگ اپنی جلد پر لکھواتے ہیں۔ رحمت کی جلد پر لکھا ہوا یہ لفظ اس کے کردار کی بہت سی گرہوں کو کھول گیا۔ رحمت نے مجھے کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔ صرف اس کے لہجے نے تھوڑی دیر پہلے ایک چھوٹا سا اشارہ دیا تھا اور اب اس کی کلائی پر کندہ لفظ اس اشارے کو وسیع و عریض معنی پہنا رہا تھا۔ کلائی پر زینب لکھا تھا اور ایک چھوٹے سے دل کے ساتھ تیر کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایک لحظے کے لئے یہ لفظ اور یہ نشان میری نگاہ میں

چمکے اور دوسرے ہی لمحے رحمت بتی بجھا کر اور دروازہ کھول کر باہر کی تاریکی میں رینگ گیا۔ میں سب کچھ فراموش کر کے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی........ یہ انتظار طویل ثابت ہوا۔ کوئی دس منٹ بعد کھڑکی کی گرل پر ہلکی سی دستک ہوئی میں نے پردہ کھسکا کر دیکھا۔ دوسری طرف رحمت کا ہیولا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"وہ کمینہ منشی خاں' ابھی جاگ رہا ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔"

میں لرزتے قدموں پر وہیں کھڑی رہی۔ لمحے سیکنڈوں میں اور سیکنڈ منٹوں میں بدلتے رہے۔ اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوئی دس پندرہ گز کی دوری سے ایک کراہ سنائی دی اور پھر کوئی دھڑام سے کچی زمین پر گر گیا........ کراہ سے پہلے بھی ایک آواز آئی تھی اور میں اس آواز کو کسی حد تک پہچان گئی تھی۔ وزنی لکڑی یا لوہے سے کسی کے سر پر زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کام شروع ہو چکا ہے۔ میرا اندازہ کہہ رہا تھا کہ چوٹ کھا کر گرنے والا رحمت نہیں کیونکہ گرنے کی آواز کے بعد ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً رحمت نے منشی خاں کو نشانہ بنایا تھا۔ تین چار منٹ میں نے سولی پر لٹکتے گزار دیئے۔ آخر دروازے کے پاس تیز قدموں کی آواز آئی۔ رحمت نے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔

گہری تاریکی کے باوجود مجھے پتہ چل رہا تھا کہ وہ سخت گھبرایا ہوا ہے۔ مرتعش آواز میں بولا "بی بی جی! چلیں۔"

"کہاں؟"

"میں بتاتا ہوں۔"

"لیکن میرا بچہ!"

"بب........ بچے کو رہنے دیں۔ وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ کم از کم اپنی زندگی بچا لیں........"

اس کے لہجے نے میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ کتنا سنگ دل ہوگیا تھا وہ۔ کتنی بے رحمی سے میرے دل کو مسل رہا تھا۔ مرد تھا نا' اسے کیا معلوم تھا ماں کیا ہوتی ہے۔ اپنے شیرخوار کے بغیر اسے کہیں سے جانا کیسا لگتا ہے۔ وہ تو مجبوراً اکیلی بازار بھی

جاتی ہے تو اس کا دل گھر میں پالنے کے پھندنوں میں اٹکا رہتا ہے اور یہ گھر نہیں تھا۔ ایک سفاک شخص کی قتل گاہ تھی۔ میں یہاں اپنے زخمی فرحان کو چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔ میں اتنی تیزی سے پیچھے ہٹی جیسے رحمت کی بجائے موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔ "نہیں رحمت میں اپنے بچے کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

وہ لرزاں سرگوشی میں بولا "بی بی جی! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا" میں فیصلہ کن لہجے میں بولی "اور مجھے یہاں سے جانا بھی نہیں۔"

وہ کچھ دیر الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ لگتا تھا اس کے پاس بولنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں۔ میں نے کہا "کیا بات ہے کیوں نہیں آسکتا فرحان؟ کہاں ہے وہ؟"

"اچھا........ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں پھر کوشش کرتا ہوں" اس کے لہجے میں عجب سی شکستگی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گیا۔ اس دفعہ اس کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمبل تھا اور کمبل میں کوئی شے لپٹی ہوئی تھی۔

"آیئے میرے ساتھ" اس نے کہا۔ میں نے کمبل چھو کر فرحان کی موجودگی کا یقین کیا اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ خشک ہوا نے پورے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ میرے سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ کئی دنوں کی قید با اذیت کے بعد آخر میں کھلے آسمان تلے آگئی تھی۔ آزادی کی منزل ابھی دور تھی لیکن امید کی کرن افق سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک دیوار کے سائے سائے چلاتا رحمت مجھے ایک برآمدے میں لے آیا۔ ایک نیم تاریک کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے کھسک کھسک کر آگے بڑھا۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہم ایک ڈیوڑھی نما کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے آخری سرے پر لکڑی کا ایک پرانا پھاٹک نظر آ رہا تھا۔ پھاٹک میں موٹی زنجیر پڑی تھی اور وزنی تالا لگا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جالے بھی نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا اس راستے کو شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ رحمت اس پھاٹک کی دہلیز پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سرگوشی میں بولا۔

"بی بی جی! اس پھاٹک سے نکل کر سیدھی چلتی جانا' نالے کی چھوٹی سی پلی آئے گی۔ اس پلی کو پار کرو تو سامنے ہی پیپل کا اکیلا درخت ہے۔ اس درخت کے نیچے کھڑی ہو جانا' زینب وہاں پاس ہی کماد کے کھیت میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ خود ہی تم کو دیکھ لے گی۔"

اس نے فرحان کو کمبل سمیت زمین پر رکھ دیا۔ پھر پھاٹک کا ایک پٹ ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے پٹ پر ٹانگ جما کر پورا زور لگایا۔ چرچر کی آواز آئی اور پھاٹک سے دونوں تختوں میں نیچے کی جانب تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہوگیا۔ یہ فاصلہ بمشکل اتنا تھا کہ میں سکڑ سمٹ کر اس میں سے گزر سکتی تھی۔ رحمت کے اشارے پر میں نے ایسا ہی کیا۔ نیچے جھک کر پہلے میں نے اپنا سر گزارا اور پھر جسم کو موڑ توڑ کر درز میں سے گزار دیا۔ پورا جسم خراشوں سے بھر گیا اور کندھے کا زخم کھل کر خون اگلنے لگا۔ اس کے بعد رحمت نے کمبل میں لپٹا ہوا فرحان بھی میرے سپرد کر دیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی جی! اب جو کچھ بھی ہے خدا کا شکر کرو۔ چودھری وہاب آپ دونوں کو مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سچ پوچھتی ہو تو........ باغ کے پچھواڑے آپ دونوں کے لئے زمین بھی کھودی جا چکی ہے۔"

میں نے لرز کر فرحان کو سینے سے بھینچ لیا۔ رحمت نے زخمی زخمی لہجے میں کہا۔

"بس جی اب جلدی کرو نکل جاؤ یہاں سے پیپل تک پہنچنے سے پہلے کہیں رکنا نہیں' رب راکھا۔"

میں نے اٹھ کر دیکھا۔ میرے پیچھے تاروں کی روشنی میں ایک کچے راستے کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ دور دور تک چارے کے کھیت تھے اور گنے کی فصل تھی۔ مالٹے اور کینو کے پودے غالباً میری بائیں جانب رہ گئے تھے۔ ایک یخ ہوا ہڈیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ میں نے مڑ کر ایک نظر اس منحوس عمارت کو دیکھا جہاں بقول رحمت ہمارے لئے ایک قبر بھی کھودی جا چکی تھی اور فرحان کو بازوؤں میں لے کر تیز قدموں سے کچے راستے پر بڑھنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ تک میں سیدھی چلتی چلی گئی۔ اچانک مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ میرے بازوؤں میں فرحان کا وزن ہمیشہ سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ کمبل کے اندر اس کی ننھی کمر کی لچک کچھ نامانوس سی لگ رہی تھی........ اور پھر وہ گری'

جو اسے چھاتی سے لگا کر میرے بدن میں دوڑ جاتی تھی' آج کہاں تھی........ کہاں تھا خوشی اور طمانیت کا وہ احساس' میرے اندر سے ایک خاموش چیخ بلند ہوئی۔ میں نے جلدی سے بیٹھ کر فرحان کا کمبل کھولا۔ میرے ہاتھ اس کے گداز رخساروں پر آئے۔ انگلیاں اس کی جلد سے مس ہوئیں اور زمین میرے قدموں کے نیچے ڈگمگانے لگی۔

"فرحان........ فرحان" میں نے بے پناہ لاڈ سے کہا۔ اس کے چہرے کو تھوڑا سا جھنجھوڑا' تھوڑا سا ہلایا۔ اسے اپنے بازوؤں میں ہلکورا دیا۔

"فرحان! آنکھیں کھول میرے بچے' اپنی ماں کو دیکھ' اسے رو کر منا........ کوئی دکھڑا بتا........" دل سے ایک جگر پاش آواز صور اسرافیل کی طرح بلند ہوئی "فرحان یہاں نہیں ہے...... فرحان کہیں بھی نہیں ہے........" ذہن نے چلا کر کہا۔

"نہیں' وہ بے ہوش ہے' گہری بے ہوشی میں ہے۔"

دل چلایا "وہ گرمی کہاں ہے؟ وہ نرمی کہاں ہے؟ وہ لوچ کہاں ہے؟ کہاں ہے تیرا فرحان؟ اب کسے ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کمبل میں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا' پھر میں چیخی' ہاں مجھے یاد ہے چیخی تھی۔ میری آواز کھیت کھیت اور منڈھیر منڈھیر بکھرتی چلی گئی۔ "فرحان........ فرحان" میری پکار سے بیکراں وسعتیں دہلنے لگیں۔ میں اسے چومنے لگی' چاٹنے لگی' اسے بھینچنے لگی' "میرے لال آنکھیں کھول' میری جان حرکت کر" لیکن حرکت کہیں نہیں تھی' آنکھیں ساکت تھیں۔ میں اٹھی اور بھاگتی چلی گئی۔ مغرب کی طرف یا شاید مشرق کی طرف' یا شاید کسی دوسری طرف' میں رو رہی تھی اور بھاگ رہی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خار ٹوٹ رہے تھے۔ میری آنکھوں کے آگے تاریکیوں کے دیو ناچ رہے تھے۔ میرے پیچھے آوارہ کتوں کے گروہ لپک رہے تھے۔ آوازیں تھیں اور پکاریں تھیں مگر میں بھاگ رہی تھی۔ اب مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ رحمت میرے بچے کو لینے گیا تھا تو خالی ہاتھ کیوں آگیا تھا۔ اس نے زخمی زخمی لہجے میں کیوں کہا تھا۔

"وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ کم از کم اپنی زندگی بچالیں........" ہاں میں اب سب کچھ سمجھ رہی تھی لیکن دل کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں مکمل طور پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ پتہ نہیں میں اس حالت میں کب تک اور کہاں تک بھاگی۔ پھر میں نے خود

کو ایک گاؤں میں پایا۔ ایک ہراساں چہرے نے پوچھا "کیا بات ہے بہن؟"

"ڈاکٹر کہاں ہے؟" میں چلا کر پوچھا

ایک دوسرے شخص نے داہنی طرف اشارہ کیا اور میرے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ میرے پیچھے بھی قدموں کی آوازیں تھیں۔ تاریک گھروں کے دروازے دھڑ دھڑ کھل رہے تھے۔ خوابیدہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ پھر میں نے ایک لالٹین کی روشنی میں گاؤں کے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس نے میرے بچے کو لکڑی کی ایک میز پر سیدھا لٹایا۔ اسٹیتھسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ٹارچ سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ یا شاید صرف مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ میری سوالیہ نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر تھیں۔ یہ چہرہ مجھے ایک جواب دینے والا تھا۔ میری زندگی کا سب سے اہم جواب۔ اس سر کو اقرار میں ہلنا تھا یا انکار میں۔ سر کی انہی دو جنبشوں کے درمیان میری زندگی اٹکی ہوئی تھی۔

میں سرتاپا فریاد اور دعا بنی ڈاکٹری معائنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ میں بے زبان خاموشی ڈاکٹر سے التجا کر رہی تھی "اچھی طرح دیکھنا' خوب غور سے دیکھنا' جلدی میں فیصلہ مت دینا' یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں یہ میرا بچہ ہے' میرے جگر کا ٹکڑا ہے' میری کل کائنات ہے........" آخر ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے ہٹایا۔ رحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور انکار میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں نے بھی کچھ کہا تھا لیکن مجھ میں اتنی تاب ہی کہاں تھی کہ اس کے ہونٹوں کو سن سکتی۔ میں کسی جنگلی عورت کی طرح جھپٹی اور ڈاکٹر کی میز سے اپنا بچہ جھپٹ لیا "تم جھوٹ بولتے ہو بکواس کرتے ہو کس نے بنایا ہے تمہیں ڈاکٹر' اجڈ' دیہاتی' جاہل" میں نے فرحان کو سینے سے لگایا۔ اس کی ننگی زخمی انگلیوں کو چوما اور وہاں موجود لوگوں سے فریاد کرنے لگی۔

"بھائیو! مجھے کسی طرح شہر پہنچا دو۔ میں اسے ہسپتال لے جاؤں گی۔ شہر میں میرا بھائی خود ڈاکٹر ہے۔ وہ اسے بچالے گا۔ خدا کے لئے جلدی کرو۔"

لوگوں کی نظروں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ شاید میری ذہنی حالت پر بھی شک کر رہے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ ان میں سے کوئی میری مدد نہیں کرے گا۔ میں نے بچے کو لیا اور ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"کہاں سے آئی ہو بہن' تمہارے شوہر کا کیا نام ہے؟" ایک عورت بازو کھینچ کھینچ کر مجھ سے پوچھ رہی تھی اور یہ کوئی اکیلی عورت نہیں تھی' کئی مرد و زن تھے۔ وہ سب مجھ سے سوال پوچھ رہے تھے۔ مجھے روکنے کی سعی کر رہے تھے۔ میں انہیں دھکیلتی اور کاٹتی ہوئی کھیتوں کی طرف نکل گئی اور ایک بار پھر بھاگنے لگی۔ مجھے بس ایک اندازہ ساتھا کہ شہر اس طرف ہو گا۔

چند فرلانگ کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ یہ گاؤں سے ہی میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے میں ایک خشک برساتی نالے کے اندر دبک کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ان کی لالٹینوں کی روشنیاں اور ان کی آوازیں دور چلی گئیں تو میں اپنی تاریک پناہ گاہ سے نکلی اور ایک بار پھر اپنے بے سمت سفر پر روانہ ہو گئی۔ کوئی صدا پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

"ثنا تیرا بچہ مر چکا ہے۔ اس کے جسم کا خون اس کی کٹی ہوئی انگلیوں سے رس رس کر نکل چکا ہے۔ اب اس کے بدن میں لہو کی بوند ہے نہ زندگی کی رمق" مگر میں تھی کہ کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے اپنے پیچھے آنے والے ہر شخص سے خوف آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا لوگ مجھ سے میرے زندہ فرحان کو چھین کر دفن کر دیں گے۔ میں گرتی پڑتی بھاگتی رہی۔ آخر کہیں قریب سے ٹیوب ویل چلنے کی آواز آئی۔ سخت سردی کے باوجود میرا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا اور پیاس اتنی شدید تھی کہ جون جولائی کی دوپہروں میں بھی کیا ہو گی۔ ٹیوب ویل کا پانی گرنے کی آواز آئی تو میں اس آواز کی طرف لپکتی چلی گئی۔ میں پانی پی رہی تھی کہ پاس والے کوٹھے کے پیچھے سے تین چار افراد برآمد ہوئے۔ پتہ نہیں وہ راستے میں میرے پیچھے لگے تھے یا اس ٹیوب ویل پر پہلے سے موجود تھے۔ ان میں ایک نے پوچھا۔

"بی بی! کیا بات ہے' اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "بھائی! اگر تمہارے پاس کوئی سواری ہے تو مجھے شہر تک لے چلو۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں" اس شخص نے آگے بڑھ کر فرحان کو دیکھنا چاہا تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں...... نہیں ہوا لگ جائے گی' کمبل مت ہٹاؤ۔"

وہ نرمی سے بولا "بی بی! دیکھنے تو دو" ہاتھ میں پکڑی لالٹین اونچی کر کے اس نے فرحان کو ایک نظر دیکھا۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کی حرکت محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا۔

"کس کی ہے تو؟" اس نے پوچھا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہیں میرے خون آلود کرتے سے پھسلتی ہوئی میری کلائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جہاں ابھی تک سونے کی بیش قیمت چوڑیاں موجود تھیں۔ سب کچھ لٹ گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ چوڑیاں ابھی تک میرے جسم سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے ادھیڑ عمر شخص کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پکار کر کہا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو' پہلے مجھے بچے کی جان بچا لینے دو۔"

وہ دکھ سے بولا "بیٹی! اب اس کو کیوں لیے پھرتی ہے یہ تو.........."

"خبردار!" میں نے چلا کر کہا "خبردار....... ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا یہ میرا بیٹا ہے۔ میں زندہ ہوں تو یہ کیسے مر سکتا ہے۔ یہ بھی زندہ ہے....... خبردار کچھ نہ کہنا۔"

میں نے فرحان کو پھر بانہوں میں جکڑا اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔ یوں لگتا تھا میرے پیچھے آسیبی پرچھائیاں لپک رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اپنا پاگل پن محسوس بھی کر رہی تھی پھر بھی ہوش میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ دل کی آرزو تھی کہ کاش یہ سب ایک خواب ہو۔ اچانک میں ٹھٹھک کر رک گئی۔ مجھے راستہ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ کہیں قریب ہی جنریٹر کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے میں پھر انہی کھیتوں میں نکل آئی تھی جہاں سے میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ بیس تیس قدم بھاگ کر میں نے ایک کھیت پار کیا اور داہنی جانب دیکھا تو چند کھیتوں کی دوری پر اس منحوس عمارت کی نیم روشن چار دیواری نظر آئی جہاں میں نے اپنا سب کچھ گنوایا تھا۔ میرے اندر ایکا ایکی ایک آتش فشاں دہک اٹھا۔ تصور میں چوہدری وہاب کی مخصوص مسکراہٹ چمکی اور تن بدن میں شعلے لپک گئے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے پاس کوئی بندوق ہو' پستول ہو' خنجر یا کلہاڑی ہو۔ میں چیختی چلاتی اس مکان کے اندر گھس جاؤں۔ جو میرے سامنے

آئے اسے ہلاک کر ڈالوں اور اس چار دیواری کے سب سے بڑے شیطان کو اتنے
لگاؤں کہ اس کی ہر بوٹی علیحدہ علیحدہ ہو کر پھڑکنے لگے لیکن ہتھیار کہاں تھا؟ وہ شے
تھی جو میری ناتوانی کو توانائی میں بدل سکتی اور وہاب کے پہریداروں کے درمیان سے
راستہ بنا سکتی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ ہتھیار کیا ہوتا ہے اور کسی وقت اس
ضرورت کتنی شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ میں اپنی کیفیت ٹھیک طرح بیان نہیں
پا رہی۔ یوں سمجھ لیں کہ پانی میں ڈوب کر مرتے ہوئے شخص کو جتنی ضرورت ہوا کی ہو
ہے اتنی ہی طلب مجھے ہتھیار کی تھی۔ میں نے دیوانوں کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھ
درختوں' فصلوں اور منڈیروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ گھونسلوں میں
ہوا تھا یا آسمان پر چمک رہا تھا یا دور کے کھیتوں میں بھونک رہا تھا۔ میں غم و غصے سے
قابو ہو کر درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس عمارت کی طرف بڑھی۔ قریباً نصف فرلانگ
کا وہ فاصلہ مجھے نصف گز کی طرح محسوس ہوا۔ یوں لگا میں اڑتی ہوئی اس فاصلے کو پاٹ گ
ہوں۔ یہ عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ میں گھوم کر عمارت کے پہلو میں آئی اور وہاں سے صد
دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے پہچان لیا یہی دروازہ تھا جہاں سے ایک ہفتہ پہلے مجھے گزار
جہنم میں داخل کیا گیا تھا۔ دروازہ بند تھا میں نے پوری قوت سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو" میں حلق کی پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔

ذرا دیر بعد وزنی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپ
سامنے ایک بوڑھے شخص کو پایا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ میں چیل کی طر
اس پر جھپٹی۔ وہ میرا دھکا لگنے سے دور جا گرا۔ لاٹھی ٹن ٹن کی آواز سے پختہ فرش
لڑھکتی چلی گئی۔

میں نے فرحان کو ایک طرف چارپائی پر ڈالا اور اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔
یکایک ایک ہٹا کٹا شخص نکل کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے اسے زوردار دھکا دیا۔ اس
نے گرتے گرتے بھی میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ
تھی۔ میں نے پے در پے اس کے پیٹ میں ٹھوکریں ماریں اور خود کو چھڑا لیا۔ میرے
ذہن میں صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ تھا وہاب کے مسکراتے چہرے کا۔ میں اس چہر
کی مسکراہٹ اس طرح نوچنا چاہتی تھی کہ اس کے پیچھے ہڈیوں اور بے نور آنکھوں کے

ہوا کچھ باقی نہ بچے۔ میں نے ایک ایک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی دروازہ کھلا ہوا
نہیں تھا۔ ایکا ایکی دو مردوں نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش
کی لیکن خالی ہاتھ کہاں تک ان کا مقابلہ کرتی۔ اتنے میں دروازہ کھولنے والا بوڑھا بھی ان
کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان تینوں نے مجھے بے بس کر دیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔
میں چیخ چیخ کر ایک ہی فقرے کی تکرار کئے جا رہی تھی۔

"چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو مجھے۔"

اتنے میں بیرونی دروازے کی طرف سے بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دروازہ
کھلا اور کئی افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ یہ
وہی لوگ تھے جو شروع سے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں اس بستی کے لوگ بھی تھے
جہاں دیہاتی ڈاکٹر نے فرحان کو دیکھا تھا۔ ٹیوب ویل پر ملنے والے افراد بھی تھے اور وہ
کسان بھی تھے جنہوں نے اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مجھے بھاگتے دوڑتے
دیکھا تھا۔ ان سب کے چہروں پر تجسس تھا' حیرانی تھی اور دکھ تھا۔ وہاب کے ملازم اب
مجھے بے دریغ پیٹ رہے تھے۔ یہ سب نئے ملازم تھے اور اس سے پہلے میں نے انہیں
کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ حویلی میں اور نہ اس ڈیرے پر۔ مجھے پٹتے دیکھ کر ایک لمبا تڑنگا
شخص آگے آیا۔ اس نے مجھے حویلی کے ملازموں سے چھڑانے کی کوشش کی اور انہیں بتایا
کہ وہ نورپور کا نمبردار ہے۔ ملازم اس نمبردار کو بالکل خاطر میں نہیں لائے۔ صرف اتنا ہوا
کہ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔

وہ مجھے چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے رعب سے کہا۔

"نمبردار جی! ان لوگوں سے کہیں اپنا کام کریں' یہ بڑی حویلی کا معاملہ ہے۔"

ایک شخص نے ہمت کر کے پوچھا "لیکن یہ ہے کون؟ اس کا قصور کیا ہے؟"

وہاب کے کارندے نے طنزیہ لہجے میں کہا "معمولی قصور ہے۔ اس نے جاگیردار
صاحب کو قتل کیا ہے۔ اب کو کچھ لگتی تو نہیں تمہاری؟"

سوال پوچھنے والا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"یہ جھوٹ بولتے ہیں' ظالم ہیں یہ' انہوں نے پچھلے جمعے سے مجھے اس مکان میں
بند کر رکھا ہے...... وہ پڑی ہے میرے معصوم کی لاش' جسے ان درندوں نے تڑپا تڑپا کر

مارا ہے۔ دیکھو! اس کمسن کو...... دیکھو ذرا" میرے ذہن پر ایک بار پھر دھند چھانے لگی۔ میں پاگلوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور ان کے ہاتھوں کی گرفت میں تڑپنے لگی۔

نمبردار اور دوسرے لوگ اب بغور میری شکل دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔ ایک شخص نے زور سے کہا "ہاں...... ہاں یہی ہے وہ' میں نے تصویر دیکھی تھی اخبار میں" لوگ اب مجھے پہچان گئے تھے اور میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہوتا رہا تھا۔

میں نے بہت چیخ وپکار کی لیکن کوئی میری یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ مجھے اس مکان میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے اور میرے بچے کو قتل کیا گیا ہے۔ چودھری وہاب کے کارندے کہہ رہے تھے "یہ پاگل ہوگئی ہے' چودھری وہاب صاحب نے تو ابھی تک اس باغ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ یہ پاگل پن میں خود ہی اپنے بچے کو مار لائی ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں' میں پاگل نہیں ہوں" میں چلانے لگی۔ آہنی ہاتھوں کی گرفت مجھ پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ "میں نے اپنے بچے کو نہیں مارا۔ انہوں نے مارا ہے' ان سب نے مارا ہے۔" میری پکار لوگوں کے شوروغل میں دبتی جا رہی تھی۔ کسی سخت ہاتھ نے ایک مضبوط رسی میرے جسم کے گرد لپیٹنی شروع کر دی۔ میرے دونوں بازو بھی اس رسی کی گرفت میں آتے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا اوپری دھڑ قطعی طور پر جکڑا جا چکا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا "تھانے لے کر چلو" کوئی کہہ رہا تھا "پہلے حویلی لے جاؤ" ایک آواز کانوں میں پڑی "فاحشہ ہے' اس کو یہیں پتھر مار مار کر مار دینا چاہئے" ایک جوشیلی آواز آئی "ہاں یہیں مار دینا چاہئے" ایک اور آواز "نہیں پہلے حویلی لے کر جانا چاہئے"...... "چلو...... چلو...... چلو" بہت سی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ مجھے پیچھے سے دھکیلا اور آگے سے کھینچا جانے لگا۔ میں ہر قدم پر مزاحمت کر رہی تھی۔ میری نگاہیں اپنے فرحان کی لاش ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے چیخ کر کہا "رک جاؤ...... رک جاؤ...... مجھے اپنے لال کی صورت تو دیکھ لینے دو۔" اس کا منہ تو چوم لینے دو!"

کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ وہ مجھے مارتے اور کھینچتے ہوئے باہر لے آئے اور ایک جلوس کی صورت میں آگے بڑھنے لگے۔ وہ میری زندگی کا خوفناک ترین سفر تھا۔ خدا ہر

شخص کو ذلت کی اس انتہا سے بچائے۔ میرا جسم زخم زخم اور لباس تار تار تھا۔

میں اٹھ رہی تھی اور گر رہی تھی۔ جاگیردار کے زرخرید کتے میرے چاروں طرف بھونک رہے تھے۔ ان کے پیچھے تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ہوسکتا ہے ان کے دلوں میں میرے لئے ہمدردی ہو۔ مگر اس ہمدردی کو انہوں نے کسی خوفناک راز کی طرح دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا تھا۔ طاقت کے سامنے کمزور جذبوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ میرے بھائی بھی تو میرے ہمدرد تھے۔ انہیں بھی تو پتہ تھا کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں مگر میرے بھائی اور میرے خون کے سارے رشتے مجھ سے نگاہیں پھیر کر مصلحت کے خول میں چھپ چکے تھے۔ اپنی بے حسی کے لئے ان کے پاس یہی جواز کافی تھا کہ میں نے عدالت میں اپنے شوہر کے حق میں بیان دیا تھا۔ اب میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو جاتا اس میں میرا ہی قصور تھا۔ خود غرضی و طاقت کی آندھی نے ضمیر کے چراغ بجھا دیئے تھے۔

لوگ مجھے دھکیلتے اور کوستے ہوئے اس حویلی تک لے آئے جہاں آج سے دو برس پہلے میں دلہن بن کر اتری تھی۔ میرے قدموں میں سرسوں کا تیل بہایا گیا تھا اور پھول نچھاور کئے گئے تھے۔ آج پھولوں کی جگہ میرے پاؤں میں ٹوٹے ہوئے کانٹے تھے اور سونے چاندی کی جگہ مجھ پر پتھر نچھاور کئے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا چودھری وہاب حویلی کی بیرونی بالکونی میں کھڑا تھا۔ یہ بالکونی بڑے گیٹ کے عین اوپر واقع تھی۔ اس کے ساتھ دو بندوق بردار محافظ بھی تھے۔ وہاب کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔ مجھے پکڑ کر لانے والوں میں سے ایک نے بالکونی میں جا کر اس سے کچھ بات چیت کی۔ اس بات چیت کے بعد چودھری وہاب بالکونی میں تھوڑا سا آگے آیا اور تقریر کرنے والے انداز میں بولا۔

"بھائیو! میں جانتا ہوں' چودھری واصف کی ناگہانی موت نے آپ کو صدمے سے بے حال کر رکھا ہے۔ اس کی موت کی ذمے دار آپ کے سامنے ہے۔ اس قاتلہ کی سزا تو یہی تھی کہ اسے اسی جگہ سنگسار کر دیا جاتا۔ مگر کچھ بھی ہو ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا۔ آپ ذرا تحمل سے کام لیں۔ میں نے انسپکٹر خورشید محمد کے پاس بندہ بھیج دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس پہنچ جاتی ہے۔"

ایک شخص چلا کر بولا "ہم نہیں مانتے پولیس کچہری کو' اس عورت نے ہمارے ان

داتا کو مارا ہے' ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ایک بوڑھے نے پکار کر کہا "مارو...... ہاں مارو اس بچے کھانی ڈائن کو"

میں اس خرانٹ بوڑھے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ واصف کے بے دام کے غلاموں میں سے ایک تھا اور اس کی بیٹی واصف کی رکھیل تھی۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا پھر بھی مجھے اتنی سمجھ آ رہی تھی کہ یہ جو کچھ ہونے لگا ہے چودھری وہاب کے ایما پر ہو رہا ہے۔ وہ اپنے شرمناک گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے اس جگہ مروا دینا چاہتا ہے...... یہ سب کچھ جان کر بھی میرے دل میں کوئی ہراس پیدا نہیں ہوا۔ اب میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے بچے کے بغیر ہر سانس میرے لئے بوجھ تھا۔ اس بوجھ کو اٹھائے اٹھائے میں جیلوں اور کچہریوں میں کہاں بھٹکتی پھرتی۔ میں موت کی آخری اذیت جھیلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

"مارو...... مارو" اب ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

خاموش اکثریت پر جاگیردار کے گنے چنے نمک خواروں کا شور غالب آتا جا رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں بے رحم سفاک ہاتھوں نے مجھ پر پتھروں ڈنڈوں اور لاٹھیوں کی بارش کر دی مگر ایسا صرف ایک یا دو سیکنڈ کے لئے ہوا۔ اس سے پہلے کہ میرے جسم سے خون کے فوارے چھوٹتے اور گوشت چیتھڑوں میں بدلنے لگتا...... یکایک جابر ہاتھ رک گئے۔ ضربوں کا سلسلہ تھم گیا۔ میں نے دیکھا میرے چاروں طرف جاگیردار کے کارندے کائی کی طرح پھٹ رہے ہیں۔ بھگدڑ کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونج رہی تھیں۔ پھر مجھے کچھ فاصلے پر لہراتی ہوئی مشعلیں نظر آئیں۔ یہ مشعلیں تیزی سے قریب پہنچ رہی تھیں۔ میرے بالکل پاس سے کوئی چلایا۔

"شہاب کے آدمی آ گئے...... شہاب کے آدمی۔"

وہی سراسیمگی دیکھنے میں آئی جو تین ہفتے پہلے میرے اور سلیم کے فرار ہوتے وقت دکھائی دی تھی۔ دفعتاً گولیاں چلنے لگیں۔ اب چاروں طرف گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ میں بھاگ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ میرے سامنے حویلی کی بالکونی میں ایک شخص کو گولی لگی اور وہ تڑپ کر نیچے پختہ فرش پر آ گرا۔ اس کے بعد بالکونی کی چھت پر لگا ہوا لیمپ چکنا چور ہو گیا اور اردگرد تاریکی پھیل گئی۔ چند گولیاں ٹھک ٹھک کی آواز

سے درخت کے تنے میں پیوست ہوئیں۔ یہ جگہ اب غیر محفوظ تھی۔ میں اٹھ کر بھاگی تو ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ ڈھاٹے میں سے صرف چمک دار آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے زور مار کر خود کو چھڑانا چاہا تو آواز آئی۔

"میں شہاب ہوں' آؤ میرے ساتھ۔"

میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ مجھے کھینچتا اور سنبھالتا ہوا ایک گھوڑے تک لے آیا۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس نے مجھے اٹھا کر گھوڑے پر سوار کر دیا اور عقب سے سہارا دے کر سنبھال لیا۔ ایک گھڑسوار نے قریب آ کر تیز لہجے میں کہا۔

"چودھری جی! آپ نکل جائیں ہم سنبھالتے ہیں ان کو"

چودھری شہاب نے تحکم سے کہا "نہیں سادل...... سارے نکل چلو اگر ان کتوں نے پیچھا کیا تو ٹبوں کے پار گھیر لیں گے' چل دے آواز اور بلا سب کو۔"

"نہیں چودھری جی' میری بات مانیں' آپ نکل چلیں۔"

اسی دوران گولیاں ہمارے سر کے اوپر برگد کے پتوں سے تڑتڑ ٹکرانے لگیں "نکلیں چودھری جی" اس شخص نے لجاجت سے کہا اور گھوڑا گھما کر جوابی فائر کرنے لگا۔ چودھری شہاب نے لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا ایک چکری لے کر آگے بڑھنے لگا۔ رات پچھلے پہر کی خنکی میں کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح لوگ حویلی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ اب مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے کے دشوار گزار سفر کے بعد میں نے خود کو ایک حویلی کے دروازے پر پایا۔ یہ حویلی درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپیں گونجیں تو لکڑی کے پھاٹک میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک ادھیڑ عمر شخص لالٹین لئے برآمد ہوا۔ ہمیں دیکھنے کے بعد وہ جلدی سے اندر چلا گیا۔ "کریم بخش" اس نے کسی کو آواز دی۔ ذرا دیر بعد پانچ چھ مسلح آدمی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر چودھری کو شہاب کو سلام کیا اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔

چودھری شہاب نے کہا "اس بی بی کو اندر لے جاؤ اور حفاظت سے رکھو" پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا تمہیں یہاں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہئے۔"

شہاب کی آواز میرے کانوں میں جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔ میری آنکھیں

خشک ہو چکی تھیں لیکن دل مسلسل رو رہا تھا۔ اپنے بچے کا مرا ہوا چہرہ میری نگاہوں میں تھا۔ دو افراد نے بڑے احترام سے مجھے گھوڑے سے اتارا۔ ایک شخص نے شہاب سے پوچھا۔

"چودھری جی' استاد نہیں آیا؟"

"وہ بھی آتا ہی ہوگا" چودھری نے جواب دیا اور گھوڑا موڑ کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔ مجھے گھوڑے سے اتارنے والے بڑے احترام سے اندر لے آئے۔ یہ کافی وسیع حویلی تھی مگر لگتا تھا مدت سے بے آباد پڑی ہے۔ ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ کمرے سازوسامان سے خالی تھے۔ ایک جگہ اینٹوں کا عارضی چولہا اور جست کے ٹوٹے پھوٹے برتن بکھرے تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں پیال کے کچھ بستر بچھے ہوئے تھے اور ان پر میلی رضائیاں پڑی تھیں۔ ان بستروں کے بیچوں بیچ پختہ فرش پر آگ جل رہی تھی اور آگ کے دھوئیں نے چھت کو سیاہ کر رکھا تھا۔ ایک ہال نما کمرہ جو شاید حویلی کا ڈرائنگ روم تھا اور جہاں چند خوبصورت پینٹنگز ابھی تک آویزاں تھیں اصطبل کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ قریباً چھ عدد گھوڑے یہاں بندھے ہوئے تھے اور ان کی بو سے پوری حویلی مہک رہی تھی۔ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک چارپائی پر بدبودار بستر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود اشیاء سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کسی مرد کا قیام رہا ہے۔ میں گم صم سی بستر پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھیں صحرا کی طرح ویران ہو چکی تھیں۔ ایک پر تپش چبھن کے سوا ان میں کچھ نہیں تھا۔ میرا فرحان مر چکا تھا لیکن میں نہ بین کر رہی تھی اور نہ میرے ہاتھ سینہ کوبی کے لئے اٹھ رہے تھے' نہ بال نوچ رہی تھی اور نہ دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی میری' کچھ دیر بعد ایک شخص نے گرما گرم چائے کا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا اور ایک پٹی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میں اپنے کندھے پر باندھ لوں۔ میں نے پٹی باندھی اور نہ چائے پی۔ اس طرح بیٹھی رہی........ آخر میری زندگی کی منحوس ترین رات کا اندھیرا صبح کے اجالے میں بدل گیا۔ کوئی دس بجے کے قریب پختہ فرش پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں اور سات آٹھ افراد حویلی میں آ گئے۔ وہ سب تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے کمرے دروازہ کھلا اور ایک بے حد خوفناک شکل والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کی پیشانی پر

کسی کلہاڑی یا تلوار وغیرہ کا زخم تھا۔ اس زخم نے پیشانی کے ساتھ ساتھ اس کی ناک کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے لگتا تھا جیسے مٹی کے ٹوٹے ہوئے چہرے کو اناڑی پن سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کی خود رو داڑھی کانٹوں کی مانند تھی اور مونچھوں نے بالائی ہونٹ مکمل طور پر چھپا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ایک بازو سے خون بہہ رہا ہے' دوسرا ہاتھ اس نے ماتھے تک اٹھایا اور بولا "سلام بی بی جی۔"

میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ غالباً وہ بھی جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ دروازہ بھیڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کی آواز سے میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی ڈھاٹا پوش تھا رات جسے چودھری شہاب نے ساول کہہ کر مخاطب کیا اور جس نے چودھری سے کہا تھا وہ مجھے لے کر نکل جائے۔

اب کسی ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساول جسے اس کے ساتھی استاد ساول کہہ کر بلا رہے تھے انہیں رات والے معرکے کی بابت بتا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ رات ہمارے آنے کے بعد چنگیزیوں کی حویلی کے سامنے خونریز لڑائی ہوئی ہے۔ دو گھنٹے جاری رہنے والی فائرنگ میں دونوں طرف سے دو دو آدمی مارے گئے ہیں اور قریباً ڈیڑھ درجن زخمی ہوئے ہیں۔ میں سب کچھ سن رہی تھی لیکن دل کسی بات کا اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ واقعات میرے اردگرد نہیں ہو رہے بلکہ کسی کہانی کا حصہ ہیں۔ دوپہر کے وقت ایک شخص کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ رحمت تھا۔ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ لرزاں ہاتھوں سے اس نے ٹرے میرے قریب رکھ دی اور اپنی ہچکیوں کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے آپ کے بچے کی موت کا بڑا دکھ ہے بی بی جی! پر کیا کیا جائے' اللہ کی رضا یہی تھی۔ آپ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کریں" وہ دیر تک مجھے پرسا دینے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ لاہور سے میرے عزیزوں نے بچے کی میت حاصل کرنے کے لئے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے اور امید ہے کہ شام تک پوسٹ مارٹم کے بعد میت انہیں دے دی جائے گی........ اس نے مجھے کھانا کھلانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا۔

"بی بی جی! زینب کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

میرے اگلے دو تین دن بالکل بے حسی کی کیفیت میں گزرے۔ صرف سینے میں ایک چنگاری سی تھی جو کبھی بھڑک کر شعلہ اور کبھی الاؤ بن جاتی۔ چودھری شہاب کے آدمی ہر طرح میرا خیال رکھ رہے تھے اور رحمت تو ہروقت میری دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔ اس حویلی کے بارے مجھے جو کچھ پتہ چلا تھا اس کا لب لباب یہ تھا۔

یہ حویلی ایک مقامی زمیندار کی تھی۔ زمیندار کو فلمیں بنانے کی لت پڑ گئی تھی اور وہ جائیداد بیچ کر لاہور جا آباد ہوا تھا۔ یہ حویلی چونکہ ایک پرسکون جگہ پر تھی اور کبھی کبھار شوٹنگ میں بھی کام آتی تھی لہٰذا زمیندار نے حویلی اور اردگرد کی کچھ زمین رکھ چھوڑ تھی۔ یہاں دیکھ بھال کے لئے خانو نامی ایک چوکیدار رہتا تھا۔ چودھری شہاب کے کچھ بندوں نے جیل سے فرار ہونے کے بعد اس حویلی میں پناہ لی تھی۔ چوکیدار خانو کو انہوں نے ڈرا دھماکا کر اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ جیل سے فرار ہونے والے کل پانچ آدمی تھے۔ جن میں سے ایک جاگیرداروں کے ساتھ لڑائی میں ہلاک ہوگیا تھا اور باقی چار جن میں استاد ساول بھی شامل تھا اس حویلی میں تھے۔ یہ سب خطرناک لوگ تھے اور چودھری شہاب کے ایک اشارے پر ہر کام کر گزرتے تھے۔ رحمت کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ پولیس نے "پال پور" سے چودھری شہاب کے پانچ آدمی گرفتار کر لئے ہیں اور وہ خود ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لئے شہر گیا ہوا ہے۔

اپنے بارے میں رحمت نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات مجھے اور مردہ فرحان کو حویلی سے نکالنے کے بعد' وہ ایک پگڑی کی کمند بنا کر خود بھی حویلی سے باہر آگیا تھا۔ اس کے بعد وہ سیدھا نہر کے پار سرکاری رکھ میں پہنچا تھا جہاں پروگرام کے مطابق زینب نے مجھے لے کر پہنچنا تھا۔ یہاں محکمہ جنگلات کا ایک پرانا ریسٹ ہاؤس تھا اور اس رات وہی ریسٹ ہاؤس ہم تینوں یعنی میرے' زینب اور رحمت کے ملنے کی جگہ تھی۔ مگر وہاں صرف رحمت پہنچ سکا تھا۔ میں فرحان کی موت میں دیوانی ہو کر کہیں سے کہیں نکل گئی تھی اور زینب بھی نہ جانے کیوں وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ہم دونوں کی تلاش میں ناکامی کے بعد رحمت اکیلا ہی چودھری شہاب کے گاؤں پال پور چلا گیا تھا۔ درحقیقت شروع سے اس کا پروگرام یہی تھا کہ مجھے اور زینب کو حویلی سے نکالنے کے بعد چودھری شہاب کے پاس

لے جائے گا۔ اس پورے علاقے میں چودھری شہاب ہی وہ واحد شخص تھا جو چنگیزیوں کے کسی باغی کو پناہ دینے کا سوچ سکتا تھا۔

فرحان کا مرا ہوا چہرہ دیکھنے کے بعد نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ میں ساری رات چھت کی کڑیاں گنتی اور سارا دن خاموش بیٹھی رہتی۔ رحمت میرا دھیان بٹانے میرے پاس آ بیٹھتا بات سے بات نکالتا' خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دینے لگتا۔ اس کی گفتگو کچھ اس طرح ہوتی تھی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہے۔ رات نیند آئی یا نہیں؟ آنکھوں سے تو لگتا ہے آج بھی جاگتی رہی ہیں۔ چودھری صاحب آج بھی نہیں آئے۔ پتہ نہیں کس چکر میں ہیں۔ میرا خیال ہے آج ضرور شکل دکھائیں گے۔" رحمت ایک ہمدرد اور غمگسار شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہروقت ایک اداسی سی ٹپکتی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا اس کا ماضی کسی دل گداز کہانی کا امین ہے۔ ایک روز وہ خود ہی مجھے یہ کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ اس روز سارا دن زینب کو تلاش کرنے کے بعد واپس آیا تھا اور نڈھال سا میرے کمرے کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"بی بی جی! آپ بھی سوچتی ہوں گی۔ میرا اور زینب کا کیا رشتہ ہے' میں کیوں اس کے لئے اتنی مصیبت اٹھا رہا ہوں۔ کچھ کچھ اندازہ تو آپ کو بھی ہوگیا ہوگا۔" پھر وہ خیالوں میں گم ہوگیا۔

"یہ آج سے گیارہ بارہ سال پرانی بات ہے۔ میں اور زینب ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ بڑی پاک صاف محبت تھی ہم دونوں کی۔ ایک دوسرے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے ہم' جدائی کا خیال بھی نہیں تھا ہمارے دماغوں میں' پورے گاؤں کے لڑکے مجھ سے حسد کرتے تھے کہ زینب جیسی سوہنی کڑی میرے بس میں ہے۔ ہمارے گھرانوں میں دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ بات جب پھیلنے لگی تو بڑوں نے ہماری منگنی کر دی۔ اس طرح لڑکپن میں ہی زینب میری منگ بن گئی۔ میں ایک یتیم لڑکا تھا۔ ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا' جسے میں بیٹے کی طرح سمجھتا تھا اور باپ بن کر پال رہا تھا۔ میں جاگیرداروں کا کاماں تھا اور نوعمری میں ہی میں نے سخت محنت سیکھ لی تھی۔ چودھری واصف مجھے انگریزی میں "لوہے کا لڑکا" کہا کرتے تھے۔ آپ کو پتہ نہیں بی بی کہ سخت سردی میں زخمی مرغابی کو ٹھنڈے ٹھار پانی سے نکال کر لانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں چودھری صاحب کے لئے یہ کام کیا کرتا تھا۔ وہ شکار پر ہمیشہ مجھے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ میرا کام چودھری صاحب کے گھوڑوں اور شکاری کتوں کی دیکھ بھال تھا اور یہ کام میں اب تک بڑی محنت سے کرتا رہا ہوں۔ لڑکپن سے میرے دل میں دو ہی خواہشیں تھیں۔ ایک زینب کو حاصل کرنا اور دوسرے اپنے چھوٹے بھائی "جانی" کو کسی قابل بنانا' میں اسے پڑھا رہا تھا اور تیسری جماعت کے بعد اسے اس کے خالو کے پاس شہر بھیج دیا تھا۔ وہ وہیں رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی گاؤں میں نہیں آنے دیا۔ اگر کبھی خون زیادہ جوش مارتا تو شہر جا کر اس سے مل آتا تھا۔ اس کا تعلیمی خرچا پورا کرنے کے لئے مجھے ضرورت سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی مگر میں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ زینب کی محبت میں کچھ اتنی طاقت

تھی کہ میں ہر مشکل ہنس کر سہہ لیتا تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گی بی بی جی! میں سارا سارا دن اور ساری ساری رات کام کیا کرتا تھا۔ سارا دن جانوروں کی دیکھ بھال اور راتوں کو کھیتی میں کام۔ ان دنوں خون میں جوش بھی کچھ زیادہ تھا۔ یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ سونا ہے یا آرام بھی کرنا ہے۔ ان ہی دنوں ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ زینب کا ایک دعویدار پیدا ہو گیا۔ یہ ساتھ والے گاؤں کا نوجوان جراح دین محمد تھا۔ دین محمد کے باپ قدرت علی سے زینب کے باپ اکبر نے اپنی شادی پر دو سو روپیہ بیاج پر قرض لیا تھا۔ یہ قرض اب بڑھتے بڑھتے بیس سالوں میں پانچ ہزار روپیہ ہو چکا تھا۔ قدرت علی کا بیٹا دین محمد اس رقم کی واپسی چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا یا تو قرض چکا دو یا زینب کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ زینب کا بوڑھا باپ اس بارے میں سخت پریشان تھا۔ مجھے جب اس بات کا پتہ چلا تو تن من میں آگ لگ گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو زینب کے سر سے اس قرض کی گالی اتار کر رہوں گا۔ ایک روز میں زینب سے ملا اور اس سے وعدہ کیا کہ جب تک میں تیرے باپ کا قرض نہ اتار لوں گا تجھے چھوؤں گا اور نہ تیری شکل دیکھوں گا۔ زینب اس دن رونے لگی تھی۔ اس نے کہا تھا "رحمت! میرے اور اپنے درمیان ایسے قول کی دیوار کھڑی نہ کر جو پورا نہ ہو سکے' تیرے دو ہاتھ ہیں کوئی چار ہاتھ نہیں' کتنا کام کرلے گا تو' کتنی ہڈیاں رول لے گا اپنی' یہ میرے باپ کا مسئلہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح حل کر ہی لے گا۔"

میں نے زینب کی کوئی بات نہیں مانی تھی اور اسے دلاسہ دے کر گھر واپس بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد ڈھائی تین برس مجھے اپنے آپ کا ہوش نہیں رہا۔ میں نے جاگیردار کی حویلی میں' ان کے اصطبل میں' ان کے کھیتوں میں ہر جگہ خون پسینہ بہایا اور پائی پائی جمع کرتا رہا۔ آخر وہ دن آیا جب میری مٹھی میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ تھے اور دل میں حوصلہ تھا کہ اب میں اپنی زینب کو ہر بندش سے آزاد کر سکوں گا...... مگر قدرت میری بیوقوفی پر مسکرا رہی تھی۔ میں نے سوچا کچھ تھا اور ہوا کچھ۔ میں صبح اٹھ کر کنوئیں کی طرف جا رہا تھا کہ چودھری صاحب کے دو ملازموں نے مجھے راستے میں روک لیا۔ انہوں نے کہا تمہیں فوراً حویلی میں بلایا گیا ہے۔ میں حویلی میں پہنچا تو رب نواز بڑے ٹھاٹ سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا...... رب نواز کو تو آپ جانتی ہیں نا...... وہی جو انگریزی رائفل کے

ساتھ ہر وقت دم کی طرح چودھری واصف کے ساتھ رہتا تھا۔ آج کل وہ ہسپتال پر
ہے۔ رب نواز کے پاس ہی دونوں منشی بیٹھے ہوئے تھے اور میز پر بہی کھاتے کھلے رکھے
تھے۔ میں وہاں پہنچا تو رب نواز نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا۔ بڑے منشی نے ایک
پرانے کھاتے کے کچھ صفحے الٹ پلٹ کئے اور اسے رب نواز کے سامنے رکھ دیا۔ رب
نواز نے کہا۔

"رحمے' تجھے پتہ ہے نا کہ تو پکا کاماں ہے؟" "میں نے "ہاں" میں جواب دیا۔ رب
نواز نے پوچھا۔ "یہ بھی پتہ ہے کہ پکا کاماں کا کس کو کہتے ہیں؟" میں نے انکار میں سر ہلا
اور یہ بات تھی بھی صحیح' میں بچپن سے سنتا آیا تھا کہ ہم حویلی کے "پکے کامے" ہیں
لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ "پکا کاماں" کس کو کہتے ہیں۔ رب نواز نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے
مجھے گھورا اور بولا "پکا کاماں وہ ہوتا ہے جو جاگیردار کے پاس گروی ہو' اس پر قرضہ ہو
ہے۔ وہ جاگیردار کی مرضی کے بغیر کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ کہیں جا سکتا ہے۔ بڑے
جاگیردار صاحب کے زمانے میں تو بھاگنے والوں کو ٹکٹکی پر لگا کر ان کی چمڑی ادھیڑ دی جا
تھی مگر ہمارے جاگیردار واصف صاحب دل کے نرم ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو ٹکٹکی
نہیں چڑھایا اور اس کا نتیجہ پتہ ہے کیا نکلا ہے...... اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب تک جاگی
کے کوئی ایک سو "پکے کامے" حرامی پن دکھا چکے ہیں...... اور ان میں تیرا بھائی بھی شامل
ہے جو شہر میں خیر سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ جاگیردار صاحب نے کل حکم دیا ہے ک
ایسے جتنے بھی "کامے" بھاگے ہوئے ہیں انہیں پکڑ کر لایا جائے اور جاگیر میں کام پر لگ
جائے۔ اب تو بتا تیری مرضی کیا ہے؟"

میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار کے کارند
میرے بھائی کو پکڑ کر لے آئیں گے۔ اس کی پینٹ بوشرٹ اتار کر اور اس کا سر مونڈ
اسے لنگوٹی پہنائی جائے گی اور کھیتوں میں کام پر لگا دیا جائے گا۔ میں سر سے پیر تک کان
گیا۔ وہ کہاں تھا اتنے جوگا' اسے تو پتہ ہی نہیں تھا محنت مشقت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو بابو
کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے رب نواز کی منت کی کہ مجھے ایک بار جاگیردار صاحب
بات کر لینے دو۔ وہ مکاری سے مسکرایا اور اس نے بتایا کہ جاگیردار صاحب کل سویر
والی گاڑی سے کراچی چلے گئے ہیں اور اب تو ولایت جانے والے جہاز میں بھی بیٹھ

ہوں گے۔ میں سمجھ گیا کہ جاگیردار صاحب مجھے اور مجھ جیسے دوسرے بدنصیبوں کو اپنے
خونخوار کتے کے حوالے کر کے چلے گئے ہیں۔ اب ہم تھے اور رب نواز کا ڈنڈا تھا......
ابھی رب نواز مجھ سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ اس کے کارندے کسی قریبی گاؤں سے تین
چار "پکے کاموں" کو پکڑ کر لے آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ان سب کے ہاتھ
رسیوں میں بندھے ہوئے تھے اور انہیں بری طرح مارا گیا تھا۔ وہ چوروں کی طرح سر
جھکائے کھڑے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر رب نواز سے کہا۔

"خاں جی! کسی طرح بچت نہیں ہو سکتی۔ میرا بھائی جانی تو کڑیوں کی طرح ہے۔
اس سے کہاں گھوڑوں کی مالش کی جائے گی اور کسی چلائے جائے گی؟"

رب نواز نے شیطانی ہنسی ہنس کر کہا "تو دیکھنا یہاں تو کڑیاں بھی تیر کی طرح
سیدھی ہو جائیں گی وہ تو پھر منڈا ہے۔"

میں نے رب نواز کے قدموں میں سر رکھ کر کہا "خاں جی! کچھ رحم کرو۔"

وہ بولا "رحم میرے قدموں میں نہیں اس رجسٹر میں ہے۔ انگوٹھے لگے ہوئے ہیں
اس پر تیری تین پشتوں کے' آٹھ ہزار روپیہ فی بھائی قرضہ ہے تم دونوں پر' بھائی کو شہر میں
رکھنا چاہتے ہو تو چار دن کے اندر اندر آٹھ ہزار روپیہ لے آؤ ورنہ بھائی کو لے آؤ......
اور ہاں...... چار دن کی مہلت بھی تمہیں دے رہا ہوں ورنہ ابھی مشکیں باندھنے والوں
کو بھیج دیتا اس کی طرف......؟

میں دل پر بہت بھاری بوجھ لئے گھر چلا آیا...... اب ایک طرف میرا بھائی تھا اور
دوسری طرف میری محبت' مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ قرض چکانے والا
ایک تھا اور قرض خواہ دو' دونوں ایک سے ایک بڑھ کر سخت تھے۔ رہائی کسی بھی طرف
نہیں تھی۔ وہ دن میرے لئے بہت سخت تھے۔ آخر سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ
کچھ بھی ہو جائے بھائی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میرا بھائی ہی نہیں بیٹا بھی تھا۔
میں نے اس پر سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منت سماجت کر کے رب نواز کو چھ
ہزار روپے پر راضی کیا اور ایک ہزار قرض لے کر بھائی کی آزادی کی قیمت چکا دی۔ اس
واقعے کے دو مہینے بعد زینب کی شادی دین محمد سے ہو گئی۔ جس رات زینب کی شادی تھی

میں بہت رویا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہے اور زندہ رہنے کا کوئی فائ
نہیں مگر اس روز شہر سے میرے بھائی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا کہ اس نے دسویں
امتحان پاس کر لیا ہے۔ میرے اندر جیسے پھر جینے کی آس بندھ گئی۔ میں نے سوچا رحمت
علی تو نے کچھ کھویا ہی نہیں کچھ پایا بھی ہے اور کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔

اپنی کہانی کے اس موڑ پر رحمت سانس لینے کے لئے رکا' پھر کھوئی ہوئی آواز میں
بولا "بی بی جی! میرا بھائی اب برسرروزگار ہے۔ محکمہ جنگلات میں ملازم ہے۔ کوئی بڑا افسر
نہیں بنا مگر اپنی روٹی عزت سے کما رہا ہے اور افسریوں میں رکھا بھی کیا ہے۔ ماشاء اللہ چا
پیسے بھی جمع کر چکا ہے اب جلد ہی شادی کر دوں گا اس کی' بڑا بھلا مانس ہے۔ اتنا نیک ہے
کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ اس کی شادی کی بات کرتا ہوں تو لڑکیوں کی طرح شرما جاتا ہے۔"

میں نے دیکھا رحمت کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ جیسے تصور میں
بھائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو ٹھٹھک سا گیا۔ سر جھکا کر بولا "آپ بھ
سوچ رہی ہوں گی بھائی کی شادی کی باتیں کر رہا ہے' مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا
آپ کا اندازہ درست ہے بی بی جی' میں نے شادی نہیں کی اور اب تو عمر بھی گزر گ
ہے۔ اب سہرا باندھتا کیا اچھا لگوں گا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اب کوئی آرزو بھی نہیں۔ صرف
ایک ہی تمنا ہے کہ بھائی کو بیاہوں اور اسے پھلتا پھولتا دیکھوں۔ رات دن اسی فکر میں
رہتا ہوں کبھی سوچتا ہوں جاگیرداروں سے بگاڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ میری زندگی
اب کوئی بھروسا نہیں رہا۔ جانی کے فرض سے جتنی جلدی سبکدوش ہو جاؤں اچھا ہے
اس کے بال بچے دیکھنا تو شاید اب میری قسمت میں نہیں ہے" باتیں کرتے کرتے رحمت
یک دم اداس ہو گیا۔ بے خیالی میں اپنے زخمی ہاتھ کو سہلاتا ہوا بولا۔

"سمجھ نہیں آتی' زینب کدھر چلی گئی ہے۔ میں نے اسے ریسٹ ہاؤس کا را
اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کوئی مشکل بھی نہیں تھا۔ پل کی سیدھ میں چلتے جانا تھا آگے
راستہ آتا ہے۔ یہی ایک راستہ ہے پکی سڑک تک پہنچنے کا۔ بچے بچے کو معلوم ہے ا
راستے کا۔ تقریباً ایک کوس چل کر اسے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ جانا تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس
نگران میرا اپنا بھائی ہے۔ فارسٹ گارڈ ہے وہ' اسے میں نے سب کچھ سمجھا رکھا تھا۔
بیچارا ساری رات جاگتا رہا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے وہ۔"

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اس طویل گفتگو کے دوران میں نے پہلی بار
اپنی زبان کھولی "کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟" میں نے ایک موہوم خدشے کے تحت
پوچھا۔

"جان محمد جی...... ویسے میں ہمیشہ اسے جانی کہتا ہوں۔ وہ ہے بھی تو میرا دل جانی'
وہ میرا سب کچھ ہے بی بی جی' بڑے لاڈ دیکھے ہیں میں نے اس کے......"

رحمت پتہ نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔
کانوں میں "جان محمد" کے الفاظ گونج رہے تھے۔ یہ نام ایک دفعہ پہلے بھی سن چکی تھی۔
زینب نے اس شخص کا نام لیا تھا۔ اس رات جب وہ لٹی پٹی ہمیں درختوں کے جھنڈ میں
ملی تھی اور اپنے گھر چولہے کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنی بپتا سنائی تھی اس نے کہا تھا کہ
اس کی عزت برباد کرنے اور اسے ذلیل و خوار کرنے والے شخص کا نام جان محمد ہے اور
اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ فارسٹ گارڈ ہے...... "فارسٹ گارڈ جان محمد" میں زیرلب
بڑبڑائی' اور ایک ہی لمحے میں ساری صورت حال مجھ پر واضح ہوتی چلی گئی۔ واقعات کی
بہت سی کڑیاں خودبخود مربوط ہو گئیں۔ اس کا مطلب تھا رحمت نے اس رات بے خبری
میں زینب کو ایک ایسے شخص کی طرف بھیج دیا تھا جو اس کی جان اور عزت کے لئے بہت
بڑا خطرہ تھا۔ رحمت جسے اپنا "نیکوکار بھائی" کہہ رہا تھا وہ ایک بے رحم لٹیرا بھی تھا۔ یقینی
بات ہے کہ زینب اس تک پہنچی تھی اور اس نے اسے اپنی ہوس کی قید میں ڈال دیا تھا
یا...... جان سے مار دیا تھا' اس شخص سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ اگر
میرا اندازہ درست تھا اور یہ جان محمد وہی تھا تو پھر زینب کے بارے کوئی اچھی امید رکھنا
نادانی تھی۔

رحمت نے میرے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے تو بولا "بی بی جی! کیا بات ہے؟ کیا
آپ...... جانی کو جانتی ہیں؟"

"نہیں" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رحمت کو اس
طوفان سے کیسے آگاہ کروں جو میرے سینے میں ہلچل مچا رہا تھا۔ وہ شخص جس نے پوری
زندگی اپنے بھائی کی بہتری کے لئے وقف کر دی تھی اور اسے ایک باعزت شریف انسان
بنا کر خوش ہو رہا تھا۔ اب اس کا اصل چہرہ دیکھے گا تو اسے کیسا لگے گا؟ یہ سوچ کر ہی میری

روح لرز گئی۔ رحمت الجھی الجھی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "کل میں زینب کے گاؤں بھی گیا تھا۔ اس کے بچوں کا برا حال ہے۔ لاوارث بچوں کا کون بنتا ہے اور ان سے تو گاؤں کے لوگ ویسے بھی کنی کترا رہے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زینب نے جاگیردار کے قاتلوں کو پناہ دے کر بڑی بے وقوفی کی ہے اور اب اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ کوئی ان کے سر پر ہاتھ رکھنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ میں رات کے اندھیرے میں گیا تھا اور تین چار دن کا راشن ایک پوٹلی میں باندھ کر ان کے صحن میں پھینک آیا ہوں۔ اللہ کرے انہیں مل گیا ہو........" رحمت بہت سی باتیں کر رہا تھا لیکن میں کچھ نہیں سن رہی تھی۔ میرا ذہن تو فارسٹ گارڈ جان محمد اور زینب میں الجھا ہوا تھا۔ اس بے رحم شخص نے نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ میں نے سر درد کا بہانہ کر کے رحمت کو باہر بھیج دیا اور آنکھیں بند کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔

اگلے روز کی بات ہے۔ رحمت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہا دیکھو رحمت، جان محمد تم سے چھوٹا ہے اور چھوٹوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ کبھی معمولی اور کبھی سنگین۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے بھائی سے بھی ایک سنگین غلطی ہوئی ہے۔ لیکن امید کرتی ہوں کہ تم بڑے پن کا ثبوت دو گے اور اس معاملے کو تحمل سے سلجھانے کی کوشش کرو گے........" اس کے بعد میں نے نسبتاً نرم لفظوں میں اور احتیاط کے ساتھ ساری بات رحمت کے گوش گزار کر دی اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے خدشہ ہے زینب اس وقت بھی ریسٹ ہاؤس میں جان محمد کے پاس ہوگی۔

رحمت بے پناہ تحیر اور کرب کے عالم میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس نے مجھ سے کچھ سوالات بھی کئے جن کے میں نے تسلی بخش جوابات دیئے۔ آخر میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس حالت میں وہ مجھے بے حد قابل رحم شخص محسوس ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور دیر تک دائیں بائیں سر ہلاتا رہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا بی بی جی! مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

پھر اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی اور دعا کرتی رہی کہ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔

رحمت سے گفتگو کے بعد اب مجھے اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں رہ گیا تھا کہ رحمت کا بھائی فارسٹ گارڈ جان محمد وہی ہے جس کا تذکرہ کئی روز پہلے زینب نے کیا تھا..........

رحمت کی واپسی قریباً تین گھنٹے بعد ہوئی۔ زینب بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھا۔ اس وقت شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ زینب سرتاپا کسی بستر کی چیک دار چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ رحمت اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے قریب سے رحمت کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے خون تیر رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے چلا گیا تھا۔ اندر آ کر زینب نے چادر الٹ دی اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ رونے اور بین کرنے لگی۔

"چودھرانی جی یہ کیا ہو گیا۔ تیری گود کو کس کی نظر کھا گئی۔ ہائے ربا، کیا بگاڑا تھا اس معصوم نے کسی کا........"

وہ بڑے دردناک الفاظ میں فرحان کو یاد کر رہی تھی۔ اس کے گرم آنسو میری گردن کو بھگو رہے تھے لیکن میری اپنی آنکھوں میں نمی تک نہیں تھی۔ بس ایک جلن سی تھی پلکوں کے نیچے۔ دل جیسے پتھر ہو کر رہ گیا تھا۔ میں پورے ہوش و حواس میں تھی اس کے باوجود مجھے رونا نہیں آ رہا تھا۔ فرحان کو رو دھو کر زینب میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا "کہاں تھی تو؟"

زینب میرے سوال کو نظرانداز کر کے بولی "بہت مارا ہے رحمت نے اس شیطان کو، لاٹھیاں مار مار کر دونوں بازو توڑ ڈالے ہیں اس کے، اللہ کی پناہ رحمت تو جیسے غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اگر میں نہ بچاتی تو وہ ضرور اسے جان سے مار ڈالتا۔ اب بھی کچھ پتہ نہیں کہ بچتا ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے شروع سے بتا ہوا کیا تھا؟"

جواب میں زینب نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ "اس رات زینب کو وہاب کے چنگل سے نکال کر رحمت نالے کے پار چھوڑ آیا تھا۔ اس نے کہا تھا میں ابھی تھوڑی دیر میں بی بی اور اس کے بچے کو بھی مکان سے نکال دوں گا۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق ہم تینوں کو ریسٹ ہاؤس میں پہنچنا تھا جہاں بقول رحمت اس کا چھوٹا بھائی جانی

ہماری میزبانی کے لئے موجود تھا۔۔۔۔۔۔ زینب سخت سردی میں قریباً تین گھنٹے کماد کے کھیت میں چھپی میرا اور فرحان کا انتظار کرتی رہی۔ آخر مایوس ہو کر آہستہ آہستہ ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دی۔ وہ سحری کے وقت وہاں تک پہنچ سکی۔ ریسٹ ہاؤس میں جس شخص نے اس کا استقبال کیا وہ نوجوان گارڈ جان محمد تھا۔ جان محمد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ جان محمد نے اسے پکڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اسے ایک سٹور میں بند کر دیا۔۔۔۔۔۔ وہ اب تک اسی سٹور میں قید تھی۔ جان محمد سخت خوفزدہ تھا۔ وہ بدکردار تو تھا مگر بھائی سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے خوف تھا کہ زینب اس کے بھائی کے سامنے اس کا کچا چٹھا کھول دے گی۔ دوستوں کے ساتھ مل کر جو شیطانی کھیل اس نے زینب کے ساتھ کھیلا تھا' اس کے ضمیر کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ایک رات وہ نشے میں دھت ہو کر زینب کے کمرے میں آگیا۔ اس نے زینب کو خوفناک دھمکیاں دیں اور کہا کہ اگر اس نے اس کے بھائی کو کوئی بات بتائی تو وہ اس کو بچوں سمیت قتل کر دے گا۔ زینب خوفزدہ ہو گئی۔ جان محمد کے مجبور کرنے پر اس نے اپنے بچوں کی قسم کھالی کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ جان محمد نے کہا "اور لالے رحمت کو یہ بھی نہیں بتائے گی کہ تو یہاں پہنچی تھی" زینب نے اس بات کا بھی وعدہ کر لیا۔ جان محمد نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ ایک دو دن تک اسے چھوڑ دے گا مگر بعد میں اس نے پھر ارادہ بدل دیا۔ اس کا شک دور نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ راز راز نہیں رہ سکے گا۔ زینب سخت الجھن میں تھی۔ جان محمد کے دم بدم رنگ بدلتے مزاج نے اسے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ کبھی تو اسے لگتا کہ جان محمد وحشی درندے کی طرح اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ سب کچھ کر گزرے گا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن کسی وقت وہ اس کی جان بخشی پر آمادہ نظر آنے لگتا۔۔۔۔۔۔ آج وہ پھر بہت مشتعل نظر آ رہا تھا۔ زینب سہمی ہوئی اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اتنے میں کچھ فاصلے سے تیز تیز باتوں کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد مار پیٹ ہونے لگی۔ زینب نے چارپائی پر کرسی رکھ کر روشن دان سے جھانکا۔۔۔۔۔۔ رحمت اپنی لاٹھی سے جان محمد کو روئی کی طرح دھنک رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ لاٹھی ٹوٹ گئی تو اس نے ایک کرسی اٹھالی اور وہ جان محمد کے سر پر مار مار کر

توڑ دی۔ زینب کو خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالے گا۔ وہ سٹور میں بند زور زور سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخیں رحمت کو ہوش میں لے آئیں۔ رحمت نے ٹوٹی ہوئی کرسی ایک طرف پھینکی اور دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رونے لگا۔ بعدازاں اس نے زینب کو سٹور سے نکالا اور اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں لے آیا۔"

یہ تھی زینب کی کل کہانی' یہ سب کچھ مجھے سنانے کے بعد وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ بچوں کی جدائی نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ ان سے جدا ہوئے اسے اب تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ زینب کے رونے کی آواز سن کر رحمت ہمارے پاس چلا آیا۔ اس کے غصے کا چڑھا ہوا دریا اب کچھ اتر چکا تھا۔ اس نے زینب سے کہا۔

"زینب! حوصلہ رکھ' سب ٹھیک ہو جائے گا' میں نے ابھی ایک بندا بھیجا تھا چک ۱۴ اس نے بتایا ہے کہ بچے ٹھیک ٹھاک ہیں انہیں راشن بھی مل گیا ہے۔ تیری بڑی لڑکی روٹی شوٹی پکا لیتی ہے۔"

زینب نے کہا "میں ان کی شکلوں کو ترس گئی ہوں۔"

رحمت بولا "زینب! تجھے صبر سے کام لینا پڑے گا نہ تو اس وقت اپنے گھر جا سکتی ہے نہ بچے یہاں آسکتے ہیں۔ تو تو جانتی ہی ہے چنگیزی ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ اپنی اور بچوں کی جان کی دشمن نہ بن۔ مجھے کچھ سوچنے دے۔ کوئی حل نکالنے دے مجھے۔"

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے میں اور زینب اس کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ زینب کہہ رہی تھی "بی بی جی! میں آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ اللہ کرے میں مر جاؤں۔ وہ مرن جوگا میرا بھائی نہ آپ کی مخبری کرتا اور نہ یہ قیامتیں گزرتیں آپ پر' آپ کے بچے کی جگہ اس کے اگلے پچھلے کیوں نہ مر گئے۔"

میں نے کہا "بس کرو زینب' کسی کا کچھ قصور نہیں' جو لکھا تھا وہی ہوا ہے۔ اب چھوڑ بھی دے اس بات کو" وہ دیر تک رضائی میں سر دیے کر سسکتی رہی اور پھر نڈھال ہو کر سو گئی۔ وہ سو گئی لیکن میری نیند تو شاید آنکھوں کا رستہ ہمیشہ کے لئے بھول چکی تھی۔ میں جاگتی رہی۔ چند منظر تھے جو بار بار آنکھوں کے سامنے آتے تھے۔ میرا اور سلیم کا حویلی سے جان بچا کر نکلنا' پھر زینب کے گھر سلیم کا خنجر سے زخمی ہو کر گرنا' زینب کا فرحان کو لے کر بھاگنا اور آخر میں فرحان کا زرد چہرہ' جان سے خالی' مسکراہٹ سے عاری' ننھا سا

تھکاہارا نڈھال فرشتہ جس کی آنکھیں میرا راستہ دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں۔ آہ کیسے مرا ہو گا وہ' اکیلا......... تنہا رو رو کر ہچکیاں لے لے کر' اس نے مجھے بڑا تلاش کیا ہو گا' بڑا ڈھونڈا ہو گا مجھے......... جی چاہا رو دوں' اتنا روؤں کہ میرا کلیجہ پانی ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جائے اور میں مر کر فرحان کے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر آنسو اور نیند تو ایکا کر چکے تھے۔ انہیں میری آنکھوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ یکایک کسی نے میرے پاؤں کو ہلایا اور میں اٹھ گئی۔ میری پائنتی رحمت کھڑا تھا۔ اس نے ایک تہہ شدہ کاغذ میری طرف بڑھایا اور اشارے سے کہا کہ میں اسے زینب کی نظر سے بچا کر پڑھ لوں۔ میں نے ایک نظر سوئی ہوئی زینب کی طرف دیکھا اور کاغذ رکھ لیا۔ رحمت جیسے آیا تھا ویسے ہی دروازہ بھیڑ کر دبے پاؤں واپس چلا گیا۔ یہ ایک کاپی سائز ورق تھا۔ میں نے سرہانے رکھی لالٹین کی لو اونچی کی اور پڑھنے لگی۔ رحمت ان پڑھ تھا اس نے یقیناً کسی ہمراز سے لکھوایا تھا۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"بی بی جی! السلام علیکم! جو بات منہ سے نہیں کہہ سکتا اس کے لئے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ بی بی جی! آپ عقل والی ہیں۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میں نے زینب کے بارے میں بڑی سوچ بچار کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے اور اس کے بچوں کو سہارے کی بڑی ضرورت ہے۔ میں سچے دل سے زینب کا خیر خواہ ہوں اور اسے سکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے جو کچھ کرنا پڑا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کوئی مناسب شخص دیکھ کر اس سے شادی کر لے اور اس کے ساتھ اس علاقے سے کہیں دور نکل جائے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے اس کے محفوظ رہنے کا' اب مجھے اس کے دل کا کچھ پتہ نہیں وہ کیا چاہتی ہے اور کیا سوچتی ہے۔ آپ ذرا اس کو ٹٹولیں جہاں تک میرا سوال ہے بی بی جی! میرے لئے وہ اب بھی اسی طرح قابل عزت ہے دنیا والے جو چاہیں سمجھیں میرے لئے وہ وہی دس سال پہلے والی زینب ہے۔ میں ہر حال میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس مختصر سے خط نے مجھے وہ سب کچھ سمجھا دیا جو رحمت سمجھانا چاہتا تھا۔ اس کے بغیر بھی میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ رحمت کی آنکھوں میں آج بھی زینب کی تصویر ہے اور اس کے بازو کی طرح پکی روشنائی سے ایک نام اس کے دل پر بھی

کندہ ہے۔ جو بات انسان خود نہیں کہتا وہ اس کی آنکھیں کہتی ہیں اور جسم کا ہر عضو کہتا ہے......... اگر رحمت زینب سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ بہت اچھی بات تھی۔ اسے حق تھا اپنے بارے میں سوچنے کا اور وہ کوئی انجان شخص نہیں تھا۔ اگلے روز میں نے موقع دیکھ کر زینب سے اس بارے میں بات کی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی شفاف آنکھوں میں خوشیوں کے رنگ لرزے۔ وہ ایک ساعت میں نو دس برس کا فاصلہ طے کر کے ایک کنواری الہڑ دوشیزہ بن گئی جس کے لئے ہر کھیت کھلیان اور پن گھٹ ایک سیر گاہ تھا اور جس کی نگاہیں گاؤں کے گلی کوچوں میں اپنے محبوب سے آنکھ مچولی کھیلتی تھیں......... مگر دوسرے ہی لمحے یہ سارے رنگ اڑ گئے۔ الہڑ دوشیزہ کہیں دور چلی گئی اور مصیبت کی ماری چار بچوں کی ماں مایوسی سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

"نہیں چودھرانی۔" اس کے ہونٹوں سے ایک مستحکم آواز نکلی "میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے کوئی حق نہیں کسی کی حیاتی اجاڑنے کا۔ اب تو جو چار دن رہ گئے ہیں کسی طرح کٹ جائیں تو خلاصی ہو۔"

میں نے کہا "زینب......... تیری سوچ غلط ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے' شکل صورت بھی اچھی ہے' تو جسے چار دن کی زندگی کہہ رہی ہے وہ پہاڑ جیسی زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ کیسے کاٹے گی یہ سفر؟......... رحمت بہت اچھا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ تم دونوں خوش رہو گے' وہ تجھے اور تیرے بچوں کو کوئی دکھ نہیں دے گا۔ ہمت کر......... یہ قدم اٹھا لے........." میں نے زینب کو بہت سمجھایا لیکن مگر وہ کسی طور رضامند نہیں ہوئی۔ صرف ایک دلیل تھی جو اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی تھی اور وہ دلیل اس کے بچوں کے متعلق تھی۔ ان کی سلامتی کے لئے وہ ہر حد تک جانے کو تیار تھی......... آخر کئی روز کی سوچ بچار کے بعد اس کا انکار خاموشی اور پھر نیم رضامندی میں بدل گیا۔ میں نے رحمت کو اس کامیابی سے آگاہ کیا۔ اندرونی مسرت اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمکنے لگی۔ اس نے کہا۔

"بی بی جی' میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نہ ہوتیں تو کچھ بھی نہ ہو سکتا۔ میں آج ہی کراچی اپنے دوست کو اطلاع دے دیتا ہوں' وہ ایک دو دن میں ہماری رہائش کا بندوبست کر دے گا۔" بات کرتے کرتے اچانک اس کی آواز رندھ گئی اس نے

آنکھوں پر مفلر رکھ کر بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا۔ گلوگیر آواز میں بولا "بس بی بی جی' میں ہی پاگل تھا۔ جھوٹے خواب دیکھتا رہا۔ ساری زندگی بھائی کو بنانے کی کوشش کرتا رہا اور اسے بنایا بھی تو کیا؟ لوفر' بدمعاش اور بدکردار۔ بس جی میں ہار گیا ہوں' اب میں اپنے لئے تھوڑا سا جینا چاہتا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا اور نہ ہی اس بدبخت کو اپنی صورت دکھاؤں گا۔ وہ میرے لئے مر گیا ہے اور میں اس کے لئے۔"

ایک دو روز میں سب معاملات طے ہوگئے۔ رحمت نے پال پور جا کر چودھری شہاب سے اجازت لے لی۔ وہ رات کو رازداری سے زینب کے گھر بھی پہنچا اور اس کے بچوں کو ضروری سامان سمیت لے آیا۔ زینب بچوں کو دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہوگئی' ایک ایک کا منہ چومتی اور سینے سے لگاتی۔ چودھری شہاب کے خاص کارندوں اور خود چودھری شہاب کو بھی یہی پتہ تھا کہ رحمت صوبہ سرحد کے کسی قصبے کا رخ کر رہا ہے۔ کراچی کے بارے میں میرے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ روانگی سے ایک رات پہلے زینب میرا ہاتھ تھام کر بہت روئی۔ کہنے لگی۔

"چودھرانی جی......... آپ کی حالت دیکھ کر میرا دل خون ہوتا ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلی چلیں۔ آپ کی اور میری کہانی ایک ہی تو ہے۔"

میں نے کہا "میری اور تیری کہانی ایک ہی تھی لیکن اب نہیں۔ میں خالی ہاتھ ہوں اور تیرے پاس کھونے کے لئے اب بھی بہت کچھ ہے۔ اس بہت کچھ کو لے کر یہاں سے دور چلی جا۔"

زینب نے کہا "اور آپ؟"

"میں بھی کسی طرح جی ہی لوں گی۔"

"چودھرانی' کبھی کبھی مجھے بڑا ڈر لگتا ہے' آپ کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔"

"نہیں زینب' میں خودکشی نہیں کروں گی۔"

"ان مرن جوگے جاگیرداروں سے متھا لگانا بھی تو خودکشی ہے چودھرانی جی' آپ چھوڑ کیوں نہیں دیتیں اس علاقے کو؟ میری مانیں تو چپ کر کے پولیس کے سامنے پیش ہو جائیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ظلم آپ نے نہیں کیا آپ پر ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے زینب....... ایسا ہی کروں گی۔"

وہ دیر تک خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

"آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ کوئی......... کوئی خطرے والا کام نہیں کریں گی۔"

"زینب میرا سر چکرا رہا ہے" میں نے اکتا کر کہا "تم سو جاؤ پلیز' میں کچھ نہیں کروں گی' کیا کر سکتی ہوں میں؟"

اگلے روز زینب اور رحمت چلے گئے۔ شام کی تاریکی پھیلتے ہی حویلی کے دروازے پر ایک کھٹارہ ویگن آ کر رکی۔ رحمت نے زینب اور بچوں کو اس میں سوار کرایا اور رخصت ہوگئے۔ میں کمرے میں بیٹھی دیر تک دور جاتی ویگن کی آواز سنتی رہی۔ ایک وقت تھا کہ میں' فرحان اور سلیم ابی طرح کراچی جانے کا سوچ رہے تھے۔ ہم نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اب سلیم تھا اور نہ فرحان سب کچھ ختم ہوگیا تھا........ اور اب ہماری طرح دو اور ستم رسیدہ انسان جاگیردار کے قہر و جبر سے جان بچانے کے لئے پناہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ میرے لب ان کے لئے مسلسل دعائے خیر کر رہے تھے۔ جیپ کی آواز مدہم ہوئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ جیسے یہ آواز میرے دائرہ سماعت سے نکل گئی تھی ایسے ہی یہ دو المیہ کردار بھی اس جاگیر کی رینج سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگئے تھے۔ میں اپنی جگہ بیٹھی سوچوں میں گم رہی۔ قریباً بیس پچیس منٹ بعد ویگن کی آواز پھر آنے لگی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ لوگ واپس کیوں آ رہے تھے کیا ضرورت تھی انہیں واپس آنے کی۔ بے قرار ہو کر میں باہر آئی اور بالائی منزل پر جانے والے زینے پر چڑھ کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ گاڑی تو نظر نہیں آئی لیکن انجن کے شور نے بتا دیا کہ یہ وہ ویگن نہیں ہے۔ کوئی جیپ قسم کی چیز تھی۔ یہ انجن کا شور بیرونی دروازے کے پاس تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری شہاب تیز تیز قدم اٹھاتا اندر آگیا۔ اس کے بازوؤں میں خون سے لت پت ایک نوجوان تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ بادامی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں ننگے تھے۔ جب چودھری شہاب اسے گود میں اٹھائے میرے قریب سے گزرا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

نوجوان کی گردن کے قریب کلہاڑی یا کسی دوسرے تیز دھار آلے کا گہرا گھاؤ تھا۔ اس گھ
سے اس کی کٹی ہوئی نسیں اور چربی وغیرہ صاف نظر آ رہی تھی۔ دائیں پہلو میں بھی کوئ
زخم تھا جس سے بہنے والے خون نے پھیل کر اس کی ساری قمیض کو رنگ دیا تھا۔ گرد
ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مرچکا ہے یا گہری بے ہوشی میں
ہے........ اس کے زرد چہرے پر کچھ پرانے زخم بھی تھے۔

چودھری شہاب نے مضروب کو میرے کمرے کے سامنے ایک بچھی چارپائی پر ڈال
دیا۔ اس کے کارندے جو عام طور پر حویلی کے اس حصے میں کم ہی آتے تھے چارپائی کے
گرد جمع ہوگئے۔ چودھری نے ایک شخص کو کہا۔

"مولے' جیپ لے جاؤ اور ڈاکٹر رفیق کو بلا لا۔ جہاں بھی ملے ڈھونڈ کر لا اور کس
اور کو ساتھ مت لانا۔ چل جلدی کر شاباش۔"

مولا جیپ کی چابی لے کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری شہاب کی ہدایت پر اس
کے کارندے مضروب کا بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ چودھری شہاب پسینہ
پونچھتا ہوا میری طرف چلا آیا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"رحمت کا بھائی جان محمد........ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ شہر سے پیشی بھگت
واپس آ رہا تھا کہ یہ راستے میں پڑا ہوا ملا۔ میرا خیال ہے کہ اسے چنگیزیوں نے ما
ہے........" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چودھری بولا۔

"رحمت اور وہ عورت کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے چلے گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔ رحمت کو اطلاع تو ملنی چاہئے کہ اس کے بھائی کے ساتھ
ہوا ہے........ کتنی دیر ہوئی ہے انہیں؟"

"یہی کوئی آدھ گھنٹہ۔"

"اوہ........ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں بندے بھیجتا ہوں ان
پیچھے۔"

"نہ چودھری صاحب" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "وہ اس آگ سے نکل گئے

تو انہیں نکل جانے دو۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا انہیں واپس بلا کر۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا"
چودھری بضد تھا لیکن میں نے کہہ سن کر اس کا ارادہ بدل دیا........ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر
بھی پہنچ گیا۔ وہ چودھری شہاب کا بھیدی لگتا تھا۔ اس نے جھک کر اسے سلام کیا اور
گردونواح کے بارے میں کوئی حیرت ظاہر کئے بغیر مریض کے معائنے میں لگ گیا۔

.... جان محمد کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ سفر کے
قابل نہیں ہے اور اگر اسے اس حالت میں ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی گئی تو جانبر نہیں
ہوسکے گا۔ ڈاکٹر نے وہیں پر انتقال خون اور گلوکوز وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ رات پچھلے
پہر اسے تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ میں اور چودھری شہاب اس کے قریب ہی موجود
تھے۔ جان محمد نے کمزور نحیف آواز میں بتایا کہ اسے مارنے والے چنگیزی نہیں' سانسی
بستی کے دو نوجوان ہیں۔ (سانسیوں کی ایک خیمہ بستی وہاں قریب ہی موجود تھی' یہ لوگ
بڑے ہتھ چھٹ اور جنگجو مشہور تھے) چودھری شہاب کے پوچھنے پر جان محمد نے بتایا کہ یہ
دونوں سانسی اس کے دوست تھے مگر لالچ میں آکر انہوں نے لالے کے خلاف مخبری کرنے
کی کوشش کی' جس پر جھگڑا ہوگیا۔"

"کون لالہ؟" شہاب نے پوچھا۔

"لالہ رحمت" جان محمد نے جواب دیا "کہاں........ ہے لالہ........ وہ یہیں پر
ہے نا؟"

"ہاں ہے" شہاب نے گول مول سا جواب دیا۔ "مگر یہ سب ہوا کیسے تم تو جھنگ
ہسپتال میں تھے۔"

"میں وہاں سے بھاگ کر آیا ہوں" جان محمد نے کہا۔ اس کے بعد اس نے اکھڑے
اکھڑے سانسوں میں اس واقعے کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

"لالے کی مار سے میرے دونوں بازو ٹوٹ گئے تھے۔ میں ہسپتال میں تھا۔ کل
میرے ایک دوست فارسٹ گارڈ حسینی نے اطلاع دی کہ چنگیزیوں نے اردگرد کے دیہات
میں لالے اور دو عورتوں کے لئے منادی کرائی ہے کہ جو ان کے بارے اطلاع دے گا
اسے ایک گھوڑا اور دو ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس نے بتایا کہ اس انعام کے لالچ
میں آکر میرے دو دوست جورا اور رمبی میرے لالے کے خلاف مخبری پر تیار ہوگئے ہیں۔

یہ دونوں وہی سانسی تھے جن کے ساتھ میری لڑائی ہوئی ہے۔ دراصل جب لالہ آیا تو دونوں میرے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ہی تھے۔ پھر لالہ مجھے مارنے پیٹنے لگا اور یہ دونوں باہر درختوں میں چھپ گئے۔ جب لالہ دین محمد کی بیوی کو لے کر واپس روانہ ہوا تو ان میں سے ایک نے لالے کا پیچھا شروع کر دیا اور اسے اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔ اس نے مجھے بھی آ کر بتایا کہ لالہ دین محمد کی بیوی کو لے کر کہاں پہنچا ہے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ بعد میں جب منادی ہوئی تو وہ خبیث لالچ میں آ گیا۔ مجھے اس کی نیت کا پتہ چلا تو میں کل رات بارہ بجے ہسپتال سے نکل آیا۔ آج دوپہر جورے اور رمبی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا وہ الٹا مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی طرح باز نہیں آئیں گے تو میں نے اپنا پستول نکال لیا۔ انہوں نے پستول چھیننے کی کوشش کی میں نے جورے کو گولی مار دی۔ رمبی نے کلہاڑی سے مجھ پر وار کئے۔ میں زخمی ہو گیا لیکن گرتے گرتے میں نے رمبی کو بھی ٹھنڈا کر دیا' دونوں میری آنکھوں کے سامنے مر گئے۔ میرا اپنا خون بھی فواروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ سانسیوں کی بستی وہاں سے پاس ہی ہے۔ میں نے سوچا اگر کسی سانسی نے مجھے دیکھ لیا تو مجھ پر کتے چھوڑ دیں گے میں گرتا پڑتا سڑک کی طرف بڑھنے لگا کہ شاید کوئی میری مدد کرے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کیا ہوا

اپنی روداد سنانے کے بعد جان محمد نے ایک آہ کھینچی۔ میں نے دیکھا اس کی دھندلی آنکھوں میں اشکوں کی نمی ہے پھر وہ کراہ کر دھیمی آواز میں بولا۔

"میں مر جاؤں تو میری طرف سے لالے کو کہنا' مجھے معاف کر دے۔ میں نے اس کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ بڑا ستایا ہے اسے۔ برے یاروں کی یاری مجھے لے ڈوبی......... ورنہ......... اتنا برا نہیں تھا میں۔"

صبح اذانوں کے وقت جان محمد کو اوپر تلے دو خون کی الٹیاں آئیں اور وہ پھر گہری بے ہوشی میں چلا گیا......... بے ہوشی کا یہ سلسلہ دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لئے ٹوٹا۔ ڈاکٹر بھی اس وقت پاس ہی تھا۔ جان محمد نے چودھری شہاب کو اشارے سے پاس بلایا اور رک رک کر بولا۔

"چودھری صاحب......... میں آپ کو ایک......... بہت خاص بات بتانا چاہتا ہوں......... جاگیرداروں کے بارے میں" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ چودھری شہاب اس پر جھک گیا۔

چودھری شہاب پوری طرح جان محمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جان محمد نے اٹک اٹک کر کچھ کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے......... میں فوراً باہر نکل آئی۔ چودھری شہاب اور جاں بلب جان محمد میں کوئی آدھ گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ آخر چودھری شہاب باہر نکلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کسی بہت گہری سوچ میں ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ جان محمد نے چودھری شہاب کو اس کے دشمنوں یعنی میرے سسرال والوں کے متعلق جو کچھ بھی بتایا ہے وہ نہایت اہم ہے......... اس روز شام تک جان محمد کی طبیعت بگڑتی اور سنبھلتی رہی۔ پھر وہ گہری بے ہوشی میں چلا گیا اور اسی حالت میں دم توڑ گیا۔

☆==========☆==========☆

وہ جنوری کی دو یا تین تاریخ تھی سردی اپنے عروج پر تھی۔ کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور میں اس کے پاس بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی......... جان محمد کو مرے دس بارہ روز ہو چکے تھے اور اس دوران چودھری شہاب اس کیس میں الجھا رہا تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے جان محمد کی لاش اٹھوا کر پال پور لے گیا اور کھیتوں میں ڈال دی تھی۔ جان محمد کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے اس کے دونوں دوستوں کی لاشیں بھی پاس ہی سے مل گئی تھیں۔ سانسی بہت مشتعل تھے لیکن ان کے اشتعال کا کوئی فائدہ نہیں تھا ان کے لڑکوں کو قتل کرنے والا خود بھی قتل ہو گیا تھا اور حساب برابر تھا' میں انگیٹھی میں آگ کے شعلوں کو گھورتی ہوئی خیال کے تھپیڑے کھا رہی تھی کہ چودھری شہاب کی بہن حمیدہ آ گئی۔ میں اسے مفرور مجرموں کی اس پناہ گاہ میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرے گلے لگ کر وہ کچھ دیر روتی رہی' میں نے کہا "حمیدہ! تم یہاں!؟"

وہ بولی "تم یہاں ہو سکتی ہو تو میں کیوں نہیں ہو سکتی۔ لالے شہاب نے کہا تھا تم وہاں بڑی اداس رہتی ہو۔ میں نے کہا تو پھر مجھے لے چلو۔ میں اس کا دل بہلاؤں گی۔"

"حمیدہ! ایسا کیوں کیا تم نے! یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں یہ تو میرے جیسے

مجرموں کی پناہ گاہ ہے۔" میں سسکتے ہوئے بولی۔

حمیدہ نے دکھی ہو کر کہا "ایسا مت کہو بہن' تیری بے گناہی تو تیرے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔"

میں جانتی تھی کہ چودھری شہاب جان بوجھ کر حمیدہ کو یہاں لایا ہے۔ میں نے دو روز پہلے اس سے کہا تھا کہ ان قاتلوں اور ڈاکوؤں کے درمیان رات بسر کرتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے' وہ یہ ثابت کرنے کے لئے حمیدہ کو یہاں چھوڑ گیا تھا کہ یہ سب آدمی اس کے بھروسے کے ہیں اور وہ اپنی سگی بہن کے سلسلے میں بھی ان پر اعتماد کر سکتا ہے۔ اس کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔

حمیدہ دو راتیں وہاں میرے پاس رہی۔ وہ مسلسل میری دلجوئی میں لگی رہی اور فرحان کی موت کا غم میرے دل سے بھلانے کے لئے اپنی سی کوشش کرتی رہی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس غم کی تحریر کس انمٹ سیاہی سے لکھی گئی ہے۔ اس نے مجھے چودھری شہاب کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ چودھری شہاب ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ جوانی میں اس کی منگنی ہوئی تھی مگر بعد میں رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی اور درحقیقت یہی واقعہ تھا جو بعد میں چنگیزی اور شہاب خاندانوں کی دشمنی کا باعث بنا۔ یہ کوئی پندرہ سال پہلے کی بات تھی چودھری شہاب کے رشتے کی بات ضلع لائلپور کے ایک بڑے زمیندار کی طرف چلی۔ لڑکی خوبصورت تھی اور چودھری شہاب کے گھر والوں کو پسند بھی آئی تھی۔ باقاعدہ منگنی کے وقت شہاب کے گھر والوں کے علاوہ چند معززین بھی لڑکی کے گھر پہنچے۔ ان دنوں شہاب کے گھرانے کے ساتھ چنگیزیوں کی راہ و رسم تھی۔ منگنی کے لئے جانے والوں میں چودھری واصف چنگیزی کا مرحوم والد نیاز علی چنگیزی بھی تھا۔ چودھری نیاز علی رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے ساری زندگی اللے تللوں میں گزاری۔ خوبصورت عورتیں اس کی کمزوری تھیں۔ منگنی کی تقریب میں اس نے شہاب کی ہونے والی دلہن کو دیکھا تو اس پر ریجھ گیا۔ دماغ پر عشق کا بھوت سوار ہوا تو وہ ہر انتہا تک جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا اس کے لئے کیا ناممکن تھا یہ انہونی بھی اس نے کر دکھائی۔ چند مہینے بعد "بعض وجوہ" کی بنا پر چودھری شہاب کی منگنی ٹوٹ گئی۔ منگنی ٹوٹنے

پر لڑکی کی بدنامی ہوئی۔ اس بدنامی کو نیاز علی چنگیزی نے درپردہ بڑی عیاری سے ہوا دی اور ہر جگہ ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ لڑکی والدین کے لئے بوجھ بن گئی۔ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں ہوا۔ حالات سازگار دیکھ کر پچپن سالہ نیاز علی نے وہاں اپنی بات چلا دی۔ قریب تھا کہ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتا کہ لڑکی بیمار ہو گئی اور چند ماہ بیمار رہنے کے بعد دنیا کے جنجالوں سے چھوٹ گئی۔ اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد چودھری شہاب پر انکشاف ہوا کہ سہاگ رات کے خواب دیکھنے والی اس معصوم لڑکی کو قبر کی تاریکی میں اتارنے والے شخص کا نام نیاز علی ہے۔ یہی وہ بدباطن ہے جس نے اپنی ہوس کی خاطر ایک ہنستی مسکراتی زندگی کو بربادی کے گرداب میں دھکیل دیا۔ ایک رات چودھری شہاب جو اس وقت بیس بائیس سالہ نوجوان تھا ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر بڑی حویلی میں گھس گیا۔ وہ نیاز علی چنگیزی کو جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ اس نے چنگیزی پر سوتے میں ٹوکے سے وار کئے۔ چنگیزی شدید زخمی ہوا لیکن بچ گیا۔ شہاب گرفتار ہوا اور قاتلانہ حملے کے جرم میں جیل چلا گیا۔ وہاں سے چار سال بعد رہا ہو کر واپس آیا تو نیاز علی چنگیزی مر چکا تھا تاہم اپنی موت کے پیچھے نہ ختم ہونے والی دشمنی کا سلسلہ چھوڑ گیا تھا۔ چنگیزی شہاب کے خون کے پیاسے تھے۔ شہاب نے بھی اس دشمنی کو سر آنکھوں پر لیا۔ اس نے اپنی چودھراہٹ مضبوط کی' علاقے میں اثر و رسوخ پیدا کیا اور چنگیزیوں کا مضبوط حریف بن کر ابھرا۔ پچھلے تیرہ چودہ برسوں کے دوران اس دشمنی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے لیکن یہ ختم نہیں ہوئی تھی۔

حمیدہ نے بتایا "منگنی ٹوٹنے کے بعد ہم نے بہت کوشش کی کہ لالہ شادی کر لے مگر ں نے کسی کی نہیں مانی۔ میری ماں نے رو رو کر اپنی نظر کمزور کر لی ہے مگر وہ لالے کو منا یں سکیں اور اب وہ کہتا ہے کہ شادی کی عمر گزر گئی ہے۔ اب یہ جنجال پال کر کیا کرنا ہے۔" حمیدہ بہت دیر مجھ سے اپنے لالے کی باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی "ثناء بہن! مجھے لگتا ہے وہ تیری بات بہت مانتا ہے۔ کسی وقت تو ہی اسے سمجھا۔ باپ تو مر گیا ہے۔ ماں بھی دل ی حسرت لئے مر جائے گی۔ اکیلا بیٹا ہے اس کا۔ پتہ نہیں بیچاری کب سے بہو کی آس ائے بیٹھی ہے۔ کیا یہ آس کبھی پوری نہیں ہوگی؟"

حمیدہ کی زبانی چودھری شہاب کی روئیداد سن کر میرے دل میں اس کے لئے

ہمدردی کا ایک گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ بڑی حویلی میں' میں نے چودھری شہاب کے بارے
کچھ سنا تھا وہ اس سے بالکل مختلف شخص نکلا تھا۔ سیدھا سادھا دیہاتی زمیندار' مگر طاقتو
اور دشمن کے مقابلے میں ہوشیار۔ ابھی تک اس نے ثابت کیا تھا کہ ان پڑھ اور اجڈ
ہونے کے باوجود اس میں پڑھے لکھے چنگیزیوں سے کہیں زیادہ انسانیت ہے۔

اگر بروقت چودھری شہاب وہاں نہ پہنچتا تو اب تک میری لاش گل سڑ چکی ہوتی۔
حمیدہ کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ چودھری شہاب کے متعلق مجھ سے کچھ اور
بھی کہنا چاہتی ہے لیکن جھجک رہی ہے۔ حمیدہ دو راتیں میرے پاس گزار چکی تو میں نے
اصرار کرکے اسے واپس بھیج دیا۔

میرا کمرہ ڈیرے کے ایک پرسکون حصے میں تھا اس کے باوجود چودھری شہاب کے
کارندے اور ساتھی آپس میں جو بات چیت کرتے تھے وہ میرے کانوں تک پہنچتی رہ
تھی۔ یہ بات چیت زیادہ تر شکار کے متعلق ہوتی تھی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا تھا
چودھری اور اس کے بندے آج کل ایک خاص قسم کے باز کی کھوج میں ہیں۔ اس باز
پکڑنے کے لئے وہ منصوبے بناتے تھے اور کئی جگہ انہوں نے جال وغیرہ بھی لگائے ہو
تھے۔ وہ اس باز کے لئے عموماً "سنہرے" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد تھا
جب چودھری شہاب نے مجھے وہاب کے غنڈوں سے بچایا تھا تو وہ اس وقت بھی شکار کر
تھا۔ بعد میں اس نے شکار کئے ہوئے پرندوں کا ایک تھیلا "بابے" کو دیا تھا اور بابے
اسے دعا دی تھی کہ اللہ تیری مراد پوری کرے۔ وہ دعا دراصل اسی سلسلے میں
چودھری شہاب اور اس کے کارندے اپنی اس مہم کی کامیابی کے سلسلے میں "بابے"
دعاؤں پر بہت بھروسہ کر رہے تھے۔

ایک دن چودھری شہاب اس خفیہ ڈیرے پر آیا تو کچھ گھبرایا ہوا تھا اس نے بتا
چنگیزیوں نے ایک بڑا خرانٹ وکیل کیا ہے بہت مہنگا اور خطرناک۔ اس کے ارادے
کہ واصف چنگیزی کے قتل میں اسے بھی (شہاب کو) الجھا لیا جائے۔

میرے پوچھنے پر اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ثناء بی بی! بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا چاچا چودھری حکم دین دو دفعہ چنگیزیوں
خلاف الیکشن لڑ چکا ہے۔ دونوں دفعہ وہ ہارا ہے لیکن اس بار وہ پھر کھڑا ہو رہا تھا اور

تھی کہ اب کی بار وہ جیتے گا بھی۔ یوں بھی اس نے کافی کام کیا ہے۔ چنگیزیوں کے وکیل نے منصوبہ بنایا ہے کہ واصف کے قتل کو سیاسی رنگ دیا جائے اور کہا جائے کہ حکم دین نے آنے والے الیکشن میں جیتنے کے لئے واصف کو قتل کرایا ہے۔ ان لوگوں نے اسپتال سے سلیم کو گرفتار کر لیا ہے اور مار مار کر اس سے بیان لیا ہے کہ میرے ساتھ اس کا میل جول تھا اور میرے کہنے ہی پر وہ واصف کو مارنے کے لئے بڑی حویلی میں داخل ہوا تھا۔"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ ایک ساتھ مجھے دو متضاد خبریں ملی تھیں۔ ایک نہایت خوشی کی اور دوسری غم کی۔ خوشی کی خبر یہ تھی کہ سلیم زندہ تھا' غمناک خبر یہ کہ چودھری شہاب کو ایک ایسے معاملے میں الجھایا جا رہا تھا جس سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ مجھے یہ جان کر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ واصف الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور اسی پر کیا موقوف مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں بیوی تھی ہی نہیں۔ میں تو ایک قیدی تھی اس چار دیواری میں' جس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر' ہونٹوں پر' کانوں پر اور آنکھوں پر مہریں تھیں۔ میں نے چودھری شہاب سے سلیم کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بڑی حویلی کے تھانے میں ہے (بڑی حویلی سے اس کا مطلب وہ قصبہ تھا جہاں بڑی حویلی تھی اس کے قصبے کا نام بھی بڑی حویلی ہی پڑ چکا تھا)

"اس کی پیٹھ کا زخم کیسا ہے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

چودھری شہاب نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے سلیم کے متعلق میری فکرمندی نے اسے ٹھیس پہنچائی ہو۔ "ٹھیک ہے" وہ آہستگی سے بولا "ٹھیک نہ ہوتا تو اسپتال سے چھٹی کیسے ملتی۔"

"اب کیا ہو گا چودھری؟ سلیم کے بیان کے بعد تو......... تمہیں بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے" میں نے بات بدلی۔

وہ ہنس کر بولا "میری فکر چھوڑیں بی بی جی! جب دریا میں چھال مار دی تو پانی سے کیا ڈرنا" کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ اسی رات میں نے پھر وہ خواب دیکھا جو نیند میں مجھ پر شب خون مارتا تھا اور میری روح کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ میں نے دیکھا فرحان ایک نیم تاریک کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے اور ہونٹوں پر

پتڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ آنسو اس کے رخساروں پر خشک ہو چکے ہیں اور ان کا نمک لہ
سفید لکیروں کی صورت میں نظر آ رہا ہے اور وہ اپنی توتلی زبان میں "امی دان......... ا
دان........." پکار رہا ہے۔ ہر دفعہ جب وہ "امی دان" کہتا ہے تو اس کے سینے سے ایک
دلدوز سسکی نکلتی ہے۔ اس سسکی سے اس کا پورا جسم ہل جاتا ہے اور گلے میں سامنے کی
طرف ہنسلی کی ہڈیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گڑھا پڑ جاتا ہے۔ اتنے میں ایک جانب
سے وہ درندہ وہاب......... ہاں میں اسے درندہ ہی کہوں گی' ہاتھ میں تیز دھار چاقو لئے
اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی لعنتی مسکراہٹ ہے جو اس کے چہرے کو کہ
اور کرخت کر دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر فرحان اتنے زور سے روتا ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہ
جاتا ہے۔ میں اسے سینے سے لگانے کے لئے لپکتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ
کھل گئی۔ میں زور زور سے چیخنے لگی "فرحان! میں آ رہی ہوں......... میرے بچے! میں
رہی ہوں' نہ رو میں آ رہی ہوں" ننگے پاؤں میں دروازے سے نکلی اور برآمدے میں
کھڑی ہو کر چیخنے لگی "کہاں ہو فرحان؟ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ فرحان........."

میری چیخ و پکار سن کر چودھری شہاب ڈیرے کے دوسرے حصے سے بھاگا ہوا آ
میں نے اس کی مضبوط گرفت اپنے کندھوں پر محسوس کی۔ اس کی آواز کہیں دور سے
میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہوش کریں بی بی جی......... کیا کر رہی ہیں۔ آنکھیں
کھولیں۔ دیکھیں میری طرف یہ میں ہوں۔"

میں اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس نے مجھے دونوں کندھوں سے
پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا۔ آخر میں خواب اور بیداری کی درمیانی حالت سے نکل
آئی۔ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی......... میرا سارا و
دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ چودھری شہاب نے اپنی گرم چادر میرے جسم پر ڈالی۔ پھ
ملازم کو زور سے آواز دے کر بولا "خیرو! جا اندر سے بی بی جی کی جوتی لا۔"

خیرو بھاگا ہوا میری جوتی لے آیا۔ چودھری مجھے سہارا دے کر چلاتا ہوا کمرے
لے آیا۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چودھری نے میرے اوپر رض
ڈال دی اور بولا۔ "بی بی جی! اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ آپ اتنی سمجھ
ہیں' پھر کیوں اس طرح کرتی ہیں۔ مرنے والے کی روح کو تکلیف ہوتی ہے اس طرح

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "چودھری! بس......... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔
میں اب اور نہیں چھپوں گی۔ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی اور عدالت سے
انصاف مانگوں گی۔ عدالتیں اندھی بہری نہیں ہوتیں۔ میں سب کچھ صاف صاف بتاؤں گی
اور اپنے بچے کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گی۔"

چودھری شہاب نے پریشانی سے کہا "بی بی جی! میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔
آپ عقلمندی کی بات نہیں کر رہیں۔ ان پندرہ سالوں میں جتنا میں نے چنگیزیوں کو جانا ہے
کسی اور نے نہیں جانا ہوگا۔ آپ یہ بات بھول جائیں کہ ان کے خلاف قانونی لڑائی لڑ کر
انصاف حاصل کر سکیں گی۔ بالکل بھول جائیں یہ بات۔ ایسا کر کے آپ صرف اپنے آپ کو
نقصان پہنچائیں گی۔ یہ سیدھے لوگ نہیں ہیں' اس لئے سیدھی زبان بھی نہیں سمجھتے۔
ان سے کسی اور لہجے میں بات کرنی پڑتی ہے......... اور میں کروں گا یہ بات۔ بس تھوڑا
سا صبر کریں آپ' اس معاملے کو ذرا ٹھنڈا ہونے دیں۔"

میں نے جھلا کر کہا "چودھری! تمہیں کیوں میری اتنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں
چاہئے اپنا آپ۔ پھانسی ہی ہو جائے گی نا......... مجھے قبول ہے۔ ایک دفعہ میں دنیا کو سچ تو
بتا دوں گی نا۔"

شہاب بولا "ثناء بی بی! میں سیدھا سادھا جٹ بندا ہوں آپ پڑھے لکھے" لوگ
ہیں۔ آپ جتنا علم تو میرے پاس نہیں لیکن اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ جان بوجھ کر جان
گنوانی حرام ہے اور قانون کے سامنے پیش ہو کر آپ مفت میں جان گنوائیں گی۔ جان نہ
گئی تو زندگی ضرور برباد ہو جائے گی۔ ساری عمر کے لئے پاگل خانہ یا جیل' بڑا پکا کیس بنا
رکھا ہے انہوں نے آپ کے خلاف آپ کیوں نہیں سمجھتیں؟ آپ کو نہ سہی لیکن کچھ
لوگ ہیں جنہیں آپ کی زندگی کی ضرورت ہے" چودھری نے روانی میں یہ بات کہہ تو
دی لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں'
میں نے ایک ساعت کے لئے اپنائیت کی جھلک محسوس کی۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا
میں چلتا ہوں۔ آپ اندر سے کنڈی لگا لیں۔ لالٹین جلتی ہی رہنے دیں یا پھر انگیٹھی جلا
لیں' آج سردی بھی زیادہ ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ چودھری سے کہوں کہ وہ ادھر ہی

میرے پاس بیٹھا رہے۔ مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جائے۔ ورنہ پھر پاگل کر دینے والی سوچیں مجھے آ گھیریں گی لیکن میں کہہ نہ سکی' صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ وہ اپنی چادر لے جائے۔ میرے ہاتھ سے چادر لے کر وہ باہر نکل گیا۔ میں دروازے کو کنڈی چڑھائے بغیر بستر پر دراز ہو گئی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جو خواب میں نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر کوئی بدنصیب ماں بھلا سو سکتی ہے؟ ابھی رات کے صرف دس بجے تھے پہاڑ جیسی رات سامنے تھی اور فرحان کی یادیں چاروں طرف سے گھیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی یادیں شوخ چنچل ہنستی مسکراتی اٹھکھیلیاں کرتی یادیں' پاؤں پاؤں چلتی' چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی اور توتلی زبان میں باتیں کرتی یادیں۔ میرا سینہ پھٹنے لگا' مجھے لگا میں رو رہی ہوں.......... لیکن نہیں آنسو میری قسمت میں کہاں تھے' جیسے فرحان میری گود سے روٹھا تھا ویسے وہ میری آنکھوں سے روٹھ چکے تھے۔ آنسوؤں کی جگہ صرف ایک جلن تھی۔ جو کبھی گھٹ جاتی اور کبھی بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت پھر یہ جلن انتہا کو چھو رہی تھی۔

ایکا ایکی نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں ایک فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔ ٹرنک کھول کر ایک سوئیٹر پہنا۔ ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھی ہوئی کچھ رقم نکال کر چھوٹے سے دستی پرس میں رکھی۔ گرم چادر اوڑھی اور باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئی.......... کچھ دیر بعد میں دیواروں کے ساتھ ساتھ احتیاط سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے سب لوگ کمروں میں سو رہے تھے۔ بیرونی دروازے کے پاس چھپر کے نیچے ایک شخص اپلوں کی آگ جلائے' رضائی لپیٹے نیم دراز تھا۔ اس کی آٹومیٹک رائفل سرہانے رکھی ہوئی تھی آگ کی مدھم روشنی میں رائفل کا لوہا چمک رہا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھی۔ کنڈی کو ٹٹول کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسے کھولتے ہوئے آواز ضرور پیدا ہو گی۔ کہیں پہریدار بیدار ہو جاتا تو گھبراہٹ میں فوری طور پر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ سوچا کہ رائفل اس سے دور ہٹا دوں۔ دبے پاؤں اس کے سرہانے پہنچی اور وزنی رائفل کو نالی کی طرف سے پکڑ بہ آہستگی اٹھا لیا۔ پہریدار غالباً غنودگی میں تھا۔ فوراً جاگ گیا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لئے آگ کی مدھم روشنی اس کی بڑی بڑی مونچھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر منعکس ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ کی رائفل

پورے زور سے گھومی اور اس کی کنپٹی پر پڑی' کھٹاک کی نہایت ہولناک آواز کے ساتھ وہ پہلو کے بل بستر پر لڑھک گیا۔ میں نے ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی اور رائفل چارپائی پر پھینک کر دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھی۔ معمولی کوشش کے بعد میں نے دروازہ کھول لیا اور باہر نکل آئی۔ یہ ایک سنسان جگہ تھی۔ کہیں قریب سے چھوٹی نہر گزرتی تھی۔ چاروں طرف درخت تھے درختوں کے درمیان سے ایک کچا راستہ گزرتا تھا۔ اس ڈیرے کا مالک اگر اس جگہ کو شوٹنگ کے لئے استعمال کرتا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں کرتا تھا۔ ہماری پنجابی فلموں میں عموماً ایسی ہی جگہوں پر مار دھاڑ کے مناظر فلمائے جاتے ہیں۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا کہ اس وقت میں خود کو کسی فلم کا کردار ہی محسوس کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں سے کیسی کیسی انہونیاں سرزد ہو رہی تھیں۔ پہریدار کے سر سے بندوق ٹکرانے کی جو آواز پیدا ہوئی تھی وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کہیں وہ مر تو نہیں گیا؟ ذہن میں یہ پراندیش سوال گونجا۔ "مر بھی گیا ہے تو کیا ہے' مجھے دو دفعہ پھانسی نہیں ہو جائے گی" میں نے خود ہی جواب دیا۔ اس پر وار کرنا مجبوری تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو وہ کبھی مجھے نکلنے نہ دیتا۔ "آخر وہ بھی تو کسی کا باپ یا بیٹا ہو گا" میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا اور دل میں دعا کرنے لگی کہ وہ صرف زخمی ہوا ہو۔

میں کچھ دیر درختوں کے درمیان چلتی رہی۔ پھر کھیت نظر آئے اور اونچے اونچے کھیتوں میں احتیاط سے سفر کرتی میں اچانک ہی ایک جانے پہچانے راستے پر آ گئی۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر چند ہفتے پہلے سلیم کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہماری جیپ خراب ہوئی تھی اور ہمیں زینب کے گھر پناہ لینی پڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا زینب کا گاؤں "ٹبے والی چک چودھاں" بھی کہیں قریب ہی تھا۔ مگر اب مجھے اس گاؤں سے کیا لینا تھا۔ زینب وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ تو رحمت کے ساتھ ایک نیا سفر شروع کر چکی تھی۔ ٹبے والی کا خیال آتے ہی دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اسی گاؤں میں' میں نے آخری بار اپنے فرحان کو زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ یہیں پر اس نے آخری بار اپنی توتلی زبان سے مجھے امی دان کہا تھا۔ میرے ہاتھوں سے آخری بار دلیہ کھا کر اور مجھ پر آخری نظر ڈال کر سو گیا تھا۔

میں اس تاریک راستے پر فصلوں کے درمیان بہت دیر تک چلتی رہی یہاں تک کہ مجھے تیز رفتار ٹریکٹر ٹرالیوں اور موٹر سائیکلوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یہ ایک

پختہ ذیلی سڑک تھی جو کہیں آگے جا کر جھنگ جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔ اب فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس تنگ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آ رہی تھیں۔ کبھی چارے سے لدی ہوئی کوئی ٹریکٹر ٹرالی گزر جاتی۔ کبھی کوئی سائیکل سوار گرم چادر کی بکل مارے تیز تیز پیڈل چلاتا نکل جاتا۔ نزدیکی قصبات میں موٹر سائیکلوں پر دودھ پہنچانے والے گوالے بھی آ جا رہے تھے۔ اجالا ہونے تک میں سڑک سے کچھ ہٹ کر درختوں میں کھڑی رہی، پھر سڑک پر آ گئی۔ میں نے گرم چادر سے دیہاتی انداز میں منہ لپیٹ رکھا تھا۔ جلد ہی ایک ٹرالی والے نے "بہن جی" کہہ کر مجھے ٹرالی میں لفٹ دے دی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد میں جھنگ جانے والی سڑک پر تھی۔ یہاں سے بس پکڑ کر میں جھنگ پہنچ گئی۔ بھوک سے برا حال تھا مگر میں کہیں کھانا کھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ پوچھتی پاچھتی میں جھنگ لاری اڈے پر پہنچی۔ وہاں سے مجھے سیدھے لاہور آنے والی بس مل گئی۔

جس وقت میں لاہور بادامی باغ اڈے پر پہنچی شام کے چھ بج چکے تھے اور بونداباندی ہو رہی تھی۔ میں نے رکشا لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ موہنی روڈ اپنے گھر جا پہنچی۔ دور ہی سے دیکھا تو کوٹھی کی بیرونی دیوار پر لائٹنگ ہو رہی تھی۔ باؤنڈری پر اور باغیچے کے پودوں میں جابجا رنگ برنگی روشنیاں ٹنگی تھیں۔ سڑک پر کاروں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی۔ اپنے کچھ عزیزوں کی کاریں میں دور ہی سے پہچان سکتی تھی۔ غالباً کوئی درمیانے درجے کا فنکشن تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا آج جنوری کی دس تاریخ تھی۔ آج شعیب کی سالگرہ تھی۔ شعیب جو میرا بڑا بھتیجا تھا اور مجھ سے بے حد پیار کرتا تھا۔ ہم پروگرام بنایا کرتے تھے کہ شعیب کی پانچویں سالگرہ دھوم دھام سے کریں گے اور آج......... آج اس کی پانچویں سالگرہ تھی۔ میرے دل میں شعیب کو دیکھنے اور اس کا منہ چومنے کی خواہش مچل گئی۔ جی چاہا سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر بھاگتی ہوئی اپنے گھر میں گھس جاؤں۔ بھائی تنویر کے گلے سے لگ کر خوب روؤں۔ بھائیوں کو اپنا دکھڑا سناؤں اور بھتیجوں کو خوب خوب پیار کروں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میرے حالات مجھے اس بچپنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا بہت احتیاط سے کرنا تھا۔ میں دیہاتی انداز میں چادر کا گھونگھٹ نکالے دھیرے دھیرے کوٹھی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ میں ایک عام سی عورت نظر آتی تھی۔ گیٹ

سے گزر کر میں لان میں پہنچ گئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا شامیانہ لگا تھا اور مہمان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ رنگ برنگی برتھ ڈے کیپس کے ساتھ بچے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اچانک میری نظر بڑی بھابی پر پڑی وہ ایک میز سجانے میں ملازموں کی مدد کر رہی تھیں۔ شامیانے کی قنات میں تھوڑی سی درز تھی۔ میں نے اس جھری کے ساتھ منہ لگا دیا اور باہر ہی سے بھابی کو آواز دینے کی کوشش کی مگر حیرانی ہوئی کہ دو تین بار کوشش کے باوجود میرے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ کوئی گولا حلق میں اٹک گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت آواز سنائی دی "کون ہے؟"

میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا بڑے بھائی جان میرے سامنے کھڑے تھے۔ چادر کی اوٹ سے انہوں نے میرے چہرے کی جھلک دیکھی اور ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت اُمڈتی چلی گئی۔ پھر اس حیرت کی جگہ شدید نفرت اور غصے نے لے لی۔ وہ عینک کے پیچھے سے مجھے گھورتے ہوئے بولے "تم یہاں؟"

میں سرتاپا جرم ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں بولے "میرے پیچھے پیچھے آؤ" میں چادر میں لپٹی ان کے پیچھے چل دی۔ وہ مجھے بغلی راہداری سے گزار کر ایک عقبی کمرے میں لے آئے۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور خطرناک نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ان کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بے پناہ طیش سے بولے۔ "جی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دوں۔ مگر میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا......... کیوں آئی ہو یہاں؟"

میں نے بلک کر کہا "بھائی جان میں بے قصور ہوں۔"

ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا اور میں الٹ کر چارپائی پر جا گری۔ دانت پیس کر بھائی جان نے مجھے بے نقط سنائیں اور غرا کر بولے "اگر تجھ میں تھوڑی بہت بھی غیرت ہوتی تو اپنا یہ منحوس چہرہ کبھی ہمیں نہ دکھاتی۔ جا ڈوب مر چلو بھر پانی میں یا گولی مار لے اپنے آپ کو۔ تیرے جیسی فاحشہ کو جینے کا حق ہی نہیں ہے۔ کیوں جی رہی ہے تو کیوں جی رہی ہے؟" انہوں نے مشتعل ہو کر دونوں ہاتھوں میں میرا گلا دبوچ لیا اور آگے پیچھے ہلانے لگے۔ میرا دم آنکھوں میں آ گیا تو انہوں نے گلے سے ہاتھ ہٹا کر مجھے پیٹنا شروع کر

دیا۔

"بھائی جان!" میں نے دبی دبی آواز میں فریاد کی۔

"خبردار" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے "خبردار! جو اس گھر کے کسی فرد سے ا
رشتہ جوڑا۔ تو ہماری کوئی نہیں اور نہ ہم تجھے جانتے ہیں۔ اگر ہماری کوئی بہن تھی تو
مرچکی ہے۔ دفعہ ہو جا یہاں سے اور اگر ہم پر رحم کر سکتی ہے تو یہ شہر اور یہ علاقہ چھو
جا۔"

میں نے اپنی خشک' بے اشک آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے کہا "بھا
جان! آپ کہیں گے تو دنیا ہی چھوڑ جاؤں گی لیکن میری بات تو........."

"خبردار!" وہ غرائے "مجھے کچھ نہیں سننا......... انہی قدموں پر یہاں سے لو
جا۔"

میں آنکھیں بند کرکے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پ
اٹھی اور در و دیوار پر ایک حسرت کی نظر ڈال کر خاموشی سے باہر آگئی۔ بھائی جان اپنی جگ
پتھر کی طرح ساکت کھڑے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اگر میں نے نکلنے میں چند لمحو
کی بھی دیر کی تو وہ دھکے دے کر مجھے نکال دیں گے۔

چادر میں لپٹی لپٹائی میں بیرونی گیٹ سے باہر آگئی۔ رات تاریک اور بے حد خنک
تھی' سر پر کھلا آسمان اور پیٹ میں ہونکتی ہوئی بھوک۔ چند گز چل کر میں نے اس گھر
دیکھا جسے ایک مدت تک میں نے اپنا گھر سمجھا تھا۔ جس کے آنگن میں ابوجی نے مجھے جھ
جھلایا تھا اور جس کی دہلیز پر کھڑے ہو کر امی جی نے ہر سہ پہر میرا راستہ دیکھا تھا۔ آج و
دہلیز تھی جہاں سے مجھے دھکیل کر بے اماں رات کے جنگل میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں
نظروں ہی نظروں میں "اپنے گھر" کے روشن در و دیوار کو چوما۔ "خدا حافظ" میر
ہونٹوں سے ایک خاموش سسکی نکلی اور میں سر جھکا کر آگے بڑھنے لگی۔ میں بڑے ما
سے یہاں آئی تھی۔ میں ظالم نہیں مظلوم تھی۔ میرے پاس سچ کا سونا تھا جس کے بار
کہا جاتا ہے کہ وہ ہر کسوٹی پر پورا ترتا ہے اور جس کو کوئی آنچ نہیں ہوتی۔ میں وہی
لے کر آئی تھی اپنی اور اپنے خاندان کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اور اپنے مقتو
فرحان کے خون کا حساب مانگنے کے لئے۔ مگر میری بات کسی نے نہیں سنی تھی.......

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ساری گلیاں جانی پہچانی تھیں مگر ساری اجنبی تھیں۔

"یاخدا! میں کہاں جاؤں؟"

مَیں نے پریشانی سے سوچا۔ بوندا باندی پھر شروع ہوگئی تھی۔ میں دکانوں کے چھجوں کے نیچے نیچے چلتی آگے بڑھنے لگی۔ آتے جاتے مردوں کی تیز نگاہیں میرے چاروں طرف جال سا بن رہی تھیں۔

میرا سر پہلے ہی چکرا رہا تھا' اب قدم بھی ڈگمگانے لگے۔ قریب تھا کہ میں تیورا کر کسی دکان کے تھڑے پر گر جاتی کہ تھوڑی دور نیلے اور سرخ رنگ کا ایک بورڈ نظر آیا "پولیس چوکی" ساتھ ہی ایک طرف تیر کا نشان بھی دکھایا گیا تھا۔ جی میں آیا کہ کیوں نہ سیدھی سیدھی چوکی چلی جاؤں۔ سب کچھ صاف صاف بتا کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردوں۔ جونہی یہ خیال ذہن میں واضح ہوا میں ڈگمگاتے قدموں سے چوکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اتنا بڑا فیصلہ کتنی آسانی سے کرلیا تھا۔ حالات کی گردش انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ میں نے سڑک پار کی اور لرزاں قدموں سے پولیس چوکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک ایک سوزوکی کار میرے پاس آکر رکی۔ میں سہم کر ایک طرف ہوگئی۔ کار میں سے فرخندہ برآمد ہوئی اور راہ گیروں کی پرواہ کئے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے مجھے کھینچ کر کار کی پچھلی نشست پر بٹھایا اور ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کی ہدایت کی۔

فرخندہ میری سہیلی' میری دوست ہی نہیں میری بہن جیسی بھی تھی۔ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کی یادوں کے خزانے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے بہت کچھ تھے۔

اس اندھیری اور درد بھری رات میں فرخندہ کا وجود میرے لئے طمانیت و تسکین ثابت ہوا تھا۔ میں کار کی پچھلی سیٹ پر گم صم اس کے کندھے سے لگی رہی اور وہ اپنے بازو میرے گرد لپیٹے مجھے پچکارتی رہی' تھپتھپاتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیسے مجھے تسلی دے۔ میں جو ایک مجرم تھی اور پولیس کو اپنے پیچھے لگائے پھرتی تھی۔ وہ مجھے ایک سینما ہاؤس میں لے گئی۔ ڈرائیور کے ذریعے اس نے باکس کے دو ٹکٹ منگوائے اور ہم ایک تنہا باکس میں آبیٹھیں۔ نو سے بارہ کا شو تھا۔ فضول سی فلم چل رہی تھی اور کچھ بے ذوق سے لوگ اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔ ہمیں اس فلم اور ان لوگوں سے کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ ہمیں تو تنہائی درکار تھی۔ اس پرسکون گوشے میں ہم ایک دوسرے کا دکھ سن
رہی تھیں اور سنا رہی تھیں۔ فرخندہ نے بتایا "جب تم بڑے بھائی جان اعجاز کے پیچھے چلتی
کوٹھی کے عقبی کمرے میں گئی تھیں' اس وقت میں نے تمہیں دیکھا تھا اور میں شک میں
پڑ گئی تھی۔ بعد میں کار لے کر تمہارے پیچھے روانہ ہوگئی۔" ہم نے بہت دیر وہاں باتیں
کیں' لیکن کب تک۔ ساری رات تو یہاں بیٹھا نہیں جا سکتا تھا۔ میرے انکار کرنے اور
بہت روکنے کے باوجود ہاف ٹائم کے وقت فرخندہ مجھے لے کر اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ میں
جانتی تھی اس گھر میں میڈم نادرہ بھی موجود ہے۔ وہ میڈم نادرہ جس نے میری بربادیوں
کے سلسلے کا آغاز کیا تھا۔ جس نے سلیم سے دشمنی چکانے کے لئے مجھے چنگیزی جاگیرداروں
کے چنگل میں دھکیل دیا تھا۔ میں اس عورت کے ساتھ ایک چھت تلے رات ہرگز بسر کرنا
نہیں چاہتی تھی مگر فرخندہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ بڑی ہوشیاری اور رازداری
کے ساتھ کوٹھی کے عقبی چھوٹے دروازے سے مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ کھانا
کھلانے کے بعد وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ وہ میری بربادی میں اپنی پھوپھو
میڈم نادرہ کے کردار پر بہت شرمندہ تھی۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے
بتایا۔ وہ ایک انگریزی روزنامے میں سب ایڈیٹر کی ملازمت کر رہی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی
کہ وہ پہلے سے خاصی میچور نظر آ رہی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں خود کو پولیس کے
حوالے کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں تو وہ مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ وہ میری پوری
کہانی سے آگاہ تھی۔ اس نے الماری میں سے پچھلی تاریخوں کے چند اخبار نکالے۔ ان
اخباروں میں واصف چنگیزی کے مقدمے کی خبریں لگتی رہی تھیں۔ دو روز پہلے کا ایک
اخبار اس نے میرے سامنے پھیلا دیا۔ اندرونی صفحے پر ایک تین کالمی خبر معہ ایک تصویر کے
موجود تھی۔ یہ تصویر سلیم کی تھی۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی' چہرے ہی سے اندازہ
ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ تشدد کا نشانہ بنا ہے۔ خبر کی سرخی تھی "میں چودھری حکم دین کے
کہنے پر بڑی حویلی پہنچا تھا' ملزم سلیم" .... تفصیل میں لکھا تھا کہ واصف چنگیزی قتل
کیس کے ملزم سلیم نے آج عدالت کے روبرو اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ چودھری
حکم دین سے اس کا ملنا جلنا تھا۔ یہ چودھری حکم دین ہی تھا جس نے اسے واصف چنگیزی
کے قتل پر اکسایا۔ سلیم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ پال پور کے چودھریوں نے مجھے اس

سلسلے میں ہر طرح کی پشت پناہی کا یقین دلایا تھا اور نقد انعام کا وعدہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے
کہا تھا کہ ہم تجھے ملک سے باہر بھجوا دیں گے اور اتنی رقم دیں گے کہ تم اپنی ہونے والی
بیوی کے ساتھ ساری زندگی عیش سے گزارو گے' سلیم نے اپنی محبوبہ اور اس قتل کی ایک
ملزمہ ثناء کے بارے میں بھی اہم انکشافات کئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد بھی
وہ اکثر اس سے ملتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں عام طور پر لارنس گارڈن یا شمالی شہر کے ایک
ہوٹل میں ہوتی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔
یہی وجہ ہے کہ ثناء پر دیوانگی کے اکثر دورے پڑتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ دیوانگی کے
کسی ایسے ہی دورے میں اس نے اپنے بچے کو قتل کر دیا ہو۔ سلیم نے اپنے بیان میں مزید
کہا ہے کہ ثناء اس وقت پال پور کے چودھریوں کے پاس ہے اور انہوں نے اسے حویلی
سے باہر کسی نامعلوم جگہ پر چھپا رکھا ہے۔

خبر کی آخری سطور پڑھتے پڑھتے میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ کتنا بڑا جھوٹ
تھا اور کتنی بے باکی سے لکھا گیا تھا۔ یہ سارا بیان پولیس تشدد کا نتیجہ تھا جو پولیس نے
چنگیزیوں کی مرضی و منشاء کے مطابق سلیم سے حاصل کیا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ
کیا سلیم اتنا کم ہمت ہے کہ تشدد کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا اور عدالت میں ایسا بیان دے
ڈالا؟

فرخندہ نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی "اب بتاؤ خود کو پولیس کے حوالے
کر کے تمہیں کیا ملے گا؟ فی الحال تمہیں پولیس سے دور رہنا چاہئے۔ میرا مطلب ہے دو
تین ہفتوں تک........... دیکھو ڈیئر! تمہاری ٹکر ایک ایسے دراز دست خاندان سے ہے جس
کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت اور باہمت
گواہ درکار ہیں۔ جو جال انہوں نے تمہارے گرد بنا ہے اس میں تمہارے بیانات اور
الزامات کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تمہیں زیادہ مان اس خط کا ہے جو وہاب علی نے تمہیں
بلیک میلنگ کے لئے لکھا تھا اور جو تم نے چودھری شباب کے گھر میں کہیں چھپا رکھا ہے۔
میں اس خط کو دیکھے بغیر پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ وہاب علی کی اپنی تحریر میں
نہیں ہوگا۔ چنگیزیوں کا وکیل اسے باآسانی فرضی ثابت کر دے گا۔ یہ لوگ اتنے کچے کام
نہیں کرتے۔"

"پھر میں کیا کروں' کیا اسی طرح بھاگتی پھروں؟"

"بھاگتی کیوں پھرو' میں تمہارے رہنے کا انتظام کروں گی اور تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں تو پہلے بھی بیکار نہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ایڈیٹر کی اجازت سے چنگیزی گھرانے کے بارے میں پوری تحقیقات کر رہی ہوں۔ ہمارے دو رپورٹر بھی دن رات اس سلسلے میں مصروف ہیں۔ تم دیکھنا جلد کوئی نہ کوئی اہم ثبوت ضرور سامنے آئے گا۔"

ہر اندیشے و خطرے سے بے نیاز میں فرخندہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی لیکن کوٹھی کے ایک حصے میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ فرخندہ کی پھوپھی میڈم نادرہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ وہ ایک ہوشیار اور باخبر عورت تھی۔ فرخندہ کو اس سے چڑ اسی وجہ سے تھی کہ وہ ہر وقت اس کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ کوئی اجنبی لڑکی فرخندہ کے ساتھ اس کے بیڈروم میں موجود ہے۔ درحقیقت وہ ڈرائیور جس نے ہمیں سینما پر اتارا تھا میڈم نادرہ کا "معلوماتی ذریعہ" بھی تھا۔ فرخندہ کے منع کرنے کے باوجود وہ میڈم نادرہ کے کان میں یہ بات ڈال چکا تھا۔

"اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی.......... "کون؟" فرخندہ نے سہم کر پوچھا۔

"دروازہ کھولو فرخندہ" میڈم نادرہ کی کرخت آواز آئی۔ ہم دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"کیا بات ہے پھوپھو.......... میں لحاف میں ہوں۔"

"میں کہتی ہوں دروازہ کھولتی ہو یا بلاؤں تمہاری ماں کو' کون ہے تمہارے ساتھ اس وقت؟"

"ک.......... کوئی نہیں پھوپھو' میں اکیلی ہوں۔"

"بکواس مت کر' دروازہ کھول" میڈم نادرہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ فرخندہ نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ کمرے سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ ہی کہیں چھپنے کی جگہ تھی۔ دروازہ دھڑا دھڑ بج رہا تھا۔ فرخندہ کو کچھ اور نہیں سوجھا تو آخری کوشش کے طور پر اس نے باتھ روم کا بلب اتار کر مجھے وہاں چھپا دیا.......... دروازہ اب

جیسے ٹوٹنے ہی والا تھا۔ ساتھ ساتھ میڈم نادرہ کی چیختی ہوئی آواز بھی آ رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر غصیلی عورت ہے' فرخندہ نے جونہی دروازہ کھولا وہ بگولے کی طرح کمرے میں چکرانے لگی۔ قدموں کی چاپ اور دیگر آہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پورے کمرے کی تلاشی لے رہی ہے۔ ملی جلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میڈم نادرہ اندھیرے میں در و دیوار کو گھور رہی تھی۔ اچانک اس نے مجھے دیکھ لیا۔ جونہی اس کے چہرے کے تاثرات بدلے میں اپنی جگہ سے متحرک ہوئی اور لپکتی ہوئی میڈم نادرہ کے پہلو سے نکل گئی۔ میڈم نادرہ اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ چیختی ہوئی میرے پیچھے بھاگی۔ دروازے کے پاس فرخندہ "پھوپھو جان" کہہ کر اس سے لپٹ گئی.......... اس کے ساتھ ہی اس نے کار کی چابی والا "کی رنگ" میری طرف اچھالا اور چلا کر بولی۔

"بھاگ جاؤ ثنا! یہ بڑی گاڑی کی چابی ہے جو ادھر پورچ میں کھڑی ہے۔"

میں نے ایک ساعت کے لئے میڈم نادرہ کو فرخندہ سے الجھتے ہوئے دیکھا اور میکانی انداز میں پورچ کی طرف بڑھی۔ میڈم نادرہ اب پکار پکار کر نوکروں کو آوازیں دے رہی تھیں۔ "نذیر.......... طفیل.......... چھوٹے" میں ایک روشن دروازے سے کنی کتراتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ سامنے ہی مجھے سفید سنی نظر آئی۔ کالج کے زمانے میں اس گاڑی پر فرخندہ اور میں نے کئی لمبی ڈرائیو کی تھیں۔ کئی بار میں نے اسے خود بھی ڈرائیو کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ ایک عجب سی خود وارفتگی میرے اندر پیدا ہو چکی تھی۔ کلچ دبا کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور چند بار ریس دے کر پہلا گیئر لگا دیا۔ میڈم نادرہ ایک نوکر کے ساتھ چلاتی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پہلے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو لاک تھا' پھر وہ لپک کر گاڑی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نوکر بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور رینگنے کی رفتار سے گاڑی ان دونوں کی طرف بڑھائی۔ نوکر تو میرے تاثرات دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا لیکن میڈم نادرہ اپنے پورے تن و توش کے ساتھ ڈٹی رہی۔ میری صورت دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی گاڑی کو پہلے ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کرتی رہی.......... پھر بونٹ پر اوندھی لیٹ گئی۔ وہ کسی طور پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔ میرے اندر چھپے والا

لاوا بھی اچھل چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تند سیلاب مہینوں سے کسی پتھریلے بند نے روک رکھا تھا جو اب ساری رکاوٹیں توڑ کر بہہ نکلا ہے۔ کوئی آندھی' بے پناہ شور سے میری سماعت کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ خوف' گھبراہٹ' کپکپاہٹ سب کچھ اس آندھی میں اڑ گیا تھا۔

"ہٹ جا......... بدبخت ہٹ جا" میں نے چیخ کر کہا۔ پھر پورا کلچ چھوڑ کر ریس دی۔ پہیے چرچرائے اور گاڑی لہراتی ہوئی چند گملوں سے ٹکرانے کے بعد بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ میں نے نادرہ کو اچھل کر اپنے سامنے گرتے دیکھا۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرا کر دوبارہ گاڑی کے سامنے گری اور دائیں جانب کے دونوں پہیے اس کے اوپر سے گزر گئے۔ گاڑی کے بمپر نے ادھ کھلے گیٹ کو زوردار ٹکر سے کھولا اور گاڑی سڑک پر آگئی۔ میں نے مضبوطی سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ میں رو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ جانے کب سے رکے ہوئے تھے یہ آنسو!

اگلے روز رات آٹھ بجے تک میں پال پور پہنچ چکی تھی۔ فرخندہ کی گاڑی تو میں نے لاہور ہی میں شیرانوالہ گیٹ کے پاس چھوڑ دی تھی۔ وہاں سے پیدل لاری اڈے پہنچی تھی اور سفر کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جھنگ اور وہاں سے پال پور آگئی تھی۔ لاہور کے حالات سے گزرنے کے بعد میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آچکی تھی۔ ایک بے خوفی اور خود اعتمادی سی دل میں راہ پا رہی تھی۔ ذہن میں یہ خیال راسخ ہو رہا تھا کہ کوئی میری مدد نہیں کرے گا اور نہ کوئی دکھ بانٹے گا۔ مجھے اپنے بیٹے کے لئے انصاف مانگنا نہیں خود حاصل کرنا ہوگا۔ یوں لگ رہا تھا کہ میرے بچے نے مرتے مرتے اپنا سارا درد میرے جسم میں منتقل کر دیا ہے اور جب تک میں اس درد کا حساب نہیں لے لوں گی مجھے موت آئے گی نہ سکون.........!

جب میں حویلی میں چودھری شہاب کے سامنے پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر یک دم ہراساں نظر آنے لگا اور بے ساختہ بولا "بی بی جی! کہاں چلی گئی تھیں آپ' مجھے......... مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ میرا بندہ بھی زخمی کر دیا آپ نے' کیوں ایسا کیا آپ نے؟؟"

میں خاموشی سے اپنے آنسو چادر کے کناروں میں جذب کرتی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی جواب نہیں دوں گی اور جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے بتائے بغیر بھی وہ سمجھ رہا تھا کہ میں لاہور اپنے گھر گئی تھی "اپنا گھر" ایک تیر سا دل میں چبھ رہا تھا ایسا سوچ کر بھی۔

چودھری شہاب نے ہراس آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کسی نے پہچانا تو نہیں آپ کو اندر آتے ہوئے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ حویلی پولیس کی نگرانی میں ہے اور آج رات کسی وقت مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔

میں ششدر رہ گئی۔ ایک وہی تو سہارا تھا میرے پاس' کیا وہ بھی چھوٹنے والا تھا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

چودھری نے ستے ہوئے لہجے میں کہا "وہی سلیم کا بیان' میں نے ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی تھی ورنہ صبح ہی پکڑ لیا جاتا۔ اب رات بارہ بجے کا انتظار ہے۔ جونہی ضمانت کا وقت ختم ہوا پولیس دروازے پر آجائے گی۔"

"اب کیا ہوگا؟"

وہ زبردستی ہنس کر بولا "اگر آپ کو کسی نے نہیں دیکھا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔ آپ تسلی سے کمرے میں سوئیں۔ سویرے آپ کا جو پروگرام ہو وہ حمیدہ کو بتا دیں۔ وہ ہر طرح آپ کی مدد کرے گی؟"

چودھری کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ میں نے اس طنز کو نظرانداز کر کے پوچھا "چودھری تم مجھے تو بھاگنے کا مشورہ دیتے رہے ہو خود کیوں نہیں بھاگ جاتے' کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔"

وہ بولا "بی بی جی! یہ سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے پتہ ہے کب بھاگنا ہے اور کب بھگتنا ہے۔ یہ تو اب لمبا ہی چکر چل گیا ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ اپنا سوچیں کہ کیا کرنا ہے۔ آپ اچھی بھلی عقل مند ہیں بلکہ ہم جیسے جٹوں کو عقل دے سکتی ہیں۔ ایک بات آپ کو بتا دوں اگر آپ پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئیں تو وہ آپ کو پگل خانے پہنچا کر چھوڑیں گے۔"

میں نے کہا "چودھری! ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟"

میرے لہجے پر چودھری نے چونک کر میری طرف دیکھا وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں جھانکتا رہا' پھر بولا "میں آپ سے انکار نہیں کرسکتا" ان چند لفظوں میں وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن میں وہ سننا چاہتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔"

میں نے صاف سیدھے لہجے میں کہا "سوچ لو!"

وہ بولا "سوچ کر ہی کہا ہے۔"

میں نے کہا "جان محمد نے اس رات تمہیں کوئی اہم بات بتائی تھی۔ میرا خیال ہے وہ بات "بڑی حویلی" کے بارے میں تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"چودھری شہاب نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سرہلا دیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا "وہ بات بڑی حویلی کے بارے میں ہی تھی اور میرا خیال ہے آپ کو بتانے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ درحقیقت وہ بات اہم ہونے کے باوجود اس وقت غیراہم ہے۔ اسے اہم بنانے کے لئے وقت درکار ہے' جو کل تک تو میرے پاس تھا لیکن اب نہیں ہے۔"

مختصر تمہید کے بعد چودھری شہاب نے اس رات جان بلب جان محمد کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"کوئی سات آٹھ ماہ پرانی بات ہے۔ ایک رات فارسٹ گارڈ جان محمد ڈیوٹی پر تھا کہ اسے کچے راستے سے کچھ ہٹ کر گھنے درختوں میں کھسرپھسر کی آوازیں سنائی دیں۔ جنگل میں ان دنوں لکڑی بہت چوری ہو رہی تھی۔ جان محمد چونک گیا اور صورت حال جاننے کے لئے وہ دبے پاؤں درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں جاگیردار واصف چنگیزی ایک اجنبی شخص سے مصروف گفتگو ہے۔ یہ چوڑا چکلا شخص کافی بوڑھا تھا اور رک رک کر باتیں کرتا تھا۔ واصف اس سے کہہ رہا تھا "رحیمی! تم جانتے ہو یہ کتنا نازک معاملہ ہے' میری عزت' دولت اور شہرت سب کچھ داؤ پر ہے۔ ذرا سوچو اگر کسی کو بھنک بھی پڑ جائے تو ہم سب کا کیا حال ہو۔ تمہیں پتہ ہے میں الیکشن بھی لڑنے والا ہوں۔ سیاست دان کی مجبوریاں تم نہیں سمجھتے ہو' شیشے میں بال آ
والی بات ہوتی ہے۔"

جواب میں رحیمی نامی اس بوڑھے شخص نے کہا "واصف صاحب' بے فکر رہیں جو بات آپ کے اور میرے درمیان میں ہے' وہ کسی تیسرے تک نہیں پہنچے گی۔ بچے ذرا جذباتی ہوتے ہیں میں اسے سمجھا دوں گا' آئندہ اس کی طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

واصف نے تنبیہی لہجے میں کہا "اور دیکھو ملازم جب زیادہ پرانے ہو جائیں تو بُرے ہو جاتے ہیں۔ اپنے ملازم بدل دو' بالکل نئے ملازم رکھو' جو تمہیں پہلے سے نہ جانتے ہوں۔" رحیمی نے اقرار میں سرہلایا۔ واصف نے پھر کہا "زیادہ میل جول تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ ہر نئے ملنے والے پر گہری نظر رکھو۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔"

اس پراسرار گفتگو کے بعد واصف اپنے گھوڑے پر آ بیٹھا اور رحیمی نامی وہ شخص جو لمبے شکاری بوٹ اور برساتی پہنے ہوئے تھا اپنی چھڑی ٹیکتا مخالف سمت میں بڑھ گیا۔ جان محمد نے تجسس سے مجبور ہو کر اس کا پیچھا کیا۔ کوئی ایک فرلانگ دور درختوں کے درمیان ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس میں دو آدمی پہلے سے سوار تھے۔ بوڑھے کے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ایک طرف نکل گئی۔ اس کی عقبی بتی کی روشنی میں جان محمد اس کا نمبر پڑھنے میں کامیاب رہا۔ وہ پرائیویٹ جیپ تھی...... چند روز بعد جان محمد نے ایک واقف کار کے ذریعے رجسٹریشن آفس سے جیپ کے مالک کا پتہ کرایا۔ اس کا نام عظمت خان رحیمی معلوم ہوا۔ وہ جھنگ ہی کی ایک تحصیل کا رہنے والا تھا۔ پال پور سے وہاں کا فاصلہ بذریعہ پکی سڑک پینتیس چالیس میل تھا۔ جان محمد نے خان رحیمی کا نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ شخص علاقے کا مشہور شکاری ہے اور اخباروں میں اس کے بارے لکھا جاتا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں سندر بن کے جنگلات کا حال بے حد تفصیل سے درج تھا اور شکار کے کچھ واقعات بھی تھے۔ مگر یہ تمام واقعات پچیس تیس سال پرانے تھے اور اب ایک عرصے سے خان رحیمی کے بارے کچھ سننے یا پڑھنے میں نہیں آیا تھا۔ جان محمد' خان رحیمی کو صرف نام سے جانتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس روز اسے واصف کے ساتھ دیکھ کر اسے خیال تک نہیں آیا تھا کہ یہ دور ماضی کا مشہور معروف شکاری ہے۔

خان رحیمی اور جاگیردار واصف کی گفتگو سننے کے بعد جان محمد کے ذہن میں ایک

کانٹا سا چبھ چکا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیا کھیل ہے جو جاگیردار واصف اور
رحیمی کے درمیان کھیلا جا رہا ہے۔ اپنے اس تجسس سے مجبور ہو کر وہ ایک روز
کے مضافات میں خان رحیمی کے علاقے میں پہنچ گیا۔ سندری گاؤں کے نواح میں
وسیع قطعہ اراضی خان رحیمی کی ملکیت تھا۔ یہ تمام جگہ درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی
خان رحیمی یہاں اپنے پرکھوں کے زمانے کی ایک کہنہ سال کوٹھی میں رہتا تھا۔ یہاں
کر جان محمد کو معلوم ہوا کہ خان رحیمی کے شکار کا شوق اب صرف مچھلی اور باز کے
تک محدود رہ گیا ہے۔ سردیوں کے آغاز میں جب مہاجر پرندے درختوں پر نظر آنے
ہیں' خان رحیمی اور اس کے ساتھی بے حد مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کا اصل بز
ہی ہوتا ہے۔ باز کے شکار کے لئے خان رحیمی ہر سال تین چار لائسنس حاصل کر
اور اس کاروبار میں اسے کبھی گھاٹا نہیں ہوا۔ اپنے پکڑے ہوئے بعض اچھے پرندوں
ٹریننگ بھی کرتا ہے۔ بعدازاں یہ پرندے عرب شیوخ کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت
جاتے ہیں۔ ان بنیادی معلومات کے سوا جان محمد کوئی بھی کام کی بات معلوم نہ کرسکا۔
خان رحیمی کے طرز زندگی نے اس کے شکوک کو کچھ اور ہوا دی اور وہ وہاں سے
تجسس کو بڑھا کر واپس آگیا۔

کوئی تین چار ہفتے بعد ایک روز اچانک اس کی نگاہ اخبار کے ایک اشتہار پر
یہ ضرورت ملازمہ کا اشتہار تھا "ایک پڑھی لکھی' خوش اطوار نوجوان ملازمہ کی ضر
ہے جو ایک عمر رسیدہ شخص کی دیکھ بھال کرسکے۔ اگر نرسنگ کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی
بہتر ہے۔ اپنے مکمل کوائف کے ساتھ خود ملیں۔ تنخواہ معقول دی جائے گی۔" یہ ا
کسی عبدالباقر نامی شخص کی طرف سے تھا لیکن ایڈریس اور فون نمبر خان رحیمی ک
جان محمد کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ عبدالباقر خان رحیمی کا کوئی عزیز ہے جس نے
رحیمی کی طرف سے اشتہار دیا ہے۔ جان محمد کے ذہن میں ایک بات آئی۔ وہ پال پ
ہائی سکول کی ایک استانی کو جانتا تھا' اسے باہمی چپقلش کی بنا پر ہیڈ مسٹرس نے ملازمت
علیحدہ کرا دیا تھا اور وہ بیچاری ان دنوں بیروزگار تھی۔ جان محمد نے سوچا کیوں نہ زر
اس لڑکی کو اس ملازمت کے بارے بتایا جائے۔ اگر وہ ملازم ہو کر خان رحیمی کے
گھس جاتی تو اندرون خانہ رازوں تک رسائی حاصل کرسکتی تھی۔ یوں اس کی پیر

مسئلہ بھی حل ہوتا اور جان محمد کی مطلب براری بھی ہو جاتی۔ اس نے زرینہ سے بات
کی۔ وہ تیار ہوگئی۔ اشتہار میں دیئے ہوئے پتے پر جا کر اس نے انٹرویو دیا لیکن ناکام
ہوئی۔ وہاں اس سے زیادہ پڑھی لکھی اور خوبصورت ایک لڑکی موجود تھی اور اسے ہی
چن لیا گیا۔ تاہم زرینہ کو کل وقتی گھریلو کام کاج کے لئے ملازمت کی پیش کش کی گئی جسے
وہ ٹھکرا کر واپس آگئی۔ اس کے بعد جان محمد اس سلسلے میں کچھ نہ کرسکا یہاں تک کہ اسے
موت نے آلیا۔"

میں خاموشی سے چودھری شہاب کی باتیں سن رہی تھی۔ دل میں ایک عجیب ترنگ
سی پیدا ہو رہی تھی۔ کہتے ہیں پانی اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیتا ہے۔ فرحان کی موت کا انتقام
بھی سیلاب کے ایسے تندوتیز پانی کی مانند تھا جو اپنی راہ تلاش کر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں
اتنی سکت نہیں تھی کہ جاگیردار وہاب کے درجنوں محافظوں کی طاقت کو ناکام بنا کر اس کی
گردن تک پہنچ سکتے۔ نہ ہی ان ناتواں ہاتھوں کو دستک کے لئے قانون کے دروازے تک
پہنچنے دیا جا رہا تھا۔ اب پھر کون سا راستہ رہ جاتا تھا۔ میں گھپ اندھیرے میں چاروں طرف
دیکھ رہی تھی اور چودھری شہاب کی باتیں اس اندھیرے میں ایک روشن کرن کی طرح
تھیں۔ میرے سینے میں ایک لہر سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں
چودھری شہاب سے کہا۔

"چودھری! کیا وہ ایڈریس تم مجھے دے سکتے ہو؟"

چودھری کچھ دیر خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر دبا دبا
جوش نظر آنے لگا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا "کیا آپ........ کیا آپ........ میرا مطلب
ہے........ اوہ میرے دماغ میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں
سمجھ رہا ہوں آپ کی بات آپ وہاں جانا چاہتی ہیں نا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا........ وہ بولا "آپ کا فیصلہ تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ
کو ذرا دھیان سے رہنا ہوگا۔ سنا ہے خان رحیمی کچھ خبطی سا شخص ہے........ میرا
مطلب ہے عورتوں کے بارے میں' ایسے بندے خطرناک بھی ہوتے ہیں........"
چودھری شہاب کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ دھیمے لہجے میں بولا "دیکھیں جی' آپ پڑھی
لکھی عقل والی ہیں۔ آپ کی عقل اور طرح کی ہے' ہماری اور طرح کی' جو کام بھی کریں

اپنی ذمے داری پر کریں اور اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ میں نے تو جیل میں ہونا ہے ایسی ویسی بات ہوگئی آپ کے ساتھ تو بڑی مشکل ہوگی۔"

میں نے کہا "چودھری! میں جو کہہ رہی ہوں سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں..... لیکن ایک بات بتا........... تو بھی تو کسی باز وغیرہ کے چکر میں ہے........... یہ سارا ایک معاملہ تو نہیں؟"

چودھری کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میرے اس سوال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ بمشکل سنبھل کر بولا

"آ........... آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"تمہارے بندوں کی باتوں سے۔"

اپنی کھردری داڑھی پر ہاتھ کی پشت کھجا کر بولا "نہیں بی بی جی! یہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے' جاگیردار وہاب کے معاملے سے یا خان رحیمی سے کوئی میل نہیں اس کا..... اچھا میں آپ کو خان رحیمی کا ڈریس دیتا ہوں" اس نے معقول نظر آنے کی کوشش میں "ایڈریس" کا حلیہ بگاڑتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر ایک الماری تک گیا اور کئی ماہ پرانے اخبار کا ایک چھوٹا سا تراشا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ باز والا معاملہ کر رہا ہے۔ میں بغور اشتہار دیکھنے لگی۔ تقریباً چار ماہ پرانی بات تھی۔ ناممکن سی بات کہ ابھی تک کیئر ٹیکر یا گھریلو ملازمہ کی آسامی خالی ہو' بہرحال میں کوشش کرنا چاہتی تھی۔

رات گزر چکی تھی اور رات کے ساتھ ہی رات کے واقعات بھی بیت چکے تھے۔ نصف شب کے فوراً بعد پولیس نے چودھری شہاب کو گرفتار کر لیا تھا۔ میں اس وقت حویلی کی چھت پر کاٹھ کباڑ کی ایک کوٹھڑی میں موجود تھی۔ پولیس کے جانے کے بعد حمیدہ نے مجھے کوٹھڑی سے نکالا تھا اور رازداری کے ساتھ چودھری شہاب کے کمرے میں لے آئی تھی۔ بہن بھائی کے سوا کسی کو میری موجودگی کا علم نہیں تھا۔ چودھری شہاب حمیدہ کو سب کچھ سمجھا کر گیا تھا۔ اس نے راتوں رات میری روانگی کا بندوبست کر دیا۔ ایک قمیض اس نے سلائی مار کر میرے لئے چھوٹی کر دی اور ایک قدرے پرانی شلوار کے ساتھ میچنگ بھی کر دی۔ مجھے نئی طرز کا برقعہ درکار تھا۔ جس کا انتظام نہیں ہو سکا۔ حمیدہ ہی کی ایک ریشمی چادر سے کام چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پوری طرح تیار ہو کر میں

الصبح چودھری کے ایک ادھیڑ عمر ملازم کے ساتھ حویلی سے نکل آئی۔ اکبر نامی اس ملازم نے بطور "ایک پڑوسی" خان رحیمی کے ڈیرے تک میرے ساتھ جانا تھا۔ ہمارا دشوار گزار سفر شروع ہوا۔ پہلے ٹانگیں' پھر تانگہ پھر بس اور آخر میں ایک بار پھر تانگہ۔ تب پاؤں پاؤں چلتے ہم سندری گاؤں کے نواح میں خان رحیمی کی زمین پر جا پہنچے۔ ہمارا یہ سفر جب اختتام پذیر ہوا تو شام کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ جسم تھکن سے چور تھا اور دل انجانے خدشوں سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ ڈر صرف ایک ہی تھا کہیں خان رحیمی کے ملازمین میں کوئی ایسا ملازم نہ ہو جو اس سے پہلے بڑی حویلی رہ چکا ہو اور مجھے پہچان لے۔ دور ہی سے خان کی رہائش گاہ نظر آگئی۔ ایک پیشہ ور شکاری ہونے کے علاوہ خاصا کھاتا پیتا شخص دکھائی دیتا تھا۔ کوٹھی بہت پرانی تھی مگر اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔ لان ترشے ہوئے تھے۔ ایک طرف ٹیرس تھا جو بعد میں بنایا گیا تھا مگر کوٹھی ہی کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ کوٹھی کے مین گیٹ تک سرخ کیری کی سڑک تھی ہم گیٹ پر پہنچے تو ایک سخت گیر چوکیدار نے راستہ روکا۔ میں نے اخبار کا تراشا دکھا کر مدعا بیان کیا۔ اس دوران لمبے قد کا ایک صحت مند نوجوان ڈگ بھرتا ہوا گیٹ پر آگیا۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ لباس پتلون جیکٹ پر مشتمل تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

اکبر نے کہا "جی ہم آپ کا یہ اشتہار پڑھ کر آئے ہیں یہ میری..........."

"وٹ اے نان سینس" وہ بات کاٹ کر بولا "چار ماہ بعد آپ کو اب خیال آیا ہے........... ہم دے چکے ہیں ملازمت۔"

وہ واپس جانے کے لئے مڑا تو میں نے کہا۔

"پلیز! ذرا سنئے میں دراصل..........." وہ رک کر گھورنے لگا' میں نے سنبھل کر کہا "دراصل میں رحیمی صاحب کو بہت پہلے سے جانتی ہوں' ان کی فین ہوں میں' اتنی دور سے آئی ہوں۔ اگر ایک بار ان سے میرا مطلب ہے ملازمت نہ سہی' ملاقات ہی ہو جاتی ان سے۔"

میری بات جلتی پر تیل کا کام کرگئی۔ وہ غرا کر بولا "آپ چاہتی کیا ہیں؟ یہاں کوئی درختوں پر نوٹ نہیں لگتے' غلط بتایا ہے آپ کو جس نے بتایا ہے۔ جائیے آپ یہاں سے'

میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔"

اتنے میں ایک گاڑی کیری کی سڑک پر مڑی اور تیزی سے ہمارے قریب آگئی۔ گاڑی کو دیکھتے ہی چوکیدار نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔ میں نے دیکھا پرانی شیورلیٹ کی پچھلی سیٹ پر ایک ستر اسی سالہ بوڑھا ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سفید بال' سفید مونچھیں اور بھنویں' اس کے چہرے کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط تھیں۔ دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس شخص نے پوری زندگی جفاکشی میں گزاری ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ وہ بھی کوئی شکاری قسم کی چیز نظر آتے تھے۔ بوڑھے نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور نوجوان سے پوچھا "باقر! کیا بات ہے؟" نوجوان کے بولنے سے پہلے ہی وہ بولا۔

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا" اس نے مڑ کر ایک تیز نظر میرے چہرے پر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں ایک نمایاں چمک عود کر آئی "ملازمت کے لئے آئی ہو؟"

"جج........ جی سر" میں نے جواب دیا۔

"اوکے........ اوکے مل جائے گی۔"

نوجوان باقر نے احتجاجی انداز میں منہ کھولا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی الفاظ واپس لے لئے اور تیز قدموں سے چلتا ٹیرس کی طرف چلا گیا۔ بوڑھا جو یقیناً خان رحیمی تھا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ملائم لہجے میں بولا۔

"کم آن گرل ود یور........؟" فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ اکبر کا تعارف چاہ رہا تھا۔

"انکل........ ہمارے پڑوسی ہیں یہ' میرے ساتھ آئے ہیں لاہور سے" میں نے خان رحیمی کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"اوہ گڈ........ ویری گڈ' لے آؤ ان کو بھی۔"

تھوڑی دیر بعد ہم خان رحیمی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ حسب توقع یہ ڈرائنگ روم جانوروں اور پرندوں کی ٹرافیوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف حنوط شدہ سر اور سرٹیفیکٹس فریموں کے اندر سجے ہوئے تھے۔ خان رحیمی کا سر ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

"دیکھو مس!" اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "جس آسامی کے لئے تم آئی ہو وہ تو پر ہو چکی ہے........ ہاں اگر تم اپنے کچھ ایکسٹرا ٹیلنٹ ثابت کر دو تو میں تمہیں ملاز

رکھ سکتا ہوں لیکن میرے گھر کی ملازمت کی دوسری لازم شرط خوش باشی ہے اور خوش باشی مجھے تمہارے چہرے پر دور دور نظر نہیں آ رہی۔"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا "لیکن سر! آپ نے پہلی شرط تو بتائی ہی نہیں۔"

"پہلی شرط تم پوری کر چکی ہو' اس لئے بضرورت نہیں سمجھی۔ میرا مطلب ہے' یو آر بیوٹی فل!"

میں نے عام سے لہجے میں کہا "سر یہ آپ کی نگاہ کی خوبصورتی ہے۔"

وہ بے تکلفی سے بولا "نو فارمیلیٹیز" رسمی باتوں سے مجھے چڑ ہے۔ میں مار بیٹھتا ہوں پر تکلف شخص کو........ لطیفے آتے ہیں تمہیں' آئی مین جوکس!"

"یس سر........ کچھ کچھ۔"

"کچھ کچھ نہیں چلے گا یہاں جو چلے گا "بہت کچھ" چلے گا۔ اچھا کوئی لطیفہ سناؤ۔"

میں خاموش رہی "بتاؤ........ بتاؤ" وہ تیزی سے بولا "شو می یور کوالیفیکیشن' اٹ از نو' تھنگ بٹ یور کوالیفیکیشن" میں ابھی سوچ رہی تھی کہ وہ پھر بولا۔

"ویری سیڈ" لطائف کے بارے میں تمہاری معلومات بہت محدود ہیں........ کوئی گھسا پٹا لطیفہ بھی تمہارے ذہن میں نہیں آیا۔ خیر لطیفہ یوں ہے کہ ایک شخص کے اوپری جسم پر کوٹ اور ٹائی تھی۔ نیچے پائجامہ باندھ رکھا تھا۔ پوچھنے والے نے پوچھا........ بھائی یہ کیا؟ اوپر کوٹ کیوں پہن رکھا ہے؟ وہ بولا میاں گھر میں کوئی مہمان ہی آ جاتا ہے۔ اس نے پوچھا تو نیچے پائجامہ کیوں ہے' وہ بولا "کسی وقت مہمان نہیں بھی آتا........ حد ہو گئی۔ کوئی لطیفہ بھی تمہیں یاد نہیں۔ اچھا اب بتاؤ اس لطیفے سے کون سا اچھا لطیفہ جڑتا ہے؟"

مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا یہ کیسے شخص سے پالا پڑا ہے۔ دماغ تو درد کا پھوڑا بنا ہوا تھا۔ لطائف کہاں سے یاد آتے۔ بہرحال خبطی کا سامنا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دے کر اور چہرے پر مسکراہٹ لا کر کہا "سر! ایک لطیفہ ذہن میں آتا ہے کہ بسیار خور مہمان سب کچھ چٹ کر گیا۔ میزبان کا بچہ رونے لگا۔ ماں نے آہستہ سے پوچھا "کیوں روتا ہے؟" وہ بولا "بھوک لگی ہے" ماں بولی "ذرا صبر کر" یہ پیٹو چلا جائے تو سب مل کر روئیں گے۔"

خان رحیمی نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور انگلی نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"لطیفہ اچھا ہے لیکن برمحل نہیں" اس جگہ پائجامے کے حوالے سے وہ ہاتھی اور چوہے والا لطیفہ زیادہ سوٹ کرتا ہے۔"

"کون سا چوہے والا؟"

"ویری سیڈ.......... ویری سیڈ" خان رحیمی نے بے پناہ افسوس سے سر ہلایا تمہیں تو کچھ پتہ نہیں.........."

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اچانک راہداری کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ خان رحیمی چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شلوار قمیض اور آدھے بازو کا نیلا سویٹر پہنے ہوئے ایک شخص دہلیز پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور شاٹ گن تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" خان رحیمی نے گرج کر پوچھا۔

وہ سلام کرکے اندر آیا اور مؤدبانہ انداز میں خان رحیمی کے کان کے پاس جھک گیا۔ اس نے جو کچھ بتایا کافی سنسنی خیز تھا کیونکہ بوڑھے رحیمی کی مونچھیں دھیرے دھیرے پھڑکنے لگیں تھیں۔

"پیچھا.......... سائیکل.......... غائب" اس طرح کے اکادکا لفظ ہی میری سمجھ میں آسکے۔ "دفعتاً خان رحیمی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے نوجوانوں کی طرح لپک کر پاس کی دیوار سے ایک طاقتور رائفل اتاری اور نیلے سویٹر والے کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے آدمی دروازے کی طرف جارہے تھے۔ ان سب کے قدموں میں ہنگامہ خیز تیزی تھی۔

میں اپنی جگہ حیران پریشان بیٹھی رہی۔ اتنے میں کٹے ہوئے بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی جدید فیشن کے کپڑوں میں ملبوس کمرے میں آگئی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی "میرا نام شوقیہ ایاز ہے' تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رحیمی صاحب تمہیں ملازم رکھ چکے ہیں۔ اب تمہیں لطیفے آتے ہوں یا نہیں' اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا' ہاں رحیمی صاحب حس مزاح کو بے حد پسند کرتے ہیں اگر یہاں ہاتھ پاؤں پھیلانا چاہتی ہو تو ہر صورت میں خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔"

لڑکی کے لہجے میں ہلکی سی کاٹ بھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہی وہ صاحبہ ہیں جنہیں رحیمی صاحبہ کی ذاتی خادمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ غالباً وہ کمرے کے باہر سے ہماری گفتگو بھی سنتی رہی تھی۔ اس کے کہنے پر میں نے بھی جواباً اپنا تعارف کرایا۔ یہ جان کر کہ میں لاہور سے آئی ہوں' وہ نخوت سے بولی۔

"ہاں ہم مڈل کلاس والے روٹی کی تلاش میں دور دور تک مار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو روندتے کچلتے روٹی کی طرف بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں.......... ویسے کیا کیا کرسکتی ہو؟"

میں نے کہا "ہر وہ کام جس سے عزت و وقار پر حرف نہ آئے کرسکتی ہوں۔"

وہ بولی "عزت و وقار ناپنے کا کوئی مخصوص پیمانہ نہیں ہوتا۔ حالات کے ساتھ سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔ میں نے انگلینڈ میں بعض ہم وطنوں کو بڑے وقار سے جھاڑو دیتے بھی دیکھا ہے۔"

"میں اب بھی پروقار انداز میں جھاڑو دے سکتی ہوں" میں نے مسکرا کر کہا۔

شوقیہ ایاز سے کافی دیر بات چیت ہوتی رہی۔ وہ خود کو عقل کل سمجھنے والی ایک ہوشیار لڑکی تھی۔ مجھے ایک ساتھی ملازمہ کی بجائے وہ رقیب کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی' نہ جانے کیوں؟ میں نے کوشش کی کہ اس سے معلوم کرسکوں کہ خان رحیمی اور اس کے کارندے اتنی سردی میں کہاں نکل گئے ہیں۔ لیکن کچھ نہ جان سکی.......... ایک پرتکلف کھانا کھلانے کے بعد شوقیہ ایاز نے مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ دس ضرب بارہ کا یہ کمرہ کوٹھی کے عقبی حصے میں تھا۔ پرانا کمرہ تھا لیکن خوب صاف ستھرا۔ سرونٹ کوارٹر سے قدرے بہتر اور عام رہائشی کمروں سے کم تر تھا۔ ساتھ والا کمرہ ایک بوڑھے خانساماں کا تھا۔ اس سے آگے شوقیہ کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ خان رحیمی کی خوابگاہ سے متصل تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا' ایک کھڑکی جو پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی بند کی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئی۔

حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ کل اس وقت میں پال پور کے چوہدری شہاب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور پرسوں اس وقت لاہور میں فرخندہ کے ساتھ گاڑی میں سینما ہاؤس کی طرف جارہی تھی۔ فرخندہ کا خیال آتے ہی میڈم نادرہ کا چہچہا

چلاتا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا اور میں سرتاپا لرز گئی.......... گاڑی کے زور سے اچھل کر وہ دیوار سے ٹکرائی تھی' پھر میں نے وہ پُر ہول جھٹکا محسوس کیا تھا جس نے مجھے سمجھایا تھا کہ ٹائر میڈم نادرہ کے گوشت کو کچلتا ہوا گزر گیا ہے اور پھر دوسرا جھٹکا.......... اوہ میرے خدا' میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ تو کیا میں سچ مچ قاتلہ بن چکی ہوں۔ کیا میں نے میڈم نادرہ کا خون کر دیا ہے۔ میں سوچتی رہی اور خوف سے کانپتی رہی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ پولیس میری تلاش میں چاروں طرف بھاگ رہی ہے۔ میرے میکے' میرے سسرال' ریلوے سٹیشن' لاری اڈے' دارالامان' ہر جگہ میری تلاش ہو رہی ہے۔ کسی نامعلوم احساس کے تحت میں لحاف میں کچھ اور دبک گئی' قریب ہی انگیٹھی رکھی تھی' کچھ ادھ جلی لکڑیاں بھی تھیں لیکن مجھ میں اٹھ کر آگ جلانے کی ہمت نہیں تھی۔ یکایک ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آہٹ بالکل پاس سے سنائی دی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس بند کمرے میں میرے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ کوئی جیتا جاگتا جسم۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ لکڑی کی ایک قد آدم الماری کے عقب میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ میرا اندیشہ مجھے کھینچتا ہوا اس خلا کی طرف لے گیا۔ دھڑکتے دل اور چڑھی سانس کے ساتھ میں نے احتیاط سے الماری کے عقب میں دیکھا اور جسم سنسنا کر رہ گیا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑیں۔ وہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا تھا۔ اس نے ملیشیا کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گھٹنے پیٹ سے لگائے وہ گٹھری بنا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے شیشے میں خوف جم کر رہ گیا تھا۔ میں بھی کم خوفزدہ نہیں تھی۔ میں نے انگلی اس کے چہرے کی طرف اٹھائی اور سرسراتی آواز میں پوچھا "کون ہے تو؟" وہ بٹر بٹر دیکھتا چلا گیا۔ شاید بھاگنے کی کوئی راہ ہوتی تو بھاگ ہی جاتا۔ میں نے تیزی سے جائزہ لیا کہ کہیں اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں' وہ نہتا تھا۔ اس کی بائیں ابرو پر ایک تازہ زخم تھا۔ زخم سے بہنے والا خون بائیں رخسار پر خشک ہو چکا تھا۔ اس کی خاموش آنکھوں میں جھانکنے کے بعد نہ جانے کیوں میرا خوف ایک دم کم ہو گیا۔ وہ مجھے چور اچکے سے زیادہ ایک بھگوڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور آگے بڑھ کر پوچھا "کون ہے تو؟" وہ پھر بھی خاموش رہا میں نے کہا "چل نکل باہر.......... باہر نکل ورنہ میں آواز دیتی ہوں چوکیدار کو" میری دھمکی کے بعد اس کے جسم میں

تھوڑی سی جنبش پیدا ہوئی اور وہ کھسکتا ہوا باہر آ گیا۔ خاصا دراز قد تھا۔ مجھ سے ایک دو انچ زیادہ ہی ہو گا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے کیوں چھپے ہوئے ہو یہاں؟"

اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی "میں چور نہیں ہوں جی' میں ڈر کر یہاں آ گیا ہوں۔ میرے پیچھے کچھ بندے ہیں۔ میں اندر نہ آتا تو وہ مار دیتے مجھے۔"

"تمہیں پتہ ہے یہ کس کی کوٹھی ہے؟"

"نہیں جی!" میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں کہیں یہ.......... یہ خان رحیمی کا ڈیرہ تو نہیں!"

"ہاں ڈیرہ تو خان رحیمی کا ہی ہے" اس کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہوئے۔

وہ بولا "مجھے معاف کر دیں جی میں بغیر پوچھے آپ کے گھر میں گھس گیا ہوں' میری نیت بری نہیں تھی جی۔"

"تیرے پیچھے کون لوگ ہیں؟"

"وہ جی میرے مامے کے دشمن ہیں' پرانی دشمنی ہے میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔"

اس کے بعد اس نے ڈرے ڈرے انداز میں جو کچھ بتلایا اس سے مجھے پتہ چلا کہ وہ ڈیک نالے کے اوپر کی طرف سات آٹھ میل دور رنگی پورہ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں اپنے ماموں کے پاس جا رہا تھا کہ کچھ لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور وہ سائیکل پر تھا اس نے بہت سائیکل بھگائی آخر ایک جگہ گر گیا قریب تھا کہ پیچھے سے آنے والے اسے پکڑ لیتے کہ اس نے ایک جوہڑ میں چھلانگ لگا دی اور نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا کافی دور نکل گیا۔ پھر بھی گھڑسواروں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخر وہ اس کوٹھی میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر آیا اور اس کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر آ کر چھپ گیا۔

لڑکے کی باتوں میں جھوٹ کی آمیزش محسوس ہو رہی تھی۔ خاص طور پر میں سائیکل کے ذکر پر چونک گئی۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے خان رحیمی کے کارندے نے جو اس کے کان میں کھسر پھسر کی تھی اس میں بھی سائیکل کا ذکر آیا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو

رہی تھی کہ کہیں یہ بھی وہی چکر نہ ہو۔ اپنی پوری روئیداد سنانے کے بعد لڑکا مجھ سے درخواست کرنے لگا کہ میں اس کی یہاں سے نکلنے میں مدد کروں۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ چور نہیں ہے اور اس نے اس سے پہلے اس طرح کی حرکت نہیں کی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ مظلوم نظر آ رہا تھا پتہ نہیں حقیقت میں کیا معاملہ تھا۔ اگر میرا سائیکل والا قیافہ درست تھا تو بھی لڑکے کا خان رحیمی کے قبضے میں آنا درست نہیں تھا۔ معلوم نہیں بیچارے کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ اب جب کہ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ مجرم اور قصوروار نہیں ہے تو مجھے اسے روکنا نہیں چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ وہ مجھے سچ سچ بتا دے تو میں اسے خاموشی سے باہر نکال سکتی ہوں۔ دوسری صورت میں مجھے خان رحیمی کو بتانا پڑے گا۔ لڑکے کا رنگ زرد ہوگیا لیکن وہ تھا کایاں۔ سچی بات اس کی زبان پر نہیں آئی وہ پہلے والی کہانی معمولی ردوبدل کے ساتھ دہرانے لگا۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

بہرحال اس کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اسے جانے دوں نہ میں اسے پکڑنے والی تھی اور نہ چھوڑنے والی وہ خود ہی یہاں آیا تھا اور خود ہی جا رہا تھا۔ لیکن جب میں نے باہر نکل کر اردگرد کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ لڑکے کا اتنی آسانی سے یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ بیرونی دیوار کافی اونچی تھی اور دیوار کے عین نیچے ٹین کے چھجے تلے دو مسلح افراد آگ جلائے بیٹھے تھے غالباً دونوں پہریدار تھے۔ ایسے ویران علاقوں میں بوقت شب گھر والوں کا چوکس رہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے معلوم نہیں جب حنیف نامی لڑکا اندر کودا تو یہ دونوں آدمی کہاں تھے۔ بہرحال اب وہ انہیں چکمہ دے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں گاڑیوں کا شور سنائی دیا یہ ایک سے زائد گاڑیاں تھیں اور ان میں جیپ بھی تھی جس میں خان رحیمی دو گھنٹے پہلے یہاں سے نکلا تھا۔ جلد ہی کوٹھی کے طول و عرض میں قدموں کی ٹھک ٹھک اور گفتگو کی گونج سنائی دینے لگی یہ کافی افراد تھے اور غالباً خان رحیمی کے ڈرائنگ روم میں جمع ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا ٹین کی چھت تلے ایک اور رائفل بردار آگیا تھا اس کے علاوہ بیرونی گیٹ پر بھی چوکیدار مستعد نظر آنے لگا تھا.......... صورت حال ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ لڑکا نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکتا۔ میں نے کمرے میں واپس جا کر اسے

بتایا۔ اسی دوران دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی وہ گھبرا کر الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے شوقیہ کھڑی تھی۔ وہ قدم بڑھا کر کمرے کے وسط میں آگئی۔ تحکمانہ انداز میں بولی۔

"خان جی کے مہمان آئے ہیں۔ پندرہ بیس آدمی ہیں۔ رات یہیں رہیں گے، تم مہمان خانے میں ان کے بستر وغیرہ بچھا دو اور پھر کچن میں کریم بخش اور سلطانہ کا ہاتھ بٹاؤ۔"

میں نے خوشدلی سے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ناک سکوڑ کر بولی "بو سی آ رہی ہے کہیں تمہارے کپڑوں سے تو..........؟"

"نہیں.......... ہاں" میں نے جواب دیا "میں ابھی بدل لیتی ہوں۔"

وہ ہونٹوں کو معاندانہ جنبش دیتی باہر نکل گئی۔ یہ بو حنیف کے کپڑوں سے اٹھ رہی تھی۔ جوہڑ میں کودنے سے اس کو کافی گارا کیچڑ لگا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور حنیف سے کہا وہ باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ مارا جائے گا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا بوسیدہ گدیلا دیا اور سمجھایا کہ وہ وہیں الماری کے پیچھے دبک کر بیٹھا رہے۔ بتی بجھا کر اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر میں مہمان خانے کی طرف چل دی۔ کچن کے سامنے سے گزرنے لگی تو خانساماں کریم بخش کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔

"جی!" میں نے اندر جا کر کہا۔

"بی بی! ذرا ہاتھ بٹاؤ، کھانا جلدی تیار کرنا ہے۔"

"لیکن میاں جی! وہ شوقیہ صاحبہ تو کہہ گئی ہیں پہلے بستر بچھا آؤ۔"

"اس لومڑی کو گولی مارو" باورچن سلطانہ نے کہا۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک نوجوان خوبصورت عورت تھی "بچھالیں گے بستر بھی، پہلے تم یہ مچھلی صاف کرو۔"

اس نے فریزر میں لگی ہوئی پانچ چھ کلو چھوٹی مچھلی میری طرف بڑھا دی۔ کچن میں خوب رونق تھی۔ ایک طرف بکرے کی پانچ چھ رانیں روسٹ کی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف کڑاہی گوشت بنایا جا رہا تھا۔ تکوں کا سامان علیحدہ پڑا تھا۔ یہ تکے کسی پرندے کے تھے، شاید مرغابی وغیرہ ہوگی۔ بعد میں پتہ چلا کہ رانیں بھی بکرے کی نہیں ہرن کی تھیں۔

زندگی میں پہلی دفعہ ہرن کا گوشت پکتے دیکھا۔ کوئی پون گھنٹہ کچن میں مصروف رہنے کے بعد میں مہمان خانے بستر بچھانے چلی گئی۔ ایک ہال کمرے میں دس اور دو چھوٹے کمروں میں چار چار بستر بچھانا تھے۔ چھوٹے کمرے میں بستر بچھاتے ہوئے مجھے ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو کسی حد تک سنائی دینے لگی۔ گفتگو کے دوران گاہے گاہے خان رحیمی کے زندگی سے بھرپور قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ گو اس کی آواز میں لرزش تھی اور وہ رک رک کر بولتا تھا لیکن قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی ساری کمزوریاں دور ہو جاتی تھیں۔ یہ ایک بے تکلف محفل تھی۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ گفتگو باز کے شکار کے گرد گھوم رہی ہے۔ کسی خاص قسم کے باز کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اصغر نامی ایک شخص کا ذکر بھی بار بار آ رہا تھا۔ ایک بھاری آواز والے شخص نے سیالکوٹی لہجے میں کہا۔

"خان جی! وہ لڑکا ہے کہیں آس پاس ہی' میرا دل کہتا ہے کہ وہ دور نہیں گیا۔"

ایک دوسری آواز آئی "میرا تو خیال ہے یہ سنہری موقعہ گنوانا نہیں چاہئے کیوں نہ آج نیند قربان کر دی جائے' کھانا کھا کر پھر نکل چلتے ہیں۔"

خان رحیمی نے کہا "ایسا کرو کہ چار گروپ بنا کر چار علاقے بانٹ لو۔ ٹارچیں لالٹینیں وغیرہ میرے پاس بہت ہیں۔ دس گیارہ بجے تک اسے تلاش کرو۔ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ اس علاقے سے نکل گیا ہے۔ پھر نیند خراب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ واپس آکر آرام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد دوبارہ نکل چلیں گے۔ اس تجویز کے حق میں دو تین آوازیں بلند ہوئیں.......... میں یہ سب سن رہی تھی اور میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گفتگو اسی حنیف نامی لڑکے کے بارے میں ہو رہی ہے۔ سوچنے کی بات تھی کہ خان رحیمی اور اس کے اتنے سارے دوست احباب اس معمولی سے لڑکے کے درپے کیوں ہو رہے ہیں اور اس خاص قسم کے باز سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازیں مجھے ایک اور شبے میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ان میں چند آوازیں میں نے پہلے بھی سنی ہوئی تھیں۔ اپنے شبہات کی تصدیق کے لئے میں مہمان خانے کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی اور چند قدم صحن میں چل کر ایک ادھ کھلے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ صحن میں چونکہ مکمل تاریکی تھی۔ میں ڈرائنگ روم کے کچھ حصے کا جائزہ لے سکتی تھی۔ میں نے دیکھا' دو تین قیمتی

تپائیوں پر چائے اور قہوے کے برتن رکھے ہیں اور امیرانہ حلئے والے کئی بارعب افراد یہاں وہاں صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک دو مقامی دیہاتی بھی تھے۔ ایک شخص کا چہرہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گئی۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا یہ شخص شہاب کے خاص آدمیوں میں شامل تھا۔ یہ ان چند مفروروں میں سے تھا جو چودھری شہاب کے خفیہ ڈیرے پر رہ رہے تھے۔ اس شخص کو دیکھتے ہی میں پیچھے ہٹ گئی۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہاں جس باز کا تذکرہ ہو رہا ہے یہ وہی ہے جس کے پیچھے چودھری شہاب اور اس کے بندوں کی نیندیں بھی حرام ہو رہی ہیں۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی اس باز میں' جو اتنے سارے لوگ اس کی کھوج میں تھے۔ مہمان خانے میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے میں پھر ان کی باتیں سننے لگی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ دو تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک گروہ چودھری شہاب کے آدمیوں کا بھی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ دراصل تین چار شکاری پارٹیاں تھیں جو اب تک اپنے اپنے طور پر اس پرندے کو تلاش کر رہی تھیں اور اب انہوں نے مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو سنسنی خیز انکشاف مجھ پر ہوا وہ یہ تھا کہ میرے کمرے میں چھپے ہوئے حنیف نامی لڑکے کا اس باز سے گہرا تعلق ہے' شاید وہ لڑکا اس باز کے شکار میں مدد دے سکتا تھا' یا وہ باز اس کی تحویل میں تھا؟

کچھ دیر بعد مہمانوں نے پرتکلف کھانا کھایا۔ اس دوران ان کے گھوڑوں کو بھی دانہ پٹھا دیا جا چکا تھا۔ دو تین مہمان سونے کے لئے مہمان خانے میں آگئے۔ باقی سب رائفلوں اور شاٹ گنوں سے مسلح صحن میں جمع ہو گئے' ان کے ساتھ خان رحیمی کے ملازمین ٹارچیں لالٹینیں وغیرہ تھامے ہوئے تھے۔ کئی ایک کے ہاتھ میں لاٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد چار گاڑیوں اور دس پندرہ گھوڑوں پر مشتمل یہ جلوس سرخ کیری والے راستے پر سفر کرتا ہوا گھنے درختوں کی طرف جا رہا تھا۔

کام کاج سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے الماری کے پیچھے جھانکا.......... لڑکا وہیں موجود تھا۔ یہ تمام عرصہ اس نے جاگ کر گزارا تھا' میں نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ فرمانبرداری سے باہر نکل کر چارپائی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ گدیلا بدستور اس کے کندھوں پر تھا۔

میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "دیکھو! مجھے سچ سچ بتا دو تم نے کیا کیا ہے؟ خا
رحیمی اور اس کے بندے ہر طرف تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ سخت غصے میں ہی
پکڑے جاؤ گے تو زندہ نہیں چھوڑیں گے.........."

لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ بولا "باجی! میں نے آپ سے کو
بات نہیں چھپائی ہے' سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں چھپائی ہے؟" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ نفی میں س
ہلانے لگا۔ میں نے کہا "وہ باز کہاں ہے جس کے لئے بندے تمہارے پیچھے پڑے ہو
تھے؟" میرے اچانک سوال پر لڑکے کے ہونٹ پھڑک کر رہ گئے۔ اس کی آنکھوں میں بے
پناہ تحیر نظر آیا۔

"کون سا باز؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"وہی جو تمہارا نہیں ہے اور جسے راستے میں کہیں چھپا آئے ہو" میں نے اپ
ادھوری معلومات کے سہارے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ یہ تیر کچھ کچھ نشانے پر لگا۔ لڑکے
کا اعتماد ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں نے کہا "خان رحیمی کی زبانی مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا
ہے۔ اب بتاؤ تمہاری سزا کیا ہونی چاہئے؟"

وہ پہلی بار قدرے خودسری سے بولا "وہ باز میرا ہے میں نے اسے پکڑا تھا۔ و
سخت زخمی تھا۔ آنکھیں بالکل بند تھیں' اور گردن پر بھی ڈونگا پھٹ تھا' میں حکیم صادق
سے اسے دوا لے کر نہ کھلاتا اور مرہم پٹی نہ کرتا تو وہ ایک دو گھنٹے میں ہی مر گیا ہوتا۔"

میں نے پوچھا "اچھا تم نے اسے پکڑا کیسے تھا؟"

وہ بولا "جمعے کا دن تھا جی' جمعے کے روز کام سے آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے۔
میں اپنے یار کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لئے نکل گیا۔ ہم بڑی چڑی اور گھگھی کے
نشانے لے رہے تھے کہ پچھلی طرف سے شاں شاں کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا ایک
باز اور ایک موٹا تکور بڑی تیزی سے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ دونوں ایک دوسرے
سے جڑے ہوئے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا' باز ایک کیکر کی اونچی ٹہنی سے ٹکرایا اور قلا
بازی کھا کر نیچے ایک جھاڑی میں گرا۔ میں بھاگ کر وہاں پہنچا۔ باز کانٹوں میں پھنسا ہوا
پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے جھٹ اپنا کرتا اتار کر اس پر پھینکا اور پکڑ لیا۔ میرا سارا کرتا پھاڑ دیا

اس نے اور سجے ہاتھ کا انگوٹھا بھی زخمی کر دیا.......... یہ دیکھیں" اس نے اپنے ہاتھ کا
انگوٹھا دکھایا اس پر دو تین ماہ پرانا ایک گہرا زخم تھا۔ غالباً پرندے کی چونچ کا تھا۔ "..........
لیکن میں نے بھی نہیں چھوڑا جی اسے' اس کے سر پر اپنی ایک جراب چڑھا دی اور حکیم
صادق کے پاس لے گیا.........."

لڑکے نے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کس طرح زخمی باز کا علاج کیا اور اسے کھلا
پلا کر تندرست کر دیا.......... وہ ایک ہوشیار لڑکا تھا۔ کم عمر ہونے کے باوجود میرے سامنے
بڑی صفائی سے اپنا کیس پیش کر رہا تھا۔ اب وہ مجھ پر کچھ اعتماد بھی کرنے لگا تھا۔ لہٰذا
میرے پوچھے بغیر ہی باقی واقعات بھی بتاتا چلا گیا۔ اس نے کہا "ہمارے گاؤں کا ایک آدمی
بندے شاہ مجھے اس باز کا پانچ سو روپیہ دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اسے شکاریوں کے ہاتھ بیچ
دوں گا۔ ہمارے ہمسائے اصغر لوہار کو پتہ چلا تو اس نے کہا "میں تمہیں پندرہ سو روپیہ دوں
گا' باز مجھے دے دو" بندے شاہ کو پتہ چلا تو وہ بھی پندرہ سو روپیہ دینے لگا۔ ان دونوں میں
ضد چل گئی۔ دونوں باز خریدنا چاہتے تھے۔ دونوں ہی نقد پیسے دے رہے تھے۔ میری ماں
نے کہا بیٹا ہمسائے کا حق زیادہ ہوتا ہے تم اصغر کی بات مان لو' ویسے بھی وہ مجھے بہن کہتا
ہے۔ میں نے یہ بات مان لی۔ میرے ارادے کا پتہ بندے شاہ کو چلا تو اس نے ایک شام
مجھے اپنے کھیتوں میں بلایا۔ وہ ڈیرے پر اکیلا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "پترا! میں
اللہ بخشے تیرے باپ کے ساتھ کھیلا ہوں۔ تیرے لئے میرے دل میں درد ہے۔ میں تجھے
ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ پکھیرو جو تو نے پکڑا ہے اصغر کو مت دینا" میں نے پوچھا
"کیوں نہ دوں" وہ بولا "پترا اس پکھیرو کی قیمت وہ نہیں جو تیری ماں سمجھ رہی ہے یا تو سمجھ
رہا ہے.......... یہ بڑا مہنگا پکھیرو ہے کم از کم ستر اسی ہزار روپے کا" بندے شاہ کی باتیں
سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا میں یہ پکھیرو شہر لے جاؤں اور کسی اچھے شکاری کو
دکھا کر' اور سوچ سمجھ کر بیچوں۔"

بندے شاہ کی باتیں میرے دل کو لگیں۔ میں نے چاچے اصغر کو پکھیرو دینے سے
صاف انکار کر دیا۔ وہ ہم سے لڑنے لگا کہ ہم زبان دے کر مکر رہے ہیں۔ چاچے اصغر نے
میری ماں کے سامنے تین ہزار روپیہ نقد رکھ دیا اور کہا کہ بیٹے سے کہو کہ پکھیرو مجھے دے
دے۔ پر میں نے نہ بیچنے کا پکا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ چاچا اصغر دھمکیوں پر اتر آیا۔ کہنے لگا میں

پکھیرو چھین لوں گا اور پیسہ بھی ایک نہیں دوں گا۔ میں شکار لے کر چودھری کے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے چودھری صاحب بڑے بھلے مانس آدمی ہیں۔ مسجد میں امامت بھی خود کراتے ہیں۔ دو تین حج کر رکھے ہیں۔ اللہ ان کا بھلا کرے انہوں نے چاچے اصغر کو بلا کر ڈانٹا ڈپٹا اور کہا کہ خبردار جو لڑکے سے زبردستی پکھیرو لینے کی کوشش کی۔ اس وقت یہ اس کا مال ہے۔ وہ جو جی چاہے اس کا کرے۔ بیچے یا رکھے۔ چاچا اصغر چپ چاپ گھر آ گیا۔ اس نے ہم سے تو کوئی بات نہیں کی لیکن دل میں کھوٹ تھا۔ وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ باز میرے ہاتھ سے نکل جائے......... پرسوں کی بات ہے' رات گئے کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو وہ بندے شاہ تھا۔ وہ مجھے ایک طرف اندھیرے میں لے گیا اور بولا اصغر نے بڑا غلط کام کیا ہے۔ اس نے کچھ غلط قسم کے لوگوں کو میرے باز کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "سندری کے بیلے میں کچھ شہری لڑکوں نے باز پکڑنے کے لئے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اصغر نے ان سے رشوت لے کر تمہارے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ بڑے زور والے لوگ ہیں اب تمہاری خیر نہیں یا تو وہ پکھیرو کہیں چھپا دو یا یہاں سے نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "میں چودھری صاحب کو جا کر بتاؤں گا۔"

بندے شاہ بولا "وہ بڑے بڑے افسروں کے بیٹے ہیں۔ تمہارے چودھری صاحب کا زور ان کے سامنے نہیں چلے گا۔ ایسا کرو پکھیرو مجھے دے دو۔ میں اسے لے کر کہیں نکل جاؤں گا۔ بعد میں جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو واپس کر دوں گا۔ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔"

مجھے بندے شاہ کی باتوں پر پورا یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا اچھا سوچ کر بتاؤں گا۔ گھر آ کر ماں سے مشورہ کیا۔ اسے بھی بندے شاہ پر بھروسہ نہیں تھا۔ پھر اگلے ہی دن مجھے پتہ چل گیا کہ بندے شاہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کچھ شہری آدمی چودھری صاحب سے ملنے آئے۔ میں کھیت میں کام کر کے شام کو گھر آیا تو ماں نے بتایا کہ دوپہر سے کچھ شہری بابو چودھری کی حویلی میں آئے ہوئے ہیں اور چودھری صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ میں ڈرتا ڈرتا حویلی میں پہنچا۔ وہاں چودھری صاحب کے ساتھ دو بابو لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک کی آنکھیں بڑی بڑی اور لال سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا اور

ہاتھوں میں بھی مندریاں تھیں۔ مجھے وہ اچھا آدمی نہیں لگا۔ چودھری صاحب نے مجھے کہا کہ یہ صاحب لوگ تمہارا باز دیکھنا چاہتے ہیں۔ ذرا گھر سے لے آؤ۔ میں انکار کیسے کر سکتا تھا......... انہوں نے اپنا ایک بندہ بھی میرے ساتھ بھیج دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی بابو لوگ ہیں جن کے بارے میں بندے شاہ نے بتایا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ باز لے کر کسی صورت حویلی نہیں جاؤں گا۔ میں گھر گیا۔ وہاں سے باز کو کپڑے میں لپیٹا اور پچھلی دیوار پھلانگ کر گاؤں سے نکل گیا۔ ساری رات ساتھ والے گاؤں میں ماسٹر خدا بخش کے گھر گزاری۔ ماسٹر جی کا لڑکا میرا پکا بیلی ہے۔ کل دوپہر کے وقت میں نے اس کی سائیکل لی اور اپنے ماموں کی طرف چل دیا۔ ماموں کا گاؤں ڈیک نالے کی دوسری طرف ہے۔ فاصلہ لمبا تھا' میں تیز تیز پیڈل چلاتا جا رہا تھا کہ درختوں سے نکل کر کچھ گھڑسوار میرے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں نے سائیکل اور تیز کر دی۔ ایک جگہ میں گر گیا۔ میں نے سائیکل وہیں چھوڑی اور کماد کے اونچے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آبادی کی طرف نکل گیا۔"

یہاں تک بتا کر لڑکا ایک دم ٹھٹھک گیا۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہوا کہ وہ اب جھوٹ بولے گا یا بات گول کر جائے گا۔ ایک بار تھوک نگل کر اس نے کہا "مجھے پتہ تھا کہ یہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے اور باز چھین لیں گے...... میں نے باز ایک جگہ......... چھپا دیا اور خالی ہاتھ ہی آگے بھاگنے لگا۔ اس کے بعد مجھے ایک چھپڑ میں چھال مارنی پڑی۔ آخر میں کسی نہ کسی طرح اس کوٹھی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔"

اپنی طویل روئیداد ختم کرنے کے بعد لڑکا خاموش ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور میرا اندازہ کہہ رہا تھا کہ اس کی نوے فیصد باتیں سچی ہیں۔ تاہم اس روئیداد کی اہم ترین بات وہ بڑی صفائی سے چھپا گیا تھا یعنی وہ باز اس وقت کہاں ہے' اس بارے میں اس کی زبان بند تھی۔

میں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ سارا معاملہ عجیب و غریب تھا۔ کئی گروہ اس باز کے پیچھے تھے۔ غالباً یہ ایک مہنگا اور نایاب باز تھا۔ میری معلومات بازوں اور ان کے ذریعے شکار کے بارے میں زیادہ نہیں تھیں تاہم اتنا میں نے پڑھا ہوا تھا کہ فالکن یعنی شاہین اور ہاک یعنی باز کی بعض اقسام نہایت قیمتی ہوتی ہیں اور انہیں شکار کے لئے سدھایا جاتا

ہے۔ ایک دفعہ بڑی حویلی میں واصف کا ایک دوست باز کی نسل کا ایک بڑا پرندہ لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسے گوزہاکس کہا جاتا ہے اور یہ گوزہاکس ایک دن میں سولہ خرگوش شکار کرنے کا ریکارڈ قائم کرچکا ہے.......... مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بازوں اور شاہینوں کو پکڑنے والے مطلوبہ پرندے کی تلاش میں سینکڑوں میل کا سفر طے کرتے ہیں اور جب ان کو کسی مقام پر پرندے کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے تو وہاں پکے ڈیرے ڈال لیتے ہیں.......... میرا خیال تھا کہ یہ باز بھی اسی طرح شکاریوں کی نظر میں آیا ہوا ہے اور وہ اس کی تلاش میں دیوانے ہو رہے ہیں۔

اب رات کے قریباً ساڑھے دس بج چکے تھے۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھیوں کا ابھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ میرے کمرے سے باہر تھوڑی ہی دور ایک نلکا تھا۔ میں وہاں سے پانی لے کر آئی اور لڑکے کے زخم کو دھو کر رخسار پر سے خون صاف کیا۔ اس کے کپڑے سخت غلیظ تھے اور ان کی بو کی وجہ سے' کمرے میں آنے والا کوئی بھی شخص شوقیہ کی طرح شک میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے لڑکے کو اپنی ایک شلوار اور بستر کی چادر دی اور اس سے کہا کہ وہ کپڑے اتار دے۔ خود میں کچن کی طرف چلی گئی۔ وہاں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھائے ہوئے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے ایک ڈونگے سے تلی ہوئی مچھلی کے چند بڑے بڑے ٹکڑے لے کر دو روٹیوں پر رکھے اور کمرے میں لے آئی۔ لڑکا اس وقت تک میری ہدایت کے مطابق لباس بدل چکا تھا اور شرمایا شرمایا سا گدیلا اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کھانا دیا اور اس کے کپڑے لے کر باہر آگئی۔ کوٹھی کے اس عقبی حصے میں تاریکی تھی۔ دور ٹین کے چھجے تلے بیٹھے ہوئے آدمی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ میں نلکے پر کیا کر رہی ہوں۔ یہ اس کوٹھی میں میرا پہلا دن تھا۔ یہاں کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت اتنی سردی میں نلکے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔ میں نے نلکا کھول کر کپڑے نیچے رکھ دیئے اور صابن کے بغیر ہی جلدی جلدی انہیں کھنگال ڈالا۔ کچھ اور نہیں تو گند وغیرہ تو اتر ہی گیا تھا۔ کپڑے نچوڑ کر میں اندر لے گئی اور انگیٹھی میں آگ جلا کر انہیں سوکھنے کے لئے ایک کرسی پر پھیلا دیا۔

میرے برتاؤ سے لڑکا کافی متاثر نظر آتا تھا اور اس کی آنکھوں میں اجنبیت کی جگہ اپنائیت نظر آنے لگی تھی۔ ہم دونوں دھیمے لہجے میں بات چیت کرنے لگے۔ مجھے یہ جان کر

حیرت ہوئی کہ لڑکے کا اصل نام حنیف نہیں یوسف ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے نام غلط بتایا تھا۔ اب اس نے مجھے اپنے باپ کا نام اور گاؤں کا اصل نام بھی بتایا۔ وہ بولا "باجی! آپ بڑی اچھی ہیں کیا کسی طرح مجھے یہاں سے نکال نہیں سکتیں؟"

میں نے ڈانٹ کر کہا "بے وقوف مت بنو' چاروں طرف تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ ایک فرلانگ بھی نہیں چلو گے کہ پکڑے جاؤ گے۔ اس وقت یہ جگہ تمہارے لئے محفوظ ترین ہے" وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "یوسف! اگر کوئی تم سے وہ باز خریدنا چاہے تو کتنے کا بیچو گے؟"

میرے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا "باجی! مجھے پکا پتہ ہے وہ باز ستر اسی ہزار روپے سے کم کا نہیں ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں مجھے سب پتہ ہے۔ یہ شکاری لوگ ایسے بازوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہ باتیں چھوڑو مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کوئی تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے نقد پیسے دے تو تم کتنے میں بیچو گے؟"

اس کے چہرے پر بڑوں بوڑھوں والی سنجیدگی پیدا ہوگئی۔ شاید باپ کی موت نے اسے کم عمری میں ہی دانا کر دیا تھا۔ وہ ماں کا اکیلا بیٹا تھا اور سارا دن پرائے کھیت میں پسینہ گراتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"باجی! میں اسے کم از کم پچاس ہزار روپے میں بیچوں گا اور.......... اور پینتالیس سے کم تو ایک پیسہ نہیں لوں گا' بندے شاہ کا خیال ہے کہ یہ اس کی کم سے کم قیمت ہے۔"

میں نے کہا "کیا کرے گا تو اتنی بڑی رقم کا؟"

اس کی شفاف آنکھوں میں ایک معصوم سی چمک ابھر آئی۔ اس گھڑی وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔ کہنے لگا "باجی! آج سے دس بارہ سال پہلے میرے ابے کے پاس کافی بڑی کھیتی تھی۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ پھر میرے ابے کا ساتھ کی کھیتی والے سے جھگڑا ہوگیا۔ وٹ کا جھگڑا تھا۔ معمولی بات تھی ایک دو گز زمین کی.......... لیکن بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔ لڑائی ہوئی اور میرے ابے کے ہاتھوں ایک بندہ مرگیا۔ ابا جیل چلا گیا اور وہیں بیمار ہو کر فوت ہوگیا۔ ہمارا سب کچھ مقدمے بازی پر لگ گیا وہ کھیتی بھی لگ گئی جس

پر فساد ہوا تھا۔ میری ماں نے وہ زمین چودھری کے پاس گروی رکھ کر پیسے لے لئے تھ
میں جب بھی اس کھیتی کے پاس سے گزرا کرتا ہوں میرا دل روتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہ
کہ میرے پاس کہیں سے بہت سی رقم آجائے اور میں وہ زمین چھڑا لوں۔ میری ماں بھ
ہر وقت یہی دعائیں مانگا کرتی تھی.......... اب رب نے مجھے ایک موقعہ دیا ہے تو میں
کھیتی ضرور چھڑاؤں گا۔ چودھری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کچھ دن پہلے میں نے ا
سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ دس بارہ سال گزر چکے ہیں پھر بھی وہ صرف اصل رق
لے کر کھیت مجھے دے دیں گے۔"

میں نے پوچھا "کتنے پیسے مانگے ہیں انہوں نے؟"

"پینتیس ہزار روپے" اس نے جواب دیا۔

"ہوں.......... پینتیس ہزار.......... باقی دس ہزار کا کیا کرو گے؟"

ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔ کسی دل پسند خیال کی لہریں اس کے دماغ سے ٹکرائیں اور آنکھوں میں کوئی خواب کوندے کی طرح لپک گیا۔

"کیا شادی وادی کا ارادہ ہے؟"

"نہیں جی" وہ سنبھل کر بولا "دیکھیں گے پھر کیا کرنا ہے۔"

اس کی مسیں بھیگ چکی تھی۔ عمر سولہ اور سترہ کے درمیان تھی۔ یہ دور خواب دیکھنے کا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

"یہ نہیں بتاؤ گے اس وقت باز کہاں ہے؟"

"نہیں جی" اس نے نگاہیں جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ "آپ سے پردہ نہیں لیکن.......... میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کچھ نہیں بتاؤں گا جان بھی چلی جائے تو نہیں بتاؤں گا' آپ ناراض نہ ہونا باجی۔"

وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور محتاط ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر میں خان رحیمی کے بندوں کو بتا دوں اور وہ تمہیں پکڑ لیں تو پھر؟"

"پھر بھی کچھ نہیں ہو گا جی میری گردن ہی اتار دیں گے نا' پر میں بولوں گا کچھ نہیں۔"

وہ بڑی بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس بیچارے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں

سے لڑائی لے رہا ہے وہ اس کی زبان کھلوانے کے لئے کہاں تک جا سکتے ہیں۔ جسمانی اذیت' قوت برداشت اور حد اختیار کے مسائل اس کی سمجھ میں آنے والے نہیں تھے۔ میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ اگر وہ تلاش کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اسے شیشے کے پتلے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اپنے گرم خون کی وجہ سے اس مسئلے کی سنگینی کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ دیر مزید بات چیت کی اور پھر ایک آخری فیصلے پر پہنچ گئی۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ شام کے وقت میں نے اپنے کمرے کو باہر سے تالا لگایا اور کچن میں آ گئی۔ حسب معمول مجھے اس وقت خان رحیمی کو قہوہ بنا کر پیش کرنا تھا۔ خان رحیمی نے ابھی تک کوئی خاص کام مجھے تفویض نہیں کیا تھا۔ گھر میں جہاں بھی میری ضرورت پڑتی لگا دیا جاتا تھا۔ اس کوٹھی میں زیادہ تر ملازمین عورتیں تھیں۔ وہ سب کی سب جوان اور خوبصورت تھیں۔ خان رحیمی ایک میز پر جھکا کانپتے ہاتھوں سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجانی پڑی۔ یہ خان رحیمی کے روبرو آنے کی لازمی شرط تھی۔ ٹرالی کی مدھم آہٹ سن کر اس نے اپنا سفید سر گھمایا۔

"اوہ ونڈر فل" اس نے عینک کے پیچھے سے قہوے کے برتنوں کو اور مجھے ایک ساتھ جھانکا۔ "دروازہ بند کر دو اور تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو" اس نے کہا۔ میں نے ہدایت پر عمل کیا' قہوہ انڈیل کر اسے دیا۔ اس کی نگاہیں میرے بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا "میرے پاس آؤ" میں قریب آئی۔ بولا اپنا سر ذرا جھکاؤ' میں نے سر جھکایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بالوں کا کلپ کھولا اور اسے پاؤں تلے توڑ کر بولا۔

"آئی ہیٹ دیز کلپس' آئندہ تمہارے بالوں میں کلپ نہیں ہونا چاہئے انڈر سٹینڈ؟" میں نے اس کے خبطی پن پر اقرار میں سر ہلایا۔ چند لمحے بعد اس کا موڈ بحال ہو گیا۔ اس نے حسب معمول مجھے ریڈرز ڈائجسٹ سے پڑھے ہوئے دو تازہ لطیفے سنائے۔ ان میں سے ایک لطیفے پر وہ خود بھی اتنا ہنسا کہ قہوے کی پچکاری اس کے منہ سے نکل گئی۔ پچکاری نکلنے کے بعد وہ کچھ خجل اور سنجیدہ ہو گیا.......... اس کے تمام مہمان آج ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ ناکام ہی گئے ہوں گے کیونکہ ان کا "مطلوب" تو

ابھی تک میرے کمرے میں تھا......... میں نے ان سنگین حالات میں یوسف کو باہر نکالنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ خان رحیمی قہوہ پی چکا تو میں اصل موضوع کی طرف آگئی۔ میں نے کہا۔

"خان جی! مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے یہاں کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں مگر جو بات میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں اس میں سراسر آپ ہی کا فائدہ ہے۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" خان رحیمی نے پوچھا۔

میں نے کہا "خان جی! دراصل بات کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ کل جب میں مہمانوں کے سامنے کھانا چن رہی تھی' آپ کی گفتگو کا تھوڑا سا حصہ میرے کانوں میں پڑا تھا' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کسی باز وغیرہ کی تلاش میں ہیں' کیا آپ بتائیں گے کہ اس باز میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

خان رحیمی نے ٹٹولنے والی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا پھر بولا "کوئی خاص بات نہیں بس وہ ایک کم یاب باز ہے' کافی قیمت رکھتا ہے۔"

میں نے کہا "خان جی چھوٹے منہ سے بڑی بات کر رہی ہوں معافی چاہتی ہوں کیا آپ بتائیں گے کہ اس باز کا آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

خان رحیمی نے تمباکو کی پوٹلی نکال کر پائپ بھرنا شروع کیا اور بولا "آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

میں نے اعتماد سے کہا "خان جی! میں اس باز کی تلاش میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں اور مجھ پر بھروسہ کر کے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی فی الحال آپ میرے دو سوالوں کا جواب عنایت کر دیں تو مجھے بات کرنے میں آسانی رہے گی۔"

خان رحیمی کی جہاندیدہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ اس نے پائپ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا "ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

میں نے اپنا سوال دہرایا "آپ کو اس باز کے بارے میں پتہ کیسے چلا؟"

خان رحیمی نے کہا "یہ کوئی تین مہینے پرانی بات ہے۔ کوٹ سلطان کے ایک زمیندار نے چند عربی شیوخ کو تھل میں شکار کی دعوت دی۔ ان میں ایک شہزادے امیر

ابن شاہ عابد کے پاس یہ باز تھا' دوران شکار اس باز نے بے حد ہنرمندی اور مہارت کا مظاہرہ کیا مگر ایک روز اچانک گم ہوگیا اور کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ باز کو گمشدگی سے بچانے کے لئے بعض عرب شہزادے اپنے پرندوں کے پاؤں میں خاص قسم کے چھلے پہنا دیتے ہیں یا ان کے جسموں میں بذریعہ آپریشن مختصر پرزہ رکھ دیتے ہیں۔ ایسے پرزوں سے نشر ہونے والے سگنل دوران شکار شکاریوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ ان کا شکاری پرندہ کس مقام پر ہے۔ اس باز کے پاؤں میں بھی سگنل نشر کرنے والا الیکٹرانک چھلہ تھا۔ عربی شہزادے نے اپنی جیپ پر بھٹکے ہوئے باز کا تعاقب کیا اور ہمارے علاقے میں آپہنچا۔ یہاں آکر اسے سگنل ملنے بند ہوگئے۔ معلوم نہیں وہ چھلہ کہیں گر گیا یا اتار لیا گیا۔ علاقے کے طول و عرض میں کئی روز تک باز کو تلاش کیا گیا مگر ناکامی ہوئی۔ آخر شہزادہ اور اس کے میزبان تھک ہار کر واپس چلے گئے۔ یہ خبر چونکہ شکاری حلقوں میں پھیل چکی تھی اس لئے شہزادے کی روانگی کے بعد کئی پارٹیاں اس گمشدہ باز کو ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئیں......... اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔"

خان رحیمی نے خاصی تفصیل بتا دی تھی۔ اب بہت سی باتیں میرے ذہن میں صاف ہوگئیں۔ میں نے پوچھا "خان جی! آپ کے خیال میں اس باز کی قیمت کیا ہوگی؟"

خان رحیمی نے اوپر تلے کئی کش لئے اور بولا "صحیح اندازہ تو نہیں مگر کافی مہنگا باز ہے۔"

میں نے کہا "تقریباً سات آٹھ لاکھ کا تو ہوگا؟"

"ہوں......... تقریباً" خان رحیمی نے مختصر جواب دیا۔

اس کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھیوں کی بھاگ دوڑ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ باز کی کم از کم قیمت اتنی ہوگی۔ میں نے احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا "خان جی! یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ میں اس باز کے بارے میں کسی حد تک جانتی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ سے کچھ بھی چھپاؤں لیکن مجبوری ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ ہی کے مفاد کی خاطر میں نے کسی سے وعدہ کر رکھا ہے کہ چپ رہوں گی' کیا آپ میری اس وقتی خاموشی کو درگزر کریں گے؟"

خان رحیمی کی معاملہ فہم نگاہیں میرے اندر تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ

خوشدلی سے بولا "اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارا خاموش رہنا ضروری ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے بھی خاموش رہنا ہر شخص کا حق ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ آپ کو مجھ پر 45 ہزار روپے کا بھروسہ بھی کرنا ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

میرا مطلب ہے' آپ کو اس باز کے لئے 45 ہزار روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ یہ رقم مجھے دینا ہوگی اور بغیر کسی ثبوت رسید کے۔"

"یہ......... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنی بڑی رقم......... میرا مطلب ہے........."

یکایک وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا' پھر بولا "اوکے......... ٹھیک ہے......... میں تمہیں رقم دے دوں گا' پتہ نہیں کیوں تم پر اعتماد کرنے کو دل چاہ رہا ہے......... لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیسے لاؤ گی وہ باز؟ کہیں یہ بھی کوئی "جوک" وغیرہ تو نہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا "خان جی! بس اب کوئی اور سوال نہ کریں آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے جو ذمے داری مجھ پر ڈالی ہے اب وہ مجھے نبھا لینے دیں اس کے بعد میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

"کب رقم چاہیے تمہیں؟"

"بے شک ابھی دے دیں۔" میں آپ سے صرف دو روز کی مہلت چاہوں گی"

خان رحیمی ڈگمگاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے کمرے تک گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانچ سو روپے کے نوٹوں کی ایک کھلی گڈی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اب کسی کا کمرے میں آنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ یوسف حسب معمول الماری کے عقبی خلا سے نکل کر مسہری پر بیٹھ چکا تھا۔ کھانا ختم کر کے اس نے ایک طویل ڈکار لی اور پھر خود ہی اس ڈکار پر شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے ہوئے کہا "یوسف! باز کے کتنے پیسے مانگے تھے تم نے؟"

"کیا مطلب باجی؟"

"مطلب یہ کہ کتنے میں بیچنا ہے تم نے باز؟"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا باجی! کم از کم پینتالیس میں۔"

میں نے گرم چادر کے اندر سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی "گن لو پورے پینتالیس ہزار ہیں۔"

وہ پھٹی نگاہوں سے نوٹوں کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ شاید اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس پرندے کے عوض اتنی بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ نوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جیسے ان کے اصلی ہونے کا یقین کر رہا ہو۔ یکایک وہ سہم گیا اور نوٹ جلدی سے چارپائی پر رکھ دیئے۔ "نہیں باجی! میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ خان رحیمی آپ کے ذریعے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے پکھیرو چھینا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو کچھ نہیں بیچنا۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں بیچنا۔"

میں نے مسکرا کر کہا "لیکن خان کا اس معاملے سے کیا تعلق' باز تو میں خرید رہی ہوں' اپنے ذاتی پیسوں سے۔"

وہ بولا "کیوں مذاق کرتی ہو باجی! تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟"

"تو کیا تم مجھے اتنا گیا گزرا سمجھ رہے ہو' تین سال سے میری تنخواہ خان جی کے پاس جمع ہو رہی ہے۔ میں اس طرح کا ایک باز اور خرید سکتی ہوں۔"

"باجی! مجھے سمجھ نہیں آ رہی آپ کیا کریں گی اس باز کا......... یہ تو مردوں کے کام ہیں۔"

"میں کسی مرد ہی کو بیچوں گی' میرا ایک تایا بہت بڑا شکاری ہے۔ وہی کسی سے سودا مار لے گا۔ میں نے کل اسے لاہور خط بھی لکھا ہے۔"

وہ کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "باجی! پکھیرو اگر واقعی آپ خرید رہی ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آپ کو پینتیس ہی میں دے دوں گا۔ آپ روپے مجھے دے دیں اور اپنا کوئی بھروسے کا بندہ ساتھ بھیج دیں۔ میں اسے پکھیرو دے دوں گا......... لیکن نہیں......... آپ خود ہی چلیں تو بہتر ہے بلکہ......... آپ ہی کو جانا پڑے گا۔"

اس کی احتیاط پسندی مجھے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا "لیکن میں اکیلی عورت آٹھ نو میل سے واپس کیسے آؤں گی؟"

"میں آپ کے ساتھ اپنے یار خوشئے کو بھیج دوں گا۔ وہ آپ کو خان کی جو تک چھوڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں ہی ساتھ چلی جاؤں گی لیکن رقم تمہیں وہیں موقعے پر پہنچ کر ملے گی' ایک ہاتھ دو......... ایک ہاتھ لو۔"

"ٹھیک ہے باجی" میری سکیم کامیاب رہی تھی۔ خان رحیمی کو بیچ میں نہ لا کر میں نے درست فیصلہ کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ خان رحیمی کے سامنے آنے سے یوسف بدک جاتا اور عین ممکن تھا کہ باز کی موجودگی ہی سے انکار کر دیتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ خان رحیمی ہی اپنے وعدے پر قائم نہ رہتا اور باز حاصل کرنے کے بعد رقم دینے سے انکار کر دیتا یا دی ہوئی رقم واپس لے لیتا۔ اس سودے میں خان رحیمی اور یوسف دونوں کو بے حد فائدہ تھا مگر بے اعتباری کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے معاملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر یہ معاملہ طے پا جاتا تو میرا بھی ایک اہم مقصد پورا ہو جاتا۔

میں خان رحیمی کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور اعتماد حاصل کرنے کا اس سے بہتر اور مختصر راستہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں جلد سے جلد اس "تعلق" کے بارے جاننا چاہتی تھی جو خان رحیمی اور چنگیزی گھرانے کے درمیان تھا اور جس کا "علم" میرے فرحان کے قاتلوں کو میری زد میں لا سکتا تھا۔ خان رحیمی کے اس ڈیرے پر میں مسکراتی تھی' باتیں بھی کرتی تھی' چلتی پھرتی بھی تھی مگر میں زندہ نہیں تھی۔ زندگی تو کسی ننھے جسم کے ساتھ ہی قبر کی تاریکی میں اتر چکی تھی۔

خان رحیمی کا اعتماد حاصل کرنے کے علاوہ میرا دوسرا مقصد یہ تھا کہ یوسف کو اس کا حق مل جائے۔ اس باز کے سامنے چالیس پینتالیس ہزار کی رقم کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہ تو معمولی انعام تھا۔ وہ پرندہ کسی شناور کے ہاتھ میں بھی آ سکتا تھا اور اگر کوئی گھاگ شخص ہوتا تو لاکھوں کما سکتا تھا۔ یوسف حالانکہ پینتیس ہزار پر راضی ہو رہا تھا مگر میرا ارادہ تھا کہ اسے پوری رقم یعنی پینتالیس ہزار ہی دوں گی۔ کل اس نے بڑی فرمانبرداری اور سادگی کے ساتھ مجھے اپنے عشق کی کہانی بھی سنا ڈالی تھی۔ بچپن میں ہی اس کی منگنی اپنے ماموں کی لڑکی صغراں سے ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے مگر باپ کی موت کے بعد وہ زمین بک گئی جس کا یوسف کو وارث بننا تھا۔

اس کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور اس کے ساتھ ہی ماموں کے گھرانے سے اس کا تعلق بھی کمزور پڑتا گیا۔ یوسف کی ممانی ایک بڑی زبردست عورت تھی۔ اس نے شوہر کو پوری طرح دبا رکھا تھا۔ وہ کنگال یوسف کے ساتھ بیٹی بیاہنے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ صغراں کی بات اپنی بہن کے گھر چلا رہی تھی......... اور وہ دونوں جدائی کے مارے دکھ پر دکھ جھیل رہے تھے۔ وہی صدیوں پرانی کہانی' جو معمولی کمی بیشی کے ساتھ ہمیشہ دہرائی جاتی رہی ہے۔ اپنی ممانی کی موجودگی میں یوسف ماموں کے گھر پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ باز لے کر ماموں کے گاؤں پہنچا تو اس نے گھر کی بجائے کھیتوں کا رخ کیا تاکہ وہاں باز اپنے ماموں یا ماموں زاد بھائی کے سپرد کر سکے مگر اس سے پہلے ہی چودھری شہاب کے آدمی اس کے پیچھے پڑ گئے اور وہ باز کہیں چھپا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم باز چھپانے والی بات پر مجھے یقین نہیں تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس نے پنجرہ یا تھیلا جو کچھ بھی ہو گا کسی کے سپرد کر دیا ہو گا......... اب اسی باز کی وجہ سے اس پر خوش قسمتی کا دروازہ کھل رہا تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ اگر زمین اسے واپس مل گئی اور شادی کے لئے اس کے پاس دس بارہ ہزار روپے نقد ہوئے تو ممانی کے تیور بدلتے دیر نہیں لگے گی اور ہو سکتا ہے اگلی فصل کی کٹائی تک اس کی شادی بھی ہو جائے۔

رات پل پل گزرتی رہی۔ اپنے دامن میں آنے والے کل کے ہنگاموں کی پرچھائیاں سمیٹے آگے بڑھتی رہی۔ میں اور یوسف جاگ رہے تھے۔ آخر جب کیکر' شیشم اور شرینہ کے درختوں کے اس پار کہیں دور مرغ نے پہلی اذان دی تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہ آہستگی دروازہ کھول کر میں نے باہر جھانکا۔ ٹین کے چھجے تلے گہری تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا آگ بجھ چکی ہے اور چھجے تلے موجود شخص گیٹ کے پاس چوکیدار کی کوٹھڑی میں گہری نیند سو رہا ہے۔ میں تین چار دنوں سے یہی کچھ دیکھ رہی تھی۔ رات کے آخری پہر چھجے والا شخص اپنی ڈیوٹی چھوڑتا تھا اور چوکیدار کی کوٹھڑی میں جا کر سو رہتا تھا اور یہاں سے نکلنے کے لئے یہی وقت مناسب ترین تھا۔ میں نے اندر جا کر اپنی گرم چادر اوڑھی۔ ایک پرانا کمبل یوسف کو دیا اور دونوں باہر نکل آئے۔ یوسف کو برآمدے میں ٹھہرا کر میں آگے آئی اور اچھی طرح گیٹ کا جائزہ لیا۔ حسب توقع راستہ صاف تھا۔ میں نے بہ آہستگی گیٹ کا آہنی ارل کھول دیا۔ اس کے بعد

واپس جا کر یوسف کو ساتھ لیا اور باہر نکل آئی۔ وہ خوفزدہ تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر درختوں میں چلنے کے بعد ہم کھیتوں میں نکل آئے۔ ہوا بہت سرد تھی۔ ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ یوسف نے ابھی تک مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ بس میں اس کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی دھوکہ نہیں دے گا۔ کچھ آگے جا کر مجھ سے پوچھنے لگا "باجی! خان رحیمی کا کوئی بندا ہمارے پیچھے تو نہیں لگ جائے گا؟"

میں جھلا گئی "تو کتنا شکی ہے یوسف' اتنے منہ اندھیرے کون ہمارے پیچھے آئے گا اگر نہیں تو ادھر کہیں چھپ کے بیٹھ جا اور دیکھ لے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔"

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ لیکن ابھی ہم تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ مجھے ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔ جیسے ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی اس راستے پر ہو۔ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ شاید یہی چھٹی حس کہلاتی ہے۔ بغیر کسی وجہ اور سبب کے انسان کا چوکنا ہو جانا ایک ناقابل فہم عمل ہے۔ اچانک ہماری دائیں جانب کھیتوں میں مسلسل سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ جیسے کوئی ہمارے ساتھ چل رہا ہو۔

"شاید کتے ہیں" میں نے یوسف کی ڈھارس بندھانے کو کہا۔ ہم ایک تنگ پگڈنڈی پر تھے۔ ایک طرف کماد کے کھیت تھے اور دوسری طرف جوی کے۔ سرسراہٹ کماد کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ اگر واقعی کوئی ہمارے پیچھے تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ خان رحیمی نے مجھ پر بھروسہ کر کے بھی بھروسہ نہیں کیا۔ اس نے میرے پیچھے نگران چھوڑ رکھے تھے جو اب خاموشی سے ہمارا تعاقب کرنے لگے تھے۔ اچانک ہی مجھے شدید خطرہ کا احساس ہونے لگا۔ ایک سے زائد افراد ہمارے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ میں نے دس پندرہ گز پیچھے ایک سائے کو اچھل کر داہنی جانب کے کھیت میں گھستے دیکھا۔ میں نے یوسف کا ہاتھ پکڑا اور تیز بھاگنے لگی۔ اس تنگ پگڈنڈی سے نکل جانا ہمارے لئے ضروری تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یوسف بلا تردد میرے ساتھ کھچا چلا آ رہا تھا۔ غالباً وہ بھی صورت حال کی نزاکت محسوس کر چکا تھا اور پھر اچانک ہمارے سروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کماد کے کھیت سے نکل کر تین سائے ہم پر جھپٹے۔ ایک شخص نے بندوق کا کندا گھما کر یوسف کی کمر پر مارا' دھم کی آواز آئی اور وہ چیخ کر داہنی جانب لڑھک گیا۔ کسی نے

عقب سے مجھے آہنی بازوؤں میں دبوچ لیا اور گنے کے کھیت کی طرف کھینچنے لگا۔ میں نے دیکھا دو افراد یوسف پر پل پڑے ہیں اور اسے گھونسے مارتے ہوئے کھیت میں لا رہے ہیں۔ میں نے حلق کی پوری قوت سے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی ایک مضبوط ہاتھ میرے منہ پر آ کر جم گیا۔ میری آواز حلق ہی میں دم توڑ کر رہ گئی۔ ایک ریوالور کی سرد نال میری گردن سے آ لگی اور اس نال سے بھی سرد لہجے میں کسی نے کہا۔

"خبردار' شور مچائے گی تو قتل کر دوں گا۔"

بولنے والے کا لہجہ دیہاتی نہیں تھا' مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا شخص ہے اور پتلون جرسی میں ملبوس ہے۔ یوسف کو جکڑنے والے اسے غلیظ گالیاں دے رہے تھے اور دھمکا رہے تھے کہ اس نے شور مچایا تو جان سے مار دیں گے۔ اگر آپ خود ستائشی نہ سمجھیں تو کہوں گی کہ میں نے ایک عقلمندی کی تھی' جونہی خطرے کا احساس شدید ہوا تھا میں نے وہ چھوٹا پرس جوی کے کھیت میں پھینک دیا تھا جس میں پینتالیس ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ لہٰذا تلاشی میں میرے پاس سے کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ اسی اثناء میں انہوں نے میرے ہاتھ موڑ کر ایک مفلر کے ساتھ کمر پر باندھ دیئے لیکن پھر یہ فوراً کھول دیئے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلحے کی موجودگی میں' میں مہم جوئی کی حماقت نہیں کروں گی۔ ہاں یوسف کو انہوں نے خوب اچھی طرح جکڑ دیا۔ وہ مزاحمت بھی خوب کر رہا تھا۔ دراصل وہ کافی ڈرا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اوپر مفلر باندھ دیا۔ ایک تنومند شخص نے یوسف کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ پتلون جرسی والے نے ریوالور میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور خوفناک لہجے میں دھمکی دی کہ اگر میں نے چالاکی دکھائی تو وہ بری طرح پیش آئے گا۔ ان سب کے چہرے تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ڈیل ڈول اور لہجوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہی "بابو لوگ" ہیں جن کے بارے میں یوسف نے بتایا تھا۔ چودھری کی حویلی میں وہ یوسف کا باز دیکھنے کے لئے بیٹھے رہے تھے اور وہ باز لے کر ساتھ والے گاؤں بھاگ گیا تھا۔

میرے اور یوسف کے ساتھ انہوں نے چھ سات کھیت کا فاصلہ پیدل طے کیا اور پھر ایک جیپ تک آ پہنچے۔ یہ ایک شاندار ٹیوٹا جیپ تھی۔ ہمیں جیپ میں دھکیل کر وہ خود بھی بیٹھ گئے۔ جیپ ائرکنڈیشنڈ تھی۔ ہلکی آواز میں ڈیک بج رہا تھا۔ جیپ کی اندرونی

روشنی میں' میں نے پہلے بار ان کے چہرے دیکھے۔ وہ ایک سے بڑھ کر ایک افلاطون نظر آتے تھے۔ بے ہودہ تصویروں والی جیکٹیں' تنگ جینز' بڑھی ہوئی داڑھیاں' الجھے ہوئے بال۔ وہ کل چار لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک جو دراز قد تھا اور عمر میں بھی زیادہ تھا گلے میں ایک بڑا سا طلائی لاکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ آنکھوں سے کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ ساتھی اسے چیف کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور وہ گاہے گاہے انہیں بے تکلفی سے گالیاں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں جیپ میں ڈال کر کہیں لے جائیں گے لیکن جب جیپ چلنے کے آثار نظر نہیں آئے تو میں نے کھڑکیوں سے بغور اردگرد کا جائزہ لیا۔ رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ اس جھٹپٹے میں مجھے قریب ہی چند چھولداریاں نظر آئیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہی ان لوگوں کا پڑاؤ ہے۔ یہ لڑکے آپس میں جو باتیں کر رہے تھے اس سے پتہ چلا کہ ان میں سے کوئی ایک خان رحیمی کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھے اور ایک دوسرے کو مبارکباد اور شاباش دے رہے تھے۔ لاکٹ والے لڑکے کی تمام تر توجہ یوسف کی طرف تھی۔ وہ یوسف کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ پیتے پیتے اس نے ایک زوردار ٹھوکر یوسف کی پسلیوں میں ماری۔ وہ بیچارہ پائیدان پر پڑا تھا۔ وہیں کسمسا کر رہ گیا۔ لاکٹ والے نے اس پر انگلش اور اردو میں گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے چلا کر کہا "تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے' کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا؟"

چیف نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ جیسے پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہو۔ پھر فلمی انداز میں میرے چہرے پر ریوالور کی نال گھما کر بولا "ابھی تمہاری باری بھی آ جاتی ہے۔ ذرا چھری تلے دم لو۔"

اس کا لہجہ خوفناک تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس کے اشارے پر ایک لفنگے نے یوسف کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا۔ وہ بھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخنے لگا اور دہائی دینے لگا کہ اسے باز کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ راستے میں اس کے ہاتھ سے نکل کر اڑ گیا تھا۔ اس اعلان کے جواب میں لاکٹ والے نے بہت زوردار تھپڑ یوسف کے منہ پر مارا۔ اس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور سرخ خون گاڑی کے کارپٹ کو بھگونے لگا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو منڈھے ہوئے سر والے ایک لڑکے نے' جو غالباً کسی کالج کی یونین کا صدر تھا

ایک لمبا چاقو میری گردن پر رکھ دیا اور چاقو کے زور سے مجھے دھکیل کر سب سے پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ یوسف بے حد چیخ و پکار کر رہا تھا مگر اس کی آواز بند گاڑی سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ لاکٹ والے نے زبردستی اس کے منہ میں کپڑا ٹھسیڑ دیا اور اس پر جھک کر سپاٹ لہجے میں بولا "دیکھو منحوس کی اولاد' ہماری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں' نہ ہی ہمیں اس سے غرض ہے کہ تو کہاں تھا اور کہاں سے آیا ہے۔ ہمیں صرف وہ باز دے دے' ہم چپ چاپ تجھے چھوڑ دیں گے بلکہ انعام بھی دیں گے۔ دوسری صورت میں جو کچھ ہو گا وہ تیرے کھوپڑے میں نہیں آئے گا اور نہ ہی آ سکتا ہے۔ ہم اچھے لوگ نہیں ہیں اور ان سب میں برا میں ہوں۔ بندے کو ایسی موت مارتا ہوں کہ......... خیر چھوڑو۔ ایک دو گھنٹے میں تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔" پھر وہ میری طرف مڑا اور ریوالور کو سٹائلش انداز میں انگلی پر گھما کر زہریلے لہجے میں بولا "ہاں......... آئرن لیڈی تو اس لونڈے کے ساتھ کہاں بھاگی پھر رہی ہے؟"

اس کا ایک ساتھی دبے دبے لہجے میں بولا "چیف یہ مجھے بڑی گہری عورت لگتی ہے' میرا خیال ہے میں نے اخبار میں کہیں اس کی تصویر بھی دیکھی ہے لیکن کچھ یاد نہیں پڑ رہا" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ منڈھے ہوئے سر والا جس کا نام عاطف بخاری تھا' بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ بولا "یارو! مجھے تو ایک اور شک پڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ الو کا پٹھا یوسف ابھی تک اس کے پاس چھپا ہوا تھا' اگر ایسا نہیں تو اس وقت یہ دونوں چوروں کی طرح خان رحیمی کی کوٹھی سے کیوں نکلے' سوچو......... سوچو۔ ذرا مغز استعمال کرو مہربانو' قدر دانو! ہو سکتا ہے ان کا آپس میں کوئی ٹانکا ہو گیا ہو؟"

لاکٹ والے نے خطرناک لہجے میں کہا "آئرن لیڈی! سب کچھ صاف صاف بتا دے یہ کیا چکر ہے؟ آرام سے بتا دے گی تو تیرے لئے بھی اچھا ہو گا اور اس لڑکے کے لئے بھی' ورنہ تم دونوں بری طرح پچھتاؤ گے' میں تم دونوں کو آدھ گھنٹے کا ٹائم دے رہا ہوں۔ آدھ گھنٹے میں اپنا اچھا برا خوب سوچ سمجھ لو۔ اس کے بعد ہم اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیں گے اور تم دونوں کے پاس پچھتانے کا وقت بھی نہیں رہے گا۔ "انڈرسٹینڈ!" اس نے آخری فقرہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا وہ گاڑی سے باہر نکلنے لگے۔ لاکٹ والے

نے گنجے سر والے سے کہا "بخاری تو گاڑی کے پاس ہی رہ اور ان دونوں پر نظر رکھ۔"

بخاری بولا "یار چیف! یا تو اس آئرن لیڈی کے ہاتھ باندھ دے یا مجھے یہاں مت چھوڑ۔ اگر اس نے بھاگنے واگنے کی کوشش کی نا تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں غصے میں کتنا کمینہ ہو جاتا ہوں۔"

لاکٹ والے نے ریوالور اسے تھماتے ہوئے کہا "تو ہو جانا کمینہ۔ تو ہے ہی کتوں کے خاندان سے............ تجھے کون روک سکتا ہے مگر ایک ہی گولی چلانا' زیادہ قیمتی نہیں ہے اس "نیلوفر" کی جان۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سن رہی ہے تو بھی' یہ پاگل کتا ہے' نہ بھونکتا ہے نہ کاٹتا ہے' بس پھاڑ کھاتا ہے اور ادھر تجھے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ بھلی مانس بن کر اندر بیٹھی رہ اور سمجھا اپنے اس کچھ لگتے کو۔ ہم ناشتہ ماشتہ مار کے ابھی آتے ہیں" ان کی بول چال سے لے کر چال ڈھال تک سب میں فلمی انداز جھلکتا تھا۔

وہ چاروں باہر نکل گئے۔ گنجے سر والا عاطف بخاری کچھ دور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی تینوں چھولداریوں کی طرف چلے گئے۔ یہ جگہ چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ جیپ کے علاوہ یہاں ایک پک اپ بھی موجود تھی۔ کچھ دور درختوں کی شاخوں سے ایک رسی بندھی تھی اور اس پر رنگ برنگ کپڑے جھول رہے تھے۔ ایک ملازم پیشہ نوجوان چھولداریوں کے سامنے آگ جلائے کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ یہ کل تین چھولداریاں تھیں۔ کافی قیمتی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک چھولداری کے عین اوپر ایک شیشم کی سب سے بلند شاخ پر ٹی وی انٹینا نظر آ رہا تھا اور اس کی لمبی سفید تار ہوا میں دھیرے دھیرے جھول رہی تھی۔ پک اپ میں ایندھن کے کام آنے والی خشک لکڑی کا ڈھیر پڑا تھا اور اس کے علاوہ شکار کا کچھ سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ جس میں جال اور لوہے کے بڑے بڑے ڈنڈے شامل تھے۔

میں نے باہر کے ماحول سے توجہ ہٹا کر یوسف کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس کا اوپری ہونٹ پھٹ کر کریہہ منظر پیش کر رہا تھا۔ زخم چر کر کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا اور ناک کی چونچ تک پہنچ گیا تھا۔ گاڑھے خون کے اندر سے گوشت کی سفیدی جھانک رہی تھی۔ میں نے بہ آہستگی اس کے منہ سے کپڑے کا گولا نکالا اور اپنے دوپٹے سے اس کا خون صاف کرنے لگی۔ وہ کراہ رہا تھا اور سخت تکلیف میں تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے ہاتھ

کھول دوں مگر پندرہ گز دور بیٹھے بخاری کی نظریں میری ہر حرکت دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بہ آہستگی مخالف سمت کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اندرونی کھٹکا کھینچ کر ہینڈل کو حرکت دینا چاہی مگر پتہ چلا کہ دروازہ صرف باہر سے کھل سکتا ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے دروازوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اب یہ گاڑی ہمارے لئے کال کوٹھڑی سے کم نہیں تھی۔ میں نے یوسف سے کہا "یوسف ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ لگتا ہے اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔"

"باجی......... میرے ہاتھ.........." یوسف نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے ہونٹ کے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔

میں نے کہا "وہ دیکھ رہے ہیں' میں تمہارے ہاتھ نہیں کھول سکتی' اور اس کا فائدہ بھی کیا ہے' وہ ہمیں بھاگنے نہیں دیں گے" میں اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے باوجود صورت حال کی سنگینی لہجے پر اثرانداز ہو رہی تھی۔ یوسف کی آنکھوں سے ہراس جھانک رہا تھا۔ میں نے کہا "یوسف! یہ لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرا خیال ہے تم انہیں باز کا پتہ دے دو۔ کہیں کوئی اور ہی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔"

میری بات پر وہ ایک دم چونک سا گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر بولا "نہیں........ میں نہیں بتاؤں گا' مار بھی دیں گے تو نہیں بتاؤں گا"

میں نے کہا "یوسف! سب سے قیمتی جان ہوتی ہے جان گنوا دو گے تو پھر باقی کیا رہے گا۔ ذرا سوچنے کی کوشش کرو۔"

وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا "میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ بچہ نہیں ہوں میں۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ پر شک کر رہا ہے۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھدار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ ان فریب کن حالات کا قصور تھا جن سے ہر یتیم بچے کو گزرنا پڑتا ہے۔ زمانے کی سنگ دلی اور بے حسی بے آسرا بچوں کی ذہنی نشوونما کو کیسے کیسے متاثر کرتی ہے؟ اس کا مشاہدہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں اس کی ہمدرد اور خیرخواہ تھی لیکن وہ مجھ پر بھی بھروسا نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نے دکھ سے کہا "یوسف! کیا تمہارا خیال ہے کہ میں ان سے ملی ہوئی ہوں؟"

"تم سب ملے ہوئے ہو۔" وہ خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "خان رحیمی تم اور یہ بابو لوگ، سب ایک ہو۔"

میں نے کہا "یوسف سمجھنے کی کوشش کرو، اگر میں ان لوگوں سے ملی ہوئی ہوں تو مجھے کیا ضرورت تھی تمہیں یہاں لانے کی، کیا یہ سب کچھ خان رحیمی کی کوٹھی پر نہیں ہو سکتا تھا......... اور.......... اور تمہارے سامنے میں نے اپنا پرس کھیتوں میں پھینکا تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی اتنی بڑی رقم ایسے پھینکنے کی۔ وہ تمہارے سامنے مجھے بھی گالیاں دے رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرو یوسف! میں تمہاری برائی میں نہیں ہوں۔"

میں دس پندرہ منٹ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا شبہ کسی حد تک دور ہو گیا مگر باز کے بارے میں اس نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ تکرار سے ایک ہی بات کہہ رہا تھا "باز میرا ہے میں نے اسے پکڑا ہے، میں کسی کو کیوں دوں؟"

اسی دوران لاکٹ والا اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ اب اس نے آنکھوں کو سیاہ چشمے میں چھپا رکھا تھا۔ ایک تنکے سے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے اس نے لوفرانہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا "ہاں مس لال پری! کیا فیصلہ کیا تم "دو دیوانوں" نے".......... پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ میرے چہرے کے تاثرات سے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے بخاری اور ایک موٹے لڑکے کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے دبوچ کر پلک جھپکتے ہی میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ اس مقصد کے لئے ایک ٹائی استعمال کی گئی۔ بندش اتنی سخت تھی کہ میری کلائیاں جیسے آگ میں جلنے لگیں۔ میں ان کے تیور دیکھ کر کانپ گئی۔ مین نے کہا "خبردار! اسے کچھ نہ کہنا وہ پہلے ہی زخمی ہے۔"

انہوں نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں۔ لاکٹ والے نے جس کا اصل نام اس کے لاکٹ پر اخترزماں کندہ تھا اپنے ساتھی کو گالی دے کر کہا "ابے کبوتر! دیکھتا نہیں لونڈا زخمی ہے لا ادھر مرہم، میں لگاؤں اس کے ہونٹ پر" اس نے ساتھی لڑکے سے سلگتا ہوا سگریٹ لے لیا اور دو کش لے کر بڑی بے دردی سے یوسف کے کٹے ہوئے ہونٹ پر رکھ دیا۔ یوسف کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک ساعت کے لئے میں نے سوچا میرا فرحان بھی تو ایسے ہی کرب سے گزر کر موت کا

لقمہ بنا تھا۔ وہ بھی تو ایسے ہی چیخا چلایا ہوگا، اپنی بدبخت ماں کو پکارتا رہا ہوگا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور چلا کر کہا "چھوڑ دو......... اس کو چھوڑ دو، خدا کے عذاب سے ڈرو، اتنے فرعون نہ بنو۔"

میں نے لپک کر یوسف کی طرف بڑھنا چاہا تو بخاری نے مجھے بالوں سے کھینچ لیا۔

اخترزماں بولا "بڑا درد اٹھ رہا ہے اس کے دل میں، مجھے تو کوئی گہرا رشتہ لگتا ہے۔"

بخاری نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور جو کچھ کہا وہ میرے، تن بدن کو آگ لگا گیا۔

میں نے کہا "شرم کرو بے غیرتو! کسی کو گالی دینے سے پہلے سوچ لو تمہیں بھی بیٹا، باپ اور بھائی کہنے والیاں ہوں گی۔"

اخترزماں نے گھوم کر ایک زور کا تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ اور پھر بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہاں میرے یوسف ثانی، کچھ بتائے گا کہ.........." آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اپنی گردن پر خیالی چھری چلائی۔ جواب میں یوسف نے ان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ پوری شدت سے انکار کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ضد پر آ گیا ہے.........

مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی اذیت جھیل کر بھی وہ ثابت قدم رہے گا۔ درحقیقت وہ کھیت میں محنت کرنے والا سخت جان کسان تھا۔ کوئی نازک اندام شہری لڑکا ہوتا تو اب تک کئی بار بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ سختی جھیل کر وہ اور بھی خود سر ہو گیا تھا۔

"چیف! میرا خیال ہے پہلے اس آئرن لیڈی کو پگھلا لیں پھر اس ابن فتومس کو بھی دیکھ لیں گے۔"

اخترزماں نے خطرناک انداز میں عینک اتار کر ایک طرف پھینکی اور میری جانب بڑھا "کیا خیال ہے بلبل صحرا! تو بھی کوئی نغمہ سنائے گی یا اس راج گدھ کی طرح چپ ہی رہے گی؟" غالباً اسے دوسروں کو نت نئے ناموں سے پکارنے کا شوق تھا۔ اس نے جتنی بار مجھے مخاطب کیا تھا ایک نئے نام سے کیا تھا۔ اچانک اس نے بے پناہ سنگین لہجہ اختیار کیا اور بولا "میرا خیال ہے گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا، بے غیرتی کا تمغہ تو تو ہمیں دے ہی چکی ہے۔ اب تھوڑا سا بے غیرت بن جانا چاہئے کیوں تیرا کیا خیال ہے کبوترا خان؟"

کبوترا خاں نے کہا "حق کہہ رہے ہو چیف" اس نے سگریٹ سلگا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

اخترزماں مجھ پر جھپٹا اور سلگتی ہوئی سگریٹ میری کلائی پر مسل دی۔ میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے صرف ٹانگیں آزاد تھیں۔ میں نے اخترزمان کو زور سے ٹھوکر ماری۔ دفعتا پہلو سے کبوترا خاں عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میرے بالوں کو بل دے کر مٹھی میں جکڑ لیا۔ ایکا ایکی یوسف زور زور سے چیخنے لگا۔ "رک جاؤ' چھوڑ دو اسے' میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے ۔ میں بتاتا ہوں سب کچھ۔"

اس کی پکار سن کر اخترزماں' بخاری اور کبوترا خاں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ بخاری اور کبوترا خاں پیچھے ہٹ گئے جبکہ اخترزماں بدستور میرے سرہانے کھڑا رہا اور میرے بالوں کو بل دے کر مٹھی میں جکڑے رکھا "ہاں بک' کیا بکنا چاہتا ہے باجے" اس نے گرج کر کہا۔

یوسف نے کہا "اس کو چھوڑ دو' میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

"بتاؤ پھر...... کہاں ہے باز؟"

یوسف نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میرے ساتھ چلو' میں تمہیں وہاں تک لے چلتا ہوں لیکن باجی کو چھوڑ دو' اسے کچھ پتہ نہیں۔"

اخترزماں نے اس کی کمزوری پکڑتے ہوئے کہا "نہیں باجی تمہاری یہیں رہے گی' باز ہمیں مل جائے گا تو یہ چھوٹ جائے گی۔"

میں یوسف کے رویے کی تبدیلی پر حیران ہو رہی تھی' اس کا ظرف میری توقع سے کہیں زیادہ نکلا تھا۔ وہ اپنی جان پر اتنی اذیت سہہ گیا تھا لیکن مجھے مصیبت میں دیکھ کر سب کچھ ہارنے پر تیار ہو گیا تھا۔ ہم دونوں میں کوئی برسوں کی رفاقت نہیں تھی' نہ ہی یہ مہینوں کا ساتھ تھا۔ چند دن پرانی شناسائی تھی۔ اس مختصر شناسائی نے اسے اتنے بڑے فیصلے پر آمادہ کر دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اخترزماں اور اس کے ساتھیوں کو سب کچھ بتانے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"اس دن یوسف جب چودھری شہاب کے آدمیوں سے ڈر کر بھاگا تھا تو سیدھا

سرسوں کے ان کھیتوں کی طرف گیا تھا جہاں اس کے خیال میں اس کا ماموں یا ماموں زاد بھائی کام کر رہے تھے مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ اس کی ممانی بھی کھیت میں موجود تھی۔ وہ شوہر اور بیٹے کو روٹی دینے وہاں آئی ہوئی تھی۔ یوسف نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ ممانی کے ہوتے ہوئے وہ کھیت میں نہیں جا سکتا تھا اچانک اسے خیال آیا کہ اگر ممانی یہاں موجود ہے تو صغراں گھر میں اکیلی ہو گی اس نئی امید کے سہارے وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ باز اس نے ایک کھیس میں لپیٹ رکھا تھا اور کھیس کے اندر اس کے سر پر کالی ٹوپی چڑھا رکھی تھی۔ ٹوپی کی وجہ سے باز بالکل بے حس و حرکت تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کپڑے کے اندر پرندہ ہے۔ وہ گاؤں کی چند گلیوں سے گذر کر ماموں کے مکان کے پچھواڑے میں پہنچ گیا اور چار فٹ اونچی چار دیواری پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اسے صغراں تنہا مل گئی۔ اس نے اسے باز تھمایا اور ضروری ہدایات دینے کے بعد جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل گیا۔ اس کے بعد کے واقعات بھی اس نے مختصراً بیان کر دیئے۔

یوسف کی پوری بات سننے کے بعد اخترزماں نے پوچھا "یہ صغراں کون ہے؟"

یوسف نے کہا "میرے ماموں کی بیٹی اور میری منگیتر۔"

اختر زماں بولا "وہی جس کے بال بھورے ہیں اور ٹھوڑی پر پاس پاس دو تل ہیں۔"

یوسف نے اقرار میں سرہلا دیا۔ اخترزماں کی معلومات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یوسف کے روپوش ہونے کے بعد شکاری پارٹیوں نے اس بارے میں کافی تفتیش کی تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے اس کی چھوڑی ہوئی سائیکل سے یا کسی اور ذریعے سے یہ سراغ لگا لیا تھا کہ اپنے گھر سے غائب ہونے کے بعد وہ قریبی گاؤں میں شاید ماموں رحیم بخش کے گھر کا ہے۔ وہاں سے انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس نے اپنے ماموں کے گھر کا رخ کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ماموں اور دوسرے گھر والوں سے پوچھ گچھ کی ہو گی...... یہ بڑا لمبا چوڑا چکر تھا۔

ایک طرف میں اپنے خیالوں میں گم تھی اور دوسری طرف اخترزماں اور یوسف میں طے پا رہا تھا کہ یوسف' صغراں سے باز کیسے حاصل کرے گا اور کیسے اخترزماں کو

ہینڈاوور کرے گا۔ اختر زماں کے اصرار پر یوسف رضامند ہوگیا کہ وہ پیغام بھجوا کر صغراں کو باز سمیت کسی جگہ بلا لیتا ہے۔ اب مسئلہ صغراں کو بلانے کا تھا۔ طے یہ ہوا کہ یوسف' اپنے ماموں کے گاؤں "گوپور" میں اپنی ایک رازداں عورت سے مدد لے گا۔ اس کا نام سرداراں تھا۔ یہ رشتے کرانے والی نائن تھی۔ یوسف کے گاؤں میں بھی آتی جاتی تھی اور یوسف اس سے صغراں کا حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا۔ اس کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا اور رات کے اندھیرے میں یوسف باآسانی اس سے رابطہ قائم کرسکتا تھا۔

شام سے ذرا پہلے اختر زماں نے بخاری کو حکم صادر کیا کہ وہ اور کبوترا' یوسف کے ساتھ گوپور چلے جائیں۔ اس نے اپنے ریوالور کے علاوہ ایک واکی ٹاکی بھی بخاری کو دے دیا۔ یہ خاصی لمبی رینج کا سیٹ نظر آتا تھا۔ غالباً یو ایس اے کا بنا ہوا تھا۔ یو ایس اے ہی کی ایک طاقتور الیکٹرانک دوربین بھی میں نے جیپ میں دیکھی تھی۔ کبوترا کے پاس ایک ہلکی سی مگر بہت طاقتور گن تھی۔ ایسی گن میں نے ایک دفعہ ائرپورٹ پر ایک سیکورٹی آفیسر کے پاس دیکھی تھی۔ یہ گن بھی خاصی قیمتی دکھائی دیتی تھی۔ ان لوگوں کا سازوسامان دیکھ کر میں حیران ہونے کے علاوہ اور کیا کرسکتی تھی۔ اختر زماں نے یوسف کو کبوترا کی گن دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک سیکنڈ میں چھبیس گولیاں نکالتی ہے۔ ہوشیاری دکھاؤ گے تو چہرہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا تمہارا......... ہاں اگر اچھے فتومس بن کر تعاون کرو گے تو جان بھی بچے گی اور انعام بھی ملے گا۔"

کبوترا نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس نے ایک بوسیدہ سے کمبل کی بکل ماری تو پہچاننا مشکل ہوگیا کہ وہ شہری ہے یا دیہاتی۔ بخاری بھی چھولداری میں گیا اور اپنے ملازم کی شلوار قمیض پہن کر آگیا۔ عینک اتار کر اس نے گرم چادر کی بکل ماری تو منڈھے ہوئے سر کے ساتھ وہ سکہ بند دیہاتی نظر آنے لگا۔ صرف جوتے کی کسر تھی مگر اندھیرے میں جوتا کس نے دیکھنا تھا۔ پوری طرح تیار ہو کر انہوں نے یوسف کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اسے لے کر پک اپ میں جا بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پک اپ دھول اڑاتی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

سرد اور تاریک رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ شہر کی سردی اور بن کی سردی کا فرق مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ گھنے درختوں میں سرسراتی ہوا گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں کو چھو رہی تھی۔ یوسف اور بخاری وغیرہ کو گئے ہوئے اب چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی تک ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان کا آخری پیغام کوئی ڈھائی گھنٹے پہلے ملا تھا۔ جب وائرلیس پر انہوں نے اختر زماں کو اطلاع دی تھی کہ وہ تریموں ہیڈورکس کو جانے والی سڑک پار کرچکے ہیں اور اب مطلوبہ گاؤں کوئی ڈیڑھ دو میل کی دوری پر ہے۔ اس کے بعد ان کی گاڑی وائرلیس کی رینج سے دور چلی گئی اور سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ اختر زماں کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک وہ واپس آجائیں گے مگر اب نو بج چکے تھے۔ نہ وہ خود آئے تھے اور نہ ہی رابطہ بحال ہوا تھا۔ میں ایک چھولداری میں دہرا کمبل لپیٹے بیٹھی تھی۔ چند فٹ کی دوری پر اکائی کا ڈیک پورے زور شور سے انگلش دھنیں بجا رہا تھا۔ چھولداری سے باہر جیپ کے پاس اختر زمان' ان کا چوتھا ساتھی مقصود اور ملازم جیدا بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی نہ جانے وہاں کیا حالات پیش آئے ہوں گے۔ بہت سے سوال ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اگر یوسف نے باز واقعی اپنی منگیتر کو دیا تھا تو اس بچاری کے لئے یقیناً مصیبت کھڑی ہوگئی تھی۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ اس نے اسے رکھا کہاں ہوگا۔ وہ کوئی عام پرندہ نہیں تھا کہ مرغیوں کے ڈربے میں بند کرکے دانہ ڈال دیا جاتا۔ پھر صغراں کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اسے رازداری سے رکھتی۔ اسے یہ معاملہ اپنی ماں سے بھی چھپانا تھا۔ اگر وہ پرندہ اب بھی اس کے پاس تھا تو یہ کیا ضروری تھا کہ یوسف کے پیغام پر وہ اتنی رات گئے اس سے ملنے فوراً چلی آتی۔ اگر وہ نہ آتی یا سرداراں نامی اس عورت کو ہی کسی طرح کا شک پڑ جاتا تو معاملہ بہت گڑبڑ ہوسکتا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اختر زماں کا رابطہ پک اپ سے قائم ہوگیا۔ وہ دھیمے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آئے۔ پھر پریشانی کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے دو تین گالیاں بھی بکیں۔ پھر تیز تیز کچھ ہدایات دینے لگا۔ رابطہ منقطع کرکے وہ بے قراری سے آگ کے گرد ٹہلنے لگا۔ ان کا چوتھا ساتھی مقصود بھی الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ صورت حال کسی طوفان کا پیشہ خیمہ دکھائی دے

رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد جنوبی سمت سے پک اپ کے انجن کا تیز شور سنائی دیا۔ چند ہی لمحے بعد پک اپ لہراتی' شور مچاتی آگ کے پاس آکر رکی۔ پک اپ کے اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک لڑکی کبوترا خان کی بانہوں میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کی چیخیں انجن کے شور میں سے ابھر ابھر کر چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ بخاری اور یوسف کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ڈرائیور' جو پک اپ چلا رہا تھا۔ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جب دروازہ کھول کر باہر نکلا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کے ایک کندھے سے قمیص پھٹی ہوئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ کبوترا خاں نے لڑکی کو دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور آگ کے پاس لا کر پٹخ دیا۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی اور اس کی چیخیں دور تک گونج رہی تھیں۔ آگ کی روشنی میں میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہی صغراں ہے۔ اس کے بال بھورے تھے اور وہ کم عمر بھی تھی۔ بمشکل پندرہ سال عمر رہی ہوگی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو........ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میرا ابا مجھے جان سے مار دے گا' مجھے گھر جانے دو۔"

کبوترا خان نے اختر زمان سے کچھ کہا۔ اختر زمان نے اسے اشارہ کیا کہ لڑکی کو جیپ میں لے جائے۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کی چیخ و پکار کسی بھولے بھٹکے شخص کو یہاں کھینچ لائے (حالانکہ اس کا امکان نہیں تھا۔)

میں ششدر تھی کہ یہ بگڑے ہوئے رئیس زادے کیسی من مانیاں کر رہے ہیں۔ مالی فائدے یا شوق کی خاطر وہ ہر اخلاقی قدر کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے اس اقدام کے کتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ جس لڑکی کو یہاں اٹھا لائے تھے وہ کلبوں میں شامیں گزارنے والی اور گولف کھیلنے والی کوئی انگلینڈ پلٹ ماریہ' نادیہ' یا نینا وغیرہ نہیں تھی' صغراں تھی' دیہاتن صغراں' تیل سے بال چپڑنے والی' موٹی اوڑھنی اوڑھنے والی اور شام کے بعد دہلیز سے قدم باہر نہ رکھنے والی۔ وہ اس زمین کا وہ نرم و نازک پودا تھی جو باد سموم کے پہلے جھونکے ہی سے فنا ہو جاتا ہے........ اور یہ غنڈے اسے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا' انہوں نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔

وہ چلا رہی تھی "میرا ابا مجھے مار ڈالے گا" اور وہ اسے ٹیوٹا جیپ کی طرف کھینچ رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا کہ کیا کروں' چند لمحے کے لئے میں پتھرا کر رہ گئی۔

دفعتاً میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپکتی ہوئی جیپ کی طرف گئی' صغراں کو اب اٹھا کر جیپ میں ڈالا جا رہا تھا۔ "رک جاؤ..... رک جاؤ" میں نے چیخ کر کہا مگر میرے وہاں پہنچتے پہنچتے صغراں اس چھوٹے سے عقوبت خانے میں پہنچ چکی تھی۔ کبوترا اور اخترزماں بھی اس کے ساتھ ہی جیپ میں گھس گئے تھے۔ میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے شیشے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ چوڑے جبڑوں اور گندمی رنگت والا مقصود مجھے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اخترزماں نے دانت کچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ایک گالی دے کر بولا "آنے دو اس کو بھی اندر" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بازو تھام کر مجھے اندر کھینچ لیا۔ گرج کر بولا "چپ چاپ اس پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ' شور مچاؤ گی تو شوٹ کر دوں گا' اپنے باپ کی قسم شوٹ کر دوں گا۔" اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا اور غصے کی زیادتی کی وجہ سے اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ کبوترا خاں نے کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے۔ چیخ چیخ کر صغراں کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ پورے زور سے بولتی تھی تو بھی اس کی آواز دس بارہ گز سے دور نہیں جاتی تھی۔

"باجی جی! مجھے بچالیں" وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی "خدا رسول ﷺ کی قسم میرا کوئی قصور نہیں ہے" گاڑی کی اندرونی روشنی میں' میں نے غور سے اس کا حلیہ دیکھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں' گردن پر خراشیں تھیں اور چھینٹ کی پھولدار قمیض بھی آستین سے ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے اور بھی کمسن نظر آتی تھی۔

اخترزماں نے غرا کر کہا "چپ کر جا' کچھ نہیں کہیں گے ہم تجھے لیکن اگر شور مچاتی رہی تو......" اس نے ریوالور لہرا کر صغراں کو دھمکی دی۔ وہ بیچاری سہم کر چپ ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لئے اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے

لگی۔

اخترزماں نے تیز لہجے میں کبوترا سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟ وہ تیرا باپ بخاری کہاں ہے؟ اور وہ لڑکا؟"

کبوترا نے کہا "چیف! شکر کر ہم آگئے ہیں۔ وہاں تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اب بھی کچھ پتہ نہیں کیا بنتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہاں سے بستر بوریا گول ہی کرلیں۔"

"کیوں' ہوا کیا ہے؟"

"پولیس پیچھے لگ گئی ہے' بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔ تریموں ہیڈورکس کے پاس انہوں نے روکا تھا' ہم بھاگ نکلے۔ پانچویں میل سے ذرا آگے ٹکر ہوگئی۔ ہماری جیپ ایک سائیکل والے کو گرا کر کچے میں اتری اور درخت سے ٹکرا گئی۔ پولیس والوں کی پک اپ بھی قلابازی کھاگئی۔ پتہ نہیں کتنے مرے ہیں اور کتنے بچے ہیں۔" کبوترا کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

اخترزماں نے غرا کر کہا "پاگل کے بچے! مجھے شروع سے بتا کیا ہوا تھا' لڑکی کہاں سے ملی اور پولیس کب پیچھے لگی؟"

کبوترا گھگیا کر بولا "چیف! یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں ہے' میں تو کہتا ہوں بھاگ چلیں۔"

اخترزماں نے پوچھا "کوئی بندہ قتل تو نہیں ہوگیا تم سے؟"

کبوترا بولا "چیف! قتل تو نہیں ہوا مگر پلسیوں کی پک اپ جو الٹ گئی ہے۔ کیا پتہ ایک دو ختم ہوگئے ہوں۔"

اخترزماں کچھ دیر پریشانی سے سوچتا رہا۔ لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک نظر کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور بولا "اچھا ٹھیک ہے' اگر نکلنا ہے تو جلدی کرو فالتو' خیمے وغیرہ رہنے دو ادھر ہی' ضروری سامان لے لو چلو جلدی کرو۔"

اس کی ہدایت پر کبوترا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا تو چیف نے پوچھا "لیکن ان دونوں کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

کبوترا بولا "وہ بڑی نہر کی طرف گئے ہیں۔ میواتیوں کے گاؤں میں پہلے یہاں سے نکل چلیں پھر میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔"

کبوترا' مقصود' ملازم اور ڈرائیور جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے۔ اخترزماں نے مجھے حکم دیا کہ میں صغراں کا پراندہ کھول کر اس سے اس کے ہاتھ باندھ دوں۔

"میں یہ نہیں کروں گی" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ خوفناک لہجے میں انتہائی خوفناک دھمکیاں دینے لگا۔ اس گھڑی وہ سچ مچ کوئی درندہ نظر آ رہا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور جلتی آنکھیں ہم دونوں کو گھور رہی تھیں۔ یکایک کہیں نزدیک سے گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ یہ دو یا تین گاڑیاں تھیں۔

کبوترا اور مقصود بھاگتے ہوئے جیپ میں آگئے۔ کبوترا کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "یار چیف! میرا خیال ہے وہ آگئے۔"

اخترزماں ہم دونوں کو ریوالور کی زد میں لے کر غرایا "اگر تم دونوں نے اونچی آواز میں سانس بھی لیا تو میں مار دوں گا۔" پھر اس نے مقصود سے کہا "چل صودی! اب آگے لگ' تیرا باپ ایس پی ہے تو ہی نبڑ اپنے رشتے داروں سے۔"

مقصود عرف صودی بولا "ٹھیک ہے پھر وہ ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تم ان کو آواز نہ نکالنے دینا۔ دروازے اندر باہر سے لاک کرلو۔ میں بات کرتا ہوں ان سے۔"

اس گفتگو کے دوران گاڑیاں موقعے پر پہنچ چکی تھیں۔ ان کی تیز ہیڈ لائٹس شاخوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے بڑی دانشمندی سے بھاگنے کے دونوں راستے مسدود کردیئے تھے۔ ہماری گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ لہٰذا باہر کی آوازیں نہ ہونے کے برابر ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اخترزماں نے ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹایا تو میں نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک گاڑی کی روشنی میں' میں نے دیکھا' مقصود پولیس انسپکٹروں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے اشاروں اور بولنے کے انداز سے اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی وہ پک اپ پاس ہی کھڑی تھی جس کا پیچھا کرتے ہوئے پولیس کی جیپ الٹی تھی۔ پک اپ کا زخمی ڈرائیور بھی نزدیک ہی موجود تھا۔ ان دونوں اہم ثبوتوں کی موجودگی میں وہ نہ جانے پولیس کے سامنے کیا صفائی پیش کر رہا تھا...... تھوڑی دیر بعد وہ آوازیں جیپ کے بالکل قریب سے آنے لگیں۔ بولنے والے بڑے تیز تیکھے لہجے میں بول رہے تھے۔

"انسپکٹر! میں پھر کہہ رہا ہوں' تم اچھا نہیں کر رہے ہو" یہ مقصود کی آواز تھی۔

جواب میں انسپکٹر کی بھاری آواز سنائی دی "اوئے دیکھ لیں گے ہم تجھ پاٹے خاں کو' چل پیچھے ہٹ' نہیں تو نکالتا ہوں گو رنری.........."

مقصود کی خطرناک آواز آئی "ٹل جا انسپکٹر' اب بھی ٹل جا۔"

جواب میں کسی نے بند دروازے کے ہینڈل کو جھٹکا دیا اور زور سے بولا۔

"باہر نکلو اوئے" یہ دوسرے انسپکٹر کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے ہاتھاپائی کی آوازیں آئیں۔

اخترزماں نے جیپ کے بند دروازے کو ایک سخت جھٹکے سے کھولا۔ انسپکٹر جو باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا' دروازہ لگنے سے دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی مقصود نے اوپر تلے دو فائر کئے۔ میں نے ایک دراز قد پولیس والے کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ پھر دو گولیاں سنسناتی ہوئی جیپ کی باڈی میں لگیں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صغراں بھی ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ کبوترا خاں نے جیپ کے اندر ہی سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس کا رخ بائیں جانب تھا۔ اس کی جدید آٹومیٹک رائفل اوپر تلے شعلے اگل رہی تھی۔ یکایک ایک زبردست چھناکے سے جیپ کی ونڈ اسکرین چور چور ہو گئی۔ "بھاگو صغراں" میں نے دبی دبی آواز میں کہا اور خود بھی کھسکتی ہوئی جیپ سے باہر آگئی۔ تاریکی میں چاروں طرف شعلے سے لپک رہے تھے۔ کسی پولیس افسر کی گرجدار آواز سنائی دی "نذر حسین! بائیں طرف ہو جا' کوئی بھاگنے نہ پائے" جواب میں اخترزماں نے بلند آواز میں اپنے کسی ساتھی کو للکارا۔ میں حتی الامکان جھک کر چلتی ہوئی آڑ کی تلاش میں بھاگی۔ میں نے محسوس کیا کہ صغراں بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں ایک پولیس جیپ کے پاس سے گزریں۔ غالباً پک اپ کی طرف سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ پولیس جیپ کی دونوں ہیڈلائٹس چھناکوں سے ٹوٹ گئیں اور شیشے کی کئی چھوٹے ٹکڑے میرے بائیں ہاتھ پر لگے۔ میں نے صغراں کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی محفوظ سمت میں لے گئی۔ گہری تاریکی میں ہم دور تک بھاگتی چلی گئیں۔ آخر صغراں ہانپ کر بیٹھ گئی وہ ہانپتے ہوئے بولی "باجی! پولیس والوں نے انہیں پکڑ لیا ہوگا' اب تم کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

ایک لمحے کے لئے میں چونک گئی۔ صغراں کی اور میری سوچ میں فرق تھا۔ اس کے لئے پولیس سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں تھی جبکہ میرے پاس تھی' میں ایک مفرور ملزمہ تھی۔ حالانکہ پولیس ہمارے لئے امداد غیبی کی صورت میں آئی تھی مگر اس "امداد غیبی" کا سامنا کرنا میرے لئے بے حد دشوار تھا۔

میں نے کہا "اٹھو صغراں' ہمیں آگے جانا ہے یہاں رکنا خطرناک ہے" وہ نیم رضامندی سے اٹھی اور ایک بار پھر میرے ساتھ بھاگنے لگی۔

اس جگہ سے کوئی ایک میل آگے آنے کے بعد ہم بڑی نہر تک پہنچ گئیں اور ایک چھوٹی سی تنگ پلیا کے نیچے بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ اس وقت تک رات کے قریباً ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ٹھٹھری ہوئی "دیہاتی رات" اوس میں بھیگی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی' بس بہتے پانی کا ہلکا سا شور تھا جو گھنے پتوں کی سرسراہٹ کے ساتھ مل کر فضا کو کچھ اور خنک کر رہا تھا۔ میرے جسم پر ایک گرم چادر تھی جبکہ صغراں کا سر بھی ننگا تھا اور پاؤں بھی۔ جونہی اس کی سانسیں کچھ بحال ہوئیں وہ سردی سے کانپنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔ وہ رو رہی تھی "ہائے ربا' میں کیا کروں؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ.........؟" اس نے کراہتے ہوئے کہا......... مجھے تھوڑی دور ایک کشتی کے آثار نظر آئے۔ یہ کافی بڑی کشتی تھی۔ اسے پانی سے نکال کر کوئی آٹھ دس فٹ خشکی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ کشتی پر ایک چھوٹا سا خیمہ یا جھونپڑا بھی تھا۔ میں صغراں کو لے کر کشتی کی طرف بڑھی۔ یہ ایک پرانی اور شکستہ کشتی تھی۔ جگہ جگہ جوڑ لگے ہوئے تھے۔ جھونپڑا بھی ٹوٹا پھوٹا تھا۔ تاہم اس وقت ہمیں یہاں پناہ مل سکتی تھی۔ میں نے احتیاط سے کشتی کا جائزہ لیا اور صغراں کو لے کر جھونپڑے میں آگئی۔ یہاں ایک پیال کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ ڈھیر ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ ہم دونوں نے گرم چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی اور پیال میں گھس کر بیٹھ گئیں۔ سن رکھا تھا کہ پیال سردیوں میں لحاف کا کام دیتی ہے۔ آج یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔

میں ہمدردانہ لہجے میں صغراں سے باتیں کرنے لگی۔ میرے خلوص نے اسے متاثر کیا اور وہ جلد ہی اپنے دکھ کی شدت میں کمی محسوس کرنے لگی۔ میں نے اسے یوسف کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ یوسف اور میں کن حالات میں

اخترزماں کے چنگل میں پھنسے اور پھر یوسف کو کیونکر اسے پیغام دے کر بلانا پڑا۔ یہ جان کر کہ میں نے خان رحیمی کی کوٹھی میں تین دن یوسف کو پناہ دے رکھی تھی صغراں مجھ سے اور بھی متاثر ہوئی۔ وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یوسف مجھے اپنے حالات کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا ہے۔ لہٰذا وہ بھی کھل کر باتیں کرنے لگی۔ اس نے فکرمندی سے کہا "باجی! پتہ نہیں' وہ یوسف کو کہاں لے گیا ہے وہ تو زخمی بھی تھا۔ ہائے اللہ کتنی چوٹ آئی ہے اس کو منہ پر' میرا تو دل ہول رہا ہے۔"

"کون لے گیا ہے اس کو' وہی منڈھے ہوئے سر والا تو نہیں تھا؟"

صغراں نے اقرار میں سر ہلایا اور بولی "وہ بڑا غصے میں تھا' کہیں وہ یوسف سے جھگڑ نہ پڑا ہو' باجی......... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے......... اب کیا ہوگا میرا......... میرا ابا تو مجھے کاٹ ہی ڈالے گا۔"

وہ سخت پریشان تھی اس کا دھیان یوسف کی طرف جا رہا تھا اور کبھی اپنے ابے کی طرف' رہ رہ کر وہ پولیس کی جیپ کا ذکر بھی کر رہی تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے الٹ کر کھیت میں گری تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھے اور ان دیکھے مناظر خوف بن کر جمے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "صغراں! مجھے اس طرح کچھ سمجھ نہیں آ رہی' تو مجھے شروع سے بتا کیا واقعہ ہوا ہے۔ کیا وہ باز سچ مچ......... میرا مطلب ہے کیا ہوا ہے اس باز کے ساتھ؟"

صغراں نے بڑی معصومیت کے ساتھ ناک سے شوں شوں کی آواز نکالی اور الٹے ہاتھ سے آنسو پونچھ کر بولی "باجی! یہ منگل کی بات ہے' پچھلا ٹائم تھا۔ یوسف بڑا گھبرایا ہوا ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ میں اس وقت اکیلی تھی۔ اس نے کھیس میں لپٹا ہوا ایک باز مجھے دیا اور کہا میں اسے کہیں چھپا لوں۔ وہ کل یا پرسوں کسی وقت آ کر لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ میں باز کو چھت پر اپلوں والی کوٹھڑی میں لے گئی۔ اس کوٹھڑی میں میرے سوا کوئی کم ہی آتا جاتا ہے۔ میں نے سوچا یہاں یہ حفاظت سے رہے گا۔ مرغیاں ڈھانپنے والا ایک پرانا ٹوکرا ہمسائی کی چھت پر پڑا تھا۔ میں اٹھا لائی اور باز کو اپلوں والی کوٹھڑی میں اس کے نیچے رکھ دیا۔ تین دن کسی کو بالکل پتہ نہیں چلا۔ آج سویرے جب میں باز کو کلیجی کے ٹکڑے کھلانے کے لئے چھت پر

گئی تو دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باز وہاں نہیں ہے۔ میں بڑا گھبرائی۔ سارے کوٹھے پر دیکھا پر کچھ پتہ نہیں چلا۔ کوٹھڑی کے کچے فرش پر کسی بچے کے پاؤں لگے ہوئے تھے۔ ایک ایسا ہی نشان ایک گیلے اپلے پر بھی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون بچہ ہے جس نے یہ کام کیا ہے۔ ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ ہمارے گاؤں کا ڈاکیا نور محمد ہمارے گھر آ کر میری ماں سے باتیں کرنے لگا۔ میں بھی پاس جا کر سننے لگی۔ ڈاکئے نور محمد نے ماں سے کہا۔

"بہن جی! صبح نماز پڑھنے جا رہا تھا کہ ایک بچہ آپ کے گھر کی پچھلی طرف سے بھاگ کر قبرستان کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ بالو تھا۔ میں نے آواز دی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے نکل گیا۔ سوچ سوچ کر آپ کی طرف آیا ہوں کہ کہیں وہ آپ کی کوئی چیز ہی اٹھا کر نہ لے گیا ہو۔ آپ ذرا اندر جا کر دیکھ بھال لیں۔

میری ماں گھبرائی ہوئی اٹھی اور اندر جا کر ٹرنک وغیرہ دیکھنے لگی۔ اسے زیادہ فکر میرے جہیز کے سامان کی تھی۔ سب کچھ دیکھ لیا مگر کوئی ایسی بات نہیں تھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ چاچے نور محمد کو اطمینان ہو گیا اور وہ چلا گیا......... میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی پر میں کسی کو بتا نہیں سکتی تھی......... یوسف نے مجھے زبان بند رکھنے کو کہا ہوا تھا۔

یہ بالو میواتیوں کی بستی کا رہنے والا ہے۔ اس کا قد بہت چھوٹا ہے بس تین ساڑھے تین فٹ ہوگا۔ سر بہت بڑا ہے' عمر کوئی چالیس سال ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اسے گاؤں کی گلیوں میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ اس کی آواز اچھی ہے۔ دردناک آواز میں قصے کہانیوں کے شعر پڑھتا ہے اور لوگوں سے پیسے اناج وغیرہ اکٹھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی اسے چرس بھی پیتے دیکھا گیا ہے۔ میرے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ اسی بالو کا کام ہے۔ میں سارا دن روتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ شام کے وقت سرداراں آ گئی۔ اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا کہ گاؤں سے باہر یوسف میرا انتظار کر رہا ہے اور اس نے کہا ہے کہ جو چیز اس نے مجھے سنبھالنے کو دی تھی وہ لے کر آ جاؤں۔ میں کسی نہ کسی طرح بہانہ بنا کر گھر سے نکلی اور پرانے باغ میں یوسف سے ملنے آ گئی۔ میں نے یوسف کو بتایا کہ باز گم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے لگا۔ اتنے میں درختوں سے تین

آدمی نکل آئے۔ ان میں ایک تو کبوترا خان تھا اور دوسرا وہی گنجے سر والا' وہ مجھے گھور
لگے اور کہنے لگے "تم جھوٹ بول رہی ہو' سچ بتاؤ باز کہاں ہے" میں ڈر کر رونے لگی۔
ہم دونوں کو لے کر اپنی نیلی گاڑی کے پاس آ گئے....... یوسف کے پوچھنے پر میں نے ا
ساری بات بتا دی۔ میری زبان سے بالو کا نام سن کر یوسف نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو
جب میں تمہیں ہیرو دینے کے لئے تمہارے گھر آیا تھا اور پچھلی دیوار پھلانگی تھی' یہ با
گلی میں موجود تھا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اگر باز کسی نے چوری کیا ہے تو وہ بالو
سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا......" گنجے سر والا اور اس کے ساتھی ہم دونوں کی باتوں
جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یوسف نے مجھے کوئی اشارہ کر دیا ہے یا میرے
کان میں کوئی بات کہہ دی ہے جس کی وجہ سے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ کبوترا خا
نے اپنی بندوق میری طرف سیدھی کرلی اور غصے سے بولا'

"ایسی کہانیاں ہم نے بہت سنی ہوئی ہیں' ہمیں باز کے بارے میں بتاؤ یا مرنے کے
لئے تیار ہو جاؤ۔"

میں سچ مچ ڈر گئی۔ میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں وہی سچ ہ
لیکن ان میں سے کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے یوسف کے ساتھ مجھے بھی ڈرا
دھمکا کر گاڑی میں سوار کرلیا اور کہا کہ ہم انہیں اسی وقت بالو کے پاس لے چلیں۔
میواتیوں کا گاؤں اس نہر کے دوسرے کنارے پر یہاں سے تقریباً تین چار میل کی دوری پر
ہے۔ ہمارے گاؤں سے بھی اس کا فاصلہ چار پانچ میل کے قریب ہے لیکن راستہ خراب
ہے اور گاڑی آگے تک نہیں جاسکتی...... ہماری گاڑی بھی کوئی دو میل جانے کے بعد
رک گئی۔ راستہ تھا ہی نہیں۔ کھیت تھے یا پگڈنڈیاں تھیں۔ گنجے سر والے نے اپ
ساتھیوں سے مشورہ کیا اور یوسف کو لے کر نیچے اتر گیا۔ اس نے کبوترا سے کہا کہ وہ مجھ
لے کر ڈیرے پہ چلا جائے...... خود وہ یوسف کو لے کر پیدل ہی آگے بڑھ گیا۔ میں چیخنے
چلانے لگی۔ کبوترا نے مجھے تین چار تھپڑ مارے۔ یہ دیکھ کر یوسف نے گنجے سر والے سے
ہاتھا پائی شروع کر دی مگر اس نے پستول کی نال یوسف کے سر سے لگا دی اور اسے دھکیلتا
ہوا درختوں کی طرف لے گیا......" یہاں تک کہہ کر صغراں سسکنے لگی۔ میں نے گرم چادر
اچھی طرح اس کے کندھوں پر ڈالی اور دلاسہ دے کر چپ کرایا۔ وہ گلوگیر لہجے میں کہنے

"میں بہت روئی چلائی مگر کبوترا نے میری دونوں باہیں جکڑ کر مجھے سیٹ پر بٹھا دیا
ر گاڑی موڑ کر دوسری طرف کا رخ کرلیا۔ دو میل کچے راستے پر سفر کرنے کے بعد ہم
کی سڑک پر پہنچے تو میری چیخیں سن کر پلس کی ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ پلس کو دیکھ
کر کبوترا ڈر گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی
تیز چلائے اور کچھ بھی ہو جائے آہستہ نہ کرے۔ ڈرائیور نے ایسا ہی کیا۔ دونوں گاڑیوں
بہت دوڑ لگی۔ ہماری گاڑی دائیں بائیں ڈول رہی تھی اور کبھی کبھی تو لگتا تھا ابھی
الٹ جائے گی۔ پلس کی گاڑی پرانی تھی پھر بھی وہ پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ پھر دونوں
گاڑیاں بالکل پاس پاس چلنے لگیں۔ ایک دو بار گولی بھی چلی۔ مجھے پتہ نہیں وہ کون سی جگہ
تھی جہاں ہمارے والی گاڑی ایک سائیکل والے کو بچاتی بچاتی کچے میں اتر گئی اور زور زور
سے اچھلنے کے بعد ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ پلس کی گاڑی بھی ہمارے بالکل پیچھے تھی۔
وہ الٹ گئی اور قلابازی کھا کر ایک کھیت میں جا کر گری۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میری چیخیں
نکل گئیں۔ کبوترا خاں نے چلا کر ڈرائیور سے پوچھا بچ گئے ہو۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا
"بڑی سخت چوٹ آئی ہے پر بچ گیا ہوں" وہ بولا "پھر سوچتے کیا ہو بھاگو' انہوں نے گاڑی
پیچھے ہٹائی اور ایک بار پھر پکی سڑک پر چڑھا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پلس کی گاڑی
میں سے دھواں نکل رہا تھا اور سپاہی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے...... اس
کے بعد آپ کو پتہ ہی ہے ہم کیسے وہاں پہنچے اور کیسے پلس نے وہاں چھاپہ مارا۔"

صغراں کی روئیداد نے بہت سی کڑیاں آپس میں ملا دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا
اس باز کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو ایک نہایت قیمتی اور "شام الاٹ" چیز کے ساتھ
ہوسکتا ہے۔ غالباً بالو نامی اس شخص نے یوسف کو پراسرار انداز میں صغراں کے گھر داخل
ہوتے دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ اسی تجسس نے اسے
جرم پر ابھارا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ قیمتی پرندہ اب صغراں کے گھر سے غائب تھا......
میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ کچھ آہٹیں سن کر چونک گئی۔ یہی کیفیت صغراں کی ہوئی۔
اس کا چھوٹا سا خوبصورت دہن کھل گیا اور ڈری ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے
لگی۔ ایک سے زائد افراد تیز تیز چلتے اس کشتی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں

بھی کر رہے تھے۔ ہم دونوں پیال کے اندر کچھ اور بھی دبک گئیں۔ میں نے دل کو دلاسہ دیا کہ رات کے اس پہر اس شکستہ حال کشتی کی طرف کس نے آنا ہے۔ راہ گیر ہوں گے پاس سے گزر جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا وہ افراد سیدھے کشتی کی طرف آئے۔ پھر میں نے کشتی میں جنبش محسوس کی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ان لوگوں کا تعلق یقیناً اسی کشتی سے تھا۔ صغراں سہم کر میرے ساتھ چپک گئی۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر ایسے لگا کہ تین چار افراد مل کر زور لگا رہے ہیں۔ ایکاایکی کشتی اپنی جگہ سے حرکت میں آگئی۔ وہ دور ڈھلوان کیچڑ پر پھسلتی ہوئی پانی کی طرف جا رہی تھی۔ ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ میں نے کشتی کو پانی کی لہروں پر محسوس کیا۔ کشتی نہر میں اتاری جا چکی تھی۔ یہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا او یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کشتی کو رات کے اس پہر کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ صغراں رو دے گی یا اٹھ کر بھاگ نکلے گی۔ میں نے ایک بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ کشتی والے چپو چلاتے ہوئے تیزی سے بہاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی بھرائی ہوئی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سے جاگے ہیں یا جگائے گئے ہیں۔ اب پتہ چل رہا تھا کہ ان کی تعداد پانچ سے کم ہرگز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک شخص کے لہجے میں کچھ زیادہ گھبراہٹ تھی۔ وہ کسی جگہ آگ لگنے کا ذکر کر رہا تھا۔ لاش، جلی ہوئی بکریاں اور صلو بھائی کے الفاظ بھی بار بار اس کی گفتگو میں آ رہے تھے۔ پانی کے بہاؤ پر کشتی کی رفتار ہر لحظہ تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی گفتگو میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ جلد ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کسی جگہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ شاید آگ وغیرہ لگ گئی ہے۔ قریبی گاؤں سے ایک ڈاکٹر اور ایک کمپاؤنڈر کو جائے حادثہ پر لے جایا جا رہا ہے۔ کشتی میں اس گاؤں کا چودھری بھی سوار تھا۔ ہم دونوں کو ہر لحظہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اندر نہ آ جائے۔ ایسا ہو جاتا اور آنے والے کے پاس معمولی روشنی بھی ہوتی تو ہمارا پکڑا جانا یقینی تھا۔ کشتی کی رفتار سائیکل کی عام رفتار سے کم نہیں تھی۔ چپوؤں کی چھپاچھپ سناٹے میں دور تک گونج رہی تھی۔ آخر ہمیں کشتی والوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ چپوؤں کی صدا مدہم ہوئی۔ چند ہلکے پھلکے جھٹکے کھانے کے بعد کشتی کنارے سے جا لگی۔ کشتی کو کھینچ کر کنارے پر چڑھا دیا گیا۔

اس وقت میں نے پیال میں سے تھوڑا سا آگے کو کھسکتے ہوئے دروازے سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ مجھے کچھ فاصلے سے بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں اور اس کے ساتھ ہی آسمان پر نامانوس سرخ روشنی دکھائی دی۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ کہیں آگ لگ ہوئی ہے۔ جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے باہر دیکھا۔ کشتی خالی تھی۔ کنارہ اونچا تھا اس لئے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاں فضا میں ایک حدت سی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے موسمی حدت آگ کی مرہون منت تھی۔ میں نے سرگوشی میں صغراں کو باہر آنے کی ہدایت کی۔ وہ میری چادر لپیٹے ہوئے باہر آگئی۔ کشتی کی نوک کے پاس ایک خانے میں بوسیدہ سی نیم روشن لالٹین رکھی تھی۔ لالٹین کے پاس ہی ایک دھوتی یا اس قسم کا کوئی کپڑا تھا۔ میں نے یہ کپڑا اٹھا کر اوڑھ لیا۔ کشتی کے درمیان والے حصے میں اب کوئی ایک انچ پانی کھڑا تھا۔ غالباً کشتی کا پیندہ رستا رہتا تھا۔ عجیب سی کشتی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہمیں چلا کر اتنی دور لے آئی ہے۔

میں صغراں کے ساتھ احتیاط سے کنارے پر چڑھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر آیا۔ ایک کچی پکی بستی کا ایک حصہ آگ کی زد پر تھا۔ بہت سے مکان جل کر راکھ ہو چکے تھے اور کچھ ابھی جل رہے تھے۔ بستی کے اردگرد نشیب و فراز میں دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔ آگ کی روشنی ان کے متحرک جسموں پر منعکس ہو رہی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ لوگ ٹولیوں اور مجمعے کی صورت میں جگہ جگہ کھڑے تھے۔ اردگرد کی پگڈنڈیوں پر لوگ تیز قدموں سے آ جا رہے تھے............ ہم دونوں نے دیہاتی انداز میں چادریں لپیٹیں اور دھڑکتے دل کے ساتھ ہجوم میں شامل ہو گئیں۔ اس پر ہنگام نیم تیرگی میں امید نہیں تھی کہ کوئی ہمیں پہچان سکے گا۔ میں نے دیکھا ایک جگہ تین لاشیں زمین پر رکھی تھیں ان کے قریب بہت سی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا یہ عورتیں میواتی تھیں۔ تماشائیوں میں بہت سے میواتی نظر آ رہے تھے۔ صغراں حیران کن نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرا بازو دبایا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر کہنے لگی۔

”باجی! یہی تو میواتیوں کا گاؤں ہے۔ میں ایک دو بار اس راستے سے گزر چکی ہوں۔ اچھی طرح پہچانتی ہوں میں۔“

صغراں کے لہجے میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ شاید اسے یوسف کا خیال آگیا تھا۔ وہ بھی تو دو ڈھائی گھنٹے پہلے بخاری کے ساتھ اسی گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا...... پتہ نہیں یہاں پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں سے سنگین ترین خطرات کی بو آ رہی تھی۔ فرط غم سے نڈھال ہو کر صغراں ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "باجی...... مجھے کچھ ہو رہا ہے۔" اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔ میں نے جلدی سے بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ اس کا دل ہائی سپیڈ مشین کی طرح دھڑک رہا تھا۔ بڑی نرم و نازک لڑکی تھی وہ۔ اوپر سے محبت کی مار نے اسے بالکل ہی بے دم کیا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے حواس بحال ہوئے۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

"صغراں! حوصلے سے کام لے' اس طرح تو لوگوں کو شک پڑ جائے گا' چل اٹھ کر کھڑی ہو جا' چل شاباش" وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑی ہو گئی۔ میں اسے لے کر داہنی طرف بڑی۔ اچانک ایک طرف سے شور بلند ہوا کچھ لوگ ایک بڑی سی چارپائی کندھوں پر اٹھائے برآمد ہوئے اور اسے بڑے آرام سے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا۔ جلے ہوئے گوشت کی بو سے دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے آنکھوں پر جبر کرتے ہوئے چارپائی پر نگا دوڑائی۔ ایک گرانڈیل لاش پوری چارپائی پر پھیل ہوئی تھی۔ اس شخص نے چوڑی دار پائجامہ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ سینے اور گردن پر بال ہی بال تھے اور چہرہ...... چہرے کی طرف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بری طرح جلا ہوا تھا۔ میواتی عورتوں کی ایک جماعت اس لاش کے گرد بین کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ان کی گریہ زاری سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں صغراں کو کھینچتی ہوئی اس منظر سے دور ہٹنے لگی۔ مگر اس رخ پر میں زیادہ آگے نہیں جا سکی۔ اتفاقاً میری نگاہ پولیس کی گاڑیوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ دو گاڑیاں تھیں اور ان کے اردگرد مسلح سپاہی ٹہل رہے تھے۔ اب اس جگہ ایک لمحہ بھی رکنا میرے لئے خطرناک تھا۔ میں نے صغراں کو مخالف سمت میں کھینچا اور ہجوم کو چیرتی ہوئی نہر کی طرف بڑھنے لگی۔ کشتی ابھی تک اسی جگہ کھڑی تھی لیکن خالی نہیں تھی۔ چند آدمی کسی زخمی کو ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اس میں سوار ہو رہے تھے۔ بہرحال کشتی سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ہم نہر کی ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھنے لگیں۔ تاریکی میں قدم قدم پر خوف کا پہرہ تھا اور ہر شجر کے پیچھے جیسے ایک حادثے نے گھات لگا رکھی تھی۔

اونچے سرکنڈوں میں چلتی ہم کوئی دو فرلانگ آگے آئی تھیں کہ ایک موڑ پر اچانک ایک سایہ ہمارے سامنے آگیا۔ ہم ٹھٹھک کر پیچھے ہٹیں۔

"ب...... باجی' یہ میں ہوں یوسف" یوسف کی آواز سن کر میں سناٹے میں رہ گئی' ظاہر ہے صغراں کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ چند لمحوں کے لئے ہم کچھ بھی نہ بول سکیں۔ پھر صغراں بے تابی سے یوسف کی طرف بڑھی لیکن چند قدم چل کر رک گئی۔ غالباً اسے یاد آگیا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

"یوسف کہاں تھے تم؟" اس نے جذبات سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

یوسف نے قریب آکر کہا "میں نے آپ کو پولیس کی گاڑیوں کے پاس سے مڑتے دیکھ لیا تھا مگر...... مگر یہ ان باتوں کا موقع نہیں' آپ آئیں میرے ساتھ...... میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔"

وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ ٹخنے کے زخم کی وجہ سے وہ بری طرح لنگڑا رہا ہے۔ اسے بولنے میں بھی خاصی دقت پیش آئی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ہمیں درختوں کے درمیان ایک ہموار جگہ لے آیا۔ یہاں فربہ جسم اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا ایک شخص موجود تھا۔ اس نے گھٹنوں تک لمبا ایک چوغہ پہن رکھا تھا۔ چوغے کا رنگ اندھیرے میں تو نظر نہیں آیا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ زرد تھا۔ چوغے والے کے گلے میں کچھ مالائیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ شخص کوئی پیر قسم کی چیز ہے۔ یوسف نے اسے بڑے ادب سے "حضرت جی" کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔

"میں انہیں لے آیا ہوں جی۔"

چوغے والے نے ایک تیز گہری نظر ہم دونوں پر ڈالی اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک چھوٹا سا خشک نالہ پار کر کے وہ ہمیں اپنی کٹیا میں لے آیا۔ میرے لئے زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ میں کسی پیر فقیر کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھ رہی تھی۔ ایک بے روغن کے جستی ٹرنک پر دو مٹی کے دیئے جل رہے تھے۔ جیسے ٹرنک کی بجائے قبر پر پڑے ہوں۔ ایک تکیہ' ایک گدیلا' ایک لالٹین جو جھونپڑی کے بانس سے لٹک رہی تھی' مٹی کا ایک گھڑا۔ بسلولائیڈ کا ایک پیالہ اور دو عدد لوٹے۔ قریباً یہی کل سامان تھا اس جھونپڑی کا۔ یوسف نے چوغے والے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے حضرت جی ہیں۔ مجھ سے پہلے اللہ بخشے اباجی بھی ان کے ہاتھ پر بیعت تھے۔"

چوغے والے نے یوسف کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا "بی بیو! تمہارے بارے میں اس نے مجھے بتا دیا ہے۔ یہاں تم تینوں آرام سے رات گزار سکتے ہو' گھبرانے اور خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ سونا ہے تو آرام سے سو جاؤ' ورنہ وہ لوٹے پڑے ہوئے ہیں وضو کر لو اور نفل پڑھو' تہجد کا وقت بھی بس ہونے ہی والا ہے۔" مجھے یہ شخص روایتی پیروں فقیروں سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے لمبے کھچڑی بال شانوں تک تھے اور آنکھوں میں آسودہ سی چمک تھی۔ ماتھے کے محراب اور پیشانی کی شکنوں نے اسے ایک محترم شخصیت کا روپ دے دیا تھا۔

اس کے بزرگانہ لہجے نے صغراں کو ایک بار پھر سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے روتا دیکھ کر یوسف کے مرشد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور یوسف سے بولا۔

"اوے 'کھوتے' تو نے کیا تکلیف دی ہے میری بیٹی کو' کیوں رو رہی ہے یہ؟"

یوسف نے کہا "حضرت جی! جلدی کی وجہ سے میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکا تھا اگر اب اجازت ہو تو.........؟"

"ہاں ہاں سنا' یہ کیا کہانی ہے؟"

جواب میں یوسف نے مختصراً الفاظ میں شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ باز کا ہاتھ آنا' پڑوسی اصغر اور بندے شاہ کا باز خریدنے پر جھگڑا' اخترزماں وغیرہ کا پیچھے لگنا اور یوسف کا صغراں کو باز سونپ کر خان رحیمی کی کوٹھی میں جا چھپنا۔ پھر اس کے بعد کے واقعات اور آخر میں یوسف کا عاطف بخاری کے ساتھ میواتیوں کے گاؤں کی طرف روانہ ہونا' اس نے سب کچھ پیر صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ غالباً وہ ان سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ جب وہ اپنی روائیداد کے اس مرحلے پر پہنچا جہاں وہ عاطف بخاری کے ساتھ میواتی گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا تو میں اور صغراں زیادہ توجہ سے اس کی بات سننے لگیں کیونکہ اس کے بعد کے واقعات کا ہمیں علم نہیں تھا۔ یوسف نے کہا۔

"وہ گنجے سر والا بابو مجھے لے کر میواتی گاؤں میں پہنچا تو یہاں اور ہی تماشا نظر آیا۔ پوری بستی چودھری کے گھر کے سامنے جمع تھی۔ احاطے کی چار فٹ اونچی چار دیواری کے

اندر الاؤ دہک رہا تھا اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ چارپائیوں اور کرسیوں پر کم از کم تیس آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں زیادہ تر مسلح تھے۔ سب اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ چودھری جسے یہاں کے سارے میواتی صلو بھائی کہتے ہیں کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ آخر اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "دیکھو بھائی! تم سب بڑے بڑے لوگ ہو۔ کوئی زمیندار ہے' کوئی جاگیردار ہے' کوئی شہر کا سیٹھ ہے اور کوئی خان رحیمی کی طرح جنگل کا سیٹھ......... میں تم سب میں چھوٹا آدمی ہوں پر تمہارا میزبان ہوں۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری بات سنو....... دیکھو میرے بھائیو! بات یہ ہے.........."

ایک دم شور بلند ہوا اور سب بلند آواز سے چیخ و پکار کرنے لگے۔ ایک موقع پر تو لگا کہ وہ ایک دوسرے کے گلے پڑ جائیں گے۔ پھر خان رحیمی نے اٹھ کر کہا کہ یہ جگہ بات کرنے کے لئے ٹھیک نہیں اس لئے مکان کے اندر چلو۔ سب لوگ اٹھ کر چودھری صلو کی بیٹھک میں چلے گئے۔ بخاری کے کہنے پر میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے بتایا کہ صلو بھائی کے سالے نے ایک قیمتی باز پکڑا ہے۔ کئی شکاری اس باز کی تلاش میں تھے۔ ان سب کو پتہ چل گیا ہے اور اب وہ باز خریدنے کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ (صلو بھائی کا سالا وہی ٹھگنے قد والا بالو تھا' مجھے حیرانی ہوئی کہ چودھری کا رشتے دار ہونے کے باوجود وہ بھیک مانگتا تھا' غالباً اس بھیک کو وہ اپنے فن کی داد سمجھتا تھا) یوسف نے اپنی روئیداد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ہم سب وہاں کھڑے رہے اور صلو بھائی کی بیٹھک کے اندر گرما گرم باتیں ہوتی رہیں۔ پھر پتہ چلا کہ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ سب نے مل کر نیلامی کا فیصلہ کیا ہے۔ جو بھی زیادہ بولی دے گا باز اٹھا لے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ باز بیٹھک کے اندر پہنچ چکا ہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بیٹھک کے اندر سے پھر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا اور کئی آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا باہر آ گرے۔ پھر میں نے ایک لمبے شخص کو دیکھا وہ چاردیواری کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ میں ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا مگر میرا خیال ہے کہ وہ باز کا پنجرہ تھا۔ چار دیواری کے پاس اسے سات آٹھ میواتیوں نے گھیر لیا۔ ان سب کے پاس لاٹھیاں اور بلم تھے۔ وہ لمبا شخص بڑا جی دار تھا جی' زور آور بھی خوب تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی چیز چار دیواری

سے باہر پھینک دی۔ جہاں سے اسے فوراً کسی دوسرے بندے نے اٹھا لیا۔ لمبے قد والا میواتیوں سے بھڑ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے دو میواتیوں کے پیٹ میں چھرا مارا۔ اتنے میں اور میواتی آگئے۔ پھر تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ سارے گاؤں والے تتر بتر ہوگئے۔ میں بھی ایک بیل گاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے چودھری صلو کا بھینس خانہ جلنے لگا' اس کے چھپروں کو آگ لگ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا محلّہ جلنے لگا۔ ادھر فائرنگ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے خان رحیمی کی بڑی سفید جیپ کو دیکھا' وہ بڑی تیزی سے ایک لال کار کے پیچھے بھاگی' پھر پتہ نہیں کیا ہوا وہ ایک دم مڑی اور ایک گھر کی کچی دیوار توڑ کر صحن میں جا گھسی۔ ہر طرف چیخ و پکار ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں بیل گاڑی کے پیچھے سے اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لگا تار گولیاں چل رہی تھیں۔

چودھری صلو کے گھر کے سامنے چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ گاڑیاں چھ سات میل کا چکر کاٹ کر نہر کے پل کی طرف سے آئیں تھیں کیونکہ اس میواتی گاؤں تک گاڑی لانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں ایک ایک کر کے وہاں غائب ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنا بھی رک گئیں۔ گاؤں کے لوگ بالٹیاں' گھڑے اور کنستر وغیرہ لے کر نہر کی طرف بھاگے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے دو بچوں کو آگ سے نکالا ہے۔ یہ دیکھئے میرے ہاتھ"...... یوسف نے اپنے ہاتھ روشنی کی طرف کردیئے۔ کئی جگہ سے کھال جلی ہوئی تھی جس پر اس نے نمک تیل لگا رکھا تھا۔ پھر وہ بولا "چودھری صلو کی لاش میرے سامنے ایک دیوار کے نیچے سے نکالی گئی ہے۔ اس کی بھینس خانے کی کم از کم چار بھینسیں جل گئی ہیں اور بکریوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں" یوسف نے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ شاید وہ جلتی اور ممیاتی ہوئی بکریوں کو آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "بخاری کا کیا ہوا' وہ بھی تو تیرے ساتھ تھا؟"

"مرگیا وہ بھی" یوسف نے کہا "میں خود اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں اس کی گردن میں سامنے گولی لگی ہے جو گردن کے پیچھے سے نکل گئی ہے۔ جب گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو وہ مجھے بھول کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ اس کے بعد جب چودھری کے

بھینس خانے کو آگ لگی تو میں نے اسے ایک میواتی سے گتھم گتھا دیکھا۔ اس کے بعد پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا اور کس نے اسے گولی ماری۔"

جھونپڑی کے اندر گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ ہم میں سے ہر کوئی اس واقعہ کی بے پناہ شدت محسوس کر رہا تھا۔ یوسف نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"باز کا کچھ پتہ چلا؟"

یوسف نے کہا "یہاں چودھری صلو کے کارندے اور دوسرے لوگ جو باتیں کر رہے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ سارا معاملہ ایک غنڈے بابری کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ یہ شخص کچھ ہی عرصہ پہلے کسی دوسرے علاقے سے آیا ہے اور بڑا منہ چھٹ اور لڑاکا مشہور ہے۔ ان دنوں یہ شخص ضلع بھکر کے ایک مالدار شخص شاہ دین ٹوانہ کے لئے کام کر رہا ہے۔ ٹوانہ کو جانتی ہیں آپ؟"

یوسف اپنی بات روک کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا "اچھا اس کے بارے آپ کو پھر بتاؤں گا...... ابھی کچھ دیر پہلے چودھری صلو کی بیٹھک میں جو "اکٹھ" ہوا تھا اس میں شاہ دین ٹوانہ اور اس کا غنڈہ بابری بھی بیٹھے تھے۔ نیلامی کی بولی سے پہلے ہی بابری کا چودھری صلو سے جھگڑا ہوگیا۔ بابری نے بڑی ہوشیاری سے چودھری کے ایک کارندے کو نہتا کر کے چودھری کو چارپائی سمیت الٹا دیا۔ پھر وہاں ایسی کھلبلی مچی کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ جس لمبے شخص کو میں نے میواتیوں سے لڑتے دیکھا تھا وہ بابری ہی تھا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک شخص گھبرایا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہ ایک باریش نوجوان تھا۔ اس نے بڑے ادب سے چونغے والے کو سلام کیا اور دو زانو ہو کر بولا "حضرت جی! ڈی ایس پی کی ہدایت پر پولیس نے ناکہ بندی کر کے گھر گھر تلاشی شروع کر دی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس طرف بھی آئیں۔"

چونغے والے نے پوچھا "کون سا ڈی ایس پی ہے؟"

باریش نوجوان نے کہا "میرا خیال ہے جھنگ والے چودھری صاحب کا بھائی اشفاق گوندل ہے" چونغے والے نے کہا "ٹھیک ہے جاؤ" وہ ادھر نہیں آئے گا اگر آیا بھی تو میں

بات کر لوں گا" وہ جانے لگا تو چونگے والے نے کہا ٹھہرو۔

باریش نوجوان الٹے پاؤں چلتا چلتا پتھر کی طرح ساکت ہوگیا "جی حضرت جی!" اس نے جھک کر کہا۔

"جاؤ دیکھ کر آؤ کہ اُچی پلی والا راستہ صاف ہے اگر صاف ہے تو مجھے آکر بتاؤ" باریش نوجوان ادب سے سلام کرکے باہر چلا گیا۔"

چونگے والے حضرت جی پورے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے انہیں صغراں اور یوسف کی کہانی کا تو پہلے ہی سے علم تھا میرے بارے میں بھی یوسف انہیں کافی کچھ بتا چکا تھا۔ انہوں نے یوسف کا کان پکڑتے ہوئے کہا "تو بڑا نالائق ہے یوسفے صغراں کی جگہ تیری ماں بہن اس طرح رات گھر سے باہر رہتی تو کیا کرتا تو؟ بدبخت تجھے ذرا احساس نہیں دیکھ بیچاری کا رو رو کر کیا حال ہو رہا ہے چل ابھی اسی وقت اسے گھر چھوڑ کر آ۔"

یوسف دم بخود سر جھکائے بیٹھا تھا اس کا کان ابھی تک حضرت جی کے ہاتھ میں تھا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "بیٹی تو تو بڑی سیانی لگتی ہے پڑھی لکھی بھی ہے تجھے چاہئے تھا اس بیچاری کو گھر پہنچاتی تو اسے لے کر ادھر نکل آئی۔"

میں نے کہا "حضرت جی مجھے مہلت ہی نہیں ملی ان غنڈوں اور پولیس میں گولی چلنے لگی ہم بھاگ کر نہر پر پہنچیں اور ایک بیڑی میں چھپ گئیں ابھی میں اس سے اتہ پتہ ہی پوچھ رہی تھی کہ بیڑی ہمیں لے کر ادھر روانہ ہوگئی میں تو حضرت جی خود بہت پریشان تھی پتہ نہیں اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی؟"

صغراں گھٹنوں پر منہ چھپائے مسلسل روتی جا رہی تھی حضرت جی نے کہا "چپ کر دھی رانی اللہ خیر کرے گا اللہ سے خیر مانگ چپ کر جا اچھا چل میں خود جاتا ہوں تیرے ساتھ۔ تیرے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ کچھ نہیں ہوا ہے تجھے ڈلے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا" وہ صغراں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے وہ کسی ننھی بچی کی طرح ہچکیوں سے رونے لگی اسی دوران حضرت جی کا بھیجا ہوا بندہ واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اچی پلی والا راستہ صاف ہے ادھر ناکہ نہیں لگا ہے۔ حضرت جی چونغہ سنبھال کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور باریش نوجوان سے بولے "نذیر محمد! تم جلدی سے دو گھوڑیاں لے آ مولوی یسین کے گھر سے چل فٹافٹ آ۔" نذیر محمد سر جھکا کر باہر نکل گیا حضرت جی نے یوسف کو ٹھوکر مار کر کہا

"چل کم بختا اٹھ تو بھی ساتھ چل ہمارے کھوتا کہیں کا۔" صغراں کے آنسو خشک ہو چکے تھے وہ کبھی چور نظروں سے یوسف کی طرف دیکھ لیتی تھی بڑی پیاری جوڑی تھی ان دونوں کی۔ یوسف ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا حضرت جی اپنی پگڑی باندھنے لگے اتنے میں دروازے سے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی میرا دل دھک سے رہ گیا اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ پولیس کے آدمی ہیں پھر کسی نے دھیمی آواز میں حضرت جی کو پکارا بولنے والا کوئی رعب دار شخص لگتا تھا۔

"کون ہے؟" حضرت جی نے اندر سے پوچھا۔

"حضرت جی میں ڈی ایس پی اشفاق ہوں اندر آسکتا ہوں؟"

"ٹھہرو میں خود باہر آتا ہوں" حضرت جی نے جواب دیا۔

وہ پگڑی لپیٹ کر باہر نکلے "کیا بات ہے گوندل؟" ان کی آواز آئی۔ ڈی ایس پی گوندل نے کہا "حضرت جی آپ کو پتہ چلا ہی ہوگا میواتی گاؤں میں کیا قیامت ٹوٹی ہے؟"

"ہاں بڑا افسوس ہوا ہے یہ سن کر پتہ نہیں ہمارے اس علاقے میں کیا مصیبت آگئی ہے۔"

ڈی ایس پی اور حضرت جی اس واقعے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ڈی ایس پی کا انداز مودبانہ تھا کچھ دیر بعد وہ سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا قانون کا ہاتھ ایک بار پھر مجھے چھو کر گزر گیا تھا حضرت جی نے اندر آکر کہا "چلو یہ بھی اچھا ہوا اب اس طرف کوئی نہیں آئے گا" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے تم آرام سے یہاں بیٹھو تہجد کا وقت ہوگیا ہے۔ بہتر ہے کہ نماز پڑھ لو۔ میں اس لڑکی کو چھوڑ کر سورج نکلنے تک آجاؤں گا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

باریش نوجوان جسے حضرت جی نے نذیر محمد کہا تھا گھوڑیاں لے آیا تھا۔ صغراں نے میری طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور اپنا معصوم چہرہ اوڑھنی میں چھپا کر یوسف کے ساتھ باہر نکل گئی۔ حضرت جی چلے گئے اچانک مجھے ایک بات یاد آئی میں نے جھونپڑی کے دروازے سے یوسف کو آواز دی وہ گھوڑیوں کی طرف جاتے جاتے رک گیا میں نے اسے پاس بلایا قریب آکر وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا میں نے کہا تمہارا راستہ تو وہی ہے نا اگر ہو سکے تو اس کھیت میں دیکھ لینا۔

وہ سمجھ گیا کہ میرا اشارہ رقم والے پرس کی طرف ہے۔ سر ہلا کر بولا "آپ بے فکر رہیں باجی مجھے سب یاد ہے بس دعا کریں میرے پہنچنے سے پہلے کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔"

"میں نے کہا اللہ خیر کرے گا ابھی کافی اندھیرا ہے" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھوڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

حضرت جی اور یوسف کی واپسی قریباً آٹھ بجے صبح ہوئی وہ صغراں کو اس کے گاؤں چھوڑ آئے تھے۔ معلوم نہیں یہ حضرت جی کی کاوش کی برکت تھی یا صغراں کی اپنی خوش بختی کا کرشمہ کہ اس گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق ملا تھا۔ دراصل گھر میں کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ صغراں رات بھر اپنے بستر سے غائب رہی ہے اور کئی میل کی خاک چھان کر علی الصبح گھر لوٹی ہے۔ جب حضرت جی اسے ساتھ لے کر گھر چھوڑنے گئے تو گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صغراں کا والد یوسف کا ماموں فجر کی نماز پڑھنے مسجد گیا ہوا تھا باقی اہل خانہ محو خواب تھے صغراں خاموشی سے اندر چلی گئی۔

یوسف نے مجھے کانپتے لہجے میں بتایا کہ رقم والا پرس اسے مل گیا ہے وہ پرس اس نے وہیں کھیت میں ایک محفوظ جگہ مٹی میں دبا دیا تھا۔

میں حضرت جی کو اپنی پر غم روئیداد سنا کر کچھ رہنمائی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ واپس آنے کے بعد حضرت صاحب نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا سادہ سا کھانا تھا مکئی کی روٹی گڑ کی چائے اور شلجم کا سالن اس کے بعد وہ بیٹھے ہی تھے کہ ایک پجارو جیپ آگئی اس میں سے چند افراد اترے اور حضرت جی کو بصد احترام و اصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت جی کے جانے کے بعد ان کے باریش مرید نذیر محمد نے بتایا کہ وہ شور کوٹ چلے گئے ہیں اور اب دو تین روز بعد ہی آئیں گے ہم دونوں یہ سن کر حیران رہ گئے دراصل شور کوٹ میں حضرت جی کا کوئی نیازمند الیکشن میں حصہ لے رہا تھا وہ اپنی انتخابی مہم کا آغاز کرنے سے قبل حضرت جی کے دست مبارک سے کوئی فیض حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت جی سے میری شناسائی چند گھنٹے سے زیادہ پرانی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں ان کی روانگی نے مجھے ایک دم اداس سا کر دیا مجھے لگا جیسے میں اپنے کسی بزرگ کے سائے سے محروم ہوگئی ہوں۔ اس احساس کی غالباً دو وجوہات تھیں ایک تو محترم بزرگ کی

سحرانگیز شخصیت اور دوسرے میرے حالات جنہوں نے ہر طرف سے یورش کرکے مجھے درد لا دوا کی تفسیر بنا دیا تھا۔ الیکشن کے ذکر پر میرا دھیان خودبخود وہاب کی طرف چلا گیا۔ میری اطلاعات کے مطابق اب اپنے مقتول بھائی کی جگہ وہ خود الیکشن میں حصہ لے رہا تھا اس نے واصف کے قتل میں چودھری شہاب کو ملوث کرکے اپنی انتخابی مہم کو ایک اور ہی رنگ دے دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ انسان کے بھیس میں وہاب جیسا درندہ اپنے حلقے کا نمائندہ بن گیا تو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ساتھ یہ کتنا سنگین مذاق ہوگا۔ وہ جنونی شخص جو ایک معصوم بچے کو تڑپا تڑپا کر مار سکتا ہے اختیار کا قلمدان سنبھال بیٹھا تو کس کس کی تقدیر میں جاں سوز عذاب نہیں لکھے گا۔ کاش تاریکی کی یہ پیش قدمی کسی طرح رک سکتی۔

اس شام جب نذیر محمد تین میواتیوں کے جنازے میں شریک ہونے کے بعد قریبی گاؤں سے ہمارے لئے کھانا لینے گیا ہوا تھا اور میں اور یوسف جھونپڑی کے ملجگے اجالے میں پاس پاس بیٹھے تھے میں نے یوسف سے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

وہ بولا "باجی پکھیرو ہمیں مل سکتا ہے اب بھی مل سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں شاہ دین ٹوانہ کو جانتا ہوں" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ہاں بتایا تو تھا۔"

وہ بولا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ کیسے جانتا ہوں۔"

"ہاں، نہیں بتایا تھا" میں نے قدرے جھلا کر کہا۔

اس نے ہونٹ کے زخم کو انگلی سے دھیرے دھیرے چھونا شروع کیا اور بولا، پچھلے سال انہی دنوں میں شاہ دین اپنے سب سے چھوٹے بھائی کی بارات لے کر ہمارے گاؤں گوپور آیا تھا۔ بڑی دھوم کی شادی تھی وہ۔ زمیندار مرزا اسماعیل نے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی پورے چار دن اس نے بارات کو اپنے گھر ٹھہرایا وہ دعوتیں ہوئی تھیں کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ ایسی شادی نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ بارات میں عورتیں بھی تھیں۔ ایک دن عورتیں زمیندار اسماعیل کا باغ دیکھنے کے لئے گئیں وہاں کہیں شہد کا چھتا لگا ہوا تھا کسی

نے لکھیاں چھیڑ دیں عورتیں چیخیں مارتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ ان میں سے ایک بڑی عمر کی عورت جو شاہ دین کی بیوی تھی گھبرا کر دوڑی تو نہر میں گر گئی۔ میں اس وقت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ عورت غوطے کھانے لگی تو میں بھاگ کر گیا اور نہر میں چھلانگ لگا دی وہ کافی بھاری بھرکم تھی مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے نکال ہی لیا۔ وہ رو رو کر مجھے گلے لگانے لگیں اور کہنے لگیں کہ اگر اس کا اپنا بیٹا زندہ ہوتا تو بالکل میرے جتنا ہوتا۔ وہ جتنے دن ہمارے گاؤں رہی صبح شام میری تعریفیں کرتی رہی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے زبردستی پانچ سو روپے بھی دیئے۔ پندرہ بیس دن بعد وہ پھر گوپور آئی تو سیدھا ہمارے گھر پہنچی اور بڑی دیر تک بیٹھی رہیں چند سال پہلے اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا وہ بڑی دکھی تھی وہ مجھے اپنے سامنے بٹھا کر دیکھتی رہتی اور کہتی کہ میری آنکھیں بالکل اس کے بیٹے سے ملتی ہیں۔

پچھلے محرم میں تو وہ پورے بیس دن ہمارے گاؤں میں رہی میری ماں سے کہنے لگی کہ یہ بیٹا مجھے دے دو میری ماں نے کہا میرے پاس یہی تو ایک جینے کا سہارا ہے دو بھی ہوتے تو تمہاری بات کبھی نہ ٹالتی۔ پھر اس کے پیچھے اس کا شوہر شاہ دین خود آ گیا وہ اسے سمجھا بجھا کر واپس لے گیا۔"

یوسف کی پوری بات سننے کے بعد میں نے پوچھا تم کہنا کیا چاہتے ہو کیا تمہارا خیال ہے کہ بیوی کے کہنے پر شاہ دین وہ باز ہمیں دے دے گا؟"

وہ بولا "میرا یہ مطلب نہیں لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ اگر ہم بھکر میں شاہ دین کے فارم پر پہنچ جائیں تو کوئی نہ کوئی رستہ نکل آئے گا ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا مطلب ہے جو آپ نے کہا ہے کہ وہ عورت ہمیں باز ہی لے دے ستر اسی ہزار روپیہ ان لوگوں کے لئے کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے یوسف سے کہا "کیا تم اب بھی یہی سمجھ رہے ہو کہ وہ باز ستر اسی ہزار کا ہے!؟"

وہ کچھ چونک گیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "کبھی کبھی مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ اس سے بھی مہنگا باز ہے جس طرح یہ لوگ اس کے لئے گولیاں چلا رہے ہیں اور بندے مار رہے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے ایک غلط بات نکل گئی ہے کہ کم از کم ابھی مجھے یوسف سے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی وہ تجسس سے بولا "باجی آپ کا کیا خیال ہے

کتنی قیمت ہے اس کی؟"

میں نے بات بدل کر کہا "قیمت تو اس کی ستر اسی ہزار ہی ہوگی مگر آپس کی ضد کی وجہ سے وہ اس کی زیادہ قیمت دینے پر بھی تیار ہیں۔ ان کے آپس کے لڑائی جھگڑے بھی اسی ضد کی وجہ سے ہیں ضد بڑی بری چیز ہوتی ہے یوسف!" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "باجی کچھ بھی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر میں شاہ دین فارم پہنچ جاؤں تو وہ پکھیرو مجھے مل سکتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھ یوسف میں تجھے یہ مشورہ ہرگز نہیں دے سکتی اس کام میں بہت خطرہ ہے۔"

وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا "خطرے کی بات چھوڑیں جی یہ تو ایک سودا ہے آپ نے مجھے پینتیس ہزار روپیہ دینا ہے اور میں نے آپ کو پکھیرو۔"

"یوسف پینتیس ہزار جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے۔"

"باجی آپ سمجھنے کی کوشش کریں اچھا ایسا کریں آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں آپ کو پکھیرو لے کر دوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے قسمت آزمانا چاہتے ہو تو آزما لو۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"بس باجی آپ سیانی ہیں آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ میں تو کبھی جھنگ سے آگے نہیں گیا آپ ساتھ ہوں گی تو مجھے بڑا حوصلہ رہے گا۔ میں نے سب سوچ لیا ہے میں آپ کو اپنی بہن بنا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ عابدہ بی بی آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوں گی اس نے کون سی دیکھی ہوئی ہے میری بہن۔"

میں نے پوچھا "یہ عابدہ بی بی کون ہے؟"

وہ بولا "وہی شاہ دین کی بیوی اس کا نام عابدہ ہے" مجھے حیرانی ہوئی کہ یوسف اس عورت کا نام ایسی لاپرواہی سے لے رہا ہے۔ میں ساتھ جانے کے سلسلے میں باآسانی یوسف سے انکار کر سکتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو رہی تھی وہ کسی حد تک ڈھیٹ اور ضدی لڑکا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب بھکر جا کر رہے گا

شاہ دین ٹوانہ کے بارے میں میں نے جو کچھ اب تک سنا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ اچھا شخص نہیں اس کے غنڈے بابری کا ذکر بھی میں سن چکی تھی آدھی شب کے وقت کشتی میں میواتی گاؤں کی طرف آتے ہوئے کشتی والے جو باتیں کر رہے تھے ان میں بھی بابری کا نام آیا تھا۔ کشتی والوں کے خیال میں وہ ایک خطرناک اور نڈر غنڈہ تھا میں صاف طور پر اندازہ لگا سکتی تھی کہ شاہ دین فارم میں جا کر یوسف اپنے لئے خطرات مول لے گا دوسری طرف اس کا اعتماد بھی مجھے شک میں ڈال رہا تھا نہ جانے اس کے ذہن میں کیا بات تھی جو وہ باز کے حصول کے بارے اتنا پُرامید تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے یوسف میں تیرے ساتھ چلوں گی کب چلنا ہے تجھے؟" وہ بولا "میرا تو خیال ہے کل منہ اندھیرے نکل چلیں ایک دفعہ پہلے بھی میں جا چکا ہوں کم از کم پانچ چھ گھنٹے لگیں گے فارم تک پہنچتے پہنچتے۔"

میں نے کہا "اگر صبح سویرے جانا ہے تو پھر ایسا کر وہ پرس کھیت سے نکال لا کتنا فاصلہ ہے یہاں سے کھیت کا۔"

"باجی فاصلہ تو تین چار میل ہے نہر تیر کر پار کر جاؤں تو اس سے بھی کم ہے مگر میرا خیال ہے رقم وہاں بالکل محفوظ ہے ابھی اسے ادھر رہنے دیں۔ خرچے کے لئے میرے پاس پیسے ہیں چار سو روپیہ ہم دونوں کے لئے کافی نہیں ہوگا کیا؟"

میں نے غور سے یوسف کی طرف دیکھا شاید وہ رقم کے سلسلے میں مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔

اگلے روز بذریعہ بس ہم بھکر کی طرف روانہ ہوئے۔ بھکر کے مضافات میں شاہ دین ٹوانہ کا وسیع و عریض ڈیری فارم تھا۔ شاہ دین کی رہائش بھی اس فارم کے ایک حصے میں تھی یوسف کی معلومات کے مطابق شاہ دین کی تین بیویاں تھیں جنہیں اس نے تین علیحدہ علیحدہ مکانوں میں بسا رکھا تھا جیسا کہ میں نے بتایا ہے یوسف ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا وہ مجھے کسی خاص دشواری کے بغیر شاہ دین فارم پر لے آیا۔ بیرونی گیٹ پر ہی ہمیں مسلح چوکیدار نے روک لیا یوسف نے بتایا کہ ہم عابدہ بی بی کے مہمان ہیں چوکیدار باز پرس کرنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرے شخص نے یوسف کو پہچان لیا اور چوکیدار کو بتایا

کہ یہ لڑکا پہلے بھی عابدہ بی بی سے ملنے آ چکا ہے ہمیں فارم کے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ فارم جتنا وسیع تھا اتنا ہی صاف ستھرا تھا کہیں گوبر یا کوڑے کی آلائش تک نہیں تھی ایک حصے میں بہت سے فوارے لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں قطار در قطار ان کے نیچے کھڑی نہا رہی تھیں۔ سفید لباس والے پڑھے لکھے ملازم مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے فارم کے ایک شیڈ تلے دودھ کی ترسیل میں کام آنے والی گاڑیاں کھڑی تھیں ڈیری فارم کا ہر شعبہ جدید خطوط پر استوار نظر آتا تھا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ایک کارندے کو آواز دے کر کہا ہم دونوں کو شیر محمد کے سپرد کر دیا جائے۔ کارندے نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں ایک طویل برآمدے میں پہنچا کر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کے حوالے کر دیا یہی شیر محمد تھا اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا وہ ہمیں لے کر سرو کے بلند و بالا درختوں کی ایک قطار سے گزرا اور فارم کے رہائشی حصے میں لے آیا۔ وہ بڑا نرم خو شخص تھا بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ "آپ کو بڑی بی بی جی سے ملنا ہے سائیں!" اس نے پوچھا۔ یوسف نے ہاں میں جواب دیا وہ بولا آپ ایک دفعہ شاید اس سے پہلے بھی آئے تھے گوپور سے آئے ہیں نا آپ؟ یوسف نے اس دفعہ بھی اثبات میں سر ہلایا وہ بولا سائیں سنا ہے دو تین روز پہلے آپ کے علاقے میں بڑا نقصان ہوا ہے میواتیوں کے کسی گاؤں میں آگ شاگ لگ گئی ہے؟

یوسف نے کہا "ہاں جی ہم نے بھی سنا ہے چار بندے بھی مر گئے ہیں۔"

"بات کیا ہوئی تھی!" شیر محمد نے پوچھا اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ٹوہ لینے کی فکر میں ہے۔ میں نے یوسف کو کہنی ماری وہ کچھ کہتے کہتے بات بدل گیا۔ اس دوران ہم ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ شیر محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ بڑا لق و دق ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہم ایک مضافاتی علاقے میں کھڑے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں جو چیز کثرت سے نظر آ رہی تھی وہ اسلحہ تھا۔ لگتا تھا یہاں کے باسیوں کو مختلف النوع اسلحہ جمع کرنے کا جنون ہے۔ مغلیہ دور کے خنجروں اور تلواروں سے لے کر جدید آٹومیٹک رائفلوں تک سب کچھ دیواروں پر آویزاں تھا۔ ہم صوفوں پر بیٹھ گئے ایک ملازمہ نے اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع دی چند ہی لمحے بعد ایک عورت بھاگتی اندر داخل ہوئی۔ اپنے لباس سے وہ گھر کی مالکن نظر

آتی تھی اس کا آدھا سر سفید تھا شکل و صورت میں سادی دیہاتنوں جیسی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے یوسف کو دیکھا اور دونوں بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھی۔

"میرا پتر' میرا پتر آیا" اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور لپک کر یوسف سے لپٹ گئی بڑی وارفتگی سے وہ یوسف کا منہ سر چومنے لگی۔ "میرا پتر' کہاں تھا تو ماں کی خبر ہی نہ کی آ میرا لال میرے سامنے بیٹھ ماں صدقے یہ تیرے ہونٹ پر کیا ہے ہائے میں مرگئی کس نے مارا ہے تجھے؟"

"کچھ نہیں تھوڑی سی چوٹ لگ گئی تھی" یوسف نے کہا۔

عورت نے یوسف کو شانوں سے پکڑ کر سامنے بٹھالیا اور مضطرب انداز سے اس کی چوٹ کو دیکھنے لگی۔ اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ عورت کی ذہنی حالت درست نہیں اس کی آنکھوں میں ممتا دیوانگی بن کر جھلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ یوسف کی چوٹ کی طرف سے مطمئن ہوگئی۔ پٹی کی وجہ سے اسے زخم کی نوعیت کا پتہ نہیں چلا تھا مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی "بالکل میرا اسلم ہے وہی جسم وہی ناک نقشہ اور آنکھیں تو ہیں ہی اسلم کی" وہ یوسف کی آنکھوں کو چومنے لگی پھر جیسے اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا" پتر یہ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ یوسف نے کہا "میری بہن ہے وہی جس کے بارے میں ماں نے تجھے بتایا تھا" اچھا اچھا رانی ہے" وہ لپک کر میری طرف آئی اور میرا سر چومنے لگی یوسف کی آمد نے اسے خوشی سے دیوانہ کر رکھا تھا۔ ایک ملازمہ نے خشک لہجے میں کہا "بس بی بی جی اب اندر چلیں ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ بولنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

عابدہ روہانسی آواز میں بولی "رشیداں کچھ تو خدا کا خوف کر دیکھ اتنے دن بعد میں نے اپنے پتر کی شکل دیکھی ہے مجھے کچھ دیر اس کے پاس تو بیٹھ لینے دے۔"

ملازمہ رشیداں نے کہا "بی بی عابدہ' شاہ جی آنے والے ہیں کیوں مجھے بھی جھاڑ پڑوانی ہے۔ چلیں اپنے کمرے میں۔ شاہ جی ہو کر چلے جائیں تو پھر بیٹھ رہنا یہاں۔" اس نے عابدہ کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور اپنے ساتھ چلاتی ہوئی باہر لے گئی۔ عابدہ دکھ بھرے انداز میں مڑ مڑ کر یوسف کی طرف دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی "چلے نہ جانا یوسفے میں ابھی پھر آتی ہوں' ہاں ابھی آتی ہوں۔" تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ پھر ہمارے پاس

آگئی۔ پتہ چلا کہ شاہ صاحب آدھ پون گھنٹہ عابدہ بی بی کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنی نئی بیوی کی طرف جا چکے ہیں جونہی عابدہ بی بی ہمارے پاس پہنچی ملازمہ نے پرتکلف کھانا سامنے سجا دیا بھوک ہم دونوں کو بہت لگی تھی عابدہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر یوسف کو دینے لگی مجھے یہ منظر عجیب سا لگا مگر یوسف شاید پہلے بھی ایسے مرحلوں سے گزر چکا تھا وہ اطمینان سے نوالے لیتا رہا۔ میرے سر میں سفر کی وجہ سے سخت درد ہو رہا تھا میں کھانے کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر سو رہی۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کمرے میں زرد کا بلب جل رہا تھا ساتھ والی چارپائی پر پھولدار چادر بچھی تھی اور سنہری جھالر والا تکیہ رکھا تھا چارپائی پر عابدہ دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اس کی گود میں یوسف کا سر تھا وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑے لاڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کی آوازیں مدھم تھیں اس لئے مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا یکایک یوسف نے اس کی گود سے سر نکالا اور بھڑک کر بولا۔

"ٹھیک ہے نہیں تو نہ سہی میں بھی تجھے شکل نہیں دکھاؤں گا بس ابھی جا رہا ہوں میں۔"

عابدہ کا رنگ زرد ہوگیا اس نے تڑپ کر یوسف کا بازو پکڑ لیا نہ "میرا پتر ایسی بات نہ کر اللہ دی قسمے نہیں تو میں مرجاؤں گی۔"

"تو پھر میری اتنی سی بات تو نہیں مان سکتی۔"

عابدہ جلدی سے بولی "ٹھیک ہے میرا پتر تو بیٹھ جا بیٹھ جا میں سویرے شاہ جی سے بات کرتی ہوں۔"

"بات نہیں کرنی" یوسف جھلا کر بولا "مجھے پھیرولا کر دینا ہے پھیرو۔"

عابدہ عاجزی سے بولی "مگر پتر میں نے کبھی چوری نہیں کی میں کیسے کروں گی یہ سب کچھ!"

یوسف اٹل لہجے میں بولا "تو اسے چوری سمجھتی ہے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔"

"مگر یوسف ...."

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے تو کرتی رہ اگر مگر میں جا رہا ہوں غلطی سے آگیا تھا تیرے

پاس۔"

یوسف جلدی سے میری طرف بڑھا جیسے مجھے جگانا چاہتا ہو۔ عابدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی "نہ میرا پتر!" وہ سرگوشی میں بولی "مجھ پر ایسا ظلم نہ کرنا میں وہی کروں گی جو تو کہے گا۔"

یوسف نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور بولا "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر" عابدہ نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھا "میں.......... میں پوری کوشش کروں گی پتر پر میری سمجھ میں نہیں آرہا میں ڈیرے پر جاؤں گی کس طرح؟ یہ رشیداں تو کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پتہ نہیں مجھے پاگل سمجھتی ہے میں تجھے پاگل لگتی ہوں یوسفے! پاگلیں میری طرح کی ہوتی ہیں؟"

یوسف نے سوال نظرانداز کرتے ہوئے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہی پھر بولا "تو بیس سال سے یہاں رہ رہی ہے یہ بھی نہیں سوچ سکتی کہ ڈیرے پر کیسے پہنچنا ہے؟" عابدہ نے کہا "یوسفے اگر پکھیرو وہاں نہ ہوا تو پھر!"

"وہیں ہے وہیں ہے" یوسف نے زور دے کر کہا "اور کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔"

عابدہ بولی "میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے یوسفے! شاہ جی نے پرسوں صبح ایک تاریخ پر لاہور جانا ہے اگر وہ چلے گئے تو دو تین دن انہیں وہاں لگ ہی جائیں گے جب شاہ جی نہ ہوں تو ڈیرے پر رات کو صرف ایک بندے کا پہرہ ہوتا ہے میں کسی نہ کسی طرح اندر چلی ہی جاؤں گی پھر تو مجھ سے ناراض نہیں ہوگا نا؟"

"نہیں ہوں گا ناراض" یوسف جھلا کر بولا "مگر پرسوں تک یہاں کیسے رہوں گا' شاہ جی تو آج ہی مجھے کہہ رہے تھے کہ کاکے مل لیا ہے تو اب پھٹا کھا جا ڈاکٹر نے اسے زیادہ ملنے جلنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

"نہیں کل کا دن میں تجھے کسی طرح رکھ ہی لوں گی مگر ایک بات کہوں گی یوسفے!" کچھ کہتے کہتے عابدہ کی آواز بھرا سی گئی عجیب انداز سے کہنے لگی "یوسفے ان پنکھ پکھیروؤں کے پیچھے نہ بھاگا کر دیکھ میرے پتر ہر پکھیرو کسی عابدہ کے اسلم کی طرح ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے مار دیتا ہے یا پکڑ کر لے جاتا ہے تو دو آنکھیں بڑا روتی ہیں۔"

یک دم قدموں کی آواز آئی عابدہ نے ڈر کر کہا "ہائے اللہ وہ رشیداں آگئی اچھا پتر

تو سو جا میں صبح آؤں گی" دروازہ کھلا اور کچی نیند سے جاگی ہوئی رشیداں کا سراپا نظر آیا وہ تحکم سے بولی "بی بی جی مجھے بڑے شاہ جی سے شکایت کرنا پڑے گی آپ کیوں آئیں ہیں اٹھ کر یہاں؟" عابدہ لرز کر بولی "نہیں نہیں میں تو یونہی" الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے پھر وہ تیز قدموں سے ملازمہ کے آگے آگے چلتی باہر نکل گئی۔

صبح یوسف نے مجھ سے کہا "باجی پکھیرو اس مکان میں تو نہیں میں نے سارے دیکھ لیا ہے فارم میں اور بھی کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی۔ میرے خیال میں وہ یا تو ڈیرے پر ہے یا پھر چھوٹی ٹوانی کے مکان میں" شاہ دین کی تیسری بیوی کو وہ چھوٹی ٹوانی کہہ رہا تھا۔
(بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ شاہ دین ٹوانہ کی منکوحہ بیوی نہیں تھی)

میں نے کہا "یوسف میں تجھے ایسا لڑکا نہیں سمجھتی تھی بڑا افسوس ہوا ہے مجھے۔ میں نے رات تیری اور عابدہ کی ساری باتیں سن لی ہیں" اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا میں نے کہا "بہت شرم کا مقام ہے یہ۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تو یہاں آکر ایسا کرے گا تو میں نہیں آتی۔ تجھے حیا نہیں آتی ایک بدنصیب ماں کو ستاتے اور رلاتے ہوئے؟"

"وہ باجی میں تو.........."

"چپ کر" میں نے طیش میں کہا "خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا تو نے ایک ماں کی محبت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ تو اس کی کمزوری پکڑ کر اسے کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہے۔"

"باجی تم سمجھنے کی کوشش کرو وہ ایک پاگل عورت ہے اگر اس نے ہمارا کام کر دیا تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی اسے کچھ نہیں کہے گا کوئی نہیں پوچھے گا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیوں کر رہی ہے نہ ہی کسی کو اس پر شک ہوگا۔"

"بہت گھٹیا ہو تم' مجھے نفرت ہے تم سے" میں نے غصے سے کہا "تمہیں معلوم ہی نہیں انسانیت کیا ہوتی ہے وہ بیچاری پاگل نہ ہوتی تو تجھ جیسے کو کیوں منہ لگاتی" میرا پر طیش چہرہ دیکھ کر یوسف ایک دم خاموش ہوگیا کچھ دیر سر جھکا کر ٹخنے کے زخم کو سہلاتا رہا آخر بولا "ٹھیک ہے باجی تم ناراض ہوتی ہو تو میں منع کر دوں گا اسے۔"

اتنے میں ملازمہ رشیداں ایک بڑے ٹرے میں ناشتہ لے کر آگئی۔ عابدہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی انہیں دیکھ کر یوسف چپ ہوگیا.......... وہ سارا دن یوسف

نے خاموشی میں گزار دیا اس نے میری بات کا کافی اثر لیا تھا۔ میں نے ایک دو بار اسے بلانے کی کوشش کی مگر وہ مختصر جواب دے کر چپ ہوگیا عابدہ سارا دن ہمارے چاؤ چونچلوں میں مصروف رہی اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا ایک دکھی ماں کا درد دوسری دکھی ماں سے بڑھ کر اور کون جان سکتا ہے۔ عابدہ کے صرف دو بچے تھے ایک بیٹی ایک بیٹا اب اس کے پاس صرف ایک بیٹی تھی۔ بیٹا اس کی آنکھوں کو سمندر دے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایک روز صبح سویرے وہ وضو کر کے اور ٹوپی پہن کر قریبی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نکلا تھا اس کے بعد ماں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی گیارہ سال گزر چکے تھے وہ آج بھی اس کی ننھی منی قمیضوں' چپلوں اور ٹوپیوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھی اسے سترہ سالہ یوسف کی آنکھوں میں اپنے چھ سالہ اسلم کی آنکھیں جھانکتی نظر آتی تیں۔ رات ہوگئی یوسف اور میں خاموشی سے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ میں یہاں کا ماحول اچھی طرح دیکھ چکی تھی اگر وہ باز اس فارم میں کہیں تھا بھی تو ہم اسے حاصل کرنے کی امید نہیں لگا سکتے تھے۔ یہ لوگ میری توقعات سے کہیں زیادہ چوکنے تھے نظم و ضبط ایسا تھا کہ ڈیری فارم کی بجائے کسی ممنوعہ فوجی علاقے کا گمان ہوتا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ دین تقسیم ہندوستان سے پہلے خود بھی فوج میں رہا تھا اس نے پورے فارم کو خاردار باڑوں اور آہنی دروازوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ غالباً باز کی موجودگی کے سبب یہ لوگ اور بھی محتاط تھے۔ ہمارے لئے بہتر یہی تھا کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ میں نے اس سلسلے میں بات کرنے کے لئے ایک دو بار یوسف کو آواز دی لیکن وہ سو چکا تھا یا جان بوجھ کر خاموش تھا۔ آخر میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں یکایک مجھے خیال آیا کہیں یوسف کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے وہ غصے میں تو تھا ہی اگر مردانگی دکھانے کے لئے خود ہی ڈیرے کی طرف نکل جاتا تو بے حد خطرناک تھا میں نے سوچا کہ زیرو کا بلب جلا چھوڑنا چاہئے۔ چارپائی سے اٹھ کر میں نے دیوار پر سوئچ بورڈ ٹٹولا اور لائٹ آن کر دی۔ یوسف کے لحاف پر نگاہ ڈالتے ہی ٹھٹھک گئی مجھے احساس ہوا کہ لحاف کے نیچے کچھ نہیں ہے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لحاف اٹھایا بستر خالی تھا۔ دل دھک سے رہ گیا میرے اندیشے درست نکلے .... نہیں، نہیں وہ شاید کسی حاجت کے لیے باہر نکلا ہے میں نے لائٹ دوبارہ آف کر دی۔ بے آہستگی دروازہ کھول کر باہر نکلی قریب

ہی پیشاب خانہ تھا اس کا کھلا دروازہ میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ کہاں چلا گیا ہے وہ۔ میں ننگے پاؤں بے آواز چلتی برآمدے کی طرف گئی پھر سوچا کہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر دیکھنا چاہئے ابھی نصف سیڑھیاں ہی چڑھی تھی کہ کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی میں نے سیمنٹ کے جالی دار دریچے سے باہر جھانکا ڈیرے یعنی مردانے کی طرف سے کوئی بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

یہ کوئی دبلا پتلا مرد تھا اس نے بے تابی سے دروازے پر دستک دی اس کے پیچھے کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر ڈیرے کی طرف شوروغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رشیداں نے دروازہ کھولا اور وہ دبلا پتلا مرد جلدی سے اندر آگیا۔ دونوں ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں تھوڑے ہی فاصلے پر سیڑھیوں کی تاریکی میں موجود ہوں۔ ڈیوڑھی میں ان دونوں کی آواز گونج رہی تھی اور شب کے سناٹے کی وجہ سے باآسانی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ مرد کہہ رہا تھا۔

"تجھے پتہ ہے نا شیخ کا وہ باز پہلے ایک لڑکے کے ہاتھ آیا تھا!"

"ہاں........ ہا.......... تو نے ہی تو بتایا تھا" ملازمہ رشیداں کی آواز آئی۔"

"پتہ ہے وہ لڑکا کون ہے؟" مرد نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"یوسفا جسے پتر پتر کہتی ہے تیری بی بی عابدہ۔"

"ہائے میں مرگئی.........." رشیداں کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ مرد نے کہا "پکڑا گیا ہے وہ ڈیرے کے پاس گھوم رہا تھا۔ بابری نے دھر لیا۔ بڑا مارا ہے گوپور گاؤں کا ایک نیا کاماں آیا ہوا ہے ہمارے پاس اس نے پہچان لیا ہے۔ وہ کہتا ہے اس لڑکے نے باز پہلے پکڑا تھا۔"

رشیداں نے کہا "ہائے دل محمد اب کیا ہوگا!" رشیداں کا انداز تخاطب بتا رہا تھا کہ ساتھی مرد اس کا شوہر ہے۔

وہ بولا "وہی ہوگا جو چوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کوئی لمبا ہی چکر ہے شاہ جی اور بابری اس طرف آ رہے ہیں۔ یوسفے کی بہن کدھر ہے؟"

رشیداں نے کہا "اپنے کمرے میں ہوگی۔"

دل محمد بولا........ "دیکھ........ اگر اندر ہے تو باہر سے کنڈی چڑھا دے۔ چل جلدی کر۔"

رشیداں کی چپل کی چڑچڑ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھاگتی ہوئی ہمارے کمرے کی طرف گئی ہے ذرا ہی دیر بعد اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی

"دل محمد........ وہ تو وہاں نہیں ہے۔"

"کہاں چلی گئی........؟" دل محمد نے کہا۔

اتنے میں بیرونی دروازے کے پاس شور سنائی دیا کسی نے سیمنٹ کی جالی میں جھانکنے کی کوشش کی آٹھ دس سائے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا کچھ سوجھائی نہیں دیا کیا کروں........ پھر ڈیوڑھی سے ملی جلی آوازیں آئیں اور ہر طرف میری تلاش شروع ہوگئی ان آوازوں میں گاہے گاہے عابدہ کی ڈری ڈری چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ نیند سے جاگی تھی اور اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ قدموں کی آوازیں سیڑھیوں کی طرف بڑھیں تو میں بھاگتی ہوئی چھت پر آگئی چھت گہری تاریکی میں ڈوبی تھی ایک بیکار تھریشر مشین اور ٹریکٹر چند بوسیدہ ٹائر یہاں وہاں پڑے تھے۔ میں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ چھت زیادہ اونچی نہیں تھی کوئی مرد ہوتا تو باآسانی کود جاتا مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ بفرض محال اگر میں ایسا کر بھی گزرتی تو مجھے فارم کے اندر ہی رہنا تھا اور فارم کے اندر بچ نکلنے کے امکانات نہایت معدوم تھے۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں ویٹ تھریشر کی آڑ میں ہوگئی۔ ایک بھاگتا ہوا طویل سایہ سیڑھیوں سے برآمد ہوا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹارچ تھی اس نے ٹارچ کو تیزی سے چاروں طرف گردش دی چند لمبے ڈگ بھر کر اس نے ایک ٹریکٹر ٹائر کو زور سے ٹھوکر ماری پھر پھنکارتا ہوا تھریشر کی طرف آیا میرے اندازے کے مطابق یہی بابری تھا۔ میں کل پرزوں کی آڑ میں کچھ اور سمٹ گئی ٹارچ کا دائرہ ٹائلوں کے فرش پر رینگتا ہوا میرے پاؤں پر آکر رک گیا۔ ایک ساعت کے لئے اپنے ننگے پاؤں میری آنکھوں میں چمکے پھر میں نے بابری کو خود پر جھپٹتے محسوس کیا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور مشین کے ایک ٹوٹے ہوئے

آہنی لیور سے بابری کے سر پر زوردار ضرب لگائی ضرب سنگین تھی لیکن بابری نے کچھ زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے گرتے گرتے اپنا بایاں ہاتھ لہرایا جو میرے بالوں پر پڑا میں بھاگنے کی فکر میں تھی جھٹکا لگا تو لڑکھڑا کر گر گئی۔ بابری کا چہرہ میری آنکھوں سے ایک فٹ کی دوری پر تھا۔ "ثنا" ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور تاریکی میں جیسے سینکڑوں بم دھماکوں سے پھٹ گئے۔

چند لمحوں کے لئے مجھے پتہ ہی نہیں چلا میں کہاں اور کس حال میں ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے سامنے دیکھا میرے سامنے سلیم کا چہرہ تھا اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور داڑھی بھی تھی لیکن اس کا یہ حلیہ میری آنکھوں کو مزید دھوکہ نہیں دے سکتا تھا اس کی آواز جیسے صدیوں کی پکار بن کر میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "ثنا........ ثنا" چند لمحوں کے لئے اس گونج کے سوا گردوپیش میں اور کوئی آواز باقی نہ رہی۔ یکایک بھاگتے قدموں سے چھت لرز اٹھی ایک بھاری آواز آئی "بابری!"

"سلیم نے ٹھٹھک کر بائیں طرف دیکھا اگلے ہی لمحے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا اس نے میرے بالوں کو زور سے جھٹکا دیا۔ میں سسکاری لے کر اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اس نے ایک بھرپور طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میری زبان پر خون کا نمکین ذائقہ پھیل گیا۔ ایک جسیم سائے نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور بھاری آواز میں بولا۔

"نیچے لے چلو اسے........... یہ شاہ دین تھا۔"

سلیم مجھے کھینچتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا شاہ دین کے دوسرے کارندے بھی ہمارے ساتھ آرہے تھے۔

مجھے ڈیرے پر لے جایا گیا وہاں یوسف پہلے سے موجود تھا اس کی قمیض کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور نتھنے کا زخم بھی دوبارہ کھل کر خون اگل رہا تھا وہ چارپائی پر مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا میری آمد پر بھی اس کا سر جھکا ہی رہا۔ روشنی میں میں نے پہلی بار سلیم کو غور سے دیکھا۔ آخری بار میں نے فرخندہ کے گھر اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تھی تصویر کے مقابلے میں اب وہ کہیں صحت مند نظر آرہا تھا۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی بابری جو علاقے میں ایک خطرناک غنڈے کے طور پر ابھر رہا تھا درحقیقت سلیم

تھا............ صاف ظاہر تھا کہ وہ جیل سے مفرور ہے۔ داڑھی اور خالصتاً دیہاتی لباس میں اسے پہچاننا خاصا دشوار تھا۔ اس کے ساتھ شاہ دین کھڑا تھا۔ کافی صحت مند شخص تھا عمر تقریباً 65 برس ہوگی مگر چہرے مہرے سے 50 کے آس پاس لگتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹے سروالے سے کہا۔

"اوئے ملکی پہچان ذرا اس کو یہی ہے اس کی بہن!"

چھوٹے سروالے نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے "توبہ کرو جی چٹا جھوٹ ہے یہ۔ اس کی بہن رانی کو میں جانتا ہوں اچھی طرح۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔" شاہ دین نے اپنے بھاری بھرکم چہرے کو اوپر نیچے ہلایا سلیم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بندوق کے کندے سے یوسف کو ٹھوکا دیا اور کہا "اوئے مچھر تو تو کہتا تھا یہ بہن ہے تیری!"

یوسف کے چہرے پر سرخ رنگ کی لہر سی گزر گئی وہ اپنے غصے اور پشیمانی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہ دین نے گالی دے کر کہا۔

"اوئے بتاتا نہیں یہ کیا لگتی ہے تیری؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے یوسف پر ٹھوکروں اور دوہتڑوں کی بارش کر دی یوسف الٹ کر چارپائی سے نیچے گرا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک شخص نے ڈانگ سے دھکیل کر مجھے ایک طرف کر دیا۔ اس دوران عابدہ روتی پیٹتی وہاں پہنچ گئی وہ پہریداروں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

"شاہ جی! میرے پتر کو کچھ نہ کہنا" وہ ہاتھ اٹھا کر دہائی دینے لگی اسے دیکھ کر شاہ دین کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ اس نے پھنکار کر کہا "لے جاؤ اس کو باہر........ لے جاؤ........" اس کا اشارہ عابدہ کی طرف تھا۔ پہریدار جو اب تک اسے ہاتھ لگانے سے گریز کر رہے تھے اس پر جھپٹے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ شاہ دین کا لب و لہجہ اچانک ہی نہایت خطرناک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے کہا۔

"لا اوئے شیدے رسی........ باندھ ان دونوں کو سامنے تھم (ستون) کے ساتھ۔"

شیدا رسی لینے کے لئے بھاگا شاہ دین کی آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس نے چند قدم چل کر دیوار سے ایک ہنٹر اتار لیا اس سے پہلے صرف ہنٹر کے

بارے میں سنا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہی ہنٹر ایک خود سر شخص کے ہاتھ میں تھا اور مجھ پر یا یوسف پر برسنے والا تھا۔ ہمارے اردگرد کھڑے تمام افراد کے چہرے پر ایک سفاک سی دلچسپی نظر آ رہی تھی۔ وہی دلچسپی جو ہر اس شخص کی آنکھ میں نظر آتی ہے جو باطنی طور پر ظالم ہوتا ہے مگر ظلم کی توفیق نہیں رکھتا۔ صرف ظلم ہوتے دیکھ سکتا ہے۔

شاہ دین نے ہنٹر ہاتھ میں لہرایا اور آتش باز نگاہوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں غیرارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اگر ہنٹر میرے جسم پر پڑا تو کیا ہوگا مگر اتنا معلوم تھا یہ ایک نہایت تکلیف دہ عمل ہوگا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے؟ پھر اچانک میرا سارا خوف زائل ہو گیا میں جیسے ایک دم بے فکر ہو گئی اگر سلیم یہاں تھا تو پھر مجھے سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ایک نظر سلیم کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ تیزی سے کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کی ذہانت اور حاضر دماغی پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سنگین حالات میں درست فیصلہ کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے یاد تھا جب واصف کی موت کے بعد ہم بڑی حویلی سے نکلے تھے اور گیٹ پر مسلح چوکیداروں نے ہمیں روک لیا تھا۔ سلیم نے بڑی بے ساختگی سے انہیں شہاب کے حملے کی خبر دی تھی اور انہیں الجھا کر ہم صاف بچ نکلے تھے۔ اسی طرح پندرہ بیس منٹ پہلے جب چھت پر اس نے مجھے پہچانا تھا اور اوپر سے شاہ دین آ گیا تو وہ کمال ہوشیاری سے میرے لئے اجنبی بن گیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ شاہ دین کا کوڑا میرے جسم پر پڑنے سے پہلے وہ کوئی حل نکال لے گا اور پھر ایسے ہی ہوا۔ اس نے صورت حال بگڑتے ہوئے دیکھی تو جلدی سے شاہ دین کے پاس آیا۔ اس کے کان کی طرف جھک کر وہ کچھ کہنے لگا۔ شاہ دین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ہنٹر پر اس کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ایک گہری سانس لی پھر سلیم کے ساتھ باتیں کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد سلیم واپس آ گیا۔ آتے ہی اس نے یوسف کو ایک دو ٹھوکریں ماریں اور گالیاں بکتے ہوئے اپنے کارندوں سے بولا کہ ہم دونوں کو برآمدے والے کمرے میں بند کر دیا جائے۔ سلیم کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ شاہ دین کے آدمیوں نے ہمیں لاٹھیوں

سے دھکیل کر نیچی چھت والے ایک کمرے میں بند کر دیا یہ کمرہ غالباً اس سے پہلے سلیم کے اپنے استعمال میں تھا۔ ایک طرف کھونٹیوں پر اس کے چند جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ شیشہ کنگھی منجن اور اسی طرح کی چند دوسری اشیاء ایک بوسیدہ سے ٹرنک پر پڑی تھیں۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ شاہ دین کے آدمیوں نے دروازہ باہر سے بند کرکے کنڈی لگا دی۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ ان کی نگاہیں مجھے اپنے جسم کو چھوتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر سلیم یہاں نہ ہوتا تو خدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ یہ سب کچھ یوسف کی جلدبازی اور ضد کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ میں نے کہا "اپنی مرضی کرکے دیکھ لیا نا!"

"یہ سب تمہارا قصور ہے" وہ لال پیلا ہو کر بولا۔

اسی دوران سلیم آگیا۔ سلاخ دار کھڑکی کے سامنے اپنی چارپائی ڈالی اور ایک گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی بالکل نئی ایم جی رائفل چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ جیب سے سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک کارندے نے جلدی سے آگے بڑھ کر تیلی دکھائی۔ ایک دوسرا شخص پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ تینوں مدہم لہجے میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سلیم کے ہاتھوں کے اشاروں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو جانے کے لئے کہہ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اور سلام کرکے باہر نکل گئے۔ اب ڈیرے کے اس حصے میں سلیم' یوسف اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو فی الوقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ سلیم نے میدان صاف کر لیا ہے اور اب وہ کوئی بات کرے گا۔ مگر آدھ پون گھنٹہ گذر گیا اس کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ کیا وہ اب بھی محتاط رہنے پر مجبور تھا۔ پھر بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ یوسف کی وجہ سے احتیاط برت رہا تھا اور چاہتا تھا کہ پیش رفت میری طرف سے ہو۔ میں نے اسے سر کے اشارے سے پاس بلایا وہ جلدی سے سگریٹ بجھا کر کھڑکی پر آگیا۔ اس کی سوالیہ نظریں یوسف کا تعارف چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"سلیم! تم کھل کر بات کرسکتے ہو۔ یوسف سے کوئی پردہ نہیں۔"

سلیم کے چہرے پر شناسائی پھوار کی طرح برسنے لگی۔ اس نے کہا "ثنا! مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ تم یہاں......... میرا مطلب ہے......"

میری خشک آنکھوں میں جلن اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے کہا "سلیم یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔"

ایکاایکی سلیم کا چہرہ بھی غم میں ڈوب گیا۔ میری طرح اسے بھی فرحان کی موت یاد آگئی تھی۔ وہ گلوگیر ہو کر بولا "ثناء فرحان کا بہت دکھ ہوا ہے۔ اتنے دن گزر گئے پھر بھی اس خبر پر یقین نہیں آ رہا۔ کاش یہ سب کچھ نہیں ہوا ہوتا......... یہ سب کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا"

"اخباروں کے لکھے پر کیسے یقین کرلوں۔ تمہارے سسرال والے تو کہتے ہیں کہ تم نے پاگل پن میں خود ہی اپنے بچے کو مار ڈالا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے.........؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے حقیقت کا پتہ ہو تب ہے نا۔ چند دن پہلے چودھری شہاب کی ایک چھوٹی سی خبر اخبار میں آئی تھی۔ اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ تم نے نہیں تمہارے جیٹھ نے بچے کو مارا ہے۔ اس خبر میں تو بڑی دردناک بات لکھی تھی۔ چودھری شہاب نے کہا ہے کہ تمہارے جیٹھ وہاب نے بلیک میل کرنے کے لئے تمہیں فرحان کی کٹی ہوئی انگلیاں بھیجی تھیں" میری آنکھوں میں خنجر سے اتر رہے تھے۔ جی چاہتا تھا سلیم کے سامنے رو دوں۔ اتنا روؤں کہ دل بھی آنکھوں کے رستے بہہ جائے مگر آنسو؟ کہاں تھے میرے آنسو' میری گود خالی کرنے والا میری آنکھوں کو بھی خالی کر گیا تھا۔ میرے سارے آنسو اپنی مٹھی میں بند کرکے وہ قبر کی تیرگی میں اتر گیا تھا۔

"کیا یہ بات سچ ہے ثناء؟" سلیم نے پر درد لہجے میں پوچھا۔ میں بالکل خاموش رہی۔ وہ میرے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا "مجھے معلوم ہے ثنا یہ سب کچھ سچ ہے۔ تم نہ بھی بتاؤ تو تمہارا چہرہ بتاتا ہے۔"

میں نے بات بدلتے ہوئے کہا "سلیم! تمہیں جیل سے نہیں بھاگنا چاہئے تھا۔ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ "میرا خیال ہے اس کا جواب تم اپنے آپ سے پوچھو۔

ہمارے ہر سوال کا جواب ہمارے اپنے پاس ہی موجود ہے۔ ہم ایک دوسرے کی کہانی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ہاں۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ اس جگہ تمہاری موجودگی کا کیا مطلب ہے اور شیخ کے باز کے ساتھ تمہارا نام کیوں لیا جا رہا ہے۔"

میں نے سلیم کو اشارے سے بتایا کہ یوسف کے سامنے یہ گفتگو مناسب نہیں ہے......... اس نے صفائی سے موضوع بدل دیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کیسے جیل سے چھوٹا اور کس طرح شاہ دین ٹوانہ تک پہنچا۔ اس کی روداد کافی طویل تھی۔ گو یہ روداد دلچسپ ہے مگر یہاں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ مختصراً یہ کہ چنگیزیوں کے ایماء پر پولیس کی حراست میں سلیم پر بہت تشدد کیا گیا۔ ایک روز جب اسے پولیس لاری میں بٹھا کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ کورٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔ لاری کا ایکسیڈنٹ ہو گیا وہ الٹ گئی۔ کئی قیدی اور پولیس والے زخمی ہوئے۔ اسی افراتفری میں سلیم فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ وہ چھپتا چھپاتا مری جا پہنچا۔ یہاں ادھیڑ عمر شاہ دین اپنی ایک نوخیز ساتھی کے ساتھ تفریح کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ اس لڑکی کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے نہیں تھا۔ لاہور سے لڑکی کے وارث اس کی ٹوہ لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ وہ شاہ دین سے اپنے کچھ واجبات وصول کرنا چاہتے تھے۔ اتفاقاً اس جھگڑے میں سلیم کو شاہ دین کی طرف سے اہم کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ شاہ دین سلیم کی جرأت اور دلیری سے متاثر ہوا اور اسے اپنے ساتھ بھکر لے آیا۔ سلیم کی باتوں سے پتہ چلا کہ شاہ دین سیر و شکار کا بے حد شوقین ہے۔ اسلحہ جمع کرنے کے علاوہ سیر و شکار واحد شوق ہے جس پر وہ بے دریغ پیسہ اور وقت خرچ کر سکتا ہے۔ شیخ کے گمشدہ باز کے بارے میں اسے بھی خبر تھی اور وہ اس کی ٹوہ میں تھا۔ آخر میواتیوں کے "اکھ" میں سلیم کے بل بوتے پر وہ یہ باز حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ سلیم نے بتایا کہ وہ باز اب بھی اسی فارم میں موجود ہے۔

اس موقع پر یوسف نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا "وہ باز کسی کا نہیں۔ صرف میرا ہے۔ میں نے اسے پکڑا ہے۔ میں دیکھوں گا کون اسے چھینتا ہے۔" وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

سلیم نے کہا "بھائی میرے آہستہ بول شاہ دین کے بندے پاس ہی ہیں۔ سن لیا تو

مصیبت آ جائے گی۔ پہلے بڑی مشکل سے میں نے اسے ٹالا ہے" اس کا اشارہ شاہ دین کی طرف تھا۔

میں نے پوچھا "کیا کہا تھا تم نے اسے؟"

سلیم نے بتایا کہ دو تین دن پہلے پولیس آئی تھی' اسی میواتی گاؤں والے واقعے کے سلسلے میں۔ شاہ دین نے انہیں دو تنخواہ دار بندوں کی گرفتاری دے دی تھی اور کچھ لین دین بھی کر لیا تھا۔ وہ واپس چلے گئے تھے۔ مگر ابھی شاہ دین کو ان کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب شاہ دین ہمیں مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا تو سلیم نے اسے یہ کہہ کر شبہے میں ڈال دیا تھا کہ کہیں ہم دونوں میں سے کوئی پولیس کا مخبر نہ ہو......... یہ بات شاہ دین کے دل کو لگی تھی۔ یوسف کے بارے میں تو معاملہ قدرے صاف تھا مگر میرا کوئی اتہ پتہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے شاہ دین کا ہنٹر والا ہاتھ لٹک گیا تھا۔ پولیس کی تعلق دار عورت کو مار کر وہ کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا.......... تاہم یہ بچاؤ عارضی تھا۔ شاہ دین کی سی آئی ڈی' پولیس کی سی آئی ڈی' سے دو ہاتھ آگے تھی۔ جلد یا بدیر اسے پتہ چل ہی جانا تھا کہ پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ شاہ دین کو یہاں ٹیلیفون کی سہولت حاصل تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہی اپنا یہ شک دور کر لیتا۔ سلیم اس معاملے میں قدرے پریشان تھا۔

وہ رات ہم نے تقریباً آنکھوں میں ہی کاٹی۔ سلیم کبھی چارپائی پر جا کر بیٹھ جاتا اور کبھی کھڑکی کے پاس آ کر باتیں کرنے لگتا۔ صبح فجر کے وقت وہ کچھ دیر کے لئے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو چہرے پر پریشانی کے سائے نہیں تھے۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر بولا۔

"ثنا! ایک اچھی خبر ہے۔ شاہ ایک تاریخ کے لئے لاہور چلا گیا ہے۔ اب پرسوں سے پہلے نہیں آئے گا"......... پھر اس نے ایک نظر میرے عقب میں دیکھا۔ ساری رات جاگنے کے بعد اب یوسف پر نیند غلبہ پا چکی تھی۔ اسے سویا دیکھ کر سلیم نے کہا کہ میں اسے کھل کر اپنے بارے میں بتاؤں۔ سلیم سے بھلا مجھے کیا چھپانا تھا۔ حالات کے طوفان نے ہمیں ایک ہی لہر پر سوار کر دیا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ بڑی حویلی کے ایک فارسٹ گارڈ نے مرتے مرتے چنگیزیوں کے بارے میں کیا انکشاف کیا تھا۔ اس ادھورے انکشاف کی وجہ سے میں کیونکر خان رحیمی کے ڈیرے پہنچی اور وہاں کس طرح

یوسف سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد صغراں، میواتی گاؤں اور اختر زمان کے بگڑے ہوئے ٹولے کے بارے بھی سب کچھ بتایا۔ سلیم میری باتیں پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

میری روداد ختم ہوئی تو اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کئی سال پہلے کا وہی لڑکا جھانک رہا تھا جس نے ہوٹل کے فیملی کیبن میں مجھ سے کہا تھا' شاہ میں اگلی جمعرات کو تمہارا انتظار کروں گا......... وہ جمعرات کبھی نہیں آئی تھی اور شاید اسے کبھی نہیں آنا تھا۔ مگر سلیم کی آنکھوں میں وہ جمعرات ایک ادھ جلے انگارے کی طرح ہمیشہ دہکتی رہتی تھی......... وہ ایک عمیق سانس لے کر بولا "شاء! چنگیزیوں کو برباد کرنے کے اس سفر میں خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں......... اس موقع میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے مجھے سو بار بھی جیل سے بھاگنا پڑا تو بھاگوں گا۔"

میں خاموش رہی۔ محسوس ہوا کہ رو رہی ہوں مگر آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ خشک تھیں۔ شاید اب ساری زندگی مجھے ایسے ہی رونا تھا۔ سلیم نے کہا "ہاں......... اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ اگر وہ باز یہاں سے لے جانا ہے تو اس سے سنہری موقع ہمیں پھر نہیں مل سکتا........."

میں نے پوچھا "کیا وہ تمہاری تحویل میں ہے؟"

اس نے کہا "نہیں تحویل میں تو نہیں مگر زیادہ دور بھی نہیں۔ اگر تم سے کل کسی وقت ملاقات ہو جاتی تو بہت بہتر تھا......... جس جگہ تم کھڑی ہو ٹھیک اسی جگہ باز کا پنجرہ پڑا تھا۔"

میں نے جلدی سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس پرندے کے بارے اتنا کچھ سن چکی تھی کہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ سلیم نے کہا "رات والے واقعے کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے۔ شاہ اسے یہاں سے اٹھوا کر گھر لے گیا ہے۔ خیر اب بھی کچھ بگڑا نہیں۔ میں آج ہی......... ملتا ہوں۔ عشرت سے۔"

"یہ عشرت کون ہے؟"

ایک لحظے کے لئے سلیم کے ہونٹ لرزے۔ جیسے اس کے منہ سے کوئی ان چاہی بات نکل گئی ہو۔ پھر سنبھل کر بولا "وہی لڑکی جو مری میں شاہ کے ساتھ تھی۔ اب ادھر ہی رہتی ہے۔ شاہ کی پہلی بیوی کے مکان کے پیچھے اس کا مکان ہے۔"

"تو کیا باز اب اس کے پاس ہے؟"

"ہاں۔ شاہ کا خیال تھا کہ وہ ادھر زیادہ محفوظ رہے گا۔ شاید اس نے لاہور جانا تھا اس وجہ سے بھی احتیاط کی ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا تم وہاں جا سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے پہلے جاتے رہے ہو؟"

"نہیں۔ پہلے تو نہیں گیا۔ مگر آج کوشش کروں گا۔" مجھے اندازہ ہوا کہ سلیم کچھ چھپا رہا ہے۔ شاید.........؟ ایک سوال سا ذہن میں چمکا اور ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح میرے مقدر کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

صبح کا ناشتہ سلیم نے بڑے اہتمام سے منگوایا۔ تاہم دکھاوے کے لئے کارندوں کے سامنے ہمیں دھمکیاں وغیرہ بھی دیں۔ دوپہر کے وقت جب ڈیرے کے اس حصے میں کوئی نہیں تھا وہ کمرے کی کنڈی کھول کر اندر آ گیا۔ اس کی مسہری کے نیچے پلاسٹک کی ایک ٹوٹی ہوئی بالٹی تھی۔ یہ بالٹی اس نے فرش پر الٹا دی۔ سگریٹ کی کچھ خالی ڈبیاں، جلی ہوئی تیلیاں مالٹوں اور گنڈیریوں کے چھلکے اور مڑے تڑے کاغذ بہت کچھ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ایک گلابی رنگ کے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ایک اور ٹکڑا اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کوڑے میں گلابی کاغذ کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ ان پر نیلی روشنائی سے کچھ لکھا بھی ہوا تھا کوئی خط قسم کی چیز تھی یہ۔ اس کے کہنے پر یوسف بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ جلد ہی وہ تمام ٹکڑے کوڑے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بیس پچیس ٹکڑے ہوں گے۔ سلیم انہیں ترتیب سے جوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایک دقت طلب کام تھا۔ میں بھی سلیم کی مدد کرنے لگی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد فرش پر کاپی سائز کا ایک مکمل صفحہ بچھا ہوا تھا۔ اس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

ڈیئر بابری!

"بہت مجبور ہو کر خط لکھنے کا رسک لے رہی ہوں۔ اس خط کو پڑھتے ہی پھاڑ دینا یا جلا دینا۔ پتہ نہیں تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔ دل کو بڑا سمجھاتی ہوں لیکن یہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ ہائے اللہ کیا کروں کچھ تم ہی آ کر سمجھاؤ نا۔ پرسوں بھی سارا دن انتظار کرتی رہی لیکن تم تو پتہ نہیں راستہ بدل کر گزر جاتے ہو" اس کے بعد دو شعروں اور چند عشقیہ فقروں کے بعد لکھا تھا" ڈیئر' پرسوں ہفتے

کو شاہ جی تاریخ پر لاہور جا رہے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ چند بہت ضروری باتیں کرنی ہیں تم سے۔ دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان آ جانا۔ پچھلی ڈیوڑھی کی بتی بجھی ہوگی اور دروازہ بند ہوگا مگر کنڈی نہیں لگی ہوگی۔ کتا بھی میں باندھ چھوڑوں گی۔ دیکھو بھولنا نہیں دس اور ساڑھے دس کے درمیان۔ دیکھو' میرے بارے میں کوئی غلط خیال ذہن میں نہ لانا۔ میں ایسی عورت نہیں ہوں۔ پتہ نہیں تم نے کیا جادو کیا ہے جو یہ خط لکھنے کی حرکت کر بیٹھی ہوں۔

فقط تمہاری دید کی طالب۔

"دس اور ساڑھے دس کے درمیان" سلیم نے زیرلب دہرایا یوں لگتا تھا خط کے مندرجات اس کے ذہن سے اتر چکے تھے۔ "آج ہفتہ ہی ہے نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے نگاہیں چراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ میری کیفیت کو محسوس کرکے وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں یہ اچھی عورت نہیں ہے۔ اس لئے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں پرسوں اس نے یہ رقعہ اپنی ذاتی ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دیا۔ میں نے سرسری نظر سے دیکھ کر پھاڑ دیا۔ مگر اب.......... ایک بار تو وہاں جانا ہی پڑے گا۔"

سلیم کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے یہ رقعہ واقعی سرسری نظر سے دیکھا ہوا تھا۔ غالباً اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ عشرت نے اسے ملنے کے لئے کیا ٹائم دیا ہوا ہے۔

رات کے دس بجے تھے۔ یوسف منہ پھلائے کروٹ بدلے لیٹا تھا۔ کمرے کی خاموشی گھمبیر ہوئی تو میں وقت گذاری کے لئے کوئی مصروفیات ڈھونڈنے لگی۔ سلیم کے ٹرنک کے نیچے چند پرانے تہہ شدہ اخبار نظر آئے۔ میں نے نکال لئے اور جلدی جلدی ورق گردانی کرنے لگی۔ آخر ایک اخبار میں مطلوبہ خبر نظر آ ہی گئی۔ یہ شہاب الدین کے بارے میں خبر تھی اس خبر کا ذکر سلیم نے کیا تھا.......... اس خبر کے مطابق چودھری شہاب الدین نے چنگیزیوں پر مجھے بلیک میل کرنے کا الزام لگایا تھا اور فرحان کی کٹی ہوئی پوروں کا ذکر کیا تھا۔ اس خبر میں نادرہ کا ذکر بھی موجود تھا۔ اخبار نے اپنے لاہور کے رپورٹر کے حوالے سے لکھا تھا کہ میڈم نادرہ کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی ہے اور اس کے انتڑیوں کے دو آپریشن ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی اس کی حالت تسلی بخش نہیں۔ رپورٹر نے

اس "قاتلانہ حملے" کی کڑیاں بھی چنگیزیوں اور پال پور کے چودھریوں کی انتخابی رنجش سے جا ملائیں تھیں۔ دور کی کوڑی لاتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ چودھری شہاب نے ثناء کو (یعنی مجھے) میڈم نادرہ کو قتل کرنے کی خصوصی مہم پر لاہور بھیجا تھا کیونکہ وہ وہاب چنگیزی کے سوشل ورک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ بیچاری فرخندہ کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا تھا اس پر میری آلہ کار بننے کا الزام لگایا گیا تھا۔

اس پوری خبر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ چنگیزیوں کے گھاگ وکیل نے چودھری شہاب کو اس معاملے میں بری طرح جکڑ لیا ہے۔ اس نے چودھری شہاب ہی کے دو کارندوں کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا تھا اور انہوں نے بیان دیا کہ واصف چنگیزی کو قتل کرنے کے بعد اس کی ملزمہ بیوی کئی روز شہاب الدین کی حویلی میں چھپی رہی ہے۔ ظاہر ہے چودھری شہاب کے ان کارندوں کو پیسے دے کر یا ڈرا دھمکا کر توڑ لیا گیا تھا.......... مجھے کبھی کبھی چودھری شہاب پر ترس بھی آنے لگتا تھا۔ وہ صرف میری وجہ سے اس دلدل میں پھنسا تھا۔ پہلے اس نے مجھے پناہ دینے کی غلطی کی اور پھر جب چنگیزیوں کے کارندے مجھے سنگسار کرنے کی فکر میں تھے وہ میری جان بچانے پہنچ گیا۔ کسی طاقتور کے خلاف کسی مجبور اور کمزور کی مدد کرنا آج کے دور میں غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے چودھری شہاب کی وہ خاموش آنکھیں یاد آئیں جو مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہیں سکتی تھیں۔ میں نے جب بھی ان آنکھوں میں دیکھا مجھے ان کی گہرائی سے خوف آیا۔

میں نے اپنے خیالوں سے چونک کر یوسف کی گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی دونوں سوئیاں گیارہ کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ سلیم کی طرف سے ابھی کوئی اطلاع نہیں تھی دل و دماغ میں اندیشوں کی چاپ سنائی دینے لگی یونہی بات چھیڑنے کے لئے میں نے کہا۔

"یوسف کیا ٹائم ہوگیا ہے؟"

"گیارہ" اس نے مختصر ترین جواب دیا اور بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

یکایک ہم دونوں کو چونکنا پڑا۔ فارم کے رہائشی حصے کی طرف سے تڑتڑ کی خوفناک آواز آئی یقیناً یہ ایم جی کا فائر تھا میں اچھل کر بستر سے کھڑی ہوگئی اور کھڑکی میں سے جھانکا۔ برآمدے میں کسی متنفس کے آثار نہیں تھے۔ یوسف ڈری ہوئی نظروں سے میری

طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً میری اپنی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ چند لمحے بعد کہیں قریب سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور رہائشی حصے کی طرف جا کر معدوم ہو گئی۔ قریباً دو منٹ ہم نے سخت شش و پنج میں گذارے پھر کوئی دھم کی آواز سے دیوار پر سے کودا اور برآمدے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سلیم تھا۔ جب وہ بھاگتا ہوا ہمارے کمرے کی طرف آیا تو اس کی چادر چیل کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پنجرا نما چیز تھی۔ جلدی سے اس نے دروازہ کھولا۔

"آ جاؤ ثناء! وہ تیزی سے بولا برآمدے میں آکر اس نے اپنے بستر کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کو وہ اندر سے کنڈی لگا کر گیا ہوا تھا۔ کنڈی کھول کر ہم باہر آ گئے اور قریباً بھاگتے ہوئے ایک ٹرک تک پہنچ گئے۔ اس ٹرک کے پیچھے ایک بڑا سا ٹینکر تھا یقیناً اس میں دودھ وغیرہ فارم سے منتقل کیا جاتا تھا۔ سلیم نے ٹرک کا دروازہ کھول کر پہلے پنجرہ اندر رکھا پھر مجھے اوپر چڑھنے کے لئے کہا۔ اس وقت بھاگتے قدموں کی آواز سے گرد و پیش گونج اٹھے۔ میں نے دیکھا پانچ چھ آدمی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ ان میں سب سے آگے ادھیڑ عمر شیر محمد تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین دن پہلے ہمیں بیرونی گیٹ سے عابدہ تک پہنچایا تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست الجھن اور خدشوں کے سائے تھے۔

"کیا بات ہے بابری صاحب یہ ابھی فائرنگ کیسی ہوئی ہے؟"

سلیم جھلا کر بولا "ادھر جا کر دیکھو جدھر فائرنگ ہوئی ہے۔ ادھر آم لینے آئے ہو؟"

شیر محمد نے پوچھا "لیکن آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"سلیم بولا کہیں نہیں جا رہا جاؤ ادھر دیکھو کیا بات ہوئی ہے۔"

"شیر محمد چوکنا سا ہو گیا۔ "بابری صاحب گولی آپ کی رائفل کی تھی ابھی آپ نے اندر ٹرک میں کیا رکھا ہے۔"

سلیم غرایا۔ "تو تم مجھے روکو گے!" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تو شیر محمد کے کندھے سے آویزاں پستول کی طرف بڑھا اور اس کی خوفناک ٹکر شیر محمد کی ناک پر پڑی۔ وہ اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ باقی آدمی ہراساں ہو کر پیچھے پیچھے ہٹے۔ سلیم نے اپنی طاقتور رائفل ان کی طرف سیدھی کی اور بے حد سرد لہجے میں بولا۔

"مجھے جانتے ہو ناں! بھون کے رکھ دوں گا بھاگو یہاں سے۔" میں نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ وہ چار پانچ ہٹے کٹے افراد سچ مچ بھاگ اٹھے۔ شیر محمد وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شاید اس کی کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹ گئی تھی۔ سلیم نے مجھے سہارا دے کر ٹرک پر چڑھایا اس کے بعد یوسف چڑھا تب سلیم گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ٹرک اسٹارٹ ہو کر تیزی سے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کو اندر سے بڑا سا تالا لگا ہوا تھا سلیم نے کھڑکی کے اندر سے منہ نکالا اور چوکیدار سے کہا کہ وہ تالا کھولے چوکیدار کو بھی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ہراس نظر آ رہا تھا۔ جی اچھا کہتے ہوئے وہ ملحقہ کمرے کی طرف گیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ اور ایسا ہی ہوا غالباً کھڑکی سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ ٹرک کے لئے گیٹ کھولنا چنداں مشکل نہیں تھا سلیم نے پہلا گیر لگا کر ٹرک آگے بڑھایا اور ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ گیٹ کا داہنی سمت والا ستون زمین بوس ہو گیا ٹرک کے پہیے گیٹ کی آہنی چادر کو توڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اب ہمارے پیچھے دھول تھی اور چیخ و پکار کی آوازیں تھیں۔

تقریباً دو میل نیم پختہ راستے پر چلنے کے بعد ہم پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی جو آگے جا کر بھکر سے جھنگ جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔ حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے غور سے سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کی قمیض کا گریبان ادھڑا ہوا تھا اور چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ تاریکی کی وجہ سے ان خراشوں کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی اس کے ہاتھ کی پشت اور آستین پر خون کے دھبے تو میں ٹرک میں بیٹھتے ہی دیکھ چکی تھی۔ معلوم نہیں عشرت کے مکان میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ خدا جانے وہ کیسی عورت تھی لوگ اسے شاہ دین کی تیسری بیوی سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ بیوی تو کجا عورت کہلانے کی حقدار بھی نہیں تھی۔ میرے قدموں میں وہ پنجرہ پڑا تھا جس کے لئے ایک خلقت دیوانی ہو رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھنے کی کوشش لیکن تاریکی میں صرف پرندے کا ہیولا نظر آیا۔ ایک مدہم سی حیوانی بو ٹرک کے کیبن میں پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک سلیم چونک گیا سامنے سے آنے والا ایک ٹرک اپنی ہیڈلائٹس کو مخصوص انداز میں اوپر نیچے حرکت دے رہا تھا۔ سلیم نے ٹینکر کی رفتار کم کر دی سامنے والے ٹرک نے پاس سے گزرتے ہوئے سلیم سے کچھ کہا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ بولنے والا پشتو لہجے میں بولا تھا۔ سلیم نے بتایا کہ آگے ہائی وے پولیس چیکنگ کر رہی ہے۔ ٹرکوں اور بسوں والے ایک دوسرے کو ایسے اشارے عموماً دیتے رہتے ہیں۔ پٹھان ڈرائیور کا دیا ہوا اشارہ ہمارے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوا تھا۔ اس وقت ہم اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ پولیس کی ناکہ بندی کا سامنا کر سکتے۔ سلیم اشتہاری مجرم تھا اور میں بھی مفرور تھی۔ ہمارے پاس ایک انتہائی قیمتی پرندہ تھا اور یہ ٹرک بھی چوری کا تھا۔ اگر یہ سب کچھ چھپ بھی جاتا تو سلیم کے کپڑوں پر خون کے دھبے اور اس کے چہرے کی خراش اور رگڑ نہیں چھپ سکتی تھیں لہٰذا کچھ آگے جا کر سلیم نے ٹرک سڑک سے نیچے اتارا اور درختوں میں روک دیا۔ اس کی روشنیاں بجھا کر ہم نیچے اتر آئے۔ سلیم نے رائفل کندھے سے لٹکا کر پنجرہ ہاتھ میں لے لیا۔ ہم تیزی سے کھیتوں میں چلتے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ٹرک سے بمشکل نصف فرلانگ دور ہی گئے ہوں گے کہ سڑک پر بریکوں کے چرچرانے کی تیز آواز آئی۔ پھر دو گاڑیاں سڑک سے اتر کر کچے میں ہچکولے کھاتیں ٹرک کی طرف بڑھیں۔ یقیناً یہ شاہ دین کے آدمی تھے سلیم نے حالانکہ ٹرک سڑک سے ہٹا کر درختوں کے اندر روکا تھا مگر وہ تاڑنے والوں کی نظر سے چھپا نہیں رہا تھا۔ ہمارے کانوں میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بج اٹھیں۔ "تیز چلو' جلدی کرو۔" سلیم نے تیز لہجے میں کہا ہم دونوں حتیٰ الامکان رفتار سے سلیم کا ساتھ دینے لگے۔ یوسف کا ٹخنہ ابھی پوری طرح ٹھیک

نہیں ہوا تھا اسے تیز چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس وقت ہماری اولین ترجیح پناہ تھی۔ چاروں طرف چارے کے کوتاہ قد کھیت تھے۔ کوئی درختوں کا جھنڈ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ٹرک چھوڑ کر ہم فوری طور پر پکڑے جانے سے بچ گئے تھے مگر خطرات بدستور تعاقب میں تھے کوئی تین چار فرلانگ آگے کسی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے ہم نے اپنے قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ جونہی ہم اس نامعلوم گاؤں میں داخل ہوئے دور کھیتوں میں کسی گاڑی کی ہیڈلائٹ چمکنے لگیں۔ نوے فیصد امکان تھا کہ اس گاڑی میں شاہ دین کے مسلح کارندے ہوں گے۔ سلیم آگے آگے جا رہا تھا میں نے کہا۔

"سلیم میرا خیال ہے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔"

مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا سیدھا نکلتا چلا گیا۔ گلی کے اختتام پر ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا۔ وہ جوہڑ کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا اس سخت سردی میں وہ ہمیں ٹھٹھرتے ہوئے جوہڑ میں سے گزارنا چاہتا تھا۔ جوہڑ کے عین کنارے پر پہنچ کر وہ رک گیا ہم سے کہنے لگا جوتیاں اتار لو۔ اس نے اپنی جوتی بھی اتار لی اب ہم تینوں کے جوتے ہاتھ میں تھے.... وہ ہمیں لے کر واپس مڑ آیا۔ اچانک مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں آ گئی۔ وہ کافی دور اندیشی سے کام لے رہا تھا کچھ دور چل کر وہ ایک مکان کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ یہ اس گلی کا آخری مکان تھا۔ دو اطراف درخت تھے ایک طرف کوڑے کا ڈھیر سا تھا۔ عام دیہاتی مکانوں کے برخلاف اس مکان کی بیرونی دیوار قدرے اونچی تھی۔ سلیم نے باز والا پنجرہ نیچے رکھا اور ذرا سا اچھل کر مکان کے صحن میں جھانکا پھر آگے بڑھ کر دروازے کا جائزہ لیا وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ہاتھوں پر تھوک کر آپس میں رگڑا.... اور ایک ہی جست میں دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ اندر جا کر اس نے دروازے کی کنڈی گرائی اور ہم دونوں صحن میں چلے گئے۔ یکایک ایک اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں یوں لگا جیسے کوئی لالٹین تھامے ادھر چلا آ رہا ہے۔ یہ نازک لمحے تھے۔ سلیم نے یوسف کا بازو پکڑا اور جلدی سے ایک تاریک دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک فربہ جسم کا شخص ہاتھ میں لالٹین لئے جھومتا ہوا برآمد ہوا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ لالٹین نیچے رکھ کر اس نے اپنا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھایا۔ ایسے میں روشنی اس کے جسم پر پڑی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ کوئی پولیس والا

تھا۔ اس نے دروازے کی کنڈے گری ہوئی دیکھی تو سوچ میں پڑ گیا۔

"بانو۔" اس نے آواز دی۔ دروازے کو کنڈی نہیں لگائی تھی؟"

بانو جو اس کی بیوی تھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پولیس والا بڑبڑاتا ہوا کمرے کی طرف گیا اور کوئی چیز لے کر دوبارہ دروازے کی طرف گیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سے پتہ چلا کہ وہ دروازے کو تالا لگا رہا ہے۔ تالا لگا کر اور لالٹین اٹھا کر وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ ہم نہ صرف ایک پولیس والے کے گھر میں گھس آئے تھے بلکہ بند بھی ہو گئے تھے۔

سلیم اور یوسف تو اس خطرناک پناہ گاہ سے نکل بھی سکتے تھے لیکن میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا پولیس سے ٹکر لینا ہمارے ذہن میں تھا اور نہ ہی ہم ایسا چاہتے تھے.... اسی وجہ سے ہمارے تینوں کے ذہن میں تھا کہ یہاں سے نکل چلیں۔ دفعتاً ایک بار پھر لالٹین کی روشنی چمکی اور قدموں کی چاپ سنائی دی وہی شخص نمودار ہوا اور لالٹین سر کے برابر لا کر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ یقیناً اسے شبہ ہو چکا تھا تو اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور پھر یہی ہوا جونہی لالٹین کی روشنی اس تاریک کونے میں پہنچی جہاں ہم سمٹے کھڑے تھے پولیس والے کی آنکھیں پھیل گئیں ایک لمحے کے لئے شاید وہ خوفزدہ ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"اوئے کون ہو تم....؟" اس نے گرج کر پوچھا اور اس سے پہلے کہ کوئی ہم میں سے جواب دیتا اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا غالباً وہ ابھی گھر لوٹا ہی تھا۔ نہ صرف اس کی وردی جسم پر تھی بلکہ ہولسٹر بھی کمر سے لگا ہوا تھا۔ "کون ہو تم؟" اس نے پھر کڑک کر پوچھا۔ ہم تینوں کا حلیہ اسے اور بھی شیر کر رہا تھا۔ میں اور یوسف بوسیدہ سے دیہاتی لباس میں تھے۔ سلیم کا لباس بھی ادھڑا پھٹا ہوا تھا جو واحد چیز اس پولیس والے کو متاثر کر سکتی تھی وہ سلیم کی رائفل تھی مگر وہ رائفل سلیم نے صحن میں داخل ہوتے ہی ایک تندور کے اندر رکھ دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس رائفل کی وجہ سے ہمیں پناہ لینے میں دشواری ہو۔ اب وہ رائفل بھی ہماری دسترس میں نہیں تھی۔ سلیم نے اپنے لہجے میں دیہاتی پن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کہیں تسلی سے بیٹھ کر ہماری بات سن لیں ہم چور وور نہیں ہیں۔"

"ہوں.... ایک چوری اوپر سے سینہ زوری۔" پولیس والے نے بڑے بڑے دیدے گھما کر کہا۔

سلیم نے کہا "ہماری بات تو سن لو جی۔" وہ بولا "بچو جی! بات تو میں تہاڈی ایسی سنوں گا کہ کچھ سنانے کو باقی نہیں چھڈوں گا۔ چلو پیر پٹو ذرا آگے لگو ہاں تینوں۔" اس نے بڑی لاپرواہی سے اپنے ریوالور کو حرکت دی۔ اس کا حکم ماننے کے سوا ہمارے پاس چارہ نہیں تھا۔ وہ ہم تینوں کو لے کر ایک نیچی چھت والے کوٹھے میں آ گیا یہ کوٹھا باقی مکان سے قدرے علیحدہ تھا۔ ایک طرف چند ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں پڑی تھیں ایک سائیکل کھڑی تھی اور جلانے والی خشک لکڑیوں کا ڈھیر سا لگا تھا۔ پولیس والے نے لالٹین نیچے رکھ دی اور ہمیں دیوار کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ یوسف کافی ڈرا ہوا تھا اور لرز رہا تھا۔ میں پولیس والے کے عہدے کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیم تاریکی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بول چال اور ڈیل ڈول سے تو وہ کوئی حوالدار یا ہیڈ کانسٹیبل لگتا تھا مگر میں جانتی تھی کہ اس عہدے کے پولیس والے کے پاس ریوالور نہیں ہوتا شاید وہ سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا۔ سلیم کے چہرے پر بھی الجھن نظر آ رہی تھی تاہم وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ کمرے کی ملگجی روشنی میں پولیس والے نے پہلی مرتبہ سلیم کے ہاتھ میں پکڑا پنجرہ دیکھا اور غرا کر بولا۔

"یہ کیا اوئے.... اچھا تو غیر قانونی شکار بھی کھیڈتے ہو.... کہاں سے پکڑ کے لائے ہو اس ابے کو؟"

سلیم نے کہا.... "یہ میرا نہیں ہے جی.... جھنگ کے ایک خان صاحب کا ہے۔ ان کا ایک دوست لے گیا تھا اس سے لے کر آ رہا ہوں۔ خان صاحب کے پاس لائسنس ہے جی اس کا۔"

"کون سا خان ہے اوئے۔ مجھے بھی پتہ چلے یہ لائسنس شائسنس تو ہمارے ہتھوں سے ہو کر جاتے ہیں۔ کیا نام ہے خان کا؟"

"صمد خان۔" سلیم نے یونہی ایک نام لے دیا۔

"اچھا اچھا.... دیکھ لیں گے اس پاٹے خان کو بھی.... یہ عورت کون ہے؟ اور یہ منڈا کون ہے تیرے ساتھ؟"

ایک دم پولیس والے کی آنکھوں میں عجیب سے چمک نظر آئی اس نے غور سے باز کو دیکھا اور ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ "اوئے.... کہیں.... کہیں یہ وہ باز تو نہیں جس کے بارے میں اخباروں میں بھی آیا ہے.... اوئے ٹھیک ٹھیک بتاؤ.... کہیں یہ عربی شیخ والا باز تو نہیں۔"

سلیم نے کمال اعتماد سے کہا۔ "نہیں جناب یہ تو سستا سا باز ہے۔ ہمارے خان صاحب نے بچہ لے کر پالا تھا۔ اس طرح کے دو تین اور باز بھی ہیں ان کے پاس اگر آپ کو چاہیئے تو خاص رعایت کر دیں گے۔ ہزار بارہ سو میں پڑ جائے گا آپ کو؟"

"اوئے اوئے کسی بیوپاری کی اولاد تو مجھے کس لائن پر ڈال رہا ہے۔" پولیس والے نے گرج کر کہا۔ "میں نے اچار ڈالنا ہے اس کو خرید کر.... تم ذرا مجھ کو یہ دسو کہ میرے گھر میں کیسے گھسے ہو؟"

سلیم نے سادگی سے کہا۔ "جی ہم جھنگ جا رہے تھے آٹھویں میل کے پاس ہماری بس خراب ہو گئی سوچا کہ رکنا تو پڑ ہی گیا ہے۔ سائیں گلے شاہ کے مزار پر سلام کر لیں۔ وہاں رات بھی گزار لیں گے۔ مگر مزار سے تین چار غنڈے ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ ہاتھا پائی بھی کی ہم سے۔ یہ دیکھئے میری ساری قمیض پھاڑ دی ہے۔ ان سے بچتے بچتے آپ کے گھر میں گھس آئے۔"

پولیس والے نے کہا۔ "ایسی بڑی کہانیاں سنی ہیں میں نے.... دیکھ کاکا' مالا ہو گیا ہے خراب۔ ایسے مالوں میں کوئی خان شان اپنے کسی کارندے کی مدد نہیں کرتا۔ الٹا تم کو چھتر پڑیں گے اپنے مالک سے۔ تم ایک پلس افسر کے گھر میں گھسے ہو کوئی چھوٹا موٹا جرم نہیں کیا تم نے۔ چنگا یہی ہے کہ خان شان کو اس مالے میں نہ گھسیٹو اور ایتھوں کا مالا ایتھے ہی طے کر لو۔" وہ ہمیں پکا الو سمجھ رہا تھا۔ اس کی فطرت کا اندازہ کر کے سلیم نے اپنے چہرے پر کچھ اور سادہ لوحی طاری کر لی۔ ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

"غلطی ہو گئی ہے جی.... معاف کر دیں۔"

وہ بولا "غلطی تو ہوندی ہی معاف کرنے کے لئے ہے اور معافی کی قیمت شمت بھی تو ہوتی ہے.... کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں؟"

سلیم نے کہا "جی کرایہ نکال کر کوئی پندرہ بیس روپے ہوں گے۔"

"پندرہ وی سے کچھ نہیں بنے گا کوئی نیڑے تیڑے جاننے والا ہے تمہارا؟"

"نہیں جی.... بالکل پردیسی ہیں جی.... معاف کر دیں۔"

وہ کچھ اور شیر ہوا.... "کاکا بلی پلس والے کے گھر میں گھسنا اتنا بڑا جرم ہے کہ تمہارے صمد خان کو پتا چل گیا تو چھتر مار مار کر نوکری سے نکال دے گا تمہیں۔ اس تک یہ بات نہ ہی پہنچے تو اچھا ہے"

یوسف کا تو کچھ پتہ نہیں لیکن میں اور سلیم اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے یہ شخص ہمارے حلیے اور بول چال سے مکمل طور پر دھوکا کھا چکا تھا۔ اس کا دماغ عرش پر پہنچا ہوا تھا اور وہ ہمیں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "جناب! آپ خود ہی ہمیں کوئی راستہ بتائیے۔" اس نے مونچھ کو بل دیا۔ "مجھ سے بول بچن لانے کی کوشش نہ کرو۔ بڑا زریلا تھانیدار ہوں میں۔ چیکیں کڈوا دیتا ہوں بندے کی۔ زنانی ہو یا مرد سب پر ایک ہی ہاتھ رکھتا ہوں۔"

میں نے دیکھا سلیم کی نظریں پولیس والے کے ہاتھ پر جمی ہوئی ہیں غالباً وہ اس کے ریوالور کے رخ کا اندازہ کر رہا تھا یکایک اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص کو جا لیا۔ دونوں اوپر نیچے خشک لکڑی کے ڈھیر پر گرے۔ میں نے جلدی سے کوٹھے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا سلیم کا ایک زوردار مکہ پولیس والے کے منہ پر پڑا تو اس کے منہ سے ڈری ڈری چیخ نکل گئی ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اس کے زمین پر گرتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نقلی ہے میں نے آگے بڑھ کر یہ کھلونا ریوالور اٹھا لیا پولیس والا اب سلیم کے نیچے دہائی دے رہا تھا۔

"او بھاجی میری گل تے سنو.... او بھاجی ہتھ تے روکو۔"

سلیم نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور سیدھا کھڑا کر دیا اس کی آنکھ کے نیچے نیل نمودار ہو رہا تھا اور جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ "کون ہے تو؟" سلیم نے غصیلی سرگوشی کی۔ جواب میں اس شخص نے بھیک مانگنے والے لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ اس کا نام حسن دین ہے وہ ذات کا میراثی اور پیشے کا بہروپیا ہے۔ اس نے ایک عجیب شناختی کارڈ بھی دکھایا اور دعویٰ کیا کہ یہ اس کے "بہروپیے پن" کا اجازت نامہ ہے۔ سلیم نے مجھے اشارہ کیا میں جلدی سے گئی اور صحن کے کونے میں واقع تندور کے اندر سے سلیم کی وزنی رائفل نکال لائی۔ حسن دین بہروپیے کی بیوی خاصی گہری نیند سو

رہی تھی۔ اسے بالکل پتہ نہیں چلا تھا کہ گھر کے ایک حصے میں کیا کچھ ہوا ہے۔ میں نے کوٹھے میں جا کر رائفل سلیم کو تھمائی تو حسن دین کی خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ وہ کبھی رائفل کی طرف دیکھتا اور کبھی ہمارے بدلے ہوئے چہروں کی طرف۔ سلیم نے رائفل کی سرد نال اس کی گردن پر رکھی تو خوف سے اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ "مم.... میرا قصور بادشاہو.... وہ گھگیا کر بولا۔"

سلیم نے کہا۔ "تیرا قصور یہ ہے کہ تو بڑا زہریلا تھانیدار ہے۔ بندے کی چیکیں نکلوا دیتا ہے۔" وہ شرمندگی سے کھیس نکالنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ سلیم نے غرا کر کہا۔ "دیکھو میری طرف..... میرا نام بابری ہے جانتا ہے بابری کو؟"

"نہیں.... نہیں...." حسن دین نے کہا۔ اس کا جواب اور اس کی آنکھوں میں چمکنے والا خوف گواہی دے گیا کہ اس نے بابری کا نام ضرور سنا ہے۔ سلیم نے کہا۔ "کچھ غنڈے ہمارے پیچھے ہیں ہو سکتا ہے وہ ابھی کچھ دیر میں تیرے دروازے تک بھی آئیں اگر انہیں ہمارے بارے میں پتہ چلا تو سب سے پہلے میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

"نہ میرے بادشاہ۔" حسن دین نے لرز کر کہا۔ "میں آپ کا نوکر.... آپ کے نوکروں کا نوکر۔ آپ کے نوکروں کے نوکروں کا نوکر۔"

سلیم نے کہا۔ "چل جا.... اپنی بیوی کو جگا اور اسے طریقے سے سب کچھ بتا دے اور سمجھا بھی دے۔ میں بات دہرانے سے گولی چلانا بہتر سمجھتا ہوں اور ہاں.... اگر دودھ ہے تو گرم چائے کا انتظام بھی کر۔"

ہماری وہ رات خیریت سے گزر گئی تاہم خطرہ ابھی موجود تھا۔ حسن دین کی بیوی سلیم کی ہدایت پر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گھر سے باہر نکلی اور اس نے واپس آ کر بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کے گھر کے سامنے ایک کار اور ایک جیپ کھڑی ہے لوگ کہتے ہیں کہ رات کچھ چور گاؤں میں آئے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک یہیں کہیں چھپے ہوں.... صبح دس بجے کے قریب سلیم نے حسن دین عرف دینو کی بیوی کو پھر باہر بھیجا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ گاڑیاں واپس چلی گئی ہیں۔ یہ بڑی امید افزا خبر تھی۔ اس عورت کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارا کھرا اٹھانے والوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید ہم نہر پار کر کے آگے نکل گئے ہیں۔ (سلیم اس لئے ہمیں ننگے پاؤں چلا کر واپس لایا تھا)

عورت نے بتایا کہ کھرا اٹھانے کے لئے پاس والے گاؤں سے دو کھوجی بھی بلائے گئے تھے۔

شاہ دین ٹوانہ کے فارم سے نکلنے کے بعد ہم نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا دینو بے اولاد تھا گھر میں اس کی بیوی ہاجرہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں سلیم کو پوری طرح یقین دلا چکے تھے کہ ہمارے موجودگی کی خبر کسی کو نہیں ہو گی باز کا پنجرا ابھی تک کوٹھے میں ہی تھا۔ میں نے وہاں جا کر پہلی بار غور سے باز کو دیکھا واقعی وہ ایک شاندار پرندہ تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر عجیب طرح کی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ یقیناً ایسے پرندے کو پرندوں کا بادشاہ کہلانے کا حق حاصل تھا۔ سلیم نے بتایا کہ اسے مشرقی شہباز (ایسٹرن ہاک) کہا جاتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پرند کی لمبائی کم و بیش 25 انچ تھی سر گردن اور پشت سنہری مائل سلیٹی رنگ کی تھی۔ سینہ اور بطن بالکل سفید تھا اور ان پر آرپار خوبصورت سیاہ دھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ ٹانگیں حیرت انگیز طور پر بڑی اور مضبوط تھیں۔ میں محویت سے قدرت کے اس انمول شاہکار کو دیکھتی چلی گئی۔ میں نے پوچھا۔ "سلیم اس کی کیا قیمت ہو گی؟"

سلیم نے کہا۔ "کافی زیادہ ہے؟"

میں نے اس پر انکشاف کیا کہ خان رحیمی کے مطابق اس باز کی قیمت آٹھ لاکھ سے کم نہیں سلیم حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا اس نے پوچھا۔

"یہ بات تم سے خان رحیمی نے کی تھی!" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔

"پھر خان رحیمی نے جھوٹ بولا ہے یا اسے بازوں کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اس باز کی قیمت کم از کم چالیس لاکھ روپے ہے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں یک ٹک سلیم کو دیکھنے لگی۔ میری نگاہوں میں وہ سارے مناظر گھوم گئے جو خان رحیمی سے ملنے کے بعد اب تک پیش آ چکے تھے۔ شکاری پارٹیوں کی دیوانہ وار بھاگ دوڑ کا سبب اب اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی ساتھ والے کمرے سے حسن دین کی آواز آئی اور ہم دونوں چپ ہو گئے۔ حسن دین نے اندر آ کر سلیم سے کہا۔

"میرے سرکار! وہ منڈا آپ کا رو رہیا ہے۔ اس کو کیہہ ہوا ہے؟" دینو کا اشارہ یوسف کی طرف تھا۔ میں نے غور کیا تو واقعی سامنے والے کمرے سے یوسف کی ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر جلدی سے کمرے کی طرف گئی۔ دیکھا تو یوسف چارپائی پر پہلو کے بل پڑا تھا اور بازو آنکھوں پر رکھے رو رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" میں نے پوچھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پاس بیٹھ کر اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کندھا چھڑایا اور کچھ اور زور سے ہچکیاں لینے لگا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے یوسف۔ کچھ بتاؤ بھی۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ سخت ناراض ہے۔ میرے بار بار پوچھنے کے بعد آخر اس نے کہا۔

"جاؤ چلی جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"لیکن یوسف ہوا کیا ہے۔ میں نے یہی کہا تھا نا کہ اس عورت کو اس معاملے میں نہ گھسیٹو۔ کون سی ایسی بات بری بات کہہ دی تھی میں نے۔"

"تم نے مجھے گالی دی ہے۔ تم نے مجھے بے غیرت اور بزدل کہا ہے۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو تو مجھے بھی تم سے کم نفرت نہیں ہے۔" میں نے اسے پچکار کر اس کا ٹمپریچر کم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں اپنے لالچ کے لئے تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے۔ ایک پیسے کا فائدہ بھی میرے دماغ میں نہیں تھا۔ تمہارا وہ پرس بھی مجھے وہاں سے نہیں ملا تھا۔ پر میں نے سوچا کہ تمہیں بتایا تو تمہیں دکھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ پرس مجھے مل گیا ہے۔ میں صرف تمہارے فائدے کے لئے یہاں آیا تھا۔ مگر تم نے جو باتیں کی ہیں انہوں نے میرا کلیجہ ٹکڑے کر دیا ہے۔"

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پرس کے معاملے میں یوسف نے جھوٹ بولا تھا۔ اس بات سے اس کے خلوص کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر میں نے بھی کوئی ایسی ناجائز بات نہیں کی تھی..... وہ مجھ سے چھوٹا تھا اور ایک غلط طرز عمل پر اسے ٹوکنا میرا حق تھا اور فرض بھی۔ شاید میں نے الفاظ کچھ سخت استعمال کر دیئے تھے میں نے سوچا کہ اسے منالینا چاہئے۔

میں نے کہا "دیکھو یوسف۔ ہربات میں اللہ کی طرف سے کوئی بہتری ہوتی ہے۔ تم

نہ کھا کر ڈیرے کی طرف نہ جاتے اور سلیم سے ہماری ملاقات نہ ہوتی تو کیا پتہ ابھی ہم وہیں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوتے۔ قدرت نے ہمارا کام بھی کر دیا ہے اور تم ایک عورت کو دکھ پہنچانے کے گناہ گار بھی نہیں ہوئے۔ باقی اگر تمہیں میری کوئی بات ی ہو تو میں معافی مانگ لیتی ہوں۔ چلو اٹھو اپنی باجی کو معاف کر دو۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ اتنے میں سلیم آگیا۔

"...... بھائی یہ کیا رونا دھونا ہے؟" اس نے یوسف کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پوچھا

"نہیں یونہی سر میں درد ہو رہا تھا" یوسف نے ایک عام فہم بہانہ بتایا۔ سلیم نے ایک ئی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "اب اس باز کے بارے میں کیا ارادے

"

میں نے کہا "باز کا مالک تمہارے سامنے بیٹھا ہے اس سے پوچھو۔" میرا اشارہ کی طرف تھا۔ سلیم نے کہا۔

"ہاں.......... میاں یوسف اب اس کا کیا کرنا ہے؟" یوسف پہلے تو خاموش رہا سلیم دوبارہ پوچھا تو بولا۔ "جس طرح باجی کہتی ہے ویسے کر لو۔"

سلیم کی یہ بات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی کہ باز کی قیمت چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اس کا مطلب تھا اس پرندے کو جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک چاہئے۔ سوال اٹھتا تھا کہاں۔ جواب تھا۔ جہاں بھی یہ متلاشی نگاہوں سے بچ سکے۔ ڈھونڈنے والے ہاتھوں سے دور رہ سکے۔ میں اپنے دل کی واردات ٹھیک ٹھیک بیان چاہتی ہوں۔ چالیس لاکھ روپیہ کوئی چھوٹی رقم نہیں تھی۔ یہ باز اس وقت ہم تینوں کی تھا۔ ہم تینوں اسے اپنے پاس رکھنے کا سوچ سکتے تھے۔ سلیم کو اپنی زندگی سنوارنے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔ یوسف کو اپنی محبت حاصل کرنے کے لئے پیسے کی ت تھی اور مجھے بھی اپنے فرحان کا انتقام لینے کے لئے پیسے کی ضرورت پیش آ سکتی اس دنیا میں پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ جسے نہیں ہوتی وہ ولی اللہ ہوتا ہے یا درجے کا جھوٹا۔ ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت تھی اور میں خود کو خان رحیمی سے ہوئے کسی وعدے کا پابند نہیں سمجھتی تھی۔ بات اس سے لئے ہوئے چالیس ہزار کی تھی تو میں وہ اسے واپس بھی لوٹا سکتی تھی۔ یوں ہم اس بیش قیمت پرندے کو

اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ پرندہ ہمارے پاس محفوظ نہیں تھا۔
اول تو ہم اس پنجرے کے ساتھ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر نکل بھی جاتے
تو ڈھونڈنے والے ہمیں پاتال سے بھی نکال لیتے پھر سب سے ٹیڑھی کھیر اسے "ڈسپوز"
کرنا تھا۔ چیز کی قیمت وہی ہوتی ہے جس پر وہ فروخت ہوسکے۔ اس پرندے کی
مارکیٹ میں یقیناً چالیس لاکھ کے ہندسے کو چھو رہی تھی مگر ہم اسے اس قیمت پر
نہیں بیچ سکتے تھے۔ تو پھر کیا بہتر تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ موجودہ حالات میں اس پرندے
سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ یعنی اسے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے
مطابق خان رحیمی کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے صلے میں اس کا قرب اور اعتماد
حاصل کیا جائے۔ حالات کے تھپیڑوں نے مجھے بڑی تیزی سے ایک بدلی ہوئی عورت بنا دیا
تھا۔ واصف کی سختیوں اور عزت نفس کو خاک میں ملانے والی سزاؤں نے میرے اندر
تبدیلی کی گنجائش پیدا کی تھی۔ اس کے بعد جب میرے رشتے ناطوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا
تھا اور مجھے میری جڑوں سے کاٹ کر لاوارثی کی زمین پر پھینک دیا گیا تھا تو میں غیر محسوس
طور پر اس نئی مٹی میں پیوست ہونے لگی تھی۔ یہ لاوارثی جو کل تک مجھے اندھیرے میں
بھٹکا رہی تھی اب میری رہنمائی کرنے لگی تھی۔ اس لاوارثی نے میری انگلی تھام لی تھی
اور انتقام کے لئے مجھے جینا سکھا رہی تھی۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ میرے
اندر خوداعتمادی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔ ایسے فیصلے جن کے کرنے کا
میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"سلیم! ہمیں یہ باز خان رحیمی تک پہنچانا ہے۔"

سلیم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن بات کئے بغیر بند کر لیا۔ ہونٹ کھلنے اور
بند ہونے کے وقفے میں وہ ایک بہت بڑا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایسا فیصلہ جو ہزار گھنٹوں کی سوچ
کے بعد بھی نہ ہو پاتا۔ مگر میرے ساتھ اس کی غیر مشروط وابستگی نے پلک جھپکنے میں یہ
فیصلہ کرا دیا تھا۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے ثنا جیسے تمہاری مرضی.... مگر اس بارے میں
سمجھ لو کہ خان رحیمی تک پہنچنا کس طرح ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا

"مطلب یہ کہ ہمیں خان رحیمی کے ڈیرے پر پہنچنے سے پہلے وہاں کے حالات

جاننا چاہیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے باز کے سلسلے میں شاہ دین سب سے پہلے خان
رحیمی پر شک کرے گا۔ تمہارے اور یوسف کے بارے میں شاہ دین کو یہی شبہ تھا کہ
تمہیں خان رحیمی نے بھیجا ہے۔ ممکن ہے خان رحیمی کا ڈیرہ شاہ دین کے آدمیوں کی نظر
میں ہو اور ہم وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لئے جائیں۔"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

سلیم نے کہا "ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ہم دینو کو جھنگ بھیجتے ہیں
خان رحیمی کے ڈیرے کی طرف۔ وہ خان رحیمی کو ہمارا پیغام پہنچائے کہ باز ہم نے حاصل
کر لیا ہے اب یہاں سے نکلنے کا مسئلہ ہے۔ وہ اس کا کوئی حل نکالے۔"

سلیم کی تجویز خاصی معقول تھی۔ مگر دینو کو اس مشن پر بھیجنا خطرے سے خالی نہیں
تھا۔ سلیم میری الجھن بھانپ کر بولا۔ "دینو کے بارے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔
ہم نے اس کی ایک ایسی رگ پکڑی ہے کہ مرتا مر جائے گا مگر ہمیں دھوکا نہیں دے
گا۔"

"کیا مطلب....؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اس مکان میں چوری کا مال موجود ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ کل رات
دروازے کی کنڈی کھلی دیکھ کر دینو کتنا پریشان ہوا تھا۔ وہ فوراً اندر گیا تھا اور تالا لے کر
آیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں یاد ہے۔"

سلیم بولا۔ "اور تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس مکان کی چار دیواری دوسرے
مکانوں سے کافی اونچی ہے!" میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ سلیم نے کہا کہ "یہ سب
احتیاطی تدبیریں اس مال کے لئے ہیں جو دینو نے اس مکان میں چھپا رکھا ہے۔ تقریباً پچپن
ساٹھ ہزار کا سونا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

سلیم نے کہا "کل رات اس کاٹھ کے الو نے خود ہی بتا دیا ہے۔ وہ کافی ڈرا ہوا تھا۔
میں نے اسے کہا دینو پچھلے کمرے کی چابی نکال۔ دراصل میں وہاں باز والا پنجرہ رکھنا چاہتا
تھا۔ دینو پتہ نہیں کیا سمجھا۔ ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے کہنے لگا۔

"بادشاہو! آپ کو سب پتہ ہے۔ مجھ سے بلی چوہے کا کھیل کیوں کھیلتے ہو۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ خود ہی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔"

"مجھے اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی مگر اتنا ضرور پتہ چل گیا کہ وہ اپنا کوئی جرم چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے طریقے سے بات کی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ کوئی دو ڈھائی مہینے پہلے ایک چاندنی رات میں وہ سائیکل پر شہر کی طرف سے آ رہا تھا کہ ایک جگہ اسے پیشاب آگیا۔ اسے پیشاب کی بیماری ہے۔ جب حاجت ہوتی ہے ایک دم بول اٹھتا ہے۔ سائیکل پھینک کر وہ کھیتوں کی طرف دوڑا کچھ دور ایک پگڈنڈی پر جاتے ہوئے دو اچکے اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ دینو بہروپئے کی وردی میں تھا۔ انہوں نے اسے پولیس والا سمجھا پہلے تو انہوں نے ایک کھیت میں چھپنے کی کوشش کی۔ پھر کوئی چیز پھینک کر مخالف سمت میں بھاگ اٹھے۔ دینو نے پاس جا کر دیکھا وہ ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی اس میں ایک ٹرانسسٹر ریڈیو' چند قیمتی کپڑے اور زیورات تھے۔ دینو یہ سامان گھر لے آیا۔ کپڑے تو اس نے جلا ڈالے۔ ٹرانسسٹر گندے نالے میں پھینک دیا اور زیورات کو ایک ڈبے میں بند کر کے زمین میں دبا دیا۔ یہ زیورات اب تک اس کے پاس تھے۔ وہ فطری طور پر ایک ڈرپوک شخص تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان زیورات کا کیا کرے۔"

کسی نے سچ کہا ہے دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر شخص ایک کہانی ہے۔ حسن دین ایک بہروپیا تھا وہ بہروپیا کیوں بنا اور اسے ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی یہ ایک علیحدہ سوال ہے مگر اس بہروپئے کی ذات سے نجانے کتنی کہانیوں کو وجود ملا تھا۔ سلیم نے بتایا کہ دینو اب پوری طرح اس کے قابو میں ہے اور وہی کرے گا جو سلیم کہے گا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت سلیم نے دینو کو ضروری ہدایات دے کر خان رحیمی کی طرف روانہ کر دیا۔

دینو کی واپسی اگلے روز شام کے وقت ہوئی۔ خان رحیمی کے دو کارندے بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے باز کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ باز میرے پاس ہے پہلے یہ بتاؤ کہ جانے کا کیا انتظام ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھکر سے ایک ٹریکٹر ٹرالی ساتھ لائے ہیں اس میں کھاد کی بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ بوریوں کے درمیان اتنی جگہ ہے کہ تین چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ میں نے سلیم سے کہا کہ وہ باہر جائے اور دیکھ کر آئے۔ سلیم ان دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا کچھ دیر بعد واپس آ کر اس نے بتایا کہ

ٹرالی میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دینو نے بتایا کہ وہ بھی ساتھ جا رہا ہے۔ وہ خاصا خوش نظر آتا تھا پتہ چلا کہ خان رحیمی سے اس کی کافی گپ شپ ہوئی ہے اور خان رحیمی نے اسے ساتھ ہی آنے کو کہا ہے۔ غالباً خان رحیمی دینو کے ""بھانڈ پنے"" سے متاثر ہو چکا تھا۔ جونہی اندھیرا گہرا ہوا ہم دینو کے گھر سے نکلے اور پاس ہی کھڑی ہوئی ٹرالی میں چڑھ گئے۔ گھر چھوڑنے سے پہلے دینو نے اپنے گھر کے پچھلے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اطمینان کیا کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں سلیم نے زیورات کی صفائی تو نہیں کر دی.... ٹرالی میں بوریاں بڑے طریقے سے لادی گئی تھیں۔ عین درمیان میں ایک خلا تھا۔ یہ خلا لمبائی کے رخ پر تھا اور ہمارے بیٹھنے کے بعد اس کے اوپر بھی بوریاں رکھی جا سکتی تھیں۔ ہم تینوں یعنی میں یوسف اور سلیم باری باری پنجرے سمیت اندر چلے گئے۔ دونوں آدمیوں نے دینو کے ساتھ مل کر اوپر بوریاں چن دیں۔ تاریکی میں یوریا کھاد کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگا مگر یہ تاریکی اور بدبو تو اگلے دو تین گھنٹے تک برداشت کرنا ہی تھی۔

ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد براستہ جھنگ بالآخر ہم سمندری گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی اس کہنہ سال کوٹھی کے سامنے رکی جسے خان رحیمی کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ جہاں بازوں کا معروف شکاری خان رحیمی رہتا تھا اور جس کی طویل راہداریوں اور تنگ و تاریک کمروں میں کہیں وہ راز بھی پوشیدہ تھا جو میرے بااثر دشمنوں کو قانون کی دسترس میں لا سکتا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی کوٹھی کے وسیع لان میں پہنچ کر رکی۔ بوریاں اٹھا کر ہمیں باہر نکالا گیا۔ خان رحیمی نے بڑی بیتابی سے میرا استقبال کیا۔ اس کی نگاہیں باز کی دید کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میں نے بوریوں کے اندرونی خلا سے پنجرہ نکال کر خان رحیمی کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی نمودار ہوئی۔ باچھیں کھل گئیں اور وہ کانپتے سر کے ساتھ پرندے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

"ونڈر فل۔ ان بی لیوایبل۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا اور جوش سے بولا۔

"یو آر اے گریٹ گرل۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا کہنا چاہئے۔ حیران کر دیا ہے تم نے۔"

میں نے دیکھا چند فٹ کی دوری پر شوقیہ کھڑی بڑی رقیبانہ نگاہوں سے مجھے گھور

رہی تھی۔ خان رحیمی نے باز کے نظارے سے چونک کر کہا۔ "چلو بھئی اندر چلو فوراً اندر چلو۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ اور پھر ہم نے تم سے پوری کہانی بھی تو سننی ہے۔"

ہم سب کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں اچانک ہی خان رحیمی کے لئے وی آئی پی کا درجہ حاصل کر گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے برابر بٹھایا۔ سلیم اور یوسف کے ساتھ بھی وہ بڑی محبت سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے یوسف کو گھورتے ہوئے کہا "یہ لڑکا کہیں.... ؟میرا مطلب ہے۔"

میں نے کہا "آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ یہی یوسف ہے اس نے یہ باز یہاں تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے"

خان رحیمی نے کہا "یوں مزا نہیں آئے گا۔ میں بات شروع سے اور تفصیل سے سننا چاہوں گا۔ اس لئے پہلے چائے کا پروگرام ہو جائے۔ کہانی کا مزا چائے کے بغیر سفر کا مزا موسیقی کے بغیر اور ہنی مون کا مزا برفباری کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں دینو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

دینو نے کہا "مائی باپ' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ عالم لوک ہو۔ ویسے ہنی مون میں نے بھی ایک دفعہ کھادا تھا۔ کوئی خاص مزا نہیں آیا تھا۔ خالص ہنی مون تو اب کہیں ملتا ہی نہیں ہے۔" خان رحیمی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اوئے میراثی کے بچے یہ ہنی مون کھایا نہیں منایا جاتا ہے۔" دینو نے بات بدلی "بس جی! آپ مناتے ہوں گے۔ ہم میراثی لوگ تو کھاتے ہیں۔ اپنا اپنا ٹے سٹ ہوتا ہے نا"

"وٹ ٹے سٹ۔ یہ ٹے سٹ کیا ہے؟"

میں نے وضاحت کی کہ "ٹیسٹ۔ ٹی اے ایس ٹی"

خان رحیمی نے دینو کو انگلش میں ایک دو بے ضرر گالیاں دیں اور پھر شوقیہ کو چائے کے لئے آوازیں دینے لگا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ خان رحیمی اور دینو میں اتنی جلدی بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے۔ در حقیقت مزاح خان رحیمی کی کمزوری تھا اور کوئی بھی مزاحیہ شخص اسے اپنا گرویدہ کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ چائے کے دوران میں نے خان رحیمی کو اپنی کتھا سنانی شروع کی.... میں اب اس سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ یوسف کے ساتھ اپنی اولین ملاقات سے لے کر شاہ دین ٹوانہ کے فارم تک

پہنچنے اور وہاں سے باز حاصل کرنے تک سب کچھ حرف بحرف میں نے خان رحیمی کو بتا دیا۔ اگر چھپایا تو صرف سلیم کا کردار۔ میں نے اسے بابری ہی کے نام سے متعارف کرایا اور خان کو بتایا کہ اس نے باز کو فارم سے نکالنے میں ہر طرح میری مدد کی ہے۔ ویسے میرے بتانے سے پہلے ہی خان رحیمی اور بابری ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ میواتی گاؤں کے اکٹھ میں وہ دونوں ہی موجود تھے۔ خان رحیمی یہ سن کر بے حد حیران ہوا کہ جس وقت میں اس سے پینتالیس ہزار روپیہ وصول کر رہی تھی۔ اس وقت یوسف اس کوٹھی کے ایک کمرے میں موجود تھا۔

مختصر یہ کہ خان رحیمی ہم تینوں کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا' اور بات تھی بھی متاثر ہونے والی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ہم نے وہ لاکھوں روپے کا باز بہ رضا و رغبت خان رحیمی کے حوالے کر دیا تھا (اپنی گفتگو کے دوران انگریزی کا سہارا لیتے ہوئے میں نے خان کو یہ بھی جتا دیا تھا کہ میں اور سلیم باز کی اصل قیمت سے آگاہ ہیں) خان رحیمی دیر تک ہم تینوں سے اس مہم کی تفصیلات دریافت کرتا رہا۔ تقریباً تمام شب یہ محفل جمی رہی۔ صبح چار بجے ہم آرام کرنے کے لئے اٹھے۔ خان رحیمی نے بتایا کہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے' پرسوں اس کی واپسی ہو گی اور باز کی حصولیابی کے سلسلے میں ڈیرے پر جشن منایا جائے گا۔

اس روز دوپہر کے وقت میں بیدار ہوئی تو پتہ چلا کہ خان رحیمی کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزری تو خان رحیمی پر نظر پڑ گئی۔ وہ شیشے کے ایک چوکور ٹکڑے پر جھکا ہوا بغور کسی سفید سفید چیز کا معائنہ کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر چونک گیا اور مجھے اندر بلا لیا۔

"یہ دیکھو گرل" اس نے بڑی اپنائیت سے کہا "پہچانو یہ کیا ہے" میں غور کیا تو کراہت سی آ گئی۔ شیشے کے ٹکڑے پر کسی پرندے کی بیٹ تھی۔ ایک بیٹ مکمل تھی جبکہ دوسری کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

"جانتی ہو یہ کس کی بیٹ ہے؟" خان رحیمی نے پوچھا۔

میں نے کہا "باز ہی کی لگتی ہے۔"

وہ بولا "کسی حد تک ٹھیک کہتی ہو مگر یہ ایسٹرن گوزہاک نہیں۔ میرا قیافہ ہے کہ

گولڈن ایگل ہے۔ ہمالین گولڈن ایگل..... اس بیٹ کے اندر تم یہ سیاہ داغ دیکھ رہی ہو، یہی اس کی نشانی ہے' یہ بھی کافی قیمتی پرندہ ہوتا ہے مگر جس پرندے کی یہ بیٹ ہے' یہ ابھی نوخیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پر پہلی بار نکلے ہیں.....''

بازوں' عقابوں اور شاہینوں کے متعلق خان رحیمی کی معلومات بہت وسیع تھیں.....

وہ اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر آگے پیچھے حرکت دے کر مختلف زاویوں سے بیٹ کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ بیٹ نہ ہو کوئی قیمتی ہیرا ہو اور خان رحیمی کو اس کی شناخت کرنی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے عینک اتار کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کسی ملازم کو آوازیں دینے لگا۔ کسی نے پوچھا۔

''جناب کہیں جا رہے ہیں؟''

وہ بولا ''ہاں جانا ہی پڑے گا۔ یہ بیٹ کا نمونہ دریا پار کے جنگل سے مصطفیٰ نے بھیجا ہے۔ بڑا پرانا شکاری ہے مصطفیٰ۔ کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔ یہ پرندہ یقیناً اس جنگل میں موجود ہے۔ ہم نہ پہنچیں گے تو کوئی اور لے جائے گا۔''

میں نے پوچھا ''واپسی کب تک ہوگی؟''

''دو راتیں تو لگ ہی جائیں گی' پرسوں تھرس ڈے کو صبح سویرے پہنچ جاؤں گا۔ باقی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تین چار رائفل مین یہاں موجود ہیں۔ میرا بھتیجا بھی ادھر موجود ہے۔ شاہ دین کوئی رسک لینے کی حماقت نہیں کرے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی آدمی کو بات چیت کے لئے بھیجے۔ ایسے میں جاوید اس سے ڈیل کرلے گا۔ یو ڈونٹ وری!''

خان رحیمی کے ساتھ پوری شکاری پارٹی جا رہی تھی۔ دو جیپیں تھیں ایک پک اپ میں سامان لادا جا رہا تھا۔ جال' لوہے کے ڈنڈے' بندوقیں وغیرہ۔ سہ پہر کے وقت یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سلیم نے شکار کے سلسلے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا تو خان رحیمی نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

وہ تین بجے روانہ ہوئے۔ قریباً چار بجے شوقیہ میرے پاس آئی۔ میں اس وقت یوسف کے ساتھ اپنے سابقہ کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی نخوت سے اطلاع دی کہ کوئی عورت باہر مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

میں نے پوچھا ''کون ہے؟''

بولی ''ماتھے پر تو نام نہیں لکھا ہوا' خود ہی جا کر دیکھ لو۔''

میں نے کہا ''میرا پوچھ رہی تھی؟''

بولی ''نہیں۔ کہتی تھی بابری سے ملنا ہے۔ بابری نہیں تو خان رحیمی سے ملوا دو۔ میں نے کہا وہ دونوں نہیں ہیں کہنے لگی پھر یوسف یا اس کی بہن سے ملوا دو۔''

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ مجھ سے ملنے یہاں کون آ سکتا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ سے کہا کہ ملاقاتی عورت کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

شوقیہ نے کہا ''بڑا کہا تھا میں نے اسے' کہتی ہے یہیں بات کروں گی۔ گیٹ کے سامنے ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

میں الجھن کو جھٹک کر شوقیہ کے ساتھ ساتھ باہر آئی۔ طویل صحن طے کر کے گیٹ پر پہنچی تو سامنے ہی پیلی چھت والی کالی ٹیکسی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر کوئی برقعہ پوش بیٹھی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے نکل کر درختوں میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں جھک کر کہا۔ ''جی فرمائیے!''

عورت نے رخ میری طرف موڑا۔ اس کے چہرے پر دوہرا نقاب تھا۔ کھنک دار آواز میں بولی۔ ''اندر آ جاؤ میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں نے پوچھا۔ ''لیکن آپ ہیں کون؟''

وہ بولی۔ ''میرا نام عشرت ہے۔ شاہ دین فارم سے آئی ہوں۔''

اس کا یہ فقرہ مجھے ہلا کر رکھ گیا۔ اس عشرت کو سلیم غسل خانے میں بندھا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔ وہ نقاب کی اوٹ سے بولی۔

''تم وہی ہو نا جسے یوسف نے اپنی بہن بتایا تھا!''

''ہاں وہ مجھے اپنی بہن ہی کہتا ہے۔''

عورت نے ہاتھ بڑھا کر اپنا نقاب بائیں جانب الٹ دیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور آنکھیں تھرا کر رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا جیسے میری بڑی بھابی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ ہو بہو وہی چہرہ' وہی ناک نقشہ۔ میں نے آنکھوں کو زور سے جھپکا اور

حواس بحال کئے۔ یہ لڑکی جو اپنا نام عشرت بتا رہی تھی 80 فیصد میری بھابی کی تصویر تھی۔ اگر اس کا چہرہ ذرا سا فربہ اور عمر چند سال زیادہ ہوتی تو شاید میرے لئے اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

"کیا بات ہے تم حیران ہو گئی ہو؟" عشرت نے پوچھا۔

"ن.......... نہیں تو.........." میں نے خود کو کمپوز کیا۔

وہ بولی۔ "بابری کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ تھوڑی ہی دیر پہلے کسی کام سے گیا ہے۔"

"کب تک آ جائے گا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے ایک دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

عشرت نے ہونٹ سکوڑے' اس کے چہرے پر الجھن تھی' آخر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "سچ سچ بتاؤ' تمہارا اصل نام کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے میں نے اپنا غلط نام آپ کو کبھی نہیں بتایا۔ میرا نام شاہدہ ہے۔" (اسی نام سے میں نے خان رحیمی کے پاس ملازمت حاصل کی تھی)

معلوم نہیں عشرت کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں بہرحال وہ مجھے اسی نام سے پکارنے پر تیار ہو گئی۔ بولی۔ "شاہدہ تم سلیم کی کیا لگتی ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو لگتی ہو گی جو تمہارے لئے اس نے شاہ جی کو اتنا بڑا دھوکا دیا۔" عشرت کے لہجے میں رقابت کی جھلک تھی۔

"دیکھیں عشرت صاحبہ! آپ اپنے کام کی بات کریں۔"

"ارے' تم تو برا مان رہی ہو۔ میں نے ایک رسمی بات کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ایسی ہی رسمی بات میں بھی کر سکتی ہوں' آپ اس کی کیا لگتی ہیں؟"

عشرت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں چور ہے گڑبڑا کر بولی۔ "دیکھو' میں اس وقت بحث میں پڑنا نہیں چاہتی' ایک بڑی ضروری اطلاع لے کر یہاں آئی ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

عشرت نے نقاب کو گھونگھٹ کی طرح تھام کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھا جیسے ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے۔ اس کی آنکھوں سے سراسیمگی جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔ بولی۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ خان رحیمی اور دوسرے لوگ کہاں گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

وہ بولی۔ "مگر مجھے پتہ ہے' وہ باز کے شکار پر گئے ہیں اور مصطفیٰ نامی شکاری نے انہیں اس باز کے بارے میں خبر دی ہے۔"

میں حیرت سے عشرت کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سو فیصد درست کہہ رہی تھی۔ عشرت نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے شاہدہ' بڑا زبردست نقصان ہونے والا ہے خان رحیمی کا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"خان رحیمی کو جان بوجھ کر یہاں سے بھیجا گیا ہے۔ یہ ساری شاہ جی کی چال ہے۔ مجھے بتاؤ ان لوگوں کو یہاں سے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہی کوئی ایک گھنٹہ ہوا ہے۔"

وہ بولی۔ "تو انہیں فوراً واپس بلانے کا انتظام کرو۔ ورنہ شاہ جی اور ان کے آدمی اس کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

میں سن ہو کر رہ گئی۔ عشرت کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی وہ نایاب باز اس وقت کوٹھی میں تھا اور خان رحیمی شکار پر۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عشرت نے مزید بتایا کہ شاہ جی اور اس کے آدمی بھکر سے روانہ ہو چکے ہیں اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ شاہ دین پہلے اپنے صرف ایک آدمی کے ساتھ خان سے ملنے کے بہانے کوٹھی آئے گا۔ اگر حالات سازگار ہوئے یعنی خان رحیمی اور اس کے مسلح کارندے موجود نہ ہوئے تو وہ کوٹھی میں ہی رک جائے گا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اس کے باقی ساتھی بھی کوٹھی پر آ دھمکیں گے۔ دوسری صورت میں وہ خان رحیمی سے دعا سلام کے بعد فوراً واپس جانے کی کوشش کرے گا.......... میں نے عشرت سے پوچھا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہے۔

وہ بولی۔ "دیکھو تم اب وقت ضائع نہ کرو۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے خان رحیمی اور

بابری کو واپس بلا لو۔" پھر اپنی نیلی کلائیاں مجھے دکھا کر بولی۔ "یہ دیکھو' ظالم اتنی زور سے مجھے باندھ کر آیا تھا' کوئی اور ہوتی تو اس پر تھوکتی بھی نہ۔ یہ مرد ہوتے ہی ہرجائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا' پھر نقاب ڈال کر بولی۔ "ڈرائیور کو بلاؤ میں اب جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "ایک بات میں بھی پوچھ سکتی ہوں؟؟"

وہ نقاب الٹ کر بولی۔ "پوچھو.......... لیکن جلدی۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری شکل کی ایک عورت میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے' شاید لاہور میں کسی شادی پر' تمہاری کوئی بہن لاہور میں رہتی ہے؟؟"

میں نے صاف دیکھا عشرت کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ بولی۔ "نہیں تو میری تو کوئی بہن نہیں' ہو سکتا ہے مجھے ہی دیکھا ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں' وہ تو اپنا نام شاید امینہ یا ثمینہ بتاتی تھی۔"

عشرت کے چہرے نے ایک بار پھر رنگ بدلا۔ بظاہر لاپرواہی سے بولی" بھئی ہو گی کوئی.......... ویسے تمہیں احساس نہیں کہ میں کس مشکل سے یہاں پہنچی ہوں اور نہ ہی یہ احساس ہے کہ تھوڑی دیر بعد یہاں کیا ہونے والا ہے' تم خان رحیمی کو بلانے میں ایک لمحے کی دیر نہ کرو' مجھے اجازت دو' میں چلتی ہوں۔" اس نے کھڑکی سے سر نکال کر ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ جلدی سے ڈرائیونگ نشست کی طرف بڑھا میں باہر نکل آئی۔

اس نے برقعے کے اندر سے کہا۔ "شاہدہ' جلدی کرو۔" میں نے سر کے اشارے سے "اچھا" کہا۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی واپس روانہ ہو گئی۔

خوش قسمتی سے ایک گاڑی اس وقت کوٹھی میں موجود تھی۔ میں نے ایک رائفل مین سردار محمد سے مشورہ کیا اور اسے ساری صورت حال بتا کر دینو کے ساتھ شکار پارٹی کے پیچھے روانہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کوٹھی کے بیرونی گیٹ کو اندر سے تالہ لگوا دیا اور باقی تمام دروازے بھی بند کرا دیئے۔ اس کی بعد خان رحیمی کے تینوں سینٹ برنارڈ کتے لان میں کھلے چھوڑ دیئے۔ یہ کتے اتنے جسیم تھے کہ اندھیرے میں دیکھنے والا کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کتے ہیں۔ سینٹ برنارڈ نسل کے عام کتوں کی طرح ان

کے جسم بالوں سے بھرے ہوئے تھے.......... شیخ والا باز اس وقت خان رحیمی کے خاص کمرے میں تھا اور ایک آدمی اس کی نگرانی پر مقرر تھا۔ میں نے رنگو نامی شخص کو ساری صورت حال بتائی اور اسے کہا کہ وہ باز لے کر تہ خانے میں چلا جائے۔ کوٹھی میں رائفل مینوں کے علاوہ اس وقت گیارہ ملازم اور تھے ان میں ایک خانساماں' ایک باورچن' ایک ہیلپر' دو مالی' تین صفائی ستھرائی والی عورتیں' دو خدمت گار اور ایک شوقیہ تھی' مگر میرے سمیت ان میں کوئی بھی رائفل کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ ہم سب کوٹھی کی بالائی منزل پر آ گئے اور خان رحیمی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ سورج دور مغربی جنگل میں ڈوب گیا تھا۔ خنکی کا ہاتھ تھام کر تاریکی کی سبک گام پرچھائیاں ہر طرف پھیلتی جا رہی تھیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ دھیرے دھیرے پرسکون خاموشی میں بدلنے لگی۔ یہ خاموشی اپنے دامن میں خطرے سمیٹے ہوئے تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ خان رحیمی جیسے جہاندیدہ شخص کو ایسی غلطی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی نے اسے اس جال میں پھنسایا تھا۔ یا پھر شکار کا انتہا کو چھوتا ہوا شوق اس کوتاہی کا سبب تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا' اب میری دعا تھی کہ کوئی سانحہ رونما ہونے سے پہلے وہ لوگ لوٹ آئیں..........

ہر پل گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتا رہا تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دور درختوں میں گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ ہم سب کے دل شدت سے دھڑکنے لگے' ان روشنیوں کے عقب میں کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ بھی اور خان رحیمی بھی' اہل خانہ بھی اور دشمن خانہ بھی۔ کوٹھی میں موجود دونوں رائفل مین اور چوکیدار سبحان خان تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ گاڑیاں ہچکولے کھاتی قریب پہنچیں تو پھر کسی نے خان رحیمی کی چوکور بتی والی جیپ پہچان لی۔ سینے سے شکر کا سانس نکلا۔ خان رحیمی' سلیم اور دوسرے لوگ گاڑیوں سے نکل کر تیز قدموں سے کوٹھی کے اندر آئے۔ دینو اور سردار محمد کی زبانی انہیں کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ باقی کی تفصیل انہیں میں نے بتا دی۔ سلیم میری باتوں سے سمجھ گیا کہ یہ اطلاع پہنچانے والی لڑکی وہی عشرت ہے۔

خان رحیمی کے چہرے پر ہلکی سی خجالت تھی۔ وہ ایک گھاگ شخص تھا۔ ایسی غلطی اس سے شاذ ہی ہوئی ہو گی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھا گریٹ گرل' ہم جیسے بوڑھوں کو بھی یہ دنیا چکر دینے سے باز نہیں آتی۔ بہرحال......... ویل ڈن' تم نے بروقت فیصلہ کیا ہے' مگر یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے سلیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہو گی کوئی آپ کی ہمدرد۔"

سلیم نے کہا۔ "خان جی' کیوں نہ یہ گاڑیاں پچھلے صحن میں کھڑی کر دیں!"

خان رحیمی بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہیں پیچھے لے جاؤ اور وہاں کی لائٹس بھی آف کر دو۔"

اس کے بعد خان رحیمی نے اپنے مسلح گارڈوں کو کوٹھی کی چھت پر بھیج دیا۔ ان کی تعداد پندرہ سے کم ہرگز نہیں تھی۔ سب کے پاس طاقتور رائفلیں' موزر اور پستول تھے۔ میں سمجھ گئی کہ راستے میں خان رحیمی اور اس کے ساتھی شاہ دین کے سلسلے میں کوئی پلاننگ کر چکے ہیں۔

اس وقت نو بجے تھے جب کوٹھی کے گیٹ پر ایک جیپ آ کر رکی۔ خان رحیمی' سلیم' سردار محمد' یوسف اور میں دوسری منزل پر سامنے والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کھڑکیوں سے گیٹ کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ جیپ سے شاہ دین ٹوانہ اپنے ذاتی محافظ شیر محمد کے ساتھ اترا۔ شیر محمد کے سر پر بڑی سی پٹی تھی یہ پٹی اس ٹکر کی مرہون منت تھی جو سلیم نے فارم سے نکلتے وقت شیر محمد کے ماتھے پر ماری تھی۔ شیر محمد جیسا مضبوط اور کڑیل شخص اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا مگر سلیم کی اس ٹکر نے اس کے سارے کس بل ایک پل میں نکال دیئے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی سلیم کے سر میں' میں نے جس کسی کو بھی اس کی ضرب کھاتے دیکھا تھا وہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہا تھا......... ہم نے دیکھا شاہ دین ٹوانہ چوکیدار سے کوئی بات کر رہا ہے۔ پھر چوکیدار نے ایک ملازم کو بلا کر کچھ کہا اور وہ تیز قدموں سے کوٹھی کی طرف بڑھ آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آ کر ہمیں اطلاع دے رہا تھا کہ مہمان پہنچ گئے ہیں۔ خان رحیمی نے رائفل مین سردار محمد اور دینو کو بھیجا کہ وہ ڈرائنگ روم میں جا کر شاہ دین سے بات کریں۔ اس کے بعد اس نے مجھے کہا میں ان کی باتیں سنوں۔ سردار محمد اور دینو چلے گئے تو چند منٹ بعد میں بھی زینے اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئی۔ ایک دروازے کی درز سے میں نے اندر جھانکنا شروع کیا۔ شاہ دین ٹوانہ اور شیر محمد صوفوں پر بیٹھے تھے۔

سامنے ہی خان رحیمی کا رائفل مین سردار محمد ایک کرسی پر موجود تھا اور اس کے ساتھ دینو مودب کھڑا تھا۔ سردار محمد کہہ رہا تھا۔

"کچھ بتا کر نہیں گئے جناب لیکن آج رات تو نہیں آئیں گے۔"

شاہ دین نے کہا۔ "کوئی شکار وکار کا چکر تو نہیں!" سردار محمد نے اثبات میں جواب دیا۔ شاہ دین بولا۔ "پھر تو پوری پارٹی گئی ہو گی!"

سردار محمد نے کہا۔ "ہاں جناب' پندرہ بیس بندے گئے ہیں۔"

میں نے دیکھا شاہ دین کی گھنی مونچھوں کے نیچے ایک مطمئن مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ جما کر بولا۔ "پہلے پتہ ہوتا تو اتنا لمبا چکر نہ پڑتا۔"

سردار محمد بولا۔ "خان صاحب نہیں تو کیا ہوا' ہم آپ کے خادم تو ہیں آپ رات یہیں رہیے۔ کیا پتہ کل وہ آ ہی جائیں۔"

شاہ دین نے کہا۔ "ہاں' تھکاوٹ بھی بہت ہو گئی ہے' یہ جنگل کا راستہ تو دن بدن خراب ہی ہوتا جا رہا ہے' پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں......... ویسے بھی دو دن سے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

"کیوں جناب' خیر ہے؟" سردار محمد نے پوچھا۔

"وہی......... وہ شیخ والا باز گم ہو گیا ہے۔" شاہ دین نے جواب دیا۔

سردار محمد نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "شیخ والا باز' آپ کے پاس تھا؟"

"ہاں تھا تو ہمارے پاس ہی۔"

سردار محمد نے کہا۔ "ہم تو سمجھتے رہے وہ چودھری شہاب کے بندے لے اڑے ہیں یا پھر ان شہری منڈوں میں سے کوئی ہاتھ دکھا گیا ہے۔"

شاہ دین نے گہری سانس بھری۔ "سمجھنے کو تو کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے......... خان رحیمی یہاں ہوتا تو اس سے دل کے دکھڑے پھولتے۔ خیر اب جیسے تیسے رات تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

سردار محمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ دینو جدی پشتی خادموں کی طرح ہاتھ ناف پر باندھے خاموش کھڑا تھا۔ شیر محمد نے کہا۔ "او کدو' ادھر آ۔"

"جی جناب!" دینو نے جھک کر جواب دیا۔

"اوئے اور کتنے بندے ہیں کوٹھی میں؟"

دینو نے کہا۔ "جی مجھ سمیت کوئی دس جانے ہیں۔"

"شاہ دین بولا۔ "اوئے گندی ہانڈی کے چمچے تو بھی بندوں میں شمار ہے؟"

دینو نے کہا۔ "سارے میرے جیسے ہی ہیں۔ جو میرے جیسے نہیں تھے وہ شکار کھیڈن چلے گئے ہیں۔"

شاہ دین نے پوچھا۔ "کیا مطلب' بندوقوں شندوقوں والے سارے چلے گئے!"

"بس جی ایک دو تین ہی ہوں گے۔"

شاہ دین نے کہا "اوئے ایک دو تین کیا بات ہوئی۔ ٹھیک بتا ایک دو ہیں یا تین ہیں ؟"

اس وقت بغلی دروازہ کھلا اور خان رحیمی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ شاہ دین کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "مجھ سے پوچھ شاہ دین اس بے چارے کو کیا معلوم ہو گا۔"

شاہ دین کا رنگ زرد ہو گیا۔ تاہم اس نے خود کو بڑی تیزی سے سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے گرمجوشی نمودار ہوئی۔" اوہ خان صاحب! آپ کہاں سے آٹپکے۔" دونوں نے آگے بڑھ کر معانقہ کیا۔ خان رحیمی دیر تک شاہ دین کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ شاہ دین نے کہا۔ "میں تو مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا آپ کے بندے نے بتایا کہ آپ شکار پر گئے ہوئے ہیں۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "ہاں گیا تو شکار پر ہی تھا پھر پتہ چلا کہ اور بھی کئی "پارٹیاں" نکلی ہوئی ہیں۔ سوچا اگلے ویک اینڈ کو سہی۔"

"تو کیا راستے ہی سے واپس آ گئے؟"

"ہاں.......... بس آپ سے ملاقات ہونی تھی.......... اور سنائیں کیسے آنا ہوا۔ میواتی گاؤں سے تو آپ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل ہی نہیں دکھائی۔ اس باز کا بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ مارا ماری میں معلوم نہیں کون لے گیا۔ چلو.......... میواتیوں کے ہاتھ تو نہ آیا۔"

شاہ دین نے کہا۔ "میرے تین چار بندوں کو پولیس لے گئی تھی۔ اسی چکر میں پڑا رہا ورنہ آپ سے تو ضرور ملنا تھا۔"

"کیوں.......... خیریت تو تھی نا؟"

شاہ دین نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دراصل خان صاحب! وہ باز میرے ہی ایک بندے نے پکڑا تھا۔ وہی بابری جس نے چودھری صلو کی چارپائی اٹھائی تھی۔"

خان رحیمی نے اس اطلاع پر حیرت کا اظہار کیا پھر بولا۔ "یہ بابری وہی ہے نا لمبا سا اکھڑ سا!" شاہ دین نے اثبات میں جواب دیا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "میرے ایک بندے کو چاقو بھی مار دیا تھا اس نے.......... خیر اندھیرے میں پتہ نہیں کون کس سے لڑ رہا تھا۔"

شاہ دین ہنس کر بولا۔ "ویسے تو آپ کے ڈرائیور نے بھی میری گاڑی اٹھانے کی کوشش کی تھی۔"

خان رحیمی نے قہقہہ لگایا۔ "اور آپ کے بندے نے گولی مار کر اس کا ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔" شاہ دین کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ خان رحیمی بولا۔ "ہاں.......... تو کیا کہہ رہے تھے آپ بابری کے بارے میں؟"

شاہ دین ٹوانہ نے بابری کو ایک گالی دے کر کہا۔ "وہ غداری کر گیا ہے۔ پرسوں باز کے ساتھ کہیں نکل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہوا ہے۔ میرا خیال تھا۔ معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو سارے شکاری بھائیوں کو بلاؤں اور ہم مل جل کر اس پرندے کا معاملہ طے کر لیں.......... دو تین دن سے وائلڈ لائف والے بھی گھومتے پھر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کے پاس بھی آئیں گے۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "آپس کی انڈر سٹینڈنگ بڑی چیز ہے شاہ دین! مگر ہم لوگوں کو بروقت اس کا خیال نہیں آتا۔"

اسی دوران چائے اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ آ چکی تھی۔ چائے کے ساتھ ساتھ خان رحیمی اور شاہ دین کی باتیں بھی جاری تھیں۔ یہ بڑی پہلودار اور ذومعنی باتیں تھیں۔ دونوں موجودہ صورت حال سے انجان بنے ہوئے تھے اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چائے ختم ہوتے ہی شاہ دین جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

کہنے لگا۔ "خان صاحب! بہت پریشان ہوں۔ جب تک وہ بدبخت بابری مل نہیں

جائے گا چین نہیں آئے گا مجھے۔ بس اب اجازت دیجئے۔"

خان رحیمی نے حیران ہو کر کہا "ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور رات یہیں رہیں گے۔" شاہ دین گڑبڑا گیا۔ خان رحیمی نے کہا "کیوں سردار محمد یہی کہا تھا ناٹوانہ صاحب نے!"

سردار محمد نے کھیسیں نکال کر کہا "درست فرما رہے ہیں آپ۔"

خان رحیمی بولا "میری غیر موجودگی میں آپ یہاں رات گزار رہے تھے اور میں آگیا ہوں تو جانے کی فکر میں ہیں۔"

شاہ دین نے "میں نے عرض کیا ہے ناکہ طبیعت کچھ پریشان سی ہے۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔"

خان رحیمی نے خوشدلی سے کہا "اگر میری موجودگی سے طبیعت پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے تو بتا دیں۔ آپ نے آنا ہو گا تو میں موقع سے ادھر ادھر ہو جاؤں گا۔"

شاہ دین نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ اس کی پیشانی پر اب پسینہ چمک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا تاکہ پروگرام کے مطابق اس کے مسلح آدمی دندناتے ہوئے نہ پہنچ جائیں جبکہ خان رحیمی "میزبانی" کا ہر تقاضہ پورا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ شاہ دین کو پکڑ پکڑ کر بٹھا رہا تھا۔

"نہ شاہ صاحب! کھانے کے بغیر تو اب آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ ناممکن! اب تو پندرہ بیس منٹ کی بات ہے۔ ابھی دسترخوان لگ جاتا ہے۔ لیجئے یہ سوپ کی خوشبو تو آنے بھی لگی۔ جتنی دیر کھانا لگے ہم سوپ سے نبٹ لیتے ہیں۔ سوپ سے ایک بڑا اچھا لطیفہ یاد آگیا ہے............"

خان رحیمی نے کسی نہ کسی طرح شاہ دین کو کھانے پر روک ہی لیا۔ کھانے کے دوران شاہ دین کی بے چینی دیکھنے کے لائق تھی۔ کبھی کبھی وہ جھلا سا جاتا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ دفعتاً گیٹ کی طرف گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ ذرا دیر بعد رائفل مین سردار محمد بھاگتا ہوا آیا۔

"خان صاحب! دو گاڑیوں پر کوئی ایک درجن بندے گیٹ پر پہنچے ہیں۔ سب کے پاس رائفلیں اور بندوقیں ہیں۔ چوکیدار سبحان خان کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ گیٹ

کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔"

خان رحیمی نے مصنوعی حیرت سے کہا "کون باسٹرڈ ہیں؟"

سردار محمد بولا "ان میں شاہ صاحب کا چھوٹا بھائی عتیق بھی ہے۔"

"اوہو.......... تو یوں کہو نا کہ مہمان آئے ہیں۔ چوکیدار نے ان سے کوئی بدتمیزی کی ہوگی۔ بلا لو ان کو اندر۔ گو اینڈ ہری اپ"

میں دروازے کی اوٹ سے یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ہر شخص ہر بات سمجھ رہا تھا پھر بھی درمیان میں ایک مہین پردہ سا تھا۔ ماحول میں زبردست کھچاؤ تھا اور یہ کھچاؤ ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے خانوں، وڈیروں اور سرداروں کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا اس کی ایک جھلک اس تنازعے کی کھینچا تانی میں بھی نظر آرہی تھی۔ خان رحیمی نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ.......... مسٹر شاہ دین نئے مہمانوں کا استقبال کریں۔"

وہ سب اٹھے اور آگے پیچھے چلتے باہر پورچ میں آگئے۔ خان رحیمی کے پیچھے کم از کم اٹھارہ مسلح افراد تھے۔ خود رحیمی کے کندھے سے بھی ریوالور جھول رہا تھا۔ اپنی جگہ ہر شخص پر سکون نظر آنے کی کوشش میں تھا۔ پورچ میں خان رحیمی کے تین تنومند رکھوالے تین خوفناک کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی ان کتوں کو دیکھتے ہی جسم میں سردی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ میں برآمدے کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑی تھی۔ میرے سامنے کوٹھی کا بیرونی گیٹ کھلا اور شاہ دین کے دس گیارہ مسلح آدمی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ظاہر ہے اندر کا منظر ان کی توقعات کے برخلاف تھا۔ وہ اپنی جگہوں پر ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اب شاہ دین کے لئے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں تھا۔ صورت حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ شاہ دین نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا:

"خان صاحب! بابری کہاں ہے؟ مجھے بابری چاہئے۔"

خان رحیمی نے سگار سلگا کر ایک کش لیا اور اطمینان سے بولا "تو بابری کے لئے آئے ہو؟"

"بے شک.......... وہ میرا مجرم ہے۔"

خان رحیمی نے کہا "اس وقت وہ مجرم نہیں تھا جب میواتیوں کے گاؤں سے باز لے کر نکل گیا تھا۔"

"خان صاحب میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مہربانی کر کے آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔"

خان رحیمی نے کہا "شاہ دین اس پرندے کے لئے کھلا میدان تم نے خود لگایا تھا۔ اب تم کسی کو مجرم یا ڈاکو نہیں کہہ سکتے۔ تم میرے گھر میں ہو اور میرے مہمان ہو۔ مہمانوں کی عزت ہماری روایت ہے ورنہ میں تمہاری بات کا جوب تمہارے ہی انداز میں دیتا۔"

شاہ دین کا چھوٹا بھائی جو کچھ زیادہ ہی گرمی خورا تھا اچھل کر آگے آیا اور بھڑکیلے لہجے میں بولا "زیادہ گٹ مٹ نہ کر خان! اس کتے کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ آج تماشہ ہو جائے گا یہاں۔"

اس کے گستاخ لہجے کو خان رحیمی کا ذاتی محافظ سردار محمد برداشت نہ کر سکا۔ کڑک کر بولا "زبان کو لگام دے سور" یکایک جیسے کوئی تنی ہوئی نادیدہ ڈور کھچ سے ٹوٹ گئی۔ شاہ دین کا بھائی بجلی کی طرح حرکت کر کے سردار محمد پر جھپٹا۔ میں نے پورچ کی روشنی میں ایک ساعت کے لئے دونوں کو گتھم گتھا دیکھا۔ خان رحیمی کی گرجدار آواز آئی ٹھہرو............ مگر یہ ایک آواز ایک سینٹ برنارڈ کتے کی خوفناک غراہٹ میں دب کر رہ گئی۔ جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے یا گولی بندوق کی نالی سے نکلتی ہے سینٹ برنارڈ اپنی زنجیر چھڑا کر بھاگا اور شاہ دین کے بھائی پر جا پڑا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ سردار محمد دھکا لگنے سے دور جا گرا ہے اور کتا شاہ دین کے بھائی عتیق سے گتھم گتھا ہو گیا ہے۔ دوسرے کتوں کی پرشور آوازیں بھی کانوں کو پھاڑ رہی تھیں۔ موقع پر موجود افراد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک دو بندوقیں سیدھی بھی ہوئیں لیکن کتا اور انسان اس طرح دست و گریباں ہو چکے تھے کہ گولی چلانا ناممکن تھا۔ یہ سارا ایک یا دو ساعتوں کا کھیل تھا پھر میں نے کتے کے رکھوالے کو دیکھا وہ چلاتا ہوا کتے کی طرف بڑھا مگر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ کتے کے منہ میں عتیق کے گوشت کا سرخ لوتھڑا تھا اور اس کی خونخواری انتہا کو چھو رہی تھی۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ دو تین سیکنڈ کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ کھولیں تو ایک ناقابل گمان منظر دیکھا۔ بوڑھا خان رحیمی دیو ہیکل کتے سے لپٹا ہوا اسے شاہد دین کے بھائی سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں وہ تینوں بری طرح

پلٹنیاں کھا رہے تھے۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ موذی جانور خان رحیمی اور عتیق ٹوانہ میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ معاً اوپر تلے تین فائر ہوئے۔ دھماکوں سے در و دیوار لرز اٹھے۔ یہ ہوائی فائر تھے اور کسی نے کتے کو ڈرانے کے لئے کئے تھے۔ غالباً سردار محمد کی رائفل سے ہوئے تھے۔ پھر کسی نے آگے بڑھ کر بڑی دلیری سے کتے پر بندوق کا کندا آزمایا۔ میں نے پہچان لیا یہ سلیم تھا۔ وہ تاک تاک کر کتے کے سر کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی شاہ دین کا ایک کارندہ بھی کتے پر لاٹھیاں برسانے لگا۔ ایکا ایکی کتے نے خان رحیمی اور عتیق کو چھوڑا اور بھاگتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ ہم سب دونوں زخمیوں کی طرف بڑھے۔ عتیق کی حالت دیکھ کر تو لگتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی گردن سے گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا غائب تھا۔ سینے اور بازوؤں پر بھی زخم تھے۔ وہ بالکل بے سدھ تھا۔ خان رحیمی کے پیٹ اور دائیں ران پر بھی گہرے زخم تھے۔ اس کی سرخ قمیض تار تار ہو چکی تھی۔ دونوں کو طبی امداد کی فوری ضرورت تھی۔ پانچ چھ آدمیوں نے مل کر انہیں اٹھایا اور بھاگتے ہوئے گاڑیوں کی طرف لپکے۔ ذرا ہی دیر بعد کئی گاڑیوں کے انجن جاگ اٹھے اور ان کی ہیڈ لائٹس تاریکی میں گردش کرنے لگیں۔ وہ افراد جو تھوڑی دیر پہلے مرنے مارنے پر آمادہ تھے اب وہ شدید زخمیوں کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

اس رات خان رحیمی کی کوٹھی پر پیش آنے والے اس واقعے نے حالات کو بالکل نیا رخ دے دیا۔ شاہ دین کے بھائی کو بچانے کے لئے خان رحیمی نے جس طرح اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا وہ قابل ستائش تھا اور ناقابل فراموش بھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ان لمحوں میں خان رحیمی یہ جرات نہ کرتا تو عتیق ٹوانہ کی جان نہ بچائی جا سکتی۔ اس وقت ایک سے بڑھ کر ایک جوان اور شہ زور موقع پر تھا۔ اس کا سگا بھائی بھی تھا لیکن عتیق ٹوانہ کے کام کوئی آیا تھا تو وہ خان رحیمی تھا۔

شاہ دین ٹوانہ نے بھی اس واقعے سے بہت اثر قبول کیا۔ خان رحیمی کو خون دینے کا موقع آیا تو شاہ دین نے نہ صرف خون دیا بلکہ اپنے آدمیوں سے بھی خون دلوایا۔ خان رحیمی کے پیٹ پر کتے کے بھنبھوڑنے سے گہرا زخم آیا تھا۔ تاہم آنتوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ایک آپریشن کے بعد اس کے پیٹ پر ٹانکے لگا دیئے گئے' ران کے زخم کو

بھی کسی حد تک سنبھال لیا گیا۔ عتیق کا بھی ایک پر خطر آپریشن ہوا اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ خان رحیمی تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہا۔ یہ اس کی زندہ دلی اور جواں دلی تھی کہ ایک ماہ بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ورنہ اس کی عمر کے پیش نظر ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اسے "ہیل اپ" ہونے میں دو تین ماہ لگ جائیں گے۔

شاہ دین اور خان رحیمی کے درمیان باز کا تنازعہ گفت و شنید کے ذریعے طے کر لیا گیا۔ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں۔ اتنا پتہ ہے کہ خان رحیمی نے چند ایکڑ بارانی زمین فوری طور پر شاہ دین کے نام کر دی اور باز کی فروخت کے بعد کچھ نقد رقم دینا بھی قبول کی (جو زمین شاہ دین کو دی گئی اس کے بارے ان کے دمیان پہلے بھی کوئی تنازعہ چل رہا تھا۔ اس طرح نئے تنازعے کے طفیل یہ پہلا تنازعہ بھی ختم ہو گیا)۔ صلح صفائی ہو گئی تو شاہ دین کے دل میں سلیم' یوسف اور میرے بارے میں جو رنجش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور اگر دور نہ ہوئی تو کم ضرور ہو گئی۔ شاہ دین نے سلیم کو خان رحیمی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

☆===========☆===========☆

اب خان رحیمی گھر آ چکا تھا۔ میری ذمے داری تھی کہ روز سویرے اس کے لئے چوزے کا سوپ تیار کرواؤں اور ناشتے کے ہمراہ اس کے کمرے میں پہنچاؤں۔ وہ مجھ پر خاصا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسی اعتماد کے سبب مجھے بعض اوقات "ہیڈ باورچن" کی ذمے داریاں بھی نبھانا پڑتی تھیں۔ شوقیہ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر جل رہی تھی۔ عملی طور پر کسی نے اس کی جگہ لے لی تھی اور اس کی ذمے داریاں مختصر ہو کر رہ گئی تھیں۔ تاہم اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ذمے داریاں سونپنا خان رحیمی کا کام تھا۔ ایک دن میں باورچن سلطانہ سے خان رحیمی کے لئے ناشتہ تیار کروا رہی تھی کہ شوقیہ کے کمرے سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ میں اور سلطانہ بھاگ وہاں پہنچیں وہ ایک صندوق کھولے بیٹھی تھی۔ کپڑے اور دیگر اشیاء ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ شوقیہ اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا شوقیہ؟"

وہ بولی۔ "ہائے لٹ گئی۔ میری دونوں انگوٹھیاں اور جھمکے غائب ہیں۔" میں نے دیکھا قریب ہی زیور کا ایک خالی ڈبہ پڑا تھا۔ اتنے میں خانساماں اور ایک دو دوسرے ملازم

بھی آ گئے۔ شوقیہ رو رو کر بتانے لگی کہ یہ ڈبہ صندوق میں کپڑوں کے نیچے پڑا تھا۔ ابھی اس نے صندوق کھولا ہے تو ڈبہ خالی ملا ہے۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر پوری کوٹھی میں پھیل گئی۔ سب حیران تھے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ انگوٹھیوں اور جھمکوں کی قیمت شوقیہ کے مطابق چھ سات ہزار سے کم نہیں تھی۔

میں خان رحیمی کی طرف گئی تو پتہ چلا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ صبح ہی صبح ڈرائیور کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ اتنے میں باورچن سلطانہ بھی وہاں آ گئی۔ چپکے سے میرے کان میں کہنے لگی کہ وہ لومڑی یوسف پر شک کر رہی ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ یہ سب شوقیہ کی سازش ہے۔ یوسف ہفتے میں ایک آدھ بار مجھ سے ملنے گوپور سے کوٹھی چلا آتا تھا۔ کل سے وہ آیا ہوا تھا۔ یقیناً شوقیہ نے کوئی ڈرامہ کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ یوسف سے بھی بہت خار کھاتی تھی۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ "یوسف کدھر ہے؟"

اس نے بتایا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے باہر نکلا ہے۔ مسواک کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اب کیا کیا جائے۔ خان رحیمی بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ پڑوس کی طرف سے تیز تیز باتوں کی آواز آئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو خان رحیمی کا بھتیجا باقر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ شوقیہ بھی اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"کہاں ہے وہ الو کا پٹھا!" باقر نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ اس کا اشارہ واضح طور پر یوسف کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں ادھر ہی کہیں ہو گا' ابھی آ جاتا ہے۔"

باقر شوقیہ کی بہت سائیڈ لیتا تھا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی.......... چلا کر بولا۔ "وہ اب نہیں آئے گا چور بھی کبھی واپس آتا ہے۔ اس نے چوری کی ہے۔"

میں نے کہا۔ "باقر صاحب! اس طرح بغیر سوچے سمجھے الزام مت لگائیں وہ چور نہیں ہے۔"

شوقیہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے کل خود اسے اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ باجی کو دیکھنے آیا تھا۔"

باقر نے پورے وثوق سے کہا۔ "یہ سو فیصد اسی کا کام ہے۔"

اتنے میں گیٹ کی طرف سے شور سنائی دیا میں نے دیکھا اور غصے کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ باقر کے دو آدمی یوسف کو بازوؤں سے گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور وہ لانے والوں سے الجھ رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے باقر صاحب! کچھ شرم کرنی چاہئے آپ کو۔ آپ جانتے نہیں کہ خان صاحب کتنا ناراض ہوں گے اس بات پر!"

باقر نے کہا۔ "اگر وہ چور پکڑنے سے ناراض ہوں گے تو بے شک ہوا کریں۔"

مجھے باقر کی عقل پر افسوس آ رہا تھا۔ وہ شوقیہ کے بھڑکانے پر یوسف کو چند ہزار کے شبے میں گھسیٹ رہا تھا اور یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے کے ہاتھوں سے انہیں لاکھوں کا فائدہ ہو چکا ہے۔ مجھے خان رحیمی کی بے حسی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ازخود یوسف کے بارے میں کچھ سوچے گا۔ لاکھوں کا باز یوسف کی وجہ سے خان رحیمی کے قبضے میں آیا تھا۔ ان لاکھوں روپے میں سے چند ہزار پر تو یوسف کا حق بنتا تھا۔ مگر خان رحیمی جیسے یوسف کو بھول ہی چکا تھا۔ ایک ماہ گزرنے کے باوجود اس نے یوسف کے لئے کچھ نہیں کیا تھا اور اب اس کا بھتیجا اسے چوری کے شبے میں بے عزت کر رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ خان رحیمی نے باز کے سلسلے میں پینتالیس ہزار روپے دیئے تھے لیکن اس میں سے تو ایک پیسہ بھی یوسف کو نہیں مل سکا تھا۔

باقر نے یوسف کو تھپڑ مارے تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ اتنے میں سلیم بھی آ گیا۔ سلیم کو دیکھ کر باقر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ورنہ ہو سکتا تھا وہ مجھ سے بھی زور آزمائی کرنے لگتا۔ سلیم نے باقر کو سمجھایا کہ وہ تحمل سے کام لے۔ چور جو کوئی بھی ہے کوٹھی کے اندر سے ہے۔ وہ بچ کر نہیں جائے گا۔

کوٹھی میں مسلح محافظوں سمیت کم و بیش پینتیس افراد اس وقت بھی موجود تھے۔ ان میں دس بارہ عورتیں اور باقی مرد تھے۔ اب معلوم نہیں یہ کس کا کام تھا اور یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ واقعی چوری ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ سلیم اور باقر نے یوسف سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے صاف انکار کیا کہ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے۔ رائفل مین سردار محمد نے بھی اس کی طرف سے صفائی پیش کی۔ اس نے بتایا جس وقت یوسف

شوقیہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ٹین کے چھپر تلے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ یوسف زیادہ سے زیادہ آدھ منٹ کمرے میں رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ صفائی کرنے والی نئی ملازمہ گلزار پرسوں سے غائب ہے۔ گلزار کا سن کر مجھے بھی شبہ ہوا۔ یہی لڑکی شوقیہ کے کمرے میں بھی صفائی کرتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہی ہاتھ دکھا گئی ہو۔ باورچن سلطانہ نے باقر سے کہا۔ "مالک! مجھے بھی گلزار پر شک ہو رہا ہے۔ اسے پیسوں کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ پرسوں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اسے تین چار ہزار روپیہ کہیں سے ادھار لے دوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں کی رہنے والی ہے وہ؟" سلطانہ نے بتایا کہ سندری گاؤں کی۔

باقر نے گرج کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "بلا کر لاؤ اس کتیا کو بھی۔"

دو رائفل بردار تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ میں نے شوقیہ سے پوچھا۔ "صندوق کا تالہ بند تھا؟" اس نے ہاں میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "آج سے پہلے تم نے ڈبہ کب دیکھا تھا؟"

اس نے کہا۔ "دو تین ہفتے ہو گئے۔ چھوٹی عید پر جھمکے پہنے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی ضروری تو نہیں کہ چوری آج کل ہی ہوئی ہو۔"

میری اس بات پر سردار محمد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔ "بی بی جی! آپ کی بات غور کرنے کے لائق ہے۔ کیا معلوم چوری ہوئے دو تین ہفتے ہو چکے ہوں اور شوقیہ بی بی کو اب پتا چلا ہو۔"

شوقیہ کی آنکھیں بھی سوچ میں ڈوب گئیں۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ عید کے بعد وہ تین چار روز بیمار رہی تھی۔ قریباً سارے ہی ملازم اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے کمرے میں آتے جاتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ واردات انہی دنوں میں ہوئی ہو۔ خانساماں بولا۔ "مالک میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔ پتہ نہیں صحیح ہے یا غلط' وہ جو مالی کا لڑکا ہے نا کئی دنوں سے بڑا بن ٹھن کر رہتا ہے۔ کھلے دل سے پیسے خرچ کر رہا ہے اور سگریٹ بھی گولڈ لیف کے پیتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس کے پاس کہیں سے فالتو پیسے آئے ہیں۔"

روشن بیس اکیس سالہ نوجوان تھا۔ میں نے کئی بار اسے کوٹھی کے باغ میں کام

کرتے دیکھا تھا۔ اگر وہ بن ٹھن کر رہتا تھا اور اعلیٰ سگریٹ پیتا تھا تو پھر ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔ باقر نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ روشن کو بھی لے کر آئیں۔

اسی دوران باقر کے بھیجے ہوئے آدمی ملازم گلزار کو لے کر آ گئے۔ وہ بائیس تیئس سال کی ایک جوان اور قبول صورت لڑکی تھی۔ اگر اس لڑکی نے بوسیدہ کپڑوں کی جگہ جدید تراش کا سوٹ پہنا ہوتا' بال شیمپو سے دھلے ہوتے' رخساروں پر سیر شکمی کی چمک ہوتی اور وہ کسی بیوٹی پارلر سے نکل کر اپنی ٹویوٹا کار کی طرف بڑھتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ اور لب گنگ ہو جاتے۔ باقر نے گلزار کو سر سے پاؤں تک گھورا اور تیکھے لہجے میں سوال جواب کرنے لگا۔ اس کا انداز بالکل پولیس والوں کا تھا اور وہ بیچاری حوالاتیوں کی طرح لرزہ براندام تھی۔ پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ باقر نے اسے شہتوت کی چھڑی سے بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ ایک تکلیف دہ نظارہ تھا۔ ایک جوان عورت کو ایک جوان مرد بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی اور منتیں کر رہی تھی۔ اس عورت کے لئے بھی پردے کے احکامات تھے۔ محرم و نامحرم کے شرعی قوانین یہاں بھی لاگو ہوتے تھے۔ یہ عورت جو خاک میں لوٹ رہی تھی' کسی کے لئے قابل احترام ہستی تھی' کسی کی پیاری بیوی' کسی کی محترم بہن اور کسی کی معزز ماں تھی۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا اور میں یوسف کو لے کر وہاں سے چلی آئی۔

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا' اب ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی۔ سردی انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے کمرے میں انگیٹھی دہکائی اور یوسف کو پاس بٹھا کر اسے دلاسہ دینے لگی۔ باقر کے تھپڑوں سے اس کا ایک کان سرخ ہو رہا تھا اور وہ مسلسل روتا جا رہا تھا۔ وہ کوٹھی آنا نہیں چاہتا تھا مگر میرے بے حد اصرار پر اس نے ہفتے میں ایک بار آنے کی حامی بھرلی تھی۔ اس واقعے کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ اب وہ پھر آئے گا۔ اس چھوٹی سے عمر میں ہی دکھوں اور پریشانیوں نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ایک طرف دال روٹی کا چکر تھا اور دوسری طرف اس کی محبت لحہ بہ لحہ اس سے دور ہو رہی تھی۔ صغراں ابدی جدائی کے گرداب میں تھی اور ڈوبنے سے پہلے اس کا ہاتھ بار بار یوسف کو مدد کے لئے بلا رہا تھا...... کیا ان دونوں کو بھی اس انجام کا شکار ہونا تھا جو ازل سے محبت کرنے والوں کا مقدر رہا ہے؟ یہ سوال میرے ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

کچھ دیر یوسف کی ڈھارس بندھانے کے بعد میں ٹیرس کی طرف گئی۔ بارش اب تیز ہو چکی تھی۔ سردی سے ہڈیوں میں گودا جم رہا تھا۔ میں نے دیکھا باقر برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہے۔ کوٹھی کے پانچ چھ مشکوک افراد اس کے سامنے تھے۔ ان میں گلزار اور اس کا خاوند بھی تھا۔ یہ سب لوگ ایک قطار میں کھڑے تھے اور کھلے آسمان تلے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ان کے جسموں پر لرزہ اور چہروں پر منتیں سماجتیں تھیں۔ اتنے میں اندرونی برآمدے کی جانب سے خان رحیمی آتا دکھائی دیا۔ اس کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی ابھی لوٹا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ صحن میں ملازمان کی لرزتی کانپتی قطار دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے چونکا۔

"وٹ از دس!" اس نے پوچھا۔

باقر نے کہا۔ "مس شوقیہ کی چوری ہوئی ہے انکل...... اس شبے میں پکڑا ہے۔"

"اچھا...... اچھا۔" خان رحیمی نے عام سے انداز میں کہا۔ جیسے یہ واقعہ اس کے لئے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ تیز قدموں سے میری طرف بڑھ آیا۔

"ہیلو گریٹ گرل! وہ یوسف کدھر ہے۔" اس نے ہانک لگائی۔

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اندر ہے۔"

خان رحیمی چہکا۔ "آئی ہیو اے سرپرائز فار ہم' میں اسے حیران کر دوں گا کہاں ہے وہ...... یہ دیکھو میں کیا لایا ہوں اس کے لئے۔"

خان رحیمی نے اوور کوٹ کی جیب سے کچھ کاغذ نکال کر میرے سامنے لہرائے۔

"یہ کیا ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"اس زمین کے کاغذات' جو اس کے باپ نے گروی رکھی ہوئی تھی۔"

میں ششدر رہ گئی۔ خان رحیمی نے کہا۔ "میں دو تین دن سے اسی چکر میں تھا۔ اب بھی گوپور سے آ رہا ہوں۔ کہاں ہے وہ چغد اسے میرے سامنے تو لاؤ...... اور ہاں اس کے لئے ایک اور خوشخبری بھی ہے...... میں نے ایک آدمی بھیجا ہے اس کے ماموں کے گاؤں۔ وہ آج ہی اسے لے کر یہاں آ جائے گا۔ میں اس کے ماموں سے خود رشتے کی بات کروں گا۔ آئی تھنک اٹ ول بی آل رائٹ۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "لیکن.......... لیکن جناب! آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟"

خان رحیمی نے کہا۔ "مس شاہدہ! یہ ایک غلط سوال ہے.......... کیا یوسف نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا.......... مجھے تو افسوس ہے کہ میں ہسپتال چلا گیا اور اس سارے معاملے میں اتنی تاخیر ہوئی۔ بہرحال دیر آمد درست آید۔"

شوقیہ اور باقر کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ یوسف کو خان رحیمی کے سامنے ملزم بنا کر پیش کرنے والے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہو گیا تھا۔ اچانک گلزار ملزموں کی قطار سے نکل کر دوڑتی ہوئی آئی اور خان رحیمی کے پاؤں میں گر پڑی۔

"خان جی! میں بے قصور ہوں۔ مجھے اپنے اکلوتے بچے کی قسم میں نے چوری نہیں کی۔"

خان رحیمی نے باقر سے پوچھا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟"

باقر نے بتایا کہ مس شوقیہ کے کمرے سے طلائی انگوٹھیاں اور جھمکے چوری ہو گئے ہیں۔ سب سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن کوئی نہیں مان رہا۔

میں نے دیکھا خان رحیمی کی گاڑی کے ڈرائیور چاچے شفیع کا رنگ بدلا۔ اس نے شوقیہ سے کہا۔ "بٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ زیور تو تم نے خود دیا تھا۔"

"کسے؟" شوقیہ نے پوچھا۔

"اپنی ماں کو۔"

"کب؟"

چاچے شفیع نے کہا۔ "حیرت ہے تمہیں کچھ یاد نہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ شوقیہ جب زیادہ بیمار تھی تو فیصل آباد سے اس کی والدہ خبر لینے آئی ہوئی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں شوقیہ نے اپنی والدہ سے کہا تھا کہ صندوق سے انگوٹھیاں اور جھمکے نکال کر اپنے پاس رکھ لو۔ چاچا شفیع بھی اس وقت پاس ہی موجود تھا۔"

چاچے شفیع کی بات سن کر شوقیہ کے چہرے پر پہلے تو الجھن نظر آئی پھر وہ شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔ اس کے چہرے سے صاف پتہ چلا کہ اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہے۔ مگر اتنی جلدی وہ اپنی غلطی تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی.......... آئیں بائیں شائیں

کرنے لگی کہ اگر اس کی والدہ زیور ساتھ لے جاتیں تو اسے بتا کر جاتیں' یا خط میں ہی ذکر کرتیں' وغیرہ وغیرہ۔ اس کا پریشان چہرہ اس کے جھوٹ کی نشاندہی کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! اپنے غلط شک کی وجہ سے مس شوقیہ نے یوسف کو ذلیل کرایا ہے۔ سب کے سامنے اسے تھپڑ مارے گئے ہیں اور گالیاں نکالی گئیں ہیں۔"

خان رحیمی کے چہرے پر شدید برہمی دکھائی دی۔ وہ گرج کر بولا۔ "کس نے کیا ہے ایسا؟"

شوقیہ اور باقر کی گردنیں جھک گئیں۔ خان رحیمی کی نظریں باقر پر جم گئیں۔ وہ باقر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میرا خیال ہے تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کے لئے بیوقوفی کی گنجائش نہیں رہتی۔"

باقر نے کہا۔ "انکل! میری اس سے کوئی دشمنی نہیں' اس پر شبہ کیا جا رہا تھا۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "بہت خوب انسپکٹر صاحب! اچھی تفتیش فرما لیتے ہیں آپ' کبھی اپنے بارے میں بھی کھوج لگائیے کہ کس مقصد کے لئے پیدا فرمایا گیا ہے آپ کو۔"

خان رحیمی نے یہ فقرہ انگریزی میں کہا تھا' پھر بھی باقر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ منمنا کر بولا۔

"انکل! آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔"

خان رحیمی بولا۔ "میں انسلٹ نہیں کر رہا' انسلٹ کی شروعات کر رہا ہوں۔ مگر اتنی عقل ہے مجھ میں' سب کے سامنے تمہیں بے عزت نہیں کروں گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں' میں وہیں تم سے بات کروں گا.......... جاؤ۔" باقر نے احتجاجی انداز میں کچھ چاہا مگر خان رحیمی نے دانت پیس کر "آئی سے گیٹ لوسٹ۔" کہا تو وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

باقر نے مالی کے لڑکے روشن کو نیم کے درخت کے نیچے مرغا بنا رکھا تھا۔ وہ سردی اور خوف سے بری طرح لرز رہا تھا۔ خان رحیمی نے پوچھا۔ "اس نے کیا کیا ہے!؟"

رائفل مین سردار محمد نے کہا۔ "خان جی! اس نے ابھی ایک چوری بکی ہے' کہتا ہے پچھلے مہینے اسے عاشق ارائیں کے کھیتوں سے ایک زنانہ بٹوہ ملا تھا اس میں بہت سے پیسے تھے۔"

بٹوے کا ذکر سن کر میں اور خان رحیمی دونوں بری طرح چونک گئے۔ اس گمشدہ

پرس کی بابت صرف ہم دونوں کو ہی معلوم تھا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "جاؤ اسے ادھر لے کر آؤ۔" سردار محمد روشن کو ہمارے پاس لے آیا۔ اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بوسکی کی ڈیزائن دار قمیض کے نیچے رنگین لاچہ پہن رکھا تھا۔ یہ لباس اس کی آمدن اور شکل و صورت سے ہرگز لگا نہیں کھاتا تھا۔ خان رحیمی نے اس سے پرس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے اقرار کیا کہ کوئی ایک مہینہ پہلے صبح سویرے وہ سندری گاؤں میں اپنے گھر سے نکل کر کھیتوں میں گیا تو سرخ رنگ کا ایک بٹوہ اس کے ہاتھ لگا۔ اس میں بہت سے نیلے رنگ کے نوٹ تھے۔ وہ بے حد حیران ہوا۔ اس نے ان میں سے ایک نوٹ نکالا اور ساتھ والے گاؤں سے ریزگاری لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر وہ تین نوٹ لے کر جھنگ چلا گیا اور وہاں سے کپڑے اور دوسری چیزیں لے کر آیا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا وہ پرس ابھی تک اس کے گھر میں تھا۔

سردار محمد نے بتایا کہ باقر صاحب نے دو بندے گاؤں میں بٹوا لانے کے لئے بھیجے ہوئے ہیں وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ خان رحیمی کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ بولا "دیکھ رہی ہو مس شاہدہ! زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ بری سے بری چیز میں بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ بیوقوفی' کم عقلی' بزدلی' بدصورتی یہ ناپسندیدہ اوصاف ہیں مگر زندگی ان کے بغیر مکمل نہیں۔ اس کی جیتی جاگتی مثال میرا بھتیجا ہے۔ اس سے بڑھ کر "بے کار" اس چاردیواری میں اور کون ہے مگر دیکھو اس کے ہاتھ سے بھی ایک اچھا کام ہو گیا۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خان رحیمی کے دو کارندے صحن میں پہنچے اور جھک کر سلام کرنے کے بعد سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے گرم چادر کے اندر سے اپنا ہاتھ نکالا۔ اس میں میرا سرخ پرس تھا۔

اگلے روز صبح سویرے چکن سوپ ڈبل روٹی اور مکھن پر مشتمل ناشتہ لے کر خان رحیمی کے بیڈروم کی طرف گئی تو اندر سے بہت تیز تیز باتوں کی آواز آئی۔ خان رحیمی کسی شخص کو بری طرح ڈانٹ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ ڈانٹ کھانے والا یوسف کا ماموں تھا۔ وہ کل رات گئے یہاں پہنچا تھا اور آج صبح صبح خان کے سامنے اس کی پیشی ہو گئی تھی۔ میں اندر پہنچی تو خان رحیمی غصے میں چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کاٹھ کے الو ہو تم' شی از یور وائف ناٹ یور ہسبنڈ۔ عجیب چغد مرد ہو تم' بیوی کی کیا مجال ہے کہ خاوند کا حکم نہ مانے۔"

یوسف کا ماموں بولا۔ "خان جی میرا مطلب ہے تھوڑا سا وقت۔"

خان رحیمی چنگھاڑا۔ "وقت.......... کیا وقت' کوئی پنج سالہ پلان پاس کرنا ہے اس نے۔ یہی اعتراض تھا نا اسے کہ لڑکے کے پاس اپنی زمین نہیں۔ اب زمین ہے اس کے پاس اور نقد پیسہ بھی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہاری زمین بھی خرید سکتا ہے۔ اب وہ کیوں نہیں دے گی رشتہ۔ میں اسے سوچنے کے لئے ایک دن بھی نہیں دے سکتا۔ اگر زیادہ چوں چرا کرے گی تو ٹانگیں تڑوا کر پھینک دوں گا نہر میں' کیا سمجھتی ہے وہ باسٹرڈ اپنے آپ کو!"

میں سمجھ گئی کہ خان رحیمی "رشتے" کی بات کر رہا ہے۔ مجھے پتہ تھا وہ جب بات کرے گا ایسے ہی کرے گا۔ اس کی طبیعت میں ایک جوشیلی سی کج روی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ یوسف کا ماموں بیچارا سخت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس تند و تیز گفتگو میں مداخلت کی اور اشاروں کنایوں میں خان رحیمی کو سمجھایا کہ وہ رشتے کی بات کر رہا ہے۔ رشتوں کے بندھن میں بندھی ہوئی لڑکی کا معاملہ ہے کوئی گولڈن ایگل کا شکار نہیں۔ بمشکل خان رحیمی کے پارے نے نیچے کی طرف سفر شروع کیا۔ میں نے یوسف کے ماموں سے کہا کہ وہ بیوی کو لے کر گوپور آئے اور اگر یوسف کی والدہ سے اس کا کوئی جھگڑا ہے تو اسے سمیٹنے کی کوشش کرے۔ یوسف کے ماموں نے میری تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہونے لگا تو خان رحیمی نے کہا۔

"لک مسٹر' جس کسی کو بھی سمجھانا بجھانا ہے دو دن میں سمجھا لو پرسوں اس وقت مجھے رپورٹ چاہئے۔ تمہیں آ کر بتانا ہو گا کہ ہمیں رشتہ قبول ہے.......... انڈرسٹینڈ؟ اور ہاں.......... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسی ویک اینڈ پر یوسف کی انگیج منٹ کر دی جائے۔ انگیج منٹ سمجھتے ہو نا یعنی منگنی۔ منگنی کا یہ فنکشن گاؤں میں نہیں اسی کوٹھی میں ہو گا۔ میں خود سارا انتظام کراؤں گا۔ تم چاہو تو چالیس پچاس آدمی لا سکتے ہو منگنی پر لیکن ایک شرط ہے ان میں سے کوئی شلوار قمیض یا پینٹ شینٹ پہننے کی کوشش نہ کرے۔ بس اپنے اصلی لباس دھوتی کرتے میں آئیں۔ جب تم لوگ خواہ مخواہ شہری بننے کی کوشش کرتے ہو تو

مجھے بہت برے لگتے ہو۔"

یوسف کے ماموں نے زور زور سے اقرار میں سرہلایا۔ جیسے سب کچھ طے ہو چکا ہو اور مہمانوں کے لباس کا معاملہ ہی باقی رہ گیا ہو۔ وہ چلا گیا تو خان رحیمی نے کانپتے ہاتھ سے سوپ کا چمچہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں مس شاہدہ! میں نے ٹھیک کیا ہے نا' میرا مطلب ہے زندگی میں کچھ رنگ ہونا چاہئے۔ کچھ ہاؤ ہو کا ماحول' ویسے ایک فنکشن تو ہمارا ڈیو ہی تھا نا' کچھ یاد ہے کہ نہیں تمہیں؟" میں سوچ میں پڑ گئی وہ بولا۔ "تم نوجوانوں سے تو ہم بوڑھوں کی یادداشت اچھی ہے تیرے جیسی بناسپتی دوشیزہ کے بارے میں ایک لطیفہ ہے..........." وہ کچھ دیر ذہن پر زور ڈال کر لطیفہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "چلو حساب برابر ہو گیا' تمہیں فنکشن بھولا' مجھے لطیفہ بھول گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن.......... جناب مجھے تو فنکشن یاد آ گیا ہے۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"آپ نے کہا تھا کہ شیخ کا باز ملنے کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کریں گے مگر اس کے بعد آپ کو ہسپتال ایڈمٹ ہونا پڑ گیا۔"

"کوریکٹ۔" خان رحیمی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس فنکشن اور اس فنکشن کو آپس میں مکس اپ کر لیا جائے۔ ذرا انجوائے منٹ ہو جائے گی تم شوقیہ کو بلاؤ۔ وہ کارڈ وغیرہ چھپوانے میں ماہر ہے۔ اگر فنکشن ہونا ہی ہے تو پھر ذرا طریقے سے ہو۔ میرا خیال ہے ڈھائی تین سو کارڈ کافی رہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! میرا خیال یہ ہے کہ اب سوپ والا پیالہ اوندھا ہونے ہی والا ہے۔" اس نے چونک کر پیالے کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین نہیں آیا کہ یہی شخص ہے جسے چند ماہ پہلے فارسٹ گارڈ جان محمد نے واصف چنگیزی سے گفتگو کرتے سنا تھا اور جو چنگیزیوں کے ساتھ کسی پراسرار راز میں شریک ہے۔

بالآخر خان رحیمی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اسی ویک اینڈ پر کوٹھی میں یوسف اور صغراں کی منگنی کی تقریب دھوم دھام سے برپا ہوئی۔ اس منگنی کے پس منظر میں "باز کا

جشن" بھی موجود تھا۔ شہر سے اور اردگرد کے علاقے سے تقریباً چھ سو مہمان کوٹھی میں جمع تھے۔ ان میں اعلیٰ افسران بھی تھے۔ نواحی زمیندار اور چودھری بھی تھے اور گاؤں کے عام دیہاتی بھی۔ بڑا عجیب و غریب اجتماع تھا۔ اونچ نیچ کا فرق کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کم از کم اس تقریب کی حد تک طبقاتی فاصلے مٹ گئے تھے۔ عام دیہاتیوں کے حقوں' ان کی رنگین پگڑیوں اور لاٹھیوں کو شہری حضرات نے دیہی کلچر کا حصہ سمجھ کر قبول کیا ہوا تھا۔ کھانے پینے کا لمبا چوڑا انتظام تھا۔ کوٹھی کے پچھلے باغ میں میں نے بیسیوں ہی دیگیں پڑی دیکھی تھیں۔ سامنے والے وسیع و عریض تراشیدہ لان میں پانچ چھ سو کرسیاں اور میز وغیرہ رکھے تھے۔ اس اوپن ائر میں ایک ورائٹی شو کا اہتمام بھی تھا۔ لاہور سے معروف گلوکار اور مزاحیہ فنکار مدعو تھے۔ شام کے آٹھ بجے تک یہ فنکشن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی مسکراہٹوں اور رنگ برنگے لباسوں کی بہار تھی۔ آج کتنے ہی عرصے بعد میں نے رنگ دار لباس پہنا تھا اور ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ مجبوری تھی ورنہ زندگی تو رنگ و بو سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے میرے سینے میں دل ہی کہاں تھا۔ وہاں تو ایک پتھریلی تختی تھی جس پر کوئی معصوم اپنی انگلی خون میں ڈبو کر لکھ گیا تھا۔ میری ماں! میرے لہو کا حساب لینا۔ میری اذیت کو بھول نہ جانا۔ میری بے بسی کو فراموش نہ کر دینا۔ وہ توتلی زبان میں مجھے امی دان کہنے والا' میرے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھنے والا اور دروازے کے پیچھے چھپ کر مجھے پکارنے والا' میرا سب کچھ ہی تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے شب کی تاریکیوں میں بارہا سوچا تھا۔ وہاب چنگیزی تو نے ایسا کیوں کیا؟ قیامت کا اختیار تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پھر ایک ماں پر یہ قیامت تو نے کیسے ڈھائی؟ میں تجھے کس نام سے پکاروں وہاب چنگیزی کاش انسانی لغت میں کوئی ذلیل نام تیرے "شایان شان" ہوتا۔

رنگ و روشنی کے اس سیلاب میں مہمانوں کے درمیان گھومتے ہوئے دو نگاہیں ہر لحظہ میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ یہ سلیم کی نگاہیں تھیں۔ عجیب سی کسک تھی ان نگاہوں میں اور دھیمی دھیمی تپش تھی۔ یہ نگاہیں میرے جسم کے گرد ایک نادیدہ جال بن رہی تھیں۔ میں چھپنا چاہتی تھی مگر چھپ نہیں سکتی تھی۔ آخر وہ کیوں ایسے دیکھ رہا ہے مجھے؟ یہ سوال مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اب یہ کیا چاہ رہا تھا مجھ سے؟ یہ جانتے بوجھتے بھی

کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے.......... اس کی ان دزدیدہ نگاہوں سے گھبرا کر میں بالآخر چھت پر چلی گئی۔ یہاں تاریکی تھی اور خاموشی بھی۔ ہوا تھمی ہوئی تھی اور خنکی اشجار پر تاریک دھند کی طرح اتری ہوئی تھی۔ لائٹنگ کے لئے چھت پر بہت سی تاریں بچھی ہوئی تھیں ان سے پاؤں بچا کر چلتی میں ایک تاریک منڈیر تک پہنچی اور دونوں کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں سلیم کی دزدیدہ نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ مجھ سے اپنی خاموش محبتوں کا صلہ مانگ رہا تھا جب کہ میرے پاس تہی دامنی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اپنی بیچارگی کا احساس آنسو بن کر میری آنکھوں سے چھلکنے لگا۔ میں وہیں کھڑے کھڑے رونے لگی۔ دفعتاً عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کسی نے دھیمی آواز میں مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے چودھری شباب کھڑا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتی چلی گئی۔

"تم.......... تم کب آئے ہو؟"

وہ بولا۔ "جیل سے تو پچھلے بدھ کو آیا تھا' یہاں آج ہی آیا ہوں۔ میری ضمانت ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نیچے مہمانوں میں تھے؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم جیسے چھوٹے لوگ آپ جیسے بڑے لوگوں کو کہاں نظر آتے ہیں۔"

نہ جانے کیوں چودھری شباب کی موجودگی سے میری ڈھارس سی بندھ جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تیز بارش اور ژالہ باری میں کسی گھنے پیڑ کا سایہ مل گیا ہو۔ اس کے مزاج میں دھیمے پن کے علاوہ گہرائی اور ہمدردی کا عنصر بھی بہت نمایاں تھا۔ وہ بولا۔ "آپ رو رہی تھیں' خیریت تو ہے۔" میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ کہنے لگا۔ "اتنی سردی میں اکیلی اوپر چلی آئی ہیں کیوں اپنی جان کی دشمن بنی رہتی ہیں۔" میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ سیڑھیوں کے دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔ وہ سلیم کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ نے ہم دونوں کو روشنی میں نہا دیا۔

"شاہدہ تم یہاں!" اس نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا۔ "بابری ان سے ملو یہ چودھری شباب ہیں۔" سلیم نے آگے بڑھ کر چودھری شباب سے مصافحہ کیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔

"بڑی تعریفیں سن رکھی ہیں آپ کی' آج ملاقات بھی ہو گئی.......... اگر آپ پسند کریں تو یہیں چھت پر آپ کے لئے دو کرسیوں کا انتظام کر دیا جائے!"

چودھری شباب نے کہا۔ "بڑی مہربانی بابری صاحب! بس ہم نیچے ہی آ رہے ہیں۔" سلیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "نیچے بھی کیا رکھا ہے جی' بس شور شرابہ ہی ہے۔ بڑا سکون ہے یہاں چھت پر۔" پھر اس نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور رخ پھیر کر نیچے اتر گیا۔

چودھری شباب نے کہا۔ "بڑا تیکھا جوان ہے یہ' سنا ہے تیس چالیس بندوں کے اندر سے باز لے کر نکل گیا تھا۔" میں نے اثبات میں جوب دیا۔ چودھری نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یہاں آنے کا کچھ فائدہ ہوا ہے یا نہیں.......... میرا مطلب ہے کوئی کھوج کھرا.........."

میں نے کہا۔ "چودھری! یہ بات تسلی سے کرنے والی ہے۔ اس جگہ پر گفتگو مناسب نہیں۔"

سیڑھیوں کی طرف سے پھر چاپ سنائی دی۔ میں نے سمجھا شاید سلیم سچ مچ کرسیاں لے آیا مگر چاپ نزدیک آئی تو پتہ چلا کہ یہ ایک سے زیادہ آدمی ہیں اور انہوں نے کوئی وزنی شے بھی اٹھا رکھی ہے۔ پھر یہ لوگ چھت پر پہنچ گئے۔ یہ چار آدمی تھے۔ انہوں نے کوئی سفید سی لمبی سی شے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ ان کا پراسرار انداز دیکھ کر میں اور شباب غیرارادی طور پر ایک زیادہ تاریک کونے میں سمٹ گئے۔ سفید چیز نیچے فرش پر رکھنے کے بعد ایک آدمی سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کرنے لگا اور باقی تین کونے والی کوٹھڑی کی طرف چلے گئے۔ یہ کہنہ سال کوٹھڑی شاید کبھی برساتی کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی مگر اب اس پر ایک زنگ آلود تالہ پڑا رہتا تھا۔ کوٹھڑی کی طرف جانے والے غالباً اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ہمت کر کے ایک قدم آگے بڑھی اور غور سے اس سفید چیز کی طرف دیکھا۔ جب میں اسے شے کو پہچاننے کے قابل ہوئی تو سرتاپا لرز گئی.......... وہ ایک کفنائی ہوئی لاش تھی۔ سفید کفن پر گلاب کی ایک

آدھی پٹی اٹکی رہ گئی تھی۔ کفن کے تینوں "بند" مضبوطی سے بند تھے۔ اس نیم تاریک ماحول میں یہ نظارہ اتنا خوفناک تھا کہ میرے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ شاید میں لڑکھڑائی بھی تھی۔ شباب نے کندھوں سے تھام کر مجھے سہارا دیا اور تاریک کونے میں کھینچ لیا۔ کوٹھڑی کا زنگ آلود دروازہ کھولنے کے بعد چاروں افراد واپس آئے۔ ان میں سے ایک خان رحیمی کا ذاتی محافظ سردار محمد اور باقی تینوں سندھی نظر آتے تھے۔ یہ محسوس کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ زمین پر پڑی لاش کے اندر پھڑپھڑاہٹ سی ہو رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے گمان ہوا جیسے یہ کسی بہت بڑے پرندے کی لاش ہے۔ یہ بے تکی سوچ میرے دہشت زدہ ذہن کی پیداوار تھی۔ ایک شخص کی سرگوشی ابھری۔ "سائیں تم دونوں پاؤں کی طرف ہو جاؤ۔" پھر چاروں نے مل کر وہ لاش اٹھالی اور زنگ آلود تالے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

رات تقریباً دو بجے تک رقص و سرود اور راگ رنگ کا مظاہرہ زوروں پر رہا۔ پھر مہمان ڈگمگاتے ہوئے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے اور روانہ ہو گئے لیکن بہت سے ایسے تھے جنہیں رات کوٹھی ہی میں قیام کرنا تھا۔ ان کی شب بسری کا انتظام پہلے سے ہی کر دیا گیا تھا۔ ان رہ جانے والے مہمانوں میں شاہ دین ٹوانہ اور عشرت بھی تھے۔ عشرت کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب محفل برخاست ہو چکی تھی۔ وہ مجھے کن اکھیوں سے دیکھ کر مسکرائی لیکن جان پہچان ظاہر نہیں کی۔ گلابی رنگ کی چمکیلی تاروں والے سوٹ اور ہلکے میک اپ میں وہ بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اپنی بڑی بھابی کا سراپا میری نظروں میں گھومنے لگا۔

جب سارے مہمان محو استراحت ہو گئے۔ کوٹھی کی زیادہ تر روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میرے ذہن میں ایک بار پھر وہ لاش ابھر آئی جو میں نے چھت پر اپنے قدموں سے چند گز دور پڑے دیکھی تھی اور جو اس وقت بالائی منزل کی کوٹھڑی میں موجود تھی۔ یہ منظر یاد کر کے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ آخر اس کفن کے اندر کیا تھا؟ کوئی زندہ جسم تھا جو حرکت کر رہا تھا۔ اس جسم کو اس چاردیواری میں لانے والے کون تھے۔ وہ چوڑے شانوں والا کون تھا جو ورائٹی شو کے دوران خان رحیمی سے سرگوشیاں کر رہا تھا؟ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس وقت چھت پر جاؤں اور کسی طرح اس کوٹھڑی میں جھانکنے کی کوشش کروں مگر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں تو عورت تھی میری جگہ کوئی عام مرد بھی ہوتا تو اس وقت یہ ہمت نہ کر سکتا۔

وہ ساری رات میں نے عجیب و غریب ڈراؤنے خواب دیکھتے ہوئے گزار دی۔ صبح

آنکھ کھلی تو سب سے پہلے لاش کا خیال آیا۔ اب رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو چکی تھی۔ کوٹھی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دل کڑا کر کے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور انہیں طے کر کے چھت پر آ گئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے۔ دائیں بائیں دیکھ کر میں دروازے کے سامنے پہنچی۔ اندر اب کچھ بھی نہیں تھا۔ گرد آلود ٹوٹا پھوٹا فرنیچر تھا۔ چند خستہ حال چارپائیاں تھیں اور ایک زنگ آلود پیڈسٹل فین۔ ایک لمحے کے لئے مجھے گمان ہوا شاید رات میری آنکھوں نے دھوکا کھایا تھا۔ اگر لاش یہاں رکھی گئی تھی تو اب کہاں گئی۔ بغور دیکھنے سے مجھے گرد آلود فرش پر ایک لمبوترا نشان نظر آیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہاں وہ لاش رکھی گئی تھی۔ ارد گرد قدموں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے.......... میں سب کچھ دیکھ کر نیچے آ گئی۔ چودھری شباب بھی ابھی تک یہیں تھا۔ میں اس کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے آواز دے کر مجھے اندر بلا لیا۔ اس کے سرہانے تپائی پر بجلی والا بڑا ریڈیو پڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "میم صاحب! ذرا اس پر آزاد کشمیر تو لگا دیں۔ مجھے تو سٹیشن ہی نہیں مل رہا۔"

میں تپائی کے ایک سرے پر بیٹھ کر مطلوبہ سٹیشن تلاش کرنے لگی۔ میں جانتی تھی ریڈیو کا تو صرف بہانہ ہے دراصل وہ مجھے زینوں سے اترتے دیکھ چکا تھا اور اب جاننا چاہتا تھا کہ چھت پر مجھے کیا نظر آیا ہے۔ دبے لہجے میں بولا۔

"کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں.......... کوٹھڑی کا دروازہ تو کھلا پڑا ہے۔"

"اور.......... لاش؟"

"وہ وہاں نہیں ہے۔"

"حیرت ہے وہ کہاں گئی؟"

میں نے کہا۔ "کیا پتہ' وہ لاش تھی بھی یا نہیں۔"

چودھری شباب بولا "میں تو یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ آج دوپہر تک واپس چلا جاؤں گا لیکن آپ کسی طرح اس چکر کا پتہ چلائیں۔ الیکشن میں اب ستائیس اٹھائیس روز رہ گئے ہیں۔ اگر اس سے پہلے چنگیزیوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تو بڑا

اچھا ہو.........."

اچانک شباب خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ دروازے پر سلیم کھڑا عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے گڑبڑا کر شباب نے کہا۔

"بابری صاحب! اندر آ جاؤ کوئی پردہ نہیں ہے۔"

سلیم اندر آتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک کہتے ہو چودھری صاحب! بندے کو اندر باہر سے ایک جیسا ہونا چاہئے۔ پردہ تو وہ کرتے ہیں جو کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بابری! یہ آزاد کشمیر نہیں لگ رہا چودھری صاحب سننا چاہتے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "آزاد کشمیر نہیں لگ رہا تو تم تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کر لو۔ چودھری صاحب کا مقصد تو وقت گزاری ہے۔ کیوں چودھری جی!"

چودھری شباب ہنس کر رہ گیا۔ غالباً بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران دینو ایک بڑی ٹرے میں ناشتہ لے کر آ گیا۔ لگتا تھا اسے خود بھی خوب بھوک لگی ہوئی ہے۔ وہ ناشتے کو ہوسناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"لو جناب! ناشتہ کر لو ناشتے کے بعد خان صاحب نے سب کو وڈے کمرے میں سدیا ہے' ضروری گل کرنی ہے۔"

چودھری شباب نے کہا۔ "یار تو کیوں لنگڑی اردو بولتا ہے کیا کسی کی بددعا ہے تجھے!"

دینو ہنس کر بولا۔ "میراثیوں اور بھانڈوں کو بددعا نہیں لگتی جی۔"

سلیم نے کہا۔ "ہاں انہیں بددعا لگنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔"

دینو نے کہا۔ "دراصل چودھری صاحب بہروپیا بننے سے پہلے میں جھنگ کے ایک میواتی سیٹھ کے گھر نوکر تھا۔ پورے بیس سال گزارے ہیں میں نے اوتھے۔ جب میں نوکر ہوا تھا وہ لوگ بڑی گاڑھی اردو بولتے تھے۔ میں بھی بڑی ٹھیٹ پنجابی بولتا تھا۔ پھر کچھ میں نے ان کی اردو خراب کی کچھ انہوں نے میری پنجابی کا بیڑا غرق کیا۔ ایک دن میری مالکن کا نانا انڈیا سے ان کے گھر مہمان آیا۔ اس نے جدوں گھر والوں کی زبان سنی تو غش کھاندے کھاندے بچا کہنے لگا۔ "اوہ تمہارا ستیاناس ہو۔ یہ کون سی بولی بول رہے ہو تم' یہ

کس نے کونڈا کر دیا ہے تمہاری زبان کا' تم تو جدی پشتی اردو شپینگ ہو اور اردو بھی وہ جو لوہے توڑ ہوتی ہے۔"

میں نے دینو کی بات کاٹ کر کہا۔ "اردو شپینگ نہیں اردو سپیکنگ۔"

"ہاں ہاں وہی۔" دینو نے کہا۔ "اپنے نانے کی بات پر میری مالکن نے حیران ہو کر کہا کہ ہم تو اچھی بھلی اردو بولتے ہیں آپ کو پتہ نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے۔ ان کے نانا نے گرج کر کہا۔ "تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں' کیا بہرا ہوں۔" میں پاس ہی تھا میں نے کہا۔ "جناب عالی! آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں اور بیگم صاحبہ بھی' دراصل علاقہ بدلنے سے تھوڑا بہتا فرق تو پے ہی جاندا ہے۔" مالکن کے نانا نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر چیخ کر بولا۔ "یہ کون ہے' یہ الو کا پٹھا کون ہے' یہ اس گھر میں کیسے گھسا۔" مالک نے بتایا کہ میں ان کا برسوں پرانا ملازم ہوں۔ بس جناب عالی پھر کیا تھا اس خبطی بڈھے نے اپنی لوہے کے دستے والی سوٹی اٹھائی اور مجھے مارنے کے لئے بھاگا۔ میں جان بچانے کے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "میں تینوں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بدبخت تو نے میری نسل خراب کر دی.........." بس جی کچھ نہ پچھیں اس روز کتنا ہنگامہ ہوا۔ مار تو مجھے پے گئی اور نوکری بھی چھٹ گئی پر میں نے بھی پچھلے چھ سالوں کی تنخواہ نقد و نقد اسی جگہ رکھوالی۔"

میں نے کہا۔ "دینو! چلو تمہاری بات ہم نے مان لی مگر اب تم اردو پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو۔ نوکری تو تمہاری چھوٹ چکی اب سیدھی سادی پنجابی بولا کرو۔"

وہ کہنے لگا۔ "بس یہی تو بات ہے جی' اب میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ پکی پکی اردو سیکھ کے چھوڑنی ہے۔ پورا اردو دان بننا ہے۔ اب یا اردو رہے گی یا میں رہوں گا۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں میں نے بیوی بھی اردو شپینگ کی ہے.........."

دینو غالباً اس موضوع پر لمبی چوڑی بات کرنا چاہتا تھا مگر کسی قریبی کمرے سے اسے خان رحیمی کی آواز آئی اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں سخت پریشان تھی۔ دو تین روز سے میں سلیم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ کوئی موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اطوار سے نظر آتا تھا کہ سخت ناراض ہے۔ معلوم نہیں اس ناراضگی کی کیا وجہ تھی۔ غالباً چودھری شہاب کے حوالے سے وہ کسی

شک میں مبتلا تھا۔ میرے تصور سے وہ کفن پوش لاش چمٹ کر رہ گئی تھی۔ یقیناً رات کوٹھی میں کوئی انہونا واقعہ ہوا تھا۔ اس واقعے سے میرے اور شہاب کے علاوہ کوئی باخبر نہیں تھا۔ سلیم کو بھی خبر نہیں تھی۔ میں اس سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ کسی اڑیل بچے کی طرح منہ پھلائے پھرتا تھا۔ ایک روز پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسے متوجہ کرنا چاہا مگر وہ ناک کی سیدھ میں نکلا چلا گیا۔ اسے مجھ سے بہت شکوے تھے۔ شہاب کی آمد نے ان شکوؤں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا تھا۔ میں سلیم کی مسلسل ناراضگی کی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی' اس لئے نہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے میں اسے چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ ایک ماں کی حیثیت سے مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا تھا اور اس سلسلے میں سلیم ہی میری مدد کر سکتا تھا۔ شاید میں خودغرض بھی تھی کہ صرف اپنے بچے کے لئے سوچ رہی تھی۔ اس سے آگے مجھے نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ سنائی دیتا تھا۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ میری زندگی پر ایک قرض ہے اور وہ قرض مجھے اتارنا ہے اور اگر میں ایسا نہ کر سکی تو قیامت تک کے لئے ماں اور بچے کے رشتے سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

ایک رات میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ سلیم دوسری منزل کے ایک کمرے میں سوتا تھا۔ پندرہ بیس زینے طے کر کے میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ سکتی تھی مگر یہ فاصلہ مختصر ہونے کے باوجود بہت طویل تھا۔ اس کوٹھی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سلیم اور میں بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اگر کوئی ہمیں اکٹھے دیکھ لیتا تو بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ شوقیہ تو پہلے ہی شکوک بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی۔ وہ کئی دفعہ پوچھ بھی چکی تھی کہ شاہ دین کے فارم میں بابری میری مدد پر کیسے آمادہ ہو گیا۔ جب سے اس نے یوسف پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ میری اور اس کی بول چال تقریباً بند تھی.......... بہت دیر سوچنے اور کروٹیں بدلنے کے بعد آخر میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی صورت میں باندھا۔ اوڑھنی لی اور چپل پہن کر بہ آہستگی کمرے سے نکل آئی۔ دھڑکتے دل سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن سلیم کے کمرے میں روشنی تھی۔ میں نے پہلے کھڑکیوں سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر پردے تھے۔ دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ سامنے ہی سلیم نظر آیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی

تھی اور ہونٹوں میں سگریٹ دبا تھا۔ وہ بے حد چوکنی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا لاحاصل تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا۔ سلیم کی جاگی جاگی سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے دیکھا لحاف کے اوپر اس کی جھولی میں کھلا ہوا پستول اور ننھا سا برش پڑا تھا۔ یقیناً میرے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ پستول صاف کر رہا تھا۔

میں اس کے سامنے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے سلیم ناراض ہو؟"

وہ یکسر خاموش رہا۔ میں نے کہا۔ "اگر ناراض ہو تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔"

اس نے پستول کو ایک جھٹکے سے بند کر کے ہولسٹر میں ڈال لیا۔ "کوئی وجہ نہیں ہے۔" وہ غرا کر بولا۔ "پاگل ہوں میں، پاگلوں کے کسی کام کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ میں تمہارے پیچھے چنگیزیوں کی حویلی میں گیا اس کی کیا وجہ تھی۔ تمہارے فریب کی وجہ سے خنجر کھایا اس کی کیا وجہ تھی۔ تمہیں شاہ دین کے فارم سے لے کر بھاگا اس کی کیا وجہ تھی۔ ساری دنیا کی دشمنی مول لی، عزیزوں رشتے داروں سے منہ موڑا، قانون کو پیچھے لگایا، اشتہاری ملزم بنا، ان تمام کاموں کی کیا وجوہات تھیں؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو نثا، چلی جاؤ چلی جاؤ، میں اپنی ذلیل نگاہیں ڈال کر تمہارے پاک پوتر چہرے کو گنہگار کرنا نہیں چاہتا............"

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "سلیم، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، تم تو میرا سہارا ہو، تم بھی مجھے چھوڑ دو گے تو میں کیا کروں گی، تم تو سب کچھ جانتے ہو، پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

وہ کراہ کر بولا۔ "کہا نا کہ میں پاگل ہوں، میری عقل خبط ہو گئی ہے۔ مجھے تمہارے دکھوں کا کوئی احساس نہیں رہا۔ میں ہوس کا بندہ بن گیا ہوں۔ تمہارے زخمی دل کی طرف نہیں تمہارے جسم کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

میں حیران ہو کر سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر سے یوں ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ میں نے کہا۔ "سلیم! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، تم تو ایسے نہیں تھے۔"

اس نے کہا۔ "میں ایسا نہیں تھا لیکن اب ہو گیا ہوں۔ میں کب تک جھوٹ بولتا رہوں گا۔ تم پر جو سانحہ گزرا ہے، مجھے اس کا دکھ تم سے کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ وہ سب کچھ چاہتا ہوں جو ایک مرد ایک عورت سے چاہتا ہے۔ کیا تم مجھے وہ سب کچھ دے سکتی ہو؟ یا اچھے دنوں کا وعدہ ہی کر سکتی ہو؟ اگر نہیں تو پھر میں کس آس پر زندہ رہوں۔ کیوں ملوں تم سے اور کیوں تمہارے آس پاس بھٹکتا رہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک دو دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

میری آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جلنے لگیں۔ اس گھڑی سلیم مجھے بے حد بے رحم اور نامہربان نظر آیا۔ ایک ایسا مرد جو میرے عورت ہونے کے گناہ کو کسی صورت معاف نہیں کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر اس کے کمرے سے چلی آئی۔ وہ ساری رات میں نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں، میرے فرحان کی چیخیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھے آگے بڑھنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت تھی، مگر میرے سائے کے علاوہ کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ راز کہیں اس کوٹھی میں یا اس کے گرد و نواح میں دفن تھا جو چنگیزیوں کے لئے موت کا پھندا بن سکتا تھا۔ مگر وہ کہاں تھا؟ اس رات نظر آنے والی وہ پراسرار سرگرمی کیا تھی؟ میں سلیم سے اس بارے میں بات کرنے گئی تھی مگر وہاں ایک دوسرا ہی موضوع شروع ہو گیا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم لیٹی رہی اور صبح ہو گئی۔ اتنے میں ڈینو آ دھمکا۔ وہ مجھے جگانے آیا تھا۔ میں پہلے سے جاگ رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ کہنے لگا۔

"اچھا ہوا آپ جاگ اٹھیں۔ کل خان صاحب کے لئے ناشتہ مجھے لے جانا پڑا تھا۔ کہنے لگے تم بھانڈ ہو۔ تمہارے لطیفوں میں پھکڑپن ہوتا ہے۔ میں صبح سویرے لیڈر ڈائجسٹ (ریڈر ڈائجسٹ) کے لطیفے سنتا ہوں۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک تھا۔ پر ایس توں بعد تے اوناں نے مجھ پر لطیفیاں کی بارش کر دی۔ لطیفے سنا سنا کر میرا برا حال کر دیا۔ قسم لے لو اب جو ایک سال تک میرے منہ پر ہاسا آئے تو ایسے دردناک لطیفے، توبہ توبہ۔ کہنے لگے یہ مسکرانے والے لطیفے ہیں۔ لو جی یہ بھی کوئی بات ہے۔ لطیفہ تو وہ ہوتا ہے جو سننے والے نوں پٹھیاں کر دے یا اس کی پسلی چڑھ جائے یا اس کی وکھی پاٹ جائے۔ وکھی سے مجھے ایک بات یاد آ گئی ہے۔ ویسے پہلے آپ یہ بتائیں کہ وکھی یعنی وکھی کے لئے

اردو میں کوئی لفظ ہے کہ نہیں۔ میں نے تو بڑا سوچا ہے مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا.........."

دینو عادت کے مطابق مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ میں چونک گئی۔ کہیں سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بالکل ویسی ہی خوشبو جو اس رات لاش کے کفن سے آئی تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ یہ خوشبو دینو کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ اچانک میری نظر دینو کی قمیض پر پڑی۔ اس نے سفید کھڑکھڑاتے لٹھے کی قمیض پہن رکھی تھی اور بالکل نئی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ قمیض تم نے کہاں سے لی ہے؟"

وہ بولا۔ "جی کل ہی سلوائی ہے۔ وہ نورا گاڈی ہے نا' بھینسوں مجوں والا' اس نے کپڑا دیا تھا۔"

نورا گاڈی' خان رحیمی کی کوٹھی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک الگ تھلگ کچے مکان میں رہتا تھا۔ کوٹھی میں اس کا بہت آنا جانا تھا۔ خان رحیمی کے ساتھ بہت بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔ لگتا تھا اس کے بچپن کا دوست ہے۔ میں نے دینو سے پوچھا نورے کے پاس یہ کپڑا کہاں سے آیا؟"

دینو بولا۔ "اس کی بیل گاڑی میں پڑا تھا۔ میں نے پچھا لے لوں۔ کہن لگا لے لو۔ میں نے ایک قمیض بنوالی' دو کچھے سلوا لئے' اب بھی تھوڑا سا پڑا ہے۔ آپ کو لوڑ ہو تو آپ لے لیں۔"

میں نے غور سے کپڑے کو دیکھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اسی کفن کا کپڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "دینو یہ نورا گاڈی اس وقت کہاں ہو گا؟"

دینو نے کہا۔ "جی اس ویلے تو وہ اپنی مجیں لے کر نہر کی طرف گیا ہو گا دوپہر کے وقت آئے گا' پر آپ..........؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "یوں ہی پوچھ رہی تھی' ویسے یہ کرتہ تم اتار دو' پتہ نہیں کیوں مجھے برا لگ رہا ہے۔"

دینو نے ناپسندیدگی کی وجہ پوچھی لیکن میں ٹال گئی۔ اتنے میں خان رحیمی کی خوابگاہ کے باہر سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کا مطلب تھا وہ ناشتے کے لئے بے چین ہو رہا ہے۔ میں جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتہ تیار کرتے ہوئے ذہن مسلسل

نورے گاڈی میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا جس رات لاش غائب ہوئی' صبح صبح نورا گاڈی کوٹھی آیا تھا اور خان رحیمی سے کچھ باتیں کرنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس رات میں صبح تک جاگتی رہی تھی۔ کوٹھی کی گاڑیوں میں سے کوئی بھی اسٹارٹ ہو کر نہیں گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ لاش کوٹھی سے کہیں لے جائی گئی تھی تو اس کے لئے گاڑی نہیں بلکہ بیل گاڑی استعمال ہوئی تھی۔ دینو کے بیان کے مطابق کفن یا کفن کے کپڑے کا کچھ حصہ نورے کی بیل گاڑی میں پڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا؟ سوچ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ نورے گاڈی سے ملنا چاہئے۔ نورے نے دو بھینسیں پال رکھی تھیں اور یہ کوئی معمولی بھینسیں نہیں تھیں۔ کسی بہت خاص نسل کی بھینسیں تھیں اور میں نے سنا تھا کہ ان میں سے ایک ضلع کی سطح کے مقابلے میں انعام بھی حاصل کر چکی ہے۔ میں نے ایک دن نورے سے کہا تھا کہ وہ اپنی بھینسیں دکھائے۔ وہ دکھانے کے لئے لایا تھا مگر میں یوسف کی منگنی کے سلسلے میں اس کے ماموں کے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ نورے سے ملنے کا یہ ایک اچھا بہانہ تھا۔ سہ پہر کے وقت میں کوٹھی سے نکلی اور ڈھائی تین فرلانگ دور نورے کے مکان پر پہنچ گئی۔ شاندار سانڈوں والی اس کی بیل گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ گھر میں ہے۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ نورا بھینسوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "آؤ بی بی جی بڑی قسمت ہے میری آپ نے میرے گھر میں قدم رکھا۔ اس یوسفے کو بھی لے آنا تھا۔ بڑا خوش ہوتا ہے وہ بھینسوں کو دیکھ کر اور دیکھیں نا جی' چیزیں بھی تو دیکھنے والی ہیں۔"

واقعی بہت شاندار بھینسیں تھیں۔ وہ بولا۔ "میں نے ایک ایک مہینے کی وچھیاں پالی تھیں جناب! پچھلے سے پچھلے سال بیل گاڑیوں کی دوڑ ہوئی تھی چنیوٹ میں' ڈپٹی کمشنر صاحب نے اول انعام دیا تھا مجھے۔ دو ہزار روپیہ نقد تھا ایک پگڑی تھی اور یہ وچھیاں تھیں۔"

میں بھنیسوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ درحقیقت میں کچھ دیر یہاں رکنا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ نورے کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جس سے لاش کے مسئلے پر روشنی پڑتی۔ میں نے باتوں باتوں میں یوسف کی منگنی کی رات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا اس نے گلوکاروں اور مزاحیہ فنکاروں کا شو دیکھا تھا؟

اس نے بتایا کہ شروع شروع میں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ گڑبڑا گیا' بولا۔ "بس جناب! نیند آ گئی تھی۔"

میں اس سے بھینس کا دودھ دھونے کا طریقہ سیکھنے لگی۔ وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے سکھانے لگا۔ ادھیڑ عمر شخص تھا لیکن کافی ہنس مکھ اور باتونی۔ دوبارہ یہاں آنے کے لئے کوئی بہانہ تو چاہئے تھا لہٰذا میں نے دودھ دھونے میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ کل میں پھر آؤں گی.......... اگلے روز سہ پہر کے وقت میں پھر نورے کے مکان میں جا پہنچی۔ وہ بیل گاڑی کے اوپر بیٹھا جھاڑو پھیر رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے نورے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی صفائی کر رہا تھا۔ آپ اندر چلیں میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے غور سے دیکھا۔ بیل گاڑی میں وہ برادہ سا پڑا ہوا تھا جو غالباً مرغیوں کی خوراک تھی۔ شاید ابھی ابھی وہ خوراک کے تھیلے کہیں اتار کر آیا تھا۔ میں اندر چلی آئی۔ چند لمحے بعد نورا بھی آ گیا۔ اس نے ڈبی دار دھوتی پر سفید شلوکا پہن رکھا تھا۔ چال ڈھال سے خالص دیہاتی آدمی نظر آتا تھا۔ میں باتوں باتوں میں اسے کریدنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی شک میں نہ پڑ جائے۔ لہٰذا بہت محتاط گفتگو کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ڈھب پر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے سفید شلوکے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"نورے! یہ شلوکا تو نے نیا سلوایا ہے؟ ایسا ہی کپڑا میں نے دینو کے پاس بھی دیکھا تھا۔"

"ہاں جناب! وہ میں نے ہی دیا تھا' بس ایک جگہ سے مل گیا تھا۔"

"میں نے پوچھا۔ "اور کپڑا مل سکتا ہے؟"

وہ بولا۔ "ایسی تو کوئی خاص بات نہیں اس کپڑے میں' آپ نے کیا کرنا ہے؟"

"بس تھی ضرورت۔" میں نے کہا ایسی ہی باتوں کے دوران وہ مجھے دودھ دھونے کے گر سکھاتا رہا۔ اتنے میں گرج چمک ہونے لگی۔ جب میں کوٹھی سے چلی تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بادل بھی تھے لیکن اتنی جلدی موسم خراب ہو جائے گا پتہ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگی۔ نورے نے جلدی جلدی بھینسوں کو ایک چھپر تلے

باندھا۔ اس کام میں میں نے بھی اس کی مدد کی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی۔ بیلوں کی جوڑی کو اندر باندھتے باندھتے ہم پانی میں شرابور ہو گئے۔ بھیگ تو میں گئی ہی تھی۔ سوچا کہ کوٹھی واپس چلی جاؤں مگر اس دوران ژالہ باری ہونے لگی۔ دیہات میں اور خاص طور پر کھلے علاقے میں جہاں کوئی سایہ وغیرہ نہ ہو ژالہ باری بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ میں چاہنے کے باوجود جا نہ سکی۔ نورے نے برآمدے میں اپلوں کی آگ جلائی اور سادگی سے بولا۔ "جناب! آپ آ جائیے وہاں سردی لگے گی آپ کو۔" لیکن میں برآمدے کے در ہی میں کھڑی رہی۔ بالکل اچانک ہی مجھے اس چار دیواری سے خوف سا آنے لگا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا کہ نورا مجھے "جناب" سادگی یا احترام کی وجہ سے نہیں کہہ رہا بلکہ طنز سے کہہ رہا ہے۔ اس کی عام سی آنکھوں میں کبھی بڑی خاص سی چمک لہرا جاتی تھی۔ جونہی ژالہ باری بند ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اچھا نورے میں چلتی ہوں۔"

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "اتنی جلدی جناب عالی' کوئی گپ شپ لگاؤ میرے ساتھ۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو ہی جائے۔" میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نورے نے ہاتھ بڑھایا اور قریب رکھے اپلوں کے ڈھیر میں سے ایک طاقتور رائفل نکال لی۔ رائفل کو گود میں رکھ کر وہ کسی پالتو جانور کی طرح تھپکنے لگا۔ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بادشاہو! دودھ دھونا تو آپ نے سیکھ لیا' اب جاسوسیاں شاسوسیاں بھی سیکھ لو' سیکھے بغیر کوئی کام نہیں آتا!"

میں نے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "کہنا تو کچھ نہیں چاہتا' سننا چاہتا ہوں اور خان صاحب بھی سننا چاہیں گے۔"

"کیا سننا چاہیں گے؟"

"یہی کہ تم ہو کون' تمہارا اصل نام اور پتہ ٹھکانہ کیا ہے۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کس لئے..........؟" آخری الفاظ کہتے کہتے نورے کا لہجہ جنونی ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کسی درندے کی طرح روشن تھیں۔ میں نے صحن میں نکلنے کے لئے قدم بڑھایا تو وہ لپک کر میرے سر پر پہنچ گیا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے اتنا شدید جھٹکا دیا کہ میں لڑکھڑاتی

ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے لپک کر کمرے کی کنڈی اندر سے بند کر دی۔ پہلی مرتبہ مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ وہ غرا کر بولا۔

"میں بڑا برا آدمی ہوں میم صاحب! مجھ سے جھوٹ بولے گی تو بڑا پچھتائے گی۔ مجھے تجھ پر اسی وقت شک ہو گیا تھا جب تو نے یہاں نوکری کی تھی۔ بتا کس چکر میں آئی ہے یہاں؟"

میں نے کہا۔ "نورے تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے' اور اپنی زبان سنبھال کر بات کر' میں ایسا لہجہ سننے کی عادی نہیں ہوں۔"

نورے نے بھنا کر رائفل کی سرد نال میری گردن سے لگا دی۔ دانت پیس کر بولا۔

"اپنے آپ پر رحم کھا بیوقوف! میں تجھے بتا چکا ہوں کہ اچھا آدمی نہیں ہوں۔ سچ بتا دے ورنہ پچھتائے گی۔ میں نچوڑ دیتا ہوں جھوٹ بولنے والے کو۔"

میں خود کو چوہے دان میں محسوس کر رہی تھی۔ نورے کے بارے میں میرے اندازے غلط نکلے تھے۔ وہ میری توقع سے کہیں ہوشیار اور خطرناک شخص تھا۔ وہ ایک ایسے معمولی چہرے کا مالک تھا جو کسی بھی شخص کو دھوکا دے سکتا ہے........... یہی وہ وقت تھا جب مجھے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس دستک نے نورے کو بری طرح ٹھٹکا دیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر چارپائی پر گرا اور میرے منہ کو اپنے مضبوط ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ "کون ہے؟" وہ اندر سے ہی پکار کر بولا۔

"نورے! یہ میں ہوں بابری۔" صحن سے سلیم کی آواز آئی۔ "شاہدہ بی بی تو ادھر نہیں آئی!"

میں اپنی جگہ پر پڑی کسمسائی لیکن نورے کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ بولا۔ "کل آئی تھیں آج تو نہیں آئیں........... ذرا کپڑے بدل رہا ہوں تم دو منٹ ٹھہرو میں آتا ہوں۔"

سلیم نے کہا۔ "نہیں جلدی ہے پھر آؤں گا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔"

بارش کے پانی میں سلیم کے قدموں کی چاپ سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ سلیم غالباً بیرونی دروازے کو پار کر چکا تھا۔ بے بسی کا شدید احساس میرے رگ و پے میں دوڑ

گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا بایاں پاؤں کمرے کی بند کھڑکی بالکل پاس ہے۔ میں نے اس پاؤں کو ذرا سا آگے بڑھا کر زور زور سے کھڑکی پر مارا۔ نورے نے میری یہ ٹانگ سمیٹنے کی کوشش کی تو میرے سر پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ آزاد کرایا اور چیخ کر سلیم کو آواز دی۔ آواز ابھی پوری طرح بلند بھی نہیں ہوئی تھی کہ نورے نے بھرپوری قوت سے میرا منہ ڈھانپ لیا۔ تاہم یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ سلیم دوبارہ کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ "کیا بات ہے؟" سلیم نے باہر سے نورے کو مخاطب کیا اس نے میری ادھوری چیخ نہیں سنی تھی لیکن کھڑکی کے تختے بجنے کی آواز اس تک پہنچ گئی تھی۔ "کیا بات ہے نورے؟" اس نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔ "کچھ نہیں۔ میں نے تو نہیں بلایا۔" نورے نے جواب دیا۔ یہ محسوس کر کے میری امید بندھی کہ نورے کی آواز نارمل نہیں ہے۔ صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سے زور آزمائی کرتے ہوئے بول رہا ہے۔

"دروازہ کھولو نورے۔" سلیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ نورا خاموش رہا سلیم نے دو تین دفعہ اپنا فقرہ دہرایا۔ پھر اچانک زور کا دھماکہ ہوا اور دروازے کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ میں نے سلیم کو تیزی سے اندر آتے دیکھا اس وقت تک نورا مجھے چھوڑ کر اپنی رائفل سنبھال چکا تھا۔ سلیم کی لپیٹ سے بچتے ہوئے وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور گولی چلا دی۔ دھماکے سے کمرہ لرز اٹھا۔ رائفل کی نال کے رخ سے مجھے اندازہ ہوا کہ نورے نے سلیم کو گولی نہیں ماری صرف اسے ڈرایا ہے۔ گولی کمرے کے کچے فرش میں پیوست ہوئی تھی۔ نورے نے سلیم کو گالی دی اور کڑک کر بولا۔

"خبردار بابری' ایک قدم بڑھایا تو کلیجہ پھاڑ دوں گا۔"

سلیم ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا مگر اس کا چہرہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ رکے گا نہیں اب تک میں اس چہرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ اس چہرے کے دو روپ تھے۔ پہلا روپ ایک عام انسان کا تھا اور دوسرا ایک جنگجو درندے کا' جو ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دشمن پر جھپٹ پڑتا ہے اور اس وقت سلیم نے یہی روپ دھار رکھا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے برق سی لہرائی۔ سلیم نے تیزی سے نیچے جھک کر دو قدم اٹھائے اور نورے کو اپنے کندھے کی ضرب سے دھکیل کر دیوار پر دے مارا۔ سلیم کا

ایک ہاتھ نورے کی کمر سے لپٹا ہوا تھا اور دوسرا رائفل پر تھا۔ دوسرا دھماکہ ہوا اور اس مرتبہ گولی چھت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے میں بارود اور دھواں پھیل گیا اور چھت سے مٹی گرنے لگی۔ نورا اور سلیم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ نورا سلیم سے کمزور نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی میں وہ بھی ماہر نظر آتا تھا اس نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی اور سلیم کو دھکیل کر دیوار سے لگا دیا تھا لیکن وہ ایک بات سے بالکل بے خبر تھا۔ سلیم اسے بتدریج اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔ اس کی خوفناک ٹکر کسی بھی وقت اس کے چہرے پر پڑنے والی تھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دھم کی آواز سے نورے کے سر نے جھٹکا کھایا اور اس کے ناک منہ سے خون نکلنے لگا۔ وہ حیران سا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت سلیم کی دوسری ٹکر اس کے چہرے پر پڑی اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس کے بعد سلیم نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ٹھوکروں ٹکروں اور گھونسوں سے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بمشکل اس کی جان بچائی۔ اب وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے خون آلود چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔ میں نے دیکھا اس کی بائیں ٹانگ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ پاؤں اور گھٹنے کی پوزیشن دیکھ کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی پنڈلی ٹوٹ چکی ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ نورے نے اٹھنے کی کوشش کی تو چیخ مار کر پھر سیدھا لیٹ گیا۔ سلیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ثناء باہر کا دروازہ بند کر آؤ۔"

میں نے جا کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ کمرے میں رائفل کے دو دھماکے ہو چکے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ مکان الگ تھلگ تھا اور ویسے بھی گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ کسی کے باخبر ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں واپس برآمدے میں پہنچی تو کمرے سے نورے کی آواز آئی۔ وہ سلیم کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ اسی طرح فرش پر پڑا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ سلیم نے چارپائی کی رسی کے ساتھ اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

ناراضگی بھرے لہجے میں بولا۔ "تم یہاں کیا لینے آئی تھیں۔ میں نہ پہنچتا تو پتہ نہیں وہ کیا کر جاتا۔"

میں نے کہا۔ "جب تم نے میری بات نہیں سنی تو مجھے خود آنا پڑا۔"

"کیسی بات نہیں سنی میں نے؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی اہم بات ہو گئی اس لئے تو تمہارے پاس آئی تھی۔"

"ثناء پہیلیاں نہ بوجھواؤ۔ ہم جس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں یہ بہت خطرناک ہے۔ اور یہ الو کا پٹھا نورا سب کچھ جان چکا ہے۔ مجھے کہہ رہا تھا تم دونوں غدار ہو اور یہاں جاسوسیاں کرنے کے لئے آئے ہو۔"

میں نے ضروری سمجھا کہ سلیم کو وہ سب کچھ بتا دوں جو اس رات چھت پر پیش آیا تھا۔ میں نے لاش نظر آنے کے واقعے سے لے کر دینو کی منحوس قمیض تک سب کچھ اس کے گوش گزار دیا۔ وہ حیرانی سے سنتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میری روداد ختم ہوئی تو سلیم کے چہرے پر کرختگی کچھ اور بڑھ چکی تھی.......... اندر سے نورے کے کراہنے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ گالیاں بھی بکنے لگتا تھا۔ سلیم کو سامنے ایک کھلی الماری میں تالا نظر آ گیا۔ یہ تالا لے کر وہ باہر گیا اور بیرونی دروازے کو باہر سے مقفل کرنے کے بعد چار دیواری پھلانگ کر اندر آ گیا۔ چولہے میں اپلوں کی آگ ابھی تک روشن تھی۔ سلیم نے مجھے کہا کہ میں یہ آگ بجھا دوں تاکہ دھوئیں کی وجہ سے کسی کو نورے کی موجودگی کا شک نہ ہو۔ اس کے بعد وہ کمرے میں چلا گیا۔ میں نے مٹکے سے پانی لے کر چولہے کی آگ بالکل سرد کر دی۔ اتنے میں کمرے کے اندر سے نورے کی بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چیخ رہا تھا میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سلیم کے ہاتھ میں رائفل تھی اور نے اپنا ایک پاؤں نورے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر رکھا ہوا تھا۔ سلیم کی آنکھوں میں سفاکی تھی اور نورے کا چہرے ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "سلیم یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "شاہدہ تم باہر بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مگر.......... یہ بات ٹھیک نہیں۔"

اس نے کہا۔ "تم اسے نہیں جانتی ہو یہ شخص کسی طرح رحم کے قابل نہیں۔ میں

تمہیں بتاؤں گا اس کے بارے میں تم باہر جاؤ۔"

میں الجھی ہوئی باہر آ گئی۔ بند کمرے کے اندر سے نورے کی خوفناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ سلیم اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ لاش کس کی تھی اور اس رات وہ اسے کہاں چھوڑ کر آیا تھا۔ جواب میں نورا واہیات بک رہا تھا اور سلیم کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ خان رحیمی مجھے اور سلیم کو کتے کی موت مار دے گا۔ بہرحال کچھ دیر بعد اس کی اکڑفوں ختم ہو گئی اور وہ دھمکیاں دینے کی بجائے رونے اور چلانے لگا۔ مجھ سے یہ ساری آوازیں برداشت نہیں ہوئیں اور میں کانوں میں انگلیاں دے کر بھینسوں والے چھپر تلے جا بیٹھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد سلیم باہر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ میں نے کانوں سے انگلیاں نکالیں۔ نورے کی چیخ دھاڑ سنائی نہیں دی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"مر گیا کمبخت............ بتایا کچھ نہیں۔"

میں سر سے پاؤں تک ہل گئی۔ "کیا کہا مر گیا؟"

"مرا ہی نہیں سمجھ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"میں نے کہا۔ "سلیم اب کیا ہو گا۔ یہ تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے خان رحیمی سے ہماری اصلیت چھپی نہیں رہے گی۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" سلیم نے اعتماد سے کہا۔ "جب تک ہم یہاں سے فارغ نہیں ہو جاتے' نورے اور خان رحیمی کی ملاقات نہیں ہو گی۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اسے ٹھکانے لگا کر ابھی آتا ہوں۔"

"میں نے کہا۔ "سلیم کوئی غلط کام نہ کرنا میں تمہیں قاتل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" سلیم نے کہا اور تیزی سے اندر چلا گیا کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا تو اس کے کندھے پر نورے کا بے ہوش جسم تھا وہ اسے کہیں لے جا رہا تھا۔

صرف آدھ گھنٹے بعد سلیم واپس آ گیا شام ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ بارش تھم گئی تھی۔ اب صرف بوندا بوندی ہو رہی تھی۔ میں نے سلیم سے پوچھا کہ وہ نورے کو

کہاں چھوڑ آیا ہے۔ اس نے کہا گھبراؤ نہیں وہ جہاں بھی ہے زندہ ہے اور محفوظ ہے ہمارا مقصد اسے چند دن کے لئے خان رحیمی سے دور رکھنا ہے۔ ہم دونوں نے مل کر نورے کے گھر کی مکمل تلاشی لی اس کے ایک صندوق میں سے دیسی شراب کی ایک پلاسٹک گیلن' بے ہودہ تصویروں والے تاش' چرس کی گولیاں اور دو خم دار چاقو برآمد ہوئے۔ ایک کمرے سے ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی ہم دروازہ کھول کر اندر پہنچے تو خون آلود سوتی تھیلا نظر آیا یہ تھیلا آٹے کے بڑے بورے جتنا تھا وہ تین چوتھائی کسی شے سے بھرا ہوا تھا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر تھیلے کا منہ کھولا اس میں گوشت تھا چھوٹی چھوٹی بوٹیاں تھیں۔ میں نے غور سے ان بوٹیوں کو دیکھا تو خوف آمیز حیرت کی ایک لہر جسم میں دوڑ گئی۔ یہ مختلف جانوروں اور پرندوں کا قیمہ سا تھا۔ کہیں چوہے کی دم نظر آ رہی ہے کہیں کوے کی چونچ' کہیں گلہری کا سر اور کہیں جنگلی خرگوش کا پنجہ۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نورے نے جنگل میں کہیں جال لگایا تھا اور اس میں جو جو کچھ پھنسا تھا وہ اٹھا کر لے آیا تھا اور اس کا قیمہ کر ڈالا تھا۔ قریب ہی قصائیوں کا ایک اوزار جسے غالباً "بگدا" کہا جاتا ہے رکھا تھا۔ درخت کے تنے کا وہ گول ٹکڑا بھی موجود تھا جس پر رکھ کر گوشت بنایا جاتا ہے۔ میں اور سلیم حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے یہ قیمہ نما گوشت جس تھیلے میں بند تھا اس پر مرغیوں کی خوراک بنانے والی ایک فرم کی مہر لگی تھی۔ میں نے سلیم کو بتایا کہ نورے کی بیل گاڑی میں بھی مرغیوں کی خوراک بکھری ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مرغی خانے میں اس کا آنا جانا ہے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے بھی ایک دن خان رحیمی کی زبان سے کسی مرغی خانے کا ذکر سنا تھا۔

میں نے سلیم سے پوچھا۔ "یہاں اردگرد کوئی مرغی خانہ ہے؟"

"سلیم نے کہا۔ "سنا تو میں نے بھی ہے شاید باغاں والے گاؤں کے پاس ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس مرغی خانے سے کچھ نہ کچھ پتہ چل سکتا ہے وہاں ضرور جانا چاہئے۔" سلیم کچھ دیر خالی خالی نظروں سے خون آلود تھیلے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے میں ابھی چکر لگاتا ہوں وہاں کا تم فوراً کوٹھی چلی جاؤ یہ نہ ہو ان لوگوں کو شک پڑ جائے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے تمہارے ساتھ چلنا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"میں ڈاکٹر ماڑی کی طرف جانے کا بہانہ کر کے نکلی تھی۔ وہاں نہ جاؤں گی تو غلط ہو گا۔" ڈاکٹر ماڑی ایک ادھیڑ عمر مشکوک ڈاکٹر تھا۔ مشکوک اس لئے کہ کسی کو ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا کہ اس نے ایم بی بی ایس کیا ہے یا نہیں۔ کوٹھی سے کوئی دو کلو میٹر دور اس کا چھوٹا سا کلینک تھا۔ یہ کلینک عین نہر کے پل پر گھنے درختوں میں واقع تھا۔ اردگرد کے لوگ اسے بہت مانتے تھے۔ خود میرے کندھے کے پرانے زخم میں درد شروع ہوا تھا تو خان رحیمی نے مجھے اس کی طرف جانے کی ہدایت کی تھی۔ ڈاکٹر ماڑی کے کلینک سے "باغاں والی" کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ سلیم کے ساتھ ہی چلی جاؤں ویسے بھی اب شام ہونے والی تھی اور میرا اکیلا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ مکان چھوڑنے سے پہلے ہم نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام شواہد مٹا دیئے۔ سلیم نورے کی رائفل ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ رائفل یہیں کہیں چھپا دے۔ اس نے رائفل کو ایک مومی کاغذ میں لپیٹا اور گھر سے باہر جنتر کی جھاڑیوں کے نیچے دبا دیا۔ باہر وہ کھٹارہ دیوہیکل موٹر سائیکل کھڑی تھی جو ان دنوں سلیم کے استعمال میں تھی۔ نورے کے مکان کو باہر سے تالا لگا کر ہم موٹر سائیکل پر آ بیٹھے اور نہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ پھسلن کی وجہ سے سلیم سست روی سے جا رہا تھا۔ مغرب کی اذان کے وقت ہم ماڑی کے کلینک پر پہنچے تو میں پردے کے پیچھے خواتین والے کیبن میں چلی گئی۔ سلیم مردانے حصے میں رہا۔ ڈاکٹر ماڑی ایک لمبے تڑنگے شخص سے مصروف گفتگو تھا۔ اس شخص نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور رعب دار نظر آتا تھا۔ ان کا موضوع گفتگو سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ شلوار قمیض والا پولیس کا آدمی تھا اور کسی ایسے شخص کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جس کے بازو پر گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر ماڑی بتا رہا تھا کہ پچھلے تین چار دنوں میں کوئی ایسا شخص اس کے پاس نہیں آیا۔ پولیس والا حسب عادت اسے کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گفتگو سنتے ہی میرے ذہن میں اس چوڑے شانوں والے کا خیال آیا جو منگنی کی شب لاش لے کر حویلی کی چھت پر پہنچا تھا اس کا ایک بازو صاف طور پر زخمی دکھائی دیتا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ سلیم اشتہاری ملزم تھا اور پولیس والے کے سامنے تھا۔ کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ میں ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ ڈاکٹر اور پولیس والے کی گفتگو سن سکتی تھی۔ مگر سلیم دوسرے مریضوں کے ساتھ جس بنچ پر بیٹھا تھا، کافی دور تھا اس لئے یہ اندازہ کرنا

مشکل تھا کہ ڈاکٹر سے ہم کلام شخص پولیس آفیسر ہے۔

میں بے چین ہو گئی اگر میں یہاں سے اٹھ کر جاتی تو ڈاکٹر نے ضرور پوچھنا تھا بیٹی کیا ہوا کہاں جا رہی ہو۔ ایسی صورت میں مجھے جواب دینا پڑتا اور اپنا چہرہ بھی دکھانا پڑتا۔ اگر میں خود کو چھپا کر کیبن میں بیٹھی رہتی تو سلیم کسی مشکل میں پھنس سکتا تھا۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا کہ منہ پر چادر کا پلو رکھ کر تیز قدموں سے باہر نکلی انداز ایسا ہی تھا کہ جیسے شدید متلی ہو رہی ہے اور میں کلینک کے فرش کو آلودہ ہونے سے بچانا چاہتی ہوں۔ باہر نکل کر میں املی کے ایک پیڑ تلے اکڑوں بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔ سلیم بھاگا ہوا آیا۔ "کیا ہوا ثناء؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر ماڑی کے پاس پولیس والا بیٹھا ہے۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں تم موٹر سائیکل دھکیل کر آگے لے جاؤ میں آتی ہوں۔" سلیم میری بات سمجھ گیا۔ میں کچھ دیر بیماروں کے انداز میں اسی جگہ بیٹھی رہی پھر اٹھی اور تیز قدموں سے درختوں کی طرف چل دی تقریباً پچاس گز آگے سلیم کھڑا مل گیا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتائی۔ اس نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ میں نے کہا۔ "رات ہو گئی ہے میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔" وہ بولا "اب یہاں تک آئے ہیں تو مرغی خانہ بھی دیکھ جائیں تھوڑی دور ہے۔" میں خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نہر کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت بڑھنے لگا کوئی دو فرلانگ آگے مرغی خانے کے آثار نظر آئے۔ میں دیکھ کر حیران ہوئی یہ ایک معمولی سی کلرزدہ عمارت تھی۔ ایک چار فٹ اونچی چاردیواری کے اندر تین لمبی کوٹھریاں تھیں۔ جن کی کھڑکیوں پر سوراخ دار جالی لگی تھی۔ چند میلے کچیلے بلب ان کوٹھڑیوں کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کس ٹٹ پونجیئے دیہاتی کا مرغی خانہ تھا۔ جو سب سے حیران کن چیز یہاں نظر آئی وہ خان رحیمی کی ٹویوٹا جیپ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خان رحیمی بذات خود اس وقت مرغی خانے میں موجود ہے۔ اس چھوٹے سے خستہ حال مرغی خانے میں خان رحیمی کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات غور طلب تھی۔ خان رحیمی کی جیپ دیکھنے کے بعد ہمارا یہاں رکنا عقل مندی کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا ہم خاموشی سے واپس چلے آئے۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے سلیم بالکل خاموش تھا۔ اس کے اطوار سے ظاہر تھا کہ کوٹھی میں میری غیر موجودگی سے پریشان ہو کر وہ میرے پیچھے تو چلا آیا ہے مگر ابھی تک سخت ناراض ہے۔

میں نے ہی بات چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اس مرغی خانے میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔"

"ہوں۔" سلیم نے مختصر ترین جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "پولیس والے کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ لاش کوٹھی تک لے جانے والے افراد پولیس کی نظر میں آ چکے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "کوٹھی کے پرانے مہمان خانے میں روزانہ تین چار آدمیوں کا کھانا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لوگ ہیں۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہئے؟"

"میں تو کہتا ہوں زیادہ چکروں میں نہ پڑو اس بڈھے خان رحیمی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میرے پاس ایک ٹھکانہ ہے۔ وہاں کسی کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگر یہ بڈھا سب کچھ نہ بتا دے تو میرا نام سلیم نہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں سلیم اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ بعض کام زور آزمائی سے خراب بھی ہو جاتے ہیں۔"

وہ تلخی سے بولا۔ "تم نے کبھی کسی کی مانی ہے جو اب مانو گی۔"

میں نے کہا۔ "سلیم تم اتنا کام کرو دن کے وقت کسی بہانے اس مرغی خانے کا ایک اور چکر لگاؤ پتہ تو چلے یہاں ہے کیا۔ اگر خان رحیمی کا اس مرغی خانے سے اتنا گہرا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے وہ کفن پوش جسم بھی یہاں لایا گیا ہو۔"

سلیم خاموش رہا اس سے اس کی نیم رضامندی کا اظہار ہوتا تھا۔ یکایک سلیم نے بریک لگائی اور موٹر سائیکل پھسلتے پھسلتے بچی۔ میں نے دیکھا ہیڈلائٹ میں ایک سرخ مورس گاڑی نظر آ رہی تھی۔ پھسلن کی وجہ سے گاڑی کا اگلا پہیہ ایک گڑھے میں جا گرا تھا۔ اب گاڑی کی سواریاں اسے نکالنے کے لئے دھکا لگا رہی تھیں۔ دھکا لگانے والوں میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی' عورت کو دیکھتے ہی میں چونک گئی وہ عشرت تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں یہ سرخ موٹر کار شاہ دین ٹوانہ کے فارم میں دیکھ چکی ہوں۔ کار کی چھت پر بڑا اٹیچی کیس بندھا ہوا تھا۔ عشرت نے پتلون اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ دھکا لگانے کی وجہ سے وہ بری طرح ہانپی ہوئی تھی۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں سے خوشی

کی چیخ نکل گئی۔

"اوہ بابری تھینکس گاڈ بڑے وقت پر آئے ہو تم" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھو تمہارے گاؤں کے راستے نے کیا حال کیا ہے میرا۔" اس کا لباس اور چہرہ کیچڑ کے چھینٹوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ غالباً پہیہ گڑھے کے اندر گھومتا رہا تھا اور اس نے دھکا لگانے والوں کا حشر کر دیا تھا۔ ہم دونوں بھی موٹر سائیکل سے اتر آئے۔ عشرت نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا اور السلام علیکم کہہ کر خاموش ہو گئی۔ عشرت کے ساتھ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ملازم بھی تھا۔ ڈرائیور اندر بیٹھا تھا اور ملازم عشرت کے ساتھ مل کر دھکا لگا رہا تھا۔ اب ہم دونوں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گاڑی نکل آئی۔ عشرت نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ سلیم موٹر سائیکل پر پیچھے پیچھے آنے لگا۔ عشرت نے بتایا کہ چار روز پہلے منگنی پر ہی یہ پروگرام بن چکا تھا کہ شاہ صاحب اور وہ یہاں آئیں گے اور دس بارہ روز قیام کریں گے۔ خان رحیمی اور شاہ دین کے درمیان شکار وغیرہ کی منصوبہ بندی بھی ہوئی تھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ چھت پر صندوق کیسا ہے اور کل شام خان رحیمی نے مجھے بالائی منزل کے دو کمرے صاف کروانے کو کیوں کہا تھا۔ میں نے عشرت سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیوں نہیں آئے۔ وہ بولی۔ "بیٹھے ہوں گے اس نفے کٹنی کے پاس اسے خیر سے آج کل دماغی دورے پڑ رہے ہیں کہہ رہے تھے اسے لاہور میو ہسپتال لے کر جانا ہے فارغ ہو کر آ جاؤں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ یہ ذکر بے چاری عابدہ کا ہو رہا ہے۔ عشرت کی باتوں سے پتہ چلا کہ جب سے شاہ دین کے ڈیرے پر یوسف کو مارا پیٹا گیا تھا عابدہ کی ذہنی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ دیوانگی کی حالت میں اس نے اپنی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سرمہ سلائیاں پھیر لیں تھیں اور کہا تھا کہ جو آنکھیں اپنے گمشدہ اسلم کو نہیں دیکھ سکتیں وہ کسی اور کو بھی کیوں دیکھیں۔ اس کوشش میں اس کی ایک آنکھ بالکل ضائع ہو گئی تھی اور دوسری بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حالت سے خوف کھا کر شاہ دین ٹوانہ گوپور سے یوسف کو بھگا لے گیا تھا۔ اب وہ سارا دن یوسف کو سامنے بٹھائے آنکھیں کھول کھول کر دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جب ٹھیک طرح دیکھ نہیں پاتی تھی تو رونے لگتی تھی اور اس پر تشنج کا

دورہ پڑ جاتا تھا۔ ترسی ہوئی ماتا کا یہ انجام میرے کلیجے کو دہلا گیا۔ کاش اپنے کالے ہاتھوں سے ماؤں کے جگر گوشے نوچنے والے جان جائیں کہ بچے کو کھو کر ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت سلیم نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ وہ اس پولٹری فارم میں گیا تھا اس نے بتایا کہ اس وقت خان رحیمی بھی وہاں ہے۔ پولٹری فارم کے وسیع احاطے میں وہ باز اڑانے کی مشق کر رہا ہے۔ سلیم نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں تھا کہ وہ پولٹری فارم سے کچھ فاصلے پر درختوں میں چھپ کر سب کچھ دیکھتا رہا ہے۔ خان رحیمی کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک شکل و صورت سے انگریز دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے ربڑ یا کپڑے کا مصنوعی پرندہ بنا کر ایک تار سے لٹکایا ہوا تھا۔ خان رحیمی بار بار باز کو اس پرندے پر چھوڑتا تھا اور پھر ٹانگ پر بندھی رسی سے جا کر پکڑ لیتا تھا۔ بعدازاں انہوں نے باز کو ایک اصلی پرندے پر بھی چھوڑا اور وہ اسے شکار کرنے میں کامیاب رہا۔ سلیم نے بتایا کہ یہ شیخ والا باز نہیں تھا۔ سلیم کی اطلاع کافی حیران کن تھی۔ اس کوٹھی میں بھی کافی جگہ تھی پھر خان رحیمی باز اڑانے کے لئے مرغی خانے میں کیوں جاتا تھا۔ سلیم نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ مرغی خانے سے واپس آ رہا تھا ایک شخص نے اسے روک کر اس کا نام پتہ پوچھا وہ ایک مشکوک سا آدمی تھا........... کوٹھی کے طول و عرض میں نورے گاڈی کی گمشدگی کا چرچا ہو چکا تھا۔ سب لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ بیل گاڑی کا دھرا ٹھیک کرانے جھنگ گیا ہوا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ شام کو خان رحیمی بھی واپس آ گیا۔ نورے گاڈی کی گمشدگی نے اسے بھی بہت پریشان کیا۔ اس نے سب ملازمین سے پوچھ گچھ کی اور اپنے کارندے چاروں طرف دوڑائے۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ معلوم نہیں سلیم نے اسے کہاں چھپایا ہے اور وہ چھپا رہ بھی سکے گا یا نہیں اگر وہ کہیں سے برآمد ہو جاتا تو سارا کھیل ہی بگڑ جاتا تھا۔ سلیم مطلق فکرمند نہیں تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ اور عشرت ایک دوسرے سے کافی کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ شاہ دین ٹوانہ ابھی تک کوٹھی نہیں پہنچا تھا اور وہ ذلیل عورت اس موقع سے خوف فائدہ اٹھا رہی تھی۔ شاید وہ شاہ دین کے بغیر یہاں آئی ہی اس لئے تھی کہ سلیم کے ساتھ کھل کھیلنے کا موقع مل سکے۔ میں کوئی بچی نہیں تھی، میں صاف اندازہ کر سکتی تھی کہ سلیم مجھے دکھانے

کے لئے عشرت سے میل جول بڑھا رہا ہے۔ اس کی یہ حرکت بالکل بچکانہ تھی۔ میری صحت پر اس کی اس بے راہروی کا کیا اثر پڑتا تھا لیکن ایک روز بات حد سے گزر گئی وہ دونوں سرشام چہل قدمی کے لئے باہر نکلے اور رات کے کھانے تک واپس نہیں آئے۔ خان رحیمی پہلے ہی نورے گاڈی کی وجہ سے پریشان تھا اس واقعہ نے اسے مزید ڈسٹرب کیا۔ میں نے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے فکر و تردد کے آثار دیکھے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ دونوں واپس تو آ گئے مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ خان رحیمی کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری ہے اور وہ صرف میری وجہ سے چپ ہے۔ اگلے روز میں نے کوٹھی کی چھت پر سلیم کو جا لیا بات کرنے کے لئے موقع اچھا تھا میں نے کہا۔

"سلیم یہ جو کچھ تم کر رہے ہو کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "تم سے مطلب؟"

میں نے کہا۔ "کوئی مطلب نہیں مگر یاد رکھو میں یہاں ایک مقصد سے آئی ہوں تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس مقصد کے حصول سے پہلے حالات کو اتنا خراب کر دو کہ خان رحیمی ہمیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اگر تم میری مدد نہیں کر سکتے تو نہ کرو مگر میرے لئے مشکلیں تو پیدا نہ کرو۔"

وہ غصے سے بولا۔ "ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں دو تین گھنٹے کی مہلت دینا تو تم گوارا کر لو گی۔" اس کا لہجہ آتش فشاں تھا۔

میں نے کہا۔ "دیکھو سلیم سمجھنے کی کوشش کرو میں تمہاری دشمن نہیں۔ میں تو خوش ہوں کہ تم اپنی زندگی کے بارے میں سوچو کسی کا ہاتھ تھامو........... مگر عشرت جیسی لڑکی کا نہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تمہاری زندگی قابل رشک ہو۔"

وہ بولا۔ "صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا میں نے بھی بہت کچھ چاہا تھا مگر پاگل تھا کہ امیدوں کے سہارے جیتا رہا اب میں حقیقتوں کے سہارے جینا چاہتا ہوں جو کچھ باقی بچ رہا ہے اسے سمیٹنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم کچھ سمیٹ نہیں رہے بکھیر رہے ہو سلیم۔ سنبھل جاؤ زندگی ابھی اتنی بے کار نہیں ہوئی۔"

"میرے لئے ہو چکی ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا اتنے میں عشرت آتی دکھائی

دی۔ جب سے وہ آئی تھی اس کی آنکھوں میں گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ جسم لچک لچک جاتا تھا اور سانس جیسے ہر وقت چڑھی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کی دزدیدہ نگاہیں سلیم کے توانا بازوؤں اور کشادہ سینے پر رینگتی رہتی ہیں۔ آج اس نے سرخ پھولوں والا ریشمی جوڑا پہن رکھا تھا۔ بالوں میں سلیقے سے پھول لگائے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر سلیم مسکرانے لگا اور وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں کھو کر باتیں کرنے لگے کہ مجھے نیچے جاتے ہی بنی۔

اس رات میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ سلیم کا جو مجسمہ میرے دل کی زمین پر وقت کے ہاتھوں خود بخود تراشا گیا تھا اپنی شکل و صورت کھونے لگا۔ رات کوئی دس بجے کا وقت تھا جب میرے کمرے سے باہر قدموں کی چاپ گونجی۔ پھر کسی نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے بستر سے اٹھ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

جواب میں سلیم کی بدلی بدلی سی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بُو کا ایک بھبکا میرے سانس کے ساتھ اندر چلا آیا۔ سلیم کی آنکھیں نیم وا تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ ایک قدم اندر آ کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ "روک سکتی ہے مجھ کو روک سکتی ہے تو؟ بالکل بے بس ہے مجبور ہے کچھ نہیں ہے تیرے پاس۔ لے دیکھ میں جا رہا ہوں' تیری آنکھوں کے سامنے جا رہا ہوں۔" وہ بری طرح بہک رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں دل چاہے گا جاؤں گا' جہاں مجھے سکون ملے گا' خوشی ملے گی.......... بہت سے ٹھکانے ہیں میرے پاس' تو کیا چیز ہے' تیری وقعت کیا ہے۔ کچلی مسلی عورت' مجھے کچھ نہیں لینا ہے تجھ سے' کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھ' بڑی حور پری بنتی ہے تو' بھول ہے تیری' سب بھول ہے تیری۔"

میں نے اسے بازو سے تھامنا چاہا۔ اس نے ایک وحشیانہ جھٹکے سے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ میری کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ سرگوشی میں غرایا۔ "خبردار! مجھے ہاتھ مت لگا۔ مجھے نفرت ہے تیرے وجود سے۔"

اس نے ایک طرف منہ کر کے دیوار پر تھوکا اور باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا وہ برآمدہ پار کر کے سیدھا عشرت کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔ عشرت کے کمرے کی بتی

ابھی تک روشن تھی۔ غالباً دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ کیونکہ جونہی وہ دروازے پر پہنچا برآمدے میں ایک روشن مستطیل سی چمکی اور وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں اپنے کمرے میں بستر پر گم صم بیٹھی کلائی سے رستا خون روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ رات زخمی ناگن کی طرح سوچ کی بھول بھلیوں میں رینگتی رہی۔ رینگتی اور ڈنک مارتی رہی۔ مجھے پہلی بار سلیم کی عقل پر رونا آ رہا تھا۔ وہ مجھے لعنت ملامت کا نشانہ بنا رہا تھا اور اپنی بربادیوں کا ذمے دار قرار دیتا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا اس معاملے کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ نادرہ بیگم نے میرے لئے چنگیزیوں کا رشتہ کیوں ڈھونڈا؟ میرے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس کی دشمنی سلیم سے تھی۔ وہ سلیم کو چنگیزیوں کے مقابل لا کر اس کا قصہ تمام کرانا چاہتی تھی۔ اس عورت نے اس ذلیل مقصد کے لئے میری زندگی کو بھینٹ چڑھایا تھا۔ سلیم اپنی خواہشات کے ابال میں یہ بات بالکل بھول رہا تھا..........

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہیں۔ پچھلے پہر جب شبنم روتے چاند کا چہرہ مغربی جانب سفیدے کے درختوں میں چھپ رہا تھا' سلیم کا ہیولا برآمد ہوا اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے زینے چڑھنے لگا۔

اس رات میں ایک اہم فیصلے پر پہنچ گئی۔ دل میں جو رہا سہا خوف تھا وہ بھی ناپید ہو گیا۔ میری مامتا نے تہیہ کر لیا کہ اپنے مقصد کے لئے اب خطرے کے ہر دریا میں کود پڑنا ہے۔ اگلے روز صبح سویرے نہا دھو کر میں نے خود کو تر و تازہ کیا۔ تر و تازگی ضروری تھی کیونکہ خان رحیمی صرف مسکراہٹوں کا طالب تھا۔ ساری رات رونے والے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے جانے کا مطلب بدمزگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پر کیا کچھ بھی بیت رہی ہو اس کے روبرو ہر شخص کو مسکرانا پڑتا تھا اور یہی اس کے کردار کا سب سے عجیب پہلو تھا۔

باورچن سلطانہ سے خان کا ناشتہ تیار کروا کے میں ٹرالی میں دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی۔ خان حسب معمول بیڈ پر پھیلا ہوا انگریزی اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی بے ترتیبی سے لیٹا رہتا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت غیر رسمی موڈ میں رہنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ میری آہٹ پر اس نے حسب معمولی مجھے سرتاپا تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ لباس کے رنگ ڈھنگ اور بالوں کے سٹائل پر ایک دو فقرے کہے۔ پھر گلدستے

سے گلاب کا ایک تروتازہ پھول لے کر مجھے بالوں میں بائیں جانب لگانے کی ہدایت کی۔

"یو آر رئیلی چارمنگ۔" وہ چہکا۔ "کاش میں نے پیدا ہونے میں اتنی جلد نہ کی ہوتی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "سر! اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اتنی ٹھنڈی سانسیں بھریں گے تو نصیب دشمناں بیمار پڑ جائیں گے اور شاہ دین صاحب بھی آج کل میں آنے والے ہیں۔ شکار کا پروگرام دھرا رہ جائے گا۔"

اس نے ہنس کر کہا۔ "میں بیمار ہونے کے خوف سے اپنی آنکھوں کو بند نہیں رکھ سکتا۔"

میں بولی۔ "سر! میں نے تو ٹھنڈی سانسوں کی بات کی تھی۔"

اس نے کہا۔ "ایک ہی بات ہے۔"

میں نے ناشتہ اس کے سامنے میز پر سجا دیا۔ "سر! نورے کا کچھ پتہ چلا؟"

خان رحیمی نے نفی میں سرہلا دیا اور اپنی ان کوششوں کے بارے میں بتانے لگا جو وہ اب تک نورے کی تلاش کے سلسلے میں کر چکا تھا۔ خان رحیمی بڑی سے بڑی الجھن کو ہلکے پھلکے انداز میں لیتا تھا مگر نورے کے سلسلے میں وہ بڑی حد تک سنجیدہ تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے گفتگو کا رخ شکار اور شاہین بازی کی طرف موڑ دیا۔ میں نے کہا۔

"سر! سنا ہے آپ بازوں اور شاہینوں کو شکار کی ٹریننگ بھی دیتے ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں نے کہا۔ "سر! میری بڑی خواہش ہے کبھی دکھایئے نا مجھے بھی کہ کیسے ٹریننگ ہوتی ہے۔"

وہ بولا۔ "چلی چلو........ آج ہی چلی چلو۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تھینک یو سر' تھینک یو ویری مچ' لیکن کہاں جانا ہو گا؟"

وہ مسکرایا۔ "افق کے اس پار' جہاں بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔"

میں نے کہا۔ "سر! یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ بات تم مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہی ہو میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں سر! حقیقت بیان کر رہی ہوں کوئی چور ڈاکو ٹکر گیا تو میں اکیلی کہاں تک مقابلہ کروں گی۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور اپنے بازوؤں کے نادیدہ مسل ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"یو آر رانگ' اتنا گیا گزرا نہیں ہوں میں' کبھی وقت آیا تو دیکھ لینا۔"

اس روز خان رحیمی مجھے اپنے ساتھ ہی مرغی خانے لے گیا۔ مرغی خانے کا مالک بڑی توند والا ایک کالا سا شخص تھا۔ غالباً اس کے گردے میں درد تھا۔ وہ چلتے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتا تھا اور دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ مرغی خانے کے دو مدقوق ملازموں کے علاوہ مجھے وہ انگریز بھی نظر آیا جس کا ذکر سلیم نے کیا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ یہ پرندوں کا ایک ماہر ڈاکٹر ہے۔ اس اجاڑ بدحال مرغی خانے میں انگلش ڈاکٹر کی موجودگی معنی خیز تھی اور بات صرف ڈاکٹر تک محدود نہیں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مرغی خانے کے اردگرد درختوں میں کچھ پراسرار نقل و حرکت جاری ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو کمبل کی بکل مارے ایک درخت کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ پھر مجھے سخت نقوش والا ایک دیہاتی نظر آیا جس نے دو بکریوں کو گھاس پر منہ مارنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا اور خود گرم چادر لئے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ شخص مسلح ہے۔ مرغی خانے کے صحن میں کیکر کے درخت پر بھی ایک شخص چڑھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ شاخوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھا مگر گمان ہوتا تھا کہ وہ پہریداری کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہوں گے جو مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بڑی خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی' ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ خان رحیمی کا ایک ملازم ایک پنجرہ لے کر آیا۔ اس میں شاہین بند تھا۔ پروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک کم عمر پرندہ ہے۔ اس کے پاؤں میں خوبصورت گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ سخت بے تابی سے پنجرے میں چکرا رہا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ اسے دو روز سے بھوکا رکھا گیا ہے۔ پرندے کو پنجرے سے نکال کر اس کے سر پر ایک سیاہ تھیلی چڑھا دی گئی۔ اس کے پاؤں سے رسی نہیں باندھی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ پرندہ نہیں جسے کل سلیم نے دیکھا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ یہ شاہین تربیت کے دوسرے مرحلے میں ہے۔ اب یہ شکار کو دبوچ کر شکاری کے پاس واپس لانا سیکھ رہا ہے۔ مرغی خانے کا احاطہ کافی وسیع تھا اور اس میں گھاس اور جھاڑ

جھنکار کثرت سے تھا۔ خان رحیمی کا ایک ملازم لکڑی کا ڈربہ لے کر آیا۔ اس میں چند جنگلی خرگوش بند تھے۔ خان رحیمی شاہین کو اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی پر بٹھا کر تیار ہو گیا۔ ملازم نے ڈربے کا دروازہ کھولا۔ ایک قسمت کا مارا خرگوش ڈربے سے نکل کر گھاس پر بھاگا۔ خان رحیمی نے شاہین کے سر سے کالی تھیلی اتار کر منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ شاہین اڑا اور تیر کی طرح جنگلی خرگوش کی طرف گیا۔ خرگوش گھاس میں گھس گیا۔ شاہین اس کے اوپر اڑنے لگا۔ خرگوش کے ہر پینترے کے ساتھ وہ قابل داد انداز میں پینترہ بدلتا تھا۔ پھر اس نے غوطہ لگایا اور کمال ہوشیاری کے ساتھ گھاس کے اندر سے خرگوش کو اچک لیا۔ میرے لئے یہ منظر سنسنی خیز تھا۔ خرگوش شاہین کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں پنجوں کی گرفت سے نکل کر نیچے لٹک گئی تھیں اور جسم پر خون کی دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ شاہین' خان رحیمی کے سر پر چکرانے لگا۔ خان رحیمی نے منہ سے بار بار مخصوص آواز نکالی۔ آخر شاہین شکار کو لے کر خان رحیمی کے سامنے آ بیٹھا۔ خان رحیمی نے آگے بڑھ کر جاں بلب خرگوش کو شاہین کے پنجے سے چھڑانا چاہا تو اس نے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ بار بار اس پر چونچ آزما رہا تھا۔ ابھی اس کی تربیت ادھوری تھی۔ خان رحیمی نے بمشکل اس کی آنکھوں پر سیاہ تھیلی چڑھائی اور اسے خرگوش سے جدا کیا۔ ایک ملازم نے جلدی سے خرگوش کے گلے پر تکبیر پھیری اور اسے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ خان رحیمی نے قریب رکھی پلیٹ میں سے کلیجی کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر شاہین کی چونچ میں دینے شروع کئے اور اس کی ٹانگوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ پرندے کو سکھلانے کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ میں گہری نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ دوپہر کے وقت جب سورج سر پر آ گیا تو خان رحیمی کو اپنے سیاہ چشمے کی ضرورت پڑی۔ یہ چشمہ اس کے بیگ میں پڑا تھا۔ بیگ مرغی خانے کے آفس نما کمرے میں رکھا تھا۔ خان رحیمی نے مخصوص انداز میں کہا۔

"گرل جاؤ چشمہ لے کر آؤ۔"

میں خود کسی ایسے موقعے کی متلاشی تھی۔ آفس نما کمرے میں جا کر میں نے دیکھا ایک بے رنگ و روغن تپائی کے گرد تین خستہ حال کرسیاں رکھی تھیں۔ پلاسٹر ادھڑی دیواروں پر دو پوسٹر جھول رہے تھے۔ ایک پوسٹر میں چند چوزوں کی تصویریں تھیں۔ جب

کہ دوسرے میں ایک توانا مرغ نے چونچ میں سو روپے کا نوٹ دبا رکھا تھا۔ پولٹری فارمز سے کہا گیا تھا کہ وہ اس نسل کی مرغی پالیں۔ اب معلوم نہیں مرغ سو کے نوٹ کھاتا تھا یا اگلتا تھا۔ اس دفتر میں میری دلچسپی کی چیز لوہے کا ایک دروازہ تھی۔ میں گمان کر سکتی تھی کہ یہ دروازہ کسی اٹیچ باتھ روم یا چھوٹے کمرے میں کھلتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک کوتاہ قد شخص کو بالٹی میں ایک چیز لئے تیز قدموں سے اس آفس میں گھستے دیکھا تھا۔ اس بالٹی میں نظر آنے والی شے مجھے چونکا گئی تھی۔ یہ ویسا ہی قیمہ نما گوشت تھا جو میں دو روز پہلے نورے کے مکان میں دیکھ چکی تھی۔ اس آفس میں گھسنے کے بعد جب وہ ٹھگنا شخص واپس آیا تھا تو خالی بالٹی اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ اس آفس میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ گوشت رکھ کر چلا گیا ہو۔ اس کا مطلب تھا آفس کے اندر سے کھلنے والے چھوٹے آہنی دروازے کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہے.......... آخر وہ کیا چیز تھی جسے گوشت کھلایا گیا تھا۔

خان کے بیگ سے عینک نکالتے نکالتے میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس آہنی دروازے کو ضرور دیکھنا ہے۔ خوش بختی سے دروازے کے آہنی قفل میں چابی موجود تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا پھر سب اندیشوں اور وسوسوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے نیم تاریک سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سیڑھیاں نیچے کسی تہہ خانے میں جاتی تھیں۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنبھل سنبھل کر اترتی اور ایک ہال نما کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی خون میری رگوں میں جمنے لگا۔ میں نے تین آدمیوں کو دیکھا ان کے کندھوں سے طاقتور رائفلیں لٹک رہی تھیں اور وہ فرش پر کپڑا بچھائے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے سر کو جنبش دیتا تو مجھے دیکھ لیتا۔ میں تیزی سے واپس مڑی مگر واپس مڑنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس پنجرے پر ضرور ڈال لی جو ایک دیوار کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ پنجرہ تقریباً آٹھ فٹ اونچا اور پندرہ سولہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ ان خانوں میں باز' عقاب اور شاہین تھے۔ خدا کی پناہ.......... ایک ساعت کے لئے مجھے لگا کہ دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ وہ ایک مشرقی شہباز جس کی قیمت چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس پنجرے میں موجود تھا۔ مگر وہ ایک نہیں تھا اس جیسے کئی پرندے اس پنجرے میں بند

تھے۔ اس کے علاوہ گولڈن ایگل تھے اور شاہین تھے......... میرے ابتدائی اندازے کے مطابق ان بیش قیمت پرندوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ کروڑوں روپے کا مال ہے۔ میں اپنی کیلکولیشن پر خود ہی چکرا گئی۔ اس وقت اس خستہ حال چار دیوار کو غالباً دنیا کا قیمتی ترین مرغی خانہ کہا جا سکتا تھا۔ اپنے حواس کو بحال کرتی ہوئی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے دروازے کو بے آواز کھولا تھا ورنہ تہہ خانے میں بیٹھے ہوئے خونی شکلوں والے محافظ مجھے یوں واپس نہ آنے دیتے۔ میں لرزتے قدموں سے باہر نکلی۔ خان رحیمی نے پوچھا۔ "اتنی دیر لگا دی؟" میں نے کہا۔ "مل نہیں رہی تھی کپڑوں کے نیچے پڑی تھی۔" وہ عینک چڑھا کر نوآموز شاہین کی پرواز دیکھنے لگا۔

☆------------☆------------☆

صبح کا وقت تھا ابھی اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ کوٹھی کے زیادہ تر مکین سو رہے تھے۔ میں پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہی تھی۔ آہٹ ہوئی مڑ کر دیکھا تو سلیم تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ لگتا تھا جاگتا رہا ہے۔ کہنے لگا۔ "ثنا! مجھے کل رات والے واقعے پر افسوس ہے میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "سلیم میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ سچ پوچھتے ہو تو تم میری نظروں سے گر گئے ہو۔"

اس نے کہا۔ "میں تمہاری نظروں میں کبھی سربلند ہی نہیں ہوا تو گروں گا کیا' بہرحال تمہارے لئے ایک بہت اہم اطلاع ہے۔ تمہیں میرے ساتھ یوسف کے گاؤں گوپور تک جانا ہو گا۔" میں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر سلیم یکسر ٹال گیا۔ بولا۔ "وہیں جا کر سب کچھ معلوم ہو گا۔" جب اس نے کسی طور پر نہیں بتایا تو میں نے کہا "ٹھیک ہے میں سہ پہر کو خان رحیمی سے ڈاکٹر ماڑی کی طرف جانے کی اجازت لے لوں گی تم موٹر سائیکل پر مجھے لے چلنا۔"

اس شام ہم دونوں گوپور کی طرف جا رہے تھے۔ سلیم ایک شارٹ کٹ راستہ استعمال کر رہا تھا۔ ہچکولوں سے جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا مگر امید تھی کہ ہم آدھے وقت میں گوپور پہنچ جائیں گے۔ میرے ذہن میں ان گنت سوال تھے۔ گوپور میں آخر کیا بات تھی۔ یوسف اور اس کی ماں تو خیریت سے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ "سلیم' کہیں نورا' یوسفے کے گھر تو نہیں؟" سلیم نے اثبات میں جواب دیا۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے نورے گاڑی کو ایک جگہ باندھ کر ڈال دیا تھا۔

بعد ازاں راتوں رات یوسف کے گھر پہنچا دیا۔

میں نے کہا۔ ”سلیم یہ اچھا نہیں ہوا کہیں یوسف پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔“

وہ اعتماد سے بولا۔ ”تم بے فکر رہو‘ یوسف پر کوئی آنچ نہیں آئے گی یہ میری ذمہ داری ہے۔“

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم یوسف کے گھر ایک تنگ تاریک کمرے میں نورے کے سامنے بیٹھے تھے۔ نورے کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں بھی ایک آزار بند میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اس کی اکڑ فوں بالکل ختم ہو چکی ہے۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ لگتا تھا سلیم نے پچھلے دنوں میں اسے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ سلیم نے چٹکی بجا کے کہا۔

”چل نورے‘ جو کچھ کل بتایا تھا فٹافٹ پھر دہرا دے۔ چل شاباش۔“

نورے نے پٹیوں میں جکڑی ہوئی اپنی ٹانگ کو سہلایا اور ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنے لگا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ ”خان رحیمی کسی لمبے چکر میں ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس سیزن میں اس نے بہت سے شکاریوں سے باز‘ عقاب وغیرہ خریدے ہیں اور انہیں تربیت دی ہے۔ کچھ کو تربیت کے بغیر ہی رکھا ہوا تھا۔ یوسف کی منگنی کی رات سندھی لباس والا جو شخص کوٹھی پہنچا تھا وہ بخشو سولنگی نامی ایک مفرور ڈاکو ہے۔ وہ بیس پرندوں کی ایک کھیپ لے کر شمالی سندھ سے آیا تھا۔ وائلڈ لائف والوں کو مخبری ہو چکی تھی نتیجے میں پولیس نے سخت ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ دوسری طرف بخشو کو وعدے کے مطابق مال بھی یہاں لانا تھا۔ مجرموں کے حلقوں میں بخشو وعدے کا بہت پکا سمجھا جاتا ہے۔ اپنی اس شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اس نے اپنے ایک شناسا انگریز ڈاکٹر کو اپنا آلہ کار بنایا۔ (یہ وہی ڈاکٹر تھا جسے سلیم نے اور پھر میں نے مرغی خانے میں دیکھا تھا) پرندوں کو ایسے انجکشن لگائے جو انہیں دیر تک بے ہوش رکھ سکتے تھے۔ بعد ازاں ان پرندوں کو ایک کفن میں رکھ کر باندھ دیا گیا۔ مردے کی صحیح جسامت دکھانے کے لئے پرندوں کے ساتھ روئی وغیرہ بھی رکھی گئی۔ اس ”لاش“ کو ایک چارپائی پر ڈال کر ٹرک میں رکھا گیا۔ دو تین عورتوں کا انتظام کیا گیا جنہیں لاش کے سرہانے منہ چھپائے بیٹھے رہنا تھا۔ بخشو سولنگی بھی اپنے دو خاص

کارندوں کے ساتھ ٹرک میں سوار ہو گیا۔ یوں وہ اپنے ”باپ کی لاش“ کو اس کی وصیت کے مطابق آبائی گاؤں میں دفنانے کے لئے ملتان سے جھنگ روانہ ہوا۔ اس کا منصوبہ کامیاب رہا اور وہ ناکہ بندیوں کے باوجود جھنگ تک پہنچ گیا مگر یہاں ایک پولیس پارٹی کو اس پر شبہ ہوا۔ نتیجے میں فائرنگ ہوئی بخشو اور اس کے دو ساتھی کسی طرح کفن سمیت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور کرائے کی عورتیں ٹرک سمیت پکڑی گئیں۔ اس شب میں نے جو کفن پوش لاش دیکھی تھی وہ دراصل یہی مسروقہ پرندے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بے ہوش تھے لیکن کچھ ہوش میں آ رہے تھے اور پھڑپھڑا رہے تھے......... نورے نے بتایا کہ اس رات وہ پرندے بھی دوسرے پرندوں کے ساتھ مرغی خانے میں پہنچا دیئے گئے تھے اور یہ کام نورے گاڈی نے خود کیا تھا۔

ہمارے بار بار پوچھنے کے باوجود نورا اور کچھ نہیں بتا سکا۔ اس نے قسمیں کھا کر اور برگزیدہ ہستیوں کو گواہ بنا کر یقین دلایا کہ وہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میں نے پوچھا اس کا اندازہ کیا ہے۔ خان رحیمی ان پرندوں کا کیا کرنا چاہتا ہے؟ نورے نے کہا۔

”ظاہر ہے جی‘ وہ ان سے پیسہ کمانا چاہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم کہتے ہو کہ اس نے پرندے شکاریوں سے خریدے ہیں۔ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا۔ یہ تو کروڑوں کا کھیل ہے؟“

نورے نے کہا۔ ”اس بات کا کچھ پتہ نہیں جی‘ اس نے کئی شکاریوں کو جھولیاں بھر کر رقمیں دی ہیں۔ کوئی بڑا اثر و رسوخ والا بندہ اس کی بیک پر ہے جی‘ یہ کام ایسے ہی نہیں ہو رہا۔“

نورے کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سمجھا رہا ہے کہ ہم نے اس پر ہاتھ ڈال کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔

نورے سے گفتگو ختم کر کے ہم باہر آئے۔ سلیم نے یوسف کو نورے کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور مجھے لے کر باہر آ گیا۔ ہمیں جلد از جلد کوٹھی واپس پہنچنا تھا۔ راستے میں میں نے سلیم کو بتایا کہ کل میں مرغی خانے میں کیا دیکھ کر آئی ہوں۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ سخت حیران نظر آنے لگا۔ اب ہمارے لئے اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ اس علاقے میں ایک سنگین چکر چل رہا ہے‘ ور

خان رحیمی اس پراسرار معاملے کا مرکزی کردار ہے۔ فارسٹ گارڈ جان محمد نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "سلیم! مجھے ایک اور شک ہو رہا ہے۔"

"کیسا شک؟"

"میرا خیال ہے کہ خان رحیمی ہماری اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا نہیں.......... ہے۔ ہم دونوں ہی بڑے بے وقوف ہیں۔ وہ مرغی خانہ چاروں طرف سے سخت نگرانی میں ہے۔ پہلے میں اور تم دونوں وہاں منڈلاتے رہے پھر میں نے تمہیں تناسن گن لینے کے لئے بھیجا۔ وہ لوگ ضرور ہمیں دیکھ چکے ہیں۔"

سلیم نے موٹر سائیکل ایک جانب درختوں میں روک دی۔ جیکٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ "مجھے بھی وہ شخص یاد آ رہا ہے جس نے مرغی خانے سے واپسی پر میرا نام پتہ پوچھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مرغی خانے کے نگرانوں میں سے ہو۔"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" میں نے اس کی تائید کی۔ کچھ دیر ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم رہے۔ "اب کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اوپر تلے گہرے کش لئے اور بولا۔ "ان حالات میں تو چودھری شہاب کا خیال آ رہا ہے۔ وہی کچھ مشورہ دے سکتا ہے۔"

معلوم نہیں سلیم ایسا طنز سے کہہ رہا تھا یا سنجیدگی سے رائے دے رہا تھا۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ اب خان رحیمی کی چار دیواری میں ہمارے لئے بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔ بظاہر خان رحیمی کا رویہ اب تک نارمل تھا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ بے خبر ہے۔ وہ ایک گہرا شخص تھا اور درست موقعے پر درست فیصلہ کرنا جانتا تھا.......... ہم کوٹھی سے تقریباً تین فرلانگ کی دوری پر پہنچ چکے تھے۔ میری رسٹ واچ کی سوئیاں آٹھ بجے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ پوری رات کا چاند آہستہ آہستہ جنگل پر طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا سیاہ زمین پر کسی نے سفیدی کے چھینٹے اڑا دیئے ہوں۔ ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چل رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تین فرلانگ دور کوٹھی میں بھونکنے والے سینٹ برنارڈ کتوں کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ کوٹھی کی بالائی منزل کی روشنیاں بھی بہت

نیچے جھکے ہوئے ستاروں کی مانند دکھائی دیتی تھیں.......... ہم موٹر سائیکل کے پاس کھڑے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہے تھے کہ اچانک جیپ کا ہارن سنائی دیا۔ میں ایک لمحے میں پہچان گئی کہ یہ خان رحیمی کی ٹویوٹا جیپ ہے۔ ہوا کا رخ مخالف تھا اس لئے جیپ کی آواز اس وقت آئی جب وہ بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بھاگ نکلنے کا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے کاموں کے لئے پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم نے ابھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر ایک دفعہ ہم بھاگ اٹھتے تو پھر واپسی کے راستے بند ہو جاتے تھے۔ ہمارے سوچتے ہی سوچتے جیپ سر پر پہنچ گئی۔ ہم نیم پختہ راستے سے تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے تھے، تھوڑا سا اور ہٹ گئے، جیپ ہچکولے کھاتی ہمارے پاس سے گزری۔ ایک دو لمحوں کے لئے امید بندھی کی شاید وہ لوگ ہمیں دیکھے بغیر گزر جائیں.......... مگر کچھ آگے جا کر جیپ رک گئی۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ہماری موٹر سائیکل جیپ سواروں کی نظر سے اوجھل نہیں رہی تھی۔ جیپ کو رکتے دیکھ کر سلیم نے زور سے آواز دی۔

"غازی.......... غازی۔"

"غازی" جیپ کے ڈرائیور کا نام تھا۔ جیپ سے دو سائے چھلانگیں لگا کر اترے اور ہمارے طرف بڑھے۔ سلیم نے پھرتی سے جھک کر موٹر سائیکل کا پلگ والا تار کھینچ دیا۔

"کیا ہوا؟" ڈرائیور غازی نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سلیم نے جواب دیا۔ "پلگ کا تار ٹوٹ گیا تھا۔"

"ہم تو پریشان ہو رہے تھے آپ دونوں کے لئے۔" غازی نے کہا۔

اتنے میں خان رحیمی بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ حسب معمول مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کلینک سے واپس آتے ہوئے موٹرسائیکل خراب ہو گئی ہے۔ وہ بولا۔ "بوڑھی چیز کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور جب اسے جوانوں کے ساتھ چلنا پڑے تو بریک ڈاؤن تو ہو کر رہتا ہے۔" پھر اس نے غازی کو ہدایت کی کہ وہ موٹر سائیکل کو ٹھیک کر کے لے آئے۔ مجھے اور سلیم کو اس نے جیپ میں سوار کرا لیا۔ غازی کا ساتھی بھی موٹر سائیکل کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ جیپ میں اب ہم تینوں تھے۔ یعنی میں، سلیم

اور خان رحیمی۔ خان رحیمی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"میں تو فکر مند ہو گیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر ماڑی کے کلینک سے آ رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ تو چھ بجے ہی چلے گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہو گی' آئی تھنک قصور میرا ہی ہے۔ اس موٹر سائیکل کی خطا اب معاف ہو جانی چاہئے.......... میں تمہیں کل دوسری موٹر سائیکل دلوا دوں گا۔ اس موٹر سائیکل کا حال تو اس کار جیسا ہے جسے دیکھ کر کسی نے اس کے مالک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس میں تھوڑے سے پیسے ڈال کر نئی سائیکل کیوں نہیں لے لیتا۔"

میں نے کہا۔ "سر! آپ بھی اس موٹر سائیکل میں پیسے ڈال کر دینو کو سیکنڈ ہینڈ سائیکل لے دیں۔"

وہ بولا۔ "ایسا ہی کرنا پڑے گا ورنہ پھر کسی روز تم دونوں کے پیچھے بھاگوں گا۔"

میں نے کہا۔ "سر! بہت افسوس ہے آپ کو اتنی سردی میں ہمارے لئے تکلیف اٹھانا پڑی۔"

"نو فار میلیٹیز۔" اس نے انگلی اٹھائی۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں' میں تکلف کرنے والے کا سر پھاڑ دیتا ہوں.........."

خان رحیمی کے رویے سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا۔ کبھی لگتا وہ بالکل بے خبر ہے۔ کبھی لگتا کہ وہ ہم سے بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا ہے۔ میں نے کن انکھیوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کرنے والا ہے۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھولے ہوئے تھے اور آنکھوں میں تیز چمک تھی.......... اور پھر یکایک وہ سب کچھ ہو گیا جس کی توقع میں کر رہی تھی۔ سلیم نے اپنی جیکٹ کی جیب سے 38 بور کا ریوالور نکالا اور خطرناک لہجے میں بولا۔

"خان رحیمی! جیپ روک دو۔"

خان رحیمی کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے مڑ کر سلیم کی طرف دیکھا۔ جیپ خود بخود رستے سے اتر گئی۔ خان رحیمی نے بریک لگا کر اسے روک لیا۔ خان کا ہاتھ جیپ کے ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں بھرا ہوا پستول ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"سوری سر!" میرے منہ سے نکلا۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے نے ایک لمحے میں کئی رنگ بدلے۔ سلیم نے غرا کر کہا۔ "شاہدہ! ڈیش بورڈ سے ریوالور نکال لو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر خان رحیمی کی جیبوں کی تلاشی لی اور سخت لہجے میں بولا۔ "خان! جیپ کو موڑو' بائیں طرف چلو۔"

بائیں طرف ایک کچا راستہ تھا جو غالباً گورپور کی طرف جاتا تھا۔ خان نے سنبھل کر کہا۔ "بابری وٹ از گوئنگ آن' یہ کیا پاگل پن ہے!"

سلیم غرایا۔ "زیادہ بھولا مت بن خان' چالاکی دکھائے گا تو بڑھاپا خراب کر دوں گا' جیپ اسٹارٹ کر۔"

خان رحیمی نے ایک گہری سانس لی "تو میرا اندازہ درست تھا تم دونوں وہ نہیں جو ظاہر کر رہے ہو۔"

سلیم نے کہا۔ "تمہارا اندازہ درست تھا اور ہمارا بھی غلط نہیں تھا.......... تم جیپ اسٹارٹ کرو۔" اس نے ریوالور خان رحیمی کی گردن پر رکھ دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی شخص کی گردن پر پستول دیکھا اور اس نظارے نے دل پر عجیب سی ہیبت طاری کر دی۔

سلیم کی ہدایت پر خان رحیمی نے جیپ اسٹارٹ کی اور بائیں طرف جانے والے راستے پر موڑ لی ایک فرلانگ آگے جا کر اس نے جیپ پھر روک لی اور بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں آپس میں چند ضروری باتیں کر لینی چاہئیں۔ ایسا کرنے میں ہم تینوں کا فائدہ ہے۔"

"کیسی باتیں؟" سلیم نے پوچھا۔

خان رحیمی ریوالور کی نال سے قطعی خوفزدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالکل عام سے لہجے میں ریوالور کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اس باسٹرڈ کو پیچھے ہٹاؤ تو کچھ عرض کروں مجھ بوڑھے سے تم جوانوں کو خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

سلیم نے ریوالور کی نال اس کی گردن سے ہٹا لی مگر رخ خان رحیمی کی طرف ہی رکھا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "ہاں مسٹر سلیم! اب بتاؤ کیا بات ہے مجھے معلوم ہے تم غصے کے

بہت تیز ہو۔ کیوں ثناء واصف میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" ہم دونوں شدید حیرت کے عالم میں خان رحیمی کا منہ تکنے لگے۔ اس نے کہا۔ "ڈونٹ وری۔ میں تم دونوں کے بارے اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم اپنے بارے میں جانتے ہو۔ تم دونوں لاہور میں موہنی روڈ کے رہنے والے ہو۔ تمہاری پہلی ملاقات آج سے ساڑھے تین برس پہلے گورنمنٹ گرلز کالج کے سامنے ہوئی تھی۔ ہوئی تھی یا نہیں؟" ہم دونوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ بولا۔ "اب تم پوچھو گے کہ مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ اس کا جواب بہت طویل بھی ہے اور بہت مختصر بھی ہے۔ میں جس پیشے میں ہوں اس میں نہ صرف آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں بلکہ ان آنکھوں کو بہت احتیاط سے استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تم دونوں کو اس وقت پہچانا جب تم گمشدہ باز لے کر میرے پاس پہنچے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تم دونوں میں پہلے سے کوئی تعلق موجود رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق کرائی اس دوران تم دونوں مرغی خانے کے گردونواح میں گھومتے پائے گئے اور تمہارے بارے میں میرے شکوک اور پختہ ہو گئے۔ بہرحال اس وقت میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں اب تم مانو یا نہ مانو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

خان رحیمی کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور اس سے کچھ بھی چھپانا فضول ہے۔

سلیم نے کہا۔ "اگر تم بہت کچھ جانتے ہو تو ہم بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ تم بتا دو گے' دوسری صورت میں........"

"دوسری صورت میں تم مجھ کو ٹارچر کرو گے۔ مجھے مارو پیٹو گے؟" سلیم نے اثبات میں جواب دیا۔ خان رحیمی نے تمباکو کی پوٹلی نکالی اور اطمینان سے پائپ بھرنے لگا۔ وہ ہم سے بچوں جیسا برتاؤ کر رہا تھا۔ اس کا یہ انداز سلیم کو کسی بھی وقت غصے سے بے قابو کر سکتا تھا۔ میں اس صورت حال سے ڈر رہی تھی۔ خان رحیمی نے پائپ سلگا کر کہا۔

"مجھے یہاں سے لے جا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یوں سمجھو کہ تم اپنا مشن اپنے ہاتھوں سے برباد کر لو گے۔ میں اس وقت تمہیں تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا حریف سمجھ رہے ہو اور یہ بالکل غلط ہے۔"

سلیم نے بھنا کر کہا۔ "خان رحیمی یہ چکر کسی اور کو دینا فی الحال تم یہ جیپ اسٹارٹ

کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو۔"

سلیم ہر صورت خان رحیمی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ اگر خان رحیمی نے فوراً اس کی بات نہ مانی تو وہ خان کو زخمی کر دے گا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو۔ گو اب خان رحیمی کی بات پر اعتبار کرنا بہت مشکل تھا۔ میں اپنی آنکھوں سے پولٹری فارم کا تہہ خانہ دیکھ چکی تھی جہاں کروڑوں روپے کے پرندے رکھے تھے مگر خان رحیمی جو اشارہ دے رہا تھا وہ بھی قابل غور تھا۔ ہو سکتا تھا خان رحیمی بھی وہ نہ ہو جو بظاہر نظر آ رہا تھا۔ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ وہ ہمارے بارے میں تقریباً سبھی کچھ جان چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابھی تک ہم پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ہمیں جانتے بوجھتے ڈھیل دیتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں فارسٹ گارڈ جان محمد کا چہرہ بھی گھوم رہا تھا۔ اس نے عرصہ پہلے جاگیردار واصف اور خان رحیمی کے درمیان ہونے والی جس گفتگو کا ذکر کیا تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ خان رحیمی اس کاروبار کا کرتا دھرتا نہیں بلکہ ایک پرزہ ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا دل چاہا کہ خان رحیمی پر اعتبار کیا جائے۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے تعلقات چنگیزیوں سے ہیں آپ ان سے چوری چھپے ملاقاتیں کرتے ہیں اس مرغی خانے میں آپ نے کروڑوں روپے کے ناجائز پرندے رکھے ہوئے ہیں۔ ملک کے بدنام ترین لوگ آپ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ابھی پچھلے ہی دنوں مفرور ڈاکو بخشو سولنگی ایک کفن میں پرندے چھپا کر آپ کے لئے لایا ہے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا قانون شکنی یہاں ہو رہی ہے۔ آپ ایک ایسے دھندے کی نگہبانی کر رہے ہیں جو ملک کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچا رہا ہے۔"

خان رحیمی کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ مسکرایا۔ "ویل ڈن! تم دونوں نے کافی معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میں قابلیت ہے۔ میں تمہارے سوالوں کے جواب ضرور دوں گا مگر اس وقت نہیں۔ یہ ایک بہت سنگین کھیل ہے۔ تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔ اگر جلد بازی کرو گے تو سب کچھ بگڑ جائے گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو میں وہی کروں گا جو ہم سب کے لئے بہتر ہو گا۔

یہ فقرے کہتے ہوئے خان رحیمی کے چہرے پر ہردم کھیلنے والی مسکراہٹ یوں غائب ہو گئی جیسے کبھی اس کے چہرے پر آئی ہی نہیں تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بالکل بدلا ہوا انسان لگا۔ بہت گہرا۔ بہت بردباد اور تحمل مزاج۔

میں نے سلیم کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا۔ "خان صاحب! آپ اپنی باتوں سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ کا اور ہمارا راستہ ایک ہے اس کے باوجود آپ کچھ بتا بھی نہیں رہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوٹھی پہنچ کر ہم سے ناروا سلوک نہیں ہو گا؟"

خان رحیمی مسکرایا۔ "کوئی ضمانت نہیں سب سے بڑی ضمانت تمہارا اپنا اعتماد ہے۔" میں کچھ دیر خان رحیمی کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ "اوکے خان' آخر میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہم اس امید پر واپس چلتے ہیں کہ آپ بھی ہم پر اتنا اعتماد کریں گے جتنا ہم کر رہے ہیں۔"

"ضرور کروں گا.......... ضرور کروں گا۔ تم دونوں اس قابل ہو کہ تم پر اعتماد کیا جائے۔" پھر اس نے سلیم سے کہا کہ وہ اچھے بچوں کی طرح ریوالور جیب میں رکھ لے اور جیپ کا اسٹیرنگ سنبھال لے تاکہ جلد از جلد کوٹھی واپس پہنچا جا سکے........... سلیم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ریوالور جیب میں رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ خان رحیمی نے کہا۔

"اب اگر ہمارے درمیان مفاہمت ہو گئی ہے تو قیدی بھی چھوٹ جانے چاہئیں۔ میرا مطلب نورے گاڈی سے ہے.......... میں غلط تو نہیں کہہ رہا!"

"یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ۔" سلیم نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

☆------------☆------------☆

آندھی
طاہر جاوید مغل
حمیدی
2

ایک شریف زادی کی کہانی جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔ ہر صفحے پر ایک نیا ڈرامہ' ہر سطر حیرت انگیز' نان شاپ ایکشن۔ ایک خونچکاں آپ بیتی۔

آندھی

دوم

طاہر جاوید مغل

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰-عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

تین چار دن بعد کی بات ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا دیکھا تو دینو تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "آپ کو خان صاحب نے سدیا ہے اپنے کمرے میں۔"

میں نے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت خان کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا کہ خیریت تو ہے۔

وہ بولا۔ "جی خیریت کا تہانوں پتہ ہو گا مجھ کو تو جو آرڈر ہویا سی میں نے آپ کو دے دتا ہے۔"

میں اٹھ بیٹھی۔ خان رحیمی کے بلاوے پر جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لباس بدلنا پڑتا تھا۔ بال سنوارنے پڑتے تھے۔ پرفیوم لگانا ہوتا تھا۔ چہرے پر ایک مسکراہٹ لانا پڑتی تھی۔ وقت کوئی بھی ہو۔ موڈ کیسا بھی ہو یہ اس کے سامنے جانے کی لازمی شرائط تھیں۔ دینو عجیب چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس کی نظریں دیکھ کر مجھے خوامخواہ غصہ آنے لگا۔ میں نے اسے جھڑک کر واپس بھیج دیا۔ منہ ہاتھ دھو کر لباس بدلا۔ بال سنوارتے ہوئے ذہن میں عجیب سے خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ اس کوٹھی میں مجھے ڈھائی تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ خان نے مجھے رات نو بجے کے بعد بلایا تھا۔ میرے تصور میں خان رحیمی کے متعلق وہ تمام باتیں آنے لگیں جو میں نے لوگوں سے سنی تھیں اور جن میں اس کے عجیب و غریب کردار کا ذکر تھا۔ عورتوں میں خان رحیمی کی دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت شوقیہ اس وقت بھی کوٹھی میں موجود تھی۔ وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی اور میں نے اکثر بے وقت اسے

خان رحیمی کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا اور آج ایک "بے وقت بلاوا" مجھے بھی آ گیا تھا۔ تیار ہو کر میں خان رحیمی کے کمرے میں پہنچی۔ دستک دی اندر سے اس نے کہا آ جاؤ۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ وہ حسب معمول بے تکلفی سے بستر پر نیم دراز تھا۔ پورے کمرے میں پائپ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں خاموش بیٹھا ہوا وہ کچھ پراسرار سا لگتا تھا۔ اس کے سرہانے ایک ریکارڈ پلیئر رکھا تھا۔ ریکارڈ پلیئر پر ایک قدیم انگلش گانا بج رہا تھا۔ یقیناً یہ میری پیدائش سے بھی پچیس تیس برس پہلے کا گانا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" خان رحیمی نے عجیب سے انداز میں کہا میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد ایک طویل اور گہری سانس لے کر وہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ لگا کر بند کر دیا۔ کھڑکیوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں اور پردے برابر کر دیئے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ خان رحیمی نے تمام بتیاں بجھا کر صرف ایک چھوٹا نیلگوں بلب جلتا رہنے دیا۔ ایک الماری کھول کر بوتل اور گلاس نکالا اور میرے سامنے بیٹھ کر پینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں فروزاں آگ میں صاف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے بوڑھے چہرے سے الگ نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا وہ کسی جوان شخص کی آنکھیں ہوں۔

خان رحیمی نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس سے کھیلتے ہوئے بولا۔ "گرل مجھے معاف کرنا میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ میری مجبوری ہے۔ ایک دلچسپ نفسیاتی مرض ہے۔ میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں لیکن معلوم نہیں تم سمجھ سکو گی یا نہیں۔"

"جی فرمایئے!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے پائپ کے کئی گہرے کش لئے اور فلسفیوں کی طرح چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ "کوئی گناہ انسان کی دسترس میں ہو۔ وہ اسے کر سکتا ہو لیکن نہ کرے تو کیا ہوتا ہے؟ انسان کے اندر ایک قوت پیدا ہوتی ہے۔ ہم اسے پارسائی کی قوت بھی کہہ سکتے ہیں۔ پارسائی کی یہ قوت قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ خود پر عذاب جھیلنے سے ملتی ہے۔ شاید تم اس خوشی کو محسوس نہ کر سکو جو مجھے اس وقت حاصل ہے۔ تم میرے سامنے ہو۔ یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے پوری دنیا محو خواب ہے۔ میرے بازوؤں میں نشے کی طاقت ہے اور میرے ہاتھوں میں ریوالور۔ میں تم پر پوری

طرح حاوی ہوں لیکن میں تم سے اتنا ہی دور رہوں گا جتنا اب ہوں۔ میں تم سے کچھ حاصل نہیں کروں گا سوائے اس روحانی قوت کے جو مجھے محبوب ہے۔ لوگ مجھے عورتوں کا رسیا سمجھتے ہیں اور میری عمر دیکھ کر مجھ پر انگلیاں اٹھاتے ہیں لیکن شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ پچھلے چالیس سال سے کوئی عورت میری زندگی میں نہیں آئی۔ از اٹ ناٹ سرپرائزنگ؟ پتہ نہیں تم میری باتوں کو سمجھ رہی ہو یا نہیں اور پتہ نہیں روحانی قوت حاصل کرنے کا یہ طریقہ بھی درست ہے یا نہیں مگر اب اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتا۔"

میں نے کہا۔ "سر! میں آپ کے اس طریقے سے اتفاق نہیں کر سکتی یہ تو ایسا ہے کہ کوئی شخص پہلے کسی غریب کی چوری کرے اور پھر مسروقہ مال لوٹا کر خدا ترسی اور سخاوت کا ڈھنڈورا پیٹے۔ روحانی قوت حاصل کرنے کے لئے بہت اعلیٰ و ارفع طریقے بھی ہیں اور کچھ نہیں تو........."

"شاپ اِٹ شاپ اِٹ۔" اس نے مسکرا کر میری بات کاٹی۔ "تقریر نہیں چاہئے بہت تقریریں سنتا رہا ہوں میں۔ ہر لڑکی مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے خوبصورت ہونٹوں سے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرو کچھ دلچسپ واقعات کچھ ہنسی مذاق کے قصے تاکہ یہ شب آسانی سے کٹ سکے۔"

میں اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عجیب خبطی سے پالا پڑا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کس بات پر یقین کیا جائے اور کسے "خبط" سمجھا جائے۔ مے نوشی کے باوجود وہ مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ چوکنا نظر آتا تھا۔ میں نے کہا۔

"خان صاحب آپ نے کہا تھا میں کوٹھی پہنچ کر تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔ مگر ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

اسے جھٹکا سا لگا۔ سنبھل کر بولا۔ "ڈیئر گرل۔ میں نے ہلکی پھلکی باتوں کا کہا تھا۔ تم نے تو میرے سر پر پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ ڈیئر یہ ذکر ابھی مناسب نہیں۔"

"پھر کب مناسب ہو گا؟"

"ایک مہینے تک........ مجھے معلوم ہے تمہیں وہ پرندے بے چین کر رہے ہیں جنہیں تم دیکھ چکی ہو۔ ان پرندوں کو فی الحال تربیت دی جا رہی ہے۔ ایک ماہ بعد انہیں

اس مرغی خانے سے لاہور پہنچایا جانا ہے۔ اس وقت تک نہ مجھے کچھ معلوم ہے نہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔"

"کوئی اشارہ تو دے سکتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "ان پرندوں کو ملک سے باہر بھیجا جا رہا ہے اور اس سمگلنگ میں ایک اہم سرکاری کارندہ ملوث ہے۔ اس شخص کی نقاب کشائی تک یہ سازش مکمل طور پر اندھیرے میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "سر مکمل طور پر تو اندھیرے میں نہیں ہے مگر آپ بتانا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے واصف کے بعد اس سازش کا مرکزی کردار وہاب چنگیزی ہے اور وہاب چنگیزی دو تین ہفتوں تک الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ الیکشن سے پہلے یہ منصوبہ بے نقاب ہو جائے!"

خان رحیمی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "دیکھو گرل! تم عربی بدو کے اونٹ کی طرح گھستی آ رہی ہو۔ مجھ پر بھروسا کیا ہے تو اب بھروسا رکھو۔ تم وہاب چنگیزی سے اپنے بچے کا انتقام لینا چاہتی ہو۔ یہ کوئی معمولی خواہش نہیں ہے اس کے لئے بے پناہ صبر و تحمل اور دانشمندی کی ضرورت ہے۔ منزل تم سے زیادہ دور نہیں مگر تمہاری کوئی غلطی تمہارے مجرم کو ہمیشہ کے لئے تمہاری نظروں سے اوجھل کر سکتی ہے۔" خان رحیمی کا لہجہ ڈرامائی تھا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

خان رحیمی اور میں دیر تک باتوں میں مصروف رہے۔ آخر چار بجے کے قریب خان کو اونگھ آنے لگی۔ اس نے ایک آخری جام چڑھایا اور مجھ سے معافی مانگتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں کمرے سے باہر نکلی تو پچھلے پہر کی خنک ہوا چل رہی تھی کمرے سے نکلتے ہوئے خود پر شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ آخر خان رحیمی کو کیا حق پہنچتا تھا پارسائی کا فخر حاصل کرنے کے لئے کسی کی نیک نامی کو داؤ پر لگانے کا۔ اس کا رویہ ہر طرح قابل مذمت تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ دفعتاً مجھے رکنا پڑا۔ عشرت کے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی رات کے پچھلے پہر یہ روشنی ناقابل فہم تھی۔ کیا وہ اب تک جاگ رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں اس کمرے کی طرف بڑھی۔ کھڑکیوں پر احتیاط سے پردے کھنچے تھے۔ میں نے پنجوں کے بل بیٹھ کر کی ہول سے آنکھ

لگائی۔ مسہری کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا مگر لگتا تھا کمرے میں کوئی نہیں۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دروازہ دھکیلا وہ بھی اندر سے بند تھا۔ اچانک مجھے غسل خانے کا خیال آیا۔ یہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ ملحق تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی کھڑکی پورچ کی طرف کھلتی تھی۔ میں دبے پاؤں پورچ کی طرف بڑھی۔ سب کچھ تیرگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھڑکی بلندی پر تھی۔ میں نے لان سے لوہے کی ایک کرسی اٹھائی اور اس پر پاؤں رکھ کر کھڑکی میں جھانکا۔ اس کے پٹ تھوڑے سے کھلے تھے اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا عشرت ایک موٹی گوری سی عورت کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس عورت کا نام کلثوم تھا اور وہ چند روز پہلے ہی کوٹھی میں ملازم ہوئی تھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس عورت نے عشرت کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور دانت پیس کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گئی کلموہی؟ سچ سچ بتا دے ورنہ وہ تیرا خصم سالار ایک بال نہیں چھوڑے گا تیرے سر پر۔"

عشرت اپنے بال چھڑاتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔ "خانم اللہ دی قسمے جھوٹ نہیں بول رہی۔ میرا بابری سے کیا تعلق؟"

کلثوم نے آنکھیں نکالیں۔ "اگر کوئی کیڑا ہے بھی تو اسے دماغ سے نکال دے اور جو کام تجھے کہا گیا ہے وہ کر۔ ابھی تک تیرا ایک ٹکے کا فائدہ نہیں ہوا ہے ہمیں۔ یہ خان رحیمی بڑی موٹی آسامی ہے اور ویسے بھی کسی بڑے گہرے چکر میں ہے۔ اچھی طرح ٹوہ لگا۔"

عشرت نے گردن سہلاتے ہوئے کہا "اچھا خانم' کہا تو ہے کہ کوشش کر رہی ہوں۔"

کلثوم یا خانم غرا کر بولی۔ "صرف کوشش سے کام نہیں چلے گا۔ وہ سالار بڑا غصے میں تھا کہتا تھا وہاں جا کر اپنے عیش و عشرت میں پڑ گئی ہے یہ دیکھ اس نے یہ لفافہ بھی مجھے دیا ہے۔ کہتا تھا اسے جا کر دکھانا تاکہ اسے اپنی اوقات یاد آئے۔"

گلابی رنگ کا لفافہ دیکھ کر عشرت کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا کر بولی۔

"نہیں........... نہیں اس کی ضرورت نہیں اسے دور رکھو مجھ سے۔"

کلثوم کے چہرے پر فتح مندی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے لفافہ دوبارہ لباس میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کمرے میں چلی گئیں۔ میں جلدی سے نیچے اتری اور کرسی لان میں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتی رہی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا معاملہ ہے۔ کلثوم نامی وہ عورت خوبصورت تو تھی مگر چہرے مہرے سے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اب یہ بات کھل گئی تھی کہ اس کا تعلق شریف گھرانے سے نہیں۔ اس نے عشرت سے جو باتیں کی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ عشرت کو یہاں کسی خاص مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے۔ اور اسے بھیجنے والے "اس بازار" کے لوگ ہیں.......... یہ بھی ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے پاس عشرت کی کوئی کمزوری ہے اور اس کمزوری کے سبب عشرت ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔ مجھے وہ لفافہ یاد آیا جو کلثوم نے عشرت کو دکھایا تھا اور جسے دیکھ کر عشرت بری طرح دہل گئی تھی۔ رہ رہ کر عشرت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور میں سوچنے لگی کہ اس لڑکی کی صورت میری بڑی بھابی سے اس قدر ملتی کیوں ہے اور اگر اس لڑکی میں اور میری بھابی میں کوئی تعلق ہے تو یہ تعلق ہمارے شریف گھرانے کے لئے کس قدر مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں اس بارے میں زیادہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ ایسا کرتے ہوئے میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔

کلثوم نامی اس نئی ملازمہ کا سامان سرونٹ کوارٹرز کے اسٹور میں پڑا تھا۔ اگلے روز میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے سامان کی تلاشی لوں۔ اس کام کے لئے میں نے دوپہر بارہ بجے کا انتخاب کیا۔ بارہ بجے کوٹھی کے زیادہ تر ملازمین مصروف ہوتے تھے۔ میں نے کلثوم کو برتن مانجھنے پر لگا دیا اور خود موقعہ دیکھ کر سامان والی کوٹھڑی میں گھس گئی۔ کلثوم کے سامان میں سے اہم ترین چیز ایک جستی ٹرنک تھا جس میں دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تالے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی ہیئر پن سے ان تالوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک تو کھل گیا تاہم دوسرا مجھے توڑنا پڑا۔ ٹرنک میں کلثوم کے کپڑے تھے ایک برقعہ تھا' ایک پرانی چپل تھی جو موٹی لفافے میں بند پڑی تھی۔ وہ خاص لفافہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک ایک کپڑے کی تہیں کھولنی شروع کیں۔ آخر ایک گرم چادر کے اندر سے گلابی لفافہ پھسل کر فرش پر جا گرا۔ میں نے لفافے پر نگاہ ڈالی اور سرتاپا لرز

گئی۔ اس کے اندر کارڈ سائز کی کئی رنگین تصاویر نکل کر فرش پر پھسل گئی تھیں۔ ان تصویروں میں عشرت ایک مرد کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے ان تصویروں کو دوبارہ لفافے میں رکھا اور لفافے کو تہہ شدہ گرم چادر میں رکھ کر صندوق کو بند کر دیا۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ میں واپس اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ان تصویروں میں سے ایک تصویر میں مجھے بڑے بھائی جان کی ساس نظر آئی تھی۔ وہ بدحال اور مدہوش عشرت کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہی خوف جما ہوا تھا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے دماغ میں یہ سوال آہنی میخ کی طرح گڑ گیا۔ میری بڑی بھابی کی تو کوئی بہن ہی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی انہوں نے ذکر کیا تھا پھر یہ لڑکی کون تھی۔ تصویروں سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ عشرت میری بھابی کی بہن ہے یا کوئی بہت قریبی عزیز ہے۔ گمان غالب یہی تھا کہ وہ بھابی کی بہن ہے۔ بھابی کی بہن اور بدنام گھرانے سے تعلق اور یہ خوفناک تصویریں؟ خدا معلوم یہ کیا چکر تھا۔ میرے تصور میں بڑے بھائی جان کا چہرہ آیا۔ کس قدر شریف النفس تھے۔ وہ کتنے خاموش طبع۔ بھابی اور بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ بمعہ اہل و عیال دو دفعہ عمرے پر جا چکے تھے۔ خدانخواستہ انہیں یہ سب کچھ معلوم ہو جاتا تو ان کے دل پر کیا بیتتی۔ بھابی کے بارے کیا کیا بدگمانیاں ان کے دل میں نہ آتیں۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں' میں نے عشرت سے اس کی کسی ہم شکل بہن کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کی کوئی بہن ہے۔ اب اس کے اقرار کے بغیر ہی یہ بات ثابت ہو چکی تھی۔ میں شام تک اس بارے میں سوچتی رہی اور پھر عشرت کے پاس پہنچی میں نے اس سلسلے میں اسے پھر کریدنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی بات بتا کر نہیں دی۔ میں کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی اس میں کئی خطرات پوشیدہ تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ میں اس کو اعتماد میں لوں۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں بھابی کو مطلع کرنا چاہئے۔ عشرت جن لوگوں کے چنگل میں تھی وہ اسے کہیں سے کہیں پہنچا سکتے تھے۔ عشرت کی بدنامی بھائی جان کے سسرال کی بدنامی تھی بلکہ ہمارے پورے گھرانے کی بدنامی تھی۔ بھابی کو مطلع کرنے کے لئے مجھے لاہور جانا پڑتا تھا۔ میں ایک مفرور ملزمہ تھی لیکن

ایک عورت ہونے کی حیثیت سے میرے لئے سفر دشوار نہیں تھا۔ برقعہ پہن کر میں کہیں بھی جا سکتی تھی۔

تیسرے روز کی بات ہے دن کے دو بجے تھے میں رکشے میں سوار موہنی روڈ پہنچی۔

میں نے سیاہ ریشمی برقعہ پہن رکھا تھا نقاب کے پیچھے سے میری آنکھیں جانے پہچانے درودیوار کو دیکھ رہی تھیں' شناسا گلیاں اور شناسا چہرے۔ کبھی میں بھی ان چہروں میں شامل تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ چلتی تھی۔ پوری آزادی اور بے فکری کے ساتھ۔ ہر طرف یادوں کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ میں نے رکشہ اپنے گھر سے چالیس پچاس گز دور ایک گلی کے ناکے پر روک لیا۔ سفر شروع کرنے سے پہلے ہی رکشے والے کو دو سو روپے کے نوٹ تھما چکی تھی لہٰذا اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ میں کہاں جاتی ہوں' کہاں رکتی ہوں اور کیا کرتی ہوں۔ معلوم نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا اور ظاہر تھا برا ہی سوچ رہا ہو گا۔ رکشے میں سوار ہوتے ہی میں اس کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہر چکی تھی۔ عام گھریلو عورتیں یوں رکشے والوں کی مٹھی گرم نہیں کرتیں۔ میں نے رکشے والے سے کہا مجھے کسی کا انتظار ہے میں کچھ دیر اندر ہی بیٹھوں گی۔ وہ چاہے تو ادھر ادھر گھوم پھر سکتا ہے۔

گلی کا یہ حصہ زیادہ بارونق نہیں تھا اور مجھے رکشے میں دیکھ کر کوئی یہی سمجھتا کہ کسی قریبی گھر سے مجھے کسی کا انتظار ہے۔ میں رکشے میں بیٹھ رہی اور میری پیاسی نگاہیں اپنے سلیٹی گیٹ کو تکتی رہیں۔ مجھے معلوم تھا شعیب' عارف' سلیمان اور پنکی اسکول سے آ چکے ہوں گے۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد وہ حسب عادت کھیل کود کے لئے گلی میں نکل آئیں گے اگر بڑی بھابی نے ان پر بہت زیادہ آنکھیں نکالیں اور کھینچ تان کر انہیں تھوڑی دیر سونے کے لئے لٹا دیا تو بھی شعیب تو ضرور باہر نکلے گا۔ وہ تو کسی کے قابو میں نہیں آیا کرتا تھا گرمیوں کی طویل دوپہروں میں میں اسے اپنے ساتھ لٹا کر تھپکتی رہتی تھی وہ دم سادھے پڑا رہتا تھا۔ جونہی میری آنکھ لگتی تھی وہ اٹھ کر بھاگ جاتا تھا۔ پھر میں نے اپنا پراندہ اس کے بازو کے ساتھ باندھنا شروع کر دیا۔ ایک دوپہر اس نے میرا پراندہ قینچی سے کاٹ لیا۔ شام کو بھائی جان سے اسے مار پڑی وہ روتا ہوا میری گود میں آ گیا۔ مصیبت میں اسے صرف میں ہی یاد آیا کرتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات مجھے جتانے آیا کرتا تھا۔ ایک پہر

میرے بنا رہنا اسے دشوار تھا۔ اب نہ جانے کس کی گود میں چھپتا تھا' کسے اپنا دکھڑا بتاتا تھا۔ میری شکل دیکھے ہوئے تو اسے مہینوں بیت گئے تھے.......... مجھے گھر کے کسی فرد کی شکل دیکھنے کے لئے کافی انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر کوئی آدھ گھنٹے بعد مجھے شعیب اور پنکی نظر آئے۔ پنکی تو دروازے کے پاس سے ہو کر واپس چلی گئی مگر پانچ سالہ شعیب حسب عادت اپنا ہاتھ باؤلنگ کے انداز میں گھماتا ہوا رکشے کی طرف بڑھا۔ اس نے میرے ہی ہاتھ کی سی ہوئی پینٹ قمیض پہن رکھی تھی اور بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ بازار جا رہا ہے۔ جب وہ رکشے کے پاس سے گزرا تو میں نے آواز دی۔

شعیب بات سنو۔"

وہ چونک کر رکشے میں دیکھنے لگا۔ میں نے نقاب ہٹا کر اسے چہرہ دکھایا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں حیرت کا سمندر نظر آیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے گا۔ مگر پھر وہ میری طرف کھچا چلا آیا۔ "پھوپھو جی آپ؟" اس کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔ میں نے بازو پکڑ کر اسے رکشے میں سوار کرا لیا۔ وہ میرے ساتھ لپٹ گیا۔

میں اس کا منہ چومنے لگی۔ دل بھر آیا بہت دیر میں اسے پیار کرتی رہی۔ پھر پرس سے نکال کر اس کی پسندیدہ سویٹس کھانے کو دیں۔ وہ مجھے کھینچنے لگا کہ میں اس کے گھر چلوں۔ اس بیچارے کو میری مجبوریوں کا کیا پتہ تھا۔ میں نے پوچھا گھر میں کون کون ہے۔ اس نے اپنی امی چاچی' چاچی کی والدہ اور دیگر بہن بھائیوں کا ذکر کیا۔ میں نے پہلے سے لکھا ہوا ایک رقعہ شعیب کو دیا اور اسے کہا کہ امی کو جا کر دے دے۔ میں نے لکھا تھا۔ "بھابی جان' میں جانتی ہوں اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کیلئے بند ہو چکے ہیں میں یہ دہلیز پار کر کے بھائی جان کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔ مگر ایک ایسی مجبوری ہے جس کے سبب میرا آپ سے ملنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ میں آپ سے صرف آدھ پون گھنٹے کا وقت چاہتی ہوں۔ باہر سواری میں بیٹھی میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ جس طرح بھی مناسب سمجھیں مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔ والسلام"

شعیب کے ہاتھ رقعہ بھیج کر میں ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا نہ شعیب باہر آیا اور نہ گھر کا کوئی اور فرد۔ ایک گھنٹہ اس طرح گزر گیا۔ اس دوران

صرف یہ ہوا کہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی چند بار کھلی اور بند ہوئی۔ میں سخت بے قراری میں گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بھائی جان کے ہسپتال سے آنے میں اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی آمد سے قبل بھابی سے گفتگو کرلوں۔ آخر مجبور ہو کر میں رکشے سے نکلی اور اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دھڑکتے دل سے میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹا دروازہ کھلا دروازہ کھولنے والی بھابی ہی تھی۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا اور نہایت بیگانگی سے بولیں۔

"کیا بات ہے۔ کیا لینے آئی ہو یہاں؟"

میں نے کہا "پلیز بھابی صرف آپ کی خاطر آئی ہوں آپ کے بھلے کی بات ہے۔"

وہ بولیں "ہمیں نہیں چاہیئے ایسا بھلا۔ پچھلی بار تو نے گھر میں قدم رکھا تھا تو پورا ہفتہ پولیس نے تیرے بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس دفعہ تو وہ جیل ہی پہنچ کر رہیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی بھابی نے نہایت نفرت اور غصے سے دروازہ میرے منہ پر بند کر دیا۔ میں سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔ حلق میں جیسے کانٹے اتر رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی گر جاؤں گی، ہمت کرکے میں نے کہا "بھابی خدا کیلئے......... تمہارے فائدے کی بات ہے۔" دروازے کی دوسری طرف سے بھابی نے کہا۔

"میں کہتی ہوں چلی جا۔ ورنہ خود بھی بے عزت ہوگی، ہمیں بھی کروائے گی" اس کے ساتھ ہی وہ دروازے سے دور چلی گئیں۔ اب کچھ کہنے سننے کو باقی نہیں رہا تھا۔ میں آہیں بھرتی ہوئی واپس رکشے میں آبیٹھی۔ دل پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ کاش میں رو ہی سکتی۔ آنسو خشک ہونے کا محاورہ بہت دفعہ سنا تھا مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب میرے آنسو سچ مچ خشک ہو جائیں گے اور میں رونے کو ترسوں گی......... میں نے رکشے والے کو اخبار کے دفتر چلنے کو کہا۔ یہ وہی اخبار تھا جس میں فرخندہ ان دنوں کام کر رہی تھی۔ رکشہ اس بلند و بالا دفتر کے سامنے رکا تو میں نے استقبالیہ کمرے سے فرخندہ کے شعبے میں فون کیا۔ اس سے بات ہوگئی میری آواز سن کر وہ فون پر تقریباً چیخ پڑی۔ گلوگیر لہجے میں بولی، میں آ رہی ہوں۔ صرف ایک منٹ رکو میں پہنچ رہی ہوں۔ پھر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ تیسری منزل سے گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔ میں نے اسے بتایا

تھا کہ میں رکشے میں بیٹھی ہوں۔ دفتر سے باہر آکر اس نے تیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رکشہ پہچان کر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ جونہی وہ رکشے میں بیٹھی میں نے ڈرائیور کو چلنے کو کہا۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں نے رکشے والے کو باغ جناح چلنے کی ہدایت کی۔ وہ ہمیں گنگارام ہسپتال کے سامنے سے گزار کر اس دروازے پر لے آیا جہاں سٹیج ڈراموں کے بورڈ وغیرہ آویزاں ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر میں نے رکشے کو فارغ کر دیا۔

باغ جناح کے ایک پرسکون کونے میں بیٹھ کر فرخندہ نے میرا ہاتھ کتنی دیر ہونٹوں سے لگائے رکھا۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کی پشت کو بھگو رہے تھے۔ یہ آنسو سب کچھ کہہ رہے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے۔ ان آنسوؤں کے ہوتے ہوئے زبان کو حرکت دینا بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بمشکل اسے چپ کرایا وہ بولی۔

"آج تو میں خدا سے کچھ بھی مانگتی مجھے مل جاتا۔ آج میں نے جتنی شدت سے تمہیں یاد کیا ہے۔ زندگی میں کسی کو نہیں کیا۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟ خیریت تھی؟"

وہ بولی "خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ ایک بہت اہم رپورٹ ہے تمہارے لئے۔ میں نے پچھلے مہینوں میں جو بھاگ دوڑ کی ہے اس کا صلہ اب ملا ہے ہمیں۔ یوں سمجھ لے تیرے دشمن کی گردن ناپ لی ہے میں نے" وہ خاصی پرجوش نظر آ رہی تھی۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولی "یوں نہیں، تھوڑا صبر کرنا پڑے گا تمہیں کہاں ٹھہری ہوئی ہو تم؟" میں نے بتایا کہ ابھی تو کہیں بھی نہیں بس اڈے پر اتری تھی وہاں سے رکشہ لیا راستے میں تھوڑی سی شاپنگ کی پھر گھر گئی اور گھر سے اس کے پاس آگئی ہوں۔ چٹکی بجاتے ہوئے بولی "تو چلو اٹھو......... فوراً اٹھو پہلے تمہاری رہائش کا بندوبست کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "لیکن کہاں؟"

وہ بولی "ہوٹل میں۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "ہوٹل میں اکیلی رہوں گی؟"

اس نے کہا "ہوٹل نہیں......... اسے گھر ہی سمجھو۔ بڑی اچھی انتظامیہ ہے اس کی۔"

اس کے لہجے پر میں چونک سی گئی میں نے کہا "خیریت ہے؟ بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں انتظامیہ کی۔ کس کا ہوٹل ہے یہ؟"

وہ زیر لب مسکرائی "ہے ایک فضول سا آدمی۔ امریکہ سے ہوٹلنگ میں ڈپلومہ لے کر آیا ہے۔ امی کہتی ہے کہ ہمارا دور کا رشتے دار بھی ہے ویسے مجھے تو یقین نہیں آتا.........."

میں نے آنکھیں پھاڑیں "اچھا...... اچھا تو یہ بات ہے۔ میں بھی کہوں یہ ہوٹل کا ذکر کرتے ہی چہرے پر لالیاں کیوں دہکنے لگی ہیں۔ فرخندہ کی بچی' سچ سچ بتا یہ کیا معاملہ ہے؟"

اس نے سر جھٹک کر خوبصورت بال پیشانی سے ہٹائے "معاملہ شاملہ کچھ نہیں ہے ڈیئر۔ بس........ حضرت لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے میرا بیڑا غرق کر کے ہی چھوڑیں گے۔ اچھی بھلی نوکری کر رہی تھی یہ نوکری رات دن ان کی آنکھ میں کھٹک رہی ہے۔ شاید انہوں نے مقصد بنا رکھا ہے کہ جرنلزم کو ایک محنتی اور بلند پایہ جرنلسٹ سے محروم کر کے چھوڑنا ہے چاہے اس کی خاطر مجھ جیسی اونگی بونگی سے بیاہ رچانا پڑے۔ اور تو اور امی بھی اس سازش میں برابر کی شریک ہیں۔"

میں نے کہا "اور مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی اس سازش میں "برابر" کی شریک ہو۔"

وہ بولی "توبہ ہے ادھر تو برا حال ہو رہا ہے اپنے کیریئر کی تباہی کا سوچ کر.........."

اتنے میں گارڈن میں گھومنے والے کچھ آوارہ لڑکے ہمارے ارد گرد منڈلانے لگے۔ فرخندہ نے کہا "چلو اٹھو' باقی باتیں کمرے میں بیٹھ کر ہوں گی" ہم دونوں گارڈن سے باہر آئیں اور رکشے میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ایک فیشن ایبل علاقے میں یہ ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تین منزلہ عمارت تھی۔ ہر جگہ نفاست اور سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔ فرخندہ کو دیکھ کر ملازمین نے جھک کر سلام کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ یہاں آتی رہتی ہے۔ مجھے لے کر سیدھی مینجر کے کمرے میں چلی گئی۔ مینجر نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں دو منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک دراز قد وجیہہ شخص تھری پیس سوٹ پہنے

اندر داخل ہوا۔ فرخندہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہی فرخندہ کا منگیتر ہے۔ راستے میں فرخندہ مجھے بتا چکی تھی کہ عابد کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

"ہیلو فرخندہ" عابد نے چہک کر کہا "بھئی آنا تھا تو مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں بالکل۔"

فرخندہ نے کہا "آپ کو اطلاع دینے سے کیا فائدہ ہوتا یہی ہوتا ناکہ آپ حیران نہ ہوتے۔ کیا بگڑ گیا ہے آپ کا تھوڑا سا حیران ہو کر۔"

عابد نے کہا "میرا مطلب ہے......... ہم تھوڑا سا انتظار کر لیتے آپ کا۔ انتظار کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔"

فرخندہ بولی "اگر ایسا ہے تو میں آپ کے لطف اندوز ہونے کا پکا پکا انتظام کر دوں گی........ ویسے جناب' مجھے آپ کی طرح قدموں تلے انتظار کا سرخ کارپٹ بچھوانے کا شوق نہیں۔"

فرخندہ کے لہجے میں کاٹ تھی۔ غالباً ان دونوں میں کوئی چھوٹی موٹی ناراضگی چل رہی تھی۔ عابد نے بے تکلفی سے کہا۔ "ملکہ عالیہ اب اس بندۂ عاجز کو مزید شرمندہ نہ کریں۔ میں تو پہلے ہی آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں........ بے حد ضروری میٹنگ تھی ورنہ میں سارے رسے تڑا کر آپ کی سہیلی کی سالگرہ میں پہنچ جاتا۔ اب میری سزا یہ ہے کہ میں ایک مہینے تک روزانہ کم از کم ایک چکر آپ کی سہیلی کے گھر ضرور لگاؤں گا اور اگر فرمائیں گی تو ہر روز ایک تحفہ بھی........."

"فضولیات نہیں چاہئیں مجھے" فرخندہ نے اس کی بات کاٹی۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی "یہ میری عزیز ترین سہیلی ہیں۔ دو تین روز آپ کے ہوٹل میں رہیں گی۔"

عابد نے گڑبڑا کر کہا "معاف کیجئے۔ ہم اپنی باتوں میں آپ کو بالکل بھول ہی گئے ویری سوری" عابد کے لہجے میں شائستگی تھی اور طور اطوار سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد مہذب شخص ہے۔ اتنے میں مینجر نے اندر آکر اطلاع دی کہ مس فرخندہ کیلئے اخبار کے دفتر سے فون ہے۔ عابد بولا

"لیجئے ایڈیٹر صاحب! آپ کی جدائی میں پریشان ہو گئے ہیں" فرخندہ اسے پیار بھری

ناراضگی سے گھورتی ہوئی باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آکر بتایا کہ اسے فوری طور پر دفتر پہنچنا ہے۔ اس نے عابد کو میرے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی....... عابد نے فرخندہ کا فرمانبردار منگیتر ہونے کے "ٹھوس ثبوت" فراہم کئے اور میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے سوٹ کے بالکل سامنے میرے لئے دو کمروں کا ایک سوٹ مخصوص کر دیا اور سپیشل طور پر کلرڈ ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کی سہولت فراہم کی۔ وہ کمپنی دینے کے لئے کافی دیر میرے پاس رہا اور باتیں کرتا رہا۔ وہ ایک دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی باتوں سے فرخندہ کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ وہ کچھ ہی ماہ پہلے امریکہ سے واپس آیا تھا۔ اسے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا میرے بارے میں بھی اس کی معلومات محدود تھیں۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ میں اور فرخندہ گہری سہیلیاں ہیں۔ فرخندہ نے اسے میرے بارے میں بتا رکھا تھا کہ میں اب لاہور میں نہیں رہتی۔ رات قریباً ساڑھے آٹھ بجے فرخندہ کا فون آیا اس وقت میں کمرے میں تنہا تھی۔ فرخندہ کسی میڈیکل سٹور سے بول رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"بہت افسوس ہے تمہیں تنہا چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہوں۔ بہت ضروری کام تھا اب بھی اس میں پھنسی ہوئی ہوں ایک دو گھنٹے میں نبٹا لوں گی صبح کا ناشتہ ہم اکٹھے ہی کریں گے۔"

میں نے کہا "عابد ٹھیک ہی کہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دو' ورنہ وہ بھی تمہیں صبح کے ناشتے پر ہی دیکھا کرے گا۔"

وہ ہنس کر بولی "سب ہی صبح کو دیکھتے ہیں۔ رات کو اندھیرے میں اٹھ اٹھ کر کون دیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری فقرے بازی کی عادت کبھی نہیں جائے گی۔"

"وہ بولی "یہ عادت تو اور بھی بگڑ چکی ہے لیکن ان دنوں میں بے حد سنجیدہ ہوں شاا....... صبح تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گی۔"

اس گفتگو کے کچھ ہی دیر بعد میں سو گئی۔ رات کے پچھلے پہر ایک پر شور دستک سے میری آنکھ کھلی کمرے کی بتی جل رہی تھی میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا کون ہے دوسری طرف سے مینجر افتخار کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ مینجر کافی گھبرایا ہوا

تھا۔ جلدی سے اندر آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں یہ دیکھ کر میرا دل دہل گیا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس نے کہا "مس فرخندہ کو کسی نے گولی مار دی ہے۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچائی گئی ہیں۔ عابد صاحب بھی ہسپتال گئے ہیں۔ جاتے جاتے وہ سختی سے ہدایت کر گئے ہیں کہ آپ کمرے سے باہر نہ نکلیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ صرف میری یا عابد صاحب کی دستک پر دروازہ کھولیں" یہ کہتے ہوئے مینجر افتخار جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں پتھر کی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ کیسی خبر تھی جو میرے کانوں نے سنی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ مینجر نے ایک بار پھر دروازے سے منہ نکال کر کہا "مس پلیز' دروازہ بند کر لیں" میں نے ہاتھ بڑھا کر چابی گھما دی اور بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ لب آپوں آپ حرکت میں آگئے اور دل سے فرخندہ کی زندگی کیلئے دعائیں نکلنے لگیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد عابد کا فون آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ فرخندہ کی حالت ٹھیک نہیں اسے آپریشن تھیٹر پہنچایا جا رہا ہے اس نے مجھے تاکید کی کچھ بھی ہو جائے میں ہوٹل سے باہر نہ نکلوں۔ وہ کوئی اہم بات مجھ سے چھپا رہا تھا۔ میں ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی اور فون بند ہو گیا۔ قریباً آدھ گھنٹہ میں نے سخت کرب کے عالم میں گزارا۔ آخر عابد کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ فرخندہ مر گئی ہے۔ وہ فون پر ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فرخندہ مر گئی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا ایک حصہ مردہ ہو کر میرے ہاتھ میں جھول گیا ہے۔ ہر دم بولنے والی اور کبھی نہ تھکنے والی فرخندہ خاموش ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہنستا مسکراتا' شرارتیں کرتا' اور خواب دیکھتا' کانٹے چنتا اور پھول بکھیرتا ہوا ایک عہد بھی مر کر ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ آہ فرخندہ میں تجھے اب کہاں ڈھونڈوں گی۔ زندگی کے تپتے صحرا میں ایک شجر سایہ دار تھا وہ بھی نہ رہا۔ اب ہانپ کر کس دیوار کے سائے میں بیٹھوں گی۔ کون مجھے گلے لگائے گا۔ میرے ہاتھ کو چومے گا اور آنسو بہائے گا۔ کون میرے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دے گا اور میرے لئے راتیں جاگے گا۔ میں سوچتی رہی۔ دل میں درد جگاتی رہی کہ شاید اس طرح میری آنکھوں میں آنسو آ جائیں اور پہاڑ سا بوجھ جو میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا ہے کسی طرح کم ہو جائے۔ مگر میرے لئے آنسو اس روز محشر کے دامن میں بھی نہیں

تھے۔

پورے اڑتالیس گھنٹے میں اس کمرے میں بند رہی۔ اپنی ماں کی طرح اپنی عزیز ترین سہیلی کا آخری دیدار بھی میری قسمت میں نہیں تھا۔ مینیجر افتخار مجھے خود کمرے میں کھانا پہنچاتا رہا تھا۔ وہ واحد شخص تھا پچھلے تین دنوں میں' میں نے جس کی شکل دیکھی تھی۔ اس نے مجھے کوئی فون کال ریسیو کرنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔ میں اس سے پوچھ پوچھ کر ہار گئی تھی لیکن وہ کچھ نہیں بتاتا تھا کہ میرے باہر جانے میں کیا خطرہ ہے۔ میری سمجھ میں یہی بات آ رہی تھی کہ فرخندہ کو جان سے مارنے والے لوگ میری یہاں موجودگی سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں اور میرے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ میں نے پہلی بار موت کی سرد انگلیوں کو اپنے اردگرد سرسراتے محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے بہت سے تاریک سائے میری طرف بڑھتے آ رہے ہیں اور میں عنقریب گھٹاٹوپ تاریکی میں چھپنے والی ہوں۔ یہ تاریک سائے کن لوگوں کے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ان سب تاریکیوں کا منبع وہی بڑی حویلی تھی جہاں سرخ چہروں' گھنی مونچھوں اور بھاری آوازوں والے چنگیزی گھناؤنی سازشوں کے تانے بانے بنتے رہتے تھے۔ فرخندہ ان ہی سازش زادوں کی کھوج میں تھی۔ وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی۔ مگر مجھے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ ہونٹوں پر موت کی مہر لگا کر قبر میں اتر گئی۔ میرے لئے ان سب کڑیوں کو ملانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

تیسرے روز عابد میرے کمرے میں آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ ان ۷۲ گھنٹوں میں ۷۲ سال گزار چکا ہے۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آتا تھا اور آنکھوں سے بڑھاپے کی نقاہت جھانک رہی تھی۔ وہ سرتا پیر قابل رحم تھا۔ لٹا پٹا سا وہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ اس نے کچھ تصویریں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ یہ فرخندہ کی تصویریں تھیں اور عابد نے میری ہی ہدایت پر کھینچی تھی یا شاید کسی سے کھنچوائی تھیں۔ یہ "میری فرخندہ" کے سفر آخرت کی تصویریں تھیں۔ وہ نرم ہونٹوں پر مسکان لئے گلاب کے پھولوں میں گھری ہوئی تھی۔ کتنی خوبصورت دلہن تھی۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی اور سرخ جوڑے کے بغیر بھی وہ کتنی خوبصورت دلہن تھی۔ اسے معلوم تھا دلہن تصویر کیسے کھنچواتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر

رکھی تھیں۔ میں ان تصویروں کو دیکھتی رہی اور میری آنکھوں میں کانٹے ٹوٹتے رہے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مینیجر افتخار کی آواز پہچان کر عابد نے دروازہ کھولا۔ افتخار نے عابد کے کان پر جھک کر ایک گھبرائی ہوئی سرگوشی کی۔ عابد کی آنکھوں میں بھی بے چینی کروٹیں لینے لگی۔ اس نے فوراً مجھے اپنے ساتھ لیا اور کمرے سے نکل آیا۔ میرا بازو تھام کر وہ کوریڈور میں تقریباً بھاگنے لگا۔ پھر اس نے مجھے جلدی سے ایک خالی کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ "عابد........ عابد" میں پکارتی رہی۔ لیکن وہ اب بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔

یہ سنگل بیڈ کمرہ تاریک اور خالی تھا۔ میں لائٹ آن کرتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پھر ایک اور پراندیش خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں عابد میری حفاظت کیلئے پولیس سے رابطہ قائم نہ کر لے۔ اگر وہ پولیس لے کر اس کمرے میں آ جاتا تو کیا ہوتا۔ پھر میں نے دل کو تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر عابد نے اس معاملے میں پولیس کو لانا ہوتا تو اب تک لا چکا ہوتا۔ ایکاایکی کمرے میں رکھے ہوئے اندرونی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے باتھ روم کی ٹیوب جلا کر معمولی روشنی کی اور ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف عابد تھا۔ اس نے کہا۔

"مس ثناء' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے وہاں بیٹھیں میں ابھی آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

میں نے چلا کر پوچھا "لیکن یہ کیا معاملہ ہے تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ کس نے قتل کیا ہے فرخندہ کو؟ کون مجھے مارنا چاہتا ہے؟"

عابد نے کہا "پلیز مس ثناء۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں لیکن فی الحال......."

ابھی بات اس کے منہ ہی میں تھی کہ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے غرا کر عابد کو دھکا دیا یا اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر شیشے کی تپائی پر پھینک دیا۔ شیشہ تڑخنے کی مدہم آواز آئی۔

عابد نے گرج کر پوچھا "تمہیں کس نے اندر آنے دیا ہے!؟"

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی "ہمیں اندر آنے کیلئے کسی کتے سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔"

عابد بولا "زبان سنبھال کر بات کرو' تم میری چھت کے نیچے کھڑے ہو۔ کیوں آئے ہو تم یہاں؟"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" بھاری آواز نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ یہ گفتگو فون کے ذریعے مجھ تک پہنچ رہی تھی لیکن آخری فقرہ اتنی صاف آواز میں اور ایسے درست تلفظ کے ساتھ بولا گیا تھا کہ میں بولنے والے کو پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے پاؤں کے تلوؤں سے سر کے بالوں تک برق سی دوڑ گئی۔ بولنے والا وہاب چنگیزی تھا۔ وہ شخص جو روئے زمین پر میرے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا اور جس کی موت کیلئے میں زندہ تھی۔

میرا دل چاہا کہ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر یہاں سے نکلوں اور اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں وہ شیطان' عابد کے ساتھ مصروف گفتگو ہے۔ پھر آنکھیں بند کرکے اس پر جھپٹ پڑوں اور اپنی جان دے دوں یا اس کی جان لے لوں۔ ایک مرتبہ تو اس ارادے کے ساتھ میرے قدم دروازے کی طرف اٹھے بھی' لیکن پھر عابد کی آواز میرے تصور میں گونجنے لگی۔ اس نے بار بار کہا تھا کہ میں اس کمرے سے باہر نہ نکلوں.......... میں ان درودیوار میں اجنبی تھی اور عابد مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ پھر مقابلہ بھی وہاب چنگیزی جیسے درندے سے تھا۔ معلوم نہیں اس کمرے سے باہر حالات کیا تھے۔ فون سے آنے والی آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں۔ شاید سب لوگ اس کمرے سے نکل گئے تھے۔ دفعتاً میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کوریڈور میں تیزی سے بھاگتے قدموں کی صدا آ رہی تھی۔ یہ صدا دروازے کے عین سامنے آکر رک گئی۔ میں نے ایک وزنی گلدان کو ہتھیار کے طور پر سنبھالا اور ایک دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ دروازے کے تالے میں چابی گھومی اور وہ کھل گیا۔ "ثناء!" عابد کی گھبرائی ہوئی سرگوشی سنائی دی میں لپک کر اس کے سامنے آگئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے میرا بازو تھاما اور مجھے کھینچتا چلا گیا۔ کوریڈور عبور کرکے ہم زینوں پر پہنچے۔ کچھ کمروں کے دروازوں اور کھڑکیوں سے ہراساں چہرے ہمیں جھانک رہے تھے۔ پچیس تیس زینے طے کرکے ہم چھت پر پہنچ گئے۔ چھت پر تاریکی تھی۔ کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا عابد نے چھت پر کھلنے والا دروازہ چھت کی طرف سے بند کیا اور مجھے لے کر ایک منڈھیر کی طرف آگیا۔ منڈھیر کی اونچائی آٹھ نو انچ

سے زیادہ نہیں تھی۔ ہوٹل کی عمارت کے پہلو پر ایک اور تین منزلہ عمارت تھی۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی تھی۔ قریباً دس گیارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ عابد نے چھت پر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ شاید وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ ناکام ہو کر وہ پانچ چھ قدم پیچھے ہٹا اور بھاگ کر دونوں چھتوں کا درمیانی خلا پھلانگ گیا۔ وہ ایک چاق و چوبند باہمت نوجوان تھا۔ مگر میرے لئے یوں دوسری چھت تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس اثناء میں چھت کا دروازہ دھڑدھڑ بجنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ موت کے ہرکارے میرا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ گئے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دوسری چھت پر عابد ہاتھ میں کوئی وزنی چیز اٹھائے لا رہا تھا۔ یہ ایک آہنی گارڈر تھا جو اسے دوسری چھت پر پڑا نظر آگیا تھا۔ یہ گارڈر جو تیرہ چودہ فٹ لمبا تھا اس نے اس طرح پھینکا کہ دونوں چھتوں کے اوپر ایک پل صراط سی بن گئی۔ "آ جاؤ ثناء" وہ تیزی سے بولا۔ دروازے پر بے پناہ زور ڈالا جا رہا تھا وہ کسی بھی لمحے ٹوٹنے والا تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے گارڈر پر قدم رکھا اور دھیرے دھیرے دوسری چھت کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ بڑی پرخطر ساعتیں تھیں۔ قدموں کی ایک لغزش مجھے چالیس فٹ نیچے پختہ گلی میں ڈھیر کر سکتی تھی۔ گو گارڈر کی چوڑائی آٹھ نو انچ تھی مگر اس وقت وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں یہ چند فٹ کا سفر طے کرنے میں کامیاب ہوئی۔ عابد نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے بھگاتا ہوا زینوں تک لے آیا۔ میں بار بار پوچھ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے گا مگر اس کا ایک ہی جواب تھا "بتاتا ہوں......... سب کچھ بتاتا ہوں" اس عمارت میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کے دفاتر تھے اس وقت زیادہ تر عمارت تاریک پڑی تھی۔ بس کسی کمرے میں روشنی نظر آتی تھی ہم چکردار زینے طے کرتے ہوئے نیچے آئے اور عمارت کے احاطے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ ہم ٹیکسی میں گھس گئے۔ عابد نے ڈرائیور کو ڈیفنس چلنے کو کہا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم ڈیفنس کی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے اتر رہے تھے۔ ٹیکسی والے کو فارغ کر کے عابد نے مجھے وہیں سڑک پر چھوڑا اور خود جلدی سے کوٹھی میں گھس گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک ہنڈا سوک کار لے کر باہر آ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں بیٹھ گئی۔ وہ مشاقی سے بھری پری سڑکوں پر ڈرائیور کرنے لگا۔ شاہراہ قائداعظم پر پہنچ

کر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے پارکنگ کی۔ ہم گاڑی میں بیٹھے رہے اور ویٹر ہمارے لئے بیف برگر اور کولڈ ڈرنک لے آیا......... ان حالات میں کھانے پینے کا ہوش کسے تھا یہ تو صرف یہاں رکنے کا ایک بہانہ تھا۔

عابد نے ایک گہری سانس لی اور پوچھا "یہ چودھری وہاب چنگیزی کون ہے؟"

میں نے کہا "تم اسے نہیں جانتے؟ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ہوٹل میں گھس آیا تھا۔ میں نے فون پر تمہارا جھگڑا سنا تھا۔"

عابد نے کہا "مس ثناء' مرنے سے قبل فرخندہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہر صورت میں آپ کی حفاظت کروں اور آپ کو ان ہاتھوں تک پہنچا دوں جنہیں آپ اپنے لئے محفوظ سمجھتی ہیں...... میں انشاء اللہ جان پر کھیل کر بھی وعدہ نبھاؤں گا......... آپ بتائیں آپ کہاں جانا چاہتی ہیں۔" عابد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

میں نے کہا "مسٹر عابد پہلے آپ یہ بتائیں کہ وہاب چنگیزی کا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا اور اگر فرخندہ نے یہ نام لیا تھا تو اور کیا کہا تھا؟"

عابد نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر گود میں رکھ لیا۔ لفافے پر ڈاک کے ٹکٹ اور مہر لگی ہوئی تھی۔ اس پر جو ایڈریس تھا وہ اس اخبار کا تھا جہاں فرخندہ کام کرتی تھی۔ عابد نے کہا "مس ثناء میں جس وقت ہسپتال پہنچا' فرخندہ شدید زخمی حالت میں تھی' ریوالور کی ایک گولی اس کی گردن اور دوسری سینے میں لگی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ اٹک اٹک کر کہنے لگی' عابد' مجھ پر حملہ کرنے والے وہاب چنگیزی کے آدمی ہیں۔ کاش میں پولیس کے روبرو یہ بیان دے سکتی۔ یہ فقرہ کہہ کر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ موقع پر موجود ڈاکٹر نے مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ کچھ دیر بعد فرخندہ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ کہنے لگی' عابد' وہ لوگ ثناء کو بھی مار ڈالیں گے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تم وعدہ کرو کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو ثناء کی حفاظت کرو گے۔ اسے پوری سلامتی کے ساتھ وہاں پہنچاؤ گے جہاں وہ جانا چاہے گی۔ میں نے فرخندہ کا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔ وہ بولی۔

"عابد' چنگیزی قاتل ہیں۔ وہ اپنے گھناؤنے جرم کے سارے ثبوت میرے کمرے

سے لے گئے ہیں لیکن کچھ میٹر میرے ساتھی رپورٹر اشفاق شاہد کے پاس بھی ہے۔ اگر اشفاق بچ گیا ہے تو وہ اس سارے واقعے سے ایڈیٹر کو ضرور آگاہ کرے گا۔ لیکن تم خود ایڈیٹر یا اشفاق سے ملنے کی کوشش نہ کرنا........" ابھی فرخندہ نے یہی کچھ کہا تھا کہ اسے ہنگامی حالت میں آپریشن تھیٹر روانہ کر دیا گیا۔ جہاں سے تھوڑی دیر بعد اس کی موت کی........"

ایک گہری آہ بھرنے کے بعد عابد نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

"اطلاع آگئی......... فرخندہ کی ہدایت کے مطابق میں نے رپورٹر اشفاق یا ایڈیٹر سلطان ربانی صاحب سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اشفاق اپنے گھر سے غائب ہے۔ اخباروں میں فرخندہ کے قتل کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس سے پتہ چلا کہ قتل کی رات وہ دیر تک اپنے دفتر میں ایک فیچر تیار کرتی رہی۔ قریباً دس بجے وہ اکیلی اپنے کاغذات پر جھکی ہوئی تھی۔ کمرے میں صرف ایک چپڑاسی لڑکا تھا۔ وہ قریبی میز پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ فرخندہ نے اسے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ وہ پانی لینے باتھ روم میں چلا گیا اس دوران تین آدمی جن میں سے دو نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپائے ہوئے تھے اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ اندر گھستے ہی انہوں نے دروازے کو کنڈی لگا دی۔

ایک شخص نے فرخندہ کو دبوچ لیا اور دوسرے نے ریوالور کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ چپڑاسی لڑکا سہم کر اندر ہی دبک گیا۔ اس کا بیان ہے کہ حملہ آور فرخندہ سے کسی ڈائری کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ جب مجبور ہو کر اس نے ڈائری دے دی تو انہوں نے اس کے سر پر ریوالور کے بٹ مارے اور پوچھنے لگے کہ اس کے بارے میں کس کس کو معلوم ہے۔ فرخندہ نے کسی کا نام نہیں لیا۔ انہوں نے بہت دھمکیاں دیں لیکن وہ خاموش رہی۔ اس دوران ایڈیٹر ربانی صاحب بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اس مداخلت پر حملہ آور سیخ پا ہوگئے۔ انہوں نے فرخندہ کو گالیاں دیں پھر اوپر تلے دو فائر کئے اور کھڑکی سے کود کر نکل گئے۔ چپڑاسی لڑکے نے باتھ روم سے نکل کر دیکھا تو فرخندہ لہولہان پڑی تھی۔"

یہ ساری روداد سنانے کے بعد عابد نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور آنسو پینے کی

کوشش کرنے لگا۔ مجھے حالات سے آگاہ کرتے کرتے اس کے تازہ زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اس کی گود میں پڑے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ کیا ہے۔

اس نے کہا "یہ لفافہ ایڈیٹر سلطان ربانی صاحب کل میرے پاس لے کر آئے تھے یہ انہیں رپورٹر اشفاق شاہد نے کوہاٹ شہر سے بھیجا ہے۔ دراصل وہ فرخندہ پر حملے کی اطلاع پاتے ہی روپوش ہوگیا تھا۔ اب اس لفافے کے ذریعے اس نے ان حالات سے پردہ اٹھایا ہے جو فرخندہ کی موت کا سبب بنے۔ اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے اس لئے وہ فی الحال سامنے آنا نہیں چاہتا۔"

عابد بولا "آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں" اس نے لفافہ میری طرف بڑھا دیا میں نے کاغذ باہر نکالے۔ یہ درمیانے سائز کے دو صفحے تھے۔ میں پڑھنے لگی۔

"سلطان ربانی صاحب! مس فرخندہ کا خیال تھا کہ ہم مکمل تحقیق کے بعد آپ کو رپورٹ دیں گے مگر اب مس فرخندہ کی ناگہانی موت سے یہ سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اب تک کے حالات آپ کے نوٹس میں دے دیئے جائیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں پچھلے تین ماہ سے ہم قصبہ "بڑی حویلی" کے چنگیزیوں کے بارے چھان بین کر رہے تھے۔ قریباً دو ہفتے پہلے ہمیں بڑی حویلی کے نواح سے ایک ایسا شخص ملا جو حلیے سے نیم دیوانہ لگتا تھا۔ مگر بہت عقل کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ چنگیزیوں نے کچھ عرصے پہلے تین آدمیوں پر بھوکا شیر چھوڑ دیا تھا۔ اس شیر نے ان میں سے دو کو موقعے پر ہلاک کر دیا اور تیسرا شدید زخمی ہو کر دم توڑ گیا۔ غلام حیدر نامی اس دیہاتی کی بات نے ہمیں ششدر کر دیا۔ ہم نے اس کو کریدا تو پتہ چلا کہ بڑی حویلی سے کچھ فاصلے پر مالٹوں کینوؤں کا بہت بڑا باغ ہے اس باغ کے بیچوں بیچ ایک جدید طرز کی کوٹھی ہے۔ اس کوٹھی میں چنگیزی دنیا کا ہر برا کام کرتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ رات دس بجے کے بعد کوٹھی کے بیرونی حصے میں ایک شیر کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ شیر رات بھر رکھوالی کرتا ہے اور اگر کوئی قسمت کا مارا غلط ارادے سے کوٹھی میں گھستا ہے تو اسے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تین اجنبی جن میں سے دو انگریز تھے چوری چھپے کوٹھی میں گھسے۔ شیر نے پہریداروں کے پہنچتے پہنچتے انہیں چیر پھاڑ ڈالا۔ بعدازاں ان کی لاشوں کو نہر کے کنارے سرکنڈوں میں دبا دیا گیا...... ہم نے غلام حیدر

کو نہر کے کنارے ان سرکنڈوں تک جانے پر آمادہ کرلیا۔ وہ ہمیں سرکنڈوں میں لے گیا اور اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں لاشوں کو دبایا گیا تھا۔ ایک چاندنی رات کو ہم نے اس جگہ کی کھدائی کی اور ہمیں مقتولین کی ہڈیاں ملیں۔ انہیں خون آلود لباسوں سمیت دفنایا گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں کچھ ذاتی استعمال کی اشیاء بھی ملیں۔ ان میں ایک عینک ایک جیبی چاقو اور چند کاغذ تھے جن پر کچھ حساب کتاب درج تھا۔ اس نیم پاگل دیہاتی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہ تینوں افراد اپنی بہن کو چھڑانے کیلئے آئے تھے۔ ان کی بہن جو پینٹ بشرٹ پہنتی ہے اور جس کے بال کٹے ہوئے ہیں چودھری کے قبضے میں ہے۔ ہمیں غلام حیدر کی اس بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ "پینٹ قمیض" والی کو تینوں مقتولین کی بہن بتا رہا تھا جبکہ ان میں سے دو یورپی باشندے تھے اور ایک مقامی شخص تھا۔ بہرحال بعد میں اندازہ ہوا کہ غلام حیدر کی بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ یعنی قتل ہونے والے تینوں افراد کسی لڑکی کی رہائی کیلئے ہی اس علاقے میں آئے تھے۔ شیر والی بات پر بھی ہمیں یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر یہ بات بھی درست نکلی۔ قریبی دیہات سے ہم نے جو سن گن لی اس سے پتہ چلا کہ نئے چودھری وہاب چنگیزی کے پاس ایک جیتا جاگتا دھاری دار شیر ہے۔ اس شیر کیلئے روزانہ دو بکرے ذبح کئے جاتے ہیں۔ سنا گیا کہ اس شیر کی مناسبت سے وہاب چنگیزی انتخاب میں بھی شیر کا نشان حاصل کرنا چاہتا تھا مگر شومئی قسمت ایسا نہ ہوسکا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ جسے شیر کہا جا رہا ہے وہ جسیم نسل کا چیتا ہے۔

میں نے رپورٹر اشفاق شاہد کا پورا خط پڑھا۔ اس میں نہایت یقین کے ساتھ چنگیزیوں پر سنگین الزامات لگائے گئے تھے اور دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگر فوری طور پر کارروائی کی جائے تو اب بھی وہاب چنگیزی کے خلاف ٹھوس ثبوت مل سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس خط میں لکھی گئی بہت سی باتیں درست تھیں۔ مالٹوں اور کینوؤں کے جس باغ کا ذکر کیا گیا تھا اسے میں کیسے بھول سکتی تھی۔ دنیا کی اس منحوس ترین چاردیواری کو کیسے بھول سکتی تھی جس میں دس روز تک میرے معصوم فرحان کی چیخیں گونجی تھیں اور آخر وہ تھک ہار کر ہمیشہ کیلئے چپ ہوگیا تھا۔ وہ در و دیوار اور حدود اربعہ تو میرے ذہن پر تا ابد کیلئے نقش ہوگیا تھا۔ اس خط میں لکھا گیا تھا کہ اب اس چار دیواری میں کوئی اور بدنصیب قیدی موجود ہے اور موت و حیات کی کشمکش سے گزر رہا ہے۔ وہ قیدی لڑکی کون تھی اور

اسے چھڑانے کیلئے آنے والے کون تھے؟

عابد غور سے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "مس ثناء اب بتائیں آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا "عابد صاحب! میں چاہوں گی کہ آپ مجھے کسی طرح خان رحیمی تک پہنچا دیں۔"

"کون خان رحیمی؟" عابد نے پوچھا

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عابد کو خان رحیمی کے بارے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "عابد صاحب! خان رحیمی میرے ایک بہی خواہ ہیں۔ آپ مجھے کسی طرح جھنگ پہنچا دیں۔ اس سے آگے میں خود چلی جاؤں گی۔"

عابد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مس ثناء اب یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں میرا بھی ہے۔ فرخندہ کے بعد مجھے اپنا زندہ رہنا بھی بیکار محسوس ہو رہا ہے.......... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ جو جنگ لڑ رہی ہیں اس میں مجھے بھی شریک کر لیں!"

میں نے کہا "مسٹر عابد! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور آپ کے دکھ میں بھی برابر کی شریک ہوں لیکن یہ کوئی ایسی جنگ نہیں جس میں آپ کی کمک کی ضرورت ہو۔ آپ بے فکر رہیں اور مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ فرخندہ کے قاتل بہت جلد کیفر کردار تک پہنچیں گے۔"

عابد ایک سمجھدار آدمی تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ ایک لمبا چکر ہے اور میں جہاں تک دیکھ رہی ہوں' وہ نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اس نے فضول سوالوں سے مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے لگا۔

"تو اب آپ جھنگ جانا چاہیں گی؟"

"میں نے کہا "جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ویسے میں بس یا ریل کے ذریعے بھی جا سکتی ہوں۔"

اس نے کہا "نہیں........ میں آپ کو خود چھوڑ کر آؤں گا.......... کیا خیال ہے ابھی چلیں؟"

"مناسب تو یہی ہے" میں نے جواب دیا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر کولڈ ڈرنک کی

بوتلیں واپس کیں۔ بل چکایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ لاہور چھوڑنے سے پہلے ایک بار فرخندہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ لوں۔ کیا پتہ پھر اس نگری میں قدم رکھنا ہو یا نہیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار عابد سے کیا تو اس نے کہا کہ یہ کسی طور مناسب نہیں۔ قبرستان میں پولیس اور چنگیزیوں میں کسی سے بھی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ چنگیزیوں نے یہاں جال سا بچھایا ہوا ہے۔

عابد یہاں کے حالات مجھ سے بہتر سمجھتا تھا لہٰذا میں اس کے جواب پر خاموش ہو گئی.......... تاہم عابد کی یہ احتیاط بے فائدہ رہی۔ ہم راوی کا پل پار کر کے شیخوپورہ روڈ پر تین چار میل آگے گئے تھے جب مجھے عابد کے چہرے پر گہری تشویش نظر آئی وہ عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے صورت حال دریافت کی۔ وہ بولا

"مس ثناء۔ ایک پجارو گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔"

میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جب ہم ریسٹورنٹ سے چلے تھے ایک نیلی پجارو گاڑی ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت بھی شبہ ہوا تھا۔ اب عابد کی بات نے اس شبے کی تصدیق کر دی۔ میرے پوچھنے پر عابد نے بتایا کہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب پہنچ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عابد نے اپنی گاڑی کی رفتار بھی بڑھا دی۔ وہ بولا "مس ثناء مجھے ان لوگوں کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ کیا خیال ہے واپس لاہور نہ چلیں؟"

میں نے کہا "عابد صاحب اگر یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ ہی گئے ہیں تو پھر لاہور یا لاہور سے باہر ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اس وقت ذہن میں ایک ہی نام گونجا "پولیس سٹیشن" مگر مجھے پولیس سٹیشن میں بھی پناہ کہاں مل سکتی تھی۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا' ثناء! تمہیں تو مرنا ہی ہے۔ اپنے ساتھ اس نوجوان کی جان نہ گنواؤ۔ اس کی گاڑی سے اتر جاؤ اور اسے جانے دو........ زندگی کی طرف سلامتی کی طرف۔ اسے موت کے گھیرے سے آزاد کر دو۔ میں نے عابد سے کہا "عابد صاحب مجھے بائیں جانب آنے والے اگلے پٹرول پمپ کے سامنے اتار دیں اور خود سیدھے شیخوپورہ چلے جائیں۔ پٹرول پمپ کا مالک مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس کے پاس پناہ لے چکی ہوں۔ اس کے ہوتے ہوئے وہاب

چنگیزی کے کارندے میرے قریب نہیں پھٹکیں گے۔"

"کون سا پٹرول پمپ......؟" عابد نے پوچھا "اگلا پٹرول پمپ تو دھوکا منڈی والے موڑ کے پاس ہے۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"کیا نام ہے اس کے مالک کا؟"

"شیخ ایاز" میں نے جو منہ میں آیا بول دیا۔

عابد بولا "مجھے افسوس ہے کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ اتفاق میں پٹرول پمپ کے مالک کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام شیخ ایاز نہیں اور وہ بہت بھلامانس آدمی ہے۔ اس مسکین کو تو خود ہروقت پناہ کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ کو کیا پناہ دے گا۔"

عابد کا لہجہ پراعتماد تھا۔ میں کٹ کر رہ گئی۔ دونوں گاڑیوں کی رفتار اب خاصی تیز ہو چکی تھی۔ میں نے عابد سے صاف لفظوں میں کہا کہ میں اس کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتی وہ براہ مہربانی مجھے یہیں پر اتار دے۔ عابد نے فیصلہ کن لہجے میں انکار کر دیا۔

میں نے کہا "دیکھیں عابد صاحب! آپ اس معاملے کو بالکل نہیں سمجھتے۔ آپ میری جتنی مدد کر چکے ہیں میں اس کیلئے بے حد مشکور ہوں۔ مگر آپ اب بھی میرے ساتھ رہیں گے تو اس میں میرا بہت نقصان ہوگا۔ اور ممکن ہے آپ کا بھی ہو۔"

عابد نے کہا "مس ثناء! آپ مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کریں۔ میں چھٹی جماعت کا طالب علم نہیں۔ ایک بڑے ہوٹل کا مالک ہوں۔ ٹھیک ہے میں ان حالات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن کچھ ایسا انجان بھی نہیں ہوں۔ میں آپ کو ان لوگوں کے چنگل میں نہیں دوں گا' چاہے مجھے اس کیلئے اپنی جان بھی گنوانی پڑے۔"

وہ بڑی مشاقی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں قریباً سو کلومیٹر کی رفتار سے شیخوپورہ شہر کے اندر سے گزریں۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے۔ شہر کے بازار سنسان نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں بس اسٹاپس کے قریب دکانیں کھلی تھیں۔ پجارو گاڑی بدستور ہمارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے ذہن تیزی سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ لوگ عابد کے گھر سے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ ایک طرح عابد نے گاڑی لینے کیلئے گھر جا کر وہی غلطی کی تھی۔ جو

میں نے فرخندہ سے مل کر کی تھی۔ فرخندہ اور عابد کا گھر دونوں چنگیزیوں کی نگاہ میں تھے...... اس وقت ہم شیخوپورہ سے دس بارہ میل آگے نکل چکے تھے جب پجارو سے ہم پر پہلا فائر ہوا۔ پٹاخے کی آواز آئی اور ٹھک سے کوئی شے کار کی ڈگی میں پیوست ہو گئی۔ اب پجارو کے بارے میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ عابد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ دوسرا فائر کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ سیون ایم ایم رائفل کی گولیاں تھیں۔ دوسری گولی گاڑی کے پچھلے ٹائر کو بے کار کر گئی۔ گاڑی عابد کے ہاتھوں میں بری طرح لہرائی اور سڑک سے اتر کر کنارے کے کھیتوں میں گھستی چلی گئی۔ جونہی گاڑی رکی۔ عابد نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا۔ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر ہم باہر نکلے اور بغیر کسی مشورے یا منصوبے کے سامنے والے کھیتوں کی طرف بھاگے۔ یہ جوی کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے ساتھ ہی وسیع جوہڑ تھا اور اس کے کنارے کنارے جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہ جھاڑیاں اور سرکنڈے ہماری پناہ گاہ ثابت ہو سکتے تھے۔ ہم بھاگتے ہوئے کھیت میں پہنچے اور وہاں سے سرکنڈوں میں داخل ہو گئے۔ ساری زمین گیلی تھی ہمارے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ سرکنڈوں کی بے رحم چھال جسموں پر چرکے لگا رہی تھی۔ کہیں قریب سے کوئی جانور بدک کر بھاگ گیا۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ معلوم نہیں وہ کیا جانور تھا۔ کتا تو ہرگز نہیں تھا۔ جوہڑ کے کنارے کی طرف آ کر ہم دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حسب توقع سرکنڈوں کے قریب مدہم آوازیں سنائی دینے لگی۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اگر وہاب کے آدمی ہماری تلاش میں سرکنڈوں کے اندر گھستے تو ہم جوہڑ کے کنارے کنارے چلتے دوسرے کھیتوں کی طرف نکل سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں نے توقع سے زیادہ ہوشیاری دکھائی۔ انہوں نے ہمارے نکلنے کا راستہ پہلے مسدود کیا اور بعدازاں سرکنڈوں میں ہماری تلاش شروع کی۔ ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعداد میں دس پندرہ سے کم نہیں۔ اس سے ظاہر تھا کہ اکیلی پجارو جیپ ہی ہمارے پیچھے نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک گاڑی تھی۔ وہ سب بار بار ہمیں للکار رہے تھے اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

یہ جگہ بڑی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ خودکار رائفلوں

سے سرکنڈوں میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے۔ مجھے یاد تھا ایک دفعہ میرے شوہر واصف نے اپنے آدمیوں سے ایسے ہی فائرنگ کروائی تھی اور ایک چور کو سرکنڈوں کے اندر چھلنی کر دیا تھا۔ وہ منظر میرے تصور میں تازہ ہو رہا تھا اور دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی ہم پر گولیوں کا مینہ برسنے لگے گا۔ چنگیزیوں کے کارندے ہمیں جو دھمکیاں دے رہے تھے وہ بھی اس طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

میں نے واصف کے ذاتی محافظ رب نواز کی آواز پہچان لی۔ واصف کی موت کے وقت یہ شخص بھی سلیم کی گولی سے زخمی ہوا تھا اور کئی ماہ ہسپتال میں گزار کر آیا تھا۔ اب وہ شعلہ جوالا بنا ہوا چیخ رہا تھا۔ میں وہ الفاظ یہاں لکھنا نہیں چاہتی جن سے وہ مجھے یاد کر رہا تھا۔ اس کی آواز غصے سے پھٹی ہوئی تھی اور وہ مجھے اطلاع دے رہا تھا کہ میرا کھیل اب ختم ہو چکا ہے۔ میں ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤں اور خود کو ان کے حوالے کر دوں۔ اس دوران میں نے ایک اور کارندے کی آواز سنی۔ وہ ہمیں سنانے کیلئے رب نواز کو بلند آواز میں مشورہ دے رہا تھا کہ کیوں نہ ڈیزل پھینک کر سرکنڈوں کو آگ لگا دی جائے........ ہم یہ سب کچھ سن رہے تھے اور دھڑکنوں کو سنبھالے اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور گاڑی کچے میں اچھلتی ہوئی سرکنڈوں کی طرف آ رہی ہے۔ گاڑی کی ہیڈلائٹس کبھی کبھی گھنے جھاڑ جھنکاڑ کے اندر بھی چمک جاتیں تھیں۔ میرے دل سے دعا نکلی کاش کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ لوگ یہاں سے ٹل جائیں۔ گاڑی کا انجن سرکنڈوں کے پاس پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ منحوس صدا میرے کانوں میں گونجی جو سماعت سے گزر کر جسم کے ہر ریشے کو عذاب آشنا کر دیتی تھی۔ یہ اس شیطان کی آواز تھی جسے انسان کہنا انسانیت کی سب سے بڑی توہین تھی۔ یہ وہاب چنگیزی کی آواز تھی۔ اس نے غرا کر رب نواز سے کہا ”ڈرتے کیوں ہو۔ یہ مفرور قاتلہ ہے اگر باہر نہیں نکلتی تو اندر ہی بھون دو حرام زادی کو۔“

رب نواز نے ایک بار پھر سنگین لہجے میں ہمیں باہر آنے کی ہدایت کی۔ اس کی آواز مجھے یہ سمجھانے کے لئے کافی تھی کہ یہ اس کی آخری وارننگ ہے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اگلے چند لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تو کیا میں پھر خود کو اس بے رحم شخص کے

حوالے کر دوں جو اس سے پہلے میرے بچے کا خون پی چکا تھا اور میرے جسم سے میری بے بسی کا خراج وصول کرتا رہا تھا۔ جس نے مجھے اور میرے بچے کو ایک ہی چار دیواری میں ذبح کر ڈالا تھا اور سفاکی کا اعلیٰ ترین تمغہ سینے پر سجا کر مخمور قہقہے لگائے تھے۔ میں اس شخص کے سامنے جانا چاہتی تھی لیکن ہاتھ اٹھا کر نہیں ہاتھ بڑھا کر۔ اپنے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کو نوچ لینا چاہتی تھی وہ فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے چھین لینا چاہتی تھی جو میرے لئے کائنات کی سب سے قابل نفرت چیز تھی۔ اور یہ مسکراہٹ چھین کر اس کی مغرور گردن کو یوں دبانا چاہتی تھی کہ اس کی آخری ہچکی سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں۔ مگر کیا میں اس وقت یہ سب کچھ کر سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ وہاب تک پہنچنے سے پہلے درجنوں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں۔ پھر ایک عورت تو ان سرکنڈوں میں گر کر مرجاتی لیکن ایک بے قرار ماں کی روح ہمیشہ کے لئے سرگرداں ہو جاتی۔ ان بے حد مضطرب لمحوں میں میں نے عابد کو چھو کر دیکھا۔ جیسے چھو کر جاننا چاہتی ہوں کہ اب اس کا کیا خیال ہے۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا اور ارادے مضبوط نظر آتے تھے۔ وہ میری حفاظت کیلئے ہر انتہاء تک جانے کو تیار تھا۔ ”عابد صاحب! آپ نے اچھا نہیں کیا“ میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ یہی وہ وقت تھا جب تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ سرکنڈوں کے اندر سرخ لکیریں سی چمکتی نظر آئیں........ خدا کی پناہ‘ کتنا خوفناک منظر تھا۔ عابد نے ایک بازو میری گردن میں ڈالا اور اوندھے منہ گیلی زمین پر گرا۔ قریباً پندرہ سیکنڈ تک ہم اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑے رہے۔ آخر فائرنگ رک گئی ٹھک ٹھک کی آوازوں سے میگزین اترنے اور چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ سرکنڈوں میں سرسراہٹ گونجنے لگی۔ میں نے عابد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے ہیں‘ اب ہمارے لئے جوہڑ کی طرف نکلنے کا موقع پیدا ہو جائے گا........ عابد خاموش تھا۔ اس کا مضبوط بازو کسی وزنی چیز کی طرح میری گردن پر رکھا ہوا تھا۔ اس نامانوس بوجھ نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ ”عابد صاحب“ میں نے اسے جھنجوڑ کر سرگوشی کی اور اس وقت میرا وہ ہاتھ خون میں لتھڑ گیا جس سے میں نے عابد کو جھنجوڑا تھا۔ ہاں یہ خون ہی تھا۔ کیونکہ کیچڑ اتنا گرم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں سے کسی ماں کے دودھ کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے بے قراری سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ میری انگلیوں نے اس کے سر کو

چھوا اور مجھے پتہ چلا کہ ایک گولی اس کے کاسہ سر کو توڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔ وہ عاشق صادق اپنی محبوبہ کا تعاقب کرتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا.......... ہاں وہ مر چکا تھا۔

یہ نوجوان ایسے ہی چلبلے اور سیلانی ہوتے ہیں۔ جب کسی سے آنکھ لڑ جاتی ہے تو ہر جگہ اس کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔ کالج ہو' بازار ہو' محفل ہو' کہیں ایک دوجے کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ "عابد....... عابد' یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے بلک کر کہا اور اپنا منہ کیچڑ میں رگڑنے لگی۔ ایک لمحے کے لئے جی میں آئی کہ عابد کے پستول سے خود کو بھی گولی مار لوں۔ اب سوچتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ جان دینا اس وقت میرے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھوں کو کھولنا اور بند کرنا اور شاید میں یہ بھی کر گزرتی۔ مگر پھر فرحان کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہ مجھے اس فعل سے منع کر رہا تھا۔ میں نے اپنا نچلا ہونٹ اتنی زور سے دانتوں میں دبایا کہ خون کا ذائقہ منہ میں گھل گیا اور دانت اندر تک گوشت میں اتر گئے۔ کچھ دیر میں اسی طرح بے حرکت پڑی' اردگرد کی آوازوں کو سنتی رہی۔ پھر ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے لرزتے ہاتھوں سے عابدہ کا سر تھام کر اس کی پیشانی کو خون آلود ہونٹوں کا طویل بوسہ دیا تھا۔ معلوم نہیں یہ بوسہ میں نے ایک بھائی کو دیا تھا۔ ایک غم خوار ساتھی کو دیا یا پھر فرخندہ کو دیا تھا۔ فرخندہ جو اس آخری بوسے کے بغیر ہی مجھ سے اپنی صورت چھپا گئی تھی۔ میرے کندھوں کو اپنے احسانوں کے بوجھ سے توڑ کر سکون سے لحد میں جا سوئی تھی۔ "خدا حافظ فرخندہ....... خدا حافظ عابد" میرے دل نے پکار کر کہا "خدا حافظ.......... میرے غم خوارو" میں نے پستول عابد کے ہاتھ سے لیا اور ایک کہنی اور ایک پہلو کے بل جوہڑ کے ساتھ ساتھ چارے کے کھیتوں کی طرف رینگنے لگی۔ چارے کے دو کھیتوں سے آگے گنے کی اونچی فصل لہرا رہی تھی۔

وہ کافی رقبے میں تھی اور اس کی اونچائی نو دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ میں وہاں تک پہنچ جاتی تو بچ نکلنے کی امید پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا اندھا دھند فائرنگ کی آواز نے اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہوگا۔ سڑک کی طرف سے کوئی نہ بھی آیا ہو تو اردگرد کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان ضرور موقع پر پہنچ گئے ہوں گے اور ان لوگوں کی موجودگی میں وہاب اور اس کے ساتھی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہریں گے۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ وہ ایک قتل بھی کر چکے تھے۔ میری اوڑھنی کہیں گر چکی تھی۔ چپل بھی

بھاگتے ہوئے نکل گئی تھی۔ میرا منہ اور بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور میں سرکنڈوں کی آڑ میں چارے کی کھیتوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اردگرد کی آوازوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ رب نواز اور وہاب کے دوسرے کارندے سرکنڈوں میں گھس آئے ہیں اور ہم دونوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ یکایک ایک آواز مجھے اپنے بالکل قریب دائیں جانب سے آئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہی راستہ تھا جو مجھے ان سرکنڈوں سے نکال سکتا تھا۔ اب یہ بھی مسدود ہو گیا تھا۔ میں تین اطراف سے گھر چکی تھی چوتھی سمت ٹھہرا ہوا جوہڑ تھا۔ شاید عام حالات میں میں اس اجنبی اور ٹھٹھرے ہوئے پانی میں اترنے کا تصور بھی نہ کر سکتی۔ مگر اس وقت یہ پانی مجھے بالکل بے ضرر محسوس ہوا۔ قدموں کی چاپ قریب پہنچی تو میں بے آہستگی جوہڑ میں اتر گئی۔ جسم کی خراشیں اور چوٹیں یخ بستہ پانی کے لمس سے جل اٹھیں۔ یوں لگا میرا تین چوتھائی دھڑ برف کی سل تلے آ گیا ہے۔ اچانک مجھ پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ جوہڑ کی گہرائی میری توقع سے زیادہ تھی۔ میرے پاؤں زمین چھونے میں ناکام رہے تھے۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ ان خوفناک ترین لمحوں میں میرے ذہن کی سکرین پر ماضی کا ایک منظر چمک کر رہ گیا۔ بہت پرانا منظر تھا میں چھوٹی سی تھی شاید تین چار سال کی۔ میرے ابو مجھے اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھائے نہر کے ساتھ ساتھ اچھرے والے پل کی طرف جا رہے تھے۔ سخت گرمی تھی۔ نہر میں نہانے والوں کا ہجوم تھا۔ ابو نے ایک جگہ سائے میں سائیکل کھڑی کی۔ پھر میرے کپڑے اتارے اور نہ جانے دل میں کیا آئی کہ مجھے کلائیوں سے تھام کر پانی میں ڈال دیا۔ مجھے اس ٹھنڈے پانی کا لمس آج تک یاد تھا۔ میں پانی میں ڈبکی کھا گئی۔ پھر ابو نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ میں کیکڑے کی طرح ان سے چمٹ گئی۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگے....... آج اتنے برسوں بعد میں ایک بار پھر ڈوب رہی تھی لیکن کوئی ہاتھ مجھے کھینچ کر باہر نکالنے والا نہیں تھا۔ میں نیچے ہی نیچے جانے لگی یہاں تک کہ پانی میرے زخمی ہونٹ کو چھونے لگا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ دائیں بائیں لہرایا اور کنارے سے کسی جھاڑی کے اندر کو جھکی ہوئی جڑیں میرے ہاتھ میں آ گئیں۔ ابو کے ہاتھ کی طرح میں نے پوری جان کے ساتھ ان جڑوں کو تھام لیا۔

سرکنڈوں میں سرسراتا ہوا جسم اب عین اس جگہ پر تھا جہاں چند لمحے پہلے میں تھی اس کا ہیولا میں صاف دیکھ سکتی تھی وہ ایک دیہاتی شخص تھا اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ

اور دوسرے میں بندوق تھی وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا میں نے صرف اپنی ناک پانی سے باہر رہنے دی اور بالکل بے حس و حرکت ہو گئی۔

یہ بڑے جاں گسل لمحے تھے۔ بندوق بردار کے قدموں کی حرکت کے ساتھ کائنات کی گردش بھی تھم گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن پانی میں لہریں پیدا کر رہی ہے اور یہ لہریں میرے دشمن کو میری طرف متوجہ کر لیں گی۔ وہ شخص مجھ سے اتنا قریب تھا کہ میں اس کی سانسوں کی آواز بھی سن سکتی تھی۔ کہیں دور سے وہاب کی مدھم آواز سنائی دی جواب میں بندوق برادر نے زور سے کہا۔

"نہیں چودھری جی۔"

میں نے آواز پہچان لی۔ میرے سر پر میرا جانی دشمن رب نواز کھڑا تھا۔ آج اس کے لئے پورا موقع تھا کہ اپنے ایک ایک زخم کا حساب چکا سکے۔ وہ ذرا سا گھوما تو میں نے اپنی سانس تک روک لی۔ اس کی ٹارچ کی "روشن لکیر" موت کی سرسراتی انگلی کی طرح میرے سر پر سے گزری اور پھر میرے چہرے پر رک گئی۔ میری آنکھوں میں اجل کا سورج چمک گیا۔ رب نواز مجھے دیکھ چکا تھا۔ ٹارچ کی مہلک کرنیں میرے چہرے کو منور کر رہی تھیں۔ رب نواز نے رائفل سیدھی کی اور دو قدم چل کر میری طرف آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی رائفل کا رخ بدل گیا اور ٹارچ کا بھی۔ کہیں دور پھر وہاب کی مدھم آواز آئی۔ جواب میں رب نواز نے کہا۔

"نہیں چودھری جی کچھ پتہ نہیں چلا۔ میرا خیال ہے اس طرف نہیں آئے۔" میرا سر چکرانے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیا کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ رب نواز نے مجھے دیکھا نہ ہو۔ اتنے میں میری دائیں جانب سرکنڈے زور زور سے سرسرائے۔ پھر دو سائے نظر آئے۔ یقیناً یہ بھی وہاب کے کارندے تھے۔ رب نواز نے انہیں ایک گندی گالی دی اور بولا "........ ادھر کیا لینے آئے ہو۔ ادھر دیکھو اس "ماں" کو چارے کے ساتھ ساتھ" وہ دونوں الٹے قدموں واپس چلے گئے۔ پھر رب نواز بھی ٹارچ دائیں بائیں لہراتا آگے نکل گیا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ موت جیسے مجھے چھو کر گزر گئی تھی۔ لیکن وہ ٹلی نہیں تھی۔ اردگرد ہی منڈلا رہی تھی۔ قدموں کی صدا۔ فصل کی سرسراہٹ، گفتگو کی آوازیں سب کچھ میرے آس پاس موجود تھا۔ میرا دل گواہی

دے رہا تھا کہ رب نواز نے مجھے نظرانداز کیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھنے کے باوجود آنکھیں بند رکھیں ہیں۔ مجھے یاد تھا جب میری امی فوت ہو گئی تھیں اور واصف نے مجھے ان کی صورت دیکھنے سے روک دیا تھا تو رب نواز ہی کو میری نگرانی پر لگایا گیا تھا۔ اس روز میں نے رب نواز کی آنکھوں میں کرب کے آثار دیکھے تھے۔ وہ سارا دن مجھ سے نگاہیں چراتا رہا تھا اور اس کے بعد بھی میں جب تک حویلی میں رہی تھی رب نواز کا رویہ میرے ساتھ نرم ہی رہا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اسے مجھ سے ہمدردی تھی لیکن وہ حویلی کے ان ملازمین میں سے تھا جو میری بے بسی کو ترس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

قریباً دس منٹ بعد سرکنڈوں کے اندر کچھ فاصلے پر ملی جلی آوازیں سنائی دیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ عابد کی لاش تلاش کر لی گئی ہے۔ اس واقعے کے تھوڑی ہی دیر بعد گاڑیاں سٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں اور میرے اردگرد پھیلی ہوئی تمام آوازیں سمٹ کر ختم ہو گئیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں موت کی زد سے نکل آئی تھی۔ موت کی پرچھائیاں بدستور مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ بلکہ اب یہ پرچھائیاں تاریک تر ہو گئی تھیں۔ پچھلے دس منٹ میں، میں نے کئی بار پانی سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔ کنارہ ڈھلوان نہیں عمودی تھا بلکہ کچھ اندر کی طرف گیا ہوا تھا۔ درخت کی جڑوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کب کی ڈوب گئی ہوتی۔ گردن تک میرا دھڑ بالکل سن ہو چکا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دیر یہ کیفیت برقرار رہی تو شاید دل بھی ٹھٹھر کر برف کا ٹکڑا بن جائے۔ میں جتنی بار باہر نکلنے کی کوشش کرتی کنارے سے کچھ مٹی ٹوٹ کر پانی میں گر جاتی۔ پھر مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں یہ جڑیں بھی مٹی سے نہ نکل آئیں جنھوں نے مجھے تھام رکھا ہے۔ یہ جوہڑ کوئی ایسا ناقابل عبور نہیں تھا لیکن میرے لئے یقیناً موت کا گڑھا بن گیا تھا۔ فرانسیسی کی ایک کہاوت ہے کہ ڈوبنے والے کے لئے بالٹی بھی سمندر ہوتی ہے۔ میرے لئے بھی یہی جوہڑ بحر منجمد شمالی تھا۔ اس گڑھے میں، میں نے جس طرح پل پل موت کو اپنی طرف سرکتے دیکھا وہ ایک طویل روداد ہے۔ آخر میرے ذہن میں دھند سی چھانے لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں بے ہوش ہو رہی ہوں۔ اس گڑھے میں بے ہوشی کا مطلب موت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں اس وقت کو یاد کرنے لگی جب میں خان رحیمی کی کوٹھی سے نکل کر لاہور روانہ ہوئی تھی۔ شاید میں نے یہ سفر اختیار کر کے غلطی

کی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی بھابی اور اس کے گھرانے کے لئے پریشان ہونے کی۔ اب میرا کیا تعلق تھا بھابی سے' عشرت سے اور ان حالات سے جن سے عشرت گزر رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے تھا۔ صرف اپنے فرحان کے لئے سوچنا چاہیے تھا اور اسی کے لئے جینا چاہیئے تھا۔ اب اگر اس کے قاتل اس زمین پر دندنانے کے لئے زندہ رہ گئے تو میری مامتا کے دامن میں کیا رہ جائے گا۔ میں نے اپنے ذہن کو جھنجھوڑا "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں.......... سن لو میں زندہ رہنا چاہتی ہوں" خوابیدہ ذہن پر موت کی مدہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ میری آواز سننے سے انکار کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ایک کمرے میں آتشدان دہک رہا ہے۔ میں اپنے مہکتے اور قلقاریاں مارتے ہوئے فرحان کو سینے سے لگائے ایک نرم بستر میں دھنستی جا رہی ہوں.......... دھنستی جا رہی ہوں اور ڈوبتی جا رہی ہوں۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک بوسیدہ چٹائی پر پایا۔ میرے جسم کے گرد ایک موٹی گرم چادر مضبوطی سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے بالکل پاس تین اینٹوں سے ایک چولہا سا بنا ہوا تھا اور اس میں آگ جل رہی تھی۔ غالباً آگ کے دھوئیں سے کھانستے ہوئے میں نے آنکھ کھولی تھی۔ یہ اینٹوں کا بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کا در دروازے کے بغیر تھا۔ کمرے میں آگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے گیلے کپڑے کچھ دور ایک رسی سے جھول رہے تھے۔ اچانک مجھے سلیم کی کھانسی سنائی دی اور میں بھونچکی رہ گئی۔ وہ کمرے کے در میں سے جھک کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ خشک لکڑیاں تھیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس چلا آیا۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آ گئی۔"

میں نے چادر کو اپنے گرد سمیٹتے ہوئے کہا "میں کہاں ہوں' یہ کون سی جگہ ہے....... وہ پانی....... اور.......... مجھے کس نے نکالا؟"

وہ بولا "میں نے نکالا ہے' اگر دو گھڑی اور نہ پہنچتا تو ڈوب گئی ہوتیں۔"

"مگر یہ جگہ کون سی ہے؟"

"سب کچھ بتاتا ہوں تمہیں ایک منٹ صبر کرو" اس نے کہا اور بجھتی ہوئی آگ کو بچانے کے لئے چولہے میں لکڑیاں رکھنے لگا۔ آگ جل گئی تو اس نے کونے سے ایک

بوسیدہ کپڑا اٹھایا اور چٹائی کے پاس سے پانی صاف کرنے لگا۔ کپڑے کو باہر پھینکنے کے بعد وہ میرے پاس آ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔

"تم نے لاہور جا کر اچھا نہیں کیا' کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا' اب کیا پڑا تھا تمہارے لئے اس گھر میں؟"

میں نے کہا "سلیم! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو........ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیسے پہنچی اور تم........ کیسے پہنچے۔"

اس نے کہا "اخبار میں فرخندہ کی موت کی خبر پڑھی' یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اس کے ساتھ دیکھی گئی ہو اور پولیس کو تمہاری تلاش ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ "ہوم لائیک" ہوٹل میں تمہارا سراغ ملا ہے لیکن تم پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی ہو۔ "ہوم لائیک" ہوٹل فرخندہ کے منگیتر کا ہے میں سمجھ گیا کہ تم اس کے ساتھ گئی ہو' میں اپنی موٹر سائیکل پر فرخندہ کے منگیتر کا گھر تلاش کرتا پھر رہا تھا جب ایک سڑک پر میری نظر چنگیزیوں کی نیلی پجارو گاڑی پر پڑی۔ میں اس گاڑی کو لاہور میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور فوراً پیچھا شروع کر دیا۔ جلدی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پجارو بھی ایک ہنڈا کار کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی لاہور سے نکلیں اور شیخوپورہ روڈ پر مڑ گئیں۔ میں نے تعاقب جاری رکھا مگر یہاں پہنچ کر میری موٹر سائیکل گاڑیوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے انجن نے گڑبڑ شروع کر دی۔ مجبوراً مجھے رفتار سست کرنا پڑی۔ بہرحال میں نے پیچھا جاری رکھا کیونکہ مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگلی گاڑی میں تم اور عابد ہو۔"

"شیخوپورہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی میری موٹر سائیکل بند ہو گئی۔ میں نے پلگ وغیرہ کھول کر صاف کیا اور پٹرول ڈلوا کر دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ دونوں گاڑیوں نے جھنگ کا رخ کیا ہے لہٰذا راستے میں کہیں بھی دوبارہ مڈبھیڑ ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ شیخوپورہ سے نو دس میل آگے ایک جگہ سڑک کے کنارے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہنڈا سوک کھیتوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اس کا اگلا پہیہ ایک کھائی میں تھا۔ قریب ہی پولیس بھی نظر آئی۔ تاہم میں ہمت کر کے وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں سے پتہ چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں زبردست فائرنگ بھی ہوئی ہے۔ سامنے سرکنڈوں میں ایک

جرائم پیشہ شخص مارا گیا ہے اور اس کی ساتھی عورت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے........ میں موٹر سائیکل لے کر آگے بڑھ گیا کچھ دور جا کر میں نے سڑک چھوڑی اور کھیتوں میں گھس گیا۔ ایک طویل چکر کاٹ کر میں سرکنڈوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹر سائیکل ایک جگہ گنے کے کھیت میں چھپائی اور ادھر ادھر گھومنے لگا۔ سرکنڈوں کے پاس سے اچانک مجھے چیخنے کی آواز آئی۔ میں بھاگتا ہوا جوہڑ کے کنارے پہنچا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ یہ تم ہو اور ڈوب رہی ہو۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تمہیں نکال لیا۔"

میں نے پوچھا "یہ جگہ کون سی ہے؟"

سلیم نے کہا "اینٹوں کا ایک بھٹہ ہے۔ اس جوہڑ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے سوچا شاید یہاں کوئی مددگار مل جائے گا مگر بھٹہ بند پڑا تھا۔ میں تمہیں اس خالی کمرے میں لے آیا۔ تمہارے پیٹ میں پانی بھرا تھا' بڑی مشکل سے نکالا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی تم نے ایک الٹی کی ہے........" مجھے وہ پانی یاد آیا تھا جو تھوڑی دیر پہلے سلیم نے کپڑے سے صاف کیا تھا۔ پھر میری نگاہ ان کپڑوں پر پڑی جو رسی سے جھول رہے تھے۔ اچانک کسی نے میری پلکوں پر منوں بوجھ رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ یہ سانس مجھے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلا رہے تھے' اور یہ احساس بھی دلا رہے تھے کہ زندگی کتنی ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ ایک شاعر کا گیت ہی نہیں نہ ہی صرف ایک مصور کی تصویر ہے اور نہ ہی فقط ایک پھول کی خوشبو' یہ زندگی ایک ٹھہرا ہوا جوہڑ بھی ہے' ایک ستی بھی ہے اور ایک کھردری گرم چادر بھی........ میں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی اور چولہے میں نیم خشک لکڑیاں تڑتڑ کی آواز سے جلتی رہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے سلیم سے پوچھا "ہمیں یہاں کتنی دیر ہو گئی ہے؟" وہ بولا "قریباً ڈھائی گھنٹے' میں بارہ بجے تمہیں وہاں سے لایا تھا۔ آدھ گھنٹہ راستے میں لگا اور اب تین بجے ہیں۔"

عابد کی موت کا منظر میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اب تک ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی ہوں لیکن وہ خواب نہیں تھا ایک جیتا جاگتا المیہ تھا۔ میں نے سلیم کو عابد کی موت کے بارے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گیا۔ کہنے سننے کے لئے ہمارے پاس اب کیا رہ گیا تھا ہم میدان جنگ میں تھے اور جنگ میں کام آنے

والے پیاروں کا ماتم نہیں کیا جاتا۔ انہیں پھلانگ کر جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ جب موت ارزاں ہو جائے تو پھر وہ اہم نہیں رہتی۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہم جھنگ پہنچ گئے۔ وہاں سے خان رحیمی کے ایک خاص کارندے نے ہمیں بذریعہ ویگن خان رحیمی کے علاقے تک پہنچا دیا۔ میں اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا میں کچھ دلیر سی ہو رہی ہوں۔ اپنے گردوپیش کی ہر خوفناک چیز اب کچھ کم خوفناک محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ان سنگین حالات کا نتیجہ تھا جن سے میں گزر رہی تھی' یا گزاری جا رہی تھی۔

کوٹھی میں شام کے وقت خان رحیمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ پہلے تو مجھ سے لاہور کے حالات سنتا رہا۔ میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ سوائے اس بات کے کہ میں عشرت کی شرمناک تصویریں دیکھنے کے بعد لاہور گئی تھی اور یہ کہ عشرت کی شکل میری بھابی سے ملتی ہے۔ میں نے صرف یہ بتایا کہ میں بھائیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ خان رحیمی نے پوری روئیداد اطمینان سے سنی۔ گاہے مسکراتا اور گاہے رنجیدہ ہوتا رہا۔ فرخندہ اور عابد کی ناگہانی اموات کے ذکر نے اسے بھی افسردہ کیا۔ ویسے وہ اس بارے میں بہت کچھ پہلے ہی جان چکا تھا۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے ذرائع بہت وسیع تھے........

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان دنوں وہاب چنگیزی کے ڈیرے پر ایک نوخیز لڑکی موجود ہے جسے چنگیزی کہیں سے زبردستی لائے ہیں اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ وہاب چنگیزی کے پاس ایک شیر ہے جو اس نے حال ہی میں کسی مقامی شوقین سے خریدا ہے........ لیکن اسے اس سنگین واردات کا ہرگز علم نہیں تھا۔ جس میں اس شیر نے کوٹھی میں گھسنے والے تین آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا اور وہ موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ وہ یہ سب کچھ سن کر حیران ہوا........ گفتگو کے دوران سلیم کا ذکر چل نکلا۔ خان رحیمی نے کہا۔

"گرل! یہ شخص جو ہر وقت تیرا دم چھلا بنا رہتا ہے۔ آخر ہے کیا چیز؟ مجھے تو اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "سر! اس شخص کی کوششوں سے آپ کو لاکھوں روپے کا باز حاصل ہوا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی تعارف کی ضرورت رہتی ہے؟"

خان رحیمی بولا "نہیں........ یہ بات نہیں ویسے تو وہ بہادر ہے' ذہین بھی ہے

لیکن تمہارے بارے میں اس کا رویہ عجیب سا ہے۔ کچھ عشق و شق کی بیماری لگتی ہے اسے۔ آئی مین کچھ اورینٹل سا ہے' وہ اتنا عرصہ گزر گیا پھر بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔"

خان رحیمی نے کتنی مشکل بات کتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی۔ میں گڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ بغور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "سر! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ اسی سے پوچھ لیجئے۔"

خان رحیمی نے میز کے نچلے حصے سے ایک باسی اخبار اٹھالیا اور بولا "اب یہی دیکھو اس میں چودھری شہاب کا بھلا کیا قصور تھا' اسے مار کر زخمی کر دیا تمہارے اس ہیرو نے۔"

میں نے اخبار خان رحیمی کے ہاتھ سے جھپٹی۔ چودھری شہاب کے بارے ایک کالمی خبر چھپی تھی۔ سرخی تھی چنگیزی قتل کیس میں ملوث ملزم زخمی۔ نیچے لکھا تھا کل شام "ہوم لائیک" ہوٹل کے سامنے ایک نامعلوم موٹر سائیکل سوار نے چودھری شہاب سے گالی گلوچ کیا اور بعد میں اس پر جھپٹ پڑا۔ چودھری شہاب کو زخمی کرنے کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گلبرک پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ چودھری شہاب' واصف چنگیزی کے مشہور مقدمہ قتل میں ملوث ہے۔"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"رقابت" خان رحیمی نے مختصر جواب دیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!"

"مطلب یہ ہے کہ سلیم تم سے محبت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ چودھری شہاب بھی تم میں دلچسپی لیتا ہے اس بات پر اس نے چودھری شہاب کو پیٹ ڈالا ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔"

مجھے سوجھ نہیں رہا تھا اس موقع پر کیا کہوں۔ خان رحیمی نے میری پریشانی بھانپ کر خاموشی کو توڑا "درحقیقت سلیم سے پہلے چودھری شہاب ہی تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔ اخبار میں تو کوئی اطلاع نہیں تھی۔ چودھری شہاب نے ہی کھوج لگایا تھا کہ تم "ہوم لائیک" ہوٹل میں ہو۔ وہ تم تک پہنچنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا جب سلیم سے اس کی

مڈبھیڑ ہو گئی۔ سلیم نے غصے سے کہا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے اس طرح ایک اجنبی لڑکی کیلئے پریشان ہونے کی۔ شہاب نے کہا "وہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں" اس بات پر تکرار ہو گئی۔ سلیم غصے سے بے قابو ہو کر شہاب پر پل پڑا۔ میرا ایک مخبر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ قصور سلیم کا ہی تھا۔ شہاب آخری وقت تک لڑائی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ مار کھا کر بھی اس نے سلیم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بعدازاں شہاب کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر رہا ہے۔ میں نے سوچا پولیس اسے پھر کسی چکر میں نہ الجھا لے۔ راتوں رات میں نے اسے ہسپتال سے نکلوایا اور یہاں لے آیا یہ سب کچھ بڑی رازداری سے کیا گیا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "تو وہ یہاں ہے؟"

خان رحیمی نے اثبات میں جواب دیا۔ بولا "مہمان خانے میں ہے درد کی دوا کھا کر سویا ہوا ہے تم ابھی جا کر اسے بے آرام نہ کرنا........"

میں گہری سوچ میں کھو گئی۔ یہ سلیم کیا تماشے کر رہا تھا کبھی کبھی مجھے اس پر بے حد غصہ آ جاتا تھا مگر یہ غصہ زیادہ دیر برقرار بھی نہیں رہتا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ مجھے اس کے بارے میں کس انداز سے سوچنا چاہئے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر خان رحیمی نے کہا "ویسے میں نے ان دونوں کی صلح کرا دی ہے۔ تم اپنے طور پر بابری' میرا مطلب ہے سلیم کو سمجھاؤ کہ وہ ہوش سے کام لے۔ ہماری اپنی صفوں میں انتشار ہو گا تو دشمن ہمیں روئی کی طرح دھنک دے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے میں اس سے بات کروں گی۔"

خان رحیمی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "سر میرا علیحدہ سے کوئی ارادہ نہیں ہے جو آپ کہیں گے وہی ہو گا۔"

میں نے وہ خط خان رحیمی کے سامنے رکھ دیا جو فرخندہ کے ساتھی رپورٹر نے کوہاٹ کے کسی ڈاک خانے سے پوسٹ کیا تھا۔

خان رحیمی نے لفافے کو سرسری نظر سے دیکھا اور بولا "تمہارا کیا خیال ہے۔ وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے یہ ثبوت کافی ہیں؟"

"سب کچھ آپ کے سامنے ہے جناب" میں نے جواب دیا "وہاب کے غنڈوں نے پچھلے تین دن کے اندر دو افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور جس راز کو چھپانے کیلئے انہوں نے یہ گھناؤنے قتل کئے ہیں وہ بھی چھپا نہیں رہ سکا۔ فرخندہ کے ساتھی کی اس تحریر کے مطابق اس امر کی ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ چنگیزیوں نے ایک لڑکی کو اغوا کیا اور اس کی رہائی کیلئے آنے والے چار افراد کو اذیت ناک موت سے دوچار کر کے بے کفن دبا دیا۔ کیا یہ سب کچھ قانون کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی نہیں؟"

"نہیں" خان رحیمی نے مایوسی سے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا "یہ سب کچھ ناکافی ہے۔ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ چنگیزیوں نے قانون کو اس طرح الجھا رکھا ہے کہ وہ رسہ جسے ان کی پھانسی کا پھندا بننا تھا ان کے ہاتھ کی کمند بنا ہوا ہے اور اس کمند سے وہ جرائم کی نئی نئی چوٹیاں سر کر رہے ہیں۔ اس جمود کو توڑنے کیلئے ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ برائی کے اس درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کیلئے ایک تند آندھی درکار ہے۔"

میں نے خان رحیمی کی طرف دیکھا وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اپنے جذباتی پن کو محسوس کر کے اس نے پائپ سے چند گہرے کش لئے اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"صبر مائی ڈیئر...... تھوڑا سا صبر۔ میں تمہاری دلی کیفیت سے آگاہ ہوں اپنی عزیز فرینڈ اور اس کی منگیتر کی موت نے تمہیں زخم زخم کر دیا ہے۔ فطری بات ہے کہ تم ان کے لئے انصاف چاہتی ہو...... مگر میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں اس موقع پر کوئی بھی جلد بازی تمہاری منزل کو تم سے بہت دور کر دے گی۔ اگر دل پر بہت بوجھ ہے تو جاؤ کسی کمرے کے کونے میں منہ دے کر جی بھر کر رو لو۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر مسکراتی ہوئی میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسا خوبصورت لطیفہ سناؤں گا کہ تمہیں شرطیہ ہنسی آئے گی۔ نہ آئے تو میرا نام خان رحیمی نہیں......"

عجیب آدمی تھا وہ موقع محل دیکھے بغیر مسکرانے کی فکر میں رہتا تھا اس سے پہلے بھی ایک دن وہ بڑی سنجیدگی سے ایسی ہی شرط لگا چکا تھا۔ بڑے دعوے کے ساتھ اس نے شاہ دین ٹوانہ کو لطیفہ سنایا تھا اور جب اسے ہنسی نہیں آئی تو ہاتھ اٹھا کر بولا تھا' ٹھیک ہے میرا نام خان رحیمی نہیں۔ اس کی اس ادا پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

خان رحیمی کو ملنے سے پہلے میرے سینے میں طوفان سے اٹھ رہے تھے جی چاہتا تھا ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر فرخندہ کے قاتلوں کی تلاش میں نکل جاؤں۔ ان قاتلوں کی تلاش میں جن کی گردن پر صرف فرخندہ اور عابد کا خون ہی نہیں تھا۔ میرے فرحان کا خون بھی تھا۔ وہ جہاں بھی ہیں انہیں ڈھونڈ لوں۔ پھر خود مر جاؤں یا انہیں مار دوں......

مگر خان رحیمی کی عام سی باتوں میں نامعلوم کیا جادو تھا کہ میرے اندر کے شعلے دھیمی آنچ میں بدلنے لگے۔ خان رحیمی کے بتائے بغیر ہی میں سمجھنے لگی کہ اس موقع پر میری کوئی بھی جلد بازی وہاب چنگیزی کے حق میں جائے گی۔ وہاب چنگیزی مجرم ضرور تھا لیکن ان مجرموں میں سے تھا جن کا جرم ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ خان رحیمی کے کہنے پر میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ برآمدے میں پہنچ کر مجھے چودھری شہاب کا خیال آیا اور میرے قدم خود بخود مہمان خانے کی طرف اٹھ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ کوٹھی کی راہداریوں اور کمروں میں بلب جلنے لگے تھے۔ سامنے ہی دینو ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے تیز تیز قدموں سے کسی کمرے میں جا رہا تھا۔ اس کی چال میں بڑا نسوانی سا لوچ تھا۔ دیکھ کر خوامخواہ ہنسی آجاتی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی اور کچھ نہیں تو پانچ دس منٹ ضرور ضائع ہوتے۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہی پیچھے چلتی رہی۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کی منزل بھی مہمان خانہ ہی ہے۔ دراصل وہ چودھری شہاب کیلئے ہی کھانا لے کر جا رہا تھا۔ میں اس کمرے میں پہنچی تو چودھری شہاب غسل خانے سے نکل کر واپس بستر پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک پاؤں پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پیشانی پر بھی بھاری بھرکم پٹی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے سہارا دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اسے بستر پر پہنچا کر میں سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ دینو ٹرے میز پر رکھ چکا تھا۔ غصیلے لہجے میں بولا۔

"شاہدہ بی بی! یہ بابری مجھے تو بالکل چنگا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں آپ کو کیوں چنگا لگتا ہے۔ اب دیکھیں اس نے چودھری صاحب سے بدو بدی لڑائی مول لی ہے۔ بالکل ناضروری طور پر۔ ذرا سوچیں۔ ایک بندا لڑنا ہی نہیں چاہتا آگے سے ہاتھ ہی نہیں اٹھاتا تو دوجے کو بھی کچھ حیا آنی چاہیے۔ پتہ نہیں کس پہاڑی بکرے کی اولاد ہے وہ۔ اتنی زور سے ٹکر ماری ہے چودھری صاحب کو کہ سارا ماتھا نیلا ہو گیا ہے۔ پاؤں پر بھی اینٹ ماری

ہے دو تین انگلیاں کڑچ کر دی ہیں۔ وہ تو شکر ہے اوپر والے کا لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔"

شہاب مسکراتا ہوا بولا "اوئے میراثی تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے خود وہاں موجود تھا۔"
دینو بولا "میں موجود نہیں تھا مگر محسوس تو کر سکتا ہوں۔ احساس بھی کوئی شے ہوندی ہے۔"
میں نے کہا "چودھری شہاب مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تمہیں یہ زخم میری وجہ سے آئے ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"
وہ بولا "جی آپ کو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا اس میں کیا قصور ہے۔ مجھے تو بابری پر بھی کوئی رنج نہیں۔ بس وہ طبیعت کا کڑوا ہے۔"
شہاب کی تحمل مزاجی پر مجھے حیرانی ہو رہی تھی وہ تو زبان سے زیادہ ہاتھ استعمال کرنے کا عادی تھا۔ میں کچھ دیر چودھری شہاب کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی اس نے فرخندہ اور عابد کی موت پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ میں چودھری شہاب کے کمرے سے نکلی تو سامنے ہی لان میں سلیم نظر آیا۔ اس نے چبھتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی پھر بے نیازی سے منہ دوسری طرف پھیر کر عشرت کو آوازیں دینے لگا۔ وہ کوٹھی کی چھت پر ایک بڑی سی رنگین پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلیم نے "میم صاحب" کہا تو وہ جھوم اٹھی اور پکار کر کہنے لگی۔

"بابری جلدی اوپر آؤ یہ مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔ اوئی اللہ میری تو انگلیاں کٹ جائیں گی۔" پتنگ دائیں بائیں بے قراری سے حرکت کر رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ پتنگ نہ ہو۔ عشرت کے اپنے "جذبے" ہوں جو سنبھالے نہ سنبھل رہے ہوں اور وہ مدد کیلئے بابری کو پکار رہی ہو۔

اس روز بھی میں نے بابری کا ہیولا عشرت کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور ساری رات دل ودماغ میں جنگ جاری رہی۔ یہ لڑکی میری بھابی کی بہن تھی' وہ اس طرح گناہ کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی کہ اس کا پورا وجود ایک گالی بن رہا تھا۔ اگلے روز جب وہ کاندھے پر کپڑا ڈالے اپنے بال کھولے چھت کی دھوپ میں ٹہل رہی تھی میں اس کے پاس جا پہنچی۔ اس کی ذات ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی طرح میرے دماغ سے چپکی

ہوئی تھی۔ میں اس کے بارے جاننا چاہتی تھی' اس کی یہاں موجودگی کا مطلب سمجھنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی اور ہم دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ آج وہ میرے ساتھ گفتگو میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ جلد ہی مجھے عجیب طرح کا احساس ہونے لگا۔ عشرت وہی کام کر رہی تھی جو میں کرنا چاہتی تھی یعنی میں تو اسے کریدنے کیلئے یہاں آئی تھی اور وہ الٹا مجھے کرید رہی تھی۔ جب میں نے اس کیفیت کو محسوس کر لیا تو جان بوجھ کر انجان بن گئی۔ میں نے عشرت کو اس کی روانی میں بہنے دیا۔ وہ خود کو بہت ہوشیار اور باخبر سمجھ رہی تھی۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ میں خان رحیمی پر ڈورے ڈالنے کیلئے یہاں ٹھہری ہوئی ہوں اور اس بڈھے کو اپنے ہاتھوں میں کر کے مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

وہ بولی "شاہدہ' یہ خان صاحب ہر دوسرے تیسرے دن کہاں جاتے ہیں میں نے سنا ہے کہ یہاں آس پاس کوئی مرغی خانہ ہے جس میں خان رحیمی کا حصہ ہے؟"
میں نے کہا "ہاں مرغی خانہ تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس میں خان کا حصہ ہے۔"

وہ بولی "دینو کہتا تھا کہ وہاں جا کر بازوں کو ٹریننگ دیتے ہیں۔ ٹریننگ کے لئے کیا اس مرغی خانے میں جانا ضروری ہے۔ یہاں بھی تو بہت جگہ ہے ہاں' یاد آیا کہ ایک دن تم بھی تو گئی تھیں خان رحیمی کے ساتھ' کیا بہت بڑا مرغی خانہ ہے؟"
"نہیں.......... کچھ زیادہ بڑا تو نہیں' مگر احاطہ کافی کھلا ہے۔ اگر دیکھنے کا اتنا ہی تجسس ہے تو خان رحیمی سے کہو وہ لے جائے گا۔"
"نہیں.......... تجسس کی کوئی بات نہیں" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے خان رحیمی سے ضرور فرمائش کی ہو گی مگر وہ ٹال گیا ہو گا۔ عشرت کی اس دلچسپی کا راز مجھے بخوبی معلوم تھا۔ میرے کانوں میں وہ گفتگو گونج رہی تھی جو میں نے لاہور جانے سے پہلے عشرت کے باتھ روم کی کھڑکی سے سنی تھی۔ خانم نامی اس عورت نے عشرت کو مجبور کیا تھا کہ وہ جلد از جلد کوئی عملی قدم اٹھائے ورنہ اسے یہاں بھیجنے والے اس سے بری طرح پیش آئیں گے۔ عشرت کو دھمکانے کیلئے اسے وہ منحوس لفافہ بھی دکھایا گیا تھا۔ اب اس عورت کی ہدایت پر عشرت کوٹھی کی خفیہ سرگرمیوں میں جھانکنے کی طفلانہ

کوشش کر رہی تھی۔ میں اس کو طفلانہ کوشش ہی کہہ سکتی تھی کیونکہ کسی اکیلی دکیلی عورت کیلئے اس سارے گورکھ دھندے کو سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ ہماری باتوں کے دوران ہی دور سے گرد کے بال اڑتے نظر آئے۔ دو یا تین گاڑیاں کوٹھی کی طرف آرہی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ خان رحیمی کے گھڑسوار بھی تھے۔ گاڑیاں نزدیک پہنچیں تو عشرت نے ایک گہری اور سرد سانس لی "شاہ صاحب آگئے ہیں" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ شاہ سے اس کی مراد شاہ دین ٹوانہ تھا' جسے بعض لوگ غلطی سے اس کا خاوند بھی سمجھتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ کوٹھی کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔

شاہ دین ٹوانہ کی آمد کے بعد کوٹھی میں بہت گہما گہمی رہی۔ کچن ہمیشہ سے زیادہ مصروف ہوگیا۔ خان رحیمی نے شاہ دین کے اعزاز میں رقص و سرور کی محفل کا اہتمام بھی کیا۔ ان کا پروگرام باز کے شکار کا تھا۔ تاہم فی الفور قرب وجوار میں کسی پرندے کا سراغ نہیں ملا۔ شاہ دین ٹوانہ کی آمد کے تیسرے روز خان رحیمی نے سور کے شکار کا پروگرام بنایا۔ سور کشی کیلئے خان رحیمی کا اپنا ایک انداز تھا۔ اس نے بہت سے گھوڑے پال رکھے تھے جن پر بیٹھ کر جنگلی سوروں کا تعاقب کیا جاتا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بندوقوں کے علاوہ کبھی کبھی نیزے اور بلم بھی استعمال ہوتے تھے۔ خان رحیمی نے مجھے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ تقسیم ہندوستان سے پہلے جے پور میں اس نے نیزے سے سور مارنے کے مقابلے میں طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس کے البم میں ایسی بہت سی تصویریں بھی تھیں جن میں وہ راجستھان کے راجوں مہاراجوں کے ساتھ سیر و شکار میں مصروف نظر آتا تھا۔ نیزے سے سور کشی کے بارے میں اس نے مجھے اتنی باتیں بتائیں تھیں کہ نہ دیکھتے ہوئے بھی شکار کے سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

شکار پر روانہ ہوتے ہوئے جب خان رحیمی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا تو میں تیار ہوگئی۔ مجھے کسی بھی مصروفیت کی ضرورت تھی تاکہ پاگل کر دینے والی سوچوں سے فرار حاصل کر سکوں.......... ہم صبح سات بجے کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ ساری پارٹی قریباً ساٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ ان ساٹھ افراد میں اصل شکاری تو دس پندرہ ہی تھے۔ باقی تعداد ہانکا کرنے والے دیہاتیوں کی تھی۔ انہوں نے ہاتھوں میں ڈھول' کنستر' بناسپتی گھی کے ڈبے' باجے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھا رکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ننگے پاؤں تھے۔

لباس سب کا میلا کچیلا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ اور خان رحیمی کے علاوہ چند اور معززین بھی اس شکار میں شریک تھے۔ ان میں ایک صاحب کوئی ریٹائرڈ کرنل تھے۔ دوسرے بھارت سے آئے ہوئے ایک سردار جی تھے۔ سردار جی کی تھل تھل کرتے جسم والی فیشن ایبل پتنی بھی ساتھ تھی۔ ایک نوجوان شکاری لاہور سے آیا ہوا تھا۔ عشرت بھی اس پارٹی میں شریک تھی۔ اس نے سرخ شرٹ' نیلی جین اور شکاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ چینکبرے گھوڑے پر سوار وہ شاہ دین ٹوانہ کے شانہ بشانہ جا رہی تھی۔ سلیم ساتھ نہیں آیا تھا۔ کوٹھی میں کسی مہمان کی آمد متوقع تھی اور خان رحیمی نے اسے اس کے استقبال کیلئے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ شکاری پارٹی کے پیچھے پیچھے خان رحیمی کا "افسر شکار خانہ" جو گنجے سر والا ایک ادھیڑ عمر فارسٹ گارڈ تھا بہت سا ساز و سامان چھکڑے پر لئے آ رہا تھا۔ اس میں سامان خورد و نوش کے علاوہ بندوقیں اور نیزے وغیرہ بھی تھے۔ نیزوں کی انیوں کو صاف کیا گیا تھا اور وہ خوب چمک رہی تھیں۔ اس اسلحے میں چند تلواریں بھی تھیں۔ دینو ان تیز دھار آلات کو دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔ غالباً اس سے پہلے دینو نے یہ چیزیں لاہور کے عجائب گھر میں ہی دیکھی تھیں۔

مجھ سے کہنے لگا' "یہ.......... خان صاحب کے بزرگ پچھلے زمانے میں جنگیں شنگیں بھی کرتے رہے ہیں۔" میں نے نفی میں جواب دیا بولا "مجھے تو لگتا ہے پانی پت کی لڑائی میں آگے آگے یہی تھے.......... اتنے ڈراؤنے اسلحے کا یہ لوگ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "تم بھی دیکھنا میں بھی دیکھوں گی۔"

قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں شکار کھیلا جانا تھا۔ کافی گھنے درخت تھے۔ جھاڑ جھنکار بھی کثرت سے تھا۔ خان رحیمی کے کارندوں نے جلدی جلدی دھوپ میں دو خیمے کھڑے کر دیئے۔ اس وقت تک نو بج چکے تھے۔ دھوپ میں یہاں وہاں لیٹ کر سب لوگوں نے تھوڑی دیر کیلئے کمر سیدھی کی' پھر شکار کے لئے تیار ہوگئے۔ ہم تو دیکھنے والوں میں تھے اس لئے ایک طرف کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ خان رحیمی نے چار چار گھڑسواروں پر مشتمل چار پارٹیاں ترتیب دیں پھر سکے کے ذریعے ٹاس کی گئی کہ کس پارٹی کو سب سے پہلے جانور کا تعاقب کرنا ہے۔ ٹاس جیتنے والی پارٹی شاہ دین ٹوانہ کی تھی۔ وہ اپنے عربی گھوڑے پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

اس کے تینوں ساتھ بھی تیار تھے ان سب کے ہاتھ میں نیزے تھے شاہ دین کی کمر سے ریوالور لٹک رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی سنسنی تھی۔ میں نے ایک کارندے سے پوچھا "سور کہاں ہے؟" اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس سامنے والے جھنڈ سے نکلے گا.......... وہ درختوں اور جھاڑیوں کا ایک کافی بڑا جھنڈ تھا۔ کہیں کہیں لمبی جنگلی گھاس بھی اگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا ہانکا کرنے والے افراد جو یہاں تک پاپیادہ ہمارے ساتھ آئے تھے اپنے سامان کے ساتھ جھنڈ کی تین اطراف پھیل رہے ہیں.......... جیسا کہ بعد میں پتہ چلا خان رحیمی کے بھیجے ہوئے کھوجیوں نے ہمارے پہنچنے سے پہلے دو مختلف مقامات پر دو جانوروں کو گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک جانور اس جھنڈ میں تھا۔ اب اسے ہانکا کرکے باہر نکالا جانا تھا۔ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ کے مخصوص اشارے پر دیہاتیوں نے ہانکا شروع کیا۔ ایکا ایکی ڈھول 'کنستر' باجے سب کچھ بجنے لگا۔ ہانکا کرنے والے منہ سے بھی "ہاؤ ہو" کی آوازیں نکال رہے تھے۔ شاہ دین اور اس کی ساتھیوں کے تربیت یافتہ گھوڑے چوکس ہوگئے۔ ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ نتھنے پھول گئے اور اگلے پاؤں زمین پر گردش کرنے لگے۔ ہانکنے والے اپنا گھیرا تنگ کرتے ہوئے تین اطراف سے آگے بڑھنے لگے اور پھر.......... ہم نے ایک سیاہی مائل جانور کو جو عام سائز کے کتے سے دوگنا تھا جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا۔ اس کی لمبی تھوتھنی دیکھ کر جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے مخالف سمت میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی شاہ دین اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور سور کے پیچھے لپکے۔ گھوڑوں کی آہٹ سنتے ہی سور کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ وہ بدک کر پوری رفتار سے بھاگا۔ گھوڑے تند بگولوں کی طرح اس کے پیچھے گئے۔ ہم سب بے ساختہ اپنی کرسیوں کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں والے گرد آلود میدان میں وہ ایک سنسنی خیز دوڑ تھی۔ جنگلی سور گھوڑوں کے آگے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نشیبی راستے پر اوجھل ہوگیا۔ چند لمحے بعد گھوڑے بھی اس نشیب میں اتر گئے.......... شاہ دین ٹوانہ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ صرف ایک سوار کا نیزہ اسے معمولی زخم لگا سکا تھا۔ گھوڑے پسینہ پسینہ ہو کر ہانپ رہے تھے۔

سوار بھی نڈھال سے تھے۔ ابھی خان رحیمی ان سے اس "ہیٹ" کی تفصیلات پوچھ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے شور سنائی دیا۔ بہت سے دیہاتی ایک ساتھ چیخے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو ایک سور ہانکا کرنے والوں سے گھبرا کر سیدھا ہماری طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ عشرت کی چیخیں نکل گئیں۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ ویسے بھی اب ان کی باری تھی۔ خان رحیمی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیزہ سونت کر جانور کی طرف بڑھا۔ سؤر نے گھوڑوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پچھلے پاؤں پر گھوم کر رخ بدلا اور مخالف سمت میں بھاگا۔ ایک بار پھر تعاقب کا سنسنی خیز منظر دیکھنے میں آیا۔ خان رحیمی نے بھاگتے گھوڑے سے سؤر پر نیزہ پھینکا وہ اس کی پشت سے اچھل کر جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔ تاہم خان رحیمی کے ایک ساتھی نے جانور پر کاری وار کیا۔ بڑے شاندار طریقے سے بھاگتے گھوڑے سے جھک کر اس نے نیزہ سؤر کی پسلیوں میں اتار دیا۔ یہ کاری زخم کھا کر جسیم سؤر تیزی سے پلٹا اور گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ گھوڑا سوار سمیت اوندھے منہ جھاڑیوں میں گرا۔ سؤر کی پسلیوں میں پھنسا ہوا نیزہ بڑا خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ سؤر گرے ہوئے سوار پر حملہ آور ہوتا یا اپنی مہلک تھوتھنی سے گھوڑے کا پیٹ پھاڑ ڈالتا۔ پارٹی کے ایک پٹھان ممبر اصغر شاہ نے یاعلی کا نعرہ لگا کر ایسی مہارت سے نیزہ مارا کہ وہ سیدھا سؤر کے سینے میں جا گھسا۔ دوسرا نیزہ کھا کر اس نے زمین پر اتنی تیزی سے لوٹنیاں کھائیں کہ دونوں نیزوں کے دستے توڑ دیئے۔ چند ہی لمحے کے بعد وہ تڑپ کر ساکت ہوگیا۔ اسے کھینچ کر خیموں کے پاس لایا گیا۔ وہ خاصا جسیم جانور تھا۔ اس شکار کے قانون کے مطابق شکار کا کریڈٹ اسی گھڑسوار کو جاتا ہے جس کا نیزہ سب سے پہلے جانور کو چھوئے۔ اس طرح یہ شکار خان رحیمی کے کھاتے میں گیا۔ حالانکہ وہ صرف ایک کمزور سا وار ہی کر سکا تھا.......... میں نے خان رحیمی سے پوچھا کہ جب سؤر نے گھڑسوار کو نیچے گرا دیا تھا اور چند لمحوں کیلئے سوار کی جان کو خطرہ پیدا ہوگیا تو آپ نے گولی کیوں نہیں چلائی۔ جواب میں خان رحیمی نے بتایا کہ شکار کے قواعد کے مطابق یہ لڑائی آتشیں اسلحے کے بغیر لڑی جاتی ہے شکار اور شکاری کیلئے مرنے اور مارنے کے یکساں مواقع ہوتے ہیں اور بعض اوقات واقعی شکاری کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ "ہیٹ" یعنی تعاقب شروع ہونے کے بعد اگر کوئی شکاری گھبرا کر رائفل وغیرہ کا استعمال

کرتا ہے تو اسے نہ صرف مقابلے سے خارج کر دیا جاتا ہے بلکہ ساتھی اسے بزدل بھی گردانتے ہیں۔ میں حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔
اس دوران کھوجیوں نے آکر اطلاع دی کہ خشک نالے کی دوسری جانب گنے کے کھیتوں میں کچھ اور سوروں کا سراغ ملا ہے۔ اس اطلاع سے شکاریوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی' اور وہ گھوڑوں کے زین بند کسنے کے بعد اس جانب روانہ ہوگئے۔
مار دھاڑ کا یہ سلسلہ لنچ کے وقفے کے سوا شام تک جاری رہا۔ موسیقی کے علاوہ ناؤ نوش کا انتظام بھی تھا۔ کچھ لوگ ایک قریبی جوہڑ میں چھوٹی مچھلی کا شکار کھیلنے لگے۔ کچھ نے ائرگن سے پرندوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے جب اچانک مجھے احساس ہوا کہ عشرت کافی دیر سے نظر نہیں آ رہی۔ آخری بار میں نے اسے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دیکھا تھا جب وہ دینو سے باتیں کر رہی تھی۔ میں دینو کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھا کہ عشرت کہاں ہے۔ اس نے کہا۔
"جی میں کی کہہ سکدا ہاں۔ ابھی تو ایتھے تھیں۔ وہ سامنے والے درختوں میں گھوڑ سواری کی مشق کر رہی تھیں۔"
میں نے پوچھا "وہ تم سے باتیں بھی تو کر رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟"
دینو نے کہا "وہی مرغی خانے کا ذکر چھیڑیا ہوا تھا جی۔ پچھتی تھیں یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں نے کہا یہاں سے تو نیڑے ہی ہے۔ میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہے۔"
دینو کی بات سن کر فوراً" میرے ذہن میں آیا کہ ہو نہ ہو وہ بیوقوف اسی طرف نکل گئی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا وہ کیا کر رہی ہے۔ اس مرغی خانے کے گرد نگران آنکھوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ جاسوسی کے شوق میں خوامخواہ مصیبت میں پھنس سکتی تھی۔ دینو سے بات کرنے کے بعد میں خیمے میں واپس آ گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ شاہ دین ٹوانہ کو عشرت کی غیرموجودگی سے آگاہ کروں تاکہ وہ اسے ڈھونڈ کر واپس لائے۔ مگر خیموں میں پہنچ کر پتہ چلا کہ شاہ دین اور خان رحیمی تو گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے ہیں اور معلوم نہیں اب کب لوٹیں گے۔ ہو سکتا ہے سب لوگوں کو رات بھی یہیں گزارنا پڑے۔ میرے پوچھنے پر ایک کارندے نے بتایا کہ کہیں قریب ہی باز کا ایک گھونسلہ ملا ہے۔
اگر معاملہ باز کے گھونسلے کا تھا تو پھر واقعی آج شکار پارٹی کا واپس جانا ممکن نہیں تھا

شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں نے سوچا اندھیرا ہونے سے پہلے عشرت کو تلاش کر لینا چاہئے۔ میں نے دینو کو ساتھ لیا اور ہم دونوں دو بھلے مانس سے گھوڑوں پر سوار ہو کر عشرت کو ڈھونڈنے نکلے۔ مرغی خانے کی جانب اندازاً" دو میل تک سفر کے باوجود جب مرغی خانے کے آثار نظر نہیں آئے تو مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ ہم اصل راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ راستے میں ایک بوڑھے کسان سے مرغی خانے کا پتہ پوچھا تو میرے شبہے کی تصدیق ہوئی۔ مرغی خانہ ہم کوئی ایک میل پیچھے دائیں جانب چھوڑ آئے۔ شام گہری ہوگئی تھی اور تاریکی تیزی سے قرب و جوار کے مناظر کو نگلتی جا رہی تھی۔ ہم اپنا رخ درست کر کے پھر مرغی خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ تقریباً" پانچ چھ فرلانگ فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک سامنے سے روشنیاں نظر آئیں۔ یہ روشنیاں اچھلتی کودتی تیزی سے پاس آ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مشعل بردار گھڑسوار ہیں۔ اس دوران ایک ہیولا سرپٹ بھاگتا ہمارے سامنے سے گزرا۔ یہ کوئی عورت تھی۔ بدحواسی میں وہ ہمیں دیکھ نہیں سکی تھی۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا' یہ عشرت ہے۔ میں نے چیخ کر آواز دی "عشرت" میری پہلی آواز پر ہی متحرک ہیولا ساکت ہوگیا۔ میں نے دوبارہ "عشرت" کہہ کر پکارا تو وہ جتنی رفتار سے پہلے بھاگ رہی تھی' اتنی ہی رفتار سے بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی......... دینو اور میں گھوڑوں سے اتر چکے تھے۔ عشرت "شاہدہ شاہدہ" پکارتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتی۔ عقب میں ناچتی ہوئی روشنیاں ہمارے سروں پر پہنچ گئیں۔ یہ تقریباً" آٹھ گھڑسوار تھے' ان میں سے پانچ کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ انہوں نے تین اطراف سے ہمیں گھیر لیا۔ مشعلوں کی مدہم روشنی میں میں نے پہلی بار غور سے عشرت کو دیکھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ سرخ قمیض اور نیلی پتلون گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ وہ خوف سے بری طرح لرز رہی تھی۔ گھڑسوار چھلانگیں لگا کر گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے اگلے شخص کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بخشو سونگلی تھا وہی شخص جو ایک بدنام ڈاکو کے طور پر جانا جاتا تھا اور جس نے چند ہفتے پہلے کفن میں پرندے چھپا کر خان رحیمی کی کوٹھی میں پہنچائے تھے۔ اس کے بالوں بھرے چہرے پر آنکھیں دو انگاروں کی طرف دہک رہی تھیں۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے مرغی خانے میں خان رحیمی کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ تاہم عشرت سے وہ

ہرگز واقف نہیں تھا۔

اس نے بے باکی سے مجھے گھورا اور گھنی مونچھوں کے نیچے مسکرا کر بولا "بیگم جی! آپ یہاں؟"

میں نے کہا "ہاں.......... لیکن تم اس بیچاری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟"

"بیگم سائیں ہم تو آرڈر کا بندہ ہے۔ ہمیں آرڈر ہے کہ جو اس طرف آئے اسے پکڑلو اور اس وقت تک نہ چھوڑو جب تک دوسرا آرڈر نہ مل جائے یہ چھوکری ادھر تاکا جھانکی کر رہی تھی اس لئے پکڑنا ضروری ہو گیا تھا۔"

"یہ راستہ بھٹک کر چلی گئی تھی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا "ہم خان رحیمی کے ساتھ ادھر شکار پر آئے ہوئے ہیں۔ نالے کے اس پار ہمارا کیمپ ہے۔"

"اچھا تو بڑے سائیں بھی ساتھ ہیں۔ ان کو ہمارا سلام بولنا انہیں کہنا کہ آپ کا چوکیدار بالکل چوکس ہے۔"

میں نے کہا "عشرت تیرا گھوڑا کدھر ہے؟"

وہ اپنا کولہا دباتی ہوئی کراہ کر بولی "میں گر گئی تھی پتہ نہیں کس طرف نکل گیا ہے۔"

میں نے بخشو سولنگی سے کہا "اب گھوڑے کا کیا ہو گا۔ تم اسے کوٹھی پہنچا دو گے؟"

وہ سر ہلا کر بولا "بالکل جی۔ گھوڑا بھی پہنچ جائے گا اور گھوڑے والی بھی۔ اب آپ بالکل بے فکر رہیں کچھ نہیں ہو گا دونوں کو۔"

"کیا مطلب!" میں نے آنکھیں پھاڑیں۔ "دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ دانت نکال کر بولا "سائیں مطلب تو سیدھا سادھا ہے یہ لڑکی تو اب ہمارے ساتھ ہی جائے گی نا۔ دیکھیں نا جی آرڈر جو ہوا۔ ہم آرڈر سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ خان رحیمی کہے کہ ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا ہے تو چاہے میری ایک بھی ٹانگ نہ ہو میں لکڑی کی ٹانگ پر کھڑا رہوں گا۔"

مجھے سولنگی کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ یوں عشرت کو جانے نہیں دے گا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے تم حکم کے اتنے ہی پابند ہو تو چلو ہمارے ساتھ کیمپ میں۔ وہاں خان رحیمی سے جھاڑ کھا لو۔"

وہ سر ہلا کر بولا "نہ جی۔ آپ کیوں مجھے غلط کام پر مجبور کر رہی ہیں۔ جو میرے آرڈر ہیں میں نے آپ کو بتا دیئے ہیں۔ میرا کام صرف بندے کو پکڑنا ہے' پکڑ کر لانا نہیں۔ آپ اس لڑکی کو بے فکر ہو کر ہمارے پاس چھوڑ جائیں اور اگر بڑے سائیں آپ کے ساتھ ہیں تو انہیں جا کر بتا دیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے کر لیں گے۔"

عشرت نے ان خطرناک صورتوں والے خدائی فوجداروں کی طرف دیکھا اور میرے بازو کے ساتھ چمٹ گئی۔

"نہیں شاہدہ' مجھے ان غنڈوں کے حوالے نہ کرنا" وہ گڑگڑا کر بولی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "سولنگی' یا تو ہمیں جانے دو یا ہمارے ساتھ چلو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں جی۔"

ہماری گفتگو تکرار کا رنگ اختیار کر گئی اور تکرار جب زیادہ بڑھی تو میں نے عشرت کا بازو تھام کر اپنے گھوڑوں کی طرف قدم بڑھایا۔ سولنگی بازو پھیلا کر میرے راستے میں آ گیا۔ میں نے گرم چادر کے نیچے سے وہ ریوالور نکال لیا جو میں خان رحیمی کے خیمے سے ساتھ لے کر آئی تھی۔ ریوالور میں پوری گولیاں موجود تھیں۔ ریوالور دیکھ کر سولنگی ٹھٹھک گیا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھرتی جا رہی تھی۔ میں جانتی تھی یہ غصے کی دھند ہے اس دھند سے میری آشنائی پہلی بار اس وقت ہوئی تھی جب میں نے لاہور میں میڈم نادرہ کو گاڑی سے ٹکر مار کر اپنے راستے سے ہٹایا تھا۔ اس کے بعد جیسے اس دھند کیلئے کوئی راستہ سا کھل گیا تھا۔ جب بھی ناانصافی یا زیادتی کا لمحہ آتا تھا میرے رگ وپے میں طیش کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ کوئی غیر مرئی آواز میرے اندر سے مجھے پکار کر کہتی تھی۔

"ثناء' ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ اپنے بچے کا انتقام لینا چاہتی ہو تو مصلحتوں کو ٹھوکر مار دو۔ سب کچھ فراموش کر ڈالو"۔ میں ابھی تک اس آواز پر قابو پائے ہوئے تھی لیکن مجھے لگتا تھا کہ کسی روز میرے لئے اس آواز سے کان بند رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ اور اس روز میں ایک بدلی ہوئی عورت بن جاؤں گی۔ اس موجودہ عورت سے بالکل مختلف اور ناقابل یقین حد تک دلیر اور نڈر.......... میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر ریوالور سیدھا کیا تو سولنگی غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کوئی عام شخص ہوتا تو میرے اس انداز پر گھبرا جاتا مگر وہ ایک مفرور ڈاکو تھا۔ یہ ریوالور اس کیلئے کھلونے

سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی پیچھے ہٹنے کی وجہ میرے چہرے کے تاثرات تھے جو یقیناً" مرعوب کر دینے والے تھے۔ میں نے پرزور لہجے میں کہا۔

"سولنگی' ہمارے راستے میں نہ آنا۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔"

"گولی چلا دو گی تو کیا ہو گا۔ کیا یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گی؟"

میں نے دیکھا سولنگی کے ساتھیوں نے کم از کم تین رائفلوں کے منہ ہماری طرف کر رکھے ہیں۔ خود کو بھری ہوئی رائفلوں کی زد میں محسوس کرنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ میں نے گولی چلائی تو وہ بھی گولی چلانے کیلئے آزاد ہوں گے۔ ہم تینوں کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا لیکن مجھے یہ یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ہمیں مارنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ تو صرف اعصاب کی لڑائی تھی جو ڈر کر ہاری جاسکتی تھی اور دلیر ہو کر جیتی بھی جاسکتی تھی۔ میں گھوڑوں کی طرف بڑھی تو سولنگی نے آگے آ کر مجھے روکنا چاہا میں نے دونوں انگلیوں سے ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ دھماکے سے شعلہ نکلا اور گولی۔ سولنگی کے پاؤں کے پاس زمین میں پیوست ہو گئی۔ وہ جھٹکا کھا کر رک گیا۔ میں نے کہا۔

"سولنگی؛ مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ بات معمولی ہے لیکن میں اس پر جان دے بھی سکتی ہوں اور لے بھی سکتی ہوں۔"

میرے لہجے نے سولنگی پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ کچھ دیر میرا چہرہ پڑھتا رہا۔ تب اس کے بالوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے مشعل والا ہاتھ نیچے کیا اور اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کی اشارے سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ رائفلیں جھکا کر پیچھے ہٹ گئے۔ سولنگی بھاری آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے بیگم جی تم جاؤ۔ میں بڑے سائیں سے بات کروں گا اس بارے میں۔"

سولنگی کا ایک ساتھی بولا "ہم عورت جات پر ہاتھ نہیں اٹھاتے ورنہ آپ کو بتاتے کہ یہ لڑکی یہاں سے کیسے جاسکتی ہے۔"

میں عشرت کو ساتھ لے کر گھوڑے پر آ بیٹھی۔ دینو بھی لرزتا کانپتا گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ بخشو سولنگی نے ایک شاخ سے دونوں گھوڑوں کو ضرب لگائی اور وہ ہمیں لے کر آگے بڑھنے لگے۔

رات سرد اور تاریک تھی۔ خیموں کے گرد تین چار جگہ الاؤ دہک رہے تھے۔ ان کے قریب پارٹی کے ارکان بیٹھے اونگھ رہے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ میرے اور عشرت کیلئے ایک چھوٹی سی چھولداری علیحدہ لگا دی گئی تھی۔

چھولداری سے باہر خان رحیمی کا ایک مسلح پہریدار موجود تھا۔ وہ بھی اپنا چھوٹا سا علیحدہ الاؤ دہکائے بیٹھا تھا۔ خود کو بیدار رکھنے کیلئے وہ گاہے گاہے نسوار کی چٹکی ناک میں چڑھا لیتا اور ایسی دھواں دھار چھینکیں مارتا کہ سناٹے میں دور تک آواز گونجتی۔ خان رحیمی' شاہ دین ٹوانہ اور دیگر افراد ابھی باز کے تعاقب سے واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے دستی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ دونوں سوئیاں بارہ کے ہندسے پر گلے مل رہی تھیں۔ عشرت میرے بالکل پاس لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پاؤں میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ جیسے وہ میری موجودگی کے احساس کو اجاگر رکھنا چاہتی ہو۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ میں خود چاہتی تھی کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور اپنی ذات کے گرداب سے نکل کر مجھے کچھ بتانے کے قابل ہو سکے.......... میرے دماغ میں کئی دنوں سے ایک شک یقین کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری بڑی بھابی ثمینہ کی ایک چھوٹی بہن ناروے میں اپنے کسی ماموں کے پاس رہتی ہے اور وہیں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کم از کم ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ناروے میں تعلیم حاصل کرنے والی بہن یہی عشرت ہے جو ناروے کی بجائے جھنگ کے مضافاتی علاقے میں ہے اور کچھ عیاش زمینداروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے.......... آج میں نے اسے جس طرح سولنگی کے ہاتھوں سے بچایا تھا وہ بہت احسان مند ہوئی تھی۔ اس کے دل میں میرے لئے انسیت اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور اجنبیت کی ایک دیوار سی ہم دونوں کے درمیان ڈھ گئی تھی۔ اس کی دلی کیفیت محسوس کر کے مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ آج کی رات وہ مجھے اپنے دکھوں میں ضرور شریک کرے گی.......... اور میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ کچھ دیر بعد عشرت نے تکئے سے سر اٹھا کر چھولداری کے بانس سے ٹیک لگائی اور کہنا شروع کیا۔

"ہم دو بہنیں تھیں۔ ہماری ماں بہت مہربان اور نیک خاتون تھیں لیکن وہ ہماری سگی ماں نہیں تھی۔ یہ بات صرف ہم دونوں بہنوں کو ہی معلوم تھی۔ معلوم بھی کیا تھا بس ایک اندازہ سا تھا جسے ہماری ماں نے بھی کبھی جھٹلایا نہیں تھا۔ عام لوگوں کو یہی پتہ تھا کہ

ہمارا گھرانہ سابقہ مشرقی پاکستان سے اجڑ پجڑ کر آیا ہے اور اب آگے پیچھے ہمارا کوئی نہیں.......... میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میری بڑی بہن ثمینہ ان دنوں سیکنڈ ائر میں پڑھتی تھی۔ یہاں میں تمہیں بتادوں کہ میرا اصل نام عشرت نہیں زرینہ ہے۔ زرینہ کے عشرت بننے کی کہانی بڑی مختصر مگر بڑی المناک ہے۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اب کہانی ہی نہیں رہی۔ اسے تو ایک رسم کہنا چاہیے جو ہوس کی قربان گاہ پر نادان محبتوں کو بھینٹ چڑھا کر ادا کی جاتی ہے۔ ہمارے محلے میں اشرف نامی ایک لڑکا تھا۔ سکول میں آتے جاتے وہ اکثر مجھے راستے میں کھڑا ملتا۔ دھیرے دھیرے میں بھی اسے پسند کرنے لگی۔ وہ بے حد شرمیلا تھا اور بات کرتے ڈرتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی سال ڈیڑھ سال چلتا رہا پھر اس نے مجھے خطوط دینے شروع کر دیے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے اس بارے میں ماں کو بتا دیا۔ ماں نے اس لڑکے کو سرراہ روک کر ڈانٹا۔ تین چار ماہ کیلئے یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کچھ عرصہ بعد میری ایک سہیلی کے ہاتھ اس نے پیغام بھجوایا کہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں انکار نہ کر سکی اور ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہم ان دنوں کراچی میں رہتے تھے اور کراچی کی کوئی سیرگاہ ہم نے نہیں چھوڑی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں کالج میں ماں کی طرف سے چھٹی کی درخواست دے دیتی اور اشرف کے ساتھ کسی طرف نکل جاتی۔ اب سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ہم ہی عقلمند ہیں' باقی سب بے وقوف ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں ہم کیا کر رہے ہیں۔ ایک روز حسب معمول میں نے گھر سے کالج کی راہ لی مگر کالج جانے کی بجائے اپنی سہیلی کے ساتھ بس میں بیٹھی اور تفریحی پارک چلی گئی اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ اس پارک میں اشرف سے ملاقات ہو چکی تھی۔ مگر اس روز نہ جانے کیا ہوا کہ وہ مقررہ ٹائم پر پہنچ نہ سکا۔ میں اور عذرا یونہی ادھر ادھر گھوم رہی تھیں کہ آوارہ لڑکوں کا ایک گروہ ہمارے پیچھے لگ گیا۔ انہوں نے ہمیں اس قدر ستایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ہم پارک سے نکلنا چاہتی تھیں مگر وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اتنے میں درمیانی عمر کا ایک لمبا تڑنگا شخص آیا۔ اس نے دو لڑکوں کو تھپڑ مارے اور باقی کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ وہ ہمیں لے کر قریب ہی کھڑی نیلی گاڑی میں آ گیا۔ گاڑی میں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ انہوں

نے بتایا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کے آدمی ہیں اور آوارہ گرد طالب علموں کو پکڑنے کیلئے یہاں ڈیوٹی پر ہیں انہوں نے ہمارے اور گھر کا نام پتہ پوچھنا شروع کیا تو ہم گھبرا گئیں۔ اس وقت ہمارے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور ان کا تعلق قانون کے محافظوں سے نہیں قانون شکنوں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا اور وہاں سے ہماری رہائی والدین کی ضمانت پر ہوگی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو سخت گھبراہٹ کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے کار سواروں سے کہا کہ وہ گاڑی روکیں اور ہمیں کسی وردی والے سے بات کرنے دیں۔ انہوں نے سنی ان سنی کر کے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس دوران عذرا نے جو بائیں طرف بیٹھی تھی ایک سنسان موڑ پر دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی میں نے اسے دور تک کنارے کی مٹی میں لڑھکنیاں کھاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھی عذرا والا قدم اٹھاتی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے بے بس کر دیا۔ اس کے دوسرے آہنی ہاتھ نے میرے منہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ جلد ہی دم گھٹنے کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آیا تو میں ایک ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ وال کلاک بتا رہا تھا کہ میں تقریباً" چار گھنٹے بعد ہوش میں آئی ہوں۔ اجنبی چار دیواری میں جوان لڑکی کے گزارے ہوئے چند لمحے بھی ناقابل معافی ہوتے ہیں۔ میں تو کئی گھنٹے گزار چکی تھی۔ میں اب اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جو صبح کالج جانے کی آڑ میں اپنے محبوب سے ملنے نکلی تھی۔ اس روئے زمین پر کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں۔ پشیمانی اور ندامت کے منحوس پرندے اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میری ناتواں پلکوں پر بسیرا کر چکے تھے۔ اب ان پلکوں کو کبھی اس بوجھ سے آزاد نہیں ہونا تھا۔ ہر سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ تصور کی سب تتلیوں کے رنگ اڑ چکے تھے۔ پھر آہٹ ہوئی اور کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے بے ہوشی اور غنودگی کی درمیانی حالت میں دیکھا کہ میری بوڑھی والدہ روتی آنکھوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہیں۔ مجھے سینے سے لگا رہی ہیں۔ سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں ٹوٹے برتن کے ٹکڑوں کی طرح ان کے ہاتھوں سے گر گر جا رہی تھی۔ صدمے کی زیادتی سے ایک بار پھر میں بے ہوش ہو گئی.......... اس مرتبہ آنکھ اپنے گھر میں کھلی۔ مجھے تیز بخار تھا اور میری ماں اور بہن مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ اگلے چند روز میں نے عجیب

خوابناک سی کیفیت میں گزارے۔ ٹرنکولائزر دواؤں سے ذہن پر غنودگی طاری رہی تھی۔
میں جان چکی تھی کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے اور میں کیسے یہاں پہنچی ہوں۔ میرے اغوا
کے تین گھنٹے بعد کسی نے میرے گھر والدہ کو پیغام بھجوایا کہ اس کی بیٹی فلاں ہوٹل کے
فلاں نمبر کمرے میں موجود ہے۔ وہ خاموشی سے آئے اور اسے وہاں سے لے جائے۔ اگر
پولیس کو درمیاں میں لانے کی کوشش کی تو لڑکی کی جگہ اس کی لاش بھی مل سکتی ہے۔ جو
بدنامی ہوگی وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس دوران عذرا بھی ایک خدا خوف رکھنے والے کی مدد
سے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس کی والدہ نے آکر میری والدہ کو ساری صورت حال بتائی۔ میری والدہ روتی
بلکتی اس ہوٹل میں پہنچی اور میری زندہ لاش کو ٹیکسی میں ڈال کر خاموشی سے گھر لے
آئی۔ سفید پوش گھرانوں کیلئے نیک نامی ہی سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ سب کچھ لٹ
جائے تو بھی وہ نیک نامی بچانے کی کوشش کرتے ہیں.......... اس لیئے ہم نے خاموشی سے
کراچی کو خیر آباد کہہ دیا اور حیدر آباد چلے گئے۔ دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے
لگے۔ ہم دونوں بہنیں بوتیک ڈریس ڈیزائن کرتی تھیں اور ہماری والدہ ان کی سلائی کرتی
تھیں اس سے ہمیں معقول آمدنی ہوتی تھی۔ نہ صرف ہم کراچی جیسے شہر میں ایک کشادہ
مکان کا کرایہ دیتی تھیں بلکہ دیگر اخراجات بھی بہ احسن طریق پورے ہوتے تھے۔
حیدر آباد میں شروع شروع میں تو دشواری پیش آئی' تاہم جلد ہی ہمارا کیا ہوا کام بکنے لگا۔
جسم و جان کے زخم مندمل ہونے لگے۔

اندھیروں میں سویرے کی جھلک نظر آنے لگی۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس
صدمے کو خاموشی سے جھیل کر اور قانونی جھمیلوں میں نہ الجھ کر شاید ہم نے اچھا ہی کیا
ہے۔ ہماری یہ خاموشی ایک نئی زندگی کے دروازے ہم پر کھول رہی تھی۔ ایسی زندگی
جس میں ماضی کی متعفن لاش سے اٹھنے والی بو کا گزر نہیں تھا.......... مگر یہ سب ہماری
خام خیالی تھی۔ ایک روز میں دفتر پہنچی تو (میں نے ایک پرائیویٹ ادارے میں جز وقتی
ملازمت بھی کر رکھی تھی) مجھے بذریعہ ڈاک ایک بھاری لفافہ ملا۔ اُس لفافے میں ان تین
گھنٹوں کی تصویریں تھیں جو میری "زندگی کے جسم" پر تین سرطانی پھوڑوں کی حیثیت
رکھتے تھے۔ زمین و آسمان میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ جی میں آیا کہ خودکشی کر لوں مگر

خودکشی میرے گھرانے کو بدنامی کے داغ سے بچا نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے قفس میں
بہت سر پٹخا' بہ زبان خاموش بہت چیخی چلائی مگر رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی.......... پھر
مجھے وقفے وقفے سے گمنام ٹیلی فون ملنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں کوشش کے باوجود میں اس
بارے میں والدہ اور بہن کو کچھ نہیں بتا سکی۔ سب کچھ خاموشی سے جھیلتی رہی۔ شاید میں
اپنے گھر کا وہ عارضی سکون چھیننا نہیں چاہتی تھی' جس کے شکرانے میں میری والدہ دن
رات سجدے کرتی تھیں' اور جس کی سلامتی کیلئے آٹھوں پہر دست بہ دعا رہتی تھیں۔
مجھے بلیک میل کرنے والا سالار نامی ایک شخص تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں
کسی طرح دس ہزار روپے کا انتظام کر دوں تو وہ تصویریں بمعہ نیگیٹو میرے حوالے کر
دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے یہ تصویریں پانچ ہزار روپے میں خریدی ہیں۔ میں
بھولپن کے سبب اس کی باتوں میں آگئی اور رقم اکٹھی کرنے میں لگ گئی۔ اس دوران اس
نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس سے ملوں اور تمام باتیں تفصیل سے طے کر لوں۔ میں
ایک روز اس کے بتائے ہوئے پتے پر اس سے ملنے پہنچی۔ یہ گھر سے نکلنے والا میرا آخری
قدم تھا۔ پھر میں کبھی اپنوں کی صورتیں نہیں دیکھ سکی' نہ ہی لوٹ کر واپس جا سکی۔ سالار
مکروہ چہرے والا ایک سیاہ رنگ انتہائی مکار شخص ہے۔ میں اس کے جال میں چڑیا کی طرح
پھنس کر رہ گئی۔ وہ پہلے مجھے کئی روز حیدر آباد میں لئے پھرتا رہا پھر لاہور لے آیا۔ میں نے
کئی دفعہ بھاگنے کا سوچا لیکن ہر مرتبہ ماضی کے وہ تین گھنٹے میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔
اس زنجیر نے میرے ہر ارادے کو پابند اور ہر فیصلے کو معطل کر دیا۔ میں حالات کے
تند دھارے میں ایک حقیر سنگ ریزے کی طرح لڑھکنے لگی.......... لہر لہر' شہر شہر۔ اس
مکروہ چہرہ سالار نے مجھے عورت کا سب سے گھناؤنا روپ دے دیا۔ طوائف کا روپ اب
میں ایک طوائف ہوں۔ ماضی سے میرا ہر ناطہ کٹ چکا ہے۔ میرا کام اب صرف سالار کے
اشاروں پر ناچنا ہے۔"

اپنی روئیداد کے اس مرحلے پر پہنچ کر زرینہ عرف عشرت نے آنسوؤں کے
دھارے اپنی اوڑھنی میں جذب کئے اور اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔
چھولداری سے باہر دور کہیں جنگلی کتوں اور گیدڑوں کی طویل آوازیں گونج رہی تھیں۔
ان آوازوں میں کبھی کبھی ایک پرہول آواز شامل ہو جاتی تھی جس کے بارے سرشام

ہمارے پہریدار نے بتایا کہ یہ بھیڑیئے کی آواز ہے۔ پڑاؤ کے گرد آگ بدستور روشن تھی۔ شب کا سناٹا اتنا گھمبیر تھا کہ شعلے بھی سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے تھے۔ زرینہ عشرت نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ' میرا دل چاہتا ہے' آج تم سے کچھ نہ چھپاؤں۔ تم میرے بارے اتنا ہی جاننے لگو جتنا میں اپنے بارے خود جانتی ہوں۔ شاید اس طرح میرے دل کو کچھ سکون ملے.......... شاہدہ' تمہارا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ میں یہاں کسی کی بھیجی ہوئی آئی ہوں۔ مجھے بھیجنے والا سالار ہی ہے۔ اب وہ کوئی بھوکا ننگا شخص نہیں۔ نئی کار میں گھومتا ہے۔ بوسکی کے سوٹ اور ہزار ہزار روپے کی جوتی پہنتا ہے۔ بڑا "خوشحال ہے" وہ۔ اس کے تعلقات بہت سے جرائم پیشہ لوگوں سے ہیں۔ ان میں ہی سے کوئی شخص بازوں عقابوں وغیرہ کے چکر میں ہے۔ وہ علاقے کے زمینداروں کے متعلق سن گن لینا چاہتا تھا۔ سالار مجھ سے پہلے بھی ایسے کام لیتا رہا ہے لہٰذا اس نے مجھے شاہ دین کی طرف بھیج دیا لیکن یہ کام اس طرح کیا گیا کہ شاہ دین سمجھتا ہے کہ وہ خود مجھے لے کر آیا ہے۔ اس نے مری میں سالار کے ایک دو کارندوں کی پٹائی بھی کی تھی اور اپنی مردانگی پر اب تک فخر کرتا ہے۔ وہ سب ایک ڈرامہ تھا۔"

(میں اس ڈرامے کے بارے جانتی تھی۔ سلیم نے مجھے بتایا تھا کہ "شاہ دین اور عشرت" سے اس کی ملاقات مار کٹائی کے سلسلے میں ہوئی تھی) میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"عشرت' تمہاری ماں بہن اب کہاں ہیں؟"

وہ بولی "انہیں میرے بارے میں کوئی خبر نہیں لیکن مجھے ان کے بارے تھوڑا بہت پتہ چلتا رہتا ہے۔ کوئی تین سال پہلے وہ بھی حیدر آباد سے لاہور آ گئی تھیں۔ حیدر آباد میں ہی میری بہن ثمینہ کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ وہ لاہور کی ایک تعلیم یافتہ فیملی میں بیاہی گئی ہے۔ شوہر ڈاکٹر ہے۔ اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ امی جان نے لاہور میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھول رکھی ہے۔ وہ صرف خواتین کے کپڑے بیچتی ہیں اور خود ہی دکان پر کام بھی کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے محنتی رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے دکھوں کا علاج ہمیشہ سخت محنت میں ڈھونڈا ہے۔ میں ایک دفعہ برقعہ پہن کر ان کی دکان پر بھی گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہاں کاروبار چلانے والا کوئی مرد ہو گا اور میں نقاب کی اوٹ سے ماں کو اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔ مگر وہاں سیلزمین کی جگہ بھی ایک عورت ہی کام کر رہی تھی میں مایوس ہو کر واپس آ گئی.........."

اچانک عشرت کو چپ ہونا پڑا۔ شب کے سناٹے میں گھوڑوں کی تیز ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ٹاپوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک ہی گھوڑا ہے اور سیدھا پڑاؤ کی طرف آ رہا ہے۔

"کون ہو سکتا ہے؟" ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونجا۔ عشرت کے پاؤں میں تو سخت موچ آئی ہوئی تھی میں اٹھ کر چھولداری کے دروازے کی طرف گئی۔ گھوڑا پڑاؤ میں پہنچ چکا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ پڑاؤ میں آ کر بھی رکا نہیں تھا چاروں طرف بھاگتا پھر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے چھولداری کے در کی رسی کھول کر موٹا پردہ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ گھوڑا سوار کے بغیر ہے اور غالباً زخمی بھی ہے۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

یہ گھوڑا یقینی طور پر اپنے سوار کو گرا کر یہاں پہنچا تھا اب بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہا تھا۔ غالباً وہ خود بھی زخمی تھا۔ گھوڑے کی مچائی ہوئی ہڑبونگ سے سب لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ گھوڑے کو لگام سے تھام کر روکا گیا۔ وہ زور زور سے ہنہنا کر پچھلی ٹانگوں پر اچھل رہا تھا میں نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ اس کی بائیں ران پر گہرا زخم تھا۔ ہمارے پڑاؤ میں موجود ایک جہاندیدہ شخص نے مشعل کی روشنی میں اس زخم کو بغور دیکھنے کے بعد دعویٰ کیا کہ یہ بھیڑیئے کے کاٹنے سے آیا ہے۔ اس اطلاع نے سب میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ زخم بھیڑیئے کے کاٹنے سے آیا تھا یا نہیں مگر وقتی طور پر سب نے خوف محسوس کیا اور یہ بات کوئی ایسی بعید از قیاس بھی نہیں تھی۔ رات کے آغاز سے ہم کئی دفعہ بھیڑیئے کی آواز سن چکے تھے۔

گھوڑے پر قابو پانے کے بعد اس کے سوار کی تلاش شروع ہوئی۔ امکان یہی تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گرا ہو گا.......... قریباً نصف گھنٹے کے بعد اس کا سراغ مل گیا۔ وہ ہمارے پڑاؤ سے چار فرلانگ دور ایک گڑھے میں بے ہوش پڑا تھا۔ اسے ایک اسٹریچر پر

ڈال کر پڑاؤ میں لایا گیا.......... وہ درمیانی عمر اور اچھے قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس نے دیہاتی لباس پہن رکھا تھا۔ اسٹریچر پر اس کا پستول اور گولیوں سے بھری ہوئی بیلٹ بھی رکھی تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر شدید رگڑ آئی تھی۔ ساری جلد چھلی ہوئی تھی منہ میں بھی خون بھرا تھا۔ اچھی طرح معائنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ زبان دانتوں تلے آکر بری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ ہماری شکار پارٹی میں ایک سابق سرکاری ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرسٹ ایڈ باکس منگوایا اور مضروب کے منہ سے بہتا ہوا خون بند کیا اس کے بعد ضروری مرہم پٹی کر دی۔ ان کے خیال میں زبان پر ٹانکے لگنے ضروری تھے مگر فی الفور ٹانکے لگانے کا سامان موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد مضروب ہوش میں آگیا پہلے حیران نظروں سے اردگرد دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور کچھ بولنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں زبان نے حرکت کی اور وہ کراہ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے ہدایت کی کہ وہ بولنے سے پرہیز کرے کیونکہ وہ "شے" زخمی ہے جو اسے بولنے میں مدد دے سکتی ہے۔ باقی کی رات ہم نے نامعلوم بھیڑیئے کے خوف میں سوتے جاگتے گزار دی۔ اس بھیڑیئے سے یا کسی بھی بھیڑیئے سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی مگر میرے تصور میں آج تک وہ رات زندہ ہے جب ہر پل میں نے ایک خون آشام درندے کا سایہ اپنے اردگرد محسوس کیا۔ یاد رہے کہ میں اصلی بھیڑیئے کی بات کر رہی ہوں۔ ورنہ انسانی روپ میں تو لاتعداد بھیڑیئے میں نے دیکھے ہیں جو اپنی حرص و ہوس کے پنجوں سے ہر زندہ جسم کو ادھیڑنے کی فکر میں رہتے ہیں اکیلی عورت ان کے لئے لقمہ تر ہوتی ہے اور اسے ہڑپ کرنے کی آرزو میں ان کی سرخ زبانیں منہ سے نکل کر زمین پر گھسٹتی رہتی ہیں۔

صبح دم خان رحیمی اور شاہ دین وغیرہ اپنی مہم سے واپس آگئے وہ ایک شاندار باز پکڑنے میں کامیاب رہے تھے۔ خان رحیمی اس فتح پر مسرور نظر آتا تھا۔ نو گرفتار شدہ باز ایک پنجرے میں بند تھا اور خان رحیمی کی نگاہیں پنجرے سے ایسے چپکی ہوئی تھیں جیسے مقناطیس سے لوہ چون۔ وہ ہر ہر زاویئے سے پرندے کو دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ شہد خور باز کہلاتا ہے۔ شہد کے علاوہ چوہے، سانپ خرگوش حشرات غرض ہر چیز ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک ایسے ہی باز کو چالیس میٹر کی بلندی سے جھپٹ کر ایک چھوٹے سے کاکروچ کو پکڑتے دیکھا تھا۔

خان رحیمی زخمی دیہاتی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے اس بارے میں تفصیل بتائی گئی۔ میں نے اسے کل شام عشرت کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے متعلق بھی بتایا اور سولنگی کی بدتمیزی کا ذکر کیا۔ خان رحیمی نے ان دونوں واقعات سے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ اس کا سارا دھیان باز کی طرف تھا یا پھر واپس جانے کی طرف اس کا خیال تھا کہ وہ کافی لیٹ ہوگئے ہیں۔ انہیں کل رات ہی کوٹھی پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ شہر سے ایک مہمان کی آمد متوقع تھی.......... خان رحیمی کی ہدایت پر ملازموں نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور خیمے وغیرہ گرا کر چھکڑوں پر رکھ دیئے۔ ہلاک شدہ سوروں کی دموں کو کاٹ کر بطور نشانی محفوظ کر لیا گیا۔ جو دیگر چھوٹے چھوٹے جانور شکار ہوئے تھے ان میں سے قابل استعمال کو رات ہی ڈنر کا "حصہ" بنا لیا گیا تھا باقی کی کھالیں اتار کر اور مسالہ وغیرہ لگا کر رکھ لی گئیں.......... نو بجے ہماری پارٹی شکارگاہ سے روانہ ہو کر دوپہر ڈیڑھ بجے کوٹھی پہنچی۔ وہاں مہمان نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ہاں مہمان کے استقبال کے لئے خان رحیمی جو ہدایات دے گیا تھا ان پر پوری طرح عمل ہوا تھا۔ سلیم اب بھی کوٹھی کے صدر دروازے پر وردی پوش ملازموں کے ساتھ ایک رنگین چھتری لئے موجود تھا۔ پورچ سے کوٹھی کے اندرونی حصے تک مخمل جیسی وہ طویل سرخ پٹی بھی بچھی ہوئی تھی جس پر مہمان کو قدم قدم چل کر ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہونا تھا۔

خان رحیمی، سلیم سے سوال جواب میں مصروف ہوگیا جبکہ ہم سب کوٹھی میں چلے گئے۔ زخمی دیہاتی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اسٹریچر پر لدا ہوا تھا اس کے علاوہ عشرت کو بھی گھوڑے سمیت اس کے بیڈ روم تک پہنچایا گیا۔ موچ کی وجہ سے وہ نازک اندام دو قدم بھی نہ چل سکتی تھی کوٹھی کے سن رسیدہ ڈاکٹر مرزا ہمایوں نے پہلے عشرت کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ دیہاتی کی زبان پر ٹانکے لگانے کے درپے ہوگیا۔ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ زبان پر ٹانکے لگانے میں بیچارے کو دانتوں پسینے آگئے۔ لگوانے والے کا کیا حال ہوا ہوگا وہ بھی ظاہر ہے۔ پانچ چھ ٹانکے لگنے کے بعد وہ شخص کچھ غوں غاں کرنے کے قابل ہوا۔ تاہم اس کی بات سمجھنا اب بھی مشکل تھا۔ زبان کی سلائی کے بعد جب مرزا ہمایوں نے مضروب کے چھلے ہوئے چہرے پر ہائیڈروجن کا محلول ڈالا تو وہ اچھل اچھل کر دھاڑنے لگا۔ مرزا ہمایوں نے اسے بار بار ڈانٹ پلائی مگر اس نے احتجاج جاری

رکھا۔ یہ تمام شوروغل خان رحیمی کو سخت زچ کر رہا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے سے لاہور ٹرنک کال کرنے میں مصروف تھا یہ ٹرنک کال اسی مہمان کے سلسلے میں ہو رہی تھی جسے آنا تھا مگر نہیں آیا تھا۔ زخمی کے واویلے سے جھنجلا کر خان رحیمی دندناتا ہوا چلا آیا۔ اس نے دیہاتی کو سخت سست کہا۔ غالباً" کچھ اور بھی کہتا مگر دیہاتی نے ہاتھوں کے مسلسل اشاروں سے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ ان اشاروں کے ساتھ ساتھ اب وہ زبان سے بھی ٹوٹے پھوٹے لفظ ادا کر رہا تھا۔ اس کی چہرے پر گھبراہٹ کی بجائے غصہ تھا۔ اچانک زخمی کا کہا ہوا کوئی لفظ خان رحیمی کی سمجھ میں آیا اور وہ بری طرح چونک گیا اس نے پوری توجہ سے زخمی کی غوں غاں سنی اور سمجھ گیا کہ یہی وہ مہمان ہے جس کے انتظار میں وہ اور کوٹھی کا سارا عملہ کل سے سوکھ رہا ہے۔ اس نے مرزا ہمایوں کو قہر آلود نظروں سے گھورا جس نے دیہاتی کے بال باقاعدہ مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ مرزا ہمایوں ڈر کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ خان رحیمی اور دیہاتی باتیں کرنے لگے۔ خان رحیمی نے اس موقعے پر میرے سمیت سب کو کمرے سے نکال دیا۔

یہ ایک نیا ہی چکر چل گیا تھا۔ اس چکر کے بارے سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے کے لئے مہمان خانے کے پاس سے گزری تو چودھری شہاب کا کمرہ خالی پایا۔ ایک ملازم سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ رات ہی چلا گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ خان رحیمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور اس نے چودھری شہاب کو واپس بھیج دیا ہے۔ چودھری شہاب چنگیزیوں کا دشمن نمبرایک تھا اور اس کی یہاں موجودگی کسی طور مناسب نہیں تھی۔

دیہاتی کے روپ میں یہاں آنے والا مہمان درحقیقت ایک سرکاری ملازم تھا کسی خاص وجہ سے اس نے خود کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور عام دیہاتی لباس اور وضع قطع میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا عہدہ ہیڈ کلرک کا تھا اور تعلق شعبہ درآمدات اور برآمدات سے تھا۔ کہنے کو تو یہ شخص کلرک تھا مگر ٹھاٹ باٹھ سیکریٹری یا ڈپٹی سیکریٹری سے کم نہیں تھے۔ لب و لہجے سے لے کر چال ڈھال تک سب کچھ افسرانہ شان کا حامل تھا۔ جیسے ہی اس کی زبان ہلنے جلنے کے قابل ہوئی اس نے اسے ہلا ہلا کر سب ملازموں کا ناک میں دم کر دیا۔ دو تین روز ہی میں وہ ہر کس وناکس پر یوں حکم چلانے لگا جیسے خان رحیمی نے اسے رعب ڈالنے کا ٹھیکہ دے دیا ہو۔ یہ شخص شکل وصورت سے ہی لپاڈیا نظر آتا تھا۔ لگتا تھا افسران

کی چاپلوسی اور مٹھی چاپی کرنے میں اس نے کافی تجربہ کمایا ہوا ہے۔

اس کی یہاں آمد کا مقصد مجھ پر واضح نہیں تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ کھیل کا آغاز ہو چکا ہے اور جلد یا بدیر مرغی خانے میں موجود پرندوں کو تہ خانے سے نکال کر کہیں لے جایا جائے گا۔ خان رحیمی اور رئیس احمد گھنٹوں کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے.......... اور پھر ایک روز خان رحیمی نے مجھ پر انکشاف کیا کہ پرندے لاہور جا رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ تمام انتظام ہو چکا ہے۔ اس مقصد کے لئے دو گاڑیوں کا انتظام کیا گیا ہے اور یہ گاڑیاں دو پھیروں مین پرندے لاہور پہنچا دیں گی۔ میں نے خان رحیمی سے پوچھا۔

"آپ جس سرکاری ملازم کا ذکر کر رہے تھے کیا وہ یہی شخص ہے؟"

خان رحیمی نے کہا "نومائی ڈیئر' یہ تو اس کے کارندے کا کام کر رہا ہے۔ اصل آدمی لاہور میں بیٹھا ہے۔ میں ابھی تک اس کے کوائف سے پوری طرح آگاہ نہیں لیکن شک ہے کہ وہ کامرس منسٹری کا کوئی انڈر سیکریٹری ہے۔"

میں نے پوچھا "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

وہ بولا "تیل دیکھو' تیل کی دھار دیکھو۔"

دوسرے روز کی بات ہے میں نے دیکھا کہ دینو کوٹھی کے پچھلے لان میں واقع ہینڈ پمپ چلا رہا ہے۔ ہینڈپمپ کبھی کبھار ہی استعمال ہوتا تھا لہٰذا پانی کھینچنے میں سخت دشوار ہوتی تھی۔ بازو چلا چلا کر دینو کا برا حال ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ غصے میں بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا ہوا دینو؟"

وہ بھنا کر بولا "ہونا کیا تھا جی۔ وہ جو لاٹ صاحب کی دم آئی ہوئی ہے یہاں۔ عزت ماب مابدولت رئیس احمد بارا صاحب۔ کہندا ہے ٹینکی کا پانی مجھے پسند نہیں میرے لئے نلکے سے تازہ پانی لاؤ۔ بندا پوچھے ساری کوٹھی یہی پانی پیندی ہے وہ آسامان سے اترا ہوا ہے۔ پری زاد کہیں کا۔ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا۔"

میں دینو کے غصے کی وجہ سمجھ گئی اسے مہمان کے پینے کے لئے ہینڈ پمپ سے پانی لے جانا پڑتا تھا۔ میں نے کہا "دینو! ایسے نہیں کہتے۔ وہ افسر آدمی ہے۔ افسر ایسے ہی

ہوتے ہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ "آخ تھو ایسے افسر پر۔ افسر تو ہوندا ہے خدمت کرنے والا۔ خدمت کرانے والا تو حاکم ہوندا ہے۔ پانچ روز سے یہ خبیث مجھ سے نلکا چلوا رہا ہے۔ اب تو نلکا چلانے کے بعد بھی میرا بازو نلکا ہی چلاندا رہندا ہے۔ خیر وہ خبیث ہے تو میں بھی بڑا کمینہ ہوں۔ صاف پانی تو میں نے بھی ایک بار نہیں دتا اس کو۔ گند ہی پیتا رہا ہے۔"

"کیا مطلب!" میں نے پوچھا۔

"ابھی وسدا ہوں آپ کو۔ میں کوئی ڈرتا نہیں ہوں کسی سے۔"

اس نے زور لگا کر پانی نکالا۔ جگ بھرا پھر اس میں دو تین بار تھوکا اور بڑبڑاتا ہوا تیز قدموں سے مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔

"ٹھہرو" میں نے آواز دے کر کہا۔ وہ رک گیا۔ "نہیں دینو' یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "برے کے ساتھ برے نہیں بن جاتے۔ گراؤ یہ پانی۔"

"نہیں جی' میں تو نہیں گراؤں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "یہی پلاؤں گا اس باہمن کو۔"

میں نے اسے پچکارا۔ "دینو! کم از کم میرے سامنے تو ایسا نہ کرو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "نہیں' میں تو ایسا ہی کروں گا۔ اگر آپ کو اتنا ہی درد ہے اس کا تو خود لے جائیں پانی۔"

وہ بڑا جھنجلایا ہوا تھا میں سمجھ گئی کہ بحث فضول ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جگ لے کر پانی گرا دیا اور دوسرا بھرنے لگی۔.......... پانی لے کر مہمان خانے پہنچی تو رئیس احمد مہمان خانے کے لان میں آرام کرسی ڈالے دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے پاس ہی انگریزی کا اخبار رکھا تھا جسے وہ پڑھتا کم اور گھورتا زیادہ تھا۔ (گھورنے کے لئے اس میں عورتوں کی بہت سی رنگین تصویریں موجود تھیں) مجھے دیکھ کر اس نے ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑیں مجھ پر ہی کیا موقوف کوٹھی کی ہر عورت کو وہ ایسے ہی دیکھتا تھا۔ خان رحیمی کی خاطر اب سب مرد و زن اس کی بیہودگیاں خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟" اس نے افسرانہ شان کے ساتھ اپنی کنپٹی انگلی سے

ٹھونک کر کہا۔

"شاہدہ" میں نے مختصر جواب دیا۔

"شاہدہ!" اس نے میرے نام کو چبا چبا کر ادا کیا۔ کچھ دیر بے باکی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "اس وقت فارغ ہو؟"

میں نے کہا "فارغ تو نہیں.......... لیکن فرمائیے۔"

وہ بولا۔ "کل اس بدبخت دینو سے سر کی مالش کرائی تھی اب تک کھوپڑی میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ یوں ہاتھ چلاتا ہے جیسے ہتھوڑے چلا رہا ہو۔ اوپر سے گلابی اردو بول بول کر جان عذاب میں ڈال دیتا ہے.......... یہ میز کے نیچے تیل کی شیشی پڑی ہے تھوڑی سی مالش کر دو۔ شاید طبیعت کچھ سنبھل جائے۔"

میں نے پوچھا "اور اس پانی کا کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا "ادھر دے آؤ باورچی خانے میں وہ کیا نام ہے اس کا.......... سلطانہ سے کہنا میری چائے میں یہی پانی ڈالے۔"

پانی دے کر میں واپس آئی اور رئیس احمد کے سر کی مالش کرنے لگی۔ وہ مجھ سے بھی عام ملازموں کی طرح بے تکلف لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ سر کی مالش کے بعد اس نے کہا کہ میں اس کے ہاتھوں پاؤں کی انگلیاں کھینچ کھینچ کر ان کے پٹاخے نکالوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شاعرانہ گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھا کہنے لگا "اچھی لڑکی ہو تم۔ مجھے تو لگتا ہی نہیں شادی شدہ ہو۔ تمہارے جیسی تو فرسٹ سیکنڈ ائر میں ہوتی ہیں۔ کیوں اس بڈھے کے پاس خود کو برباد کر رہی ہو۔ شہر کا موج میلہ دیکھو تو ہوش اڑ جائیں تمہارے۔ کتنا پڑھی ہوئی ہو؟"

میں نے کہا "جی ایف اے کیا ہے۔"

وہ بولا "اوہ مائی گاڈ! ایف اے کر کے اور اتنی خوبصورتی سمیٹ کر تم اس ذلیل کوٹھی میں پھنسی ہوئی ہو۔ تمہیں تو ایک پل یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ میں آج ہی بات کرتا ہوں رحیمی سے۔"

"کیسی بات؟"

"بھئی تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ اچھے اور قدردان لوگوں سے ملواؤں گا۔ تم شہر کی

سوشل لائف میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو۔ دفع کرو اس آسیب زدہ کوٹھی کو..........."

میں جان رہی تھی کہ یہ لعنتی شخص مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔ اس کی نظروں میں میں ایک ایسے منقش اگالدان کی طرح تھی جو بیچ چوراہے کے پڑا تھا اور جس میں کوئی بھی تھوک سکتا تھا۔ جی چاہا اپنی انگلیوں سے اس کی چمکدار آنکھیں نوچ لوں مگر پھر خان رحیمی کی ہدایات یاد آگئیں اور میں دل مسوس کر رہ گئی۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ بولا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ چلو گی نا؟"

نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر اقرار میں ہلا دیا۔

..........اسی روز سہ پہر کی چائے پر جب خان رحیمی سے اکیلے میں بات ہوئی تو میں نے اسے سارا واقعہ بتا دیا اور کہا کہ اگر رئیس احمد مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو آپ مجھے جانے دیں۔ اس طرح ان لوگوں کے عزائم جاننے میں مزید آسانی ہو جائے گی۔"

خان رحیمی کو میری یہ بات بری لگی۔ اس نے کہا "گرل! میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم کو اس طرح اپنے مقصد کیلئے استعمال کروں.......... اٹ از ناٹ فیئر۔ اس اس باسٹرڈ رئیس احمد نے ایسا کیوں سوچا۔"

میں نے کہا "سر! کسی کے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ انسان وہی ہوتا ہے جیسا وہ اپنے آپ کو تصور کرتا ہے۔ میں وہ کیسے ہو سکتی ہوں جو مجھے رئیس احمد تصور کر رہا ہے۔"

وہ بولا "گرل! اس میں بہت رسک ہے تم اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈال رہی ہو۔ معلوم نہیں وہ کیسے لوگ ہیں۔ کیا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"سر! آپ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے یقین ہے میں دھوکا نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی بھٹکوں گی۔ میرا بچہ مر کر میرا سب کچھ لے گیا ہے لیکن ایک نہ ختم ہونے والا اعتماد دے گیا ہے۔ یہ اعتماد مجھے رسوا نہیں ہونے دے گا۔ آپ یقین رکھیں۔"

خان رحیمی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا "گرل! ایک ہی دائرے میں جینا اچھا نہیں ہوتا۔ تمہارا بچہ ایک حقیقت تھا مگر تمہاری زندگی اب بھی ایک حقیقت ہے۔ عورت کے بہت سے روپ ہیں اور ہر روپ کی اپنی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کو سمجھنے

کی کوشش کرو.........."

میں خاموشی سے خان رحیمی کی باتیں سنتی رہی۔ گفتگو کا یہ سلسلہ مختلف موضوعات کا احاطہ کرتا ہوا اختتام پذیر ہوا تو ہم دونوں میں یہ طے ہو چکا تھا کہ مجھے ہر صورت رئیس احمد کے ساتھ شہر جانا ہے۔

رات بہت سرد تھی۔ ہوا بند کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے سیٹیاں بجاتی گزرتی تھی۔ میں بستر پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی کہ پھر وہی منحوس آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ جو میری شب بھر کی نیند اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتی تھی۔ یہ سلیم کے بہکے قدموں کی آہٹ تھی۔ وہ زور زور سے کھنکار رہا تھا تاکہ مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو۔ اسے دیکھے بغیر اس کی سانس سونگھے بغیر ہی میں بتا سکتی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میرا دل دہل گیا۔ آج اس کے قدم عشرت کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے میرے دروازے پر آگئے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ دروازہ نہ کھولوں مگر دوسری دستک ہوئی تو اٹھنا پڑا۔ اس کی یہ پر شور دستک کوٹھی میں ہنگامہ جگا سکتی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ لڑکھڑا کر اندر آگیا۔ آج بھی اس کی آنکھیں کبوتر کا خون ہو رہی تھیں۔ بدبو سے بچنے کیلئے میں کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پھنکارا "خیر سے کب جا رہی ہو اپنے نئے خریدار کے ساتھ؟"

میں سمجھ گئی اس کا اشارہ رئیس احمد کی طرف ہے۔ وہ پوری صورت حال جان چکا تھا۔

میں نے کہا "سلیم، تم ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"میں بھی تم پر تھوکنا نہیں چاہتا۔" وہ غرایا "لیکن ایک بات یاد رکھو میرے دل سے نکلی ہوئی بددعا تمہیں زندگی بھر چین سے نہیں رہنے دے گی۔ یاد رکھنا میری آہ تمہارا پیچھا کرے گی۔ قبر کی دہلیز تک اور اس کے بعد بھی۔ تم نے مجھے برباد کیا ہے۔ ناگن بن کر مجھے ڈسا ہے۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔"

نہ جانے کیوں وہ منظر میری آنکھوں میں چمک گیا جب اینٹوں کے بھٹے کی تنگ و تار کوٹھڑی میں وہ بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور میں صرف ایک گرم چادر اوڑھے زمین پر لیٹی تھی۔ اس گھڑی کتنا مہربان نظر آتا تھا وہ' کتنا ہمدرد اور مخلص۔ ناقابل یقین حد تک نیک۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر اتنا سنگدل بن جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"سلیم بہتری اس میں ہے کہ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ دوسری صورت میں ہم دونوں نقصان اٹھائیں گے۔"

وہ دانت پیس کر بولا "تم کیا نقصان اٹھاؤ گی بڑی سے بڑی بدنامی اب تمہارا کوئی نقصان نہیں کر سکتی۔ تمہیں تو بے غیرتی کا "اجازت نامہ" مل چکا ہے۔ جس شخص کے ساتھ چاہو جا سکتی ہو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ آگے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ رئیس احمد تمہیں تہجد گزار بنانے کیلئے شہر نہیں لے جا رہا۔ نہ ہی وہ دو بول پڑھا کر تمہیں گھر میں بٹھائے گا۔ وہ تمہیں چمکا دمکا کر دیکھنے والی چیز بنائے گا اور اس دیکھنے والی چیز کو دیکھ دیکھ کر لوگ انگلیاں دانتوں میں دبائیں گے۔ واہ.......... واہ کیا انجام ہے ایک عورت کی پارسائی کا۔ یہی وہ عورت ہے نا جو گھر سے منہ باہر نہیں نکالتی تھی۔ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی رہتی تھی اور بات کرتی تھی تو لگتا تھا وظیفے پڑھ رہی ہے۔ آج اس عورت سے علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ تو برائے فروخت ہے تو اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ خود کو گالی دینے والے کا منہ توڑنے کی بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔"

سلیم کی باتیں میرے کانوں میں دہکتی ہوئی سلاخوں کی طرح اتر گئیں۔ میں کوشش کے باوجود خود پر ضبط نہ رکھ سکی۔ میرا ہاتھ گھوما اور چٹاخ سے اس کے رخسار پر پڑا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یوں لگا جیسے میں نے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کسی سنگلاخ بت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ یہ طمانچہ سلیم کی نہیں خود میری توہین تھا۔ اپنی توہین کا منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

وہ زہریلے لہجے میں پھنکارا "میں جانتا ہوں' تمہارے پاس میرے لئے تھپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں اور مجھے تم سے کچھ چاہیئے بھی نہیں۔ بہت کچھ ہے میرے پاس اور

بہت کچھ مل سکتا ہے۔ تیرے جیسیاں راستوں میں پلکیں بچھائے رہتی ہیں۔ یقین نہیں تو چل آ میرے ساتھ میں دکھاؤں تجھ کو۔"

اس نے بڑی نفرت سے دیوار پر تھوکا اور مجھ پر لعنت بھیجتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ گھوما "وہیں جہاں جا رہا ہوں۔ جہاں سکون ہے جہاں طمانچے نہیں ہیں۔"

وہ عشرت کے پاس جا رہا تھا اور آج عشرت تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ شاہ دین ٹوانہ بھی تھا' جس کی حیثیت اس کے شوہر سے کم نہیں تھی۔ وہاں جا کر سلیم مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ ممکن تھا کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ میں نے اس کا دامن کھینچا "سلیم! نشے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو شاہ دین آ چکا ہے۔ وہ تمہیں گولی مار دے گا۔"

"ہاں........ گولی مار دے گا۔ لاش کو کون گولی مارتا ہے۔ اور میں تو لاش ہوں ساری دنیا کے قاتل مل کر بھی ایک مرے ہوئے شخص کو دوبارہ نہیں مار سکتے۔"

میں نے سختی سے کہا "رک جاؤ سلیم۔ یہ اچھا نہیں ہو گا۔"

وہ پھنکارا "تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔ تمہارے پاس کیا ہے مجھے روکنے کیلئے؟ کچھ بھی نہیں۔ تھپڑ اور گالیاں کسی کو نہیں روک سکتے۔"

"سلیم! میں نے کب دی ہے تمہیں گالی؟"

"ہر قدم پر دی ہے۔ ہر روز ہر گھڑی دی ہے۔ تم چار سال سے مجھے گالیاں دے رہی ہو۔"

اس نے باہر جانے کیلئے زور لگایا میں نے اسے روکنے کیلئے کھینچا "رک جاؤ سلیم" میں نے لجاجت سے کہا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ کھینچا تانی میں وہ پلٹ کر میری طرف آیا' میں الٹے قدموں دیوار سے ٹکرائی۔ ایک لمحے وہ مجھے بڑا خونخوار محسوس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے ایک معصوم بچے کی طرح لگنے لگا ایسا بچہ جو حالات کی سنگینی سے گھبرا کر کسی محفوظ گوشے میں دبکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایک میکانکی حرکت کے تحت اس نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے انگارہ ہونٹ میرے چہرے سے ہمکلام ہو گئے۔ اس کے گرم آنسوؤں کا لمس مَیں نے اپنے رخساروں پر محسوس کیا۔ ایک عجیب وارفتگی تھی اس کے انداز میں۔

"سلیم" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ نہیں سنا۔ وہ بہرہ ہو رہا تھا........ میں نے اسے بمشکل دھکیل کر دروازے سے باہر نکال دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ وہ وہیں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سنا وہ سسکیوں سے رو رہا تھا۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ دھیمے قدموں سے واپس چلا گیا۔ اس تند سیلاب کی مانند جو شور مچاتا آتا ہے اور آہستہ روی سے چپ چاپ لوٹ جاتا ہے۔

علی الصبح میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا وہ ابھی تک برآمدے کے ایک ستون سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور آس پاس سگریٹ کے بے شمار ٹکڑے بکھرے تھے۔ کوئی اسے اس حالت میں دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا۔ مجھے اس کی رات والی حرکت پر سخت غصہ تھا۔ تاہم جلد ہی یہ غصہ ایک بے نام سی ہمدردی میں ڈھل گیا۔ وہ مجھے ایک نادان بچے کی طرح لگا جو روٹھ کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کی سب کھڑکیاں بند کر دی تھیں اور دماغ کی بجائے دل سے سوچ رہا تھا۔ اس روز میں نے پہلی بار سلیم کو ایک مختصر خط لکھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"سلیم ایک چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہیں چاہا تھا مگر بہت پہلے میں نے حالات کی یورش کے سامنے ہار مان لی تھی۔ اب میری زندگی کی کتاب سے یہ ورق پھٹ چکا ہے۔ تم بھی اس حقیقت کو سمجھ لو۔ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ میری زندگی اب ایک کانٹوں بھرے مختصر راستے کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم مجھے معاف کر کے کوئی دوسرا ہم سفر ڈھونڈ لو۔ یہ سمجھ لو کہ اپنے بچے کے ساتھ میں خود بھی مر چکی ہوں........ جہاں تک تمہارے الزامات کا تعلق ہے ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ میری زندگی اب صرف ایک انتقام کی خاطر ہے۔ میرا اٹھایا ہوا ہر قدم اسی ایک منزل کی طرف جاتا ہے۔ میں یہاں رہوں' شہر چلی جاؤں' یا دنیا کے کسی اور حصے میں پہنچ جاؤں میں اب ایک ماں ہوں صرف ماں۔ رئیس احمد یا کوئی دوسرا شخص میرے

اس روپ کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" یہ خط لکھنے کے بعد میں نے کسی طرح سلیم تک پہنچا دیا اور اس سے اگلے ہی روز میں رئیس احمد کے ساتھ شہر روانہ ہو گئی۔

لاہور میں اندرون شہر رئیس احمد ایک حویلی نما مکان میں رہتا تھا زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اندر سے خوب سجا سنورا تھا۔ لگتا تھا کلرک رئیس احمد جس کرسی پر بیٹھا ہے وہاں دھن بارش کی طرح برستا ہے۔ رئیس احمد کی دو بیویاں تھیں۔ دوسری شادی اس نے چند ماہ پہلے ہی کی تھی۔ یہ ایک قبول صورت پہاڑی لڑکی تھی۔ گوڑی چٹی اور چھریرے جسم والی۔ بائیں ابرو پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ لڑکی کا نام نگینہ تھا وہ شستہ اردو بولتی تھی اور کافی تیز طرار تھی۔ پہلی عورت فاطمہ ویسی ہی تھی جیسی پہلی عورتیں ہوتی ہیں۔ گم صم' ڈری ڈری' روٹیاں پکانے اور کام کاج کرنے والی۔ اس کے برعکس نگینہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ سارا دن ہمسائیوں سے چخ چخ کرتی سرشام رئیس کے دفتر سے لوٹتے ہی میاں بیوی کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے میں فاطمہ عجیب نظروں سے اس بند دروازے کو دیکھتی۔ اس گھر میں پہنچ کر تصدیق ہو گئی کہ رئیس احمد ایک عیش پسند شخص ہے۔ گھر اور محلے میں اس کا کافی رعب داب تھا۔ اس لئے کوئی اسے روک ٹوک نہیں کرتا تھا۔ پیسہ بھی اس کے پاس کافی تھی۔ چاہتا تو اقبال ٹاؤن یا گلبرگ میں اچھی سے اچھی کوٹھی میں رہ سکتا تھا اور خستہ حال سکوٹر کی بجائے کار پر دفتر جا سکتا تھا۔ لیکن ہیڈ کلرک کیلئے گلبرگ سے کار پر دفتر جانا ممکن نہیں ہوتا سرکاری نوکری اور ظاہری ٹھاٹ باٹھ ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر کے کسی حصے میں قالین بافی کا ایک کارخانہ رئیس احمد کی ملکیت ہے اور وہ دفتر کے بعد سیدھا اس کارخانے میں جاتا ہے۔ رئیس احمد کے گھریلو اخراجات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اپنی تنخواہ میں تو وہ مہینے کا پہلا ہفتہ بھی بمشکل گزارتا ہوگا۔ اس نے مجھے بڑے دھڑلے سے گھر میں رکھا ہوا تھا دونوں بیویوں میں سے کسی کو جرات نہیں تھی کہ میری موجودگی پر انگلی اٹھا سکتیں۔ ہاں.......... وہ دور دور سے مجھے تیکھی نظروں کی مار مارتی اور سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر دوسری بیوی بہت چوکنا تھی۔ غالباً" اسے خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ نمبر دو کے بعد نمبر تین بھی آنے والی ہے۔ بہرحال رئیس احمد کے رویے سے کسی ایسی بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا اور وہ اب تک

شرافت سے ہی پیش آ رہا تھا اس نے گھر میں بتایا تھا کہ اس کے نئے افسر کو ایک پڑھی لکھی ملازمہ درکار تھی اور وہ اس سلسلے میں مجھے ڈھونڈ کر لایا ہے۔ افسر دورے پر شہر سے باہر ہے جونہی واپس آیا مجھے اس کے سپرد کر دیا جائے گا.......... آٹھ دس روز اس طرح گزر گئے۔ سلیم کا خیال رہ رہ کر میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ میں اسے جس حال میں چھوڑ آئی تھی وہ کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ وہ شدید بخار میں تھا اور کوئی دوا بھی نہیں کھا رہا تھا۔ صبح سویرے کوٹھی سے نکل جاتا اور معلوم نہیں سارا دن کہاں گزار کر رات گئے واپس آتا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ بیرون ملک جانے کیلئے ویزے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے دوسری پریشانی عشرت کے متعلق تھی۔ وہ میری بھابی کی بہن تھی اور کچھ عیار لوگوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ گناہ کی دلدل میں اتنی گہرائی تک دھنس چکی تھی کہ سوچ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کی ماں ان کی سگی ماں نہیں۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بات شادی کے وقت چھپائی کیوں گئی.......... ان پریشان کن سوالوں کے علاوہ فرخندہ اور عابد کی المناک موت بھی ذہن کو کچوکے لگاتی رہتی تھی ان کی موت کی ذمے دار میں تھی۔ وہ سب کچھ میری اور صرف میری وجہ سے ہوا تھا۔ کیسی سبز قدم تھی میں۔ میری ذات حادثوں کی علامت بن گئی تھی اور لگتا تھا ایک دن میں اپنے وجود سے ہی نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔

لاہور آئے آٹھ دس روز ہوئے تھے۔ جب ایک دن رئیس احمد میرے لئے ایک ریڈی میڈ سوٹ لے کر آیا۔ اس نے ہدایت کی کہ میں یہ لباس پہن لوں اور ہلکا سا میک اپ بھی کر لوں وہ مجھے اپنے افسر سے ملانا چاہتا ہے۔ میں نے خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ میں تیار ہو چکی تو رئیس احمد نے مجھے ایک سیاہ ریشمی برقعہ پہننے کو دیا۔ گھر سے باہر دفتر کی ایک لمبی سی پک اپ کھڑی تھی۔ اس پک اپ میں دیسی گھی کے تین کنستروں کے علاوہ مرغیوں کا ایک ٹوکرا بھی تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں سے آیا ہوا باداموں والا تازہ گڑ تھا۔ غالباً" مجھ سمیت یہ سب کچھ اس افسر کی خدمت میں پیش ہو رہا تھا۔ دیسی گھی کے کنستروں' مرغیوں کے ٹوکرے اور گڑ کے لفافوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے لگا جیسے میں کوئی جنس ہوں۔ کوئی بے جان شے جسے کسی کی تواضع کیلئے خوبصورت لباس میں پیک کر کے ارسال کیا جا رہا ہے۔ پک اپ اندرون شہر سے نکلی اور بھری پری سڑکوں پر سفر کرتی ملتان

روڈ سے گزر کر اقبال ٹاؤن کی ایک بنگلہ نما کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی رئیس احمد نے کال بیل بجائی ایک مستعد خادم باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر رئیس باچھیں کھول کر مسکرایا۔ ملازم نے گیٹ کھول دیا۔ پک اپ اندر چلی گئی۔

رئیس احمد نے ملازم سے پوچھا "صاحب کہاں ہیں؟"

رئیس نے کہا "ٹھیک ہے تم لوگ یہ سامان اتروا کر اندر رکھو" پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور کوٹھی کے اندرونی حصے میں آ گیا۔ کوٹھی میں تازہ تازہ رنگ و روغن ہوا تھا۔ فرنیچر بھی سارا نیا تھا۔ لگتا تھا مکین حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ کوٹھی کے اندر ایک بوڑھے خانساماں سے رئیس احمد نے رازونیاز شروع کر دیا۔ خانساماں غور سے رئیس کی باتیں سنتا رہا۔ بعد ازاں رئیس نے مجھے خانساماں کے سپرد کر دیا۔ مگر اس سے پہلے چند ہدایات بھی دے دیں۔ کہنے لگا۔

"صاحب نو بجے کے قریب آئیں گے۔ ساڑھے نو بجے ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد گیارہ بجے تک چہل قدمی کریں گے۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ بیڈ روم میں پہنچ جائیں گے اس وقت تم دودھ کا گلاس لے کر ان کے کمرے میں جانا۔ اندر جانے سے پہلے دو بار ہلکی دستک دینا۔ اگر ٹی وی آن ہو تو اس کے پیچھے سے گزر کر بائیں جانب والی میز پر گلاس رکھ دینا۔ اگر صاحب پوچھیں کہ کون ہو تو میرا حوالہ دینا۔ اگر وہ "اوکے" کہہ دیں تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں مزید تمہاری ضرورت نہیں۔ اس صورت میں فوراً باہر آ جانا مگر میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری ضرورت محسوس کریں گے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے رئیس کی آنکھوں میں ایک مکروہ سی چمک عود کر آئی۔ مجھے سر تا پا گھورنے کے بعد ایک گہری سانس لی اور بولا "بہت بڑے افسر ہیں فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو دو کوڑی کا محتاج بنا سکتے ہیں۔ بڑی تمیز سے پیش آنا۔ ان کو خوش کرو گی تو خان رحیمی جیسے بوڑھے کتے تمہارے تلوے چاٹتے نظر آئیں گے۔"

اس کے بعد رئیس واپس چلا گیا۔ خانساماں نے مجھے ایک ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا یہ چھوٹا سا کمرہ ملازموں کیلئے مخصوص تھا۔ یہاں ایک ٹی وی بھی چل رہا تھا میں کچھ دیر بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہی پھر لان میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ بنگلے کی وضع قطع اور یہاں کے ماحول سے مکینوں کی خوشحالی اور ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا

کہ یہاں کی فضا میں کچھ گھٹن سی ہے۔ ایک خوف سا در و دیوار سے لپٹا ہوا تھا۔ قریباً نو بجے گھنی مونچھوں والا ایک شخص موٹر سائیکل پر بنگلے پہنچا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ "افسر صاحب" کا ہیڈ اردلی تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب کچھ لیٹ ہیں' دس بجے تک ڈنر پر پہنچیں گے۔ دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب پورچ میں سرخ پردوں والی ایک لمبی کار آ کر رکی اسے باوردی ملازم ڈرائیو کر رہا تھا۔ خدمت گار نے لپک کر عقبی دروازہ کھولا۔ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک کلین شیو شخص برآمد ہوا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ شکل و صورت سے ہی وہ اعلیٰ سرکاری افسر لگتا تھا۔ خدمت گار نے بڑھ کر بریف کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا......... انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ شخص کار سے اترتے ہی سیدھا کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بعد تمام کام پروگرام کے مطابق ہوئے۔ بارہ بجے کے قریب خانساماں نے ایک ٹی ٹرالی پر دودھ کا جگ اور گلاس رکھا۔ انہیں خوان پوش سے ڈھانپا اور مجھے خواب گاہ کی طرف بھیج دیا۔ میں ٹی ٹرالی دھکیلتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ دو بار دستک دی اور اندر چلی گئی۔ دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔ کار سے اترنے والا شخص سلیپنگ گاؤن پہنے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے عقب میں دیوار پر ایک لڑکی کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ بیڈ کے ساتھ والی منقش تپائی پر بریف کیس کھلا رکھا تھا اور وہ شخص ایک انگلش رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔

"عبدل کہاں ہے؟" اس نے نہایت بارعب آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا "سر وہ آج چھٹی پر ہے۔"

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ایک لمحے کیلئے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھے بطور ایک مفرور قاتلہ کے پہچان نہ لے۔ اخبار میں میری تصویر چھپے کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا......... تاہم جلد ہی مجھے اس کی نگاہوں سے اندازہ ہوا کہ میرا چہرہ اس کیلئے اجنبی ہے۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے......... میں رئیس صاحب کے ساتھ آئی تھی......... آج شام" میں نے

جواب دیا۔ اس نے عینک اتار کر مجھے سرتاپا گھورا اور گھورتا چلا گیا۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گئی۔ اس نے انٹرکام پر خانساماں کو اندر بلایا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور سیلوٹ کے انداز میں سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا "خانساماں' کیا رئیس احمد آیا تھا؟"

خانساماں نے اثبات میں جواب دیا۔

"یہ لڑکی اس کے ساتھ آئی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"اور کیا لایا تھا؟"

"جی۔ گاؤں کی ایک دو سوغاتیں ہیں جی' کچھ گھی ہے۔ مرغیاں ہے اور گڑ وغیرہ ہے۔"

"گڈ.......... ویری گڈ.......... ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

خانساماں چلا گیا تو نواز حسنی نے ٹیلی فون پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دوسری جانب رئیس احمد ہی ہے۔ اس نے رئیس احمد کو فوراً بنگلے میں حاضر ہونے کی ہدایت کی۔

ریسیور رکھ کر وہ میری طرف دیکھنے لگا "کہاں سے لایا تھا تم کو؟"

میں اس سوال کیلئے پہلے سے تیار نہیں تھی اس لئے گڑ بڑا گئی۔ ایک ہوشیار افسر کے سامنے سچ بولنا ہی بہتر سمجھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس سے پہلے خان رحیمی کے پاس ملازم تھی رئیس وہیں سے مجھے لایا ہے۔

"کیا کہہ کر لایا تھا؟"

"ملازمت کا کہہ کر۔"

"تم نصف شب کو اس سج دھج کے ساتھ ملازمت کرنے آئی ہو؟"

"جی' مجھے جو ہدایت کی گئی تھی میں نے اس پر عمل کیا ہے۔ بطور ملازمہ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

"جانتی نہیں یا بھولی بنی ہوئی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے یہاں کے طور طریقوں کا کچھ پتہ نہیں۔"

نواز حسنی مجھ سے اسی طرح سوال و جواب کرتا رہا۔ کبھی کبھی رسالے کی ورق گردانی بھی کرنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد گیراج میں سکوٹر رکنے کی آواز آئی۔ رئیس احمد پہنچ گیا تھا۔ نواز حسنی نے مجھے باہر جانے کی ہدایت کی۔ میں خواب گاہ سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں بھی اس لڑکی کی تصویر موجود تھی جو بیڈ کے عقب میں نظر آرہی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد خواب گاہ سے چیخم دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ پتہ چلا کہ رئیس احمد کی شامت آئی ہوئی ہے۔ کافی گرماگرمی ہو رہی تھی۔ پھر خواب گاہ کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے رئیس احمد کو دھکا کھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو رہا تھا۔ "سر میری بات تو سنیں" وہ بار بار یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔

"آئی سے گیٹ آؤٹ.......... آئی سے گیٹ آؤٹ" نواز افروز حسنی کی دھاڑوں میں رئیس احمد کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ دم دبا کر برآمدے کی طرف نکل گیا.......... ذرا ہی دیر بعد میں نے دیکھا وہ مرغیاں' گڑ کے لفافے اور گھی کے کنستر ایک ریڑھے پر لدوا رہا تھا۔ تب وہ ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور مجھے برقعہ پہننے کو کہا۔ ابھی میں برقعہ پہن ہی رہی تھی کہ نواز حسنی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ مجھے جانے کو تیار دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تشویش لہرا گئی۔ بولے "نہیں۔ اس کو رہنے دو۔ کسی بے سہارا لڑکی پر تجھ جیسے مرد کا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ میں اسے خود خان رحیمی کے پاس پہنچاؤں گا۔"

"اوکے سر.......... ٹھیک ہے سر.......... جیسے آپ کی.......... مرضی سر" رئیس احمد نے تھرتھر کانپتے ہوئے کہا۔ پھر ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سکوٹر سمیت غڑاپ سے بنگلے سے باہر تھا۔

نواز حسنی صاحب کے کردار کا یہ پہلو میرے لئے بڑا متاثر کن تھا۔ سول سروس میں ان جیسے افسر خال خال ہی دیکھنے میں آیا کرتے ہیں اور اس دور میں تو زیادہ سے زیادہ انگارے پیٹ میں بھرنے کی دوڑ سی لگی ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں نواز حسنی کے کردار کی معترف ہو گئی اور اسکے ساتھ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی کہ شاید میں غلط جگہ پر آ گئی ہوں۔ اگر کوئی اعلیٰ سرکاری افسر پرندوں کی سمگلنگ میں ملوث تھا تو وہ نواز حسنی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی پہلو سے اس طرز کا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ غالباً لاہور میں اس کی

ٹرانسفر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور اس کے قریبی ماتحت بھی اس کے مزاج سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ رئیس احمد بھی ان میں سے ایک تھا۔ زبردست جھاڑ کھانے کے بعد وہ دو تین دن تک بالکل نظر نہیں آیا لیکن چوتھے روز رات کے وقت مجھے اس کی صورت پھر دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی نواز حسنی کے بارے میں میری تمام خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ نواز حسنی وہی تھا جس کی طرف حالات پہلے اشارہ کر چکے تھے۔

اس رات گیراج میں رئیس احمد کا سکوٹر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آیا ہوا ہے۔ ظاہر تھا کہ نواز حسنی صاحب کے کمرے میں ہوگا۔ مجھے یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ میں نے کوشش کی اور حسن اتفاق سے ایک ایسی کھڑکی تک پہنچ گئی جو ادھ کھلی تھی اور جہاں سے ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔ اس کے لیے کھڑکی کے ساتھ لگی ہوئی کانٹوں بھری بیل میں کئی منٹ تک سر گھسیڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ گردن اور چہرے پر جابجا خراشیں پڑ گئیں لیکن ان خراشوں کے عوض نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

کمرے میں رئیس احمد شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ نواز حسنی صاحب کہہ رہے تھے "خیر جو کچھ بھی ہوا۔ آئندہ سے احتیاط رکھنا۔ یہ طریقہ مجھے پسند نہیں۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد حسنی صاحب کی آواز دوبارہ آئی "ہاں کارخانے میں سب ٹھیک ہے نا۔ اردگرد کسی کو شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں سر" رئیس کی آواز آئی "بس پرسوں تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی تھی۔ ایک کٹی ہوئی پتنگ اس احاطے میں جا گری جہاں پرندے ہیں۔ ایک قالین باف لڑکا دس فٹ اونچی دیوار پھاند کر اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے دیکھ لیا۔ اب میں نے دیوار پر سیمنٹ سے شیشے کے ٹکڑے لگوا دیئے ہیں اور نگران بھی مقرر کر دیا ہے۔"

نواز حسنی نے پوچھا "لڑکے نے کچھ دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں سر" رئیس نے پورے وثوق سے کہا۔ "میں نے پوری تسلی کرنے کے بعد ہی اسے چھوڑا ہے آپ بے فکر رہیں۔"

نواز حسنی نے کہا "بس چند دن کی بات اور ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ الیکشن

کے ہنگامے میں ہی یہ سارا کام مکمل ہو جائے۔ بس ایک وائلڈ لائف والے کا تھوڑا سا چکر ہے۔ وہ نبٹ جائے تو مال روانہ کر دیں گے......... پرندوں کی ہائی جین کا پورا خیال رکھو اور ڈاکٹر چوبیس گھنٹے موجود رہنا چاہئے۔"

"ڈونٹ وری سر۔ میں خود بھی زیادہ وقت وہیں گزار رہا ہوں۔ سارے کام پر میری نظر ہے۔"

اسی دوران صدر دروازے کی طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں اور میں کھڑکی سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے جتنی بھی گفتگو سنی تھی وہ یہ سمجھانے کیلئے کافی تھی کہ نواز حسنی اس کھیل میں پوری طرح شریک ہے۔ رئیس اس کے کارندے کے فرائض انجام دے رہا تھا اور پرندے رئیس نے اپنے کارخانے میں کہیں چھپا رکھے ہیں.........

حیرانی کی بات یہ تھی کہ اگر رئیس، نواز حسنی کا کارندہ ہے تو اس رات رشوت پیش کرنے پر اسے جھاڑ کیوں پلائی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ حسنی جرائم پیشہ ہونے کے باوجود رشوت نہیں لیتا تھا لیکن یہ تو ایسا ہی تھا کہ بوٹی سے پرہیز کیا جائے اور شوربے کو بار عبث استعمال کیا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ حسنی نے اپنے ماتحت کی پیش کی ہوئی رشوت کو اپنے شایان شان نہ سمجھا ہو......... یا پھر اسے رشوت پیش کرنے کا طریقہ پسند نہ آیا ہو۔ میں اس بارے میں جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھ رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں نواز حسنی کے کردار نے میری نگاہوں کے سامنے کئی رنگ بدلے تھے۔ شروع میں میں نے اسے ایک بدعنوان سرکاری افسر جانا تھا۔ بعد وہ مجھے بے حد متقی اور پرہیزگار شخص محسوس ہوا اور اب ایک بار پھر وہ مجھے گلے تک گندگی میں دھنسا ہوا نظر آ رہا تھا.........

حسنی اس بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ بیوی پندرہ سولہ برس پہلے فوت ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی اور لڑکا تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔

نواز حسنی مجھے خان رحیمی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ ایسے ضروری کاموں میں الجھا ہوا تھا کہ میری روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی ایک روز میں نے یہ حیران کن خبر سنی کہ نواز حسنی کا اکلوتا لڑکا جو جیل میں تھا رہا ہو کر گھر آ رہا ہے۔ اتنے بڑے افسر کا بیٹا اور جیل میں......... یقیناً اس نے کوئی ٹھیک ٹھاک جرم کیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیٹے سے نواز حسنی کے تعلقات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ اس دوپہر میں کچن میں

خانساماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی دفعتاً" صدر دروازے کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ایک ملازم نے آکر بتایا کہ چھوٹے مالک گھر پہنچ گئے ہیں اور ان کے یار دوست انہیں جلوس کی صورت میں گھر لے کر آئے ہیں۔

خانساماں نے اس خبر پر ناک بھوں چڑھائی لگتا تھا اسے یہ خبر اچھی نہیں لگی۔ میں نے کچن کی کھڑکی میں سے "چھوٹے مالک" کی صورت دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ چند دوستوں کے ساتھ پورچ میں سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب یہ شخص یوسف کے کٹے ہوئے ہونٹ کو سگریٹ سے داغ رہا تھا۔ اس کی کرخت صورت میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ اختر زماں عرف چیف تھا۔ میں نے آخری بار اسے پولیس مقابلے کے وقت دیکھا تھا جب وہ اور اس کے ساتھی عاطف، مقصود اور کبوترا خان پولیس کے نرغے میں آگئے تھے اور میں موقع دیکھ کر صغراں کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ اب مجھ پر یہ راز کھل رہا تھا کہ اختر زماں عرف چیف نواز حسنی کا فرزند ارجمند ہے۔ اس کے جیل جانے کی وجہ بھی اب بخوبی سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً" پولیس مقابلے کے بعد وہ لوگ پکڑے گئے تھے۔ اب کئی ماہ بعد اسے ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی تھی۔ اگر یہ اختر زماں کا گھر تھا تو میرا یہاں رکنا سخت خطرناک تھا۔ وہ مجھے پہچان لیتا تو پرانے بدلے چکائے بغیر نہ چھوڑتا۔ میں یہاں سے کافی معلومات حاصل کر چکی تھی۔ مزید معلومات کے لالچ میں کھیل بگڑ بھی سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں۔

سہ پہر کے وقت نواز حسنی دفتر سے واپس آیا تو باپ بیٹے میں سخت جھڑپ ہوئی پہلے تو دونوں کافی دیر ایک بند کمرے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر اچانک اختر زماں چیختا ہوا باہر نکلا "بس ڈیڈ' میں بے غیرت بن کر نہیں جی سکتا۔ آپ چند دن کہتے ہیں میں چند گھڑیاں بھی انتظار نہیں کر سکتا۔"

نواز حسنی غصے سے بے قابو ہو کر اندر گیا اور ایک سیون ایم ایم رائفل نکال لایا۔ اس نے رائفل دور سے اختر زمان کے سینے پر کھینچ ماری اور دھاڑ کر بولا "یہ لے رائفل اور جا.......... کر لے اپنی مرضی۔ لیکن یاد رکھ اس کی اور اپنی موت کا ذمے دار تو خود ہو گا۔"

اتنے میں نواز حسنی کا کوئی عمر رسیدہ رشتے دار اندر سے نکل آیا۔ اس نے باپ بیٹے کو جھاڑ پلائی کہ وہ کیوں چیخ چیخ کر سارے گھر کو سنا رہے ہیں۔ جو بھی بات ہے وہ اندر بیٹھ کر کریں۔ انہیں دھکیل کر وہ دوبارہ کمرے میں لے گیا.......... یہ کافی سنگین معاملہ لگتا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس معاملے کا تعلق اس لڑکی سے ہے جس کی تصویریں جا بجا گھر میں لگی ہوئی ہیں۔ خانساماں کی زبانی مجھے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ یہ لڑکی نواز حسنی کی صاحب زادی ہے اور اس سے بے پناہ پیار کرتے ہیں.......... میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ صاحب زادی کہاں ہے لیکن کوئی ٹھوس بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ جب عمر رسیدہ شخص کے سمجھانے پر باپ بیٹا دوبارہ کمرے میں چلے گئے تو کچن میں آلو کاٹتے ہوئے بوڑھے خانساماں نے ایک گہری سانس لی اور مایوسی کے انداز میں سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس گھر کے معاملات پر گہری نظر رکھتا ہے اور جو چکر یہاں چل رہا ہے اس سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے اسے ایک بار پھر کریدنے کی کوشش کی اور پوچھا کہ یہ باپ بیٹا ملتے ساتھ ہی کیوں جھگڑنے لگے ہیں۔

خانساماں نے تاسف سے کہا "اولاد خراب نکلے تو والدین کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے میں تو کہوں گا اس گھر پر جو مصیبت آئی ہے اس کا سبب یہ لڑکا ہی ہے۔ دوسروں کی بہو بیٹی کو بری نظر سے دیکھتا تھا آج اپنی.........." کچھ کہتے کہتے بوڑھا خانساماں ایک دم خاموش ہو گیا۔ جو بات وہ کئی دنوں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے منہ سے نکل ہی گئی تھی۔ میرا یہ شبہ درست نکلا تھا کہ اس معاملے کا تعلق نواز حسنی کی بیٹی اور اختر زماں کی بہن سے ہے۔ یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اپنی جگہ سن کھڑی رہ گئی.......... ایک ہی ساعت میں واقعات کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور پلک جھپکتے میں ایک تصویر بن گئی.......... کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں تھی جو جھنگ کے منہ زور چنگیزیوں کے قبضے میں تھی اور جسے رہا کرانے کی کوشش میں چار افراد پر اسرار طور پر ہلاک ہو چکے تھے.......... اگر ایسا تھا تو نواز حسنی واقعی قابل رحم تھا۔

میں خانساماں سے کوئی سوال پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ خود ہی بول اٹھا۔ "لے بیٹا یہ کافی اندر پہنچا دے۔"

اس نے کافی کے برتنوں کو خوان پوش سے ڈھکتے ہوئے کہا۔ میں چکرا گئی۔

خانساماں کو انکار کرنا مشکل تھا اور کافی لے کر اندر جانا اس سے بھی مشکل۔ اختر زماں کا سامنا کرنا جان بوجھ کر مصیبت مول لینا تھا۔ میں ٹرالی لے کر کچن سے نکل آئی۔ لیکن ٹرالی کو منزل تک پہنچانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا' بیچ راستے کے ٹھہر کر میں سوچنے لگی کہ کیا کروں۔ کوئی دوسرا ملازم بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کے ذمے یہ کام لگا دیتی۔ اچانک خیال آیا کہ جانا تو مجھے ہے ہی تو کیوں نہ ابھی نکل چلوں۔ میرا یہاں کون سا لمبا چوڑا سامان پڑا تھا اور اگر ہوتا بھی تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت میرا اصل مقصد اختر زماں کی نگاہ میں آئے بغیر یہاں سے نکل جانا تھا۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور ٹی ٹرالی کو وہیں جیسے کا تیسا چھوڑ کر بغلی راہداری میں مڑ گئی۔ دو کمروں کے اندر سے گزر کر پورچ میں پہنچی اور وہاں گارڈینا کی قد آدم باڑ کے ساتھ ساتھ چلتی صدر دروازہ پار کر گئی۔
سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آرہی تھیں۔ میں نے ایک کار والے سے لفٹ مانگی جو اس نے بخوشی دے دی۔ بنگلے سے نکلتے ہی میں کار میں سوار ہوگئی اور وحدت روڈ والی سڑک سے میرا فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ جب تک بنگلے میں میری غیر موجودگی محسوس کی جائے گی' میں سٹیشن یا بس اڈے تک پہنچ چکی ہوں گی۔ بس تیار مل جاتی تو رات نو دس بجے تک میں خان رحیمی کے پاس پہنچ سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ابھی ہماری گاڑی چوک یتیم خانہ سے کافی دور تھی کہ ایک سبز ڈاٹسن کار تیزی سے آئی اور اس نے اوورٹیک کرکے ہماری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لفٹ دینے والے شخص نے گھبرا کر بریک لگا دیئے گاڑی سڑک سے اتر کر رک گئی۔ میں نے سبز کار میں جھانکا اور دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اختر زماں عرف چیف بیٹھا تھا۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا آنکھوں پر حسب معمول کمانی دار عینک تھی۔ بڑا سا طلائی لاکٹ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے سرد نگاہوں سے گھورا اور ٹھہرے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

"چل نیلوفر' نکل باہر۔ ورنہ تماشا لگا دوں گا۔"

مجھے لفٹ دینے والے نے گھبرا کر کہا "کیا بات ہے مسٹر! یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟"

اختر زماں نے روانی سے کہا "میں تمہارا باپ لگتا ہوں اور یہ تمہاری ماں لگتی ہے۔ چونچ بند رکھ بچہ ورنہ سارے پر جھاڑ دوں گا۔"

پھر اس نے اپنی خونی نگاہیں مجھ پر گاڑیں اور سفاک لہجے میں بولا "کیوں اترتی ہے نیچے یا اتاروں تجھ کو؟"

میں اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ویسے بھی مجھے اب ایسے اکھڑ مردوں سے بات کرنے کا ڈھنگ آگیا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا "تم میری مرضی کے بغیر مجھے کیسے لے جاؤ گے؟"

اس نے کہا "تم اپنی مرضی سے ہی جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں تم شوروغل پسند نہیں کرو گی۔ تماشا لگ گیا تو پولیس بھی آ جائے گی اور مجھے پتہ ہے پولیس سے تمہارے تعلقات اتنے اچھے نہیں ہیں۔"

اختر زمان نے بڑا ٹھیک نشانہ لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ جان چکا ہے۔ واقعی میں کسی ہنگامے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کیوں کہ قانون کے کاغذوں میں مفرور قاتلہ تھی۔ میں کچھ دیر سنجیدگی سے اختر زماں عرف چیف کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑے اعتماد سے کھڑکی پر جھکا کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

اس نے کہا "سب کچھ یہاں بتا دوں گا تو باقی کیا رہ جائے گا۔"

میں نے لفٹ دینے والے کا شکریہ ادا کیا اور پچھلا دروازہ کھول کر اختر زمان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے شاہراہ قائداعظم پر جا رہے تھے۔ ایک معروف ہوٹل کے پارکنگ میں اس نے گاڑی روکی اور مجھے لے کر کاؤنٹر پر آگیا۔ یہاں ایک کمرہ پہلے سے اس کے نام پر بک تھا۔ چابی لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا میں نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

"اختر صاحب! ہماری گفتگو ڈائننگ ہال میں ہوگی۔"

اس کا پارہ چڑھ گیا.......... اور چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ مگر موقع محل دیکھ کر اس نے خود پر قابو پایا اور ایک گہری سانس لے کر پلٹ آیا۔ ہم ڈائننگ ہال میں ایک نیم تاریک کونے کی میز پر جا بیٹھے۔ اختر زماں نے کافی کا آرڈر دے دیا اور مجھ سے بولا "تم ایک سنگین جرم کرکے بھاگی ہوئی ہو اور تمہارا اصل نام شاہدہ نہیں ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے

تمہارا جرم قتل سے کم ہرگز نہیں ہاں قتل سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے کہا "اختر زماں تم نے کچھ کہا ہی نہیں تو غلط اور صحیح کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ تمہیں کچھ اتہ پتہ نہیں۔ صرف اندھیرے میں تیر چلا رہے ہو۔"

میری بات سچی تھی اس لئے اختر زماں کو بہت کڑوی لگی۔ وہ تلملا کر رہ گیا اور بولا "میرے لئے یہی یقین کافی ہے کہ تم مجرم ہو۔ جرم اگلوانا میرا نہیں پولیس کا کام ہے۔"

اس کی بات میں وزن تھا وہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی مجھے پھانسی کے پھندے کی طرف روانہ کر سکتا تھا۔ درحقیقت میواتی بستی کی لڑائی میں ہلاک ہونے والے عاطف بخاری نے مجھے کافی حد تک پہچان لیا تھا اور اگر وہ کچھ دیر اور میرے ساتھ رہتا تو شاید سو فیصد پہچان لیتا۔ مگر بعد ازاں وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کا چھوڑا ہوا شک اختر زماں کے دماغ میں اب تک موجود تھا۔ میرے رویے نے اس شک کو اور تقویت دی تھی۔ جنگل میں پولیس مقابلے کے دوران میں صغراں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس سے اختر زماں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں مفرور ہوں۔ اب وہ اپنی ان معلومات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر انتہائی سنگین لہجے میں بولا۔

"دیکھو شاہدہ، میری بہن اغوا ہوئی ہے اور مجھے پتہ چلا ہے کہ اس معاملہ میں خان رحیمی بھی ملوث ہے۔ اب میرے گھر میں تمہاری موجودگی سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی ہے۔ میں بڑا برا آدمی ہوں شاہدہ......... تم اور خان رحیمی سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ شام سے پہلے پہلے میری بہن کو رہا کر دو۔"

اختر زماں بظاہر نارمل لہجے میں بولا تھا مگر اس کے لہجے کے نیچے دہکتے ابلتے لاوے کی روانی میں صاف محسوس کر رہی تھی۔ اختیار اور دولت کے نشے میں دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے والے کے اپنے چہرے پر جوتے کا سایہ پڑا تھا تو وہ جلے پاؤں کی بلی بن گیا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ باپ نے اس سے بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا اپنی حماقت یا جلد بازی کے سبب معاملے کو سنگین تر بنا دے اس نے اس تمام پریشانی کو اپنے تک محدود......... رکھا ہوا تھا۔ اختر زماں کے شعلہ فشاں

مزاج کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے حقائق کو چھپا کر اچھا ہی کیا گیا ہے۔ میں نے اختر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں میرا ہاتھ ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو نکال لو میرے اندر سے اپنی بہن۔"

وہ خوفناک لہجے میں غرایا "خدا کی قسم، تمہیں معلوم نہیں تم کس موت کو دعوت دے رہی ہو۔ میں تمہیں ایسی موت ماروں گا کہ........."

بات ادھوری چھوڑ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ غصے میں وہ نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کیلئے تو مجھے لگا کہ وہ میز اٹھا کر مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ تاہم تمام خدشات کے باوجود میں اپنی جگہ بااعتماد بیٹھی رہی۔ آج اختر زماں عرف چیف سے خوف آنے کی بجائے مجھے اس پر ترس آ رہا تھا......... میرے سکون اور اعتماد کو دیکھ کر اس کا غصہ متزلزل ہو گیا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بائیں جانب دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "سوچتے کیا ہو اختر زماں۔ پکڑ لو مجھے اور لے جاؤ کسی عقوبت خانے میں۔ آخر تمہاری بہن اغوا ہوئی ہے......... اتنے بڑے غنڈے کی عزت پر حرف آیا ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ۔"

وہ خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا اور ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اختر زماں، خدا جب انسان سے ناراض ہوتا ہے تو انسان کی عقل بھی اس سے ناراض ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کتنا بھی ذہین اور نکتہ داں ہو غبی اور احمق بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ہر کام کا نتیجہ الٹ نکلتا ہے۔ سونے میں بھی ہاتھ ڈالے تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔ جس کی بھلائی کا سوچتا ہے اس کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ نحوست ناکامی اور مصیبت کے سائے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تمہاری گمراہیاں بھی تمہیں اس سٹیج پر لے آئی ہیں۔ تمہارا وجود نہ صرف تمہارے اپنے بلکہ تمہارے لواحقین کیلئے بھی مصیبت بن چکا ہے۔ اپنے نفس کی من مانیوں سے جو گناہ تم نے کمائے ہیں ان کے خمیازے میں سے تمہارے گھر والوں کو بھی حصہ مل رہا ہے اور انشاء اللہ ملتا رہے گا........."

میرے سینے میں غبار بھرا ہوا تھا۔ یوسف کی چیخیں، صغراں کی گریہ زاری اور اپنی

بے بسی سب کچھ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ میں دیر تک بولتی رہی اور وہ آنکھیں پھاڑے سنتا رہا۔ اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور اب ایک طرح کی لاچاری اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھی آخر وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مس شاہدہ! اگر ارسی کے اغوا میں تمہارا یا خان رحیمی کا ہاتھ نہیں تو پھر وہ کون ہے جس نے یہ جرات کی ہے؟"

میں نے کہا "اختر زماں تم کوئی اکیلے ہی جرات منداس علاقے میں نہیں ہو۔ بڑے بڑے کافر بھرے ہوئے ہیں یہاں۔ یہاں ہر بڑی مچھلی چھوٹی کو نگلتی ہے۔"

وہ بولا "مس شاہدہ' میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ اگر میری کوئی مدد کر سکتی ہو تو کرو' ورنہ........... چند گھنٹے کے اندر اندر میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ اب اس کے اندر کا غصیلا حیوان خجالت کے دھوئیں میں تحلیل ہو چکا ہے۔ اس کی شیطانیت ایک طرح کی بے بسی میں ڈھل چکی تھی مجھے اب اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ آختر اب باقی باتیں کمرے میں کرتے ہیں۔"

کمرے میں پہنچ اختر زماں نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ اغوا ہونے والی لڑکی کا نام ارسہ ہے۔ گھر میں اسے پیار سے ارسی کہتے ہیں۔ وہ میٹرک کا امتحان دے چکی ہے۔ نواز افروز حسنی بیٹی سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی پیدائش کے چند ہی ماں بعد نواز حسنی کی محبوب بیوی انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ان کی موت کے بعد نواز حسنی نے بیٹی کو ماں اور باپ بن کر پالا۔ اختر زماں تو بچپن میں ہی اپنی خالہ کے پاس انگلینڈ چلا گیا تھا لہٰذا ان کی تمام خوشیاں مسرتیں اور محبتیں ننھی ارسہ سے وابستہ ہوگئیں۔ انہوں نے اس کیلئے کبھی آیا کا انتظام نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی دوسرے مددگار کا سایہ اپنی بچی پر پڑنے دیا۔ وہ اس کے سب کام خود کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب تک وہ چار سال کی نہیں ہوگئی حسنی صاحب نے دفتر کا منہ نہیں دیکھا۔ چند برس پہلے تک وہ خود اسے نہلاتے تھے' اس کے بالوں میں کنگھی کرتے تھے' اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے اور گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے' اب بھی جب وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی بے تکلفی سے ان کی گود میں بیٹھتی تھی اور ان سے چمٹ کر سوتی

تھی۔ دیکھنے والے ان کی محبت کی مثالیں دیتے تھے اور حیرت میں ڈوب جاتے تھے۔ نواز حسنی صاحب کی سب سے بڑی خوشی ارسی کیلئے شب و روز محنت کرنا اور اپنی کمائی کو اس پر خرچ کرنا تھا۔ وہ اس کے لئے یورپ سے خوشبوئیں اور لباس منگواتے تھے۔ اس کی لذت کام و دہن کے لئے انہوں نے خود نفیس کھانے پکانے کے کورس کر رکھے تھے اور اعلیٰ سرکاری خانساماؤں اور باورچیوں سے بھی مدد لیتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر وہ دنیا کی ہر دستیاب چیز حاضر کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کی تربیت پر بھی بے پناہ توجہ دی تھی' وہ اسے ایک مثالی شخصیت بنانے کے آرزومند تھے۔

اور اس کوشش میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی........... اب یہی خوش جمال اور خوش سیرت لڑکی جو حسنی صاحب کی جان اپنے جسم میں لئے پھرتی تھی ایک اوباش شخص کی سفاکی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اسے اغوا کرنے والے نے اس کی واپسی کے لئے ایک کڑی شرط رکھی تھی۔ اس شرط نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو گھٹنے ٹیکنے اور ہر اصول کو پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

واقعات کے تسلسل سے ظاہر تھا کہ چنگیزی نہایت عیار قسم کے بلیک میلر ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کے لئے وہ بڑے بڑے جرائم بغیر ہچکچاہٹ کے کر جاتے ہیں۔ میں سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ شاید خان رحیمی بھی کسی قسم کی بلیک میلنگ کا شکار ہے۔ وہ کیوں اس غیر قانونی کاروبار میں چنگیزیوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا؟ اب کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میرا خان رحیمی سے ملنا اور اس سے تفصیلی گفتگو کرنا ضروری تھا۔ مجھے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر اختر زماں عرف چیف نے عاجزی سے کہا۔

"مس شاہدہ! پلیز........... اگر تمہیں کچھ معلوم ہے تو مجھے بتاؤ۔ کہاں ہے میری بہن' کیوں اغوا کیا گیا ہے اسے؟ کیا چاہتے ہیں وہ لوگ؟ ان سوالوں کے جواب نہ ملے تو میرا دماغ الٹ جائے گا اور میں ایسا کچھ کر جاؤں گا جو سب کو تباہ و برباد کر ڈالے گا۔"

میں نے بغور اختر زماں کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی برداشت اور ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اسے مزید اندھیرے میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے اسے دھیمے لہجے میں سمجھانا شروع کیا کہ وہ تحمل سے کام لے اور اپنے

غضب کو قابو میں رکھے۔ کیونکہ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے مجرم کا نام جان کر بھی آپے سے باہر نہیں ہوگا اور باہمی صلاح مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ جب اس نے وعدہ کرلیا اور مجھے اس کے وعدے کا یقین بھی آگیا تو میں نے محتاط لفظوں میں وہاب چنگیزی کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے یہ نام حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر سنا' اور چند لمحے کے لئے کچھ بھی نہ بول سکا.......... آخر اس نے لرزاں لہجے میں پوچھا "چنگیزیوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ وہ اسمگلنگ میں ملوث ہیں اور تمہارے ڈیڈ کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کس قسم کی اسمگلنگ؟ کہیں.......... کہیں یہ کوئی پرندوں وغیرہ کا چکر تو نہیں۔ میرا مطلب ہے باز عقاب وغیرہ کا.........."

"ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ" اس نے ہونٹ سکوڑے "تو کیا خان رحیمی بھی اس میں ملوث ہے؟"

"خان رحیمی بھی اسی طرح ملوث ہے' جس طرح میں ہوں۔ میں ابھی تمہیں اس بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی۔"

اخترزماں کے چہرے پر سنسنی خیز سوچ کے آثار تھے۔ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آج سے چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے وہاب چنگیزی نے اچانک ہمارے ہاں آنا جانا شروع کیا تھا۔ اس کی آمدورفت دس پندرہ روز چلی۔ زمیندار لوگ سرکاری افسروں سے بنا کر رکھنے کے لئے ایسے دورے کیا ہی کرتے ہیں۔ پھر ایک روز میں نے وہاب چنگیزی کو برہمی کی حالت میں اپنے گھر سے نکلتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جس غرض سے ڈیڈ کے پاس آ رہا تھا وہ پوری نہیں ہوئی۔ غلط خواہشات لے کر ڈیڈ کے پاس آنے والے لوگ ایسے ہی مایوسی کے عالم میں ہمارے گھر سے نکلا کرتے ہیں مگر وہاب چنگیزی کو یوں جاتے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ چنگیزیوں جیسے گھرانے سے دشمنی مول لینا کسی بھی افسر کے لئے گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ مجھے ایک نامعلوم سے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ اس بارے میں ڈیڈ سے بات کروں گا مگر پھر یہ واقعہ ذہن سے نکل

گیا.......... اب تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ انہی ملاقاتوں کا شاخسانہ ہے۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ باتیں کرتے ہوئے اخترزماں کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جوش وجذبہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس کی میں توقع کر رہی تھی وہاب چنگیزی کے نام نے اس کے بھڑکتے جذبوں کو ایک موٹے سرد کمبل میں لپیٹ دیا تھا اگر میں کہوں کہ وہ ہراساں نظر آ رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

"اوہ گاڈ۔ یہ کیا ہوگیا۔ ڈیڈ نے ایسی حماقت کیوں کی۔"

وہ مٹھیوں کو بھینچ رہا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"مس شاہدہ! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ لڑکی جو چنگیزیوں کے قبضے میں ہے' ارسہ ہی ہے۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور اس پر انکشاف کرتے ہوئے کہا "اس سے پہلے تمہارے ڈیڈ بزور بازو ارسہ کو چھڑانے کی ایک ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں تین چار افراد ہلاک بھی ہوئے ہیں۔"

یہ اطلاع اخترزماں کیلئے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ سفید پڑ گئے وہ بولا "ان کم بخت چنگیزیوں سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ کاش ڈیڈ یہ دشمنی مول لینے سے پہلے کسی سے مشورہ کر لیتے لیکن وہ تو مشورے کو توہین سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں میں دودھ پیتا بچہ ہوں۔ میں اسی روز سمجھ گیا تھا کہ چنگیزی ضرور کوئی گل کھلائیں گے۔ اوہ مائی گاڈ۔ یہ سب کیوں ہوا۔"

اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر سر میز پر جھکا دیا۔ وہ خود بھی ایک جرائم پیشہ شخص تھا بڑے بڑے غنڈے اس کے نام سے تھراتے تھے۔ مگر یہ سن کر کہ اس کی بہن چنگیزیوں کے قبضے میں ہے اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ یہ بالواسطہ طور پر چنگیزیوں کی طاقت اور بالادستی کا اعتراف تھا۔ ثابت ہوتا تھا کہ سفاکی کی دنیا میں چنگیزی ایک "معتبر" نام ہے.......... یہ نام اب الیکشن کے مرحلے سے گزر کر اور عوام کے کندھے پر بندوق رکھ کر جمہوریت کا سینہ چھلنی کرنے والا تھا۔ کیسا سنگین اتفاق تھا کہ آج میں وہاب چنگیزی کے کردار سے پوری طرح آگاہ ہوئی تھی اور آج ہی الیکشن ہو رہا تھا۔ انتخابی حلقوں میں

صبح سے پولنگ جاری تھی۔ میں نے حسرت کے ساتھ سوچا کاش میں یہ سب کچھ تھوڑا عرصہ پہلے جان جاتی۔ اب میری یہ معلومات کم از کم الیکشن کے حوالے سے بیکار تھیں......... اخترزماں تشویش ناک نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ غالباً وہ تصور ہی تصور میں اپنی نوعمر بہن کی بے بسی اور ذلت کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے پناہ اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"مس شاہدہ' اب آپ کے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟"

میں نے الٹا اس سے سوال کیا "تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ارسہ کو بزور بازو چھڑایا جاسکتا ہے؟"

وہ دردناک لہجے میں بولا "میرا خیال ہے نہیں۔ چنگیزی جیتی جاگتی ارسہ کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے اور اگر خدا نخواستہ ارسی کو کچھ ہوگیا تو اس کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ ارسی اور ڈیڈ کی موت۔ ایک فیصد امکان بھی نہیں کہ ڈیڈ اس کا صدمہ برداشت کرسکیں۔"

اخترزماں کی آنکھوں میں ہراس ہی ہراس تھا۔ فلمی انداز میں گالیاں بکنے والا اور ریوالور کو ہردم انگلی پر گھمانے والا چیف' نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔

میں نے کہا "تو پھر اٹھو اخترزماں' ہم خان رحیمی کے پاس چلتے ہیں۔ اس مرحلے میں خان رحیمی سے بہتر مشورہ ہمیں کوئی نہیں دے سکتا۔"

کمرے کو لاک کرکے ہم ہوٹل کے صدر دروازے سے نکلے اور پارکنگ میں آگئے۔

اس روز رات ٹھیک نو بجے ہم جھنگ پہنچ گئے۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ پولنگ ہو رہی تھی۔ راستے بھر میں انتخابی جوش و خروش کے مناظر دیکھتی رہی اور دل سے رہ رہ کر ایک دعا نکلتی رہی۔ وہ دعا یہ تھی کہ اے رب کریم تو قادر مطلق ہے۔ دلوں کے راز جانتا ہے۔ ایک شخص جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے سیدھے سادھے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ انہیں دھوکا دے رہا ہے اس کا فریب نیچے سے لے کر اوپر تک اور دوڑ سے لے کر منسٹر تک چل رہا ہے۔ اپنی عیاری سے اس نے نہ صرف ایک خلقت کو دھوکا دیا ہے بلکہ حکومتی مشینری کو بھی دغا دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ کوئی اور نہ جانتا ہوگا مگر

اے اللہ تو تو جانتا ہے۔ یہ شخص روئے زمین کا سب سے قابل نفرت شخص ہے۔ اس نے ایک معصوم فرشتے کو تڑپا تڑپا کر مارا ہے اور ایک مجبور ماں کو اپنی ہوس کی آگ میں جلایا ہے۔ اے خدا! یہ شخص جو اندر سے گناہوں کے کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے نیکی کا سفید لبادہ پہن کر عوام کے سامنے آیا ہے۔ اے مالک! اسے سرنگوں کر اسے ذلیل و رسوا کرکے مظلوموں اور بے کسوں کی لاج رکھ لے۔ یہ دعا مانگتے ہوئے میرا دل بار بار بھر آیا۔ کسی وقت میں آنکھیں بند کرکے کار کے دروازے سے سر لگادیتی۔ ایسے میں ہزاروں انسانوں کا ہجوم میری آنکھوں کے سامنے آتا۔ میں تصور ہی تصور میں ان کے سامنے روتی چیختی اور پکار پکار کر کہتی۔

"اے لوگو وقت نے تمہارے ہاتھوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ دیکھو......... اچھا فیصلہ کرنا۔ اس شخص کو پہچان لینا۔ دھوکے میں نہ آنا۔"

رات کے اندھیرے میں ہماری کار خان رحیمی کی وسیع و عریض کوٹھی کے اندر رکی خان رحیمی کی مخصوص جیپ پورچ ہی میں تھی۔ میں اخترزماں کے ساتھ صدر گیٹ پر پہنچی تو سلیم سے ملاقات ہوگئی۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ واقعی مریض دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی' چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ۔ ایک کمبل لپیٹے وہ سست قدموں سے گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا' پھر نفرت سے منہ پھیرلیا اور بغیر کچھ کہے اپنے راستے پر بڑھ گیا۔ اس منظر نے میرے دل کو ٹھیس پہنچائی۔ میں اخترزماں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر واپس آئی تو سلیم گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے گیٹ کیپر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ چہل قدمی کے لئے نکلا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد واپس آجائے گا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں خان رحیمی کے پاس آئی وہ اپنے ریڈنگ روم میں تھا۔

عقابوں کے بارے میں ایک بڑی موٹی سی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوا پھر اس کی آنکھوں میں خاص چمک نظر آئی۔ رسمی کلمات کے بعد پائپ سلگا کر بولا "آؤ گرل! میرا اندازہ ہے کہ تم کوئی اہم خبر لائی ہو......... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے اس کے خیال کی تصدیق کی۔ وہ خوش ہو کر بولا "میرے پاس بھی

تمہارے لئے ایک چھوٹی سی نیوز ہے۔"

میں نے کہا "پہلے آپ سنا دیجئے۔"

اس نے کہا "نہیں پہلے تم۔"

میں بولی "سر آپ نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ آپ کی خبر چھوٹی سی ہے لہٰذا آپ پہلے ہی فارغ ہو جاتے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا "یعنی تم اگری کرتی ہو کہ تمہاری نیوز بڑی ہے......... بہرحال' میری نیوز یہ ہے کہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق چودھری وہاب اپنے حلقے میں تیس ہزار ووٹوں کے فرق سے ہار گیا ہے۔ اس حلقے میں اصل مقابلہ چودھری وہاب چنگیزی اور چودھری شہاب کے چچا چودھری حکم دین کے درمیان تھا۔ غیر حتمی نتائج کے مطابق چودھری شہاب کے چچا نے پچاس ہزار کے قریب ووٹ حاصل کئے ہیں اور وہاب چنگیزی کے ووٹ بیس ہزار اکٹھے ہیں........."

میرے دل کی گہرائیوں سے شکر الحمدللہ کی خاموش صدا نکلی' کاش اس وقت میری آنکھوں میں آنسو ہوتے اور میں انہیں شکریے کے طور پر بہا سکتی۔ ایکا ایکی مجھے محسوس ہوا کہ دوران سفر میں نے تصور ہی تصور میں ہزاروں لاکھوں کے مجمع کے سامنے جو خاموش تقریر کی تھی وہ کسی طرح حقیقت کا روپ دھار کر خلق خدا کے کانوں تک پہنچ گئی ہے ووٹ کاسٹ کرنے والے ہاتھوں نے وہاب چنگیزی کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا ہے۔

کچھ دیر خان رحیمی اور میں اس خوش کن خبر پر تبصرہ کرتے رہے' پھر خان رحیمی نے کہا "میری اطلاعات کے مطابق تم اس وقت انڈر سیکرٹری نواز حسنی کی کوٹھی سے آ رہی ہو اور تمہارے ساتھ جو شخص ہے وہ نواز حسنی کا بیٹا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا "گڈ" خان رحیمی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا "اب بتاؤ۔ تمہاری نیوز کیا ہے؟"

میں نے کہا "سر! میری نیوز یہ ہے کہ چنگیزیوں کی سازش کا جال ٹوٹ گیا ہے ان کا سارا کیا دھرا سامنے آگیا ہے۔ اب آپ پورے اعتماد سے ایک ایسا کیس رجسٹر کرا سکتے ہیں جو چنگیزیوں کو جہنم واصل کر سکے۔"

"تمہارا مطلب ہے ٹھوس ثبوت فراہم ہو گئے ہیں؟"

"یس سر۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ لڑکی جسے چنگیزیوں نے اغوا کر رکھا ہے اور جس کی رہائی کے لئے آنے والے چار افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا' کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"اسی نواز حسنی کی بیٹی' جو آپ کے خیال میں چنگیزیوں کا کارندہ ہے۔"

خان رحیمی نے بے قراری سے کہا "گرل مجھے شروع سے اور تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔"

جواب میں میں نے اسے رئیس احمد کے گھر سے مال رشوت کے طور پر انڈر سیکرٹری کی خوابگاہ تک پہنچنے اور وہاں سے آگے کا سارا احوال تفصیل سے بتا دیا۔

خان رحیمی' حیرت اور بے یقینی کے عالم میں سنتا رہا' اس نے گاہے گاہے سوالات بھی کئے۔ جب میری بات ختم ہوئی تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے کہا "سر اختر زماں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اس کی "غیرت کا مردہ" کفن پھاڑ کر جاگا ہے' اب وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ایک طویل خاموشی کے بعد خان رحیمی نے کہا "میرا خیال ہے چنگیزیوں کے خلاف کافی شہادتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ میں نے اس مجذوب شخص کو بھی بلا لیا ہے جس نے فرخندہ اور اس کے ساتھی رپورٹر کو چاروں لاشوں تک پہنچایا تھا۔ اور وہ رپورٹر بھی کوہاٹ سے میرے پاس پہنچ چکا ہے۔ یہ دونوں گواہ عدالتی کارروائی کے دوران بہت اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔"

خان رحیمی نے اپنے پرس سے نکال کر کچھ فوٹو گراف میرے سامنے رکھ دیئے۔ یہ ان چاروں ڈھانچوں کی تصویریں تھیں جو پریس رپورٹر نے رات کے وقت فلیش گن کی مدد سے لی تھیں۔ ایک ڈھانچے کی گردن عجیب طرح سے مڑی ہوئی تھی......... میرے کہنے پر خان رحیمی نے ان دونوں افراد کو بلا لیا۔ فرخندہ کا ساتھی رپورٹر پچیس چھبیس سالہ جوان تھا۔ شیو بڑھی ہوئی' آنکھیں چمکدار اور پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ دوسرا شخص نیم دیوانہ قسم کا تھا۔ اس نے قمیض کے گریبان کو غلط بٹن سے بند کر رکھا تھا۔ بار بار سر کھجاتا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں افراد بڑے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ

ہم پولیس کو اس جگہ تک پہنچائیں گے جہاں چاروں لاشیں مدفون ہیں.......... تاہم میں نے محسوس کیا کہ خان رحیمی کچھ افسردہ نظر آرہا ہے۔ دونوں افراد باہر چلے گئے تو میں نے خان رحیمی سے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔

"گرل! تم نے حسنی کی بیٹی کا بتا کر مجھے شش وپنج میں ڈال دیا ہے۔ فاریور کائینڈ انفریشن میں چند روز پہلے جان چکا ہوں کہ اسمگلنگ میں استعمال ہونے والے افسر کا نام نواز حسنی ہے۔ اس شخص سے میری پرانی صاحب سلامت ہے۔ اس کے اہل خانہ سے بھی شناسائی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ اپنی لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اگر.......... تمہاری اطلاعات کے مطابق واقعی یہ معاملہ اس کی لڑکی کا ہے تو پھر ہمیں بے حد احتیاط کی ضرورت ہوگی.......... کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ میرا خیال ہے میں اس وقت فون کرکے اسے یہاں بلا لوں۔"

میں نے کہا "سر ہو سکتا ہے حسنی صاحب کی نگرانی ہو رہی ہو۔ ممکن ہے ان کا فون بھی ٹیپ کیا جا رہا ہو۔"

خان رحیمی نے کہا "یقینی بات ہے کہ ایسا ہو رہا ہوگا۔ تم نے اس طرف میری توجہ دلا کر اچھا کیا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے اس سے رابطہ کرنے کے لئے خصوصی احتیاط کرنا ہوگی۔"

وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھا اور فون والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں خان رحیمی کے ریڈنگ روم سے نکلی تو دینو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ منہ پھلائے اندرونی کمروں سے چلا آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ سلام و دعا ہوئی میں نے دیکھا اس کے رخسار پر طمانچے کا نشان ہے۔ کسی سے مار کھا کر آیا تھا۔ میں نے اس نشان کے بارے میں پوچھا پہلے تو وہ سٹپٹایا پھر غرا کر بولا "وہی خبیث' خصم کھانی ڈائن بیٹھی ہوئی ہے راجکماری بن کے۔ چانٹے مارتی ہے 'جیسے زر خرید غلام ہوں ہم۔"

"دینو! یہ کس کا ذکر خیر کر رہے ہو؟"

"وہی عیش وعشرت بی بی اور کون۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "تو وہ ابھی تک یہیں ہے؟"

دینو نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا "لیکن شاہ دین ٹوانہ تو چلا گیا ہے۔ ابھی مجھے خان صاحب نے بتایا ہے۔"

دینو بولا "شکار پر پاؤں مڑ گیا تھا نا اس کا' وہ موچ کا بہانہ کرکے یہیں بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک حکیم کے مشٹنڈے پتر سے علاج شلاج کراندی پئی ہے۔ ہم سے کون سی گل چھپی ہے۔ بابری سے آنکھ لڑی ہوئی ہے اس کی۔ دونوں اندھیرے سویرے ملتے رہتے ہیں۔ منہ کھلوائے گی تو میں کھول دوں گا پورے کا پورا۔ ساری گل دس دوں گا جا کر خان صاحب کو۔"

میں نے پوچھا "اب کہاں ہے وہ؟"

اس نے بتایا "منہ سر لپیٹ کر پڑی ہوئی ہے اپنے کمرے میں۔ میرا خیال ہے۔ رات بابری صاحب نے اسے تاؤنی شاؤنی لگا دی ہے۔"

"تاؤنی شاؤنی" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تاؤنی شاؤنی.......... مطلب.......... مارپیٹ.......... میرا خیال ہے کل آدھی رات کے وقت بابری اور عیش عشرت بی بی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ سر پھٹ گیا ہے اس کا کھندی ہے غسل خانے میں تلک (پھسل) گئی تھی۔ بندہ پوچھے غسل خانے میں تلکنے سے تالو پھٹ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے بابری صاحب نے اس کے تالو میں کوئی شے ماری ہے۔ ڈنڈا' گلدان یا ٹائم پیس وغیرہ.......... میں نے اپنے کانوں سے عشرت کے رونے کی آواز سنی تھی۔ بارش کی وجہ سے میں برانڈے میں آکر سو گیا تھا۔ میں نے چوڑیوں کی چھن چھن کی آواز سنی۔ پھر عشرت بی بی بابری کے کمرے سے نکلی اور بھاگتی ہوئی جا کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اب کہتی ہے تلک گئی ہوں۔"

میں ان اطلاعات پر حیران ہو رہی تھی۔ دینو کی بات میں وزن تھا۔ سلیم بیمار تھا۔ ہو سکتا ہے عشرت اس کی بے رخی اور سرد مہری سے اکتا کر اس کے کمرے میں گئی ہو اور سلیم نے اسے غصے میں کوئی شے دے ماری ہو۔ غصے میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا۔

"لیکن تجھے چانٹا کس خوشی میں پڑا ہے؟"

وہ جل کر بولا "میں نے بی بی سے بس اتنا ہی کہا تھا جی کہ غسل خانے میں گر کر تالو

نہیں پاٹ سکتا۔ شاید چوٹ لگنے کی وجہ توں آپ کچھ بھول شول رہی ہیں۔"

میں نے کہا "دینو' تم ایک ملازم ہو۔ گھریلو معاملات میں دخل دو گے تو ایسا ہی ہو گا۔"

جواب میں اس کی "جگت باز" زبان قینچی کی طرح چلنے لگی اسے رئیس احمد پر بھی بہت غصہ تھا جو کئی روز اس سے دستی نلکا چلواتا رہا تھا۔ دینو سے بمشکل جان چھڑا کر میں عشرت کے کمرے میں پہنچی وہ سر پر پٹی باندھے کروٹ کے بل بستر پر پڑی تھی میں نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے رخساروں پر پھر آنسو پھسلنے لگے۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر رونے کی وجہ پوچھی۔ عشرت پہلے تو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے پہلی دفعہ میرے سامنے اعتراف کیا کہ بابری (یعنی سلیم) سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

"شاہدہ' میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ بے وفا نکلا ہے۔ اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ سارے مرد مطلب پرست کیوں ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "شاہدہ دغابازی اور مطلب پرستی کا الزام صرف مردوں پر ہی کیوں' عورتیں بھی تو اس قسم کی ہوتی ہیں۔ تم اپنی طرف ہی دیکھو' تم نے کس سے وفا کی ہے۔ کس سے بے لوثی کا برتاؤ کیا ہے؟"

میرے صاف سیدھے لہجے نے عشرت کو کاٹ کر رکھ دیا۔ الفاظ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر وہ بلک اٹھی۔ دردناک آواز میں بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو شاہدہ' میں عورت کا بدترین روپ ہوں۔ میں ہوں ہی اس قابل۔ دنیا جہان کی برائیاں مجھ میں ہیں اور ان میں ایک خود غرضی بھی ہے۔ کس قدر خود غرض ہوں میں۔ میں جانتی تھی کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھتی ہو تو میں جانتی تھی وہ تم سے محبت کرتا ہے اور میں اس کے لئے ناراض وقت کو منانے والے کھلونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے باوجود اس کی مردانگی کے بھنور میں ڈوبتی چلی گئی اور خود کو گنوا کر اسے جیتنے کی کوشش کرتی رہی میرے جیسی سستی اور ارزاں عورت کا یہی انجام ہونا تھا۔ دنیا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کاش میں مر جاؤں اور ان ساری

مصیبتوں سے میری جان چھوٹ جائے۔"

مجھے عشرت پر غصے کے ساتھ ترس بھی آ رہا تھا۔ اس کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ ایک آنکھ تھوڑی سی سوجی ہوئی تھی۔ اپنے زخمی سر اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ ایک مظلوم ہستی نظر آ رہی تھی۔ میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"عشرت! کچھ بھی ہے بابری کو اس طرح تمہاری تذلیل کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ عورت کو مارنا مردانگی نہیں اور اگر وہ مردانگی کا دعویدار ہے تو اسے تم سے معافی مانگنا ہوگی۔"

وہ کراہ کر بولی "نہیں شاہدہ' مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ قصور سراسر میرا ہی تھا مجھے اس کی سزا ملی ہے۔ رہی اس کی بات تو وہ......... وہ تو تمہاری محبت کا روگی ہے۔ نہ اسے خود پر قابو ہے اور نہ اپنی سوچوں پر اور جو شخص اتنا بے بس ہو اس کی کسی حرکت کا کیا برا ماننا.........." اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکیوں کو روکا اور نسبتاً پرسکون لہجے میں بولی۔

"شاہدہ' میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اتنا دکھی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ سچ پوچھتی ہو تو وہ مایوسی کے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ دنیا میں تم وہ واحد عورت ہو جو اسے ڈوبنے سے بچا سکتی ہو۔ پلیز' اس کا کچھ کرو اگر تم چاہتی ہو کہ وہ زندہ رہے تو تمہیں آگے بڑھ کر اسے تھامنا ہو گا۔"

اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوٹھی کے اندر زبردست سرگرمی دیکھنے میں آئی۔ انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی کے علاوہ شعبہ وائلڈ لائف کا ایک اعلیٰ سرکاری افسر بھی یہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ نیم گنجے سر والے ایک ڈی ایس پی کی پراسرار آمدورفت بھی جاری تھی۔ میٹنگ پر میٹنگ ہو رہی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی اہم فیصلہ ہونے والا ہے۔ مجھے خان رحیمی پر غصہ آ رہا تھا میں ہر ہر قدم پر اس کی مدد کر رہی تھی لیکن اس نے مجھے ان صلاح مشوروں سے یکسر علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ میں ان میٹنگوں میں شریک ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ مجھے صورت حال سے باخبر تو رکھ سکتا تھا۔ اس نے ان دو دنوں میں پلٹ کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ ایک اڑتی اڑتی خبر میرے کانوں میں یہ بھی پہنچ چکی تھی کہ الیکشن میں شکست کھانے کے بعد چودھری وہاب چنگیزی ملک چھوڑنے کا ارادہ

رکھتا ہے۔ اگر اس خبر میں تھوڑی بہت بھی صداقت تھی اور وہاب چنگیزی کے ملک چھوڑنے کا امکان تھا تو ہمیں تیز رفتاری سے عمل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ چنگیزی پر ہاتھ ڈالنے میں اتنی تاخیر کیوں کی جا رہی ہے۔ تیسری شب جب میں اپنے کمرے میں بے چین سی بیٹھی ہوئی تھی ڈینو نے آکر بتایا کہ خان رحیمی مجھے خواب گاہ میں بلا رہا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں جس حالت میں ہوں فوراً پہنچ جاؤں۔ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید پھر "روحانی قوت" حاصل کرنے کا کوئی چکر ہے۔ اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جہاندیدہ لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے گریٹ گرل ناراض ہے۔ آئی نو......... میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔ ویری ساری فار دیٹ' بیٹھ جاؤ' میں آج تمہارے سارے شکوے دور کر دینا چاہتا ہوں۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بولا "میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں بہت سے سوال سر اٹھاتے رہے ہیں۔ تم نے بڑے صبر سے ان کے جوابات کا انتظار کیا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں اس لئے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ مختصراً حالات سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا میری شہرت ایک شکاری کے طور پر ہے اور میں پچھلے پچاس سال سے اس لائن پر ہوں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے مجھے شکاری پرندوں کو پکڑنے میں دلچسپی ہوئی اور میں نے نہ صرف انہیں پکڑنا بلکہ سدھانا بھی شروع کیا۔ اس پیشے میں میں نے کافی پیسہ کمایا۔

اچھے برے ہر طرح کے لوگوں سے ملا ہوں اور بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ مگر کچھ عرصہ پہلے ایک منفرد واقعہ پیش آیا۔ ایک روز تمہارے مرحوم شوہر واصف چنگیزی نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ وہ مجھے ایک کہنہ مشق شکاری کے طور پر جانتا ہے اور میرے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہے۔ میں نے وضاحت چاہی تو اس نے مجھے پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد انکشاف کیا کہ وہ وسیع پیمانے پر شکاری پرندوں کی تجارت کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں جو بھی لائسنس یافتہ اور غیر لائسنس یافتہ حضرات شکاری پرندے پکڑتے ہیں ان سے رابطہ کیا جائے اور پرندے ان سے خرید لئے جائیں......... ان فیکٹ وہ ان پرندوں کو مشرق وسطیٰ میں سمگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور مجھے پرندوں کے حصول کے لئے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ علاقے کے شکاریوں سے میرے تعلقات ہیں اور میں یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔ مجھے درمیان میں لانے سے اسے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس دھندے سے بالکل علیحدہ رہ سکتا تھا۔ وہ ایک سیاستدان تھا اس لئے ایسے کالے دھندے سے کوسوں دور رہنا چاہتا تھا۔ واصف چنگیزی کا مطمع نظر جاننے کے بعد میں نے اس کے لئے کام کرنے کی حامی بھرلی۔ ہمارے درمیان طے پا گیا کہ ہم ایک دوسرے سے قطعی رابطہ نہیں رکھیں گے اور کسی وقت ملنا اشد ضروری بھی ہوا تو یہ ملاقات انتہائی رازداری سے ہوگی......... میں نے واصف چنگیزی کی ہدایات پر عمل کیا اور علاقے کے شکاریوں سے اونے پونے داموں پرندے خریدنے شروع کر دیئے۔ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ میری طرح جنوبی اور شمالی علاقوں میں بھی واصف چنگیزی نے اپنے ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں جو اس کے لئے ناجائز پرندے اکٹھے کرنے میں مصروف ہیں۔ تاہم پرندوں کی تربیت کی تمام ذمے داری صرف مجھ پر تھی۔ دوسرے علاقوں سے پکڑے گئے اور خریدے گئے پرندے بھی میرے پاس پہنچا دیئے جاتے تھے۔ چند ہفتے پہلے ایک مفرور ڈاکو سولنگی جو دراصل چنگیزیوں کا ایجنٹ ہے ایک کفن میں پرندے بھر کر یہاں لایا تھا......... تم اس بارے میں جانتی ہی ہو میں خواہ مخواہ تمہیں بتا رہا ہوں۔ جانتی ہو نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ پائپ کے دو تین کش لے کر بولا "اب چنگیزیوں کی سازش کا سارا تانا بانا بکھر چکا ہے۔ ان کے سارے مہرے ہماری نظر میں ہیں۔ مگر وہ کمبخت ہم سے اتنی ہی دور ہے جتنا ان انکشافات سے پہلے تھا۔ میرا خیال ہے تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو۔ مسئلہ وہی حسنی کی بیٹی کا ہے۔ یہ معاملہ بہت نازک شکل اختیار کر گیا ہے۔ جس روز تم لاہور سے آئی ہو اسی روز چنگیزی نے نواز حسنی سے رابطہ قائم کیا ہے اور اس پر واضح کر دیا ہے کہ اگر پولیس نے بڑی حویلی کے کسی فرد پر ہاتھ ڈالا تو وہ اس کی تمام ذمے داری حسنی پر ڈالے گا اور اس کی کم از کم سزا ارسہ کی موت ہوگی۔ ان فیکٹ وہ عیار جاگیردار حسنی کی سب سے نازک رگ ہاتھ میں لے چکا ہے اور اس سے سب کچھ منوا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "سر' میں نے سنا ہے کہ شکست کے بعد وہاب چنگیزی ملک چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

خان رحیمی نے لہجے کو مزید دھیما کرتے ہوئے کہا "تم نے درست سنا ہے۔ وہ

باسٹرڈ اس ماہ کی پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے یہاں سے فرار ہو رہا ہے۔ اس نے ارسہ کی رہائی کے لئے دو شرطیں رکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ پروگرام کے مطابق حسنی اپنی نگرانی میں پرندوں کو مشرقِ وسطیٰ پہنچائے۔ دوسری یہ کہ ملک سے اس کی بحفاظت روانگی کا انتظام کرے۔ شرائط کے مطابق حسنی کی بیٹی بھی جاگیردار کے ساتھ ہی امریکہ یا کینیڈا جائے گی۔ اور اس کی رہائی وہاں پہنچ کر ہوگی۔"

میں نے پوچھا "اب حسنی صاحب کا کیا ارادہ ہے؟"

خان رحیمی نے کہا "حسنی واقعی ایک دیانتدار شخص ہے۔ اپنے ملک سے اس کی وفاداری ہر شبے سے بالاتر ہے۔ وہ ایک ایسی کرسی پر بیٹھا ہے جہاں اس کے لئے چنگیزیوں کی ڈیمانڈ پوری کرنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ وہاب چنگیزی اس کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر گیا تھا مگر اس نے بڑی جرات سے اس دولت کو ٹھوکر ماردی۔ نتیجے میں وہاب چنگیزی نے وہ چال چلی جس نے حسنی کے پہاڑ جیسے حوصلے اور فولاد جیسی جرات کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ وہ چال تھی جس کا کبھی حسنی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آئی تھنک ہم میں سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ حسنی کے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔ انسانی ڈکشنری میں سے شاید ہی کوئی لفظ اس محبت کی شدت بیان کر سکے جو حسنی اپنی بیٹی سے رکھتا ہے۔ گاڈ نو۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے۔"

میں نے پوچھا "تو کیا' وہ اب چنگیزیوں کے مطالبے ماننے پر تیار ہیں؟"

خان رحیمی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں......... وہ تیار ہے۔ وہ ایک انسان ہے۔ ایک عظیم رشتے کی محبت میں بندھا ہوا۔ اس کا دوسرا نام مجبوری ہے۔ ہر انسان ایک حد تک برداشت کر سکتا ہے اور حسنی کے لئے یہ حد گزر چکی ہے۔ وہ اپنی معصوم بچی کو بچانے کے لئے زہر کا ہر گھونٹ پینے کو تیار ہے۔"

یکایک ساتھ والے کمرے سے شوروغل کی صدائیں آنے لگیں۔ کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ مجھے پھانسی نہیں چڑھنا ہے۔ جانے دو مجھے۔

ایک دوسری آواز التجائیں کر رہی تھی اور جانے والے کو روکنے کی کوشش میں تھی۔ وہ آواز یقیناً" حسنی صاحب کی تھی۔ شوروغل سن کر میں اور خان رحیمی برآمدے

میں پہنچے تو وہاں عجیب منظر دیکھا۔

حسنی صاحب اپنے ایک ہم عمر شخص سے لپٹے ہوئے تھے اور اسے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا شخص محکمہ وائلڈ لائف کا ضلعی انچارج تھا۔ اس کا نام محمد رفیع خان تھا۔ وہ پینترے بدل بدل کر حسنی صاحب کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ حسنی صاحب کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ "حسنی......... میں بھی بال بچے دار ہوں۔ میں باقی زندگی جیل میں گزارنا نہیں چاہتا۔ تم جانے دو مجھے۔" وہ حسنی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر صحن تک لے گیا اور پھر خود کو چھڑا کر کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھا اس وقت حسنی کا بیٹا اخترزماں عرف چیف لپک کر آگے آیا اور رفیع خان کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے تو رفیع خان اسے دھکے دے دے کر پیچھے ہٹاتا رہا پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اخترزماں نے بجلی کی طرح تڑپ کر بھاری بھرکم رفیع خان کو زمین سے اٹھایا اور لان کی گھاس پر پٹخ دیا۔ وہ غصے میں بے قابو ہو کر رفیع خان کو گالیاں دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر خان رحیمی تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے نوجوانوں جیسی قوت اور پھرتی سے رفیع خان کو اخترزماں کے پنجے سے نکالا۔ اتنے میں کچھ اور ملازمین بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے مشتعل اخترزماں کو گھیرے میں لے لیا۔ اخترزماں اچھل اچھل کر اور لپک لپک کر رفیع خان کی طرف آ رہا تھا۔ رفیع خان کے ہونٹوں پر خون تھا اور وہ ہانپتی ہوئی آواز میں باپ بیٹے کو ٹوٹی پھوٹی دھمکیاں دے رہا تھا۔ "تباہ کر دوں گا تم کو......... ایک گھنٹے کے اندر ہتھکڑیاں نہ لگواؤں تو نام نہیں......... دیکھتا ہوں اب کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔"

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ انڈر سیکرٹری نواز افروز حسنی' اپنے گھر میں جن کا رعب اور دبدبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا' ملازمین کی پرواہ کئے بغیر رفیع خان کے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگے اور اس کی منتیں کرنے لگے کہ وہ یوں انہیں برباد نہ کرے۔

رفیع خان چیخنے لگا۔ "نہیں......... مجھے مارو' مجھے گالیاں دو' اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی نکال لو۔ میں اب رکنے والا نہیں ہوں۔"

خان رحیمی نے اپنی فہم و فراست کو استعمال میں لا کر بڑی مشکل سے اس صورت

حال پر قابو پایا اور شعلے کی طرح بھڑکے ہوئے رفیع خان کو کسی نہ کسی طرح سردار محمد کے ساتھ واپس مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ خان رحیمی نے اخترزماں کو بھی سرزنش کی کہ اس نے اپنی جوشیلی طبیعت سے معاملے کو پیچیدہ تر کر دیا ہے۔ اخترزماں جھاڑ کھانے کے بعد اندر ہی اندر کھولتا ہوا بائیں باغ کی طرف چلا گیا۔ حسنی صاحب سر جھکائے ہوئے پہلے ہی اپنے کمرے کی طرف جا چکے تھے۔ میں خان رحیمی کے ساتھ پھر اس کی خوابگاہ میں آ گئی خان رحیمی نے کرسی پر گر کر طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ اب تک ہونے والی جھڑپوں میں سے شدید ترین تھی۔ پرسوں سے حسنی اور رفیع میں مسلسل تکرار ہو رہی ہے......... ان فیکٹ حسنی کی سوچ بھی معقول نہیں ہے۔ وہ ایک زیرک اور جہاندیدہ افسر ہونے کے باوجود بچوں کی طرح سوچ رہا ہے۔ بیٹی کی خاطر وہ چنگیزی کا ہر مطالبہ غیر مشروط طور پر مان لینا چاہتا ہے۔ چاہے اس کوشش میں خود ہی پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے۔ مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد وہ سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ امریکہ یا کینیڈا پہنچتے ہی چنگیزی اس کی بیٹی کو چھوڑ دے گا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ حسنی ان کے مطالبات پورے کر سکے اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو چنگیزی اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ نہیں کاٹے گا۔ وہ بہت سے اور مطالبات بھی حسنی کے سامنے رکھے گا۔ رفیع خان کا اس جھگڑے میں زیادہ قصور نہیں۔ وہ سرکاری ملازم ہے اور اصولی طور پر اپنی انسپکشن کی رپورٹ دینا اس کا فرض ہے۔ اس کی انسپکشن کہتی ہے کہ کروڑوں روپے کے پرندے اس وقت نواز حسنی کی تحویل میں ہیں۔"

میں نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہونا چاہئے؟"

وہ بولا "ہمارے پاس اب مناسب شواہد موجود ہیں۔ چنگیزی قانون کی مضبوط گرفت میں آ سکتا ہے۔ مگر سوال پھر حسنی کی بیٹی کا آ جاتا ہے۔ پچھلا ریکارڈ گواہ ہے کہ چنگیزی جدی پشتی بلیک میلر ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس سے پہلے حسنی نے اپنی بیٹی کو رہا کرانے کے لئے طویل اور سر توڑ کوشش کی ہے......... تقریباً ڈھائی ماہ سے وہ دن رات اس کوشش میں لگا ہوا ہے......... یہاں تک کہ اس نے پرائیویٹ طور پر غیر ملکی کمانڈوز کی خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ چنگیزیوں کے ڈیرے پر مرنے والے غیر ملکی درحقیقت کمانڈوز ہی تھے۔ ان میں رابرٹ نامی ایک مقتول تو بہت

مشہور شخص ہے۔ مارشل آرٹ کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں اس کا نام اکثر سنا جاتا تھا۔ معلوم نہیں چنگیزیوں کے ڈیرے پر ان چاروں کے ساتھ کیا بیتی۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے' وہ شیر والی بات صحیح ہو۔ ڈھانچوں کے جو فوٹوگراف آپ نے مجھے دکھائے تھے ان میں ایک ڈھانچے کا نرخرہ صاف ٹوٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

خان رحیمی نے میری بات کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ گہری سانس لے کر بولا "وہ چاروں بدنصیب عیدالضحیٰ کے بعد تین اور چار اکتوبر کی درمیانی شب کو شکاریوں کے بھیس میں چنگیزیوں کے ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ چار اکتوبر کو وہ سارا دن اپنے کیمپ کے اردگرد سور کے شکار میں مصروف رہے۔ ان کا کیمپ چنگیزیوں کے ڈیرے سے قریباً پون میل کے فاصلے پر تھا۔ انہوں نے کئی سور مارے اور چنگیزیوں کے خاص ملازم رب نواز سے بھی ان کی ملاقات ہوئی یہ تمام باتیں اس نیم دیوانے اور نیم سیانے نے بتائی ہیں جو ابھی تم سے باتیں کر رہا تھا......... اگلے روز چاروں شکاری اپنے کیمپ سے غائب پائے گئے۔ کچھ عرصہ خاموشی رہی' پھر یہ افواہیں اڑنے لگیں کہ انہوں نے چنگیزیوں کے ڈیرے میں گھسنے کی کوشش کی اور خون خوار درندے کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔"

خان رحیمی کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی الجھا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ کہہ رہا تھا قانون کو آواز دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دوسری طرف سنا رہا تھا کہ چنگیزی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مشہور ہیں۔ تیسری طرف وہ کسی چھاپہ مار کارروائی کے امکان کو بھی رد کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ اس کوشش میں تربیت یافتہ کمانڈوز ہلاک ہو چکے ہیں......... کوٹھی کے کمروں میں آویزاں دیواری گھڑیوں کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ وقت کے قدم ٹک ٹک کی مخصوص چاپ سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بقول خان رحیمی' چنگیزی نے اپنے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے جو ڈیڈ لائن دی تھی اس کے ختم ہونے میں اب صرف 72 گھنٹے باقی تھے۔ 72 گھنٹے کے اندر اندر وہاب چنگیزی کو ملک سے باہر چلے جانا تھا۔ وہیں چلے جانا تھا جہاں وہ میرے بچے کو مارنے سے پہلے تھا۔ آزاد فضاؤں میں۔ عیش و عشرت کی دنیا میں' شرابوں میں' عورتوں میں اور دنیا کی رنگینیوں میں' اسے چلے جانا تھا......... اپنے ہاتھوں کو سلامت لے کر جنہوں نے میرے بچے کی انگلیاں کاٹی تھیں۔ ان آنکھوں کو سلامت لے کر جنہوں نے میرے فرحان کو مرتے دیکھا تھا اور ان

کانوں کو سلامت لے کر جنہوں نے اس کی آخری ہچکی سنی تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا' یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو کس ماں کو یہ حق رہ جاتا تھا کہ وہ اپنی آغوش کو اپنے بچے کی پناہ گاہ کہہ سکے؟ جو اپنی بانہوں کو اس کی ڈھال اور اپنے آنچل کو اس کا سایہ کہہ سکے؟ "نہیں وہاب چنگیزی" میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے پکار کر کہا "تم میرے بچے کو مار کر یہاں سے نہیں جاسکتے۔ مجھ سے جیسے بھی ہوسکا' میں تجھ کو روکوں گی' خود مروں گی یا تمہیں مار دوں گی۔ اگر تیری عیاری نے تجھے قانون سے بالاتر کر دیا ہے اور شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی تیرا جرم عدم پتہ ہے' تو میں بھی تجھ تک پہنچنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈلوں گی۔"

میں خان رحیمی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میڈم نادرہ کو کار تلے کچلتے وقت جو دھند میری آنکھوں کے سامنے پھیلی تھی وہ پھر پھیلتی چلی جارہی تھی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک بدلی ہوئی عورت ہوں۔ شرم' خوف اور جھجک کے احساسات مجھ سے کوسوں دور چلے گئے ہیں۔ میں بڑی دلیری سے سوچ رہی تھی۔ اپنے مجرم کو عدالت کے کٹہرے تک لانے کے لئے میں نے بڑی ثابت قدمی سے جدوجہد کی تھی۔ ایک طویل انتظار کیا تھا اور شب و روز دعائیں کی تھیں۔ لیکن......... مراد بر نہیں آئی تھی۔ سب کچھ ثابت ہونے کے باوجود کچھ ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہاب چنگیزی آج بھی محفوظ و مامون تھا۔ وہ اپنا کھیل کامیابی سے کھیل کر اور بے شمار مالی فائدہ حاصل کرنے کے بعد اس ملک سے واپس جا رہا تھا۔ اس کی یہ فاتحانہ واپسی مجھے کسی طور پر قبول نہیں تھی......... آخر میں اس فیصلے پر پہنچ گئی جو کئی دنوں سے دھیرے دھیرے میری سوچوں میں پرورش پا رہا تھا......... میں مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلی اور دینو کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ جلد ہی وہ مجھے مل گیا۔ کوٹھی کے عقبی باغ میں وہ خشک پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اس کام سے چھٹی دلائی اور اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آگئی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے دینو ایک بہروپیا تھا۔ نت نئے سوانگ رچانے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ کچھ عرصہ اس نے ایک ناٹک کمپنی میں بھی کام کیا تھا۔ یوسف کی

منگنی اور باز ملنے کی خوشی میں جب خان رحیمی نے کوٹھی میں سٹیج شو کا اہتمام کیا تھا تو اس میں دینو نے بھی ایک مزاحیہ روپ دھار کر داد حاصل کی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی خداداد صلاحیت کا پتہ چلا تھا' وہ واقعی ایک کامیاب بہروپیا تھا......... کمرے میں جا کر میں نے دینو کو تفصیل سے سمجھایا کہ میں اس سے کیا چاہتی ہوں۔ پہلے تو وہ بے حد حیران ہوا اور اپنی گلابی اردو میں الٹے سیدھے سوال کرنے لگا' تاہم جب اسے یقین ہوگیا کہ میں پوری طرح سنجیدہ ہوں اور یہ سب کچھ خان رحیمی کی ہدایات پر کر رہی ہوں تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ غور و فکر کے بعد اس نے بتایا کہ اس کام کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ چند چیزوں کی ضرورت ہے جو وہ ایک دو گھنٹے میں حاصل کر لے گا۔ میں نے اسے تین گھنٹے کی مہلت دے دی۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد وہ مجھے لے کر کمرے میں گھس گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے مجھے ایک پھٹا پرانا لباس پہننے کو دیا۔ یہ لباس پہنتے ہی میں اپنی عمر سے کئی سال بڑی لگنے لگی۔ اس کے بعد دینو نے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے میرے بال قینچی سے کاٹ دیئے۔ یہ کٹنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی نے درانتی سے اونچی نیچی فصل کاٹ دی ہو۔ بعد ازاں اس نے میرے چہرے پر ہاتھ کی صفائی دکھائی اور پندرہ بیس منٹ میں مجھے ایک بدصورت ادھیڑ عمر عورت کا روپ دے دیا۔ میں نے آئینے میں چہرہ دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ اگر ایک ان پڑھ بہروپیا چہرے کو اتنا بدل سکتا ہے تو جدید دور کے میک اپ مین کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ میرے دانت پیلے زرد تھے۔ آنکھوں میں مصنوعی گیڈ تھی اور چہرے کی جلد بری طرح مرجھائی ہوئی تھی۔ دینو بہروپ بھرنے کے لئے جو سامان لایا تھا اس میں ایک استرا بھی تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے یہ استرا لباس میں چھپا لیا۔ میری یہ حرکت دیکھ کر دینو جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا کچھ اور ڈر گیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "بی بی جی' مینوں تو کوئی لمبا ہی چکر لگتا ہے۔ ایسے سین پٹ تو ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گڑ بڑ والا معاملہ ہے تو مینوں دس دیو۔ میں چھٹی کر جاؤں۔ یہ نہ ہو بعد میں پولیس مینوں بھی آگے لایا ہووے۔ میں تو ویسے ہی پولیس سے بڑا ڈرکدا ہوں۔"

میں نے پوچھا "تم کیوں ڈرتے ہو پولیس سے؟"

وہ بولا "بس جی وہی زیوروں والا معاملہ ہے۔ ٹھاکا گھر میں چھپا کے رکھنے ڈالا ہو

ہے میں نے اپنی جان کو۔ اب تو سوچا ہے کہ تھانے میں ہی جمع کرا دوں۔ اور کچھ نہیں تو پولیس والوں کے کم تو آئیں گے۔"

میں نے دینو کو سمجھا دیا کہ وہ میرے بہروپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور اس وقت تک اپنی زبان بند رکھے گا جب تک میں واپس نہیں آجاتی۔ (ویسے مجھے واپس آنے کی امید کم ہی تھی) میں بڑی بے قراری سے تاریکی پھیلنے کا انتظار کرنے لگی۔ میں کوٹھی سے اس طرح نکلنا چاہتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ خاص طور پر سلیم کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے میرے ارادوں کی بھنک بھی پڑے۔ میں جس خطرے میں کودنے جا رہی تھی اس سے سلیم کو کوسوں دور رکھنا چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی میری وجہ سے بہت دکھ جھیل چکا تھا۔ جونہی شب کی سیاہی پھیلی میں نے خان رحیمی کے لئے لکھا ہوا خط دینو کے حوالے کیا اور اسے سمجھایا کہ یہ خط اسے کس وقت اور کس جگہ رکھنا ہے۔ اس کے بعد میں نے خود کو ایک موٹی گرم چادر میں لپیٹا اور کوٹھی سے نکل آئی۔

خان رحیمی کی کوٹھی سے بڑی حویلی پہنچنے اور وہاں سے چنگیزیوں کے ڈیرے تک آنے میں مجھے ایک دن لگ گیا۔ اس سفر کا حال کافی طویل ہے لہٰذا میں اصل واقعات کی طرف آتی ہوں۔ جس دن میں وہاں پہنچی وہ جمعرات کا دن تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمعرات کے روز سہ پہر کے وقت ڈیرے سے باہر بہت سے غریب غربا اکٹھے ہوتے ہیں یہاں کسی نامعلوم فقیر کا ایک چھوٹا سا مزار تھا۔ مزار بھی کیا تھا بس ایک پختہ ڈھیری سی تھی۔ یہاں قوالیاں ہوتی تھیں۔ چمٹے بجائے جاتے تھے۔ نعرہ زنی ہوتی تھی۔ بعض لوگ گھنگھرو پہن کر ناچنے بھی لگتے تھے۔ جن دنوں میں اس منحوس ڈیرے پر قید تھی میں نے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی یہ سب آوازیں سنی تھیں۔ میری اطلاعات کے مطابق ہر جمعرات کو وہاب چنگیزی یہاں آتا تھا اور غریبوں مسکینوں میں کپڑا اور کھانا وغیرہ تقسیم کرکے اپنی جاگیرداری کا غرور بڑھاتا تھا۔ وہاب چنگیزی سے پہلے یہ "جاگیردارانہ فرض" میرا شوہر واصف ادا کیا کرتا تھا۔ بڑی حویلی کے دستور کے مطابق جمعرات کے روز حویلی میں کپڑے کے بڑے بڑے تھان آتے تھے اور دیگیں پکائی جاتی تھیں۔ تھانوں اور دیگوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی تھی جتنے گھر کے افراد' سب لوگ ایک ایک تھان اور ایک ایک دیگ پر ہاتھ رکھتے تھے۔

اس کا مطلب ہوتا تھا یہ خیرات ان کے نام پر تقسیم کی جائے گی۔

کچھ عرصہ پہلے میں خیرات دینے والوں میں تھی' آج خیرات لینے والوں کے ہجوم میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ یہ ایک طویل قطار تھی۔ یہ مزار کی ڈھیری سے شروع ہوتی تھی اور اس کا دوسرا سرا مالٹوں کے باغ تک پہنچتا تھا۔ اس قطار میں علاقے بھر کے خستہ حال بھیک منگے شامل تھے۔ وہ سوکھے سوکھے منہ بنائے منتظر نگاہوں سے ڈیرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے وہاب چنگیزی کو نمودار ہونا تھا۔ دیگوں اور کپڑے کے تھانوں والے تین چھکڑے پہنچ چکے تھے اور ان کو دیکھ دیکھ کر بھوکوں ننگوں کو اپنی ضروریات اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ موٹی گرم چادر کے نیچے میرا ہاتھ تیز استرے کے دستے کو ٹٹول رہا تھا۔ میں آج اس زمین کو چنگیزی کے وجود سے پاک کر دینا چاہتی تھی۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی کہ میرے استرے کی دھار وہاب چنگیزی کی موٹی سرخ گردن تک پہنچنے سے پہلے مجھے موت نہ آئے۔ ایک دفعہ میں چنگیزی کا نرخرہ کاٹ دیتی اور اسے بے دم ہو کر زمین پر گرتے دیکھ لیتی اس کے بعد مجھے موت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اب سوچتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں کہ اس وقت مجھے موت کتنی بے وقعت چیز محسوس ہو رہی تھی۔ اگر کوئی خوف تھا تو وہ صرف اپنی ناکامی کا تھا۔ ناکامی کئی صورتوں میں آسکتی تھی۔ کسی کو مجھ پر شبہ ہو جاتا' کوئی مجھے پہچان لیتا' یا مجھے چنگیزی پر جھپٹتے دیکھ کر دبوچ لیتا' یہ بھی ممکن تھا کہ میں چنگیزی کو بر وقت اور صحیح زخم نہ لگا پاتی' ان سارے اندیشوں اور ساری امیدوں کو سینے میں دبائے میں فیصلہ کن لمحے کی منتظر بیٹھی رہی۔ آخر باغ کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ساری قطار اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور امید بھری نظروں سے ڈیرے کی طرف دیکھنے لگی۔ جاگیردار کے لٹھ بردار کارندوں نے بھیک منگوں کو مار مار کر قطار سیدھی کی اور سب کو نیچے بٹھا دیا۔ غلیظ کپڑوں کے اندر سے خالی برتن نکل کر چمکنے لگے۔ میں نے دور سے جاگیردار کا سرخ لباس دیکھا وہ خیرات بانٹتا ہوا دھیرے دھیرے ہماری طرف آرہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے مسلح محافظ تھے۔

یہ لوگ کچھ اور نزدیک آئے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ استرے کے دستے پر خود بخود میری گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میں بجھی ہوئی نظروں سے اپنے سامنے دیکھنے لگی۔ خیرات بانٹنے کے لئے وہاب چنگیزی کی جگہ میرا دیور شجاع آیا تھا۔ میں اسے صاف

پہچان سکتی تھی دست قدرت میرے اور وہاب کے درمیان آگیا تھا۔ میں گم صم بیٹھی رہی۔ میرے دیور نے میرے سر پر سوتی کپڑے کا ایک تہہ شدہ ٹکڑا رکھ دیا اور میری جھولی میں کچھ پلاؤ اور زردہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ میں اپنے بہروپ کا بھرم رکھنے کے لئے جھولی میں سے لقمہ لقمہ چاول نکال کر کھاتی رہی اور ان لوگوں کی بے بسی کا منظر دیکھتی رہی جو زیادہ چاول اور کپڑا حاصل کرنے کے لئے شجاع کے پاؤں چھو رہے تھے اور منتیں سماجتیں کر رہے تھے۔ تقریباً" ایک گھنٹے بعد یہ ہنگامہ ختم ہوا اور پیپل کے ایک درخت تلے لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ مجھے وہاں چنگیزیوں کا ملازم خاص رب نواز بھی کھڑا نظر آیا۔ میں اسے لمبے قد کی وجہ سے صاف پہچان گئی۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی دھیمی چال چلتی درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ پچھلے پہر کی نرم دھوپ شاخوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ رب نواز کی باتیں سن کر پتہ چلا کہ وہ مالٹوں کی چھانٹی کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو کام پر لگانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اسے کام پر لگایا جائے۔ غالباً" معاوضے میں چند درجن گلے سڑے پھل ملنے کا مکان تھا۔ رب نواز نے امیدواروں کو دو قطاریں بنانے کا حکم دیا۔ چند لمحوں میں قطاریں بن گئیں۔ میں بھی غیرارادی طور پر ایک قطار میں کھڑی ہوگئی۔ رب نواز اور اس کے ساتھی مزدوری کے لئے امیدواروں کو چھانٹنے لگے۔ لگتا تھا پھل کے بدلے یہ مزدوری یہاں اکثر کی جاتی ہے۔ کیونکہ سب لوگ طریقہ کار سے واقف تھے۔ جونہی رب نواز کسی مرد یا عورت کو اشارہ کرتا وہ خوشی خوشی ایک درخت کے نیچے جا کھڑا ہوتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رب نواز اور اس کے ساتھی تنومند مردوں کو چھانٹ رہے ہیں یا نوجوان خوش شکل عورتوں کو۔ ظاہر ہے جاگیرداروں کے کارندوں کو اپنی آنکھیں سینکنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس بھرتی میں میرا انتخاب مشکل ہے۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر رب نواز کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی ایک ساعت کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے نظرانداز کر دے گا مگر اچانک میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ میرے بدن پر سرتاپا سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے رب نواز کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ مجھے وہ منظر یاد آگیا جب شیخوپورہ کے نواح میں سرکنڈوں کے اندر عابد کی موت کے بعد میں گڑھے میں گر گئی تھی اور رب نواز نے ٹارچ کی روشنی میں میرا چہرہ دیکھا تھا۔ چہرہ

دیکھنے کے بعد وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ آج ایک بار پھر ویسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ چند ساعتیں جو برسوں پر بھاری تھیں گزر گئیں اور میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ وہ مجھے قطارے سے آگے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں قطار سے نکلی اور تیز قدموں سے چلتی درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مزدوری کے لئے چن لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں آٹھ دس اور مرد و زن درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ باقیوں کو واپس جانے کی ہدایت کی گئی۔ رب نواز اور اس کے ساتھی ہمیں لے کر باغ کے اندر آگئے۔ کچھ ہی فاصلے پر اس زرد چاردیواری کی جھلک نظر آئی جس کے اندر فرحان نے دم توڑا تھا اور میں نے بے شمار ذلتیں جھیلی تھیں۔ اس چاردیواری کو دیکھتے ہی میرا تن بدن پھنکنے لگا میں نے کن اکھیوں سے رب نواز کی طرف دیکھا۔ وہ میرے وجود سے اب بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اس کے کسی انداز سے ظاہر نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید میں غلطی پر ہوں' ہو سکتا ہے رب نوز پہلی دفعہ مجھے دیکھنے اور دوسری دفعہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا ہو۔ انہی سوچوں میں کھوئی میں مالٹوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے سامنے آبیٹھی اس میں ہر طرح کے مالٹے تھے۔ چھوٹے بہت چھوٹے' بڑے بہت بڑے' خوش نما خوبصورت ٹیڑھے میڑھے اور گول مٹول' سڈول اور پلپلے' کچھ آدمی مالٹوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنا رہے تھے ہمیں ان مالٹوں کو کریٹوں اور بوریوں میں بھرنے کا کام کرنا تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں بھی کام میں لگ گئی۔ رب نواز دو تین بار میرے قریب سے گزرا لیکن اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میرے پاس ہی ایک عورت کام کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بچے کو گود میں ڈالے دودھ بھی پلا رہی تھی۔ بچہ ماں کی مصروفیت سے بدمزہ ہو کر رو رہا تھا۔ عورت نے اسے ڈانٹتے ہوئے سرگوشی کی "چپ کر جا چھوٹو' نہیں تو جاگیردار کا شیر تمہیں کھا جائے گا" اس معمولی سی سرگوشی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ عورت بچے کو ڈرانے کے لئے روایتی شیر کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ یہ سچ مچ کا شیر تھا جو سامنے والی زرد چار دیواری کے اندر کہیں بند تھا' اور اگر وہ اب تک ان مفلوک الحال مزدوروں سے دور تھا تو یہ جاگیردار کی مہربانی تھی۔ اپنی ایسی ہی "مہربانیوں" سے جاگیردار نے ان مفلوک الحال لوگوں کو احسانوں کے بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں کرتے تھے اور کہتے تھے کتنا اچھا ہے ہمارا جاگیردار' اس کے پاس ایک جیتا جاگتا شیر ہے پھر

بھی وہ اس شیر کو ہمارے اوپر نہیں چھوڑتا۔ شیر کا تصور ذہن میں آتے ہی میرے جسم میں تپش سی جاگنے لگی۔ جی چاہا زرد چاردیواری پھاند کر اندر جاؤں اور مرنے سے پہلے وہاں موجود ہر درندے کو جان سے مار ڈالوں۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہاب چنگیزی کا ایک کارندہ تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیوں ری، مسلمان ہے؟"

میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا "روٹیاں لگالے گی تندور میں؟"

"ہاں ہاں لگالوں گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کار کرنے کے بعد مجھ سے مل لینا۔ میں ادھر بیٹھا ہوں سامنے چھپر تلے۔"

میں اس امداد غیبی پر حیران ہونے لگی۔ خود بخود کوٹھی کے اندر جانے کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ پھر میرا دھیان رب نواز کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ بھی تو رب نواز کی مہربانی نہیں تھی۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ یقیناً" ایسا ہی تھا۔ اس بات پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ رب نواز مجھے پہچان چکا ہے اور کسی خاص وجہ سے میرے لئے راستہ کھول رہا ہے۔ مجھے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد اچانک کوٹھی کی پچھلی جانب سے ایک خوفناک دھاڑ سنائی دی کافی فاصلہ ہونے کے باوجود میں پہچان سکتی تھی۔ یہ چڑیا گھر کے شیر سے ملتی جلتی آواز تھی۔ یہ آواز سنتے ہی باغ میں کام کرنے والے مرد و زن سہم گئے۔ سکڑی سہمی عورتوں کو دیکھ کر جاگیردار کے کارندے مونچھوں کو تاؤ دینے اور مسکرانے لگے۔ جیسے وہ خود بھی شیر ہوں، اور انہیں ہر کمزور اور جاندار کو پھاڑ کھانے کا اختیار حاصل ہو۔

ہم شام تک کام میں مصروف رہے۔ اس دوران میں رہ رہ کر سوچتی رہی کہ ارسہ کو چھڑانے کی کوشش میں ہلاک ہونے والے وہ چاروں افراد اتنے سخت پہرے سے گزر کر ڈیرے کے اندر کیونکر پہنچ پائے۔ یقیناً" انہوں نے بڑی جرات سے کام لیا تھا۔ ایک اور بات بھی الجھا رہی تھی اور وہ یہ کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہو پایا تھا۔ فرخندہ کے ساتھی اشفاق شاہ کی پہلی رپورٹ کے مطابق ہلاک شدگان کی تعداد تین تھی لیکن تصویروں میں چار ڈھانچے دکھائی دے رہے تھے.......... میں انہی سوچوں میں گم

تھی جب سارا کام ختم ہو گیا۔ میں اس شخص کے پاس پہنچی جس نے روٹیاں لگانے کے بارے میں کہا تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا پھر مجھے لے کر کوٹھی کے اندرونی حصے میں آگیا۔ یہ سب در و دیوار میرے جانے پہچانے تھے۔ اس شخص نے کہا پہلے میں اچھی طرح منہ ہاتھ دھولوں پھر باورچی خانے کی طرف چلی جاؤں۔ سامنے ہی نلکا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ دھوئے۔ پھر اوڑھنی کا پلو بھگو کر چہرے سے گرد صاف کرنے لگی۔ میں منہ دھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس صورت میں وہ ساری سیاہی اور سریش وغیرہ دھل جاتی جو ڈینو نے میرے چہرے اور ہاتھوں پر لگائی تھی۔ آنکھوں کی مصنوعی گیڈ وغیرہ صاف کرنے کے بعد میں تیار ہو گئی تو باورچی خانے کی طرف آگئی۔ باورچی خانے میں پہلے سے دو ملازم مصروف تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ ایک بڑا سا تندور بھی لگا ہوا تھا۔ غالباً" ملازموں کو میرے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا۔ جونہی میں پہنچی ایک کرخت عورت نے بڑی بڑی دو پراتیں میرے سامنے رکھ دیں اور مرد ملازم نے آٹے کا ایک بورا گھسیٹ کر میرے آگے کر دیا۔ میں رات گئے تک آٹا گوندھ کر وقفے وقفے سے روٹیاں لگاتی رہی۔ اس دوران رب نواز دو دفعہ مجھے دیکھنے آیا۔ اس کے کندھے سے ایک طاقتور رائفل جھول رہی تھی۔ اپنے چہرے سے اس نے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا میرے بارے کوئی شک رکھتا ہے.......... قریباً" دس بجے میں کام سے فارغ ہوئی اور چند لقمے کھا کر برآمدے میں سونے کے لئے چلی گئی۔ سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا اور ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی۔ برآمدے میں ہوا کی آمد و رفت کو روکنے کے لئے بوسیدہ سی چقیں لگائی گئی تھیں۔ یہ چقیں ہوا کے زور پر دیوہیکل چمگادڑوں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر وہی موٹی سی سخت گیر عورت سو رہی تھی جسے میں نے باورچی خانے میں کام کرتے دیکھا تھا۔ اس کے خراٹے اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں "ڈبل خراٹے" ہی کہا جا سکتا ہے۔ نہ صرف وہ سانس چھوڑتے ہوئے آواز نکالتی تھی بلکہ سانس لیتے ہوئے بھی ایک پر ہول گونج پیدا کرتی تھی.......... رات کے قریباً" ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے جب میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور لحاف ہٹا کر چارپائی سے اتر آئی۔ میں شام ہی کو اندازہ لگا چکی تھی کہ مغویہ لڑکی کہاں ہو گی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً" دشواری نہیں ہوئی، کیوں میں

خود بھی اس زندان کی قیدی رہ چکی تھی۔ لڑکی انہی کمروں میں تھی جہاں میں نے اپنی زندگی کے ہولناک ترین دن گزارے تھے۔ چپل پہنے بغیر میں دھیمے قدموں سے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔ تیزدھار استرا میرے لباس میں موجود تھا اور سینے میں عجیب طرح کی بے خوفی بھری ہوئی تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی راہداریوں سے گزر کر میں ایک چھوٹے سے احاطے سے گزری۔ یہاں گھوں گھوں کی پرشور آواز سے وہ جنریٹر چل رہا تھا جو کوٹھی کو بجلی فراہم کرتا تھا۔ احاطہ پار کر کے میں ان کمروں کے سامنے آگئی جہاں میں نے قید کاٹی تھی اور اب میرے جیسی کوئی اور اذیت کے دور سے گزر رہی تھی۔ یہ کل دو کمرے تھے۔ میں نے دونوں کے دروازں سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا جب کہ دوسرے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ ارسہ اسی کمرے میں ہو گی۔ مزید تسلی کے لئے میں گھوم کر گرل دار کھڑکی کے سامنے آئی۔

کھڑکی کی درزوں اور اس کے اوپر روشندان میں سے ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ ایک اکیلی لڑکی تاریک کمرے میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ نصف شب کے وقت بھی کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ میں خود بھی ساری ساری رات بتی جلائے بیٹھی رہتی تھی اور رو رو کر فرحان کو پکارتی رہتی تھی۔ میں نے اپنی انگوٹھی کے ساتھ لوہے کی گرل کو دو تین دفعہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں ہو گئی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے اور جالی کی دوسری طرف کسی لڑکی کا ہیولا نظر آیا۔ میرے لئے یہی کافی تھا میں گھوم کر دروازے پر آئی اور کنڈی کھول کر اندر چلی گئی۔ کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا اور بلب کی روشنی میں ایک لڑکی نظر آرہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل و صورت سے بڑی معصوم لگتی تھی۔ اس کے چمکیلے بال بوائے کٹ تھے۔ اس نے ایک میلی سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پینٹ کو اب نیکر کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ وہ گھٹنوں سے نیچے نیچے سلامت نہیں رہی تھی۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ نواز حسنی صاحب کی چہیتی بیٹی ارسہ ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی شفاف آنکھوں میں ہراس نظر آیا۔ شاید میرے حلئے سے وہ مجھے کوئی بری عورت سمجھی تھی۔ ڈر کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور نرم لہجے میں کہا "گھبراؤ نہیں' ارسی میں دشمن نہیں

دوست ہوں۔"

میرے لہجے اور اپنے نام سے اس کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ وہ کان کی لو کو کھینچتے ہوئے بولی "کون ہو تم.......... اور یہاں کیوں آئی ہو؟"

میں نے کہا "تم آرام سے بیٹھو' میں سب کچھ بتاتی ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کرنے کے بعد اس کے پاس کرسی سنبھال لی۔ کبھی اس طرح میں اس مسہری پر بیٹھی تھی اور رحمت میرے لئے رہائی کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ رہائی میرے لئے عمر بھر کی قید بن جائے گی.......... میں نے دھیرے دھیرے اور محتاط لہجے میں ارسی کو صورت حال سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے یہاں سے نکالنے کے لئے آئی ہوں' اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے یہ بھی کہا کہ پولیس کے آدمی بھی میرے ساتھ موجود ہیں اور وہ سادہ لباس میں کوٹھی کے اندر پہنچ چکے ہیں۔ ارسی بار بار اپنے ڈیڈی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ کیسے ہیں؟ وہ بیمار تو نہیں؟ اس کی بے قراری دیدنی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مجھے اور پولیس کو اس کوٹھی میں بھیجنے والے صرف اور صرف اس کے پاپا ہیں۔ وہ بار بار اپنے پاپا کا ذکر کر کے سسکنے لگتی تھی۔ ایک بار تو اس نے روتے ہوئے میرے ہاتھ تھام لئے اور التجا کرنے لگی کہ میں جلد سے جلد اسے اس کے پاپا کے پاس لے جاؤں۔ یہاں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ مر جائے گی۔

میں نے کہا "ارسی! ذرا حوصلے سے کام لو۔ یہ سب کچھ اتنی جلد ممکن نہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی.........."

اسے چپ کرانے کے بعد میں نے اس سے یہاں کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے اسے ابھی تک کوئی تکلیف نہیں دی۔ صرف ایک بار اس نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی تو انکل نے اسے رات کو کھلے آسمان تلے سردی میں بٹھا دیا تھا۔ وہ ساری رات کپکپاتی رہی۔ صبح اسے شدید بخار ہو گیا۔ اس کی بیماری سے انکل پریشان ہو گئے اور انہوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔

میں نے پوچھا "یہ انکل کون ہے؟"

جواب میں ارسی نے بتایا "وہی جو اس کوٹھی کے مالک ہیں۔"

میں نے وہاب چنگیزی کا حلیہ بتایا تو ارسی نے تصدیق کی کہ ہاں یہی وہ شخص ہے جسے وہ انکل کہتی ہے۔ اسے ارسی کا بھولپن ہی کہا جاسکتا تھا کہ جو درندہ اسے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور جس نے اس کے پاپا کو ایک ناقابل بیان آزمائش میں ڈال رکھا تھا' اسے وہ انکل کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی ایک کلائی پر خراشوں کے نشان دیکھے تو پوچھا یہ کیا ہے؟"

خراشوں کو دیکھ کر وہ اچانک رنجیدہ ہوگئی۔ چہرہ بجھ سا گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے۔ میرے دل میں انجانے خدشے جاگ اٹھے۔ میں نے پوچھا۔

"ارسی سچ بتاؤ۔ کیا کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی مجھے اس کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ بچوں اور بعض نوجوانوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی مصیبت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی مصیبت جس میں ہتک' توہین' شرم یا خوف کا پہلو نکلتا ہو۔ میں نے خیال کیا کہ ارسی بھی کچھ چھپا رہی ہے۔ میرے بار بار پوچھنے پر وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے مجھے جو کچھ سمجھایا اس سے پتہ چلا کہ یوں تو وہ یہاں خیریت سے ہے لیکن "انکل" کا لڑکا موقع دیکھ کر اسے تنگ کرنے آجاتا ہے۔ میں حیرانی سے سوچنے لگی کہ یہ انکل کا لڑکا کون ہے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں شجاع کا خیال آیا۔ شاید وہ وہاب کے چھوٹے بھائی کو اس کا بیٹا سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنے دیور شجاع کا حلیہ بیان کیا تو ارسی نے اس حلیئے کی بھی تصدیق کی۔ ارسی نے بتایا کہ آج انکل کوٹھی میں نہیں تھے۔ شاید وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ شام کے بعد ان کا بیٹا کمرے میں آگیا اور بے ہودہ باتیں کرتا رہا۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شجاع کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوما اور پہلی بار مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اس باغ کا درخت تھا جس کی ہر شاخ کڑوا پھل دیتی تھی۔ زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ جب میں دلہن کے روپ میں بڑی حویلی پہنچی تھی اور رسم کے مطابق شجاع میرے گھٹنے پر بیٹھ کر مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے کتنی محبت سے اس کی روشن پیشانی چومی تھی۔ تب کیا معلوم تھا میں ایک ناگ زادے کو چوم رہی ہوں۔

میں کچھ دیر ارسی کے پاس بیٹھی اسے تسلی تشفی دیتی رہی۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ اب مصیبت ٹلنے والی ہے۔ میں کل کسی وقت پھر تمہارے پاس آؤں گی اور ہو سکتا ہے ہم کل ہی یہاں سے نکل چلیں۔"

وہ بولی "نہیں.......... میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔ آخر ان لوگوں نے کیوں قید کر رکھا ہے مجھے' میں نے یا میرے پاپا نے کسی کا کیا بگاڑا ہے.......... میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں' میں ایک پل یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں مرجاؤں گی۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی' نہیں خدا کے لئے' مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ اب مجھ سے یہ کمرہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں باہر نکل کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا اور کسی بچے کی طرح رونے لگی۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ ایسے سانس لے رہی تھی جیسے سچ مچ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے اپنے شب و روز یاد آگئے' جب میں اس کمرے سے نکلنے کے لئے اسی طرح تڑپا کرتی تھی۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور پیار سے کہا۔

"ارسی! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ خدا کی قسم نہیں جا رہی لیکن تھوڑا سا صبر اور کرو۔ ایک یا دو دن.........."

میری نصیحت بے اثر تھی۔ شاید اسے صبر کا یارا ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی "پلیز.......... ایک بار.......... مجھے پاپا کی صورت دکھادو۔ ایک بار مجھے ان کے پاس لے چلو وہ سب ٹھیک کرلیں گے۔"

میں اسے گلے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ پھر بمشکل اس سے اپنی اوڑھنی کا پلو چھڑایا اور اسے مسہری پر بٹھا کر اور تسلی تشفی دے کر باہر نکل آئی۔ راہداری تاریک تھی۔ ساتھ والے برآمدے سے کسی پہریدار کے قدموں کی مسلسل چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند کرکے بہ آہستگی کنڈی چڑھا دی۔ کنڈی چڑھاتے وقت مجھے "دھپ" کی ہلکی سی آواز آئی۔ آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کمرے کے اندر سے آئی ہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ ارسی کے گرنے کی آواز ہے۔ میں نے کنڈی دوبارہ کھولی اور دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر اندر جھانکا۔ دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ ارسی مسہری

سے فرش پر گری ہوئی تھی۔ جلدی سے اندر گھس کر میں نے دروازہ بند کیا اور ارسی کی طرف لپکی صدمے کے شدت سے وہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے بار بار اس کے گال تھپتھپائے اور سرگوشی میں پکار کر کہا "ارسی آنکھیں کھولو۔ ارسی ہوش کرو" اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور چہرہ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں بے تاب ہو کر اٹھی اور پانی لینے کے لئے باہر کی طرف لپکی چند لمحوں کے لئے میں بالکل فراموش کر چکی تھی کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے ہوں۔ نلکے پر جھک کر جب میں اوک میں پانی لے رہی تھی' ایک پہریدار نے مجھے دیکھ لیا۔ "کون؟" اس کی کرخت آواز اندھیرے میں گونجی۔ میں اس آواز کو نظرانداز کرتی ہوئی کمرے میں آئی اور ارسی کے چہرے پر چھینٹے دینے لگی۔

پہرے دار بھاگتا ہوا میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے رائفل کی نال سے مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

پھر اس کا دھیان بے ہوش ارسی کی طرف گیا "اسے کیا ہوا؟"

اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ میری نظر ایک گلاس پر پڑی۔ اس میں پانی موجود تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر یہ پانی ارسہ کے ادھ کھلے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کا ایک گھونٹ اس کے اندر گیا تو اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ میں اسے جھنجوڑنے لگی "ہوش کرو لڑکی.......... آنکھیں کھولو۔"

اس دوران دو تین اور پہرے دار بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ارسی نے آنکھیں کھولیں تو میری جان میں جان آئی.......... فرخندہ اور عبدل کی موت کے بعد مجھے ہر طرف موت ہی ناچتی محسوس ہو رہی تھی۔ ارسی کو غیر حالت میں دیکھ کر نہ جانے کیا کیا منحوس خیال آنے لگے تھے۔ ارسی کی خوابیدہ نگاہ مجھ پر پڑی۔ اور جم کر رہ گئی۔ اس نے ایک بار پھر میری اوڑھنی کا پلو تھام لیا اور غنودگی کے عالم میں پکارنے لگی۔ "مجھے چھوڑ کر نہ جانا.......... پلیز مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"

پہرے دار کڑی نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ اب ان میں میرا دیور شجاع بھی شامل ہو چکا تھا۔ میں نے اوڑھنی کو اپنے سر پر کچھ اور جھکا لیا۔ شجاع نے پہرے داروں سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

ایک پہرے دار نے ادب سے کہا "چھوٹے چودھری جی۔ اس نے رات روٹیاں لگائی تھیں۔ مختاراں نام ہے اس کا۔ کل مزدوروں کے ساتھ باغ میں آئی ہوئی تھی۔"

شجاع نے کڑک کر پوچھا "اس طرف کیوں آئی تھی مائی؟"

میں نے سر جھکائے جھکائے کہا "غلطی ہو گئی چودھری جی۔ پانی پینے اٹھی تھی۔ رونے کی آواج سن کر ادھر آ گئی۔"

شجاع گرجا "بکواس بند کر۔ رونے کی آواز پہرے دار کو کیوں نہیں آئی۔ سچ بتا کیوں آئی تھی ادھر؟"

رب نواز بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ بولا "میرا خیال ہے چوری شوری کی نیت بن گئی ہو گی اس کی.........."

ایک دوسرا پہریدار بولا "مجھے تو لگتا ہے.......... کوئی چکر ہے۔ یہ اندر گھس کر میم صاحب سے باتیں بھی کرتی رہی ہے۔"

شجاع نے آگے بڑھ کر میرے بال مٹھی میں جکڑنا چاہے مگر بال ہوتے تو جکڑے جاتے۔ اس نے ایک ٹھوکر میری کمر میں ماری اور چیخ کر بولا "کون ہے تو مائی' سچ سچ بتا ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔"

میرا سر اور بھی جھکتا جا رہا تھا۔ ہر لحظہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی پہچان لی جاؤں گی۔ دو تین مزید ٹھوکریں کھانے کے باوجود میں نے کچھ نہیں بتایا تو شجاع نے غضب ناک ہو کر ارسہ کے بال پکڑ لئے اور اس کے سر کو آگے پیچھے جھلاتا ہوا بولا "کیوں مکر کر رہی تھی۔ کون مر گیا تھا تیرا جو بے ہوش ہو گئی تھی' الو کی پٹھی۔ بتا مجھ کو' کون ہے یہ مائی۔ کیا کرنے آئی تھی تیرے پاس؟"

رب نواز نے کہا "چھوٹے چودھری! یہ سارا قصور اس میم صاحب کا ہے۔ نہ یہ روتی' نہ یہ مائی اس طرف آتی۔ میں نے خود اس کے رونے کی آواز سنی تھی۔"

شجاع نے دانت کچکچا کر ایک ٹھوکر ارسہ کو بھی ماردی۔ پھر پہرے دار پر برسنے لگا کہ وہ ارسہ کے رونے کی آواز کیوں نہ سن سکا۔ تب اس نے پہریداروں کو ہمارے بارے میں کوئی سخت ہدایت دی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ اس نے

ہم دونوں کو سخت سردی میں کھلے آسمان تلے باندھنے کا حکم دیا تھا۔ پہریدار ہمیں دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے اور اس چھوٹے سے احاطے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ باندھ دیا جہاں ایک طرف جنریٹر کی گھوں گھوں کان پھاڑ رہی تھی اور دوسری طرف کیاریاں تھیں جن میں بے پھول کے پودے لگے ہوئے تھے۔

رات بے انتہا سرد اور تاریک تھی۔ میرے جسم پر تو پھر بھی ایک موٹی اوڑھنی تھی، لیکن ارسہ کے جسم پر ایک ہلکی بشرٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس بشرٹ پر سامنے کی طرف "پاپا" کے بڑے بڑے الفاظ پرنٹ تھے۔ جس وقت ارسہ نے یہ بشرٹ خریدی ہوگی یا اس کے پاپا نے اسے لا کر دی ہوگی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ایک روز یہی بشرٹ پہن کر ایک جاگیردار کے حکم پر اسے سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات بسر کرنا ہوگی۔ اس وقت اس کا بدنصیب پاپا اس سے اتنی ہی دور ہوگا جتنا مشرق سے مغرب، سخت سردی میں طویل شب جیسے ایک مقام پر آکر رک گئی تھی۔ صبح کی منزل ہزارہا میل کے فاصلے پر محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد اندھیرے میں جب ہماری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں اور ہم نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کوئی اور بھی ہمارے ساتھ سردی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ یہ وہی پہریدار تھا جسے شجاع نے اس بات پر جھاڑا تھا کہ وہ ارسہ کے رونے کی آواز کیوں نہیں سن سکا۔ اسے دیکھ کر ہم دونوں کو اپنی تکلیف کم محسوس ہونے لگی۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ رسی کے ذریعے اسے جنریٹر کے جنگلے کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے دانت بجنے کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔ آج سے تین چار سال پہلے انسانی بے بسی کے یہ مناظر میرے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ یہ ظلم، یہ سزائیں اور یہ سارا ماحول بے حد افسانوی تھا۔ مگر اس جاگیر میں پہنچنے اور چنگیزیوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد اب کوئی انہونی میرے لئے انہونی نہیں رہی تھی۔

میں نے ارسہ کی طرف دیکھا وہ گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر کھلے آسمان کا منظر اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ حالانکہ یہاں اذیت ناک سردی تھی مگر یہ سردی ارسہ کو کمرے کی گھٹن کے مقابلے میں ہیچ محسوس ہو رہی تھی............
یکایک ایک خوفناک دھاڑ سے درودیوار لرز گئے۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل

گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ دھاڑ میرے پیچھے چند فٹ کے فاصلے سے آئی ہے۔ لیکن میں نے ارسہ اور پہریدار کی جانب دیکھا تو وہ اطمینان سے کھڑے تھے۔ اس دوران دوسری دھاڑ گونجی۔ اس دفعہ میں نے ہوش بحال کر کے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ آواز دس پندرہ گز کی دوری سے ایک اونچی دیوار کی دوسری جانب سے آرہی ہے۔ غالباً ارسہ اور پہریدار اکثر یہ آواز سنتے تھے لہٰذا ان پر میری طرح شدید خوف کا حملہ نہیں ہوا.........
اس کے بعد دو تین منٹ تک مسلسل یہ دھاڑیں سنائی دیتی رہیں۔ پوری کوٹھی گونج رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ یہاں کے مکین ہڑبڑا کر اٹھ کیوں نہیں بیٹھتے۔ کچھ دیر بعد درندہ خاموش ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی رات کے بے پناہ سناٹے کو درودیوار پر اپنی حکمرانی واپس مل گئی۔ ایک بار پھر وہی سکوت طاری ہوگیا جس میں کبھی گھنگھروؤں کی مدہم صدا کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ آواز یقیناً کوٹھی ہی کے کسی دور دراز حصے سے آ رہی تھی، جہاں شجاع اپنے بڑے بھائی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر تفریح طبع میں مصروف تھا۔ چنگیزیوں کی چھتوں تلے ایسی آوازوں کا آنا ایک بالکل عام سی بات تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اس رات کے اختتام پر میرے لئے کون سا روز محشر طلوع ہوگا۔ یقینی بات تھی کہ اب میں زیادہ دیر اپنا آپ چھپا نہیں سکوں گی۔ یہی غنیمت تھا کہ میں فوری طور پر شناخت ہونے سے بچ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ارسہ کے کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا اور یوں بھی شجاع اور اس کے کارندے پوری طرح ہوش میں نہیں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نے نشہ کر رکھا تھا۔ لیکن دن کے اجالے میں جب وہ لوگ غور سے میری طرف دیکھتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نہ پہچان سکتے اور خاص طور پر شجاع تو مزید دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔

دینو نے کامیابی سے مجھے ایک بڑھیا کا روپ دیا تھا لیکن یہ روپ زیادہ دیر میرا بھرم نہیں رکھ سکتا تھا، اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ رب نواز نے ایک ہی تیز نظر میں مجھے پہچان لیا تھا............ بہرحال کچھ بھی تھا امید کا دامن ابھی پوری طرح میرے ہاتھ سے چھوٹا نہیں تھا۔ کئی طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ شاید صبح بھی وہ لوگ مجھے نہ پہچان سکیں یا شاید صبح سے پہلے رب نواز کی طرف سے کوئی مدد مل جائے............ یا شاید............"

مگر ایک ایک کر کے سب امیدیں دم توڑ گئیں اور جو رہی سہی کسر تھی وہ اس

بارش نے پوری کر دی جس نے رات کے آخری پہر ایک گھنٹے تک ہمیں شرابور کیا۔ دینو نے میرے بالوں میں جتنی بھی سفیدی لگائی تھی اور میرے چہرے پر جتنی بھی سیاہی اور سریش ملی تھی سب بہہ گئی.......... نتیجہ یہ ہوا کہ علی الصبح جس پہلے شخص نے مجھے دیکھا وہی پہچان گیا کہ میں کوئی بہروپن ہوں۔ اور جب اس نے میرے چہرے پر غور کیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جاگیردارنی!" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی اور وہ الٹے قدموں واپس بھاگا۔

پلک جھپکنے میں یہ خبر ڈیرے کے طول و عرض میں پھیل گئی کہ پکڑی جانے والی عورت "چھوٹی جاگیردارنی" ہے۔ شجاع خود بھاگا بھاگا آیا اور آ کر میری شکل دیکھی۔ وہ پانچ چھ گز کی دوری پر کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ وہی نفرت جو اس خانوادے کے ہر فرد کی آنکھوں میں میرے لئے مخصوص تھی۔ دن چڑھے تک وہاب کے کارندے مجھے دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ میں ان کے لئے ایک تماشہ عبرت تھی۔ میری صورت دیکھ کر ان کی آنکھوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ میرے پاس آئینہ نہیں تھا مگر میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتی تھی کہ میری صورت اس وقت کیا منظر پیش کر رہی ہے۔ کٹے ہوئے بال' سریش' سیاہی اور سفیدی سب نے گڈمڈ ہو کر میرے چہرے پر عجیب نقشہ کھینچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا سب سے بڑا دشمن وہاب چنگیزی مجھے ایسی بے بسی کی حالت میں دیکھے لیکن میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے اب کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت وہاب چنگیزی شہر سے واپس لوٹ آیا۔ میری خبر پا کر وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔

اس کی صورت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ جب اس شیطان کو میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ایک کلین شیو یورپین ٹائپ شخص تھا جس نے اپنے فربہ جسم کو سرخ شرٹ اور جین میں کس رکھا تھا۔ مگر اب جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا وہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بادشاہی مسجد میں عید کی نماز پڑھ کر آیا ہے یا کسی نعتیہ مقابلے میں شرکت کے بعد لوٹا ہے۔ سفید کھڑکھڑاتی شلوار قمیض' اس پر سیاہ اچکن' نہایت شریفانہ حجامت اور جناح کیپ۔ میں اسے بمشکل پہچان سکی۔ اس کے لبوں کی مخصوص مسکراہٹ میرا سینہ چھلنی

کر گئی۔ وہ چند لمحے تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے چچ چچ کی آواز نکال کر میری حالت زار پر افسوس کرنے لگا۔ میرا دیور شجاع اور میری سسرال کے چند دوسرے افراد بھی وہاب کے عقب میں کھڑے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں میری لئے غضب کے شعلے تھے۔ اس قفس میں کوئی اپنا نہیں تھا' سب بیگانے تھے اور سب دشمن تھے۔ وہاب نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو باہر بھیج دیا۔ ایک لمبوترے نیم سرد کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میں رسیوں کے ذریعے ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہاب نے ٹہلنے والے انداز میں میرے چاروں طرف گھوم کر میرا جائزہ لیا پھر سگار سلگا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد اس کے ہونٹوں سے گونجدار آواز نکلی۔

"بھئی! بڑی ہوشیار نکلی ہو تم۔ اتنا تو ہم ساری زندگی نہیں بھاگے جتنا ان چند مہینوں میں تمہارے پیچھے بھاگے ہیں۔ کہاں کہاں سیریں کرتی رہی ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مسکرانے لگا "خیر ہم کون ہوتے ہیں تمہاری مصروفیات کے بارے میں پوچھنے والے۔ چودھری شہاب جانے اور تم جانو۔ لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ کوئی شادی وادی بھی کی ہے اس سے یا.........." فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ خباثت سے ہنسنے لگا۔ سگار کے دو طویل کش لے کر بولا "چند ہفتے پہلے پتہ چلا تھا کہ تم اپنی کسی سہیلی کے ساتھ لاہور "ہوم لائیک" ہوٹل دیکھی گئی ہو۔ میں نے سوچا چلو تمہارے درشن کر آئیں۔ مدت ہوگئی ہے صورت دیکھے ہوئے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم نے ابھی تک غصہ نہیں تھوکا اور جونہی میری آمد کا پتہ چلا تم لاہور سے سرپٹ جھنگ کی طرف بھاگو گی.......... اس بھاگ دوڑ میں وہ بے چارہ فرخندہ کا منگیتر یوں ہی ضائع ہو گیا۔ خیر ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بے وقوف لوگ مرتے ہی رہتے ہیں..........

"ارے ہاں یاد آیا.......... تمہارے اس دوسرے عاشق کا کیا بنا؟ وہ تو ایسا جیل سے بھاگا ہے کہ پھر خواب ہی ہو گیا۔ کیا نام تھا اس بھلے مانس کا.......... ہاں سلیم۔ کبھی اس کا بھی دیدار ہوا ہے یا نہیں؟"

میری آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے لیکن میرے منہ میں تھوک ضرور تھا' وہاب کے تمام سوالوں کے جواب میں میں نے یہ تھوک پوری نفرت سے اس کی طرف پھینک

دیا۔ اس نفرت کے کچھ چھینٹے اس کی جھولی اور کچھ منہ پر گرے۔ اس نے کمال اطمینان سے اچکن کی جیب سے سرخ رومال نکالا اور چہرے پر پھیر کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم میرے بھائی کی قاتل ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں اداکاروں کی طرح بھیس بدل کر کیوں آئی ہو۔ تمہارے دل میں میرے لئے بے پناہ ہمدردی ہے تم جانتی ہو کہ میں اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں تڑپتا ہوں۔ لہٰذا مجھے بھی اس کے پاس پہنچانا چاہتی ہو.......... لیکن میری ایک مجبوری ہے۔ میں جسے ایک دفعہ معاف کر دیتا ہوں اسے پھر کوئی سزا نہیں دیتا.......... اور میں تجھے معاف کر چکا ہوں۔ یہ معافی ہمیشہ کے لئے ہے۔ اب تم بڑے سے بڑا جرم بھی کر لو میرے نزدیک بے گناہ ہو.........."

سگار کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ کر وہ اٹھا اور کسی بالم نامی کارندے کو آوازیں دینے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک لمبا تڑنگا رائفل بردار اندر آگیا۔ یہ شخص بالکل گنجا تھا اور آنکھیں کسی شکرے سے مشابہ تھیں۔ اس نے حسب دستور رکوع کے بل جھک کر وہاب چنگیزی کو تعظیم پیش کی۔ وہاب چنگیزی نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "یہ معافی شدہ عورت ہے اسے کچھ نہیں کہنا لیکن اگر یہ اپنی مرضی سے اپنے شناسا سلیم کا پتہ بتا دے تو اس کی مہربانی ہے.......... اسے کھانا وانا کھلا کر دوپہر سے پہلے پہلے اس کی منزل تک پہنچا دو.........."

وہاب کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کہہ کچھ رہا ہے اور سمجھا کچھ اور رہا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اس شیطان کو اسی رمزیہ انداز میں باتیں کرتے سن چکی تھی۔ وہ کس "منزل" کی بات کر رہا تھا اس خوفناک ڈیرے سے تو کوئی راستہ کسی منزل کی طرف جاتا ہی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور مڑ کر اپنے کارندے سے بولا "ہاں.......... میں نے اس بدبخت شمشیر خان کو بھی معاف کر دیا ہے۔ اسے اب کچھ نہ کہنا" رائفل بردار زور زور سے سر ہلانے لگا۔ وہ وہاب سے بے حد مرعوب دکھائی دیتا تھا۔ مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا وہاب تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ وہ بہت مصروف اور جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص ٹرے میں میرے لئے ناشتہ لے کر آیا۔ بڑا بھرپور ناشتہ

تھا لیکن میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اسی دوران کھڑکی میں مجھے رب نواز کی جھلک نظر آئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ ہراساں اور مضطرب سا ہے۔ اب معلوم نہیں وہ واقعی پریشان تھا یا صرف مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ میں تنہا کمرے میں بیٹھی رہی۔ ناشتے کے لئے میرے ہاتھوں کی رسیاں کھولی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہیں دوبارہ باندھ دیا گیا۔ میرا دھیان رہ رہ کر ارسہ کی طرف جا رہا تھا۔ علی الصبح اسے مجھ سے دور کر دیا گیا تھا۔ اس بے چاری کی حالت بہت پتلی تھی۔ تاریک سرد رات اس پر قیامت بن کر گزری تھی۔ جب اسے درخت سے کھولا گیا تھا تو وہ لہرا کر زمین بوس ہو گئی تھی۔ دو ہٹی کٹی ملازمائیں اسے اٹھا کر اندر لے گئی تھیں..........

صبح سے دوپہر ہو گئی میں یونہی اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب بالم ایک دوسرے رائفل بردار کے ساتھ اندر داخل ہوا اور مجھے کرسی سے کھولنے کے بعد اٹھنے کا حکم دیا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری میں آگئے اور کوٹھی کے جنوبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ دونوں بہت چوکنے ہیں اور ایک لحظے کے لئے بھی نگاہ مجھ پر سے نہیں ہٹا رہے۔ وہ کوٹھی کی عقبی سمت میں آگئے۔ میں اس ڈیوڑھی کے سامنے سے گزری جس پر پرانی لکڑی کا ایک پھاٹک لگا ہوا تھا اور جس کے درمیانی خلا سے گزر کر میں اور فرحان یہاں سے فرار ہوئے تھے۔ اب اس پھاٹک کی جگہ لوہے کا ایک مضبوط دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ڈیوڑھی سے چند گز آگے ایک برآمدے میں پہنچ کر مجھے عجیب سی بو آئی۔ یہ بو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یکایک میں پہچان گئی کہ یہ کس چیز کی بو ہے اور اس کے ساتھ ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ مجھے چڑیا گھر کی سیر اور شیروں کے پنجرے یاد آگئے۔ جن کے گرد میں بچپن سے اب تک کئی بار گھوم چکی تھی.......... میرا سر چکرانے لگا.......... اور پھر میری نگاہ ایک ہال نما کمرے پر پڑی۔ اس کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اکھاڑ کر ان میں لوہے کی سلاخیں نصب کی گئی تھیں اور یہ کام حال ہی میں کیا گیا تھا کیونکہ سلاخوں کے اردگرد بے روغن پلستر نظر آ رہا تھا۔ بالم اور اس کا ساتھی اب مجھے بازوؤں سے تھام چکے تھے۔ وہ قریباً کھینچتے ہوئے مجھے اندر لائے۔ یہاں تین صوفے اور آٹھ دس کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیاں خالی تھیں۔ صوفوں پر چند افراد نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو تو وہاب کے کارندے تھے۔ باقی اجنبی

چہرے تھے۔ غالباً ان کا شمار وہاب کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار نظر آئے تاہم اس کے ساتھ ہی ایک ہراس آمیز سنسنی بھی فضا میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر میری نگاہ اس درندے پر پڑی رات میں نے جس کی لرزہ خیز آوازیں سنی تھیں۔ وہ ایک قوی ہیکل جانور تھا۔ پورے جسم پر دھاریاں سی تھیں۔ وہ بے قراری سے پنجرے میں ٹہل رہا تھا.......... زندگی میں تیسری مرتبہ میں نے کوئی درندہ چڑیا گھر سے باہر دیکھا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے ایک چیتا نما جانور دیکھا تھا۔ ہم سب گھر والے ایک تفریحی ٹور پر کرم ایجنسی کے علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک مقامی شخص نے وہ جانور ہلاک کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے گلدار کہتے ہیں اور یہ افغان علاقے کی طرف سے بھٹک کر ادھر آیا ہے۔ دوسری مرتبہ صرف چند ہفتے پہلے میں نے وہ خونخوار سور دیکھا تھا جسے خان رحیمی اور اس کے ساتھی گھڑسواروں نے نیزوں سے ہلاک کیا تھا.......... اور آج میں اس پنجرہ بند درندے کو دیکھ رہی تھی.......... خدا کی پناہ.......... میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی کہ چڑیا گھر کے شیر کو دیکھنے اور اس شیر کو دیکھنے میں کیا فرق تھا۔ میرے جسم کا ہر مسام پسینہ اگل رہا تھا اور ذہن میں خوفناک اندیشوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یکایک کہیں قریب ہی کوئی دروازہ دھماکے سے کھلا اور لرزہ خیز چیخ وپکار نے میرا دل دہلا دیا۔ یہ انسانی چیخ وپکار تھی۔ چند افراد کسی شخص کو گھسیٹتے ہوئے ہماری طرف لا رہے تھے۔ پھر میں نے چیخنے والے شخص کو دیکھا۔ رگوں میں خون جم کر رہ گیا.......... وہ شمشیر خان تھا۔ وہی پہریدار جسے رات ہمارے ساتھ ہی کھلے آسمان تلے باندھا گیا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص کسی بچے کی طرح بلک رہا تھا اور مسلح محافظوں کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر وہی رات والا لنگوٹ تھا اور ہاتھ پاؤں اور ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے۔ (ممکن ہے اس نیلاہٹ کا ایک سبب خوف اور دہشت کی زیادتی بھی ہو) وہ حلق کی پوری قوت سے چلا رہا تھا۔

"جاگیردار جی! مجھے معاف کردو۔ آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ۔ اپنے ماں باپ کا واسطہ۔ خدا کے لئے' مجھے نہ مارو.......... میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ جاگیردار جی.......... جاگیردار جی" لیکن جاگیردار وہاں ہوتا تو سنتا۔ وہ تو غالباً کوٹھی ہی میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا.......... میں اپنی ماں کے آخری دیدار کے لئے سارا

دن روتی اور بلکتی رہی تھی مگر واصف چنگیزی حویلی میں ہوتے ہوئے بھی انجان بنا رہا تھا۔

یہ مردہ سماعتوں والے پتھر کے انسان تھے۔ مظلوموں کی چیخوں سے پتھر شق ہوتے ہوں تو ہوتے ہوں لیکن اس جاگیر کے حاکموں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میرا دیوار شجاع بھی اب تماشائیوں کی صف میں اپنی نشست سنبھال چکا ہے اور دلچسپی سے پہریدار کی جدوجہد کا منظر دیکھ رہا ہے۔ شجاع کو دیکھ کر مظلوم شخص کا رونا پیٹنا انتہا کو چھو گیا۔ وہ شجاع کے قدموں میں سر رکھ کر رحم کی بھیک مانگنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ مگر اسے دبوچنے والے ڈشکرے اسے یہ موقع دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ بے بس ہو کر وہ دور ہی سے "چھوٹے چودھری" کے نام کی دہائی دینے لگا۔ مگر چھوٹا چودھری سیاہ شیشوں کی عینک لگائے بے حرکت بیٹھا تھا۔ وہ "معافی شدہ" کو بھلا کیا معاف کرتا۔ چودھری وہاب کے زہریلے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ان الفاظ کی روشنی میں مجھے اپنا انجام بھی اب صاف نظر آرہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاب کے مسلح کارندے پہریدار شمشیر خان کو گھسیٹتے اور دھکیلتے ہوئے ایک آہنی جنگلے کے سامنے لے گئے۔ پھر بالم نے چابیاں نکال کر دروازہ کھولا اور پہریدار کو اندر دھکیل دیا۔ میں اسے زندگی سے موت کی طرف دھکیلے جانے کا منظر پتھرائی نظروں سے دیکھتی رہی۔ آخر دروازہ پرشور آواز سے بند ہوگیا۔ بدنصیب شخص آنکھیں بند کر کے جنگلے سے چمٹ گیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے لگا۔ میں نے دیکھا دھاری دار شیر کی دھاری دار دم تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ اس کے بعد کچھ بھی دیکھنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔

کئی منٹ تک میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور میں اپنے کان بھی بند کرسکتی۔ وہ آوازیں میرے کانوں سے نہ ٹکراتیں جو ہمیشہ کے لئے میری راتوں کا ڈراؤنا خواب بن چکی ہیں۔ یہ مختلف آوازیں تھیں۔ چیخ وپکار کی جدوجہد کی' غراہٹوں کی' ہنسنے کی اور کراہنے کی۔ ان آوازوں میں بار بار ایک دوسری منحوس آواز شامل ہو جاتی تھی۔ یہ آواز وہاب کے کسی غیرملکی دوست کی تھی۔ تماشائیوں کی صف میں بیٹھا ہوا یہ درندہ صورت انسان شراب کے نشے میں چور تھا اور جھوم جھوم کر انگریزی میں بھونک رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی تھائی باشندہ ہے اور جو شیر سامنے

پنجرے میں ایک مردہ انسان کو بھنبھوڑ رہا ہے اس کا سابقہ مالک یہی شخص ہے۔ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے تماشائی کو فخر سے بتا رہا تھا کہ یہ رائل بنگال ٹائیگر ہے۔ اسے وہ تھائی لینڈ کے دشوار گزار جنگل سے پکڑ کر لایا تھا۔ اگر خریدنے والا وہاب چنگیزی نہ ہوتا تو وہ اس "خوبصورت بلی" کے کم از کم بیس ہزار ڈالر کھرے کرتا۔

تھائی مالک تعریفیں کرتا جا رہا تھا اور "خوبصورت بلی" اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔

آخر یہ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے تھامنے والے آہنی ہاتھ مجھے آگے کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ میرے اندر سے کوئی دلدوز آواز میں پکار کر بولا "اب تیری باری ہے ثناء اپنے گوشت کو، اپنی ٹانگوں کو اور اپنے بازوؤں کو تیز نوکیلے دانتوں اور بے رحم پنجوں کے لئے تیار کرلو" میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری دھندلائی ہوئی نظر سامنے اٹھی اور آہنی سلاخوں سے گزر کر پنجرے کے اندر چلی گئی۔ اندر کا منظر ہولناک تھا۔ مگر مجھے بالکل نہیں لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور نہ ہی چیخی چلائی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا پنجرے میں دو ٹوٹے ہوئے بازو تھے۔ خون اور مٹی میں لتھڑا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا تھا.......... بہت بڑا اور ناقابل شناخت۔ ایک کپڑے کی دھجیاں تھیں۔ جسم کے کسی حصے کی تھوڑی سی کھال تھی۔ کچھ بھی تو غیر معمولی نہیں تھا یہاں۔ اس سے زیادہ کچھ تو ابھی میرے ساتھ ہونے والا تھا.......... آہنی ہاتھوں نے مجھے کھینچنا شروع کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے مزاحمت شروع کر دی۔ میں ہاتھوں کی گرفت میں مچلنے لگی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں بھی پہریدار کی طرح رونے اور منتیں سماجتیں نہ کرنے لگوں۔ میں نے اپنے ہونٹ بے انتہا مضبوطی سے بند کرلئے مگر اپنی ٹانگوں کو پھر بھی مزاحمت سے باز نہ رکھ سکی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں اس اذیت ناک موت سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے خوف کھاتے دیکھ کر بالم نے میرے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو مٹھی میں لے کر میرا چہرہ اٹھایا اور قدیم دور کے کسی جلاد کی طرح بولا "اگر اس سزا سے بچنا چاہتی ہے تو ایک ہی صورت ہے۔ اپنے اس عاشق کا پتہ بتا دے جو جیل سے بھاگا ہے.........."

مجھے اس جلاد کی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ وہ مجھ سے ایک ایسے انعام کا وعدہ کر رہا تھا جو اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ وہ زبان کھولنے کے بدلے مجھ سے زندگی کا وعدہ کر رہا تھا

مگر میری موت کے پروانے پر وہاب چنگیزی نے صبح ہی دستخط کر دیئے تھے۔ وہاب کے یہ الفاظ "دستخط" سے کم نہیں تھے کہ "اس معاف کی ہوئی عورت کو دوپہر سے پہلے منزل تک پہنچا دینا" اب میں زبان کھولتی یا نہ کھولتی، روتی بلکتی یا چپ رہتی مجھے "منزل" پر تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے لئے کوئی رعایت نہیں تھی تو میں کسی کو کوئی رعایت کیوں دیتی۔ میں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند رکھے۔ میری آنکھوں کے سامنے رنگین دائرے سے بن رہے تھے، میرے کانوں میں بار بار بالم کی منحوس آواز گونج رہی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ بکوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بولو.......... بولو.......... بتاؤ.......... بتاؤ" الفاظ کے ہتھوڑے تواتر سے میری سماعت پر برسنے لگے۔ معلوم نہیں یہ صورت حال کتنی دیر برقرار رہی۔ شاید چند سیکنڈ.......... چند منٹ.......... یا شاید آدھ گھنٹہ۔ آخر میرے کانوں میں شجاع کی کرخت آواز گونجی۔ مجھے الفاظ کی سمجھ نہیں آئی لیکن لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری موت کے لئے "سفید رومال" لہرا رہا ہے۔ دو بے رحم ہاتھ آہنی دروازے کی طرف بڑھے اور قفل کھولنے لگے۔ ایک ساعت کے لیے سیاہ سفید دھاریوں والا زرد بے قرار جسم میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ درندے کی بو میں نے اپنے نتھنوں کے قریب محسوس کی۔ بے رحم ہاتھوں نے قفل کھول دیا اور کنڈی ہٹانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب آہنی ہاتھوں میں بل کھاتے ہوئے نہ جانے کس طرح میرا دایاں بازو آزاد ہوگیا۔ میرا ہاتھ اس تیز دھار استرے تک پہنچا جو پرسوں سے میرے لباس میں چھپا ہوا تھا۔ میری انگلیاں استرے کے دستے سے ٹکرائیں اور میں نے اسے مضبوطی سے تھام کر ایک جھٹکے سے باہر نکال لیا.......... پہلا وار میں نے لمبے تڑنگے بالم پر کیا۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں میں نے اس کی ایک تہائی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ خون اچھل کر میرے کندھے پر گرا۔ دوسرا شخص میرے سامنے تھا۔ اس کا آگے کو بڑھا ہوا پیٹ مجھے استرے کا بہترین ہدف نظر آیا۔ حتی الامکان تیزی سے میں نے اپنے آلے کو افقی سمت میں حرکت دی۔ استرا صاف طور پر نرم گوشت میں دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے محافظوں کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھیں وہ مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ رہے تھے اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہیں.......... میں نے کم از کم تین افراد کو نشانہ بنایا اور خود کو چھڑا کر عقبی ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ جوتی اسی وقت میرے پاؤں سے نکل گئی تھی جب وہاب کے کارندوں نے مجھے پنجرے کی طرف

کھینچنا شروع کیا تھا۔ اب میں ننگے پاؤں تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا' میں کیوں بھاگ رہی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں۔ دل میں صرف ایک ہی آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے اس شیطان کو ہلاک کر لوں جس کا نام وہاب ہے اور جس کی منحوس مسکراہٹ میرے سینے کا سب سے بڑا داغ ہے۔ لیکن وہ یہاں کہاں تھا۔ میں ڈیوڑھی کے بند پھاٹک تک پہنچی اور وہاں سے لوٹ کر سیڑھیوں کی طرف آئی۔ سیڑھیوں پر ایک شخص نے پہلو سے جھپٹ کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے بے دریغ استرا گھمایا وہ کندھے پر زخم کھا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دوسرے ہراساں شخص کے بازو سے نکل کر میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میرے چھت پر پہنچنے سے پہلے ہی چند افراد ایک دوسری سیڑھی کے ذریعے اوپر پہنچ چکے تھے۔ جونہی میں نے چھت پر قدم رکھا ایک پگڑی والے شخص نے لاٹھی کا وار میری بائیں کلائی پر کیا۔ استرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پختہ صحن میں جا گرا۔ اس وقت رب نواز عقب سے آیا اور اس نے پھرتی سے مجھے دبوچ لیا۔ اگر وہ نہ بھی دبوچتا تو پانچ چھ اور افراد یہ کام کرنے کے لئے موجود تھے۔ بالم نے آگے بڑھ کر مجھ پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ وہ مجھے سیڑھیوں پر گھسیٹتے ہوئے پھر صحن میں لے آئے۔ ایک شخص نے اڑنگا لگا کر مجھے بے رحمی سے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا اور دوسرا کسی رسی یا ڈوری کے ذریعے میرے ہاتھ پشت پر باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے یہ لوگ مجھے مسلسل گالیاں بھی دے رہے تھے۔ اتنے میں ہال کمرے کے اندر سے شیر کی چیخی چنگاڑتی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جیسے میرے جسم میں دانت آزمانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ان حشر خیز گھڑیوں میں مجھے بچپن کی ایک بات یاد آ گئی۔ بچپن میں میں جب ابو جان اور بھائیوں کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے جاتی تھی تو شیر کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ ڈر اس وقت اور بڑھ جایا کرتا تھا جب ابو بتایا کرتے تھے کہ ایک گندی لڑکی کو جو ماں باپ کا کہنا نہیں مانتی تھی شیر کے آگے ڈال دیا گیا تھا........ ابو کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن ان کی لاڈلی بیٹی کو بھی شیر کے آگے ڈال دیا جائے گا۔ حالانکہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا' کسی جرم کی مرتکب نہیں ہوئی ہوگی.........

میرا چہرہ زمین پر تھا اور ہاتھ کھردری رسی سے الجھ رہے تھے۔ اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی میری نگاہ عقبی ڈیوڑھی کی طرف تھی۔ میں نے دیکھا ڈیوڑھی کا پھاٹک ایک دفعہ زور

سے ہلا اور اس کے اردگرد گرد و غبار سا پھیل گیا۔ صاف طور پر محسوس ہوا کہ پھاٹک کو باہر کی طرف سے زوردار ضرب لگائی گئی ہے۔ میرے اردگرد موجود افراد بھی چونک کر پھاٹک کی طرف دیکھنے لگے۔ تب ایک بار پھر تصادم کی زوردار آواز آئی اور میں نے بے پناہ حیرت سے دیکھا کہ لوہے کا موٹا ارل اکھڑ کر دور جا گرا اور پھاٹک کھل گیا۔ ایک بس جس پر سیالکوٹ تا جھنگ براستہ لاہور لکھا ہوا تھا دندناتی ہوئی اندر گھس آئی۔ ایک لحظے کے لئے میری نگاہ بس کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف اٹھی اور میں وہاں اختر زماں عرف چیف کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا وہ سلیم تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں انگاروں کی مانند روشن تھیں۔ میں نے رب نواز' بالم اور شجاع کو اپنی رائفلیں کندھوں سے اتارتے دیکھا پھر یکایک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے بالکل سامنے تین گز کے فاصلے پر ایک شخص گولی کھا کر گرا اور چیخنے لگا۔ میں اس کے پاس سے گزری اور جھک کر بھاگتی ہوئی اندرونی کمروں کی طرف گئی۔ شیر ابھی تک بول رہا تھا اور اس کی آواز فائرنگ کی آواز میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ میں سیدھی اس کمرے کے سامنے آئی جہاں رات ارسہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب کمرے کے دروازے پر ایک بڑا قفل نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا شاید ارسہ اب یہاں موجود نہیں مگر دوسرے ہی لمحے اپنے خیال کو رد کر دیا۔

کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں نے زور سے آواز دی "ارسہ" وہ بھاگ کر آئی اور پٹ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ فائرنگ اور چیخ و پکار کی آوازوں نے اس کی آنکھوں میں خوف بھر رکھا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کروں۔ کھڑکی میں آہنی گرل تھی اور دروازے پر مضبوط تالہ۔ ہر ہر لحہ قیمتی تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا اگلے ایک دو منٹ میں یہاں کیا ہو جائے۔ اچانک کسی نے برآمدے کے ایک تاریک گوشے سے میری طرف ایک ریوالور اچھال دیا۔ یہ ریوالور فرش پر گھسٹتا ہوا میرے پاؤں سے کچھ دور رک گیا۔ میں نے بری طرح چونک کر تاریک گوشے کی طرف دیکھا۔ ایک سیاہ سایہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ دو یا تین سیکنڈ تک میں تذبذب میں ریوالور کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ریوالور اٹھایا اور تالے کی طرف آ گئی۔ فلموں میں بہت دفعہ اداکاروں کو ریوالور وغیرہ سے تالے توڑتے دیکھا تھا مگر خود یہ کام کرنا پڑا تو اندازہ ہوا کہ کتنا مشکل ہے۔ میں نے ایک فٹ کی

دوری سے نشانہ لے کر چار راؤنڈ فائر کیئے۔ تب کہیں دو گولیاں تالے کو لگیں اور اس نے دروازے کی جان چھوڑی۔ میں دروازہ کھول کر اندر گئی۔ ارسہ خوف اور دہشت کی فراوانی میں اوندھے منہ بستر پر گری ہوئی تھی اور سر تکیئے کے نیچے گھسیڑ رکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے دردناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے بازو کھینچ کھینچ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھی.......... بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور ایک لمبا تڑنگا جسم دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا.......... وہ شجاع تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی اور اس کا سینہ سانس کے زیروبم سے پھول پچک رہا تھا۔

"ہٹ جاؤ شجاع" میں نے پھنکار کر کہا۔ میرا لہجا اتنا فیصلہ کن تھا کہ میں خود حیران رہ گئی۔ شجاع نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور کوئی تندوتیز جملہ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ اس کے کھلے ہونٹوں کی آواز سننے سے پہلے ہی میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے "مستقبل کے اس وہاب" کو روند کر آگے بڑھ جانا تھا۔ ابھی اس کے ہونٹوں سے صرف "تم" کا لفظ نکلا تھا کہ اوڑھنی کے نیچے سے میں نے پورے زور کے ساتھ لبلبی دبائی اور 32 بور ریوالور کی دو گولیاں یکے بعد دیگرے شجاع کے سر اور چہرے میں پیوست ہو گئیں۔ اس کی چیخ خوفناک دھماکوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ فرش پر گرا۔ میں ارسہ کے ساتھ اسے پھلانگتی ہوئی برآمدے میں پہنچی اور دیواروں کے ساتھ ساتھ صحن کی طرف بڑھنے لگی۔ صحن میں میں نے جو سب سے پہلا منظر دیکھا وہ دست بدست لڑائی کا تھا۔ سلیم' وہاب کے تین کارندوں سے دست وگریباں تھا۔ اس کی خوفناک ٹکر کھا کر میں نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو رائفل سمیت اچھل کر دور گرتے دیکھا۔

تب میری نگاہ اختر زماں پر پڑی۔ اختر زماں کے علاوہ اس کے دس پندرہ ساتھی بھی بس میں یہاں پہنچے تھے' وہ سب وہاب کے کارندوں سے بھڑے ہوئے تھے۔ کچھ بس کے اندر ہی مورچہ زن ہو کر فائرنگ کر رہے تھے۔ چھوٹے فائر کے علاوہ سیون ایم ایم کی تڑ تڑ بھی بار بار سنائی دے رہی تھی۔ وہاب کے کارندے دائیں جانب سے گولیاں چلا رہے تھے۔ میں نے ارسہ کو بائیں جانب لیا اور ستونوں کی آڑ لیتی ہوئی بس کی طرف بھاگی۔ کچھ معلوم نہیں ہم دونوں گولیوں کی بارش میں کس طرح بس تک پہنچ پائیں۔ جونہی ہم بس میں داخل ہوئیں اختر زماں کا دست راست کبوترا خان نظر آیا۔ اس نے دھکا دے کر ہمیں

فرش پر گرا دیا۔ بس کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ سیٹوں اور فرش پر گولیوں کے خول اور شیشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہم اس طرح اوندھے منہ بس کے فرش سے چپکی رہیں۔ بس کا انجن سٹارٹ تھا۔ اور گھر گھر کی آواز پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ بس حرکت میں آئی۔ ایک شارٹ ٹرن لیا اور تیزی سے عقبی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ کوٹھی کی چھت اور برآمدوں سے مسلسل فائر ہو رہا تھا۔ بس کوٹھی سے نکلی اونچے نیچے راستوں پر فٹ فٹ بھر اچھلتی نیم پختہ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ کچھ آگے جا کر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اختر زماں کی جگہ سلیم تھا۔ اس کی قمیض پر پشت کی جانب خون کے دھبے تھے۔ میں اور ارسہ اٹھ بیٹھیں۔ اختر زماں کے تمام ساتھی بھی اب نشستیں سنبھال چکے تھے۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے غنڈے اور جنگجو قسم کے لوگ تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ اختر زماں خود بھی تو مانا ہوا گینگسٹر تھا.......... لیکن وہ کہاں تھا؟ میں نے بس میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یکایک ارسہ چیخ اٹھی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ اختر زمان ایک اگلی نشست پر لہولہان پڑا تھا۔ ہم بھاگ کر اس تک پہنچیں۔ ایک گولی اس کی گردن کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی اور دوسری بائیں پسلیوں کے نیچے کہیں گھسی ہوئی تھی۔ اسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ ارسہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے اپنا خون آلود ہاتھ ارسہ کی طرف بڑھایا۔ ارسہ اس ہاتھ کو رخسار کے ساتھ لگا کر بیٹھ گئی اور سسکنے لگی۔

"بھائی جان! یہ کیا ہو گیا.......... بھائی جان.......... بھائی جان!؟"

پھر وہ سلیم کی طرف منہ کر کے چیخنے لگی "جلدی کرو ہسپتال کی طرف موڑو میرا بھائی زخمی ہے۔ جلدی کرو۔"

میں نے آگے بڑھ کر اختر زمان کا خون آلود سر زانو پر رکھ لیا۔ سر اونچا ہونے سے اسے سانس لینے میں کچھ آسانی ہو گئی۔ پھر بھی ہر سانس کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل جاتی تھی۔ غالباً گولی کہیں پھیپھڑے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بس کو لگنے والے شدید جھٹکے اس کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ وقت کی ضرورت یہ تھی کہ بس فوراً روک دی جائے لیکن ایسا کرنا سب کی موت کو دعوت دینا تھا۔ کم از کم دو لینڈ

رادور جیپیں آندھی کی رفتار سے بس کے پیچھے اڑی آرہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ گرد آلود راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں بھاگنے لگتیں تو ان میں بیٹھے ہوئے مسلح سوار بھی صاف نظر آجاتے۔ وہ گاہے گاہے بس پر فائر بھی کر رہے تھے۔ ان کی فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس کے ٹائروں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ میں نے ایک طائرانہ نظر بس میں ڈالی۔ جگہ جگہ نشستوں کے نیچے مسافروں کا سامان' صندوق' ٹوکریاں' گٹھڑیاں جوتے وغیرہ پڑے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کارروائی کے لئے اخترزمان وغیرہ نے یہ بس کہیں سے چھینی تھی۔ دفعتاً ایک دھماکے کے ساتھ بس اپنے بائیں پہلو پر لڑکھڑانے لگی۔ سب کا دل اچھل کر رہ گیا۔ تعاقب کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ ٹائر برسٹ ہونے کے بعد سلیم نے بس کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچے راستے سے اتر کر کیکر اور شیشم کے درختوں میں جاگھسی اور چند ناتواں درختوں کو توڑنے کے بعد رک گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیپیں سر پر پہنچ گئیں۔ بس رکنے کے بعد ان کی تعداد کا صحیح اندازہ ہوا۔ جیپوں سمیت وہ چار گاڑیاں تھیں۔ ان کے عقب میں قریباً دو فرلانگ کی دوری پر جاگیردار کے رنگ دار پگڑیوں والے گھڑسوار بھی سرپٹ بھاگے چلے آرہے تھے۔ اس جاگیر سے ارسہ کو لے کر اور چھوٹے جاگیردار کو مار کر نکل جانا آدم خور شیر کی کچھار سے زندہ لوٹنے کے مترادف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وقت نے ہمارے خلاف فیصلہ دیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ ابھی چند منٹ تک اس بس میں ہمارے چھلنی جسموں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ میں نے سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ لڑنے مرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا ہے۔ کبوتر خان کے حکم پر اخترزمان کے آٹھ ساتھیوں نے بس کی کھڑکیوں میں مورچے سنبھال لئے........ مگر پھر اس سے پہلے کی میدان جنگ گرم ہوتا' ایک انوکھا واقعہ ہو گیا۔ ایسے ہی واقعات کے لئے کرشمہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم پر فائر کھولنے کی بجائے جاگیردار کی رنگ برنگ گاڑیوں نے رخ بدلے اور واپس روانہ ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی رنگ دار پگڑیوں کی وہ طویل قطار جو کھیتوں کے راستے تیزی سے قریب آرہی تھی رک گئی۔ پھر اس گھڑسوار قطار کا رخ بھی ہماری بجائے ڈیرے کی طرف ہو گیا........ یہی وہ وقت تھا جب میری نگاہ دور نیم پختہ راستے پر پڑی۔ یہ راستہ کچے راستے کے ساتھ زاویہ قائمہ بنا رہا تھا۔ مجھے اس راستے پر

کئی سرخ اور نیلی گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں ایک ٹرک بھی تھا۔ یہ سب پولیس کی گاڑیاں تھیں........ یقینی بات تھی کہ وہاب کے خونخوار کتے پولیس کی جھلک دیکھ کر ہی واپس لوٹے ہیں۔ اس علاقے میں اتنی زیادہ نفری میں پولیس کی آمد کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ بڑی حویلی کی طرف آرہی ہے۔ میں نے آگے جا کر سلیم کو ان گاڑیوں کی طرف متوجہ کیا۔ پولیس کی آمد کا سن کر ارسہ اور اخترزمان کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ اخترزمان کے باقی ساتھی بھی مطمئن بیٹھے تھے۔ غالباً ان میں سے کوئی بھی ہماری طرح مفرور مجرم نہیں تھا' سلیم اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بس سے اترنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھے۔

ارسہ اپنی بڑی بڑی حیرت بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں قریب سے گزرنے لگی تو وہ کھڑی ہو گئی۔ گھبرا کر بولی "کہاں جا رہے ہیں آپ۔ اب تو پولیس پہنچ گئی ہے۔ میرے پاپا بھی ساتھ ہوں گے۔ وہ خود ہی سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

میں نے ارسہ کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹایا اور کہا "ہمارا جانا ضروری ہے۔ تم بے فکر رہو' ہم اپنی حفاظت خود کر لیں گے۔"

زخمی اخترزمان نے بہن کا ہاتھ کھینچا' جیسے اسے سمجھا رہا ہو کہ وہ ہمارا راستہ نہ روکے۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ شاید وہ میرا اور سلیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے اس کی بہن کی بازیابی کے لئے جان کو خطرے میں ڈالا۔ اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں والا یہ اخترزمان اس اخترزمان سے کتنا مختلف تھا جس نے بند جیپ میں صغراں کی عزت تار تار کرنے کی دھمکیاں دی تھیں اور یوسف کو جلتے سگریٹوں سے داغا تھا۔ آج اپنی بہن کی عزت کی خاطر اس کے زخموں سے خون بہا تھا تو اس کے چہرے کی منحوس سرخی ایک دلگداز زردی میں ڈھل گئی تھی۔ میں نے سوچا شاید آج کا دن اخترزمان عرف چیف کی موت کا دن ہے........ مگر آج کا دن اس کے اندر کے انسان کی "زندگی" کا دن بھی تھا۔ میں نے اس کے دم بدم زرد پڑتے چہرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ارسہ کا کندھا تھپتھپایا اور سلیم کے ساتھ تیزی سے نیچے اتر گئی۔

پولیس کی دھواں اڑاتی گاڑیاں اب ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلہ پر تھیں' میں

اور سلیم جنتر کی جھاڑیوں میں گھسے اور حتی الامکان رفتار سے مخالف سمت میں بڑھنے لگے۔

میرے ہاتھ پاؤں ابھی تک لرز رہے تھے اور شہادت کی وہ انگلی ابھی تک سنسنا رہی تھی' جس سے ریوالور کا گھوڑا دبا کر میں نے پہلے کمرے کا تالہ توڑا تھا اور پھر شجاع کو شوٹ کیا تھا۔ شجاع کے لڑکھڑا کر گرنے کا منظر ابھی تک میری آنکھوں میں رقصاں تھا.......... اور وہ سارے خون اگلتے جسم رقصاں تھے جو میں نے کوٹھی کے احاطے میں بس کے اردگرد دیکھے تھے۔ یہ خون کی ہولی تھی۔ جب انصاف کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور بااثر لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھنے لگیں تو پھر ایسے خونی واقعات کا راستہ کون روک سکتا ہے؟ کوئی نہیں روک سکتا.......... اور نہ روز ازل سے کوئی روک سکا ہے۔

ہم حد نگاہ تک پھیلی ہوئی جنتر کی جھاڑیوں میں بھاگنے لگے۔ میرے پاؤں ننگے تھے۔ تلوؤں میں کنکر اور کانٹے چبھ رہے تھے لیکن ان کا درد نہ ہونے کے برابر تھا۔ گمان ہو رہا تھا جیسے رائل بنگال ٹائیگر ابھی تک ہمارے تعاقب میں ہے۔ وہ ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے نکلے گا۔ اپنے آٹھ فٹ لمبے جسم کو کھول کر بھرپور جست لگائے گا اور ہمیں اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ ڈالے گا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا جس سے میں نے شجاع کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مجھے اس کی موجودگی کا قطعاً" احساس نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کون تھا جس نے بروقت میری ضرورت کو محسوس کر کے میری مدد کی' دھیان سیدھا رب نواز کی طرف گیا۔ اگر واقعی کسی نے میری مدد کی تھی تو وہ رب نواز کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟

دفعتاً" سلیم بھاگتے بھاگتے اوندھے منہ گرا۔ میں نے اس کے کندھوں کی طرف دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ ایک عجیب وضع کا جسم اس کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔

پہلے تو میں اسے سفید رنگ کا کتا سمجھی مگر غور سے دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ ایک جنگلی بلا تھا۔ وہ ہمارے راستے میں کہیں درخت پر بیٹھا تھا۔ اوپر سے چھلانگ لگا کر سیدھا سلیم کے کندھوں پر آیا تھا۔ میں نے ایک یا دو سیکنڈ کیلئے سلیم اور جنگلی بلے کو گتھم گتھا دیکھا پھر بلے نے سلیم کو چھوڑا اور تیر کی طرح گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔ اس علاقے میں اس طرح کے جسیم بلے عام پائے جاتے تھے۔ جنگلی جانور کے بھاگ جانے کے

بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے ریوالور میں گولی موجود نہیں تھی ورنہ ممکن تھا میں بدحواسی میں فائر ہی کر دیتی۔ یہ فائر سلیم اور حملہ آور جانور میں سے کسی کو لگ سکتا تھا۔

میں دوڑ کر سلیم کے پاس پہنچی۔ وہ نیم سرخ مٹی میں بری طرح لتھڑا پڑا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے جھاڑے اس کے ہاتھوں اور گردن پر معمولی خراشیں آئی تھیں ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بھاگنے لگے۔ کبھی تھک جاتے تو تیز تیز چلنے لگتے ڈیڑھ دو فرلانگ آگے جانے کے بعد میری اوڑھنی گھنی جھاڑیوں میں اٹک کر رہ گئی۔

اب میں ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ سلیم نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے کندھے سے ایک بارہ بور رائفل بمعہ گولیوں والی پٹی کے جھول رہی تھی۔ ہم جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ ہمیں اس وقت پولیس ہی سے نہیں وہاب کے کارندوں سے بھی خطرہ تھا۔ چھوٹے چوہدری شجاع کی موت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں چنگیزی زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ خاص طور پر میری تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی اور ان کی کوشش ہو گی کہ میں جاگیر کی حدود پھلانگنے سے پہلے پہلے ان کے ہتھے چڑھ جاؤں۔

ایک جگہ میں اور سلیم ہانپ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ یہ سہ پہر دو بجے کا وقت تھا۔ کل رات کی بارش کے بعد تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پھول پتے دھلے ہوئے اور نکھرے نکھرے تھے۔ مگر اس نکھار اور اس سہانے موسم پر توجہ دینے کی فرصت کسے تھی۔ یہ سب کچھ تو امن کی باتیں ہوتی ہیں اور ہم میدان جنگ میں تھے۔ ہمارے چاروں طرف خوف کے سائے تھے اور موت کے ساتھ ہماری آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ درختوں میں بیٹھنے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ دھیان سے سلیم کی طرف دیکھا۔ لباس وہی تھا جو میں نے پانچ چھ روز پہلے خان رحیمی کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ کف اور کالر گندے تھے۔ قمیض کے کئی بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ چہرے سے ابھی تک بیمار اور ناراض ناراض لگتا تھا۔ اچانک میری نظر سلیم کی پشت پر گئی۔ خون کے دھبے اب اور پھیل گئے تھے۔ اس کی قمیض میں گولی کا نشان دیکھ کر میں بھونچکی رہ گئی۔ جلدی سے اس کی قمیض پھاڑ کر پشت ننگی کی۔ دائیں کندھے سے تھوڑا نیچے ایک گولی تقریباً دو انچ گوشت میں دھنسی ہوئی تھی۔ زخم دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگایا کہ کوشش کر کے گولی ابھی نکال لی جا سکتی ہے۔

میں نے ایک دفعہ بڑے بھائی جان کو گھر میں ایک بالکل ایسا ہی آپریشن کرتے دیکھا تھا۔ ایک واقف کار تھا جو اسپتال جانا نہیں چاہتا تھا۔ بھائی نے گھر ہی میں معمولی اوزاروں کے ساتھ اس کی پشت سے گولی نکال لی تھی۔ میں نے سلیم سے کہا کہ اسے فوری طور پر گولی نکلوا لینی چاہیے۔ ابھی زخم تازہ ہے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا "نہیں رہنے دو، میں تکلیف محسوس نہیں کر رہا۔" میں نے کہا "تکلیف کچھ دیر ٹھہر کر شروع ہو گی۔ بہتر ہے کہ پہلے ہی اس مصیبت سے نجات حاصل کر لو۔"

میرے سمجھانے بجھانے پر وہ مان گیا۔ خوش قسمتی سے میں نے وہ استرا دوبارہ اٹھا لیا تھا جو لڑائی کے دوران میرے ہاتھ سے نکل کر چھت سے صحن میں گر گیا تھا۔ اب یہ استرا میرے پاس تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے کانپتے ہاتھوں سے استرا اٹھایا اور سلیم کی پشت پر گہرا زخم لگا کر گولی نکال لی۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ سلیم نے بے حد برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اور چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ زمین پر گرنے لگے۔ گولی نکالنے کے بعد میں نے چکنی مٹی رکھ کر خون بند کیا اور اپنی قمیض کا دامن پھاڑ کر پٹی باندھ دی۔ گولی نکلنے کے بعد سلیم نے بے حد سکون محسوس کیا۔ اب وہ زیادہ بہتر طریقے سے صورت حال کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ اس نے پر سوچ لہجے میں کہا۔

"ثناء ہمیں جلد از جلد لاہور پہنچنا چاہیے۔ مجھ ڈر ہے کہ نواز حسنی صاحب کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔"

میں نے پوچھا "غلط قدم سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ بولا "حسنی صاحب کو کچھ معلوم نہیں کہ ارسہ آزاد ہو چکی ہے۔ انہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میں اور اختر زماں یہاں آئے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی بے خبری میں ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ارسہ کو اب بھی یرغمال سمجھیں گے۔ اور وہ سب کچھ کر گزریں گے جو چنگیزی ان سے چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب........ تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ پرندے........؟"

"ہاں........ پروگرام کے مطابق آج حسنی صاحب نے وہ پرندے ملک سے باہر بھجوا دینے ہیں۔ اور کل یا پرسوں کسی وقت وہاب چنگیزی بھی جعلی پاسپورٹ پر ملک سے نکل جائے گا۔ اب سے چھ سات گھنٹے بعد دس بجے والی فلائٹ سے لکڑی کے دو بکس

لاہور سے ایک خلیجی ریاست کے لئے بک کئے جائیں گے۔ ظاہری طور پر ان بکسوں میں خوردنی اشیاء ہوں گی مگر اصل سامان کچھ اور ہوگا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ رہی ہو۔ ان بکسوں میں وہ کروڑوں روپے مالیت کے پرندے ہیں جو ایک زبردست پلاننگ کے تحت ملک سے اسمگلنگ کئے جا رہے ہیں۔ یہ اسمگلنگ کی دنیا کا ایک بہت بڑا واقعہ ہوگا۔"

میں نے کہا "میں کچھ سمجھ نہیں پائی لکڑی کے باکسز کے ذریعے پرندے کس طرح اسمگل ہو سکتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ ترقی یافتہ دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انڈر سیکرٹری نواز حسنی صاحب مجرموں کے ہاتھ میں ہیں ان کے ذریعے وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں........"

میں نے پوچھا "کیا پرندوں کو بے ہوش کیا جائے گا؟"

"ہاں........ تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ وہی تکنیک استعمال کی جا رہی ہے جو اس سے پہلے پرندوں کی ایک کھیپ خان رحیمی کی کوٹھی پہنچانے میں استعمال کی گئی تھی۔ تمہیں وہ غیر ملکی ڈاکٹر یاد ہو گا جو تم نے مرغی خانے میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی فیلڈ کا ماہر ترین شخص ہے۔ پرندوں کو پہلے خاص طریقے سے بے ہوش کیا جائے گا۔ بعد ازاں انہیں بکسوں میں رکھ کر ائر پورٹ پہنچایا جائے گا۔ جہاں نواز حسنی صاحب کسٹم اور سیکورٹی چیک اپ کے تمام مراحل کامیابی سے طے کرائیں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ خود بھی اسی فلائٹ کے ذریعے سفر کریں گے اور پرندوں کو بحفاظت منزل مقصود تک پہنچا کر لوٹیں گے........"

اگر سلیم کی معلومات درست تھیں تو صورت حال واقعی تشویشناک تھی نواز حسنی صاحب کو جلد از جلد ارسہ کی رہائی سے باخبر کرنا ضروری تھا........ جہاں تک میرا اپنا تعلق تھا میں بالکل مختلف انداز میں سوچ رہی تھی۔ نواز حسنی، ارسہ اختر زماں اور ان کے مسائل سے مجھے کچھ زیادہ سروکار نہیں تھا۔ میرا اپنا ایک مسئلہ تھا........ اور آج میں اس مسئلے کو حل کر لینا چاہتی تھی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آدمی ایک خون کر لے تو اس کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ تو شاید شجاع کو مارنے اور کئی دوسروں کو زخمی کرنے کے بعد میرے سر پر بھی خون سوار ہو چکا تھا۔ میرے دل میں ایک ہی خواہش تھی جو لاوے کی طرح اچھل رہی تھی اور شعلے کی طرح بھڑک رہی تھی۔ اور یہ خواہش تھی ملعون

شیطان کو قتل کرنے کی۔ میں جانتی تھی شجاع کو مارنے کے بعد اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ کسی بھی وقت کسی چنگیزی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی میرا کام تمام کر دے گی۔ اس گولی کے اپنے نشانے تک پہنچنے سے پہلے میں اپنے ہدف تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ میں کوئی بڑی طاقتور یا مار دھاڑ کرنے والی پھولن دیوی ٹائپ عورت نہیں تھی۔ میں ایک کمزور اور ناتواں عورت تھی۔ غالباً ڈرپوک بھی تھی کیونکہ چند سال پہلے تک کسی کو لگا ہوا معمولی زخم بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن آج میرے بازوؤں اور میرے سینے میں ایک عجیب طرح کا حوصلہ سمایا ہوا تھا......... میرے ”معصوم“ کے منہ سے آنے والی کچے دودھ کی خوشبو میرے ہر ہر مسام میں رچی ہوئی تھی۔ اس کے بھولے بسرے لمس کی کسک نے میرے انگ انگ میں بجلی دوڑا دی تھی۔ میرے اندر کی زخمی ماں بپھری ہوئی تھی اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا......... سلیم کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فوری طور پر نواز حسنی کے پاس پہنچنا چاہتا ہے......... لیکن میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں بڑی حویلی کے اردگرد کھیتوں میں کہیں موجود رہوں اور کسی طرح وہاب چنگیزی تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ ممکن تھا میری قسمت یاوری کرتی اور میں کسی طرح اپنے استرے کی دھار کے ساتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتی۔ یقیناً یہ ایک خطرناک کوشش تھی۔ لہٰذا اس خطرناک کوشش میں میں کسی کا ساتھ نہیں چاہتی تھی اور سلیم کا تو کسی صورت میں نہیں۔

میں نے سلیم سے کہا ”اگر وہ نواز حسینی کی طرف جانا ضروری سمجھتا ہے تو چلا جائے۔ میں خان رحیمی کی طرف چلی جاتی ہوں کیونکہ اس وقت وہی ٹھکانہ میرے لئے مناسب ہے۔“ سلیم گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت جلد وہ میرے اندر کی کشمکش تاڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر فکرمندی نظر آنے لگی۔ بولا ”نہیں ثناء، ہم دونوں اکٹھے جائیں گے۔ نواز حسنی کو خبر کرنے کے بعد ہم خان رحیمی کے پاس پہنچ جائیں گے۔“

میرے بار بار انکار کرنے کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کے اڑیل پن میں کبھی کبھی ایک بچے کی ضد جھلکنے لگتی تھی۔ ایسے وقت اسے کسی بات سے روکنا ناممکن ہو جاتا تھا......... جب وہ کسی طرح مجھے تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو میں نے خود کو حالات

کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ہم نے گھنی جھاڑیوں اور اونچے کھیتوں میں مشرق کی طرف سفر جاری رکھا۔ شام سے ذرا پہلے ہم نے خشک نالہ پار کیا اور گوروں کے ایک قبرستان سے گزر کر بستی چاہ مولا کے نواح میں پہنچ گئے۔ اب ہم چنگیزیوں کی جاگیر سے باہر آ چکے تھے۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ چنگیزی اس پورے علاقے پر زبردست گرفت رکھتے تھے۔ سلیم کو کسی سواری کی تلاش تھی کوئی جیپ' ٹریکٹر ٹرالی' گھوڑا' کچھ بھی مل جاتا۔ راستے میں ایک جگہ ٹریکٹر ٹرالی نظر آئی بھی تھی۔ تاہم اس پر آٹھ دس ہٹے مزدور سوار تھے۔ اور ان میں سے دو تین افراد مسلح بھی تھے۔ مسلح افراد کو دیکھ کر سلیم کو بجا طور پر شک گزرا تھا کہ یہ لوگ بھی چنگیزیوں کے کارندے ہیں۔ وہ مجھے لے کر ایک کماد میں گھس گیا تھا اور ہم اس وقت باہر نکلے تھے جب ٹرالی کافی آگے جا چکی تھی۔

شام کے قریباً چھ بجے جب ہم بستی چاہ مولا سے ایک کوس آگے نکل آئے تھے اچانک ہماری مراد بر آئی۔ راستے سے کچھ ہٹ کر ایک سفید ٹویوٹا کار کھڑی نظر آئی اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا لیکن اردگرد کوئی سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم دبے پاؤں ایک کھیت میں گھسے اور احتیاط سے کار کی طرف بڑھنے لگے۔ سلیم اپنی رائفل ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کار کھیت کی منڈھیر کے ساتھ کھڑی تھی۔ پندرہ بیس گز فاصلہ طے کر کے ہم کار کے عقب میں پہنچ گئے۔ اندر نسوانی ہنسی کی مدہم آواز سنائی دی۔ پھر کوئی لڑکی بولی۔

”یہ بونٹ کیوں اٹھا دیا تم نے؟“

کسی لڑکے کی آواز آئی ”بھئی کوئی آ بھی گیا تو یہی سمجھے گا کہ گاڑی ٹھیک کر رہے ہیں۔“

لڑکی ہنسی ”بونٹ باہر اٹھا رکھا ہے اور گاڑی اندر ٹھیک کر رہے ہو۔“

لڑکا بولا ”بیس سے چوبیس سال کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے۔ خرابی کہیں بھی ہو گاڑی اندر بیٹھ کر ہی ٹھیک ہوتی ہے۔“

لڑکی غرائی ”تم مجھے کیوں بیس سے چوبیس سال کے درمیان گھسیٹ رہے ہو۔“

”اوہ ساری“ لڑکے نے معذرت کی ”میں بھول گیا۔ تمہارے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے“ دونوں دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔ سلیم نے تیزی سے باہر نکل کر

ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور ایک نوجوان لڑکے کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ لڑکا درمیانے قد کاٹھ کا تھا۔ اس نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ سلیم کی قمیض پر خون کے دھبے اور ہاتھ میں بندوق دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ یہی حال اس کی ساتھی لڑکی کا ہوا۔ ہماری آمد نے ان کی ان ڈور پکنک کا ستیاناس کر دیا (لڑکا اور لڑکی کسی ایڈوانس زمیندار گھرانے سے لگتے تھے) سلیم نے لڑکے سے کار کی چابی مانگی۔ اس نے حیل و حجت کی تو سلیم نے بندوق کا کندا زور سے اس کی گردن پر دے مارا۔ وہ بے چارا لڑکھڑا کر گاڑی کی ڈگی پر گرا۔ یہ صورت حال دیکھ کر لڑکی رونے لگی اور لڑکے سے درخواست کرنے لگی کہ وہ چابی دے دے۔ لڑکے نے بھی اسی میں عافیت جانی۔ لڑکی کے گلے میں ایک لمبا سا مفلر تھا جو دوپٹے کی طرح اس کے دونوں گھٹنوں پر جھول رہا تھا۔ سلیم نے رائفل مجھے تھمائی اور اس مفلر سے لڑکے اور لڑکی کے ہاتھ پشت پر کس کر باندھ دیئے۔ ہاتھ باندھنے میں اس نے زبردست مہارت دکھائی۔ ان دونوں کی پشتیں جڑی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ کھولے بغیر کہیں آجا نہیں سکتے تھے۔ بونٹ گرا کر ہم دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔ میں نے سلیم سے پوچھا کہ کہیں وہ ٹھٹھر کر مر ہی نہ جائیں۔ اس نے کہا "نہیں۔ ایک آدھ گھنٹے تک یہ ہاتھ کھول لیں گے یا ڈھیلے کر کے نکال لیں گے۔"

انجن اسٹارٹ کر کے سلیم نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ڈیک پر نغمہ گونج رہا تھا "دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات.........."

بڑی سڑک پر پہنچتے ہی سلیم نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ وہ بے حد تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہر لحظہ لگتا تھا کہ کسی بس ٹرک سے ٹکرا کر ہم پاش پاش ہو جائیں گے اتنی تیز ڈرائیونگ کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو لاہور پہنچنے کی جلدی' اور دوسری وہ ناراضگی جو ان دنوں ہر وقت سلیم کے موڈ پر حاوی رہتی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں جیسے آگ برسانے لگتی تھیں۔ میں بھی اس آگ کو چھیڑ کر خواہ مخواہ جھلسنا نہیں چاہتی تھی۔ اس آگ کو چھیڑ کر مجھے کئی تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ سلیم کو خود سے ایک فاصلے پر رکھنے کی کوشش میں میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس پر میں ساری عمر پچھتاتی رہوں اور وہ بھی شکوہ کناں رہے۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی۔ گاڑی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی ساڑھے تین گھنٹے کا سفر دو گھنٹے میں

طے کر کے لاہور پہنچ گئی۔ لاہور پہنچتے ہی سلیم نے اس کارخانے کا رخ کیا جو نواز حسنی کے ماتحت رئیس احمد کی ملکیت تھا اور جہاں وہ قالین بافی کراتا تھا۔ یہ کارخانہ ملتان روڈ اور بند روڈ کے درمیانی علاقے میں کہیں واقع تھا (ان دنوں بند روڈ کے ساتھ ساتھ ابھی آبادی زیادہ نہیں ہوئی تھی) کھلے کھیتوں میں کہیں کہیں کارخانہ داروں نے عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ گاڑی کارخانے کے عین سامنے جا رکی۔ لٹھ بردار پنجابی چوکیدار نے سلیم کو اندر جانے سے روکا۔ سلیم اسے دھکیل کر اندر گھس جانا چاہتا تھا' جب رئیس احمد خود ہی باہر آگیا۔ وہ حسب معمول پینٹ بشرٹ میں تھا اور اس کی چمکیلی عیار آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ رشوت خوری اور خوشامد جیسے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ سلیم سے اس کی ملاقات خان رحیمی کی کوٹھی میں ہو چکی تھی۔ سلیم کو دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھ آیا۔

"السلام علیکم' بابری پہلوان' سناؤ' کہاں سے آ رہے ہو۔ وہ.......... نواز حسنی تو بہت پریشان تھے تمہارے اور اختر زماں کے بارے میں۔ کہتے تھے پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے ہیں۔"

سلیم نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا "رئیس صاحب' نواز صاحب کہاں ہیں؟" اس سوال پر رئیس کی آنکھوں میں اچانک بے رخی نظر آنے لگی۔ اس نے محتاط لہجے میں پوچھا "تمہیں نہیں معلوم" سلیم نے نفی میں جواب دیا۔ رئیس بولا "مجھے بھی نہیں معلوم!"

سلیم نے غرا کر کہا "دیکھو رئیس صاحب! آپ کو پتہ نہیں آپ مجھے اندھیرے میں رکھ کر نواز صاحب کا کتنا بڑا نقصان کریں گے۔ وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ فوری طور پر مجھے نواز صاحب سے ملا دیں۔"

رئیس نے کہا "لیکن وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" تم خود اندر جاکر دیکھ لو۔ سلیم نے فوری طور پر اس پیشکش کا فائدہ اٹھایا اور دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔ تین چار منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے بڑی ملائمت کے ساتھ رئیس سے کہا۔

"رئیس صاحب' آپ سو فیصد کتے کی اولاد ہیں۔ آپ کی ٹھکائی مجھ پر ادھار رہی۔ انشاء اللہ۔"

رئیس احمد بھونچکا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم غڑاپ سے گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے ریس دبائی۔ پہیوں نے طویل احتجاجی چیخ ماری اور چکنی سڑک پر لہراتے چلے گئے۔ رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر بہت کم ٹریفک تھا۔ سلیم گاڑی کو اڑاتا چلا گیا۔

میں نے پوچھا "اب کہاں؟"

"ائر پورٹ" اس نے مختصر جواب دیا۔

"یعنی وہ لوگ پرندے لے گئے ہیں۔"

"ہاں......... دعا کرو ابھی وہ راستے میں ہوں۔ اس بدبخت رئیس نے خواہ مخواہ پانچ چھ منٹ ضائع کر دیئے" ہم نے قریباً پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مزنگ چونگی کا مصروف چوک کراس کیا اور شاہراہ قائداعظم کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم شاہراہ سے دو فرلانگ دور ہی تھے کہ میری نظر نواز حسنی کی کریم کلر گاڑی پر پڑ گئی۔ میں نے چیخ کر سلیم کو اس طرف متوجہ کیا۔ گاڑی دیکھتے ہی سلیم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے رفتار مزید بڑھائی اور شاہراہ قائداعظم پر مڑتے مڑتے گاڑی کو جالیا۔ میں نے تیز نظروں سے دیکھا نواز حسنی گاڑی میں موجود نہیں ہے۔ کچھ اجنبی چہرے نظر آ رہے تھے۔ جس میں ایک شخص کسٹم آفیسر کی وردی میں تھا۔ گاڑی کے آگے کسی سرکاری محکمے کا اوپن ٹرک جا رہا تھا۔ ٹرک میں کچھ دوسرے سامان کے ساتھ لکڑی کے تین بڑے بڑے بکس بھی لدے ہوئے تھے۔ تینوں بکس بالکل ایک جیسے تھے۔ سلیم کی معلومات کے مطابق ان میں سے ایک بکس میں واقعی کچھ مہنگی قسم کی خوردنی اشیاء تھیں۔ جبکہ باقی دو بکسوں میں پرندے تھے۔ اس پرانے ماڈل کے دھواں دھار ٹرک کو دیکھ کر کون اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ ٹرک کروڑوں روپے کا لیگیج لے کر جا رہا ہے۔ ٹرک کو اوور ٹیک کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ٹرک کے آگے بھی ایک ایسی جیپ جا رہی ہے جس کا تعلق نواز حسنی کی کوٹھی سے ہے۔ میں نے اچھی طرح جھانکا اس جیپ میں بھی کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ سلیم کار کو جیپ سے آگے لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ جیپ بھی نواز حسنی کی کوٹھی سے آئی ہے......... سلیم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ دس پندرہ گز جیپ سے آگے چلنے کے بعد سلیم نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر جیپ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ مگر جیپ کی رفتار میں کوئی کمی

نہیں آئی۔ جب دو تین بار اشارہ دینے کے باوجود جیپ نہیں رکی تو سلیم نے اس کے آگے آگے چل کر کار کی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ عجب صورت حال تھی۔ ہم مفرور ملزم تھے لیکن اس وقت ہماری جگہ سرکاری لوگ بھاگ رہے تھے اور ہم انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیپ والوں کو جب یقین ہو گیا کہ ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اپنی رفتار کم کی اور گاڑی کو سڑک کی سائیڈ پر لگا دیا۔ ان کے رکنے کا اثر پیچھے آنے والے ٹرک اور کار پر بالکل نہیں پڑا۔ یہ دونوں گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ جیپ میں چار افراد سوار تھے۔ ان میں سے ایک کوئی چوکیدار نما شخص تھا۔ اس کے کندھے سے بندوق جھول رہی تھی۔ سلیم کار سے اتر کر جیپ کے پاس پہنچا۔ جیپ میں سے بھی ایک صحت مند آدمی اتر کر سڑک پر آ چکا تھا۔ سلیم اور وہ کچھ دیر سڑک پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر جیپ کے اندر چلے گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ سلیم نے جیپ کے اندر جا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ اجنبی لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اور پھر یہی کچھ ہوا۔ ایک شخص جس نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی تیز قدموں سے میری طرف آیا اور کھڑکی میں جھک کر بولا۔

"بی بی! آپ کو مجسٹریٹ صاحب جیپ میں بلا رہے ہیں۔"

بولنے والے کے لہجے سے مجھے خطرے کی بو آئی۔ میں نے کہا "کون مجسٹریٹ؟ جس نے مجھ سے کچھ کہنا ہے یہیں کہے" ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ ایک دوسرا شخص پھرتی سے دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہولسٹر پر تھا۔ تیور بتا رہے تھے کہ اگر میں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ پستول نکال کر میری کنپٹی سے لگا دے گا۔ اس نے گرج دار لہجے میں کہا۔

"خاموش بیٹھی رہو بی بی' چوں چراں کی تو اچھا نہیں ہو گا" تب وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا "تم گاڑی چلاؤ بشیر۔ ڈیفنس والی کوٹھی پر چلو۔"

بشیر نامی شخص نے فوری تعمیل کی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے دیکھا وہ جیپ بھی پیچھے آ رہی ہے جس میں سلیم داخل ہوا تھا۔ میں نے راستے میں بار بار پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھائیس تیس سال

کاایک بارعب شخص تھا۔ اس وقت وہ بہت غصے میں تھا اور آنکھیں جیسے شعلے اگل رہی تھیں۔

قریباً دس منٹ بعد دونوں گاڑیاں ایک وسیع و عریض نیم تاریک کوٹھی میں داخل ہوئیں میں نے گھوم کر دیکھا تو سلیم بھی جیپ سے اتر رہا تھا۔ چوکیدار نما شخص کی بندوق اب اس کے ہاتھ میں نظر آرہی تھی۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ سلیم کو زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک جہازی سائز کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ سلیم نے زوردار لہجے میں لحیم شحیم شخص کو مخاطب کیا اور بولا۔

"دیکھیں آپ ہم پر شک کر کے زبردست نقصان اٹھائیں گے............ آپ اس ٹرک کو روکنے کی کوشش کریں۔"

لحیم شحیم شخص نے گرج کر کہا "وہ ٹرک رک چکا ہے اور تم اپنی چونچ بند رکھو میں فی الحال تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔"

سلیم خاموش ہو گیا تو وہ شخص ہاتھ پشت پر باندھ کر بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو تین منٹ کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس شخص نے لپک کر ٹیلیفون اٹھایا۔

"ہیلو............ کون؟" بہروز خاں............ ٹرک کہاں روکا ہے............ چلو ٹھیک ہے؟"............ نہیں نہیں............ تم میں سے کوئی یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ گڑ بڑ ہو گئی ہے............ یہ سارا پروگرام فی الحال کینسل سمجھو............ ہاں ہاں ڈاکٹر سنبھال کر سب کچھ............ تم فون نمبر لکھواؤ............ میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ اوکے............ گڈ بائی۔"

ریسیور نیچے رکھ کر اس نے مجھے اور سلیم کو گھورا۔ تب چوکیدار سے کہنے لگا کہ وہ گیٹ پر رہے اور اردگرد کڑی نگاہ رکھے۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے ہمارے کچھ ساتھی بھی ہوں جو یہاں تک پہنچ جائیں۔

سلیم نے کہا "آپ حد سے زیادہ شکی مزاج شخص ہیں۔ آپ کو اب تک ہم پر اعتماد کر لینا چاہئے تھا۔"

لحیم شحیم شخص نے ازحد خشک لہجے میں کہا "میں تمہیں کہہ چکا ہوں اپنی بکواس بند

رکھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب پتہ چل جاتا ہے۔"

چند لمحے بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ لحیم شحیم شخص نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہنے کے بعد بولا "جی سر' میں چوہدری طارق بول رہا ہوں" اس کے بعد جو گفتگو ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ لائن پر دوسری طرف نواز حسنی صاحب خود ہیں۔ وہ ائرپورٹ کے اندر کہیں موجود تھے اور چوہدری طارق کے نہ پہنچنے پر پریشان ہو رہے تھے۔ چوہدری طارق نے مودب لہجے میں کہا۔

"جی سر' رئیس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ پہلے کارخانے سے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر راستے میں ایک گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ سر............ ہاں سر' بات تو ایسی ہی ہے۔ ایک بندے نے ہمارا راستہ روکا ہے جی............ بابری نام بتا رہا ہے............ ساتھ میں ایک عورت بھی ہے............"

اس کے ساتھ ہی چوہدری طارق کے تاثرات بدل گئے۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ بولا "جی ہاں............ میرے پاس ہی ہیں............ میں............ میں بلاتا ہوں ان کو" اس نے ریسیور کان سے ہٹایا اور سلیم سے کہا کہ وہ بات کرے۔ سلیم نے آگے بڑھ کر ریسیور تھاما اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "جناب............ میرے پاس آپ کے لئے ایک ضروری اطلاع ہے جو شاید فون پر دینا مناسب نہ ہو۔ آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں............ نہیں سر............ میں سوچ سمجھ کر بات کرتا ہوں............ آپ فوراً یہاں آجائیں" اس کے بعد سلیم نے ریسیور چوہدری طارق کو تھما دیا۔ اس نے چند باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب چوہدری طارق کے چہرے پر کرختگی کی جگہ ملائمت نے لے لی تھی۔ وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔

"معاف کرنا بھائی۔ تم جانتے ہی ہو یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ اگر اس وقت میرا سگا باپ بھی ہوتا تو میں اس پر اعتبار نہ کرتا۔" پھر اس نے سلیم کے خراب حلیے پر نظر ڈالی اور کہا کہ اگر وہ نہا کر کپڑے بدلنا چاہتا ہے تو انتظام ہو سکتا ہے۔ سلیم نے سر کے اشارے سے انکار کر دیا۔ اس دوران ایک مسلح شخص اندر آیا اور سلیم کی بھری ہوئی رائفل اس کے پاس کرسی پر رکھ دی۔ غالباً یہ رائفل جیپ کے اندر اس سے لے لی گئی تھی۔ سلیم نے بتایا کہ ہم چوری کی کار میں یہاں پہنچے ہیں اور بہتر ہے کہ یہ کار کسی سنسان سڑک پر

کھڑی کر دی جائے۔ طارق چوہدری نے اس مشورے پر فوری عمل کرتے ہوئے ایک شخص کو کار کی چابی دے کر بھیج دیا۔ سلیم خاموشی سے فرش کو گھور رہا تھا۔ میں بھی اپنی بوسکی کی چادر میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ شاید میں بتانا بھول گئی کہ کھیتوں میں ہم جس لڑکے لڑکی کو باندھ آئے تھے ان سے ہم نے کار کے علاوہ یہ چادر بھی لی تھی۔ یہ چادر لڑکی کی تھی اس نے لاپرواہی سے کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ مجھے اس وقت ایک دھلی دھلائی اچھی چادر کی شدید ضرورت تھی۔ لہٰذا بہ امر مجبوری یہ چادر میں نے اس سے لے لی تھی۔ راستے میں اس چادر کے گھونگھٹ نے مجھے بہت سے دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا.......... ہمیں نواز حسنی صاحب کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے وہ اس کوٹھی میں کسی عقبی راستے سے آئے تھے۔ کیونکہ نہ تو ہمیں گاڑی کی آواز سنائی دی اور نہ ان کے قدموں کی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں پوری افسرانہ شان کے ساتھ وارد ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے ان کی اندرونی بے چینی کا شدید اظہار ہوتا تھا۔ چوہدری طارق کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے وہ ہمیں ایک ملحقہ کمرے میں لے گئے۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ قریباً چیخ پڑے۔

"کیا خبر ہے تمہارے پاس؟"

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا' جناب' آپ بازی جیت چکے ہیں۔ چوہدری وہاب کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔"

"پہیلیاں نہ بھجواؤ" نواز حسنی نے روہانسی آواز میں کہا۔

میں نے سلیم کی مدد کرتے ہوئے کہا "سر! میرا خیال ہے آپ کو ابھی تک ارسہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی.......... ارسہ رہا ہو چکی ہے اور اس وقت مقامی پولیس کی تحویل میں ہے.........."

نواز حسنی صاحب سرتاپا لرز گئے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں حیرت کی فراوانی سے انہیں دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ انہوں نے لرزاں لہجے میں پوچھا "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

سلیم نے کہا "جناب! ہم دونوں ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے چنگیزیوں کے ڈیرے پر بلہ بول کر ارسہ بی بی کو رہا کرایا ہے۔"

نواز حسنی بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے کہ اب ارسی کہاں ہے۔ سلیم نے کہا "جناب! آپ کے صاحب زادے اختر زماں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ چنگیزیوں کے ڈیرے میں گھسنے سے پہلے انہوں نے مقامی پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ جب ہم ارسہ بی بی کو چھڑا کر ڈیرے سے نکلے اور چنگیزیوں کی گاڑیوں نے ہمارا پیچھا شروع کیا تو ایس پی جھنگ بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر چنگیزی موقع سے پیچھے ہٹ گئے.........."

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور نواز حسنی صاحب کی اجازت سے ان کا ایک خاص ملازم اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اندرونی ہیجان سے تمتما رہا تھا۔ نواز حسنی کے کان پر جھک کر اس نے کچھ کھسر پھسر کی اور مودب کھڑا ہو گیا۔ نواز حسنی نے اسے باہر بھیجنے کے بعد کہا "میری رہائش پر جھنگ سے کال آئی ہے۔ انتظامیہ کا ایک اعلیٰ افسر بات کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو" نواز حسنی صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے ہمیں بھی چلنے کو کہا۔ کوٹھی کی عقبی سمت وہ ڈاٹسن کھڑی تھی جس میں وہ یہاں پہنچے تھے۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر کے لائے تھے۔ ہمیں بٹھا کر وہ تیز رفتاری سے اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ بنگلے میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنے میٹنگ روم کا رخ کیا جہاں ان کا نجی ٹیلیفون پڑا رہتا تھا.......... قریباً" آدھ گھنٹے بعد وہ ٹیلی فون کال سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ ان کے چہرے پر خوشی اور غمی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ارسہ پولیس کی تحویل میں سلامتی سے ہے۔ جبکہ اختر زماں جھنگ اسپتال کے آئی سی یو میں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ چوہدری شجاع موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ جبکہ ان چار زخمیوں میں سے بھی ایک شخص چل بسا ہے جو میرے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ چھوٹے چوہدری شجاع کی موت حویلی میں کہرام برپا کر چکی تھی اور چنگیزیوں کے ہرکارے ہر طرف ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ نواز حسنی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ چوہدری وہاب ابھی تک موقع پر نہیں پہنچا۔ اس کے کارندوں نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ پرانی دشمنی کی بنا پر بدمعاشوں کے ایک گروہ نے ان کے ڈیرے پر مسلح یلغار کی ہے۔ اور اس یلغار میں وہ عورت بھی شامل تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے بڑی حویلی میں دلہن کے روپ میں قدم رکھا تھا اور بعد ازاں اپنے شوہر واصف چنگیزی کو قتل کر کے

فرار ہو گئی تھی۔ میں بغور نواز حسنی صاحب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ شک نہیں جاگا کہ بڑی حویلی کی سابق جاگیردارنی میں ہی ہوں۔ میرے اجڑے بکھرے بال' میلا کچیلا چہرہ اور خستہ لباس دیکھ کر کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔

نواز حسنی صاحب نے ہم سے کہا "تم دونوں کے لئے اب یہ ٹھکانہ مناسب نہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے تمہیں اب خان رحیمی کے پاس بھی نہیں لوٹنا چاہئے۔ کیونکہ اب وہ بھی اس کہانی میں اپنا کردار بدلنے والا ہے۔ میں نے نواں کوٹ سمن آباد کے علاقے میں تمہارے لئے ایک رہائشی کوارٹر کا بندوبست کر دیا ہے۔ رئیس احمد ابھی گاڑی لے کر آئے گا اور تمہیں خاموشی سے وہاں شفٹ کر دے گا۔ میں اب اختر کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم سے رابطہ میں تمہارے کوارٹر میں ہی کروں گا........" یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے باہر نکلے مگر دروازے تک پہنچتے پہنچتے رک گئے۔ مڑ کر بولے "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ بلکہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ تمہیں زیادہ دن منہ چھپانے کی زحمت نہیں ہوگی۔ چنگیزیوں کے برے دن شروع ہو گئے ہیں۔ میں انہیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ تاعمر یاد رکھیں گے۔"

نواز حسنی صاحب کو گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ رئیس احمد ہمیں ایک سوزوکی کار پر لینے پہنچ گیا۔ ہم فی الحال نواز حسنی صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا کار میں جا بیٹھے۔ رئیس احمد کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اسے دہری شرمندگی تھی ایک تو میری وجہ سے کہ چند ہفتے پہلے اس نے مجھے کسی زر خرید لونڈی کی طرح نواز حسنی صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دوسرے وہ سلیم سے بھی شرمندہ تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب ہم کو اس کی مدد درکار تھی اس نے ہمیں آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالنے کی کوشش کی تھی.......... وہ خاموشی سے ہمیں نواں کوٹ کے ایک مختصر مکان میں لے آیا۔ دو کمروں اور ایک کچن والا یہ کوارٹر گنجان آبادی میں گھرا ہوا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں نیم کا پودا تھا اور گلاب کی کیاریاں تھیں.......... روز مرہ استعمال کا کچھ سامان کوارٹر میں پہلے سے موجود تھا۔ کچھ سامان رئیس احمد گاڑی میں ہی رکھ کر لایا تھا۔ یہ زیادہ تر کچن کا سامان تھا۔ رئیس نے سلیم کے ساتھ مل کر یہ سامان کچن میں

رکھا۔ پھر کھسیانے انداز میں خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔

وہ رات ہم نے کوارٹر میں گزاری۔ علی الصبح کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سلیم نے دروازہ کھولا۔ ایک شخص لفافہ تھما کر واپس چلا گیا۔ اس لفافے میں ایک رقعہ تھا۔ یہ رقعہ نواز حسنی صاحب کی طرف سے تھا۔ اس رقعے میں درج ہدایات کے مطابق سلیم کا نام غلام عباس اور میرا نسرین تھا۔ ہم گجرات سے شفٹ ہو کر یہاں آئے تھے۔ سلیم یعنی غلام عباس مصور تھا اور گھر ہی میں بیٹھ کر رسالوں اور ڈائجسٹوں کے لئے اسکیچ وغیرہ بناتا تھا۔ نواز حسنی صاحب نے ہم دونوں کو ہدایت کی تھی کہ پڑوسیوں سے زیادہ گھلنے ملنے اور گھر سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔ ان ہدایات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ ہمیں اس کوارٹر میں فرضی میاں بیوی کے طور پر رہنا ہوگا۔ میرے لئے یہ سب کچھ بہت الجھن کا باعث تھا لیکن حالات کے تقاضے کو بھی نظرانداز کرنا مشکل تھا۔

ہم نے اس کوارٹر میں خاموشی کے ساتھ ایک ہفتہ گزار دیا۔ اس ہفتے میں کوارٹر کی چار دیواری سے باہر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ رئیس احمد اور ایک دوسرے شخص رمضان کی زبانی ہمیں وقتاً فوقتاً ان تبدیلیوں کی خبریں ملتی رہیں۔ سب سے پہلے یہ اطلاع ملی کہ نواز حسنی صاحب نے وہ کروڑوں روپے کے پرندے محکمہ وائلڈ لائف کے حوالے کر دیے ہیں جو پچھلے ایک برس میں مختلف علاقوں سے اکٹھے کئے گئے تھے اور جنہیں چنگیزی ملک سے باہر اسمگل کرانا چاہتے تھے۔ اس اطلاع کی تصدیق اخباری خبر سے بھی ہوئی۔ یہ خبر بڑے اہتمام سے چھاپی گئی تھی۔ خبر پڑھنے کے بعد مجھے اور سلیم کو اندازہ ہوا کہ نواز حسنی کا بیان دراصل نواز حسنی اور خان رحیمی کے باہمی صلاح مشورے کا نتیجہ ہے۔ خان رحیمی اسرار کا لبادہ اتار کر منظر عام پر آگیا تھا اور اس نے بھی چنگیزیوں کے خلاف خم ٹھونک کر بیان دیا تھا۔ درحقیقت ان دونوں نے بڑی دانشمندی سے صورت حال پر قابو پا لیا تھا۔ نواز حسنی کا بیان یہ تھا کہ وہ صرف مجرموں کو پھانسنے کی خاطر پرندے اسمگل کرنے کا ڈرامہ کر رہے تھے۔ اس ڈرامے میں خان رحیمی بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ پولیس میں بھی مجرموں کے مخبر موجود تھے اس لئے وہ دونوں پوری رازداری سے کام کر رہے تھے اور مجرموں کو مکمل طور پر بے نقاب کرنا چاہتے تھے.......... خان رحیمی کی حد تک تو یہ سب باتیں صحیح تھیں لیکن ہم جانتے تھے کہ نواز حسنی کے کیا ارادے تھے؟ ان کی حب الوطنی اور راست بازی میں شک نہیں تھا۔ لیکن بیٹی کی محبت انہیں اس حد تک لاچار کر چکی تھی کہ وہ جرم کا ہر طوق گلے میں ڈالنے پر تیار ہو گئے تھے۔ ان کی حالت قابل ترس ہی نہیں ناقابل فراموش بھی تھی۔.......... ہمیں دوسری اطلاع یہ ملی کہ

نواز حسنی صاحب نے وہاب چنگیزی کے خلاف قتل، اغوا، اسمگلنگ اور دیگر سنگین جرائم میں کیس درج کرائے ہیں۔ جس کے بعد پولیس کی بھاری جمعیت نے بڑی حویلی میں کارروائی کر کے وہاب کے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام لوگوں کے خلاف بھی کارروائی ہو رہی ہے جنہوں نے بغیر لائسنس کے پرندے پکڑے ہیں اور ان کی غیر قانونی خرید و فروخت کی ہے۔ اس سلسلے میں کئی بڑے بڑے گروہوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا رہا ہے.......... ہمیں زیادہ دلچسپی وہاب چنگیزی کی گرفتاری سے تھی۔ مگر اس کے بارے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ایک روز رمضان کی زبانی پتہ چلا کہ اس نے جنوبی پنجاب کے کسی بڑے سیاستدان کے پاس پناہ لے رکھی ہے اور پولیس بھی وہاں ریڈ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔

دس پندرہ روز ان خبروں کا بہت زور رہا.......... پھر ایکا ایکی سب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ یوں لگا جیسے بیٹی کو واپس پانے کے بعد نواز حسنی صاحب کی سرگرمی بھی ماند پڑ گئی ہے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آئی یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو نواز حسنی صاحب ہمیں وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مژدہ سنا کر گئے تھے اور عہد کر کے گئے تھے کہ اب وہ شخص خلق خدا پر ظلم ڈھانے اور زمین پر دندنانے کے لئے آزاد نہیں رہے گا۔ اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ وہاب چنگیزی کی گردن پر دباؤ بڑھانے کی بجائے اس کی برائے نام بندشیں بھی ڈھیلی کی جا رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ درون خانہ کوئی "کایا پلٹ" تبدیلی آچکی ہے۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی، موسم سرما جیسے جاتے جاتے پھر پلٹ آیا تھا، ٹھنڈی ہوا جسم میں کپکپی طاری کر رہی تھی۔ گھر کی صفائی کرنے کے بعد میں نے نہا کر کپڑے پہنے اور باورچی خانے میں آگئی۔ سردی میں باورچی خانہ گوشہ عافیت محسوس ہوتا ہے۔ دوپہر کو رمضان سبزی دے گیا تھا۔ وہ میں نے دھو کاٹ کر ہنڈیا میں ڈالی اور چولہے میں آگ جلا کر بیٹھ گئی۔ سلیم دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ نواز صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ اشد ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتا تھا۔ چولہے کے سامنے بیٹھے بیٹھے میری آنکھوں میں ایک بار پھر بڑی حویلی کے خونی مناظر گھومنے لگے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اپنے انہی ناتواں ہاتھوں سے میں نے صرف ایک ہفتہ قبل دو خون

کئے ہیں اور تین افراد کو زخمی کیا ہے۔ وہاب کے کارندے کی کٹی ہوئی گردن اور شجاع کے رخسار پر ابھرنے والا گولی کا نیلگوں نشان بار بار میری آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔ غصے کی زیادتی میں کتنا صحیح نشانہ لیا تھا میں نے حالانکہ اس سے صرف چند لمحے پہلے تالہ توڑنے کی کوشش میں مجھ سے چار گولیاں ضائع ہوئی تھیں۔ آہ.......... کاتب تقدیر نے میرے ان ہاتھوں کو کیسے کیسے کام سونپ دیئے تھے۔ یہ روٹیاں پکانے' سلائی کڑھائی کرنے اور قلم تھامنے والے ہاتھ آج قتل کر رہے تھے۔ میری آنکھیں شدت غم سے جلنے لگیں۔ زندگی میں میں نے صرف ایک غلطی کی تھی اور وہی چھوٹی سی غلطی مجھے حادثوں کے دوش پر اڑا کر کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ اگر اس منحوس سہ پہر کو میں فرخندہ کے ساتھ رکشے پر بیٹھ کر سلیم سے ملنے روانہ نہ ہوتی اور نتیجے میں میڈم نادرہ کی کینہ پرور نگاہ سے محفوظ رہتی تو آج زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ کتنی مختلف اور خوبصورت۔ شاید ایسا ہی یا اس سے تھوڑا سا بڑا ایک گھر ہوتا جس میں میں واقعی کسی کی بیوی ہوتی کوئی واقعی میرا شریک حیات ہوتا اور اس ابر آلود شام میں اور اس باورچی خانے میں واقعی میں زندہ ہوتی..........

اچانک ایک دستک نے میرے خیال کا تانا بانا توڑ دیا۔ میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنچی "کون؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ دوسری طرف سے رئیس احمد کی آواز آئی "مس شاہدہ' کوئی بابری صاحب سے ملنے آیا ہے۔"

"کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں ہوں جی' ڈر دے کیوں پئے ہو۔ بوہا تے کھولو۔" آواز اور لہجے نے مجھے سمجھا دیا کہ دوسری طرف دینو ہے۔ میں نے حیرت کے دھچکے سے سنبھل کر دروازہ کھولا۔ دینو کے سر پر ٹوپی تھی اور اس نے کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ اندر آ گیا تو رئیس احمد بولا "مجھے چوبرجی ایک کام ہے۔ ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔ اتنی دیر میں آپ بات کر لیں۔ سر نے کہا ہے کہ دینو کو ساتھ ہی واپس لانا ہے۔" میں جانتی تھی کہ رئیس احمد کو کام وام کوئی نہیں صرف بہانہ بنا رہا ہے۔ دراصل وہ مجھ سے اور سلیم سے بہت کنی کتراتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ آمنا سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے.......... وہ چلا گیا تو میں دینو کو لے کر اندر آ گئی۔ دستک کی آواز سے سلیم بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ دینو کو دیکھ کر میری طرح وہ

بھی حیران ہوا۔ میرے پوچھنے پر دینو نے بتایا کہ وہ خان رحیمی کی کوٹھی سے آ رہا ہے۔ اس اطلاع نے مجھے اور سلیم کو پریشان کر دیا۔ میں نے کہا۔

"کہیں کسی کو پیچھے تو نہیں لگا لائے!؟"

وہ اطمینان سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ بولا "نہ جی اتنا کملا نہیں ہوں میں اور نہ ہی خان صاحب اتنے بھولے بادشاہ ہیں۔ خان صاحب کو پتہ ہے کہ چنگیزیوں کے بندے ہماری تاڑ میں ہیں۔ انہوں نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں بڑے حساب کتاب سے آیا ہوں۔ آدھی رات کو نکلا تھا کوٹھی سے۔ پہلے اپنے پنڈ چلا گیا۔ ایک رات اور اوتھے رہ کر شیخوپورے آیا۔ آج سارا دن شیخوپورے میں گزار کر اور چنگی طرح تسلی کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔"

سلیم نے پوچھا "لیکن یہ سارے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی' کیا مصیبت پڑ گئی تھی تمہیں؟"

دینو بولا "مصیبت مجھے نہیں جی' شاہ دین ٹوانہ صاحب کو پڑی ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خانہ رحیمی صاحب کو بھی پڑ گئی ہے.......... وہ عیش عشرت بی بی کہیں غائب ہو گئی ہے جی۔ شاہ دین صاحب اس کے وچھوڑے میں ادھے پاگل ہو گئے ہیں اور ہمیں پورا پاگل کر دیا ہے۔"

"کہاں غائب ہو گئی ہے وہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ جواب میں دینو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتایا کہ پچھلے منگل کی صبح جب اس کے پاؤں کی مالش کرنے والا حکیم اس کے کمرے میں گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ اس کا مختلف سامان بھی بکھرا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑی افراتفری میں گئی ہے۔ عشرت کے ساتھ ساتھ کوٹھی کی وہ ملازمہ کلثوم عرف خانم بھی غائب تھی جو پچھلے دنوں ملازم رکھی گئی تھی۔ (یہی وہ عورت تھی جسے میں نے باتھ روم کی کھڑکی سے عشرت کو دھمکیاں دیتے سنا تھا) اتفاقاً جس روز عشرت غائب ہوئی اس روز دوپہر کے وقت شاہ دین ٹوانہ اسے واپس لینے پہنچ گیا۔ اس کی گمشدگی کا جان کر وہ از حد پریشان ہوا۔ تب سے عشرت کی تلاش مسلسل جاری ہے لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا' دینو نے بتایا کہ وہ بھی عشرت کے سلسلے میں ہی یہاں آیا ہے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر خان رحیمی نے خیال کیا کہ کہیں وہ لاہور ہمارے

پاس ہی نہ جا پہنچی ہو.........

عشرت کی گمشدگی نے مجھے فکر مند کر دیا۔ میں عشرت کے بارے خان رحیمی، سلیم اور شاہ دین ٹوانہ سے کہیں زیادہ جانتی تھی اور میرا اس سے تعلق بھی قریبی تھا۔ وہ میری بڑی بھابی کی سگی بہن تھی اور کچھ بدقماش لوگوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ماضی پر تاریکی کا دبیز پردہ تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ دونوں بہنیں کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے حقیقی والدین کون ہیں......... عشرت کے بارے اطلاع سن کر پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ ہو نہ ہو وہ پھر اسی گناہوں کے بازار کی زینت بن گئی ہے جس سے وہ آئی تھی۔ اور اسے وہاں لے جانے والے کلثوم عرف خانم اور سالار وغیرہ ہی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ وہ دوبارہ اس دلدل میں جانے سے کس قدر خوف کھاتی تھی اور کیسے رو رو کر دعائیں کرتی تھی کہ اسے اس دلدل سے باہر ہی موت آجائے۔ سلیم کے ساتھ اسے عجب طرح کی وابستگی پیدا ہو چکی تھی اور اس کے قرب و جوار میں رہنا بھی وہ اپنے لئے انعام سمجھتی تھی۔

ڈینو کو کھانا وانا کھلا کر ہم اس سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ رئیس احمد اسے واپس لے جانے پہنچ گیا۔ حسب معمول اس نے باہر ہی سے دستک دے کر ڈینو کو بلانا شروع کر دیا۔ سلیم کئی دنوں سے رئیس کی پردہ نشینی پر جھلایا ہوا تھا۔ غصے سے بولا "اندر آجاؤ' یہاں تمہیں کوئی منہ میں نہیں ڈال لے گا۔" رئیس احمد پھر بھی نہیں آیا تو سلیم گیا اور اسے کھینچ کر اندر لے آیا۔ ہمارے درمیان کرسی پر پٹختے ہوئے بولا "جتنا شرمانا ہے یہاں بیٹھ کر شرما لو۔ ویسے حیرت ہے تمہاری شرم پر......... جب آنا چاہئے تب آتی نہیں اور جب ضرورت نہیں ہوتی تب سر پر سوار رہتی ہے۔ اور میرے خیال میں تو تمہیں شرمانے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ تم نے ایسا کون سا شرمناک کام کیا ہے۔ سفارشی ٹٹو اور رشوت خور تو اور بھی بے شمار ہیں۔ اپنے کسی راست باز افسر کے ہاتھوں ان کی چھترول بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو زیادہ دل سے نہیں لگانا چاہئے۔ پنجابی کی مثال ہے "دو پئیاں وسرگیاں" یعنی دو چانٹے پڑ گئے اور بھول گئے۔ عزت کا کیا ہے یہ تو آنی جانی شے ہے۔ بس کارخانہ سلامت رہنا چاہئے۔ ان لوگوں کو بھلا کیا معلوم کہ ایک کلرک بیچارے کو قالینوں کا کارخانہ لگانے میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ شاباش ہے تمہاری زندگی پر۔"

رئیس احمد بری طرح خجل ہو رہا تھا۔ سلیم کی تیز تیکھی باتوں نے اس کا رنگ پیلا کر دیا تھا۔ ہکلا کر بولا "یار بابری پہلوان' دراصل......... میں نے........."

"پھر وہی شرمندگی" سلیم نے زہرخند سے اس کی بات کاٹی "رئیس صاحب مجھے تو آپ کی شرم سے شرم آرہی ہے۔ آخر ایسا کیا برا کر لیا ہے آپ نے۔ اگر شاہدہ کو بنا سنوار کر آپ نے حسنی صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو اس میں کون سی قیامت آگئی۔ یہ کوئی آپ کی بہن تھوڑی تھی۔ اور وقت پڑنے پر تو آپ جیسے لوگ بہنوں کو بھی......... خیر چھوڑیں۔ یہ تو معمولی باتیں تھیں۔ مجھے صرف ایک بات پر دکھ ہے کہ آپ نے اس رات ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ اگر آپ نے ہٹ دھرمی چھوڑ کر ہمیں بتا دیا ہوتا کہ حسنی صاحب ائرپورٹ روانہ ہو چکے ہیں تو کئی مشکلات کم ہو سکتی تھیں۔ یقین کریں مجھے بڑا غصہ آیا تھا۔ جی چاہتا تھا کھوپڑا شریف کھول دوں آپ کا........."

سلیم دیر تک رئیس کو ایسے ہی "باتوں کے جوتے" رسید کرتا رہا۔ رئیس کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ خجالت سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ وہ ابھی غصے میں آکر پھٹ پڑے گا کبھی لگتا کہ یونہی شرماتا چلا جائے گا۔ ڈینو رئیس کی اس حالت سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چہرہ تو مسکین بنا رکھا تھا لیکن دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ کوٹھی میں قیام کے دوران رئیس احمد نے دستی نلکا چلوا چلوا کر اس کی جو درگت بنائی تھی اس کے بدلے آج اس کا دل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں رئیس احمد روہانسا ہو گیا۔ لجاجت سے کہنے لگا۔

"بابری پہلوان' بس اب جانے بھی دو۔ حسنی صاحب پہلے ہی مجھ سے بہت خفا ہیں۔ میں آپ سے سفارش کرانا چاہتا تھا لیکن آپ تو میرا رہا سہا حوصلہ بھی توڑ رہے ہیں۔ اگر ان باتوں میں سے آپ نے کوئی ایک بات بھی ان کے سامنے کہہ دی تو یقین رکھیں وہ مجھے معطل کرا دیں گے۔"

سلیم نے کہا "معطل ہونے سے تمہیں کیا فرق پڑ جائے گا۔ بلکہ ایک طرح سے تمہارے حق میں بہتر ہی ہو گا۔"

رئیس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "بہن کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے' میں بال بچے دار آدمی ہوں۔"

میں نے سلیم سے کہا کہ وہ اب اس موضوع کو چھوڑ دے۔ کافی کہہ سن لیا ہے۔ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اس دوران باورچی خانے سے سالن جلنے کی ہلکی سی بو آئی میں سالن دیکھنے کے بعد واپس آئی تو رئیس اور ڈینو جانے کے لئے تیار تھے۔

ڈینو کے جانے کے بعد میں دیر تک برآمدے میں ٹہلتی رہی اور عشرت کے بارے سوچتی رہی۔ اسے کیا واقعہ پیش آسکتا تھا..........؟ بادل اب کافی گہرے ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بوندیں پڑنے لگتی تھیں۔ سلیم ساتھ والے کمرے میں ریڈیو لگائے بیٹھا تھا۔ اسی طرح ریڈیو سنتے سنتے وہ سو جاتا تھا۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلتی تھی تو کھڑکھڑ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ روزانہ مجھے اس کے کمرے میں جا کر ریڈیو بند کرنا پڑتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا کہ اگر وہ سوگیا ہے تو ابھی ریڈیو آف کر دوں تاکہ رات کو سردی میں لحاف سے نہ نکلنا پڑے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ سوچ کے ٹیڑھے میڑھے رستوں پر بھاگتے بھاگتے نہ جانے کس وقت نیند نے بیداری کی انگلی پکڑی اور اسے ان دیکھی وادیوں میں لے گئی.......... دوبارہ میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک کے سبب کھلی۔ دستک ایک بار پھر ہوئی تو میں نے لیٹے لیٹے پوچھا کون؟ جواب میں سلیم کی آواز سنائی دی۔ "ثناء! میں ہوں دروازہ کھولو" میں نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ سر پر لیا اور بستر سے اتر آئی۔ کمرے میں بلب بدستور روشن تھا۔ یہ بلب ساری رات روشن رہتا تھا۔ میں اندر سے کنڈی چڑھانا بھی نہیں بھولتی تھی۔ مجھے سلیم پر تو اعتماد تھا لیکن ان حالات پر اعتماد نہیں تھا جن سے وہ اور میں گزر رہے تھے۔ وہ شب ایک تلخ یاد کا خار بن کر میرے حلق میں چبھی ہوئی تھی جب سلیم نشے میں دھت میرے کمرے میں چلا آیا تھا اور جب میں نے اسے عشرت کی طرف جانے سے روکا تھا۔ تو وہ دیوانے شخص کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا تھا.......... یہی وجہ تھی کہ سلیم کی آواز سن کر بھی میں نے فوراً دروازہ نہیں کھولا۔

"کیا بات ہے سلیم.........." میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ آواز سے اندازا ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔

"سلیم! صبح کر لینا" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ اس وقت کیا ہے۔ میں کھا جاؤں گا تمہیں؟" وہ بگڑ کر بولا۔ میں نے غور کیا لیکن اس کے لب و لہجے میں نشے کی جھلک نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آئی کہ دروازہ کھول دوں۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے ارادہ بدل دیا۔ میری خاموشی طویل ہوئی تو اس نے ذرا شدت سے دروازے پر دستک دی اور بھڑک کر بولا "کیا ہوا ہے۔ جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟" میرا ہاتھ دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھا مگر میں نے مضبوط ارادے سے اسے پھر روک لیا۔

"ثناء!" اس نے پھنکار کر کہا "دروازہ کھولو" میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں' اور دوں بھی یا نہیں۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے بدلے بدلے سے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ثناء! میں تجھے کہتا ہوں دروازہ کھول.......... ورنہ.......... توڑ دوں گا میں" اس کا لہجہ مجھے خطرے کا احساس دلانے لگا۔ میں جانتی تھی کہ اس کا پارہ چڑھا ہے تو اب چڑھتا ہی جائے گا۔ میں دیوار سے سر ٹکا کر اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے زور زور سے دروازے پر مکے برسائے اور پھنکار کر بولا "ثناء! دروازہ کھول۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھول۔ میں کہہ رہا ہوں کھول دروازہ.........." اس کی آواز دم بدم بلند ہوتی جا رہی تھی اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پڑوسیوں میں سے کوئی سن سکتا ہے۔ دروازے کی کنڈی کوئی ایسی مضبوط نہیں تھی اور سلیم کے سامنے تو اس کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ وہ باآسانی اسے توڑ کر اندر آسکتا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں سے کنڈی کھلوانا چاہتا ہے۔ میں سخت کشمکش میں تھی۔ اس دوران وہ بے پناہ غصے سے دیواروں پر مکے برسانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ابھی کسی دیوار میں سوراخ ہو جائے گا۔ وہ مجھے صلواتیں سنا رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔ آخر چیخ کر بولا۔

"مرتی رہ یہیں۔ سڑتی رہی یہیں۔ روتی رہ اپنے پیدا کرنے والوں کو.......... میں جا رہا ہوں.......... اگر باقی زندگی میں کبھی تجھے اپنی صورت دکھاؤں تو اپنے باپ کا نہیں۔ ذلیل عورت.......... کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو.......... کون سے موتی لگے ہوئے ہیں تجھے۔ میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر.......... کمینی' بدخصلت' دغاباز.........."

اس نے مجھ پر گفتنی و ناگفتنی صلواتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر مجھے مختلف آہٹوں

سے اندازہ ہوا کہ وہ تند بگولے کی طرح اپنے کمرے میں چکرا رہا ہے اور اپنا مختصر سامان اکٹھا کر رہا ہے......... آخر اس کے بھاری اور مشتعل قدموں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ مجھے اس اجنبی چار دیواری میں تنہا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ خطرات کے نرغے میں اور مصائب کی یلغار میں اور اسے اس بے حسی تک پہنچانے والی میں ہی تھی۔ میں ہی تو تھی جس نے اس کے پندھار کو بار بار توڑا تھا اور اس کی عزت نفس کو ان گنت چرکے لگائے تھے۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "ثناء اسے روک لو۔ اس آخری سہارے کو خود سے جدا نہ کرو۔ ان لمحوں کو گرفت میں لے لو جو تمہیں ساری زندگی کا پچھتاوا دے سکتے ہیں۔ اتنی کٹھور اتنی سنگدل نہ بنو" "میرے کانپتے ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھے۔ کنڈی گرا کر میں نے دروازہ کھولا سلیم تیز قدموں سے بیرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے پکارنا چاہا لیکن آواز حلق میں کہیں اٹک کر رہ گئی۔ صدیاں گزر گئیں......... لیکن مشرقی عورت کی یہ آواز......... سینے سے ہونٹوں تک کا فاصلہ طے نہیں کر سکی اور شاید کبھی نہ کر سکے۔ میں کمرے کی دہلیز پر گنگ کھڑی رہی اور وہ بیرونی دروازے کی دہلیز پار کر کے تاریک گلی میں گم ہو گیا۔ فرحان کی موت کے بعد میری آنکھیں بنجر ہو چکی تھیں۔ اگر میری آنکھوں میں آنسو ہوتے تو شاید میں اس رات اتنا روتی کہ اس ویران چار دیواری کو اشکوں سے دھو ڈالتی۔ میرا سینہ پھٹنے لگا اور آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج ایک بار پھر فرحان کی جدائی جیسا صدمہ مجھ پر گزرا ہے۔ میں رات بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ اور تاریک مکان کے اندر چکراتی رہی اگر خدا پر میرا ایمان نہ ہوتا تو شاید وہ رات میری خودکشی کی رات ہوتی۔ رات آخری پہر میں نے جلتی ہوئی آنکھوں پر دیر تک ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور نڈھال سی ہو کر بستر پر گئی۔ ذرا آنکھ لگی تو ڈراؤنے خوابوں نے میرا ہانکا شروع کر دیا۔ درندوں اور عفریتوں سے بھرے ہوئے ایک کالے جنگل میں میں تنہا تھی۔ تیز نوکیلے پنجے' خونی جبڑے اور روشن آنکھیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں۔ میں کسی غمخوار کو ڈھونڈ رہی تھی......... پکار رہی تھی۔ وہ کون تھا؟ شاید میرے ابو تھے جنہوں نے مجھے نہر سے نکال کر سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یا فرحان تھا جس کی چمکیلی آنکھیں مجھ سے محفوظ مستقبل کا وعدہ کرتی تھیں۔ یا سلیم تھا جو میری خاطر پوری دنیا سے ٹکرا

جانے کا عزم رکھتا تھا۔ میں اس شخص کو پکارتی رہی اور اس جنگل کے خطرناک دلدلی راستوں پر بھٹکتی رہی۔ ہولناک آوازوں نے میرا تعاقب جاری رکھا۔ نوکیلے پنجے میرے جسم پر سرسراتے رہے۔ آخر میں نے ایک صدیوں پرانے درخت کی شاخ سے ایک لاش جھولتے دیکھی۔ لاش کا چہرا دوسری جانب تھا مگر اس کا لباس دیکھ کر میرا دل رونے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لاش میرے کسی قریبی عزیز کی ہے۔ کوئی بہت قریبی عزیز۔ میں نے چیخیں ماریں اور خود کو یقین دلایا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ لاش کا چہرہ دیکھنے سے پہلے مجھے بیدار ہو جانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چہرہ دیکھ کر میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ میرے دل نے کہا۔ یہ تاریک جنگل دراصل نیند ہے۔ میں اس جنگل سے نکل جاؤں۔ میں بیدار ہونے کی کوشش کرنے لگی مگر کالے جنگل کی بلاؤں اور عفریتوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میں خود کو چھڑانے کے لئے مچلنے لگی' تڑپنے لگی......... ایکا ایکی ایک آہ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ سخت سردی میں جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میں پھٹی ہوئی نظروں سے چھت کو گھورنے لگی اور سوچنے لگی کہ خواب میں نظر آنے والی لاش کس کی تھی؟ دل ہولنے لگا تو میں نے خود کو تسلی دی' خوابوں کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔ دیکھا کچھ اور جاتا ہے اور پایا کچھ اور جاتا ہے......... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب تقدیر خراب ہو تو صرف اچھے خوابوں کی تعبیریں الٹتی ہیں......... اور میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ علی الصبح ہاکر نے تازہ اخبار چار دیواری کے اوپر نیم پختہ صحن میں پھینکا آواز سن کر میں اخبار پکڑنے گئی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی کی ایک اور منحوس خبر سے آگاہ ہونے جا رہی ہوں۔

اخبار لے کر میں اندر آ گئی۔ پہلے ہیڈ لائن پر نظر دوڑائی پھر دوسری خبریں دیکھنے لگی۔ نچلے حصے میں ایک تین کالمی سرخی پر نگاہ پڑی اور جم کر رہ گئی۔ سرخی کے نیچے ایک تصویر تھی اس تصویر کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ زمین آسمان گھوم رہے ہیں اور میں زمین سے اکھڑ کر کربناک فضاؤں میں بلند ہوتی جا رہی ہوں۔ یہ تصویر میرے چھوٹے بھائی تنویر اور بھابی صبیحہ کی تھی۔ یہ ان کی شادی کی تصویر تھی جس میں بھابی کرسی پر بیٹھی تھی اور بھائی ہاتھ پشت پر باندھے ان کے پاس کھڑے تھے۔ خبر کی سرخی تھی قتل کی وحشیانہ واردات دو بچوں سمیت پورے خاندان کو ذبح کر ڈالا۔ نیچے لکھا تھا "گزشتہ شب جواں

سال الیکٹریکل انجینئر تنویر محمود کو ان کے اہل خانہ سمیت سوتے میں قتل کر دیا گیا۔ قتل کی یہ بہیمانہ واردات آج رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ نامعلوم قاتل دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ تنویر محمود کے بیڈ روم تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے ایک ملازم کے سر پر بندوق سے ضربیں لگائیں اور اسے بے ہوش کر دیا۔ بعد ازاں وہ ایک جالی کاٹ کر کمرے میں گھس گئے.........."

یہاں تک پڑھتے پڑھتے اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھوں کے سامنے رنگین دائرے سے ناچے اور مجھے لگا کہ میں سر تھام کر کرسی سے گر رہی ہوں..........
دوبارہ حواس بحال ہوئے تو کوئی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ ایک دوسرے ہمدرد نے میرے سر کو عقب سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ہمارے پڑوسی تھے۔ میاں بیوی نے مجھے برآمدے میں گرتے دیکھ لیا تھا۔ اور دیوار سے سیڑھی لگا کر پاس آگئے تھے۔ پڑوسن نے مجھے ہوش میں آتے دیکھا تو ہکلا کر بولی۔

"نسرین.......... کیا ہوا تھا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟؟"

اس کا اشارہ سلیم کی طرف تھا۔ میری نگاہیں قریب گرے ہوئے اخبار پر پڑیں۔
پلک جھپکتے میں سب کچھ یاد آگیا۔ اپنے چہیتے بھائی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوما اور میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ پڑوسن خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میری دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں ایک بار پھر اخبار پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں تک میں نے پڑھا تھا وہاں سے آگے پڑھنے لگی۔
لکھا تھا کہ قاتلوں نے پہلے میاں بیوی کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد دونوں بچوں کو بھی ذبح کر دیا۔ تنویر محمود مسز تنویر محمود اور بچی ثمعین موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ جبکہ چار سالہ ٹیپو کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ قاتل جب فرار ہو رہے تھے۔ ساتھ والی کوٹھی کے مسلح چوکیدار نے انہیں دیکھ لیا۔ بڑی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے انہیں للکارا مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چوکیدار کا کہنا ہے مجرموں میں سے دو افراد نے چہرے کو رنگ دار پگڑی سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ سب کے سب دیہاتی نظر آتے تھے۔ چوکیدار کے اس بیان کے بعد بعض لوگ اس گھناؤنی واردات کی کڑیاں جرنلسٹ فرخندہ اور اس کے منگیتر کے قتل سے ملا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اس واردات میں بھی دیہاتی لباس والے افراد نے حصہ لیا تھا۔"

خبر مکمل کرنے کے بعد میری وحشت زدہ نگاہیں ایک بار پھر بھائی اور بھابی کی مسکراتی تصویر پر جم گئیں۔ کیا یہ دونوں چہرے اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ "یہ جھوٹ ہے.......... یہ جھوٹ ہے" میں نے ہیجانی کیفیت میں چلاتے ہوئے اخبار کے پرزے کر ڈالے اور ایک بار پھر نڈھال ہو کر گر گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ بس دھندلے دھندلے مناظر لوح ذہن پر محفوظ ہیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں میرے گرد جمع تھیں' وہ مجھ سے حقیقت حال پوچھنا چاہتی تھیں۔ میں صرف ایک ہی جواب دے رہی تھی۔ "چنگیزیوں نے میرے بھائی کو مار دیا ہے۔ میرے بھائی کے سارے گھر کو قتل کر دیا ہے۔ کوئی مجھے میرے گھر تک پہنچا دو۔ کوئی مجھے میرے بھائی تک پہنچا دو۔"

کسی عورت نے ایک چادر میرے ننگے سر پر ڈال دی اور کسی دوسری نے مجھے جوتا پہنا دیا۔ پھر ایک شخص نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھا۔ میں نے اسے موہنی روڈ کا ایڈریس دیا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص مجھے رکشے میں موہنی روڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں خشک آنکھوں سے رو رہی تھی اور اپنا سر بار بار گھٹنوں پر مارتی تھی۔ شہر کی بھری پری سڑکوں سے گزرتا ہوا رکشہ موہنی روڈ پہنچا اور میرے گھر کے سامنے جا رکا۔ گھر کے دروازے پر اور گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ پریشان چہرے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کئی افراد انہیں کھینچتے ہوئے دروازے سے باہر لا رہے تھے۔ وہ بار بار گھوم کر اندر کی طرف جانا چاہتے تھے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر کے اندر سے آہ و بکا کی فلک شگاف آوازیں آرہی تھیں۔ پتہ نہیں کب میں رکشے سے اتر کر گھر کے صحن میں پہنچ گئی۔ آہ.......... میری آنکھوں کی قسمت میں یہ منظر بھی دیکھنا لکھا تھا۔ سامنے ایک قطار میں بھائی' بھابی' ٹیپو اور ثمعین کے جسم رکھے تھے۔ چار بے گناہ زندگیاں جنہیں ایک "چھوٹے چوہدری" کے بدلے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ چاروں لاشیں ابھی ابھی اسپتال سے لائی گئی تھیں۔ تین سالہ ثمعین بھابی کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ جب کہ چار سالہ ٹیپو علیحدہ چارپائی پر تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں سوتے تھے آج بھی سوئے ہوئے تھے۔ مطمئن و پر سکون نیند لیکن آج اس نیند سے جگانے کے لئے کوئی صبح طلوع ہونے والی نہیں تھی۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ سفید پٹیاں ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر سروں پر باندھ دی گئی تھیں۔

بھائی اور ٹیپو کے نتھنوں میں روئی رکھی گئی تھی.......... اردگرد کا ہر منظر میری نگاہوں میں دھندلایا ہوا تھا۔ آہ و بکا کی آوازیں کہیں دور بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں بھائی کی لاش سے لپٹ گئی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ پتہ نہیں۔ میں کتنی دیر روتی رہی' اور کیا کیا کہتی رہی۔ پھر میں بھابی کو جھنجھوڑنے لگی "اٹھ جا میری بھابی! ایک نظر میری طرف دیکھ لے ایک بار میرے ہاتھوں کو چھولے "لیکن بھابی کی ناراضگی ابدی ناراضگی میں بدل چکی تھی۔ میں نے دیکھا بھابی کی گردن پر خون آلود پٹیاں تھیں۔ وہ نازک گردن گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ پھر میں ثمین کے رخساروں پر بوسے دینے لگی۔ میرا جی چاہا اس ننھی سی گڑیا کو اپنی سینے سے لگا کر اتنی زور سے بھینچوں کہ وہ میرے جسم میں سما جائے' پھر کوئی ہاتھ اسے کفن پہنا سکے اور نہ منوں مٹی کے نیچے دبا سکے۔

"ثمین.......... ثمین میری جان آنکھیں کھول۔ دیکھ تیری پھوپھو کتنی دور سے آئی ہے.......... کب سے تیری آواز کو ترس رہی ہے۔ ایک بار اپنی آواز سنا دے۔ صرف ایک بار۔"

وہ لمحے جگر پاش تھے.......... ان چار خونچکاں میتوں کے لئے میرے پاس رونا تھا۔ ہچکیاں تھیں لیکن آنسو نہیں تھے۔ ہر ہچکی کے ساتھ نفرت کا ایک گولا سا میرے حلق میں جا اٹکتا تھا۔ یہ نفرت اس قاتل کے لئے تھی جس نے اپنے بھائی کے بدلے میں میرے بھائی کے پورے گھرانے کو خاک و خون میں لوٹا دیا تھا۔ جب میں ٹیپو کے چھوٹے چھوٹے سرد ہاتھ چوم رہی تھی۔ ایک عورت نے گھسیٹ کر مجھے پیچھے ہٹا دیا' میں نے گھوم کر دیکھا یہ میری بڑی بھابی کی کوئی رشتے دار تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ یہ نفرت بھری آنکھیں دیکھ کر میں ہوش میں آگئی۔ میں سمجھ گئی کہ اگر چند منٹ بھی یہاں رہی تو یہ لوگ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میں نے اس صحت مند عورت سے اپنا بازو چھڑایا اور عورتوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں گھر سے باہر تھی۔ باہر نکلنے کے لئے میں نے ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ استعمال کیا تھا۔ میرے معصوم بچپن کی بہت سی کہانیاں اس چور دروازے سے وابستہ تھیں۔ یہ چور دروازہ ہم بہن بھائیوں کا دوست تھا۔ کبھی ہمیں امی کی ڈانٹ سے بچاتا تھا' کبھی ابو کی

مار سے اور کبھی تفریح کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ ساون کی جھڑیوں میں جب ماں اور دادی کی نگاہیں ہم پر نگران ہوتی تھیں تو اسی دروازے سے نکل کر ہم گلیوں بازاروں میں "کالیاں اٹاں کالے روڑ" پکارا کرتے تھے۔ آج اس اجنبی گھر میں یہ "دوست دروازہ" ایک بار پھر دوستی کا حق نبھا رہا تھا۔ مجھے پولیس کی دسترس سے بچا کر یہاں سے نکال رہا تھا.......... میں بھاگ رہی تھی لیکن پولیس سے نہیں ان پابندیوں سے جو مجھے میرے دشمن سے دور کر سکتی تھیں اور میں اس دشمن سے دور ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں تھا نہ جانے کس گھڑی اور کس گلی میں زندگی کی شام ہونے والی تھی۔ "سانس سورج" ڈوبنے سے پہلے میں دنیا کی مغرور ترین گردن کو چودھری وہاب کے تن سے جدا کر دینا چاہتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے لوہے کا ایک حقیر ذرہ مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے میں چودھری وہاب کی طرف کھنچتی چلی جا رہی ہوں۔ وہ کہاں ہو گا؟ کس جگہ ہو گا' کتنے محافظوں میں ہو گا' مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ میرے آبائی گھر کے صحن میں چار لاشیں پڑی ہیں' میرے لباس میں ایک انتہائی تیز دھار آلہ ہے اور مجھے راوی کے پل سے جھنگ جانے والی بس پکڑنی ہے۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں نے ایک خالی رکشے کو ہاتھ دیا اور پل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میرے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی نہیں اور کرایہ دینا پڑا تو کیا کروں گی۔ پل پر پہنچ کر رکشا رکا۔ میں نے رکشے والے سے کہا "بھائی میرے پاس پیسے نہیں' یہ میری کلائی کی گھڑی رکھ لو اور کچھ پیسے دے دو مجھے جھنگ جانا ہے" رکشے والے نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرا سینہ ابھی تک ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی آفت کی ماری ہوں۔ کرایہ چھوڑ کر وہ آگے چل دیا۔ میں کلائی کی گھڑی ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ جب ایک تیز رفتار کار میرے پاس آکر رکی۔ اس میں دو آدمی سوار تھے۔ ایک نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا "بی بی! ہمیں چودھری شہاب نے بھیجا ہے پولیس تمہارے پیچھے آرہی ہے جلدی سے بیٹھ جاؤ۔" میں نے غور سے بولنے والے کا چہرہ دیکھا۔ وہ چودھری شہاب کے ساتھیوں میں تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری داڑھی اس کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہی پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شاہدرہ کی طرف روانہ ہو

گئی۔ (اس بات کا پتہ مجھے کئی دن بعد چلا کہ داڑھی والا چودھری شہاب سے ناطہ توڑ کر وہاب چنگیزی کے ہرکاروں میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی تھی) ابھی ہم جی ٹی روڈ پر چند فرلانگ آگے گئے تھے کہ گاڑی میں کسی کیمیکل کی تیز بو محسوس ہوئی۔ پھر مجھے اندزہ ہوا کہ گاڑی میں ایک چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ پاتی نشست کے پیچھے سے دو ہاتھ برآمد ہوئے اور انہوں نے ایک بدبودار رومال سے میرا منہ ڈھانپ دیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو رات تھی۔ آنکھ کھل کر بھی پوری طرح کھلی نہیں تھی۔ کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ محرابی کھڑکیوں پر رنگ دار پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور چھت پر میلا سا فانوس۔ میں ایک آرام دہ مسہری پر لیٹی تھی۔ میرے سرہانے لکڑی کی تپائی پر ایک ٹرے میں پھل رکھا تھا۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا۔ کچھ دور صوفے پر ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ وہ صورت سے ہندوستانی فلموں کا سیٹھ یا ٹھاکر دکھائی دیتا تھا۔ سامنے میز پر امپورٹڈ سگریٹ کی ڈبیا رکھی تھی اور اس نے منہ میں پان دبایا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا۔ پھر اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور کمرے میں نیم تیرگی چھا گئی۔ سیٹھ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف بڑھا بعد ازاں جو کچھ ہوا اس کی توقع سیٹھ نما شخص نے ہرگز نہیں کی ہوگی۔ میں نے کسی دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود بھرپور مزاحمت کی۔ کمرے کی کئی اشیاء اٹھا کر میں نے اس کے سر پر توڑ دیں۔ وہ گھبرایا اور ہانپتا ہوا چیختا چلاتا باہر نکل گیا۔ اس کی روانگی کے چند لمحے بعد ایک موٹی بھدی منحوس صورت عورت اندر آئی۔ اس کے ساتھ ایک ٹھگنے قد کا مرد بھی تھا۔ ان دونوں نے مجھے بے دریغ لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں نیم بے ہوش تو پہلے ہی تھی مکمل بے ہوش ہو کر گر گئی۔

نجانے کتنے گھنٹوں یا کتنے پہروں بعد دوبارہ آنکھ کھلی۔ میری پیشانی اور دائیں رخسار پر پٹیاں تھیں۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں اسی مسہری پر اسی کمرے میں لیٹی تھی لیکن اب دن کا وقت تھا۔ جالی دار کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں اب یہ بات ذہن پر زور ڈالے بغیر بھی سمجھ

سکتی تھی کہ اس وقت کیسے لوگوں کی دسترس میں ہوں۔ ایسی چار دیواری میں ہونا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ہاں.......... گناہ کی چار دیواری میں ہونا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ایسے حادثوں کے بعد شریف عورتیں مرجاتی ہیں۔ مگر میں زندہ تھی اور میرے پاس جواز بھی تھا۔ کسی کی کٹی ہوئی انگلیاں اور ٹوٹتی ہوئی سانسیں جواز تھیں۔ کسی امی جان کہنے والے کا خاموش دہن جواز تھا.......... کون مجھے مار سکتا تھا اور کون مرنے پر مجبور کر سکتا تھا.......... موٹی بھدی عورت جس کا نام باجو تھا اور مرد جسے وہ طفیلا کہتی تھی سات آٹھ روز میری چوٹوں کا علاج کرتے رہے۔ طیش میں انہوں نے مجھے بری طرح پیٹ ڈالا تھا لیکن اب فکرمند تھے کہ میرے چہرے پر کوئی نشان نہ پڑے۔ مرہم پٹی میں وہ ایک مہنگی آئنٹمنٹ لگا رہے تھے جو زخم کا داغ نہیں رہنے دیتی۔ دو ہفتے میں میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس دوران میں اپنے اور اس چار دیواری کے بارے رات دن سوچتی رہی۔ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ نما گھر میں بند تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فلیٹ کسی بلڈنگ کی چوتھی یا پانچویں منزل پر واقع تھا۔ فلیٹ کے کھڑکیاں دروازے لوہے کے تھے اور ایک نہ ایک مسلح شخص چوبیس گھنٹے دروازے پر موجود رہتا تھا۔ باجو اور طفیلا بھی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ چکمہ دے کر یا جدوجہد کر کے یہاں سے نکل جانا ممکن نہیں تھا' مجھے کھانے کے ساتھ کوئی ایسی دوا دی جا رہی تھی کہ جاگنے کے بعد بھی ہر وقت نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے نشے کے اس جال کو توڑنے کی بہت کوشش کی۔ غسل خانے میں جا کر دیر تک سر پر سرد پانی ڈالا۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے ایک کھڑکی کھول کر جالی سے منہ لگایا اور اور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اس چیخ و پکار کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ باجو اور طفیلا نے ہتھوڑی کی ضربوں سے کھڑکیوں کی چٹخنیاں اس طرح ٹیڑھی کر دیں کہ میں کوشش کے باوجود انہیں نہ کھول سکوں۔

دو روز بعد کا واقعہ ہے میں نشہ آور دوا کی غنودگی میں پڑی ہوئی تھی۔ باجو اور طفیلا اندر آئے۔ آج طفیلے کے کندھے سے بھی ایک پستول جھول رہا تھا۔ شاید یہ مجھے ڈرانے کے لئے تھا۔ انہوں نے مجھے نرم ملائم لہجے میں سمجھانا شروع کیا کہ جہاں میں آچکی ہوں وہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ لٰہذا میرے لئے بہتر ہے کہ خود کو حالات کے مطابق ڈھال لوں۔ مختصر یہ کہ اپنی غلیظ زبانوں سے وہ مجھے گناہ کی ترغیب دینے لگے اور سمجھانے

لگے کہ ان کے کہنے پر چل کر نہ صرف میں زندہ رہوں گی بلکہ آرام کے دن بھی گزاروں گی۔ دوسری صورت میں نہ صرف میری ہڈی پسلی بلکہ زندگی کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ مجھے ایک طویل لیکچر پلانے کے بعد وہ دونوں چلے گئے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ایک شرمیلے سے نوجوان لڑکے کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ نہ جانے میرے اندر اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ میں اپنے ڈولتے ہوئے جسم کو سنبھال کر تیزی سے اٹھی اور لڑکے پر جھپٹ پڑی۔ میرے ایک ہی دھکے سے وہ الٹ کر صوفے پر جا گرا۔ اس کی پیشانی کسی چیز سے ٹکرائی اور خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے اسے تھپڑوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ اس بلائے ناگہانی کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی بوشرٹ پھٹ گئی اور کوٹ میں لگا ہوا گلاب کا پھول پتی پتی ہو کر بکھر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ چیخنے چلانے لگتا' دروازہ دھماکے سے کھلا اور باجو اور طفیلا اور ایک دوسرا شخص اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے تھر تھر کانپتے لڑکے کو بمشکل میرے ہاتھوں سے چھڑایا اور سہارا دے کر باہر لے گئے۔ باجو اور طفیلا ایک بار پھر مجھ پر پل پڑے۔ باجو نے میری گردن دبوچ کر مجھے قالین پر گرا دیا اور طفیلا میرا بازو مروڑ مروڑ کر مجھے گالیاں دینے لگا۔ میرا خیال تھا کہ آج تو وہ میرا قصہ تمام ہی کر دیں گے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چند تھپڑ مارنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے۔ طفیلا پھنکار کر باجو سے بولا۔

"تم بھی کسی کی بات نہیں مانتی ہو۔ تجھے کہہ رہا تھا کہ پہلے اس کا دماغ اچھی طرح ٹھیک کر لے۔"

باجو نے ہانپتے ہوئے کہا "اور کیسے ٹھیک کروں دماغ' تین گولیاں کھلائی ہیں کچھ اثر ہی نہیں ہوتا اس پر۔"

دونوں ایک دوسرے پر برستے ہوئے باہر چلے گئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھ گئی تو میں قالین سے اٹھی اور دروازے سے کان لگا کر باہر کی باتیں سننے لگی۔ وہ لوگ میری ہٹ دھرمی سے جھنجلائے ہوئے تھے اور مجھے سیدھا کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ اس لڑکے کی بزدلی پر بھی انہیں حیرت تھی جو ابھی مجھ سے پٹ کر گیا تھا۔ میں ڈگمگاتی ہوئی دوبارہ مسہری پر ڈھیر ہو گئی۔ آج واقعی مدہوشی روزانہ سے زیادہ تھی۔ مجھے خدشہ محسوس

ہوا کہ اگر پھر کوئی بھیڑیا میرے زندہ جسم سے گوشت کھانے آیا تو شاید میں معقول مزاحمت بھی نہ کر سکوں۔ مجھے وہ کتاب یاد آئی جو میں نے کالج کی لائبریری میں لے کر پڑھی تھی اور جس میں قحط بنگال کا حال تفصیل سے درج تھا۔ مصنف نے ایک جگہ لکھا تھا "دور دراز بستیوں میں قحط کی اتنی شدت ہے کہ لوگ اپنے جھونپڑوں سے باہر پڑے پڑے دم توڑ جاتے ہیں۔ آوارہ کتے اور گیدڑ آتے ہیں اور مردہ نیم مردہ لوگوں کے جسموں سے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو دیکھا جو جھونپڑے سے باہر بے حرکت پڑا راشن کا انتظار کر رہا تھا اور گیدڑ اس کی پنڈلی سے گوشت کھا رہے تھے۔" آج میں بھی خود کو اسی قحط زدہ بنگالی کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ میں اب تک خود پر جھپٹنے والے کتوں کو پیچھے ہٹاتی رہی تھی لیکن اب مجھ میں یہ سکت بھی ختم ہو رہی تھی۔ میں اپنی بھوک سے بہت کم کھانا کھا کر باقی غسل خانے میں بہا دیتی تھی پھر بھی خواب آور دوا کسی بلا کی طرح میرے حواس کو اپنے مضبوط پنجوں میں دبوچے رہتی تھی۔ غنودگی کی شدید لہر کو محسوس کر کے میں اٹھی اور اپنا سر غسل خانے کی ٹونٹی کے نیچے رکھ دیا۔ آنکھوں میں چھائی ہوئی دھند کچھ کم ہوئی تو واپس آئی اور سردی کے باوجود پنکھا چلا کر بیٹھ گئی۔ میرے دل کی گہرائی سے دعا نکل رہی تھی "اے مالک! تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ دل کی گہرائیاں تجھ پر آشکار ہیں۔ مجھے توفیق دے کہ میں اپنی آخری سانس تک مزاحمت جاری رکھ سکوں.........." اکڑوں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر مجھے جھپکی سی آگئی۔ آنکھ کھلی تو دروازے کی دوسری طرف سے تیز تیز باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے پاس جا کر سنا طفیلا کہہ رہا تھا۔

"ذرا دھیان سے استاد......... ہاتھ پاؤں بچا کے"

جواب میں ایک بھاری بھرکم کرخت اور کھردری آواز سنائی دی "اوئے کوئی چاقو چھری تو نہیں ہے اس کے پاس؟"

"نہیں استاد" طفیلے نے کہا۔

"تو پھر مرا کیوں جا رہا ہے......... بڑے پاپڑ بیلے ہیں تیرے استاد سائیں نے' ذرا کھول تو دروازہ۔"

میں ڈگمگاتی ہوئی جا کر پھر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ تالہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد

پٹ وا ہوئے اور کوئی وزنی قدموں سے چلتا ہوا اندر آگیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ میری طرف آیا۔

"اوہ چھوری" کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ سخت حیرت کے عالم میں میں نے جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے بخشو سولنگی کھڑا تھا۔......... وہی شخص جس کے بارے میں مجھے سلیم نے بتایا تھا کہ وہ مفرور ڈاکو ہے اور جنوبی علاقے سے پرندوں کی کھیپ لے کر آیا ہے۔ بخشو سولنگی کو میں نے سب سے پہلے خان رحیمی کی کوٹھی میں فنکشن کی رات کو دیکھا تھا۔ بعد ازاں مرغی خانے میں اس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور پھر سور کے شکار کے دوران عشرت کے معاملے پر اس سے سخت جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ عشرت کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے ریوالور نکال لیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس وقت سولنگی کو سامنے دیکھا تو میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ سولنگی کے لئے بھی میری موجودگی حیرت ناک تھی۔ وہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے انگلی میری طرف اٹھائی اور حیران لہجے میں بولا۔

"تم......... تم یہاں؟"

میں مدہوش آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنی مونچھوں کو مروڑتا رہا پھر میرے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر سندھی ٹوپی تھی۔ اس کے جسم پر بے پناہ بال تھے اور ایسی بو آ رہی تھی جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی گوشت خور جانور ہو۔ میں نے ہراساں نظروں سے اس کا کرخت چہرہ دیکھا۔ قدرت نے ہم دونوں کو کس جگہ اکٹھا کیا تھا۔ ایک وہ دن تھا جب میں نے بڑی دلیری سے اس پر ریوالور تان لیا تھا اور اسے مونچھ نیچی کر کے پیچھے ہٹنا پڑا تھا اور ایک آج کی رات تھی جب میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا اس کا رویہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر سگریٹ سلگایا اور مٹھی میں دبا کر کش لینے لگا۔ "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں بیگم سائیں؟" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ مجھ پر تو نیند طوفانی لہروں کی طرف یلغار کر رہی تھی۔ بار بار میرے سر کو جھٹکا لگتا اور مجھے پتہ چلتا کہ میں گرتے گرتے بچی ہوں۔ میری حالت دیکھ کر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اٹھ کر باہر گیا اور چند لمحے بعد واپس آگیا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا

وہ چائے کا کہنے گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد طفیلا ایک ٹرے میں چائے کے برتن سجائے اندر داخل ہوا۔ طفیل برتن رکھ کر چلا گیا تو سولنگی نے ایک کپ میں چائے انڈیلی اور بغیر دودھ چینی ملائے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ خوب رنگ نکلی ہوئی کڑک چائے تھی۔ سولنگی کے کہنے پر میں گھونٹ گھونٹ پوری پیالی پی گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا خمار ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سولنگی نے اصرار کر کے مجھے نصف پیالی اور پلا دی۔ اس کی یہ ترکیب کارگر رہی۔ میرے حواس پر سے نیند کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر جب میں کمرے میں واپس آئی تو خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ یہ جان کر مجھے اطمینان ہو رہا تھا کہ سولنگی کا رویہ مجھ سے ہمدردانہ ہے۔ وہ میری بپتا سننے کے لئے بے چین نظر آتا تھا لیکن اس سے پہلے میں جاننا چاہتی تھی کہ اس کمرے سے باہر صورت حال کیا ہے اور سولنگی کس حیثیت سے اور کیونکر یہاں پہنچا ہے۔ سب سے زیادہ تجسّس مجھے نواز حسنی اور خان رحیمی کے بارے میں تھا۔ وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟ میرے اس سوال کے جواب میں کہ سولنگی یہاں کیسے پہنچا ہے' سولنگی نے صاف سیدھے لہجے میں بتایا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔

میرے ذہن میں خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا "اس وقت میں کہاں ہوں؟"

سولنگی نے میری آنکھوں کا خوف پڑھ کر سر جھکا لیا۔ دھیمی آواز میں بولا "بیگم سائیں! تم ٹھیک سمجھ رہی ہو......... تم اس وقت بازار حسن کی ایک عمارت میں ہو۔"

آسمان جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے سر پر گرنے لگا۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے......... آہ' یہ دن دیکھنا بھی میری قسمت میں لکھا تھا۔ سفاک درندوں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہاب چنگیزی مجھے اپنے رائل بنگال ٹائیگر کا لقمہ بنا دیتا۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتا؟ وہ تو اس وقت کی سزا تھی جب میں نے ابھی چھوٹے چودھری کو گولی کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اب چنگیزیوں کے نزدیک "انصاف" کے تقاضے کچھ اور تھے۔ غالباً وہ مجھے ذلیل و رسوا کر کے اور گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر مارنا چاہتے تھے۔ میرا دل رونے لگا اور جسم ایک بار پھر ہچکیوں کی زد میں آگیا۔ گھٹنوں میں سر دے کر میں دیر تک ہچکیاں لیتی رہی۔ بار بار مجھے گمان ہوا کہ میری

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح یہ ایک گمان ہی تھا۔ کافی دیر بعد جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سولنگی سے پوچھا کہ نواز حسنی اور خان رحیمی اب کیا کر رہے ہیں؟ میرے اس سوال پر سولنگی خاموش سا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی صاف پڑھی جاتی تھی۔ سگریٹ کا کش لے کر دھیمے لہجے میں بولا "ابھی تک تو کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ نہ ہی خان صاحب نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

میں نے بھڑک کر کہا "کیوں نہیں ہوئی کوئی نئی بات' اب کسی کو اور کیا ثبوت چاہئے وہاب کے کرتوتوں کا' اب اور کیا رکاوٹ رہ گئی ہے اسے پھانسی دینے میں' اسے کیوں نہیں گرفتار کرتے' کیوں سرعام چوراہے پر نہیں لٹکاتے؟"

سولنگی نے میرے جذباتی پن کو نظرانداز کر کے کہا "بیگم سائیں! میں توڑ پھوڑ مار دھاڑ کرنے والا بندہ ہوں۔ مجھے نہیں پتہ یہ پڑھے لکھے سیاسی لوگ کیا داؤ پیچ لڑاتے ہیں۔ مجھے تو جتنا معلوم ہے آپ کو بتا دیا ہے۔ نہ وہاب چنگیزی گرفتار ہوا ہے اور نہ اسے لٹکایا گیا ہے۔"

"مگر کیوں.......... کیوں.......... اب کیا مجبوری ہے؟"

سولنگی مسکرایا "مجبوری تو ہم جیسے لوگوں کی ہوتی ہے' بڑے لوگوں کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ وہاں تو سودے بازی ہوتی ہے۔ جو پیسے دے سکتا ہے وہ ہر سودا اٹھا سکتا ہے.......... بیگم سائیں! تمہارا خیال ہے کہ وہاب الیکشن ہار گیا ہے۔ اس کے جرموں کا ثبوت بھی مل گیا ہے' اس لئے اسے پکڑ لینا چاہئے' یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ الیکشن ہار کر بھی وہاب نے بازی جیت لی ہے۔ حلقے کے ووٹروں نے اسے تو ہرا دیا لیکن اس کے اثر و رسوخ کو نہیں ہرا سکے۔"

میں نے کہا "میں اس کے اثر و رسوخ کی نہیں اس کے جرم کی بات کر رہی ہوں۔"

سولنگی نے جواب دیا "اثر و رسوخ اور جرم کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ وہاب ہار گیا تھا لیکن اس کے کئی ہم خیال اور خیر خواہ جیتے تھے۔ ان میں سے ایک پیر عباس خاں بھی ہے۔ پیر عباس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تم اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پیر عباس کی وجہ سے ہی انڈر سیکرٹری نواز حسنی پر دباؤ پڑا ہے اور وہ اپنا جوش و خروش

سمیٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا ہے۔ خان رحیمی کی ساری سرگرمی نواز حسنی کے ساتھ تھی۔ جب شاخ ہی نہ رہی تو گھونسلہ کیا رہتا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پچھلے ہفتے وہاب چنگیزی بڑی حویلی واپس آگیا ہے اسے کسی طرح کا فکر فاقہ ہی نہیں۔ اس کے کارندے گواہوں کو قابو کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب گواہ ہی کٹہروں تک نہیں پہنچیں گے تو کیسوں میں کیا جان رہے گی۔ اللہ نے چاہا تو قربانی کے ایک دو بکروں پر دفعہ ۳۰۲ لگوا دی جائے گی یا چند ڈشکروں کے لئے آٹھ دس سال تک جیل میں راشن پانی کا انتظام کر دیا جائے گا" میری آنکھوں کے سامنے بھائی تنویر بھابی صبیحہ اور بچوں کی لاشیں گھومنے لگیں۔ فرخندہ اور عابد کے مردہ چہرے تصور میں آئے۔ مجھے لگا میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی یا میں چیختی ہوئی دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گی۔ ایک طرف ظلم کی انتہا تھی' دوسری طرف لاچاری کی انتہا.......... میرے جسم کا رواں رواں نادیدہ آتش میں پھنک رہا تھا۔ میں دیر تک اندر ہی اندر آنسو بہاتی رہی۔ سولنگی سلگتے سگریٹ سے بجھے بجھے کش لے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سولنگی! یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں!؟"

وہ بولا "یہی سوچ رہا ہوں بیگم! سچ پوچھتی ہو تو اس وقت ہر طرف چنگیزیوں کا زور ہے۔ خان رحیمی اور نواز حسنی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ خان رحیمی بوڑھی جان ہے۔ وہ تمہاری حالت کا سن کر پریشان تو ضرور ہو گا لیکن کر کچھ نہیں سکے گا اور اگر کرنے کی کوشش کرے گا تو بھی کامیابی کی امید کم ہے۔ چنگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے' وہ پورے ضلع میں بھوکے کتوں کی طرح اس کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ خان رحیمی کی کوٹھی پر پولیس کی گارد نہ ہو تو شاید وہ ابھی اس پر ٹوٹ پڑیں۔ ایسے میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے خان رحیمی کو تمہارے بارے اطلاع دینی چاہئے.......... ہاں میں نواز حسنی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ مدد کر سکے۔"

میں سولنگی کی باتیں سن سن کر حیران ہو رہی تھی۔ چند دنوں میں یہ کیسا انقلاب آیا تھا۔ چنگیزی کی بجائے نواز حسنی اور خان رحیمی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیسا داؤ مارا تھا اس ابلیسی گھرانے کے چنگیزیوں نے۔"

میں نے سولنگی سے کہا "کیا تم اپنے طور پر کوشش نہیں کر سکتے!؟"

اس نے اپنے بالوں بھرے سینے کو انگلیوں سے سہلایا اور بولا "کر سکتا ہوں اور ضرور کروں گا مگر اس میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔ مجھے یہاں کا ماحول اور کمرے کا اندر باہر دیکھنا ہو گا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں۔ یہ فلیٹ پانچویں منزل پر ہے اور اس فلیٹ کے علاوہ یہاں کم از کم دس فلیٹ اور ہیں۔ ان سب فلیٹوں میں نچلے درجے کی ہی بازاری عورتیں رہتی ہیں۔ ان کے ایجنٹ اور نگران ہیں جو ہر آنے جانے والے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت تو تمہارے اس فلیٹ کے مسلح چوکیدار ہیں۔ لگتا ہے وہاب چنگیزی نے تمہاری حفاظت کا خاص انتظام کرا رکھا ہے۔ میں دو تین دفعہ پہلے بھی اس فلیٹ کے سامنے سے گزرا ہوں۔ مجھے ہمیشہ وہاں ایک یا دو مسلح افراد منڈلاتے نظر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تو تم کہنا چاہتے ہو کہ میں خود کو اس کمرے میں باجو اور طفیلے کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔"

"ہرگز نہیں۔" سولنگی نے جلدی سے کہا "میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اگر میں اور تم یہاں سے زندہ سلامت نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں تھوڑا' انتظار کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا "اور اس دوران میں ان لعنتی دیواروں میں ذلت کا عذاب جھیلتی رہوں گی!؟"

"اس کا بھی ایک حل ہے" سولنگی نے کہا۔

"کیسا حل؟"

وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولا "......... خیر تم اس بات کو چھوڑو میں خود بات کر لیتا ہوں ان لوگوں سے' آج کے بعد اس کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں آئے گا۔"

کچھ دیر بعد مجھ پر پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ آج معدے میں دوا کچھ زیادہ ہی داخل ہو گئی تھی۔ میں بستر پر بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلی گئی......... آنکھ کھلی تو نگاہ سیدھی بخشو سولنگی پر پڑی۔ وہ بدستور کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کے سامنے ایش ٹرے میں راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگا تھا۔ کھڑکیوں میں نمودار ہونے والے اجالے سے اندازہ ہوتا تھا کہ صبح ہو رہی ہے۔ بخشو سولنگی نے مجھ سے تسلی

تشفی کی چند باتیں کیں اور شام کو پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

وہ سارا دن میں نے حسب معمول نیند اور بیداری کے جھونکوں کے درمیان گزارا۔ ایک دو بار باجو اور طفیلے کے چہرے بھی نظر آئے۔ وہ کافی حد تک مطمئن نظر آتے تھے۔ شاید بخشو سولنگی نے کئی دنوں تک کے لئے ان کے خرچے پانی کا انتظام کر دیا تھا۔ کھڑکیوں پر شام اتری تو میں ایک کرسی پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ایک کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ ایک شیشہ ہی باہر کی دنیا سے میرا واحد بصری رابطہ تھا۔ اس شیشے میں سے مجھے عمارت کے ایک پیلے شیڈ کا تین چار مربع فٹ ٹکڑا نظر آتا تھا' قریباً اتنا ہی آسمان اور ایک بجلی کے کھمبے کا بالائی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ بجلی کے کھمبے یا پیلے شیڈ کے اوپر کبھی کوئی پرندہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے اپنے لئے اضافی تفریح تصور کرتی تھی۔ میرے لئے اہم ترین دلچسپی نیلے آسمان کا وہ ٹکڑا تھا جو میں روزن قفس سے دیکھتی تھی۔ اس ٹکڑے پر مجھے سرمئی شام کا عکس نظر آتا تو دیر تک پتھر کی طرح ساکت کھڑی رہتی۔ آج بھی میں اسی شغل میں مصروف تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور بخشو سولنگی اندر آ گیا۔ اس نے بڑے بازاری قسم کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ڈبی دار شلوار قمیض' پاؤں میں سرخی مائل جوتے اور گلے میں گلاب کے ہار۔ اس نے اندر آ کر دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر لوہے کی ایک پتری نکالی۔ میں نے غور کیا تو یہ لوہا کاٹنے کا بلیڈ تھا۔ بلیڈ کے علاوہ اس نے جیب سے ایک پیچ کس بھی نکال لیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

وہ بولا "بیگم جی رات جب تم سو رہی تھیں میں نے اچھی طرح اس فلیٹ کا سروے کیا تھا۔ میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس سامنے والی تیسری کھڑکی کے سوا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کھڑکی کے نیچے ایک پیلے رنگ کا شیڈ ہے اس پر اتر کر پانچ چھ گز چل کر ایک دوسری چھت پر چھلانگ لگائی جا سکتی ہے۔ یہ چھت ایک ہوٹل کی ہے جس کی اوپری دو منزلیں خالی پڑی ہیں۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا "مگر اس کھڑکی سے کیسے نکلیں گے؟"

وہ بولا "اسی لئے تو یہ سامان لایا ہوں۔ اس بلیڈ سے گرل کاٹیں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین راتیں لگ جائیں گی۔ اس کے بعد کوئی مشکل نہیں رہے گی۔"

.... طفیلے نے کھڑکی کی چٹخنیاں ٹیڑھی کر دی تھیں مگر سولنگی نے انہیں سیدھا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے پیچ کس سے چٹخنی کے بالائی پیچ کھول کر کھڑکی کھولی جو دوسری طرف جاتی تھی۔ جالی کاٹنے کے لئے سولنگی کے پاس کوئی اوزار نہیں تھا۔ اس نے اپنے جیبی چاقو سے کام چلایا تھوڑی سی جالی کاٹنے کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ایک گھنٹے تک طفیلا کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ آتا جاتا رہا۔ رات نو بجے سولنگی نے طفیلے سے کہہ دیا کہ اب وہ نہ آئے۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکی کھولی اور بلیڈ نکال کر گرل کاٹنی شروع کر دی۔ یہ کام سولنگی کی توقع سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ گرل مضبوط اور کافی مختلف قسم کی تھی۔ تین چار گھنٹے کی کوشش میں وہ چوکور سریئے کے چند ٹکڑے ہی کاٹ سکا۔ بعد ازاں اس نے احتیاط سے کھڑکی بند کر دی اور اوزار غسل خانے کے روشن دان میں چھپا دیئے۔ علی الصبح وہ واپس چلا گیا۔

یہ سلسلہ پورے پانچ روز تک چلتا رہا۔ گرل اب کافی حد تک کٹ چکی تھی۔ صرف ایک دو سریئے باقی تھے۔ انہیں کاٹ کر سولنگی گرل کا ایک چوکور ٹکڑا کھڑکی سے علیحدہ کر سکتا تھا اور ہم باآسانی وہاں سے گزر کر چار پانچ فٹ نیچے شیڈ پر اتر سکتے تھے۔ چھٹے روز شام کے بعد کمرے کی کھڑکیوں میں عجیب طرح کی روشنی نظر آنے لگی۔ حسب معمول سات بجے کے قریب سولنگی کمرے میں پہنچا تو میں نے اس کی توجہ کھڑکیوں کی طرف دلائی۔ روشنی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوا۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر اس نے نیچے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا "میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں" اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں بے قراری سے انتظار کرتی رہی۔ وہ مٹھائی کا دونہ لے کر کوئی دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کے بالوں بھرے چہرے پر مایوسی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "معاملہ خراب ہو گیا ہے نیچے گلی میں شامیانے وغیرہ لگے ہیں اور لائٹنگ ہو رہی ہے۔"

سولنگی کے بتانے سے پہلے ہی مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ سرچ لائٹوں کی روشنی

ہے۔ سولنگی نے جو کچھ بتایا اس سے صورت حال واضح ہو گئی۔ نیچے گلی میں کسی لڑکی کی پیدائش کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اور یہ جشن مسرت کم از کم ایک ہفتہ جاری رہنا تھا۔ میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا' کون کہتا ہے لوگ لڑکی کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے جسے یقین نہ ہو یہاں آکر دیکھ لے۔ سولنگی کی زبانی پتہ چلا کہ گلی میں ایک چھوٹا سا سٹیج بنا ہوا ہے۔ دور دور سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی ہیں اور لڑکی کی پیدائش پر مسرت کا اظہار کر رہی ہیں۔ ان کی یہ مسرت ہمارے لئے مایوسی کا پیغام بن کر آئی تھی۔ جس اندھیری نیم سنسان گلی میں ہم نے اترنا تھا وہاں بیسیوں افراد جمع تھے اور روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اسی دوران ادھ کھلی کھڑکی سے ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی مدھم صدائیں آنے لگیں۔ رقص و سرود کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔

اس نئی افتاد کے باعث ہم نے کمرے سے نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ ایک دو راتوں تک صورت حال کا جائزہ لیں.......... دو راتوں کے جائزے کے بعد واضح ہو گیا کہ یہ جشن طرب ختم ہونے تک ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ گلی ساری رات روشن رہتی تھی اور صبح تک ناچ گانے میں بھی کوئی وقفہ نہیں آتا تھا۔ تیسرے روز سولنگی نے مجھ سے کہا کہ اب وہ چار دن بعد ہی آئے گا۔ تب تک ہنگامہ ختم ہو چکا ہو گا اور ہم پروگرام کے مطابق یہاں سے نکل چلیں گے۔ حبس کی شدت میں لو بھی بھلی لگتی ہے۔ میں جن حالات میں گھری ہوئی تھی ان میں ایک خطرناک ڈاکو کا ساتھ بھی مجھے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ بھی تھا بہرحال میرے لئے بے ضرر ثابت ہوا تھا۔ یہ جان کر کہ اب وہ چار دن بعد آئے گا میں پریشان ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"سولنگی! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے بعد وہ طفیلا وغیرہ پھر پرانی ڈگر پر آجائیں۔"

اس نے کہا "بیگم جی اطمینان رکھو! سولنگی سے دھوکہ کریں گے تو ادھیڑ کر رکھ دوں گا انہیں۔"

سولنگی واپس چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن کر ہفتے کی شب کا انتظار کرنے لگی۔ سولنگی نے ٹھیک ہی کہا تھا اس کے جانے کے بعد بھی باجو اور طفیلے کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک ہی رہا۔ ہاں انہوں نے کھانے میں خواب آور دوا پھر دینی شروع کر دی۔ ایک بار پھر مجھ پر صبح و شام نیند کی یلغار رہنے لگی۔

کسی وقت بستر پر چپ چاپ لیٹے میرا دھیان سلیم کی طرف چلا جاتا اور جسم میں درد کی لہریں پھیل جاتیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ درد میری جان ہلکان کرتا تھا' پھر بھی اچھا لگتا تھا۔ کوئی عجیب بات تھی اس لاعلاج درد میں۔

سولنگی کے جانے کے بعد یہ تیسری شام کا واقعہ ہے۔ کریہہ چہرہ باجو میرے پاس آئی اور ایک نیا جوڑا پہننے کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی کہنے لگی کہ میں نہا دھو کر سنگھار کر لوں۔ میں نے چونک کر اس کی وجہ پوچھی۔ وہ رعونت سے بولی۔

"ابھی تیرے اندر سے "کیوں کیا کیسے" والی باتیں نہیں نکلیں؟ جو کہا جاتا ہے وہ کر۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ باجو کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔

"بڑے سے بڑے شخص کی بھی ایک زبان ہوتی ہے تم کیسے لوگ ہو کہ سولنگی کو زبان دے کر پھر رہے ہو۔ وہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔"

باجو نے کہا "بک بک بند کر' سولنگی سے نبٹنا تیرا کام نہیں ہے۔ یہ کپڑے پہن لینا' میں ابھی آتی ہوں" جوڑا میرے منہ پر مار کر وہ باہر نکل گئی۔ میری چھٹی حس مجھے دور دراز کے اندیشوں میں مبتلا کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اگر آج میں اس چار دیواری سے نہ نکل سکی تو کوئی سنگین واقعہ رونما ہو جائے گا۔ باجو کے کہنے پر میں نے کپڑے پہن لئے اور منہ ہاتھ بھی دھو لیا لیکن ذہن میں ایک اور ہی طرح کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا گیا میرے دل کی دھڑکنیں شدت پکڑتی گئیں اور میں کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتی گئی۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو کا وقت بتا رہی تھیں جب میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر کمرے کو اندر سے کنڈی لگائی اور پیچ کس استعمال کر کے عقبی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول لئے۔ جالی تو پہلے ہی کٹ چکی تھی بس گرل کے ایک دو سریئے اٹکے ہوئے تھے۔ ان سریوں کو بھی سولنگی نے نصف سے زائد کاٹ رکھا تھا۔ میں نے ان سریوں پر تھوڑا سا بلیڈ اور چلایا۔ پھر گرل پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا تو دہلیز کے قریب سے قریباً ڈیڑھ ضرب دو فٹ کا ٹکڑا علیحدہ ہو کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں اس ٹکڑے کو ٹیڑھا کر کے اندر کمرے میں آئی۔ دوپٹے کو کمر سے باندھا

اپنے خوابیدہ ذہن کو پوری طرح بیدار کیا اور کسی نہ کسی طرح خلا میں سے گزر کر نیچے شیڈ پر پہنچ گئی۔ ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ اور خلا میں سے گزرنے کی کوشش میں پورے جسم پر خراشیں آئی تھیں۔ شاید پیٹ اور بازوؤں سے خون بھی رس رہا تھا مگر مجھے اس تکلیف کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ شیڈ پر پہنچتے ہی خنک ہوا کے جھونکے جسم سے ٹکرائے۔ میں نے نیچے جھانکا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے گلی میں قناتوں کے اندر شور شرابا جاری تھا۔ غالباً کچھ ہیجڑے ڈھولکی کی تھاپ پر عجیب بے ڈھنگی آوازیں نکال رہے تھے۔ ایک طرف دودھیا بلبوں کی روشنی میں دیگوں کی طویل قطار نظر آ رہی تھی۔ کچھ سجے سجائے تانگے بھی نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کا کیا مصرف تھا۔ جس شیڈ پر میں کھڑی تھی وہ سرچ لائٹوں اور دوسری روشنیوں کی زد میں تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ابھی کوئی تماشائی اوپر دیکھے گا اور میری طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگے گا۔ یہ بڑی کٹھن گھڑیاں تھیں۔ میں نے پشت دیوار سے لگائے دائیں طرف کھسکنا شروع کیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اوپر کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ یقینی طور پر باجو یا طفیلا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ اب خطرے کی تلوار دو دھاری ہو گئی تھی۔ شیڈ بمشکل دو فٹ چوڑا تھا اور اپنے خوابیدہ ذہن کے ساتھ اس پر چلنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ تین چار گز کا فاصلہ میرے لئے "صدیوں کی مسافت" تھا۔ ہر ہر گھڑی محسوس ہوا کہ میں پکڑی جاؤں گی یا توازن کھو کر نیچے پختہ گلی میں جا گروں گی۔ شیڈ ختم ہوا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر ایک چھت نظر آئی۔ ٹائلوں کی درزیں بند کرنے کے لئے جو سیمنٹ لگایا جاتا ہے وہ مستطیل خانوں کی صورت میں صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف رکشے یا سکوٹر کے دو ٹائر پڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ویٹ لفٹنگ میں استعمال ہونے والا ایک تنگ سا بنچ تھا جس کے ایک پائے تلے سبز رنگ کی ایک پتنگ دبی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں چمکا اور دوسرے ہی لمحے میں نے آنکھیں بند کر کے چھت پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے یاد ہے میرا دایاں پاؤں ربڑ کے ٹائر پر پڑا جبکہ دوسرا پختہ فرش سے ٹکرایا۔ ایک ٹیس سی ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک دوڑتی چلی گئی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ تاہم یہ چیخ اور چھت پر گرنے کی آواز نیچے ڈھول ڈھمکے کے شور میں دب کر رہ گئی۔ میں کتنے ہی لمحے بے حرکت چھت پر

پڑی رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور نیچے جھکی جھکی برساتی کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر تاریک سیڑھیوں پر آئی اور سنبھل کر نیچے اترنے لگی۔ سولنگی کے بیان کے مطابق اس عمارت کی دو بالائی منزلیں واقعی خالی تھیں۔ تیسری منزل پر رہائش کے آثار نظر آتے تھے۔ یہاں مجھے صحن میں ایک دری نما کپڑا الگنی پر جھولتا مل گیا۔ یہ دری میرے لئے غنیمت تھی۔میں نے اسے چادر کی طرح سر پر ڈال کر گھونگھٹ سا نکال لیا۔ دری گیلی تھی اور کسی بچے کے پیشاب کی سخت بو آرہی تھی۔ میں دری میں لپٹی لپٹی نچلی منزل تک پہنچی۔ مختلف کھانوں کی خوشبو کے ساتھ پلیٹوں کی کھڑکھڑ بھی سنائی دے رہی تھی۔ تاہم یہ سارا ہنگامہ زینوں کی جانب رہ گیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر اطمینان سے ان میں شامل ہو گئی۔ میں جھک کر چل رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ چال ڈھال سے ادھیڑ عمر عورت نظر آؤں۔ بائیں پاؤں نے اب تھوڑا سا لنگڑانا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے میں زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ میں بھرے پرے بازار میں قریباً ایک فرلانگ آگے آئی ہوں گی جب ایک پولیس والے کی تیز سیٹی سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور خون جیسے رگوں میں جم گیا۔ پولیس والے کی توجہ کا مرکز میں ہی تھی۔ وہ ایک کانسٹیبل تھا ایک لاٹھی سی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ میری طرف بڑھا تو میں تیزی سے ایک تنگ بغلی گلی میں مڑ گئی۔ گلی میں مڑتے ہی مجھے ایک جنرل سٹور نظر آیا۔ جنرل سٹور کے آر پار راستہ تھا۔ میں سٹور میں گھسی اور دوسرے دروازے سے نکل کر ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر آگئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں خود حیران رہ گئی۔ لیکن خطرہ ابھی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ ممکن تھا کانسٹیبل میرے پیچھے ہو۔ میں ایک ریڑھے کی آڑ میں سیدھی نکلی چلی گئی اور پھر بغیر سوچے سمجھے ایک نیم تاریک دروازے میں گھس گئی.......... ایسا کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا کیونکہ چند سیکنڈ بعد مجھے کانسٹیبل کی سیٹی بالکل قریب سے سنائی دی۔ وہ دروازے کے سامنے منڈلا رہا تھا۔ میں دائیں پاؤں پر زور دیتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی اور عمارت کی دوسری منزل پر آگئی۔ یہاں تیسری منزل کی سیڑھیوں کے نیچے ایک تاریک گوشہ مجھے چھپنے کے لئے نہایت موزوں نظر آیا۔ میں وہاں گھس کر بیٹھ گئی.......... کہیں بالکل پاس سے گانے بجانے کی مدہم آوازیں آرہی تھیں۔ میں قریباً آدھ گھنٹہ اپنی پناہ گاہ میں دبکی رہی۔ آخر مجھے احساس ہوا کہ فوری خطرہ ٹل گیا ہے۔

گانے کی آوازیں اب اور بھی واضح اور بلند ہو گئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا ایک سے زیادہ لڑکیاں باری باری گانوں کے ٹکڑے گا رہی ہیں۔ شاید کوئی مقابلہ وغیرہ ہو رہا تھا۔ یہ آوازیں میری پناہ گاہ سے چند گز دور ایک نیم روشن کھڑکی سے آرہی تھیں۔ میں تاریکی میں کچھ آگے کو کھسک کر اس کھڑکی کے پاس پہنچی۔ نیلی جالی کی دوسری طرف اندر کا منظر حیران کن تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ ان کے ساتھ ایک منشی قسم کا شخص موٹی سی ڈائری لئے بیٹھا تھا۔ میز پر سگریٹ کے پیکٹ اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ داہنی طرف ایک قطار میں پندرہ بیس لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ادھیڑ عمر و بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور اگالدان وغیرہ رکھے تھے۔ سازندے آلتی پالتی مارے سازوں سے الجھے ہوئے تھے۔ ایک گھٹیا سے فلمی گانے کی دھن پر دو لڑکیاں محو رقص تھیں۔ چند لمحے بعد انہوں نے رقص ختم کیا تو ایک دوسری لڑکی اٹھی اور رقص کا مظاہرہ کرنے لگی۔ ایک سٹل فوٹوگرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی بناتا جا رہا تھا۔ یہاں کے ماحول سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید یہ فلمی لوگ ہیں جو یہاں کسی نئی رقاصہ کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔ میک اپ زدہ چہروں والی لڑکیاں دلکش زاویوں سے بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی خود ساختہ ادائیں اور مسکراہٹیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ فلموں میں رقص کرنے کی شدید خواہشمند ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں اپنے منتخب ہونے کی امید نہیں تھی اور وہ اس سارے بکھیڑے کو فضول سمجھ کر لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مختلف چہروں سے پھسلتی ہوئی میری نگاہ اچانک ایک چہرے پر آکر رک گئی.......... عشرت کو دیکھ کر میں چند لمحوں کے لئے سناٹے میں رہ گئی۔ یقیناً وہ عشرت ہی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ بیمار ہے' عشرت سے یوں ملاقات ہو گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ شاہ دین ٹوانہ اور خان رحیمی اسے نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے تھے اور وہ اس گنجان آباد بازار کے اس دھواں دھواں کمرے میں رقاصہ لڑکیوں کے درمیان بیٹھی رقص کرنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

قریباً دس منٹ بعد عشرت کی باری بھی آگئی۔ فلمساز نے انگلی کے اشارے سے

اسے اٹھنے اور رقص کرنے کی ہدایت کی۔ عشرت کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ وہ سستی کے ساتھ اٹھی اور سرخ رنگ کے قالین پر چلی آئی۔ اب میں اسے زیادہ بہتر طور سے دیکھ سکتی تھی۔ اس کے بجھے بجھے رخساروں پر ویرانی کا ڈیرہ تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑے ہوئے تھے۔ ان حلقوں کو میک اپ کی تہہ بھی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے تو اس نے بازوؤں کو حرکت دی اور رقص کرنے لگی۔ ہم تیری جدائی کا غم سہ بھی نہیں سکتے۔ اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے۔ وہ بڑی نقاہت سے رقص کر رہی تھی' ایک منٹ میں ہانپ کر رہ گئی۔ ایک دفعہ قالین سے اس کا پاؤں الجھا اور گرتے گرتے بچی.......... دوسری لڑکیوں میں سے ہر لڑکی نے قریباً تین منٹ رقص کیا تھا مگر عشرت کا رقص فلمساز نے ایک ہی منٹ میں ختم کرا دیا اور ایک دوسری لڑکی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ عشرت سر جھکائے تھکی تھکی سی واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

یہ کارروائی قریباً آدھ گھنٹہ مزید جاری رہی۔ پھر فلمساز نے دو بالکل نو عمر اور تیز و طرار رقاصائیں منتخب کیں۔ وہ خوشی سے پھلجھڑی بن گئیں اور بڑی بے تکلفی سے فلمساز اور اداکار کے درمیان آ بیٹھیں۔ فلمساز نے ان کی ساتھی بوڑھی عورتوں سے بات چیت شروع کر دی۔ خالص پیشہ ورانہ قسم کی گفتگو تھی جو تند و تیز قہقہوں اور گالی گلوچ کے بعد پندرہ منٹ میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد سب لوگ باہر آنے لگے۔ میں دوبارہ سیڑھیوں کے نیچے اپنی محفوظ پناہ گاہ میں چھپ گئی۔ رقاصائیں سازندے اور بوڑھی عورتیں' سب ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ میں تاریکی میں دبکی ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ عشرت جانے والوں میں شامل نہیں۔ وہ سب سے آخر میں چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر آئی اور سیڑھیاں اترنے کی بجائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس عمارت میں کہیں رہتی ہے۔ میں نے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر دیکھا وہ تیسری منزل پر پہنچ گئی تھی۔ اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر میں بھی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اب بلب بجھا دیئے گئے تھے اور سیڑھیوں میں نہ ہونے کے برابر روشنی تھی۔ یہ صورت حال میرے لئے بہت مناسب تھی۔ دبے پاؤں چلتی میں بھی تیسری منزل پر پہنچی اور اس وقت خوش قسمتی سے میری نظر اس دروازے پر پڑ گئی جس میں عشرت داخل ہو رہی

تھی۔ یقیناً یہ اس کے اپنے کمرے کا دروازہ تھا کیونکہ اس قطار میں تمام تر رہائشی کمرے تھے۔ کمروں کے آگے بالکونی کی شکل میں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ یہاں اکا دکا افراد نظر آ رہے تھے۔ میں ایک بار پھر سیڑھیوں کے نیچے والے خلا میں گھس گئی۔ یہ خلا بھی بالکل دوسری منزل کے خلا جیسا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں کاٹھ کباڑ کی بجائے کچھ ایندھن پڑا تھا۔ میں قریباً ایک گھنٹہ یہاں بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ ٹخنے میں رہ رہ کر ٹیس اٹھتی تھی اور کبھی کبھی حبس کا احساس بھی ہونے لگتا تھا۔ بالکونی اب خالی نظر آنے لگی تھی۔ کمروں کی بیشتر کھڑکیاں بھی تاریک ہو چکی تھیں۔ میں نے عشرت کو کمرے میں تنہا داخل ہوتے دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی تنہا ہوگی۔ میں بہ آہستگی اپنے تاریک گوشے سے نکلی اور دبے پاؤں چلتی عشرت والے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ میری تیسری دستک پر عشرت نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں مدہم روشنی ہو رہی تھی۔ وہ پہلے تو پہچاننے میں یکسر ناکام رہی.......... پھر بتدریج اس کی آنکھوں میں حیرت خوف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے اس نے جلدی سے مجھے اندر کھینچ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔

"شا.......... شاہدہ تم؟" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی حیرت زدہ آواز برآمد ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سمندر اچھل رہا ہے۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی اور میرے ساتھ چپکتی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر اس نے اسی طرح مجھے بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ میں نے بمشکل اسے خود سے جدا کیا۔ ہم دونوں مسہری پر بیٹھ گئیں۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ اس کمرے سے بھی چھوٹا جس میں میں کئی روز باجو اور طفیلے کی نگرانی میں قید رہی تھی اور اب اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچی تھی۔ میں نے دیکھا بستر کے ساتھ ایک میز پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہیں اور پیلے لفافوں میں بڑے بڑے ایکسرے بھی موجود ہیں۔ ایک طرف صندوق میں عشرت کا مختصر سا سامان رکھا تھا اور دیوار پر اس کے دو جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں پہنچتے ہی مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ عشرت نے حیران لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا "تم یہاں کیسے شاہدہ؟"

میں اسے کیا بتاتی کہ پچھلے چند ہفتوں میں کن طوفانوں سے گزر چکی ہوں اور میرے دل پر کیا کیا صدمے گزرے ہیں۔ میں اسے صرف اپنی روئیداد سنا سکتی تھی' وہی

روئیداد جس کا کچھ نہ کچھ حصہ اخباری خبروں کے ذریعے بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے وہاب چنگیزی کے ڈیرے پر پیش آنے والے خواب ناک واقعات سنائے۔ ان چار لاشوں کا ذکر کیا جو میں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک قطار میں پڑے دیکھی تھیں۔ باجو اور طفیلے کے بارے بتایا اور اس کھڑکی کا ذکر کیا جو مجھے گوشت نوچنے والے درندوں کے بدبودار نوکیلے دانتوں سے بچا کر یہاں تک لائی تھی۔ عشرت سب کچھ حیرت کے سمندر میں گم سنتی رہی.......... میری کہانی ختم ہوئی تو میں نے عشرت کے حالات پوچھے۔ اس کی اشکبار آنکھیں کچھ اور بھی اشکبار ہو گئیں۔ روتے ہوئے بولی۔

"شاہدہ! میں تو مرتے مرتے بچی ہوں۔ تین دن ہسپتال رہ کر پچھلے ہی ہفتے آئی ہوں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

جواب میں آہوں اور سسکیوں کی درمیان عشرت نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

"سالار کی بھیجی ہوئی عورت خانم مجبور کر کے عشرت کو خان رحیمی کی کوٹھی سے لے کر آئی تھی۔ یہاں واپس پہنچنے کے دوسرے ہی دن عشرت کو سینے میں بائیں طرف درد شروع ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے میو ہسپتال لے جایا گیا' جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی چند ماہ قبل جب ابھی اسے شاہ دین ٹوانہ کے سپرد نہیں کیا گیا تھا اسے یہ تکلیف ہو چکی تھی۔ عشرت کی عمر ابھی اتنی نہیں تھی کہ اسے ایسی جان لیوا بیماری لاحق ہوتی' مگر شاید یہ مرض اسے وراثت میں ملا تھا اور رہی سہی کسر ان تباہ کن حالات نے پوری کر دی تھی جن سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ فطرتاً ایک شریف لڑکی تھی اور اس گھناؤنے ماحول میں پھنس کر شب و روز ایک عذاب جھیل رہی تھی۔ ایسی قیامتیں پتھر سے تراشے ہوئے دل پر بھی گزرتیں تو اسے جونک لگ جاتی۔ میں نے غمزدہ نگاہوں سے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ میرے سامنے اشکبار بیٹھی وہ کملایا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ یہ لڑکی اپنے شریفانہ ماحول میں رہتی اور پاکیزگی کا نور اس کے چہرے پر ہوتا تو رعب حسن سے دیکھنے والی آنکھیں کانپ کانپ جاتیں۔ مگر آج وہ

ایک لاچار اور ٹھکرائی ہوئی مخلوق کی طرح اس حبس زدہ کمرے میں پڑی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا زرد چہرہ دیکھ کر خوف آنے لگا۔ مجھے لگا جیسے وہ ان چند ہی دنوں میں زندگی اور زندہ لوگوں سے بہت دور چلی گئی ہے.......... میں نے اس سے اس کے علاج معالجے کے بارے میں پوچھا۔ وہ بے دلی سے جواب دیتی رہی۔ میں نے اسے بتایا کہ خان رحیمی اور شاہ دین ٹوانہ اس کی گمشدگی سے بے حد پریشان ہیں اور جگہ جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عشرت کو ان معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اب اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش ہے کہ وہ اپنے گھر اپنی ماں کے پاس واپس پہنچ جائے۔ کہنے لگی۔

"شاہدہ! تم بڑے اچھے وقت پر ملی ہو' مجھے کسی تمہارے ہی جیسے سہارے کی ضرورت تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ بچوں گی نہیں۔ میری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے کچھ دن اس چاردیواری میں گزار لوں اور جہاں میری ماں رہتی ہے۔"

میں نے عشرت کو تسلی دی اور اسے کہا کہ وہ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہے۔ اسے کوئی لاعلاج بیماری نہیں اور دل کے عمر رسیدہ مریض بھی کئی کئی سال جیتے ہیں' بلکہ عام لوگوں سے بھی لمبی عمریں پا جاتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ کہنے لگی۔

"کچھ بھی ہے شاہدہ' میں ایک دو روز میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے یہاں سے چلی جانا اس کے اپنے بس میں ہے' وہ جب چاہے گی یہاں سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا سالار اور خانم وغیرہ تمہیں یہاں سے جانے دیں گے؟"

وہ بے دلی سے مسکرائی تو اس کے ہونٹوں پر دکھ کے ٹوٹے ہوئے شیشے بکھر گئے۔ کہنے لگی "جب گنا بیلنے میں سے گزر جائے تو اسے پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ مجھ میں اب کیا رہا ہے جو مجھے سنبھال کر رکھیں گے۔ نہ ناچ سکتی ہوں نہ گا سکتی ہوں نہ مردوں کے ستم جھیل سکتی ہوں۔ میری اہمیت کا اندازہ تم اس کمرے سے ہی کر لو' جب میں ٹھیک تھی اور سالار کے مہمان مجھ پر رالیں ٹپکاتے تھے تو میرا ٹھکانہ یہ کمرا نہیں دوسری منزل کا

ایک شاندار فلیٹ تھا جہاں ائر کنڈیشنز اور ہیٹر لگے تھے اور وال ٹو وال کارپٹ بچھے ہوئے تھے .... اب بھی بچھے ہوئے ہیں لیکن میری جگہ کوئی اور آ چکی ہے۔ پرسوں میری طبیعت پھر زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ سالار مجھے دیکھنے آیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب مجھے اپنے پاس رکھنے میں اسے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے خانم کے ذریعے اسے کہلوایا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دے۔ شاید آج کل کسی وقت خانم اس کا جواب لے آئے گی.........."

دروازے سے باہر قدموں کی آواز آئی اور پھر ایک مخصوص دستک سنائی دی۔ عشرت بری طرح گھبرا گئی۔ اس نے بدحواسی سے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک میلا سا پردہ اٹھا کر کمرے کے پچھلے حصے میں آ گئی۔ یہاں سبز روغن والا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دروازے کے رخ سے صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ یہ ساتھ والے کمرے میں کھلتا ہوگا۔ عشرت نے اپنی طرف سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ہلکی سی دستک دی۔ دستک کے چند لمحے بعد کسی نے دوسری طرف سے کنڈی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ ایک ٹھگنی اور بڈھی سی عورت نظر آئی جس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اسے دیکھ کر عشرت نے گھبراہٹ سے کہا۔

"ہیرا! یہ میری سہیلی ہے اسے کمرے میں چھپا لے کچھ دیر کے لئے۔"

ہیرا نامی اس عورت نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور مجھے بازو سے تھام کر اندر کھینچ لیا۔ یہ کمرہ پہلے سے بھی بدبودار تھا۔ شاید یہ عورت چرس پیتی رہی تھی۔ کمرے میں بدبو کے ساتھ دھواں بھی پھیلا تھا۔ مجھ سے میرا حسب نسب پوچھنے کی ناکام کوشش کے بعد عورت نے مجھے گالیاں دیں اور پھر سر پر دوپٹے کی گرہ باندھ کر مسہری پر پھیل گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں اس کے گونجدار خراٹے سن رہی تھی......... رات کا باقی حصہ میں نے اسی بدبودار کمرے میں سوتے جاگتے اور ابکائیاں لیتے گزار دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ کئی بار دل میں آئی کہ خراٹے لیتی ہوئی عورت کو اٹھاؤں یا خود ہی عشرت کے کمرے میں کھلنے والے دروازے پر دستک دوں مگر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بالآخر یہ منحوس رات بھی کٹ گئی۔ علی الصبح اندرونی دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف عشرت ہی تھی۔ میں

اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ رات بھر کوئی انسان نما جانور اس کمرے میں موجود رہا ہے۔ عشرت کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے اور اس کے ہونٹوں کی ماتمی نیلاہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے قبرستان میں کہیں زندگی کا نشان سا ہے۔ کوئی خوشی کی کرن ہے جو اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس کے دل سے پھوٹ رہی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سالار نے اسے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ تمام تصویریں اور نیگٹیو اسے واپس کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی آئندہ زندگی میں کوئی دخل نہیں دیا جائے گا۔ وہ بھی ماضی کے ان چھ سات سالوں کو یکسر فراموش کر دے گی......... تمام باتیں طے کر لی گئی ہیں اور اب وہ جانے کے لئے آزاد ہے۔

کیسی آزادی تھی یہ! میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا اس شب بیدار عمارت کے بیشتر مکین اب سو رہے تھے لیکن عشرت جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کچھ دیر کے لئے وہ کمرے سے نکلی تو واپسی پر ایک اخبار لے آئی۔ اخبار کے اندرونی صفحے کی ایک خبر پر اس نے انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو۔"

میں نے سرخی پڑھی لکھا تھا "واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ بازار حسن سے فرار" نیچے تفصیل درج تھی' واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ ثناء محمود کو کل بازار حسن کے علاقے میں دیکھا گیا۔ پولیس نے چھاپا مارا مگر وہ چھاپے سے قبل ہی اپنے ٹھکانے سے فرار ہوگئی۔ معلوم ہوا ہے کہ ثناء محمود کے بہت سے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطے ہیں اور وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتی ہے۔ یاد رہے کہ پچھلے دنوں ثناء محمود نے کچھ غنڈہ عناصر کے ساتھ مل کر جھنگ میں چنگیزی فیملی کی رہائش گاہ پر بلہ بولا تھا۔ اس واقعے میں چودھری وہاب چنگیزی کا سب سے چھوٹا بھائی شجاع اور ایک ملازم جان مسیح موقعہ پر ہلاک ہو گئے تھے۔ نیز اس کیس کی ایک اور فریق پرنسپل میڈم نادرہ نے کہا ہے کہ انہیں ثناء محمود اور اس کے ساتھیوں سلیم اور چودھری شہاب وغیرہ کی طرف سے جان کا خطرہ ہے' لہٰذا اس کی حفاظت کی جائے۔ انہوں نے ثناء محمود کے کردار پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ ایسی عورت صرف ایک خاندان کے لئے نہیں پورے معاشرے کے لئے بدنامی کا داغ ہوتی ہے۔ ملزمہ کو گرفتار کر کے جلد از جلد مثالی سزا دی جانی چاہیے۔

پرنسپل نادرہ جو ایک فلاحی اصلاحی ادارے کی چیئرمین بھی ہیں نے کہا ہے کہ اگر انتظامیہ نے اپنے پورے وسائل بروئے کار لا کر قاتلہ کو جلد گرفتار نہ کیا تو اس کا شدید ردعمل ہو گا۔"

خبر پڑھ کر میڈم نادرہ کا منحوس چہرہ میری نگاہ میں گھومنے لگا۔ یہ عورت اونٹ کا کینہ رکھتی تھی اور مجھے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ چنگیزیوں کے ہاں اس کا آنا جانا بدستور جاری تھا اور وہ ان کی ہر منصوبہ بندی میں شریک رہتی تھی۔

جونہی شام گہری ہوئی میں اور عشرت ان گلیوں سے نکل آئیں جہاں عورت اپنے سب سے گھناؤنے اور قابل نفرت روپ میں پائی جاتی ہے۔ عشرت برقعے میں تھی جبکہ میں نے خود کو ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اپنے سامان میں سے عشرت جسم کے لباس کے سوا کوئی چیز ساتھ نہیں لائی تھی۔ ہم بڑی سڑک پر پہنچیں اور وہاں سے رکشے میں سوار ہو کر اچھرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ عشرت کی والدہ اسی علاقے میں رہتی تھیں۔ اچھرہ پہنچ کر ایک نئے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر ہم رکیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ برقعے کے اندر عشرت کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ آج کئی سالوں کے بعد وہ اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ دوبارہ کال بیل بجانے کے لئے اٹھا لیکن کسی مردہ شاخ کی طرح نیچے جھول گیا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر کے باسیوں کو اپنی آمد سے آگاہ کر سکے۔ میں نے آگے بڑھ کر کال بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے' چہرے میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی' مگر معلوم نہیں کیوں مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں دلکشی تھی۔ وہ بڑی شفقت سے بولی "فرمایئے"

نقاب کے پیچھے سے عشرت نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے دروازے کے اندر لے آئی۔ دفعتاً عشرت نے ایک چیخ ماری اور ادھیڑ عمر عورت سے لپٹ گئی۔ عورت بوکھلا گئی اور اس کا نقاب الٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ عشرت کا چہرہ دیکھ کر وہ یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ کتنی ہی دیر وہ پھٹی ہوئی نظروں سے عشرت کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ تب اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی "عشرت

یہ.......... یہ تم ہو!" عشرت نے زار و قطار روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ سات سال بعد ماں بیٹی کا یہ ملاپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی مگر اس نے عشرت کو اپنے بازوؤں میں لے کر یوں اپنے سینے سے چمٹایا کہ کچھ دیر کے لئے وہ اس کے جسم کا ہی ایک حصہ بن گئی۔ ان دونوں کے رونے نے گھر کی دیواروں کو ہلا دیا اور مجھے لگا کہ میں اپنی جگہ کھڑی کھڑی مسمار ہو جاؤں گی۔ میں وہ کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جو ماں بیٹی کے ملاپ کو دیکھ کر میرے دل پر طاری ہوئی۔ لگتا تھا ان دونوں کے ساتھ ساتھ میں بھی آنسوؤں کے تند و تیز سیلاب میں بہتی جا رہی ہوں۔ روتے روتے عشرت کی ماں کی نگاہ اچانک میری طرف اٹھی اور وہ سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے پہچان گئی ہے۔

بعد کے واقعات میں مختصراً بیان کرتی ہوں۔ عشرت نے اپنی ماں کو وہ سب کچھ بتایا جو پچھلے چھ سات برسوں میں اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ یہ ایک دلدوز کہانی تھی' جو وہ وقفے وقفے سے مسلسل تین روز تک سناتی رہی۔ ان دونوں کی آنکھیں روتی رہیں اور سسکیاں در و دیوار میں گونجتی رہیں۔ میں گم صم ان کے پاس بیٹھی رہتی یا اٹھ کر خالی خالی گھر میں گھومنے لگتی۔ یہ گھر عشرت کی ماں صادقہ نے پچھلے ہی برس تعمیر کرایا تھا۔ یہاں اس کے ساتھ ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ یہ ملازمہ بھی گھر کے فرد ہی کی طرح تھی اور صادقہ کو اس کا نام لے کر پکارتی تھی۔ صبح سویرے صادقہ جب اپنی گارمنٹس کی دوکان پر چلی جاتی تو یہی ملازمہ پورے گھر کی نگہبان ہوتی تھی۔ وہ بڑی چاق و چوبند اور ہوشیار عورت تھی۔ ہماری آمد کے دوسرے ہی روز صادقہ' عشرت کو ایک ہارٹ سپیشلسٹ کے پاس لے گئی۔ طویل معائنے اور ٹیسٹوں وغیرہ کے بعد اس نے بھی کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ صرف دواؤں میں معمولی تبدیلی کی اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن آرام شاید عشرت کی قسمت میں ہی نہیں تھا۔ گھر واپس پہنچتے ہی اس کے دماغ پر ایک عجیب بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس بات کی ضد کر رہی تھی جس کی ضد اس نے پچھلے پندرہ سولہ سال میں کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی اصل ماں سے ملنا چاہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے صادقہ سے باتیں کرتے سنا۔ اس نے صادقہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بڑے فریادی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ماں! مجھے اس سے ملا دو۔ ایک بار صرف ایک بار اگر

مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہو تو میری یہ خواہش پوری کر دو۔"

جواب میں صادقہ نے اس کا ماتھا چوما اور کہا "بیٹی! میں تجھے کیسے سمجھاؤں میں سچ کہتی ہوں، مجھے کچھ پتہ نہیں، اگر پتہ ہوتا تو کبھی نہ چھپاتی.........."

اسی روز رات کو جب عشرت گہری نیند سو گئی تو صادقہ میرے پاس چلی آئی۔ اس گھر میں آنے کے بعد تنہائی میں میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں جانتی تھی وہ مجھے پہلے روز ہی پہچان گئی ہے اور نہ پہچاننے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ وہ مجھے بھابی ثمینہ کی نند کے طور پر اچھی طرح جانتی تھی تاہم عشرت کے سامنے اس نے اپنی شناسائی ظاہر نہیں کی تھی اور میں بھی چپ رہی تھی.......... وہ کچھ دیر بغور مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک میرے قدموں میں گر پڑی اور رونے لگی۔

"بیٹی! ہماری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے کچھ کہہ دیا تو قیامت آجائے گی۔ مجھ سے وعدہ کرو چپ رہو گی.......... کچھ نہیں کہو گی۔"

میں جانتی تھی صادقہ کیا کہہ رہی ہے اس کی تشویش سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں عشرت کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔ اگر میں یہ بات افشا کر دیتی کہ عشرت بیرون ملک میں تعلیم حاصل نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ پچھلے کئی سال سے "گناہوں کی بستی" میں رہائش پذیر تھی تو بھابی ثمینہ کے لئے کیا طوفان کھڑا نہ ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ وہ چند ہی روز میں طلاق کا کاغذ تھام کر اسی گھر میں بیٹھی نظر آتی۔ میں نے بمشکل صادقہ کو اپنے قدموں سے اٹھایا اور حوصلہ دے کر کرسی پر بٹھایا۔ وہ کہنے لگیں۔

"بیٹی! میں جانتی ہوں تیرے اپنے ساتھ بھی بہت ظلم ہوا ہے۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو چکا ہے۔ تیرے بارے میں سوچ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "آنٹی صادقہ' میں اب تسلی تشفی کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

آنٹی صادقہ نے کہا "ثناء کیا یہ بہتر نہیں کہ تم خود کو.......... قانون کے حوالے کر دو۔ میرا ایمان ہے کہ اگر تم حق پر ہو تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "آنٹی یہ سب کتابوں کہانیوں کی باتیں ہیں۔ اس دور میں حق پر آنچ

بھی آتی ہے وہ شرمسار بھی ہوتا ہے اور سچائی بناوٹ کی اصولوں سے چھپتی بھی ہے۔ میرے لئے اب موت کے سوا اور کسی کے پاس انصاف نہیں ہے۔"

میری باتوں سے آنٹی صادقہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی "بیٹی' میرا سینہ تیرے لئے کشادہ ہے' میرا دل چاہتا ہے تجھے اپنی چادر میں اس طرح چھپا لوں کہ کوئی ڈھونڈے سے ڈھونڈ نہ سکے۔ مگر میں جانتی ہوں یہ ممکن نہیں ہے پولیس کے علاوہ چنگیزیوں کے کارندے بھی تیری تلاش میں ہیں۔ وہ ہر جگہ تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ دو تین دفعہ تو وہ یہاں تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ ایک دفعہ مقامی تھانیدار ان کے ساتھ تھا اور دو دفعہ وہ اکیلے آئے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں اگر وہ پھر اس طرف نکل آئے تو تجھے کہاں چھپاؤں گی۔"

میں آنٹی صادقہ کی بات پوری طرح سمجھ رہی تھی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی کہتا۔ میرا وجود اب موت کی علامت تھا اور کوئی بھی موت کو اپنے آنگن میں جگہ نہیں دیتا۔ میں نے کہا۔

"آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں یہاں صرف عشرت کو چھوڑنے آئی تھی۔ زیادہ دیر آپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔ صرف پرسوں تک کی مہلت دے دیں۔ پرسوں دوپہر سے پہلے چلی جاؤں گی۔"

آنٹی صادقہ نے نرمی سے کہا "نہیں بیٹی! ایسی جلدی والی تو کوئی بات نہیں میرے بس میں ہو تو تجھے ساری عمر یہیں رہنے کے لئے کہوں۔ مگر میں نہیں سمجھتی یہ ٹھکانہ تمہارے لئے محفوظ ہے۔ کوئی بھی یہاں آسکتا ہے۔ زرینہ (عشرت) ثمینہ سے ملنے کو کہہ رہی ہے۔ میں اسے اب تک ٹالتی آ رہی ہوں میں کب تک ٹالوں گی۔"

اس رات میں دیر تک بے قرار سی چھت پر ٹہلتی رہی۔ ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی خود کو یقین دلاتی رہی کہ میں ہی ثناء ہوں۔ حویلی میں تصادم کے مناظر رہ رہ کر میری آنکھوں میں کوندتے اور میں حیرانی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگتی۔ کیا میں نے کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ اس طرح ایک تیز دھار آلہ پکڑ کر زندہ جسموں پر چلاؤں گی۔ اور ٹرائیگر دبا کر کسی کو موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ مگر یہ سب کچھ ہوا تھا' اور میں نے کیا تھا "بنگال ٹائیگر" کی خوفناک آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی اور پہریدار کے بکھرے ہوئے

ہاتھ پاؤں نگاہوں میں رقصاں ہو گئے۔ پھر چار مردہ جسموں کی قطار آنکھوں کے روبرو آئی اور مجھے لگا کہ میرے ذہن میں پھر وہی دھند بھر رہی ہے جو مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس دھند سے گھبرا کر میں جلدی سے سونے کے لئے لیٹ گئی.......... میں نے ایک خواب دیکھا۔ میڈم نادرہ ایک سونے کی وہیل چیئر پر بیٹھی میرے سامنے آئی۔ اس کی گرد لمبی لمبی زبانوں والے سینکڑوں افراد تھے۔ ان سب کی ایک ایک انگلی پالش شدہ لوہے کی طرح چمک رہی تھی۔ میڈم نادرہ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہی وہ بدبخت لڑکی ہے جس نے مجھے کار تلے روندا تھا۔ اب تو تمہیں یقین آیا کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔ اب یہ آوارہ گردوں کی سردار ہے۔ بازار حسن میں رہتی ہے اور گینگ کے ساتھ گھومتی ہے۔ شبخون مارتی ہے اور قتل کرتی ہے۔ کیا اس بدخصلت کے لئے معافی کی کوئی گنجائش ہے؟"

"نہیں.......... نہیں" لمبی زبانوں والوں نے بیک زبان کہا۔ پھر وہ سارے مرد و زن کورس کی صورت میں چیخنے لگے۔ "مرجا بے حیا.......... مرجا بے حیا" اور اپنی آہنی انگلیاں میرے جسم پر چبھونے لگے۔ میرے چہرے پر، میری آنکھوں میں، میری پسلیوں میں۔ میں نے خود کو موت کے عذاب میں گرفتار پایا اور چلا کر اٹھ بیٹھی۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں اٹھ کر حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں جاگ گئی تھی۔ میرا منہ بند تھا لیکن چیخیں اب بھی دیواروں میں گونج رہی تھیں۔ یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ میں چیخیں صاف سن رہی تھی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی سچ مچ چیخ رہا ہے۔ یہ عشرت تھی میں دروازے سے نکل کر بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔ وہ مسہری پر دراز تھی اور اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ آنٹی صادقہ اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ یقیناً وہی پہلے والا معاملہ تھا۔ عشرت ضد کر رہی تھی اور آنٹی صادقہ بیچارگی سے کہہ رہی تھی کہ میں کیا کروں، کہاں سے لاؤں تمہارے ماں باپ کو، میں نے کچھ سنا نہیں لیکن بغیر سنے ہی میں ان کی ساری باتیں سمجھ رہی تھی۔ عشرت کا چہرہ اب پہلے سے زیادہ بیمار دکھائی دیتا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر میرے سینے میں ہوک سی اٹھ جاتی تھی۔

اسی دوپہر کا واقعہ ہے میں شربت کا گلاس لے کر عشرت کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا اور جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔ کمرے میں ایک ایسی صورت نظر آئی تھی جس کا میں یہاں تصور بھی نہ کر سکتی تھی.......... خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ میڈم نادرہ سے یوں ملاقات ہو گی۔ چند لمحوں کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے ابھی کل رات والا خواب ہی دیکھ رہی ہوں.......... میڈم نادرہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر برسا.......... غالباً آنٹی صادقہ سے اس کی جان پہچان تھی۔ شاید ہمارے ہی گھر میں کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ وہ عشرت کی مزاج پرسی کے لئے آئی بیٹھی تھی۔ ممکن سوال یہ تھا کہ آنٹی صادقہ نے تو ابھی رشتے داروں میں بھی کسی کو عشرت (زرینہ) کی واپسی کا نہیں بتایا تھا۔ پھر میڈم نادرہ سے اس کا ایسا خاص کیا تعلق تھا جو اسے بتا دیا۔ شاید وہ اتفاقاً خود ہی چلی آئی تھی............

گھر میں میڈم نادرہ کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی میں سنگین اندیشوں کی زد میں آگئی۔ اگر اس عورت کو پتہ چل جاتا کہ میں اس چار دیواری میں ہوں تو وہ بلائے ناگہانی کی طرح مجھ سے چمٹ جاتی اور ایک گھنٹے کے اندر اندر میرے ہر دشمن کو میری سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں جلدی سے واپس ہوئی اور مکان کی پچھلی جانب ایک چھوٹے سے بیڈ روم میں چلی گئی۔ یہ بیڈ روم زیادہ تر بند رہتا تھا اور اس وقت میرے لئے مناسب پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اٹیچ باتھ روم بھی تھا اگر زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تو میں باتھ روم میں بھی جا سکتی تھی۔ ابھی مجھے اس کمرے میں آئے بمشکل ایک منٹ ہی ہوا تھا کہ آنٹی صادقہ کے قدموں کی آواز آئی اور اس کے ساتھ وہیل چیئر کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ دونوں صحن سے اس طرف آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے باتھ روم کی تاریکی میں گھس گئی۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر چلی آئیں۔ میں یہ جان کر حیران ہوئی کہ میڈم نادرہ سسکیوں سے رو رہی ہے۔ پھر ایکا ایکی جیسے اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے دروازے کی درز سے جھانکا۔ آنٹی صادقہ نے تیزی سے بڑھ کر کمرے کا بیرونی دروازہ بند کیا اور میڈم نادرہ کو بازوؤں سے تھام کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میڈم نادرہ چیئر پر بیٹھی بیٹھی آنٹی صادقہ

سے لپٹ گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں یہ راز بالکل نہیں آ رہا تھا۔ میڈم نادرہ کا یہاں پہنچنا ہی کم اسرار انگیز نہیں تھا اب بند کمرے میں اس کی یہ آہ و بکا اور بھی حیرتناک تھی۔ میڈم نادرہ کی روتی بلکتی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو گیا صادقہ! میری بیٹی کو کس جرم کی سزا ملی ہے۔ کیا گناہ کیا تھا اس نے؟"

صادقہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "حوصلہ کرو نادرہ شکر کرو وہ زندہ ہے۔"

میڈم نادرہ کی آواز آئی "تم اسے زندہ کہتی ہو صادقہ.......... ہائے میری پھول سی بچی۔ ظالموں نے اسے مسل کر رکھ دیا۔ وہ کہیں کی نہیں رہی۔ اس سے تو مرجاتی تو اچھا تھا۔ ہائے.......... میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے صادقہ مجھے کہیں سے زہر لادے۔ میں یہ درد نہیں جھیل سکتی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔"

آنٹی صادقہ سنبھال رہی تھیں اور نادرہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں بڑی کربناک تھیں۔ ایک بڑے انگلش میڈیم اسکول کی پرنسپل اور مشہور معروف سماجی شخصیت میڈم نادرہ کی یہ حالت میرے لئے بے حد تعجب خیز تھی.......... میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دونوں عورتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ عشرت یعنی زرینہ میڈم نادرہ کی بیٹی ہے.......... میڈم نادرہ ہی وہ عورت ہے جس کی بیٹیوں کو صادقہ نے ماں بن کر پالا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا.......... میڈم نادرہ اپنی بیٹیوں سے دور کیوں رہی۔ یہ سوال بہت اہم تھا۔ میری نگاہوں میں اپنی بڑی بھابی ثمینہ کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کا مطلب تھا وہ بھی میڈم نادرہ کی بیٹی ہے.......... میڈم نادرہ جس نے مجھ پر زمین تنگ کر رکھی تھی اور ہواؤں میں میری بو سونگھتی پھرتی تھی۔ میں نے سچ بولنے کا وعدہ کر رکھا ہے' اس لئے سچ کہتی ہوں کہ اپنی دشمن میڈم نادرہ کو یوں تڑپتے بلکتے دیکھ کر مجھے بالکل ترس نہیں آیا بلکہ ایک طرح کا سکون اور اطمینان محسوس ہوا۔ میرا دل چاہا وہ اور روئے تڑپے' میری طرح دیواروں سے سر ٹکرائے اور سینہ کوبی کرے۔ یہ عورت شیطانیت سے لبالب بھری ہوئی تھی اور اس کے لئے میرے پاس بددعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

آنٹی صادقہ بڑی بدحواس نظر آتی تھی۔ اس نے کہا "نادرہ تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاؤ بہتر ہے۔ میں تمہیں بعد میں سب کچھ بتاؤں گی۔

آؤ میں تمہیں پچھلے دروازے سے نکال دیتی ہوں۔ گلی سے ہو کر گاڑی کی طرف چلی جانا.......... وہ اس کی کرسی کو برآمدے کی طرف دھکیلنے لگی۔

میڈم نادرہ نے بریک لگا کر کرسی روک لی۔ روتے ہوئے بولی "صادقہ کیا بات ہے تم بتاتی کیوں نہیں ہو' اور کون ہے یہاں؟"

آنٹی صادقہ نے تیز سرگوشی میں کہا "جو لڑکی زرینہ (عشرت) کو یہاں لائی ہے' پتہ ہے کون ہے؟"

"کون ہے؟" نادرہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ثناء" آنٹی صادقہ نے جواب دیا.......... یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا شیشہ زوردار چھناکے سے کمرے کے بیچوں بیچ ٹوٹ گیا ہے۔ دروازے کی اوٹ سے میری نگاہ میڈم نادرہ کے چہرے پر پڑی۔ اس کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں حیرت سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ آنٹی صادقہ نے اس کی کرسی دھکیلتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی لیکن یہاں سے نکلنے والی بات کرو۔ وہ اوپر والے کمرے میں ہے' کسی وقت بھی نیچے آسکتی ہے"

اس وقت نہ جانے کیا ہوا۔ میرے اندر سے غم و غصے کی ایک بلند لہر اٹھی اور میں دو قدم چل کر دروازے کے پیچھے سے نکل آئی۔ آہٹ سن کر آنٹی صادقہ اور نادرہ نے بیک وقت گھوم کر دیکھا۔ میڈم نادرہ پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ ہوا۔ اس دفعہ آنٹی صادقہ بھی اس حیرت میں برابر کی شریک تھی۔ وہ صاف طور پر ہراساں نظر آئی۔ ہکلا کر بولی۔

"ثناء.......... یہ.......... یہ نادرہ بہن ہیں۔ زرینہ کی خیریت پوچھنے آئی تھیں۔"

میں نے کہا "آپ کے چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا آنٹی.......... میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ مجھے پتہ ہے یہ زرینہ کی خیریت پوچھنے کیوں آئی ہیں۔"

میڈم نادرہ کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ آنٹی صادقہ بھی خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں نے میڈم نادرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تمہاری بیٹی پچھلے سات سال سے بازار حسن کی زینت تھی۔ لگے ہاتھ اب ایک اخباری بیان اس کے بارے میں بھی دے دو۔ کہہ دو کہ

میری بیٹی سرطان کا پھوڑا ہے۔ ایسی عورت اپنے خاندان کے لئے ہی نہیں پورے معاشرے کے لئے بدنامی کا داغ ہوتی ہے۔ میری بیٹی کو سرعام سنگسار کیا جانا چاہئے۔"

میڈم نادرہ سکتے کی حالت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بمشکل اپنے لبوں کو حرکت دے کر بولی "تم......... زرینہ کو......... لے کر آئی ہو؟"

میں نے کہا "تمہیں کوئی شک ہے؟"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں مستحکم قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" آنٹی صادقہ نے کراہ کر پوچھا۔

"میں اپنے بڑے بھائی کو ایک ٹیلیفون کال کرنے جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"انہیں ان کی نئی ساس کے بارے میں بتاؤں گی' اور اس سالی کا تعارف بھی کراؤں گی جو پچھلے سات سال سے بیرون ملک "زیر تعلیم" ہے۔"

میرے اس فقرے نے میڈم نادرہ کو تڑپا کر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتی ہوئی مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کی خود سر مغرور اور خوفناک عورت چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور وہ کرسی سمیت لپک کر میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ایک بار پھر اس کی گھٹی گھٹی سی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ وہ اپنی ناک میرے پیٹ پر رگڑ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔

"خدا کے لئے بیٹی......... خدا کے لئے میری دونوں بیٹیاں برباد ہو جائیں گی۔ میرا سب کچھ لٹ جائے گا۔ تمہیں تمہارے ماں باپ کا واسطہ' مجھے معاف کر دو کسی سے کچھ نہ کہنا۔ کسی کو کچھ نہ بتانا......... میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

وہ پوری قوت سے میری ٹانگوں کو جکڑ کر مجھے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میری آنکھوں میں اپنے پیاروں کے مرے ہوئے چہرے گھوم رہے تھے۔ ان کی آخری ہچکیاں کانوں میں طوفان اٹھا رہی تھیں۔ میڈم نادرہ کی منحوس آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچتی۔ اس کی التجاؤں کا منظر میری نگاہوں میں کیونکر آتا۔

میں دروازے کی طرف بڑھتی رہی۔ وہیل چیئر الٹ گئی اور فربہ اندام میڈم نادرہ میرے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ لرزتی کانپتی آنٹی صادقہ نے میرے سامنے دروازہ بند کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹا دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ میڈم نادرہ ابھی تک میرے ساتھ گھسٹ رہی تھی اور فریاد کناں تھی۔

"ہم پر رحم کرو ثناء......... ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ خدا کے لئے ہماری بات مان لو۔"

یقیناً اس وقت کوئی مجھے نہ روک سکتا تھا۔ نہ آنٹی صادقہ' نہ میڈم نادرہ نہ عشرت اور نہ گرفتاری کا خوف۔ لیکن اس وقت ایک معصوم سے چہرے نے روک لیا۔ یہ چہرہ میرے تصور میں آیا اور اس نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ یہ میرے پانچ سالہ بھتیجے شعیب کا چہرہ تھا۔ وہ نمناک آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"پھوپھو میری ماں پر ترس کھاؤ۔ اگر تم نے میری ماں پر ترس نہ کھایا تو میں بھی دربدر ہو جاؤں گا۔ میرا آشیانہ بکھر جائے گا۔ وہ تنکے بکھر جائیں گے جن پر میری اور تمہارے پیار کی نشانیاں ثبت ہیں۔ کیا تم مجھے رلانا چاہتی ہو۔ مجھے' پنکی اور گڈو کو گلیوں میں بھٹکانا چاہتی ہو۔ ایک مدت سے تم نے ہمیں کوئی ٹافی لا کر نہیں دی۔ کوئی کہانی نہیں سنائی۔ ان ساری کہانیوں اور ٹافیوں کے بدلے جو تمہاری طرف رہ گئی ہیں اور ان ساری کہانیوں اور ٹافیوں کے بدلے جو تمہاری طرف رہ جائیں گی' میری یہ چھوٹی سی بات مان لو۔ اس ظالم عورت کو معاف کر دو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میری ماں کو بھی........."

یکایک میری ٹانگوں کی طاقت زائل ہو گئی۔ میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ میڈم نادرہ نے مجھے رکتے دیکھا تو اور زور سے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ آنٹی صادقہ نے بھی آکر مجھے تھام لیا۔ اتنے میں عشرت کے کمرے سے اس کی آواز آنے لگی۔ وہ پکار کر پوچھ رہی تھی کہ کون ہے اور یہ شور کیا ہے۔ آنٹی صادقہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بات نہیں پڑوس سے آواز آئی ہو گی۔ پھر وہ مجھے کندھوں سے تھام کر اندر لے جانے لگی۔ میں نے نیچے گری ہوئی نادرہ کو دیکھا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "میڈم تم عورت نہیں ایک ڈائن ہو۔ تم نے میرے معصوم فرحان کو کھایا ہے۔ تمہاری گردن پر عابد اور فرخندہ کے خون کے چھینٹے ہیں۔ میں تم سے انتقام لوں گی۔ مگر اس وقت ثمینہ کے معصوم بچوں کے

صدقے میں تجھے معاف کرتی ہوں۔" آنٹی صادقہ مجھے دھکیلتے ہوئے اندر لے گئی اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر گئی۔ میں کسی بے جان شے کی طرح مسہری پر لڑھک گئی اور چہرہ بازوؤں میں چھپا کر اپنی جلتی آنکھوں سے آنسو ٹپکانے کی ناکام کوشش کرنے لگی.......... آدھ پون گھنٹے بعد آنٹی صادقہ واپس آئی۔ وہ میڈم نادرہ کو رخصت کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اندیشوں کے گہرے سائے تھے.......... اس رات دیر تک وہ میرے پاس بیٹھی رہی اور اس کہانی کی گرہیں کھولتی رہی جس نے برسوں سے اسے اور نادرہ کی دونوں بیٹیوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس کہانی کا کچھ حصہ عشرت بھی مجھے سنا چکی تھی۔ آنٹی صادقہ نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ کیوں یوں ہے۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب میڈم نادرہ اور آنٹی صادقہ، لڑکپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھیں۔ دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ میڈم نادرہ کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ جبکہ صادقہ ایک ہیڈ کلرک کی بیٹی تھی اور یہ لوگ بمشکل سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔ دونوں سہیلیاں خوبصورت تھیں۔ خوش گفتار اور چنچل تھیں۔ ان کی زندگی امنگ ترنگ کے ہر رنگ سے سجی ہوئی تھی۔ فارغ وقت میں وہ کالج کی لائبریری میں بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں من پسند کتابوں سے دل بہلاتیں۔ دونوں ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ندیم شیرانی کی بہت دلدادہ تھیں۔ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کی تحریریں پڑھیں تھیں اور اسے اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ تھا بھی ایک خوش شکل اور خوبصورت نوجوان۔ چند مشاعروں میں نادرہ اور صادقہ اس سے آٹوگراف بھی لے چکی تھیں۔ پروگرام بنا کر انہوں نے ایک دفعہ ندیم شیرانی کو مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں گھیر لیا اور بہت دیر اس کا دماغ چاٹتی رہیں۔ یہ ملاقات بعد ازاں ملاقاتوں کے ایک سلسلے کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ وہ تینوں مختلف جگہوں پر ایک دوسرے سے ملتے رہے اور ایک دوسرے کو جانتے رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آگیا جب نادرہ اور صادقہ نے آپس میں فیصلہ کرنا تھا کہ ان دونوں میں سے کس نے ندیم کے ساتھ آگے بڑھنا ہے اور کس نے یہیں سے واپس لوٹ جانا ہے۔ اس مرحلے میں صادقہ نے قربانی دی اور خاموشی کے ساتھ ان دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ندیم شیرانی سے محبت نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کی محبت نادرہ سے زیادہ قدیم اور شدید تر تھی۔ مگر وہ ندیم شیرانی کو

سکھی اور خوشحال دیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ خوشی اور خوشحالی کی اسے نادرہ سے ہی مل سکتی ہے۔ وہ مفلس شاعر کے گھر کو لاکھوں کے جہیز سے بھر سکتی تھی جبکہ صادقہ کے پاس ایک محبت بھرے دل اور ایک خالی دامن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ صادقہ کے راستہ بدلنے کے سات آٹھ ماہ بعد ہی ندیم شیرانی اور نادرہ کی شادی ہو گئی۔ نادرہ کے گھر والے شیرانی کو گھر داماد رکھنا چاہتے تھے لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال انہوں نے بڑے طمطراق سے نادرہ کو رخصت کیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئی اور اس کے والد نے ندیم شیرانی کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں بھی مدد دی۔ شادی کے بعد ایک سال تک تو ٹھیک رہا مگر پھر حالات بتدریج خراب ہونے لگے۔ ندیم شیرانی کی طبیعت میں خودداری تھی۔ مگر جو کچھ وہ اپنی سسرال کی طرف سے قبول کر چکا تھا وہ اس کے گلے کی ہڈی بن گیا تھا۔ نہ اگل سکتا تھا اور نہ نگل سکتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے نادرہ یا اس کے والدین کی طرف سے کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی جس پر وہ پہروں کڑھتا رہتا تھا۔ آخر اپنی خودداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے خود کو سسرال کے ہر بوجھ سے آزاد کر لیا۔ کاروبار ختم کر کے ایک اخبار میں سب ایڈیٹر کی نوکری کر لی اور اپنی قوت بازو سے زندگی کی گاڑی کھینچنے لگا۔ نادرہ کو یہ تھرڈ کلاس زندگی کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ شروع ہی سے فیشن پرست تھی اور سوسائٹی کے حلقوں میں بن ٹھن کر گھومنا اس کی ہابی تھی۔ اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ندیم شیرانی نے شب و روز محنت کی یہاں تک کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کو روگ لگا بیٹھا لیکن نادرہ پھر بھی "سکھی" نہ ہوئی۔ ان کے اختلافات دن بدن بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ طلاق تک نوبت آگئی۔ ان کی دو بچیاں بھی تھیں۔ وہ بچیاں اس کشمکش کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ عدالت کے بکھیڑے شروع ہوئے۔ آخر ایک روز یہ نتیجہ نکلا کہ نادرہ بچیوں کو باپ کے پاس چھوڑ کر اور علیحدگی کا پروانہ لے کر والدین کے گھر پہنچ گئی.......... اگلے دو تین ماہ میں ندیم شیرانی کی حالت مزید خراب ہو گئی اور وہ رات دن خون تھوکنے لگا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ بڑی بچی ثمینہ کی عمر اس وقت چھ سال اور چھوٹی زرینہ کی چار سال تھی۔ باپ ان کا واحد سہارا تھا اور وہ بھی موت کی دہلیز پر تھا۔ ایسے وقت میں بدنصیب شاعر کی وہ دوسری پرستار آگے بڑھی جو ایک روز چپکے سے اپنا راستہ الگ کر گئی تھی اور جس نے اپنی پرخلوص چاہت کو سیپ کے موتی

کی طرح چھپا کر گہرے تاریک پانیوں میں اتار دیا تھا.......... یعنی صادقہ.......... وہ اب ایم اے کر چکی تھی اور گارمنٹس ڈیزائننگ کے ایک کورس کے بعد برسر روزگار تھی۔ اس کی والدہ ایک جگہ اس کی شادی کی بات بھی چلا رہی تھی اور توقع تھی کہ جلد ہی رشتہ طے ہو جائے گا۔ لیکن اس موقعے پر صادقہ نے اپنی مخلص اور بے لوث محبت کے لئے پھر ایک یادگار قربانی دی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ ایک روز ندیم شیرانی کے محلے داروں نے دیکھا کہ خون اگلتے اور دم توڑتے شاعر کے گھر میں ایک سنجیدہ صورت لڑکی جھاڑو دے رہی ہے اور اس کی بچیوں کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ جس چار دیواری کے پاس سے گزرنا لوگ پسند نہیں کرتے وہاں ایک صحت مند خوب رو لڑکی کا کیا کام ہے۔ کسی نے کہا یہ ندیم شیرانی کی کوئی عزیز ہے۔ کسی نے کہا رائٹرز گلڈز والوں نے نرس بھیجی ہے۔ کسی نے کہا یہ شیرانی کا کوئی پرانا چکر ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بہرحال صادقہ تن دہی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ اس نے ندیم شیرانی کے آخری دنوں کو بہت سہل بنا دیا۔ صادقہ کے آنے کے پندرہ بیس روز بعد ہڈیوں کے ڈھانچے سے زندگی کی آخری رمق بھی رخصت ہو گئی۔ ندیم شیرانی کی موت کے گیارہویں روز صادقہ نے اس کی دونوں بچیوں کو لیا اور حیدر آباد چھوڑ کر خاموشی سے کراچی روانہ ہو گئی۔ یہاں اس نے کرایے کا مکان لیا اور ایک جگہ ملازمت کر کے اپنا اور بچیوں کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے اب ندیم کی بچیاں ہی جینے کا سہارا تھیں۔ دو ڈھائی برس اسی طرح گزر گئے۔ صادقہ کو نادرہ اور اس کے گھر والوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں' کیا کرتے ہیں۔ وہ حیدر آباد میں اپنا آبائی مکان چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو چکے تھے۔ ایک روز نادرہ نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتی اور کھوج لگاتی ہوئی کراچی میں صادقہ کے گھر آپہنچی۔ اس کا حسن اب پہلے سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ اور وہ بڑے امیرانہ لباس میں تھی۔ اپنی بچیوں کو دیکھنے کی خواہش اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ صادقہ کو پتہ چلا کہ نادرہ دوسری شادی کر چکی ہے اور جھنگ میں اپنے زمیندار شوہر کے ساتھ ٹھاٹ کی زندگی گزار رہی ہے نادرہ کے والدین نے یہ دوسری شادی کرتے ہوئے نادرہ کو کنوارہ ظاہر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بچیوں سے ملنے کے لئے بہت چھپ چھپا کر یہاں تک پہنچی تھی.......... اس کے بعد ماں بیٹیوں کے ملاپ کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ نادرہ تین چار ماہ بعد

نہایت خاموشی سے کراچی آتی اور بچیوں سے ملنے صادقہ کے گھر پہنچ جاتی۔ تاہم بچیوں کو اس بارے میں بالکل نہیں بتایا گیا کہ گاہے بگاہے ان کے گھر آنے والی اور ان کے لئے تحفے تحائف لانے والی عورت درحقیقت ان کی ماں ہے۔ وہ اسے اپنی ماں کی کوئی عزیز سہیلی سمجھتی تھیں.......... اور یہ بے خبری کئی سال گزرنے کے باوجود آج تک قائم تھی۔ اسی دوران وہ واقعہ رونما ہو گیا جس میں عشرت (زرینہ) اشرف نامی نوجوان کے فریب کا شکار ہو کر غلط کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ نہ صرف وہ اپنی عزت گنوا بیٹھی بلکہ اس کی قابل اعتراض تصاویر ایک خطرناک شخص کے قبضے میں آ گئیں۔ سالار نامی وہ شخص بڑی مہارت کے ساتھ عشرت کی نفسیات سے کھیلا اور بالآخر اسے بے بس کر کے گناہوں کی دنیا میں کھینچ لے گیا۔

اس واقعے کے دو تین سال بعد ہی میڈم نادرہ کی اپنے دوسرے شوہر سے بھی علیحدگی ہو گئی اور وہ لاہور میں اپنے بھائی کے گھر آ بیٹھی۔ اس نے اپنا حق مہر بذریعہ عدالت حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے پاس کافی رقم تھی۔ اس نے اپنا ایک انگلش میڈیم اسکول کھول لیا اور فارغ البالی کے دن گزارنے لگی۔ بظاہر اسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی لیکن اندر ہی اندر ایک روگ بھی لگا ہوا تھا۔ اپنی گمشدہ بیٹی کا روگ۔ اس کا کھوج لگانے کے لئے اس نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ مگر ناکام ہوئی تھی۔

آخر ساڑھے چھ برس بعد آج اسے اپنی بیٹی کا پتہ چلا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ وہ سرتاپا دکھ اور اذیت کے پسینے میں ڈوب گئی تھی۔ جس بیٹی کی صورت دیکھنے کے لئے وہ دن رات ترسی تھی اور جسے دور دور تک تلاش کراتی رہی تھی۔ وہ اسی شہر کی ایک "غلیظ" بستی میں موجود رہی تھی اور اپنے گھائل جسم پر ذلت کے عذاب جھیلتی رہی تھی.......... شاید یہ میڈم نادرہ کے لئے صلہ تھا ان تمام زیادتیوں اور ناانصافیوں کا جو اس نے کسی دوسرے کی بیٹی سے روا رکھی تھیں۔ قدرت کا یہ انتقام کتنا واضح اور دو ٹوک تھا۔ میڈم نادرہ کے رویے نے مجھے ذلیل و خوار کر کے جس بستی تک پہنچایا تھا اس کی اپنی بیٹی بھی اسی بستی سے برآمد ہوئی تھی اور اس حالت میں کہ اس بیچاری کے دامن میں پچھتاوے اور موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

پوری روئیداد سنانے کے بعد آنٹی صادقہ نے ایک بار پھر مجھ سے درخواست کی کہ

یہ راز ہمیشہ کے لئے میرے سینے میں دفن ہو جائے ورنہ وہ تینوں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ انہوں نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا کہ ایک دو ماہ تک وہ شہر چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں جا کر آباد ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کوئٹہ کے قریب نوشکی چلی جائیں۔ وہاں ان کا ایک منہ بولا بھائی رہتا ہے۔ آنٹی صادقہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عشرت کا سایہ بھی بھابی ثمینہ اور اس کی زندگی پر ڈالنا نہیں چاہتی۔

اگلے روز کا واقعہ ہے۔ نو بجے کے قریب آنٹی صادقہ دکان پر چلی گئیں تو میں عشرت کے پاس آبیٹھی اور اس کی دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد عشرت نے شکایت کی کہ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا ہے۔ میں نے اس کو زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اس نے کہا گلوکوز پینے کو دل چاہتا ہے۔ جس ادھیڑ عمر ملازمہ مختار کا میں نے ذکر کیا ہے وہ باورچی خانہ دھونے میں مصروف تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور برقعہ ڈال کر خود ہی گلوکوز لینے چلی گئی۔ جنرل اسٹور زیادہ دور نہیں تھا۔ کافی بھرا پرا بازار تھا۔ میں گھر سے قریباً ایک فرلانگ آگے آئی ہوں گی کہ بازار میں ٹریفک جام نظر آئی سب سے آگے ایک اینٹوں والا ٹرک اور سریے سے لدی ہوئی بیل گاڑی سر جوڑے کھڑے تھے اور ان کے پیچھے دونوں طرف کافی دور تک گاڑیوں رکشاؤں اور تانگوں وغیرہ کی دو قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ایسے مناظر ہماری سڑکوں پر عام دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن جس منظر نے مجھے چونکایا وہ ایک سرخ ٹویوٹا جیپ کا منظر تھا۔ میں دیکھتے ہی پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ چنگیزیوں کی جیپ تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے افراد بھی چنگیزیوں کے کارندے تھے۔ یہ جیپ بھی دوسری گاڑیوں کے ساتھ بڑی دھیمی رفتار سے آگے کو کھسک رہی تھی۔ جیپ کا دایاں اشارہ روشن تھا جس کا مطلب تھا وہ اسی گلی میں مڑے گی جس کے آخری سرے پر آنٹی صادقہ کا گھر ہے۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جگہ جگہ میری بو سونگھنے والے پالتو کتے تھوڑی ہی دیر بعد آنٹی صادقہ کے دروازے پر بھونکنے والے تھے۔ میں الٹے پاؤں واپس مڑی اور قریباً بھاگنے والے انداز میں دوبارہ گھر چلی گئی۔ میری بدلی ہوئی رنگت دیکھ کر ملازمہ مختار نے پوچھا "کیا ہوا بیٹی؟"

میں نے کہا "اماں، وہ چنگیزیوں کے بندے پھر یہاں آ رہے ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔

آنٹی صادقہ کو میری طرف سے خدا حافظ کہہ دینا.......... اور ہاں برآمدے سے میری چارپائی اٹھا دو اور بستر لپیٹ کر کہیں چھپا دو اور چھت پر میرا دھلا ہوا جوڑا پڑا ہے۔ وہ بھی صندوق میں رکھ لو۔ میری کوئی نشانی یہاں نہیں رہنی چاہئی۔"

مختار کو مختلف ہدایات دیتی ہوئی میں عشرت کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ مسہری پر نیم دراز حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں اسے تشویش میں مبتلا کر رہی ہوں۔ بہرحال محتاط لفظوں میں نرمی کے ساتھ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ میرا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی اور میرے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ میں جوتی پہن کر اور اپنا چھوٹا سا پرس لے کر اس سے رخصت ہونے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ میں نے جلدی سے مسہری پر بیٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے رخسار چومتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنا حوصلہ بلند رکھے۔ انشاء اللہ بہت جلدی وہ ٹھیک ہو گی اور ہم دوبارہ ملیں گے۔

عشرت نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ میرے گلے سے لگی سسکتی رہی اور اسی حالت میں کہنے لگی.......... "شاہدہ، بابری.......... تمہیں بہت چاہتا ہے.......... تمہارے حالات سنبھل جائیں.......... تو اس سے.......... شادی کر لینا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا.........." یہاں تک کہہ کر چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے میری طرف سے جواب کی توقع کر رہی ہو، پھر اوپر تلے کئی ہچکیاں لے کر بولی "اور ہاں.......... جب کبھی وہ تمہیں ملے تو اس سے کہنا کہ مجھے معاف کر دے.......... میں نے اپنی نادانیوں سے اسے بہت ستایا ہے۔ میں اس قابل نہیں تھی.......... کہ میرا سایہ بھی اس پر پڑتا۔"

میں نے کہا "دیکھو ایسی بے معنی باتیں کر کے خود کو دکھ مت پہنچاؤ۔ تمہاری توجہ صرف اپنی صحت پر ہونی چاہئے.........."

یکایک بیرونی گیٹ کے پاس کسی گاڑی کا وزنی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کال بیل گونج اٹھی۔ میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"عشرت! وہ لوگ آ گئے ہیں۔ میں اب چلتی ہوں۔"

عشرت سے رخصت ہو کر میں کمرے سے باہر نکلی اور عقبی دروازے سے نکل کر گلی میں آ گئی۔

تھوڑی دور آکر مجھے ایک خالی رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر میں بادامی باغ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں سے مجھے بس پکڑ کر ایک بار پھر جھنگ کا رخ کرنا تھا۔ اپنے پروگرام کے مطابق میں آنٹی صادقہ کے گھر سے کل نکلنا چاہتی تھی' مگر چنگیزیوں کی آمد کے سبب فوری طور پر گھر چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ اب مجھے ایک رات کہیں نہ کہیں گزارنا تھی۔ لاہور میں یا جھنگ میں۔ تاکہ جمعرات کے روز "بڑی حویلی" پہنچ سکوں' اور بھک منگوں کی اس قطار میں شریک ہو سکوں جنہیں وہاب چنگیزی اپنے ہاتھوں سے نوازتا تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک نامعلوم کشش مجھے وہاب کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی۔ وہاب کو جہنم واصل کرنے کے سوا میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف' ہوا میں فضا میں اور در و دیوار میں وہاب ہی وہاب نظر آتا تھا۔ میں ایک چیونٹی تھی مگر میرے دل میں ایک ہاتھی کو ہلاک کرنے کا عزم تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں کامیاب ہوں گی کیونکہ میرے ساتھ میرے پیاروں کی آخری سانسیں سفر کر رہی تھیں ان کی بے گناہی کا احساس میرے وجود کو ناقابل شکست ہمت عطا کر رہا تھا۔ حالات نے' معاشرے نے اور قانون نے مجھے وہاب کے مقابل تنہا چھوڑ دیا تھا۔ مگر تنہا ہو کر بھی میں تنہا نہیں تھی۔ جیسے شدید گھٹن کے بعد آندھی آتی ہے۔ ایسے ہی بے بسی کی انتہا نے مجھے لامتناہی اختیار کی پہلی سیڑھی پر لا کھڑا کیا تھا۔ اب دیکھنے کو میں تنہا تھی مگر میرے ساتھ منہ زور جذبوں کا ایک سیل رواں چل رہا تھا۔ یہ کچھ مجھے ہی معلوم تھا کہ ان منہ زور جذبوں کو لگام ڈال کر میں نے آنٹی صادقہ کے گھر یہ چند دن کیسے گزارے تھے۔ میں ساری ساری رات جاگی تھی اور ہر ہر پل اس "جمعرات" کا انتظار کیا تھا جو مجھے ایک بار پھر وہاب کے روبرو کر سکتی تھی۔ اپنے تیز دھار آلے کے ساتھ اس کی منحوس گردن تک پہنچنے کا موقع دے سکتی تھی۔ یہ وہی تیز دھار آلہ تھا جس سے میں نے حویلی میں پہریدار جان مسیح کی گردن پر وار کیا تھا۔ بعد ازاں باجو اور طفیلے نے میری بیہوشی کے دوران یہ آلہ (استرا) میرے لباس سے نکال کر کمرے کے روشندان میں پھینک دیا تھا۔ ایک روز کھڑکی کی گرل کاٹتے ہوئے سوئنگی کو لکڑی کے ایک ٹکڑے کی ضرورت پڑی۔ لکڑی

ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ اس روشندان تک جا پہنچا جہاں یہ استرا پڑا تھا۔ یوں استرا ایک بار پھر میری دسترس میں آ گیا۔

رکشہ مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا بادامی باغ بس اڈے پر پہنچ گیا۔ میں جھنگ جانے والی بس کے انتظار میں ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ موسم اب کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ دھوپ میں کھڑے ہونے سے گرمی لگتی تھی۔ سائے کے لالچ میں میں ایک پانوں سگریٹوں کے کھوکھے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میں ہر چیز کو "طائرانہ" نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ یہی وہی نگاہ تھی جو پھانسی پانے والا تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے قرب و جوار پر ڈالتا ہے۔ وہ آگاہ ہوتا ہے کہ ان مناظر کو' اس زمین کو اور اس نیلے آسمان کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ میں بھی موت کی مسافر تھی۔ اس ظلم کی جاگیر سے میرے زندہ لوٹنے کا امکان بہت کم تھا۔

اپنے کان کے قریب مجھے ایک سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ "کوئی خدمت ہو تو بتاؤ جناب۔" میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک شخص جو ابھی کھوکھے کے عقب سے نکلا تھا بظاہر لاتعلقی سے میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ ڈبی دار شلوار قمیض گلے میں بڑا سا تعویذ۔ اس کا حلیہ ہرگز شریفانہ نہیں تھا۔ جی چاہا گھوم کر ایسا تھپڑ اس کے منہ پر ماروں کہ دور تک آواز جائے' لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانا مشکل تھا۔ مجمع لگا کر میں کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میری خاموشی دیکھ کر اس شخص کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ چند انچ میری طرف کھسک آیا اور بولا "دیکھو' ناراض نہ ہو جانا۔ اس طرح تمہارا یہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ وہ سامنے میری ویگن کھڑی ہے۔ جہاں جانا ہے میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں کسی بس سے اتری ہوں۔ میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے کہا "تم اپنا کام کرو' مجھے معلوم ہے میں نے کہاں جانا ہے اور کس پہ جانا ہے۔" جواب میں اس نے ایک فحش سی مسکراہٹ کے ساتھ ایسا جملہ کہا کہ میں خود پر بالکل قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے اسے سخت لہجے میں دفع ہو جانے کے لئے کہا میری بلند آواز سن کر اور بھی کئی افراد ہماری طرف دیکھنے لگے۔ کچھ چہروں پر مسکراہٹ اور کچھ پر لاتعلقی نظر آئی۔ وہ شخص تو مجھے گھورتا ہوا واپس چلا گیا لیکن اب اور بہت سی آنکھیں میرے چاروں طرف گردش کرنے لگی تھیں۔ ان آنکھوں کے مالک زیادہ تر ڈرائیور اور کنڈیکٹر

تھے۔ میں نے اخباروں میں کئی دفعہ پڑھا تھا کہ اکیلی عورتوں کو اسٹیشن اور بس اڈے پر مشکلات پیش آتی ہیں لیکن تجربہ پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ میرے ہی وطن عزیز کا کوئی حصہ ہے۔ یوں لگتا تھا میں کسی جنگل میں آ گئی ہوں اور درختوں کی اوٹ سے خون آشام جانور مجھے گھور رہے ہیں۔ شکر تھا کہ یہ دن کا وقت تھا اور اڈے پر رونق تھی۔ رات ہوتی اور یہ گہما گہمی نہ ہوتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس صورت حال کا ایک سبب میرا برقعہ بھی ہے۔ یہ وہی برقعہ تھا جسے پہن کر عشرت اپنے "دوزخ" سے نکلی تھی۔ برقعے کی تراش خراش مجھے قطعاً پسند نہیں تھی۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں میں نے اسے پہنا تھا۔ مشکل میں گرفتار ہو کر یہ احساس ہوا تھا کہ "بے وقار پردے" سے باوقار بے پردگی کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی چادر ہی میں نے سلیقے سے اوڑھ رکھی ہوتی تو اس بے ڈھنگے برقعے سے کہیں زیادہ تحفظ مجھے فراہم کرتی۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ مطلوبہ بس جلد آ جائے اور میں اس میں بیٹھ جاؤں۔ چار پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایک ڈنڈا بردار سنتری مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ سنتری نے قریب آ کر اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بی بی! کہاں جانا ہے تجھے۔ کہاں سے آئی ہو؟"

پہلے تو میرے دل میں آئی کہ اس خدائی فوجدار کو کوئی جواب نہ دوں۔ مگر میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے محتاط لہجے میں بتایا کہ مجھے فوری طور پر جھنگ جانا پڑ گیا ہے۔ بس کے انتظار میں یہاں کھڑی ہوں۔ میرے جوابات سے اس نے رائے قائم کی کہ میں خوفزدہ ہوں اور وہ مجھ پر رعب گانٹھ سکتا ہے کہنے لگا۔

"میرے ساتھ چلو۔ تمہیں بڑے تھانیدار صاحب بلا رہے ہیں۔"

"کہاں ہیں بڑے تھانیدار؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی لال گاڑی کے پیچھے۔" سنتری کا لہجہ رعب دار تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ بہت سی تماشائی نظریں ہم پر لگی ہیں اور اس جگہ تماشا بننا ٹھیک نہیں۔ میں خاموشی سے سنتری کے ساتھ چل دی۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جیسے مجھے ڈنڈے سے ہانک کر لا رہا ہو۔ میں بہت سبکی محسوس کر رہی

تھی مگر بگڑے ہوئے حالات کو مزید بگاڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ایک کچے راستے سے گزار کر وہ مجھے ایک پیلی بلڈنگ کے پچھواڑے لے آیا۔ یہاں ایک کمرے میں موٹی توند اور چربی دار جبڑوں والا ایک سب انسپکٹر پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو نو عمر لڑکے اور ایک پندرہ سالہ لڑکی بھی مجرموں کی طرح بینچ پر بیٹھے تھے۔ سب انسپکٹر نے کڑی نظروں سے مجھے سر تاپا گھورا اور ایک اسٹول پر بیٹھنے کو کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے کھردرے پن سے پوچھا۔

میں نے ایک فرضی نام بتایا۔ سب انسپکٹر نے مزید سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس کے طرز گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سمجھ رہا ہے۔ دونوں نو عمر لڑکے اور لڑکی بھی اسی الزام میں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ غالباً اڈے پر آوارہ گردی کرنے والوں کے خلاف کوئی مہم شروع کی گئی تھی۔ سب انسپکٹر کے لہجے میں تحکم اور آنکھوں میں بے باک چمک تھی۔ مجھے وہ بڑا کرخت شخص لگا۔ خاص طور پر وہ جو زبان استعمال کر رہا تھا وہ کسی طور بھی قانون کے محافظ کے شایان شان نہیں تھی۔ اتنے میں شلوار قمیض والا وہی شخص نظر آیا جو اسٹاپ پر مجھ سے ہمکلام ہوا تھا۔ اندر آ کر وہ بے تکلفی سے سب انسپکٹر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی سادے لباس میں پولیس والا ہی تھا۔ مجھ سے اس کی چھیڑ چھاڑ دراصل تفتیش کے زمرے میں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا اڈے پر پولیس والوں نے مشکوک افراد کے لئے جال بچھا رکھا ہے۔ میری بے خبری مجھے اس جال میں لے آئی تھی اور اب میں خود کو بری طرح پھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ سب انسپکٹر اور اے ایس آئی تو مجھے نہیں پہچان پائے تھے اور میں ان کے نزدیک صرف مشکوک لڑکی تھی لیکن عین ممکن تھا کہ ابھی کوئی آنکھ مجھے مفرور قاتلہ کے طور پر پہچان لے۔ میں نے سوچا مجھے جلدی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہئے۔ مگر کیسے؟ میری گھبراہٹ مجھے سب انسپکٹر کی نظروں میں مشکوک تر کر رہی تھی۔ وہ مجھے گھورتا ہوا خالص "پولیس والے انداز" میں اے ایس آئی سے بولا۔

"رمضان علی۔ کوئی زنانی بلا کر اس کی جامہ تلاشی تو لو۔ مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرے لباس میں چھپا ہوا آلہ تفتیش کا رخ کسی خطرناک سمت بھی موڑ سکتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں نواز حسنی کا خیال آیا۔ نواز

حسنی کے آفس کا نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ میں ایک کال کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے تمسخر سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کال کر کے تم کون سی توپ چلا لو گی۔ بہرحال میرے اصرار پر اس نے ٹیلی فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے نواز حسنی کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا۔ پرسنل سیکرٹری نے اٹھایا۔ خوش قسمتی سے نواز حسنی سے بات ہو گئی۔ میری آواز سنتے ہی وہ تقریباً چیخ پڑے۔

"شاہدہ۔ کہاں سے بول رہی ہو تم؟ تمہاری تلاش میں تو ہم نے زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔"

میں نے انہیں اپنے ٹھکانے سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ کرائمز برانچ کا ایک سب انسپکٹر مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انڈر سیکرٹری نواز حسنی سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سب انسپکٹر کو ریسیور دو۔ میں نے ریسیور سب انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بڑی شان سے ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ آواز سنتے ہی بدک کر رہ گیا۔ جلدی سے کرسی پر اٹین شین ہو گیا اور ہکلا ہو کر بولا۔ "جی......... جی جناب۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں جناب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ویری سوری سر........"

بات ختم کرنے کے بعد سب انسپکٹر نے ریسیور دوبارہ مجھے تھما دیا اور خود ایک طرف مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ نواز حسنی صاحب نے کہا۔

"مس ثناء! میں نے سب انسپکٹر کو سمجھا دیا ہے تم یہیں رکو۔ ابھی دس منٹ میں میرا آدمی تمہیں لینے کے لئے پہنچ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سر۔ میں انتظار کرتی ہوں۔"

جونہی سلسلہ منقطع ہوا سب انسپکٹر نے مجھے بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی اور معذرت وغیرہ کرنے لگا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہی طرح کی ہلچل تھی۔ سب انسپکٹر سے تو جان چھوٹ گئی تھی، کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ نواز حسنی کا آدمی پہنچنے سے پہلے ہی میں یہاں سے نکل جاتی۔ مجھے اب نواز حسنی، خان رحیمی یا چوہدری شہاب کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری منزل صرف اور صرف بڑی حویلی تھی۔ کسی دوسرے معاملے میں پڑ کر میں اپنی منزل کھوٹی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہاں سے نکلنے کے لئے کیا بہانہ تراشوں۔ پھر دل میں آئی کہ ایک دفعہ نواز حسنی سے مل ہی لوں۔ شاید کسی نئی بات کا پتہ

چل جائے۔ اسی کشمکش میں تھی کہ کمرے سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ نواز حسنی کی بھیجی ہوئی گاڑی آ گئی ہے اب ساتھ جانے کے سوا اور چارہ نہیں تھا۔ نواز حسنی نے ڈرائیور کے علاوہ اپنا اسسٹنٹ بھیجا تھا۔ ساتھ میں ڈینو بھی تھا۔ میں ڈینو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ پر گلابی اردو کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بتا رہا تھا کہ پچھلے دنوں مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا جاتا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نواز حسنی کی کوٹھی میں اس وقت خان رحیمی بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بوڑھی عورت بھی کل رات سے آئی ہوئی ہے اور وہ ہر صورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ڈینو نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ عورت سلیم کی ماں ہے۔ (یاد رہے کہ ڈینو بھی اب میرے اور سلیم کے اصلی ناموں سے آگاہ ہو چکا تھا) میں پریشانی کے عالم میں سوچنے لگی کہ سلیم کی ماں کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ سلیم سے میری آخری ملاقات نواں کوٹ والے مکان میں ہوئی تھی۔ جب آدھی رات کو اس نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور دروازہ نہ کھولنے پر مجھے گالیاں دیتا ہوا چلا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اب ڈینو کی زبانی اس کی ماں کا سن کر حیران ہونا یقینی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد نواز حسنی کی بھیجی ہوئی گاڑی مجھے ان کی کوٹھی کے سامنے اتار رہی تھی۔ یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جس میں میں نے رئیس احمد کو نواز حسنی صاحب کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھا تھا اور جہاں سے اختر زماں کو دیکھ کر میں بھاگ نکلی تھی۔ یہ شہر کے مشرقی علاقے میں کینٹ کے پاس ایک اور بنگلہ نما کوٹھی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی میری آمد کی خبر یہاں پہنچ چکی تھی۔ دروازے پر ہی خان رحیمی نے اپنے خطرناک برنارڈ کتوں کے ہمراہ میرا استقبال کیا۔ اس کے اردگرد محافظ موجود تھے۔ وہ خود بھی مسلح اور چوکس نظر آتا تھا۔ خان رحیمی کو ایسے الرٹ موڈ میں میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ تھے، لہٰذا لمبی چوڑی داستانیں سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ خان رحیمی مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا۔ اس نے میرے بھائی اور اس کے اہل خانہ کی موت پر تعزیت کی اور اس بات سے سو فیصد اتفاق کیا کہ یہ کوئی عام واردات نہیں اور اس المناک واقعے کے ذمے دار صرف اور صرف چنگیزی ہیں۔ خان رحیمی نے بتایا کہ وہ اور نواز حسنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ وہاب چنگیزی کو کیفر کردار تک پہنچایا جا

سکے۔ انہوں نے ملک کے ایک چوٹی کے وکیل کی خدمات حاصل کی ہیں اور وہاب کے خلاف مقدمات کی ہر طرح پیروی کر رہے ہیں۔ خان رحیمی نے کہا کہ اگر پیر قادر کی بھاری بھرکم سیاسی شخصیت بیچ میں نہ کود پڑتی تو اب تک وہاب سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ اچانک مجھے اس عورت کا خیال آیا جسے سلیم کی ماں بتایا جا رہا تھا۔ میں نے دینو سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

دینو نے کہا "او تے جی کملی عورت ہے۔ آپ کو لبھنے (ڈھونڈنے) نکلی ہوئی ہے۔ ہم نے کہا تھا اماں جی ہم سارے جو لبھ رہے ہیں تو آپ کو لبھنے کی کیا لوڑ ہے کہنے لگی۔ نہیں پتر۔ مجھے بھی جتل خراب ہونے دو۔ کیا پتہ سوہنے رب کو کس کی حالت پر ترس آجائے۔"

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ آخر اس عورت کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ نہ اس نے کبھی مجھے دیکھا تھا اور نہ میں نے۔

میں اس کا ذکر بھی پہلی مرتبہ سن رہی تھی میں نے خان رحیمی سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"وہ بتاتی کچھ نہیں۔ بس کہتی تھی کہ میرا اس لڑکی سے ملنا بہت ضروری ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں پہنچی ہے۔ ویری سٹرینج وومن۔"

میں نے سوچا وہ سلیم کے بارے مجھ سے کچھ جاننا چاہتی ہے لیکن سلیم کا تو مجھے بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ کچھ دیر بعد نواز حسنی بھی گھر پہنچ گئے۔ ارسہ ان کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ لپک کر میرے گلے سے جھول گئی۔ نواز حسنی صاحب مجھے بے حد احسان مندی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا کندھا تھپکا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ثناء! یہ اب تمہاری نہیں، ہم سب کی جنگ ہے۔ ہم سب مل کر چنگیزی خانوادے سے لڑیں گے تمہارے عزیزوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ انصاف کی چکی بہت دیر سے پیستی ہے لیکن بہت باریک پیستی ہے۔"

ارسہ کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ اس کا بھائی اب تک اسپتال میں زیر علاج ہے اور کل اس کے پتے کا ایک اور آپریشن ہونا ہے۔ ارسہ اور اس کے پاپا اسپتال سے ہی آرہے

تھے۔ جہاں تک عشرت کا تعلق تھا خان رحیمی اور نواز حسنی سمیت کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کن ہاتھوں سے ہوتی ہوئی کس آنگن تک جا پہنچی ہے اور کس حال میں ہے۔ میں نے بھی یہ سب کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

رات کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے دوران ہی گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ خان رحیمی کا دھیان سلیم کی والدہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ عورت ابھی تک نہیں لوٹی۔

نواز حسنی صاحب نے کہا "اسے جانے ہی نہیں دینا تھا۔ لاہور جیسے بڑے شہر میں اجنبی خود تو گم ہو سکتا ہے کسی گم شدہ کو ڈھونڈ نہیں سکتا۔" کھانے کے بعد میں کچھ دیر ارسہ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی پھر ارسہ مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر خود اپنے پاپا کے پاس سٹڈی روم میں چلی گئی۔ مجھے بستر پر لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا دینو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کھڑا تھا کہنے لگا۔

"یہ جی سلیم کی والدہ ہیں۔ آپ سے ملنا چاہوندی ہیں۔"

میں نے دیکھا بوڑھی عورت کے چہرے پر حزن و ملال کی زردی تھی۔ وہ بہت تھکی تھکی اور نڈھال نظر آتی تھی۔ اس کے چاندی بال بھیگ کر گردن اور پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی بارش سے تر تھے۔ وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹی تھی کچھ دیر تک ٹک میرا چہرہ دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی شناسائی نظر آئی۔

میں نے اخلاقاً ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا "آیئے تشریف لایئے!" اس نے آگے بڑھ کر روایتی انداز میں میرے سر پر پیار دیا اور اندر آگئی۔ دینو واپس چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے اسے کرسی پیش کی۔ وہ انکار کر کے میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بالکل روبرو۔ اس کا چہرہ میرے چہرے سے چند انچ کی دوری پر تھا۔ شاید اس کی نظر کمزور تھی اور مجھے غور سے دیکھنا چاہتی تھی۔ در و دیوار بادلوں کی گرج سے گونج رہے تھے اور کھڑکیوں کے شیشوں پر بجلی کی چمک تھی۔ ایسے میں عورت کے دیکھنے کا انداز مجھے بڑا ڈرامائی اور خوابناک سا لگا۔ پھر میں نے دیکھا کہ عورت کی آنکھوں سے آنسو امڈے اور

پہلے سے بھیگے ہوئے رخساروں پر پھسلتے چلے گئے وہ رو رہی تھی بڑی خاموشی سے اور بڑے ٹھہراؤ سے۔ اس نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔

"بیٹی! میں تجھ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔"

"کہئے ماں جی۔ کیا چاہئے آپ کو؟"

"اپنے بیٹے کی زندگی۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"آپ......... آپ کا مطلب ہے سلیم؟"

"ہاں میری بیٹی......... یہ دیکھو میری جھولی۔ اس جھولی کو خالی مت لوٹانا۔" دونوں ہاتھ کھول کر اس نے چادر میرے سامنے پھیلا دی۔" مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے اور مجھ سے کیا توقع کر رہی ہے۔

میں نے کہا "اماں جی' کیا بات ہے؟ وہ......... سلیم تو خیریت سے ہے نا؟"

بوڑھی عورت کچھ دیر تو سر اپنے کندھے سے ٹکائے روتی رہی پھر اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ وہ خیریت سے نہیں ہے۔ عورت کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت لاہور ہی میں اپنے ایک شناسا کے گھر موجود ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ سوکھ کر ڈھانچہ ہو رہا ہے۔ رات دن بخار میں پھنکتا ہے لیکن دوا کے پاس نہیں جاتا۔ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے دوا نہ کھائی تو حالت مزید بگڑ سکتی ہے۔ یہ سب کچھ بتا کر عورت نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ یہ ایک ماں کا رونا تھا۔ اس رونے کو سن کر میرا کلیجہ کانپ گیا۔ سلیم کی والدہ نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور کہنے لگیں۔

"بیٹی! خدا کے بعد اس وقت مجھے صرف تمہارا آسرا ہے۔ صرف تم ہی میرے بیٹے کو بچا سکتی ہو......... میری بیٹی میرے سلیم کی زندگی میں آجاؤ اور ہم دونوں کو بے موت مرنے سے بچا لو۔"

اب میں پوری طرح سمجھ رہی تھی کہ سلیم کی والدہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اس بات کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میرے پاس تو اپنی زندگی بھی نہیں تھی میں کسی کی زندگی کیا بچاتی۔ زندگی کے نام پر یہ تھوڑی سی مہلت میرے پاس فرحان کی امانت تھی۔ جس میں مجھے اس کے قاتل تک پہنچنا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ اس تھوڑی سی مہلت میں کسی کی بیوی بننے کا تصور کیسے کر سکتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ سلیم کے بارے میں گداز سوچیں

رکھنے کے باوجود میں ان گھڑیوں میں سنگدل بن گئی تھی۔ میں نے سلیم کی والدہ کی گریہ زاری سے کان بند کر لئے اور صاف کہہ دیا کہ میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اپنے بچے کی موت کے بعد اب میں بھی مرنے کے لئے جگہ ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ میں اب عورت نہیں ہوں صرف ایک ماں ہوں اور میری جو سانسیں باقی رہ گئی ہیں وہ ماں کی سانسیں ہیں۔

سلیم کی والدہ کے چہرے پر درد و کرب کی گہری پرچھائیاں پھیل گئیں۔ تب انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس نے میری ہستی کی عمارت کو بنیادوں سے ہلا دیا اور میرے عقیدوں کی عظیم الشان دیواریں دھماکوں سے زمین بوس ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔

"دیکھو بیٹی! تم ایک ماں ہو اور میں بھی ایک ماں ہوں۔ تم اپنا بچہ کھو چکی ہو' لیکن میرا بچہ ابھی زندہ ہے۔ تمہارا بچہ واپس نہیں آسکتا لیکن میرا آسکتا ہے کیا ایک ماں اپنی ممتا کے صدقے دوسری ماں پر رحم نہیں کھائے گی۔ کیا وہ چاہے گی کہ کل ایک دوسری ماں بھی اس کی طرح اپنے بچے کو روتی پھرے؟"

میں پھٹی ہوئی نظروں سے سلیم کی والدہ کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ کتنی سادہ لیکن سچی بات کی تھی اس غمزدہ عورت نے۔ اس نے میرا وار مجھ پر الٹا تھا اور ایک ہی لمحے میں مجھے نہتا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طوفانی رات میں' اس گرجتے برستے موسم میں اور اس تنہا کمرے میں اس سیدھی سادھی ان پڑھ عورت نے میرے ہی لفظوں سے مجھے شکست فاش دے دی تھی۔ مجھے اپنی ممتا پر ناز تھا اور اس نے میری ممتا کو انکار کے نشانے پر رکھ کر میرے ہاتھوں سے "اختلاف کا ہتھیار" گرا دیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بیک وقت فرحان اور سلیم کے چہرے آئے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ دونوں چہرے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ ان کے گڈمڈ ہونے سے ایک بہت بڑا بھنور پیدا ہو رہا ہے میں اس بھنور میں اترتی چلی جا رہی ہوں۔ میں لڑکھڑا سی گئی اور جلدی سے مسہری پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بیٹی؟" سلیم کی والدہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اچھا......... اچھا میں چلی جاتی ہوں۔ چلی جاتی ہوں میں۔" انہوں نے بڑی پریشانی سے کہا اور رخ پھیر کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ ان کی چال سے دل شق کر دینے والی بیچارگی

جھلک رہی تھی۔

“رک جائیں ماں جی” میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اس گھڑی مجھے اپنی آواز بھی بہت اجنبی سی لگی۔

☆-----------☆-----------☆

بعد ازاں جو کچھ ہوا اس کا تصور میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ حالات کا تیز دھارا مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ نہایت خاموشی کے ساتھ ماں جی اور مجھ میں سب کچھ طے پا گیا۔ ماں جی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو میری اور ان کی ملاقات کا پتہ چلے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں سلیم سے ایسے ملوں جیسے میں نے اپنی کوشش سے اسے تلاش کیا ہے۔ لہٰذا اگلے روز وہ خاموشی سے واپس چلی گئیں۔ انہوں نے مجھے سلیم کا مکمل ایڈریس دے دیا تھا۔ وہ اندرون شہر شیرانوالہ گیٹ میں اپنے ایک دوست کے پاس رہ رہا تھا۔ ماں جی کے جانے کے ایک دن بعد میں نے ایک مختصر رقعہ خان رحیمی کے نام تحریر کیا۔ اس رقعے میں میں نے خان رحیمی کو بتایا کہ مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے لکھا “مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتی۔ اگر آپ میرا بھلا چاہتے ہیں تو براہ مہربانی مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ممکن ہے آپ کو اعتراض ہو کہ میں اپنے خلاف مقدمات کا سامنا کئے بغیر اور وہاب چنگیزی کے خلاف گواہیاں بھگتائے بغیر جا رہی ہوں۔ آپ کا اعتراض اپنی جگہ ٹھیک ہوگا تاہم میں سمجھتی ہوں کہ قانون کے دامن میں اب میرے لئے انصاف نام کی کوئی چیز نہیں بچی۔ وہاب چنگیزی کے خلاف قائم کئے جانے والے بے جان مقدمے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ شاید ہم سب خود کو طفل تسلیاں دے رہے ہیں اور مکمل پسپائی اختیار کرنے سے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں۔”

یہ رقعہ خان رحیمی کے زیر مطالعہ کتاب میں رکھنے کے بعد میں نے دینو کو تیار کیا اور موقع ملتے ہی خاموشی کے ساتھ نواز حسنی کی رہائش گاہ سے نکل آئی۔

بذریعہ ٹیکسی ہم شیرانوالہ گیٹ پہنچے اور وہاں سے ڈھائی تین فرلانگ پیدل چل کر سلیم کے ٹھکانے پر آگئے۔ یہ ایک تین منزلہ مکان تھا۔ اس مکان کی زیریں منزل میں سلیم کا دوست رہتا تھا۔ اب شام ہو چکی تھی اور دکانوں مکانوں میں بتیاں جل چکی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ گلی بڑا اداس منظر پیش کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے میں پرانے زمانے کے کسی الف لیلوی بازار میں آگئی ہوں۔ تاریک ڈیوڑھیاں اونچے مکان یکے بعد دیگرے روشن ہوتی ہوئی کھڑکیاں۔ دینو نے دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ اس نے شلوار کے اوپر جالی دار بنیان پہن رکھی تھی اور غالباً کھانا کھاتے ہوئے اٹھ کر آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہی سلیم کا دوست وحید شیروانی ہے۔ جب ہم نے بتایا کہ سلیم سے ملنا چاہتے ہیں تو شیروانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے بہت گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ پوچھنے لگا۔

"کہیں آپ.......... میرا مطلب ہے آپ.......... کہیں یعنی آپ.......... ثناء محمود تو نہیں۔"

میں نے اعتماد سے کہا "ہاں' میں ثناء محمود ہی ہوں۔"

شیروانی کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس کی آنکھوں میں جوش اور خوشی سے ملے جلے جذبات نظر آئے۔ وہ اپنی شلوار کا آزار بند سنبھالتا ہوا جلدی سے باہر آگیا۔ "آپ.......... آپ واقعی ثناء محمود ہیں۔ اوہ گاڈ.......... بہت اچھا کیا آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔ ایک سیکنڈ پلیز.......... معافی چاہتا ہوں۔ میں ابھی حاضر ہوا۔"

وہ اپنے فربہ جسم کو پھرتی پر آمادہ کر کے جلدی سے اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد دوبارہ اس کی صورت نظر آئی۔ اب اس کے جسم پر ڈھنگ کا لباس تھا اور پاؤں میں چپل۔ "آیئے پلیز.......... اندر آیئے" وہ ہمارے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بیٹھک نما کمرہ تھا۔ صوفوں پر جھالر دار غلاف' کڑھائی دار پردے۔ فرش پر دری' ٹی وی' فریج' سائیڈ بورڈ' بک شیلف' سب کچھ اسی ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ لجاجت سے بولا۔

"ثناء بہن! میں نہیں جانتا آپ کس لئے آئی ہیں۔ بہرحال آپ کا یہاں آنا ہی بہت بڑی بات ہے۔ خدا کرے آپ حالات کو ٹھیک کر لیں۔"

ایکا ایکی اس کے گول چمکدار چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ کہنے لگا "سلیم کی حالت بہت پتلی ہے۔ ساری ساری رات چھوٹے سے کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ دوا تو اس نے کبھی کھائی ہی نہیں' پچھلے تین دن سے کھانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ میں تو سمجھا سمجھا کر ہار گیا ہوں۔"

میں نے کہا "میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

شیروانی جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے ساتھ لے کر وہ ایک دوسرے کمرے میں اندر سے گزرا اور ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ سلیم اندر ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور سلیم نے دروازہ کھولا۔ کمرہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر سلیم واپس مڑ گیا تھا۔ غالباً وہ میری دستک کو اہل خانہ میں سے کسی کی دستک سمجھا تھا۔

"سلیم" میں نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر کہا۔ سلیم نے بری طرح چونک کر اور گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی اور چہرہ رنج و غم کی تصویر تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس بت بنا میری طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کے ہونٹ لرزے۔

"تم آگئی ہو ثناء؟"

یہ بڑا عجیب سا فقرہ تھا۔ بالکل ڈرامائی انداز کا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تم کہاں سے آئی ہو' کیسے آئی ہو' میرا پتہ کیسے چلا ہے تمہیں؟ بس یہی کہا تھا کہ تم آگئی ہو؟ جیسے وہ جانتا تھا کہ میں ضرور آؤں گی۔ کسی نہ کسی وجہ سے مجھے آنا ہی پڑے گا۔

"ہاں سلیم۔" میں نے کہا "میں آگئی ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور وہ بے دم سا ہو کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں جانتی تھی یہ زیادہ سنگین ناراضگی نہیں ہے لیکن اسے دور کرنا ضروری تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے سلیم۔ منہ کیوں پھیر لیا' میرا آنا اچھا نہیں لگا؟"

وہ برہمی سے بولا "اس تنہا کمرے میں میری پاس کیوں آئی ہو۔ میں ایک ناقابل بھروسہ شخص ہوں۔ میری نیت میں فتور آگیا تو کیا کرو گی؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں جانتی تھی کہ وہ اس رات والے واقعے پر شکوہ کناں ہے جب میں نے اس کے بار بار پکارنے پر دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میں نے کہا "سلیم' جب میں سب کچھ بھول کر یہاں آگئی ہوں تو تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔ یہی ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔"

وہ اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ شاید اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ میرے ساتھ کیسا رویہ اپنائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر ہر پل جو خواہش انسان کے ساتھ رہتی ہے وہ اچانک پوری ہو جائے تو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ اس کا ردعمل کیا ہونا چاہئے.......... اتنے میں دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور شیروانی نے سلیم کو آواز دی۔ سلیم پر اس آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شیروانی ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے کھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے التجا کی کہ میں یہ کھانا سلیم کو کھلا دوں۔

میں نے کہا "لیکن بھائی صاحب.........."

وہ سرگوشی میں بولا "لیکن کچھ نہیں ثناء بہن۔ اگر تم بھی اسے یہ کھانا نہیں کھلا سکتیں تو پھر دنیا میں کوئی بھی نہیں کھلا سکتا۔"

شیروانی کے صاف شفاف لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ اس اعتماد میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔

سلیم نے اس دن کھانا کھایا۔ دوا بھی کھائی اور اپنی گوشہ نشینی بھی ترک کر دی۔ اس رات میں سلیم' دینو اور شیروانی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شیروانی ایک کار ڈیلر تھا۔ جیل روڈ پر اس کا شوروم تھا۔ قسطوں پر بھی گاڑیاں دیتا تھا۔ اس کی بیوی بمعہ بچوں کے میکے گئی ہوئی تھی اور میکہ بھی کہیں آس پاس نہیں تھا۔ شارجہ میں تھا۔ اسے دو ڈھائی ماہ تک آنا تھا اور اس دوران شیروانی اپنے گھر سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے مجھے اور دینو کو بتایا کہ ہم جب تک چاہیں بڑی آزادی سے یہاں رہ سکتے ہیں۔ کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کا مکان اس طرح کا تھا کہ وہ ہمیں اپنا کرائے دار بھی ظاہر کر سکتا تھا۔ اس نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا "آج سے آپ تینوں میرے کرائے دار ہیں۔ مکان کا اوپر والا پورشن آپ کا ہوگا۔ پانی بجلی گیس سب کچھ مفت ملے گا لیکن ایک شرط ہے۔ کرایہ میری مرضی کے مطابق ہوگا اور کرایہ یہ ہے کہ آپ تینوں کو ہنسی خوشی رہنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے جتنے دن بھی آپ یہاں گزاریں خوشی خوشی رہیں۔ ایک مدت بعد میری بیوی

اپنے میکے گئی ہے' میں ان سنہری گھڑیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں.......... آپ کے چہروں پر اداسی ہوگی تو میرا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

دینو نے مسکرا کر وعدہ کیا "آپ بے فکر رہیں۔ ہم نہ صرف خود خوش رہیں گے بلکہ آپ کو بھی ہنسا ہنسا کر وخت ڈال دیں گے۔"

"وخت؟ یہ وخت کیا ہوتا ہے؟" ٹھیٹ اردو بولنے والے شیروانی نے حیرانی سے پوچھا۔

سلیم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی۔ میں نے اسے بہت دنوں بعد مسکراتے دیکھا تھا۔ شیروانی کے ساتھ اس مکان میں ہم تقریباً دو ہفتے رہے۔ ان دو ہفتوں میں صرف ایک بار سلیم کی والدہ اس سے ملنے آئیں۔ سلیم کے سامنے انہوں نے مجھ سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کی۔ میں بھی لاتعلق ہی رہی.......... سلیم اب تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ بخار اتر چکا تھا اور نقاہت بھی دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ بیمار تھا ہی نہیں.......... اس نے وہ سب کچھ ایک خط میں لکھ کر مجھ سے کہہ دیا تھا جو وہ زبانی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہ خط مختصراً" یوں تھا۔

"ثناء! میں کوئی قلم کار نہیں۔ نہ ہی کوئی شاعر یا ادیب ہوں۔ میرے پاس ٹوٹے ہوئے لفظ ہیں۔ انہی لفظوں کا سہارا لے کر تم سے اپنے دل کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں میں تم سے پیار کرتا ہوں اور یہ اعلان مجھے سولی پر چڑھ کر بھی کرنا پڑے تو کروں گا۔ تمہارے بغیر زندہ رہنا اب میرے لئے ناممکن ہے۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ جو میرے دل میں ہے وہی زبان پر آگیا ہے۔ دو ٹوک بات یہ ہے کہ اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور یہ تم پر احسان نہیں ہوگا۔ میرے لئے دنیا میں تمہاری خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں۔ جہاں تک وہاب چنگیزی کا تعلق ہے وہ اب تمہارا نہیں میرا دشمن ہے۔ اس سے نپٹنا بھی میری ذمے داری ہوگی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے وہی سزا دوں گا جس کا وہ حقدار ہے۔ اس شیطان کا انجام ہر طرح تمہاری حسب منشاء ہوگا۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔ مجبور ہوں۔ جیتے جی دل چیر کر نہیں دکھا سکتا اپنی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ چھوڑتا ہوں۔"

فیصلہ کیا ہونا تھا۔ فیصلہ تو اس طوفانی شب کو ہو چکا تھا جب دو مائیں ایک تنہا کمرے

میں آمنے سامنے ہوئی تھیں اور ایک شدید کشمکش سے گزر کر ایک فیصلے پر پہنچی تھیں۔

میں نے اپنے فیصلے سے سلیم کو آگاہ کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر کامیابی کا تبسم چمکا اور دنیا جہان کی خوشیاں اس کی دو آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ وہ پھول کی طرح کھلا اور بہار کی طرح بکراں ہو گیا۔ ایک تند جوشیلے بگولے کی طرح اس نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا اور اڑا کر کہیں سے کہیں لے آیا۔ میں نے خود کو اس کی وارفتگی کے حوالے کر دیا اور ماضی سے دل و دماغ کے تمام رابطے منقطع کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک رات میں نے اور سلیم نے وحید شیروانی سے اجازت لی اور اس کے گھر سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ گئے۔ ڈیو بطور ملازم ہمارے ساتھ تھا ہم پشاور پہنچے پشاور سے کوہاٹ آئے اور وہاں سے کرم ایجنسی میں داخل ہو گئے۔ یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد سلیم نے کچھ عرصہ اسی ایجنسی میں گزارا تھا اور یہاں اس کے جاننے والے موجود تھے۔ ٹل سے آگے ہم پارہ چنار پہنچ گئے۔ پارہ چنار کے ایک مضافاتی گاؤں میں پہاڑی پر بنا ہوا ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان ہماری منزل تھا۔ کہیں قریب سے ایک گنگناتا چشمہ گزرتا تھا۔ دور فاصلے پر افغانستان کے برف پوش پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ یہ مکان غلام خاں نامی ایک اونچے لمبے اور سرخ و سفید پٹھان کی ملکیت تھا۔ غلام خاں زمیندار تھا اور سلیم کا گہرا دوست تھا۔ وہ سلیم کو بابری کے نام سے جانتا تھا۔ اس نے یہ مکان اپنی دوسری شادی کے لئے بنوایا تھا۔ مگر شادی سے چند ہفتے پہلے اس کی پہلی بیوی نے نرینہ اولاد کی خواہش پوری کر دی اور یوں یہ مکان آباد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب یہی مکان میرا اور سلیم کا مسکن ٹھہرا۔ پارہ چنار پہنچنے کے دوسرے ہی روز ایک چھوٹی سی تقریب میں میں سلیم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ اس تقریب میں شیروانی بھی لاہور سے آ کر شریک ہوا۔ شیروانی کے علاوہ ڈیو وہ واحد چہرہ تھا جسے میں پہلے سے جانتی تھی۔ باقی سب اجنبی تھے۔ اس تقریب میں سلیم کے مقامی دوستوں اور ان کے ساتھیوں نے بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ رات ہوتے ہی انہوں نے ناچنا گانا شروع کر دیا اور ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا میں اور سلیم ملک کی سرحد پھاند کر پولیس اور قانون کی دسترس سے بہت دور آ چکے ہیں اور دو مفرور ملزموں کی اس شادی کے شرکاء کو کسی طرح کا کوئی ڈر خطرہ نہیں۔ مقامی عورتیں جوق در جوق آئیں اور میرے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ وہ پہلے تو

کچھ جھجکتی رہیں پھر انہوں نے بے تکلفی کے مظاہرے شروع کر دیئے۔ انہوں نے مجھے لباس بدلنے پر مجبور کیا اور نہایت زرق برق مقامی لباس پہنا دیا۔ اس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے آئینے لگے تھے اور سلائی کڑھائی کا کام تھا۔ میرے بال ابھی تک زیادہ طویل نہیں ہوئے تھے پھر بھی انہوں نے بالوں کو گوندھ گوندھ کر چھوٹی چھوٹی چوٹیوں کی شکل دے دی۔ میرے ماتھے پر' رخساروں اور ہاتھوں کی پشت پر نقش و نگار بنائے گئے اور میرے چھدے ہوئے کانوں کے بند سوراخ دوبارہ کھول کر چاندی کے وزنی جھمکے آویزاں کر دیئے گئے۔ یہ جھمکے غلام خاں کی بیوی خوش بخت جان کی طرف سے تھے۔ کچھ لڑکیاں ڈھولک' الغوزہ اور دف لے آئیں۔ تیز تیز پشتو لہجے میں وہ نہ جانے کیا کیا گانے لگیں۔ میں "صم بکم" بیٹھی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جب چند بڑی بوڑھیاں موقع پر پہنچیں تو محفل نے اور ہی رنگ اختیار کر لیا۔ چھوٹی چھوٹی رسمیں ادا کی جانے لگیں۔ میری جھولی میں ایک رنگین رومال رکھا گیا جس میں بادام' اخروٹ' خشک خوبانی اور نجانے کیا تھا۔ اس رومال کی گرہیں مجھ سے کھلوائی گئیں۔ پھر میرے پاؤں کے انگوٹھوں کو سرسوں کے تیل میں ڈبویا گیا۔ ایک عورت نے کوئی نامعلوم رسم ادا کرتے ہوئے ایک سرخ دھاگہ جس میں سرخ بیر سے پروئے ہوئے تھے میرے گلے میں ڈال دیا۔ کئی مرحلوں سے گزارنے کے بعد ایک بڑے قرآن مجید کے سائے تلے مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے کو حجلہ عروسی کے طور پر سجایا گیا تھا۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ عورتیں باہر چلی گئیں۔ رات گئے سلیم اندر داخل ہوا۔ اس نے مشرق کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے۔ دور کہیں سے سرد چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ہوا کمرے میں چکرانے لگی۔ سلیم مجھے اپنے ساتھ لے کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا کہنے لگا۔

"ثناء۔ تمہیں یاد ہے......... تم نے جمعرات کے روز ہوٹل میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج بھی جمعرات ہے۔ کتنے برسوں کے بعد آئی ہے یہ جمعرات۔ مجھے تو محسوس ہوتا ہے میں آج تک اسی نیلی کیبن میں بیٹھا تمہارے انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔"

اس چھوٹے سے خوبصورت مکان میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اس زندگی کے دو رخ تھے۔ ایک رخ وہ جو سلیم کے لئے تھا اور دوسرا رخ جس کا تعلق صرف اور صرف میری ذات سے تھا۔ سلیم کے ساتھ میں ہنستی بولتی تھی اس کی خوشیوں

میں شریک رہتی تھی۔ کبھی اسے بچے کی طرح بہلاتی تھی اور کبھی خود بھی اس کے ساتھ بچہ بن کر باہمی فاصلے مٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ بہت خوش' بے حد خوش تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ میری خود سپردگی نے اسے دنیا کے ہر غم سے آزاد کر کے' تصور میں آنے والی ہر خوشی اس کی آغوش میں ڈال دی تھی.......... مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خود سپردگی کے پیچھے جبر کی کون سی داستان پوشیدہ ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اس گھر میں بسنے والی عورت کے سینے میں کون سا طوفان چھپا ہے۔ کیا قیامت ہے جو دل کے تاریک ترین گوشے میں کچھ دیر کے لئے محصور کر دی گئی ہے اور اسے محصور رکھنے میں اس عورت کو کیا کیا عذاب جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

میں ایک دھتکاری' پھٹکاری' ذلیل اور بدنام عورت اس عزت کے قابل کہاں تھی جو سلیم اور یہاں کے لوگ مجھے دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر میں خود کو اس عزت کے قابل سمجھتی تو اپنی ذات کے ساتھ ایک بہت بڑا فریب کرتی۔ بستی کے لوگ مجھے دیکھ کر سلام کرتے تھے۔ بڑی بوڑھیاں سر پر پیار دیتی تھیں۔ غلام خاں کے کارندے نگاہیں جھکا کر بات کرتے تھے۔ مگر میں جانتی تھی میں کون ہوں۔ میں ایک مفرور قاتلہ تھی جس کی گرفتاری کے لئے ایک روز بازار حسن کے چوبارے پر چھاپہ مارا گیا تھا اور میں پولیس سے بچ کر نکل گئی تھی۔ میں کون ہوتی تھی ایک باعزت مرد کی زندگی پر قبضہ جمانے والی۔ اس کے نام سے اپنا نام جوڑنے والی اور اس کے بچوں کی ماں بن کر اس کی نسل کو آگے بڑھانے والی۔ میں اب متاع کوچہ و بازار تھی۔ میرا نصیب قدموں تلے روندا جاتا تھا یا.......... مرجاتا۔ جس نے مجھے گلے کا ہار بنایا تھا۔ اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مجھے معلوم تھا جلد یا بدیر اسے اس غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ جب محبوبہ بیوی بن کر ہر پل ساتھ رہے گی اور جذبوں کے گلشن پر قربتوں کی برف گرے گی تو چند ہی ماہ میں سب کچھ بدل جائے گا۔ پھر رات کے نرم اندھیرے پر دن کی شفاف روشنی کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ اس روشنی میں سلیم آنکھیں کھول کر دیکھے گا تو اسے میرا اصل چہرے نظر آنے لگے گا۔ ایک مفرور قاتلہ کا بدنصیب چہرہ۔ وہ وقت محبت کرنے کا نہیں ہو گا' نفرت کرنے کا ہو گا یا ترس کھانے کا.......... اور وہی وقت راستے بدلنے کا بھی ہو گا۔

یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر ہی میں نے اس نئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں نے سلیم کی بیوی بن کر خود کو اس کے لئے اتنا ارزاں کر دیا تھا کہ میرے خیال میں اس کی محبت چند ماہ سے زیادہ جی ہی نہیں سکتی تھی.......... مگر بتدریج مجھے احساس ہونے لگا کہ میری سوچ اور میرے حالات ایک ہی رخ پر نہیں چل رہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ سلیم کی محبت اور وارفتگی گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے بعد اس کے اندر میری ضرورت کا احساس اور بھی شدید تر ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے دل میں کوئی خوف بیٹھ گیا ہے کہ میں اس سے جدا ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے بھی خود سے جدا کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ زمیندار غلام خان نے اسے اپنے ایک باغ کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ یہ باغ گاؤں سے قریباً پانچ فرلانگ کی دوری پر پہاڑ کی ترائی میں تھا۔ سلیم صبح آٹھ بجے باغ پر جاتا اور شام پانچ بجے فارغ ہوتا۔ لیکن اس دوران وہ گھر کے کم از کم چھ چکر ضرور لگاتا۔ ہر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کسی نہ کسی بہانے گھر چلا آتا مجھے سامنے بٹھا کر دیوانوں کی طرح صورت دیکھتا۔ میں سٹپٹاتی' پریشان ہوتی اسے دھکیل دھکیل کر گھر سے نکالتی' کبھی سچ مچ خفا ہو جاتی مگر اس پر تو کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس کی محبت کی شدت سے خوف آنے لگتا۔ میرے اندر سے کوئی پکار کر کہتا۔

"ثناء' زندگی میں تیری کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی' یہ بھی پوری نہیں ہو گی کہ سلیم تجھے دل سے اتار دے۔ تمہارے نصیب کو تمہاری آرزوؤں سے بیر ہے بس یہی ساری بات ہے۔ تم سو سال بھی انتظار کرو گی تو سلیم کی چاہت سے دامن نہیں چھڑا سکو گی۔ سلیم کی ماں سے کئے ہوئے وعدے کی بیڑی ہمیشہ تمہارے پاؤں میں رہے گی اور اپنے پیاروں کے انتقام کی آرزو ٹوٹے خنجر کی طرح تمہارے دل میں دھنستی رہے گی.........." کبھی میں سوچتی کوئی ایسا کام کروں یا سلیم سے ایسا رویہ اپناؤں کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے' مگر یہ سوچ عملی جامہ کبھی نہ پہن سکی۔ ہزار ہا صدمے جھیل کر بھی میرا دل پتھر نہیں بنا تھا۔ اس دل میں اتنی جرات نہیں تھی کہ کسی کی دل شکنی کر سکے۔ کسی کے خوابوں کے محل مسمار کر سکے۔ خدا گواہ ہے یہ کام میرے نزدیک آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک طرف میں پورے

چنگیزی خانوادے کو جہنم واصل کرنے کی جرات دل میں رکھتی تھی اور ایک طرف کسی بے گناہ کی آنکھ سے ٹپکنے والے ایک آنسو کا تصور میرے لئے سوہان روح بن جاتا تھا۔ گردش دوراں نے میری فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک رات میں نے سلیم کو ساتھ والی چارپائی پر بڑبڑاتے سنا۔ وہ اکثر نیند کی حالت میں بڑبڑانے لگتا تھا مگر آج میں اٹھ کر بیٹھ گئی' وہ بار بار میرا نام پکار رہا تھا' پھر کہنے لگا۔

"ایک بار مجھے میرے بیٹے کا چہرہ دکھا دو.......... پھر میں چلا جاؤں گا۔ خدا کی قسم چلا جاؤں گا.......... وہاب کو قتل کر کے لوٹوں گا یا کبھی نہیں لوٹوں گا۔ یہ تیری نہیں میری لڑائی ہے۔ میری لڑائی ہے.......... میڈم نادرہ کی دشمنی تجھ سے نہیں مجھ سے تھی۔"

میں نے شانہ جھنجھوڑ کر سلیم کو جگا دیا وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب روشن کیا اور میری طرف سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا۔ کیسی آواز تھی؟"

میں نے کہا "کوئی آواز نہیں تھی صرف تم بڑبڑا رہے تھے۔ وہی پرانی باتیں۔ سلیم! تمہارے دل سے یہ بات کیوں نہیں نکلتی۔ میں اپنا ماضی بھول چکی ہوں تم بھی بھول جاؤ صرف یہی ایک راستہ ہے ہمارے زندہ رہنے کا۔ میں نے اپنا انصاف خدا پر چھوڑ دیا ہے' یقین کرو میں اپنے حالات سے سمجھوتہ کر چکی ہوں۔ تم اس سمجھوتے کو ناکام کرنے والی باتیں سوچتے ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

سلیم' خاموش رہا۔ میں جانتی تھی اس خاموشی کے پیچھے ایک ہنگامۂ قیامت ہے' میں اس قیامت سے خوفزدہ تھی۔ میں سلیم کو اپنی آگ سے بچانا چاہتی تھی اور جتنا بچانا چاہتی تھی وہ اتنا ہی اس آگ کی طرف کھنچا آتا تھا۔ کمرے میں بتی جلتے دیکھ کر دینو نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور بولا۔

"خیر تو ہے استاد جی۔ میری کوئی لوڑ شوڑ ہو تو بتا دو۔"

سلیم نے کہا "نہیں تمہاری کوئی لوڑ نہیں اور مجھے پتہ ہے جب لوڑ پڑی تو تم نظر نہیں آؤ گے۔"

دراصل یہ آزاد علاقہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنا پڑتی تھی۔ بچوں تک کے کندھوں سے بندوقیں لٹکی نظر آتی تھیں۔ دینو اور سلیم کے سرہانوں کے نیچے بھرے

ہوئے پستول موجود رہتے تھے۔ سلیم نے پچھلے دو مہینے کی آمدن میں سے کچھ رقم نکال کر ایک طاقتور رائفل بھی خرید رکھی تھی۔

دینو چڑ کر بولا "استاد جی! میں نے دس برس ایک میمن سیٹھ کے گھر ملازمت کیتی ہے۔ کم از کم دس چور پھڑ کا چکا ہوں اس کے گھر میں۔"

سلیم نے شرارت سے کہا "خواب میں تو تم نے اور بھی کئی "جی داریاں" دکھائی ہوں گی۔ میں حقیقت کی بات کر رہا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں چور نہیں آتے' ڈاکو آتے ہیں' نام بعد میں پوچھتے ہیں گولی پہلے مارتے ہیں۔"

دینو نے جھلا کر کہا "استاد! ان ساری باتوں کا پتہ تو ویلا آنے پر لگے گا جو بھونکتے ہیں وہ وڈ تے (کاٹتے) نہیں۔"

اس کے بعد دینو منہ سر لپیٹ کر سو گیا۔ سلیم بھی لیٹ گیا' میں نے لائٹ آف کر دی اور اسے کہا کہ وہ سو جائے .... کافی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بدستور جاگ رہا ہے۔

"کیا بات ہے سلیم' جاگ رہے ہو؟"

"ہاں اب نیند نہیں آئے گی" اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیوں' کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ.......... یہی کہ تمہارے بغیر یہ آٹھ دس روز کیسے کٹیں گے!" (سلیم کام کے سلسلے میں ٹل شہر جا رہا تھا اور اسے وہاں چند دن لگنے تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ متعدد بار اپنی پریشانی کا اظہار کر چکا تھا)

میں نے کہا "سلیم' تمہاری اتنی محبت میری جان لے لے گی۔ اتنی محبت مت کرو مجھ سے۔ ایسی محبت خود مر جاتی ہے یا محبت کرنے والوں کو مار دیتی ہے۔"

"میرے بس میں کچھ نہیں ثناء" اس نے سادگی سے کہا "میں پاگل ہوں۔ تم میری خطاؤں کو معاف کر دیا کرو۔ جو گھڑی تم سے دور گزارتا ہوں وہ گھڑی دردناک عذاب ہوتی ہے.......... مجھے لگتا ہے کسی دن تم سے علیحدہ میرا کوئی وجود ہی نہیں رہے گا.........."

سلیم کی ایسی ہی باتوں سے میری روح کانپ جاتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کسی نے

میری قوت گویائی چھین لی ہے.......... اس نے میرا ہاتھ اپنے کشادہ سینے پر رکھ لیا کہنے لگا "ثناء تم سے یہ نہیں کہتا کہ مجھ سے اتنی محبت کرو جتنی میں کرتا ہوں' لیکن ایک التجا ہے۔ میری محبت پر انگلی مت اٹھایا کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہی میرے حق میں بہتر ہے۔"

میں نے پوچھا "کس وقت جانا ہے؟"

وہ بولا "پرسوں صبح چھ بجے کے قریب۔"

"اور واپسی کب ہوگی؟"

"بدھ کے روز شام کو یا جمعرات کی صبح۔"

"اپنا خیال رکھنا۔"

"تمہای خاطر ضرور رکھوں گا.......... اور ہاں میں نے غلام خاں کی بیوی سے کہہ دیا ہے وہ رات کو تمہارے پاس آجایا کرے گی۔ دینو بھی موجود ہوگا۔"

دیر تک سلیم ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ باتوں کو جان بوجھ کر طول دے رہا ہے اور اس کی گفتگو میں تسلسل بھی کم ہے.......... یہ عقدہ کچھ دیر بعد کھلا کہ وہ گفتگو برائے گفتگو میں مصروف تھا کیونکہ اس نے میری آواز ٹیپ کرنے کے لئے ٹیپ ریکارڈر چلا رکھا تھا۔ کیسٹ کو ٹیپ ریکارڈر سے نکال کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور مسکرا کر بولا۔

"کم از کم تمہاری آواز سے دوری کا مسئلہ تو حل ہوا۔"

تیسرے روز علی الصبح وہ روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اس کی پسندیدہ ڈش آلو کی بھاجی تیار کی۔ کچھ اس نے کھالی کچھ ساتھ لے جانے کے لئے ٹفن میں رکھ لی۔ پتلون قمیض پہن کر اس نے ریوالور کوٹ کے نیچے لگا لیا۔ اسے باغ کے لئے کچھ زرعی دوائیں اور سامان وغیرہ خریدنے جانا تھا۔ قریباً آٹھ دس ہزار روپے کی رقم اس کے پاس تھی۔ غلام خان نے بڑی سڑک تک پہنچانے کے لئے جیپ فراہم کی تھی جو دروازے کے باہر کھڑی مسلسل شور مچا رہی تھی۔ مجھے بمشکل "خدا حافظ" کہنے کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆============☆============☆

سلیم کے جانے کے بعد مجھے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا۔ جیسے میرے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور میں ایک کشتی پر تنہا رہ گئی ہوں۔ اگر ہمدرد غلام خاں اور اس کی محبت کرنے والی بیوی میرے آس پاس نہ ہوتی تو معلوم نہیں تنہائی کا یہ احساس میرے اندر کیا کیا طوفان اٹھا دیتا۔ غلام خاں کی بیوی اور اس کی بچیاں ایک لمحے کے لئے مجھے تنہا نہیں چھوڑتی تھیں۔ سارا دن گھر کے صحن میں جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔

عیدالفطر کی آمد آمد تھی۔ بستی کی کئی لڑکیاں دوپہر کے وقت آجاتیں اپنے کپڑوں پر سلائی کڑھائی کرتیں اور دوپٹوں کو رنگ دیتیں۔ جتنی معصوم شکلیں تھیں اس سے زیادہ معصوم ان کی ہنسی اور ان کی باتیں تھی۔ شہر کی رنگینیوں اور ہنگاموں سے دور اس دور افتادہ پہاڑی بستی میں زندگی کتنی حسین اور سادہ تھی۔ کبھی میرا دل چاہتا کاش ماضی سے میرا ناطہ سچ مچ ٹوٹ جائے۔ میری یادداشت کے ساتھ ایسا کچھ ہو کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے۔ نہ اپنے فرحان کی توتلی باتیں۔ نہ فرخندہ اور عابد کی خونچکاں لاشیں نہ بھائی تنویر اور اس کے اہل خانہ کے بے جان چہرے۔ سب کچھ میرے ذہن کی تختی سے مٹ جائے۔ میں اس بستی میں ایک نئی زندگی شروع کر سکوں۔ یہاں کے معصوم باشندوں کی معصوم مسکراہٹوں میں گھل مل جاؤں۔ سلیم کی بے پناہ محبت کا جواب محبت سے دے سکوں اور اس چار دیواری کو اپنی چار دیواری سمجھ کر اس میں زندگی گزارنے کی تمنا کروں۔ مگر اس سوچ کی عمر چند لمحوں سے طویل نہیں ہوتی تھی۔ وہاب چنگیزی کا مکروہ چہرہ اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تصور میں گھس آتا تھا۔ نیم روشن کمرے میں اپنے ساتھ اس کی درندگی یاد آتی تھی۔ اس کے فاتحانہ قہقہے یاد آتے تھے۔ اس کی زہریلی بدبودار پھنکاریں میں اپنی گردن پر محسوس کرتی تھی اور مجھے اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اس خوبصورت چار دیواری سے بھی نفرت ہو جاتی تھی۔

سلیم کو بدھ کے روز آنا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں رات گئے تک اس کی منتظر رہی۔ اگلا دن بھی انتظار میں کٹا۔ شام کو عید کا چاند نظر آیا۔ بستی کے لڑکے بالے خوشی سے اچھلنے کودنے لگے۔ بستی سے کچھ فاصلے پر ایک اونچی جگہ آگ کا الاؤ دہکا دیا گیا۔ مقامی رواج کے مطابق یہ چاند نظر آنے کا اعلان تھا۔ بستی کے نوجوان اور خوش طبیعت بوڑھے اس الاؤ کے گرد جمع ہو کر گپیں ہانکنے اور ساز بجانے لگے۔ ذرا اندھیر ہوا تو غلام

خان کی بیوی کئی دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر آ گئی۔ چاند رات منانے کا ان کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ سب بستی کے ساتھ ایک ہموار میدان میں جمع ہو گئیں۔ بہت سی لالٹینیں نیم دائرے کی شکل میں رکھ دی گئیں۔ ناچ گانے کا دور شروع ہوا۔ سب کچھ پشتو میں تھا لیکن ایک گیت اردو نما پشتو میں بھی گایا گیا شاید مجھے سنانے کے لئے تھا۔ مفہوم کچھ یوں تھا۔

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں سرما کی لمبی کالی راتوں میں سرخ چادر پر سنہری تاروں سے پھول کاڑھتی ہوں اور اس کو یاد کرتی ہوں۔"

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں بہار کی معطر شاموں میں پھلواری سے جھک جھک کر پھول چنتی ہوں اور ہر پھول کے بدلے ایک آنسو اس کے نام پر گراتی ہوں۔"

"میرا دولہا گھر سے باہر ہے۔ میں برسات کی جھڑیوں میں دہلیز پر بیٹھ جاتی ہوں اور دور دیس سے آنے والی ہوا سے پوچھتی ہوں کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں گیا ہے۔"

گیت کی پرسوز لے اونچی نیچی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی لیکن میں کسی گیت سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کل غلام خان رات گئے تک میرے گھر بیٹھا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ٹل میں سلیم کا کام پانچ چھ دن سے زیادہ کا نہیں تھا معلوم نہیں اب وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟

اندیشے رہ رہ کر میرے دل میں سر اٹھانے لگے۔ کہیں وہ پنجاب تو نہیں چلا گیا تھا۔ وہاں میرے اور اس کے لئے ہر طرف موت کا جال بچھا ہوا تھا اور ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ابھی کم از کم ایک برس تک ہم قبائلی علاقے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کبھی وسوسہ جاگتا کہ چنگیزیوں کے ہرکارے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے سلیم کا کھوج لگا لیا ہے۔ وہ وقت یاد آیا جب پچھلے ہفتے وہ مجھ سے رخصت ہو رہا تھا۔ دل کی گہرائی سے ایک ہوک اٹھی۔ مجھے لگا جیسے میں سلیم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ بے پناہ اور بے حد شدید۔ اتنی ہی جتنی اپنے فرحان سے کرتی ہوں۔ شاید یہ دونوں محبتیں ایک ہی نا آسودہ جذبے کے دو عکس تھے۔ جو افتادِ زمانہ کے ہاتھوں یوں باہم مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا پہچاننا مشکل تھا۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب بستی کی طرف سے دینو بھاگتا ہوا آیا۔ اس

کے بھاگنے کے انداز سے ہی ظاہر تھا کہ وہ کوئی اطلاع لے کر آ رہا ہے۔ ہانپتا ہوا میرے پاس پہنچا اور بولا۔

"بی بی جی استاد آ گیا ہے۔ ساتھ ہی سامان سے بھری ہوئی پک اپ بھی لیاندی ہے۔ آپ آ کر دیکھو تو سہی۔ کیا کیا شیویں (چیزیں) لے کے آیا ہے۔"

"وہ.......... خیریت سے تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

ہاں جی' بالکل۔ چاروں خانے خیریت سے ہے۔ بس آپ آجاؤ فٹافٹ۔"

پلک جھپکتے ہی سلیم کی واپسی کی خبر پوری بستی میں پھیل گئی۔ میں دوسری عورتوں کے ساتھ گھر پہنچی تو غلام خاں اپنے چند کارندوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی فریج ایک ٹرک نما پک اپ سے اتار رہا تھا۔ دو قالین رول کئے ہوئے دروازے پر پڑے تھے اور سلیم خود اندر کمرے میں ایک رنگین ٹیلی ویژن مناسب جگہ پر رکھوا رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور سلیم کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے کہ وہ یہ ہزاروں روپے کی اشیاء اٹھا لایا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بڑی خاص مسکراہٹ کھیل گئی۔ محبت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"ثناء تم کچھ دیر کے لئے غلام خاں کے گھر خوش بخت کے پاس بیٹھ جاؤ' اتنی دیر میں میں مزدوروں سے یہ سارا سامان سیٹ کروا لیتا ہوں.........."

میں سلیم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اتنے میں غلام خاں اسی طرف چلا آیا۔ "او خوچے تم ادھر کھڑا کیا کرتی ہے؟ جاؤ نا اپنی بہن کے پاس بیٹھو' ہم ابھی سلیم بھائی کے ساتھ مل کر تمہارے گھر کو سجاتا بناتا ہے۔ آج چاند رات ہے ناں۔ قسم سے تمہارا گھر محل لگے گا۔"

قریباً دو گھنٹے خوش بخت کے پاس بیٹھ کر جب میں دوبارہ گھر پہنچی تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ میں ایک دور دراز پہاڑی بستی کے مکان میں کھڑی ہوں۔ گھر گلبرگ کی کسی عالیشان کوٹھی کا حصہ لگتا تھا۔ قالین' پردے' فریج' ٹیلی ویژن' واشنگ مشین' صوفے غرض شہری زندگی کی بیشتر آسائشیں یہاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نئے قالین کو دیکھ کر جوتی اتارنے لگی تو وہ پیار سے ڈانٹ کر بولا۔

"خبردار' یہ قالین تمہاری جوتی کی مٹی سے زیادہ مہنگا نہیں۔ جوتی سمیت آؤ۔"

میں نے کہا "سلیم، تم باغ کا سامان لینے گئے تھے یہ کیا کیا اٹھا لائے ہو؟ کیوں اتنا خرچ کیا ہے؟"

اس نے کہا "خرچ کہاں کیا ہے ثنا بیگم؟ یہی تو دکھ ہے کہ خرچ نہیں کر سکتا۔ کاش میرے بس میں ہو اور میں دنیا کی ہر وہ شے اس چار دیواری میں لے آؤں جو تمہیں خوشی اور راحت دے سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم میرا دل تمہارے لئے کیا کیا کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے بتا دیا تو تم مجھے سچ مچ پاگل سمجھنے لگو گی۔"

میں نے پوچھا "لیکن یہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے ہیں؟"

وہ بولا "تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے یہ میرا شعبہ ہے مجھ پر بھروسہ رکھو میں اس چار دیواری میں کوئی ناپاک چیز لے کر نہیں آؤں گا۔"

"لیکن پھر بھی سلیم۔ پتہ تو چلے۔ کیا تم لاہور گئے تھے؟"

وہ مسکرایا "اب تم اصل بیوی لگی ہو۔ بیوی تفتیش نہ کرے تو لگتا ہے کام کی نہیں صرف نام کی بیوی ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر دو اس تفتیش کا جواب۔"

وہ خوش دلی سے مسکرایا "شوہر جواب دے دے تو پھر وہ اصل شوہر کہاں ہوا؟"

اتنے میں دینو آگیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی پر بڑی سی پٹی لپیٹی ہوئی تھی اور بہت سٹپٹایا ہوا نظر آتا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک چھوٹا صوفہ کمرے میں رکھتے ہوئے اس کی انگلی صوفے اور دیوار کے درمیان آگئی ہے۔ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس گھر وچ تو الٹی گنگا چلدی ہے۔ ہر کام غلط ہوندا ہے۔ چوٹ وی لگدی ہے تو غلط۔"

سلیم نے کہا "چوٹ تو کیسی بھی لگے غلط ہی ہوتی ہے"

وہ بیزاری سے بولا "بس جی، صحیح چوٹ بھی ہوندی ہے۔ اب یہی چوٹ جو ہتھ کی انگلی پر لگی ہے پاؤں پر لگدی تو اچھا نہیں تھا؟ یہ جو میرے دیہاڑی کے دو درجن پھیرے بازار اور باغ کے لگدے ہیں یہ تو ختم ہوندے۔"

میں نے کہا "ہاں یہ بات تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

سلیم بولا "خیر اب بھی چانس ختم نہیں ہوا۔ ابھی باہر ایک صوفہ اور پڑا ہے۔ اٹھا

لاؤ۔ شاید تمہاری مراد پوری ہو جائے۔"

وہ انگلی پر پھونکیں مارتا ہوا بولا۔ "نہیں جی، اب آپ اپنی مراد پوری کر لیں دو دن گھر میں تو ٹک کر بیٹھیں گے نا"

اس نوک جھونک کے درمیان ہی غلام خان اور اس کی بیوی آگئے۔ وہ ستائشی نظروں سے گھر کے در و دیوار کو دیکھنے لگے۔ غلام خان کی بیوی نے پشتو نما اردو میں کہا۔

"ان دو صوفوں کے درمیان یہ جگہ کچھ خالی خالی سی لگتی ہے۔ یہاں کچھ ہونا چاہئے تھا۔"

غلام خان اپنی داڑھی کھجاتا ہوا بولا "خو چے میرا خیال ہے......... یہاں بادا لوگ کیلئے کوئی پلنگ ولنگ رکھ چھوڑو۔"

"بادا لوگ؟ بادا لوگ کون؟" دینو نے پوچھا۔

"اوئے لکڑی کی بندر، تم چپ کیوں نہیں رہتی۔ جب تم کو کچھ اتہ پتہ نہیں تو کیوں زبان اڑاتی ہے بیچ میں۔"

دینو اپنے لئے مونث کے صیغے پر ہمیشہ سیخ پا ہو جاتا تھا، وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

سلیم نے پوچھا "بھائی غلام خان، سچی بات ہے بادا لوگ کا مطلب تو میں بھی نہیں سمجھا۔"

غلام خان ہنسا "اوے کھوتے کا پتر، تم بڑا نکمی ہے، خدائی خوار بادا لوگ کا مطلب بھی نہیں سمجھتی۔ اوئے ام کس نامعقول کے ساتھ یاری لگا بیٹھا ہے۔ تمہاری شادی کو چھ مہینے ہو گئے۔ ہم نے تو کیا کیا پروگرام بنا رکھے ہیں جشن مشن کیلئے اور تمہارے کان پر ابھی جوں بھی نہیں رینگا۔"

خوش بخت دوپٹہ منہ میں دبائے ہنس رہی تھی میں بھی کسی حد تک غلام خاں کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہا تھا مجھے معلوم تھا اس گھر میں کبھی بچے کی چہکار نہیں گونجے گی۔ بچے کے لئے اس گھر میں جگہ تھی اور نہ میرے دل میں۔ میں نے سلیم کو بھی بتا دیا تھا کہ ابھی مجھے بچے کی خواہش نہیں۔ غلام خان کا مطلب سمجھ کر سلیم کچھ چپ سا ہو گیا۔ میں بھی قہوہ بنانے کے بہانے باورچی خانے میں چلی آئی۔ قہوہ لے کر میں دوبارہ کمرے میں پہنچی تو ماحول پر چھا جانے والی

عارضی پژمردگی دور ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر غلام خان' خوش بخت' سلیم اور دینو کے درمیان نوک جھونک ہو رہی تھی اور قہقہے گونج رہے تھے۔ کچھ دیر قہوے کا دور چلتا رہا پھر غلام خاں اور خوش بخت اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ سلیم نے کہا کہ وہ ایک چکر باغ کا لگا آئے۔ میں نے کہا "رات ہو گئی ہے۔ اب صبح چلے جانا۔"

اس نے کہا کہ ایک دوسری پک اپ پر باغ کا سامان کھاد اور دوائیں وغیرہ وہاں پہنچائی ہیں۔ انہیں ذرا دیکھ آؤں۔"

میں نے کہا "دینو کو بھیج دو۔ وہ دیکھ آتا ہے۔"

کہنے لگا "جو میں کر کے آؤں گا' دینو نہیں کرے گا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"آتے آتے تمہارے لئے رات کی رانی لے کر آؤں گا' بہت پھول کھلے ہوئے ہیں وہاں۔"

میں نے پوچھا "اتنی رات گئے پھولوں کا کیا کرنا ہے؟"

وہ مسکرایا "جی چاہتا ہے کسی دن اس سارے گھر کو پھولوں سے بھر دیا کروں پھر ہم دونوں ساری رات جاگتے رہیں اور گھر میں گھومتے رہیں۔ باتیں کرتے رہیں اور باتیں سنتے رہیں۔ کبھی اس کمرے کی دہلیز پر بیٹھیں' کبھی اس کمرے کی دہلیز پر' کبھی سامنے والے برآمدے میں ٹہلنے لگیں اور کبھی.........' اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ گئی۔

وہ چلا گیا' میں نے دینو کو آواز دے کر کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ خود میں کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کمر سیدھی کر کے اٹھی اور کمرے میں ادھر ادھر بکھری چیزوں کو سنبھالنے لگی۔ سلیم کی پتلون جھاڑی تو اس کے اندر سے کچھ کاغذ اور نوٹ بیڈ پر گر گئے۔ کاغذات اور پیسوں کے بارے میں وہ ایسی ہی لاپرواہی برتتا تھا۔ میں سنبھالتی رہتی تھی اور وہ گماتا رہتا تھا۔ میں نے کاغذ اٹھائے اس میں کچھ تو سامان کی رسیدیں تھیں جو اس نے ٹل سے خریدا تھا اور پشاور سے منگوایا تھا اس کے علاوہ ایک نامانوس سا کاغذ بھی تھا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ دو گاڑیوں کی ڈیلوری رسید تھی۔ ایسی رسید گاڑی فروخت کرنے والا گاڑی خریدنے والے سے لیتا ہے' تاکہ گاڑی کا ہینڈ اوور

کرنا سند رہے۔ میں نے رسید پڑھی اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ سلیم نے تین دن پہلے لاہور میں اپنی دو ویگنیں کسی شخص کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کی ہیں۔ وہ ان ویگنوں کو فروخت کرنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر لاہور پہنچا تھا اور اسے واپسی میں دیر بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی یہی ۲ ویگنیں اس کی کل جائیداد ہیں جو اسے باپ کے ترکے سے ملی ہیں۔ وہ یہ دو ویگنیں بھی فروخت کر کے ان کے بدلے گھر کا آسائشی سامان لے آیا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی اس گھر کو قیمتی سامان سے بھرنے کی۔ جس گھر کو رہنا ہی نہیں تھا اس گھر کو بنانے سنوارنے میں نقصان کے سوا کیا حاصل ہونا تھا۔ عجیب شخص تھا یہ بھی۔ میں نے کیا سوچا تھا اور سامنے کیا آرہا تھا۔ میں اس کی محبت کی دلدل میں لحہ بہ لحہ دھنستی جا رہی تھی۔ رہی سہی کسر غلام خاں' خوش بخت اور ان کی بیٹیوں نے پوری کر دی تھی۔ ان کی پر خلوص چاہت ناک میں دم کئے رہتی تھی۔ کاش یہ چاہتیں مجھے کچھ عرصہ پہلے ملی ہوتیں۔ سوچتے سوچتے میرے دل میں آئی کیوں نہ کسی دن خاموشی سے یہ سب کچھ چھوڑ کر چلی جاؤں۔ سارے جنجالوں سے جان چھڑا کر اس راستے پر پہنچ جاؤں جس کا اختتام میرے انتقام کی تکمیل پر ہوتا تھا یا میری موت پر......... مگر اس سوچ کے ساتھ ہی سلیم کی والدہ کا چہرہ تصور میں آیا اور وہ فقرے کانوں میں گونجنے لگے جنہوں نے چند لمحوں میں میری زندگی کا نقشہ بدل دیا تھا۔

"دیکھو بیٹی تم ایک ماں ہو اور میں بھی ایک ماں ہوں تم اپنا بچہ کھو چکی ہو مگر میرا بچہ ابھی زندہ ہے۔ تمہارا بچہ واپس نہیں آسکتا لیکن میرا آسکتا ہے۔ کیا ایک ماں اپنی ممتا کے صدقے دوسری ماں پر رحم نہیں کھائے گی۔"

میں سوچنے لگی کیا میرے اس طرح چلے جانے سے وہ عہد بچ جائے گا جو میں نے اپنی طرح کی ایک دکھی ماں سے کر رکھا ہے۔ کیا میں اس کے بچے کو پہلے سے زیادہ اذیت ناک عذاب میں تو مبتلا نہیں کر جاؤں گی؟"

"کیا وہ زندہ رہ سکے گا؟"

میں سوچتی رہی اور نیا نویلا نرم و گداز بیڈ نوکیلے پتھروں کی مانند میرے جسم پر چبھتا رہا۔ دیوار گیر میوزیکل کلاک نے گیارہ بجے کا وقت بتایا مکان میں اور مکان سے باہر خاموشی تھی بستی کے سامنے اونچی ہموار چٹان پر چاند رات کا جشن منانے والے نوجوان

اور خوش طبع بوڑھے بھی اب گھروں کو جا چکے تھے۔ بس کہیں کہیں درختوں کی طرف سے کسی شخص کے بولنے یا بکری کے ممیانے کی صدا آجاتی تھی۔ کمرے کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لئے بستر سے اٹھی۔ یہی وقت تھا جب مجھے دینو کی پہلی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے برآمدے میں اوپر تلے دو فائر گونجے۔ پھر میں نے دینو کو دیکھا وہ بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کے پیچھے شلوار قمیض اور پگڑی والا ایک دراز قد شخص تھا۔ دراز قد شخص نے بندوق کا وزنی کندا پورے زور سے دینو کے سر پر مارا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ فرش پر گرا اور بے حرکت ہوگیا۔ یہ سارا منظر میں نے ایک یا دو سیکنڈ کے اندر دیکھا پھر پلٹ کر کھڑکی کی طرف آئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کھڑکی تک پہنچتی یا اس میں سے کود کر باہر نکلتی' ادھ کھلی کھڑکی ایک دھماکے سے پوری کھل گئی اور ایک رائفل بردار کود کر اندر آگیا۔ میں حلق کی پوری قوت سے چیخی۔ رائفل بردار نے مجھے دبوچنا چاہا تو میں جھکائی دے کر اس کی زد سے نکلی اور پتھر کا ایک وزنی گلدان پورے زور سے اس کے منہ پر مارا۔ میری ضرب بے حد کاری ثابت ہوئی۔ مدمقابل کے حلق سے چیخ سی نکل گئی وہ الٹ کر پہلے ایک میز سے ٹکرایا پھر ٹی وی سیٹ پر جا گرا۔ بالکل نیا ٹی وی سیٹ جسے ابھی آن بھی نہیں کیا گیا تھا پہلو کے بل فرش پر گرا اور چکنا چور ہوگیا۔ اسی دوران میرے عقب سے ایک شخص کمرے میں داخل ہو چکا تھا اس نے مجھے زوردار دھکا دیا اور میں اوندھے منہ بیڈ پر جا گری۔ گھلی ہوئی مہندی کا وہ پیالہ جو خوش بخت میرے لئے رکھ گئی تھی الٹ کر بیڈ پر پھیل گیا۔ تب ایک سخت ضرب میری کنپٹی پر لگی۔ پتہ نہیں یہ مکہ تھا' ریوالور یا بندوق کا کندا تھا یا کچھ اور۔ بہرحال اس ضرب نے مجھے نڈھال کر دیا اور مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر چیخنا چاہا لیکن آواز نے حلق تک پہنچنے سے انکار کر دیا۔ کوئی شخص میرے بازوؤں کو موڑ کر پشت پر باندھ رہا تھا۔ کانوں میں بھاگتے دوڑتے قدموں اور تیز تیز باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا حملہ آور پورے گھر میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ غالباً وہ سلیم کی موجودگی سے آگاہ تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے اپنی مزاحمت کو جمع کر کے ایک بار پھر مدد کے لئے پکارنا چاہا لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ

میرے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس دیا گیا ہے اور میری آواز تالو کے اندر ہی گونج رہی ہے۔

پھر کسی نے مجھے کندھے پر اٹھایا اور بھاگ کر کسی گاڑی میں ڈال دیا۔ فائرنگ کی مسلسل آوازیں بھی آرہی تھیں۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور مجھے لے کر آگے بڑھی' میں نے گردن موڑ کر گاڑی کی کھڑکی میں سے دیکھا عقب میں سرخ روشنی نظر آرہی تھی۔ یہ روشنی آگ کے شعلوں کی تھی۔ جو ہمارے مکان کی ایک کھڑکی سے نکل رہی تھی۔ شعلوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ پٹرول یا کیروسین آئل کی آگ ہے اور چند ہی لمحوں میں پورے گھر کو لپیٹ میں لے لے گی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی گھر میں کھڑی سلیم سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب جیسا لگا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟

کیوں ہو رہا تھا؟

"پشتو میں بولنے والے یہ لوگ کون تھے۔ دفعتاً گاڑی کو جھٹکا لگا۔ اس نے گلی میں دو تین سخت موڑ کاٹے اور غلام خاں کے گھر کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک شخص نے گاڑی کے اگلے حصے سے کھڑے ہو کر زور زور سے پشتو بولی۔ ان فقروں میں غلام خاں کا نام بڑی نفرت سے لیا گیا اور اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم پر قیامت ڈھانے والے ہمارے نہیں غلام خاں کے دشمن ہیں۔ اکا دکا غلام خاں کے گھر کی چھت سے ریوالور کے فائر ہوئے۔ بستی کے دیگر گھروں کی طرح غلام خاں کے گھر کی چھت پر بھی ایک گول مورچہ سا بنا ہوا تھا۔ مٹی کے اس مورچے میں فائرنگ کے لئے جا بجا سوراخ رکھے گئے تھے۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ فائر اسی مورچے سے کئے گئے ہیں۔ ایک دو گولیاں گاڑی میں بھی لگی تھیں۔ دفعتاً مجھے غلام خاں کی آواز گاڑی سے چند گز کی دوری پر آئی۔ میں سیٹ پر بندھی پڑی تھی اور دیکھ نہیں سکتی تھی تاہم میرا اندازہ تھا کہ غلام خاں اپنے گھر کے بیرونی گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آواز غیض و غضب سے چیختی ہوئی تھی۔ اوپر تلے خودکار رائفل کے دو برسٹ چلے' پھر مجھے خوش بخت کے رونے کی آواز آئی۔ وہ دردناک آواز میں بین کر رہی تھی۔ میں نے چشم تصور سے اونچے لمبے سرخ و سفید غلام خاں کو خاک و خون میں لوٹتے اور اس کی بیوی کو روتے پیٹتے دیکھا ایک بار پھر تڑپ کر میں نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہا لیکن میرے سرہانے بیٹھے شخص نے

مجھے یوں اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا لیا جیسے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے دبایا جاتا ہے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک ہی خیال تھا' میں اپنے میزبان کے دشمنوں کے ہاتھوں اغوا ہو رہی ہوں......... ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ سلیم کہیں سے آ جائے اور مجھے ان لوگوں کے چنگل سے نکال لے' مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا۔ سلیم اس اندھی رات کے روبرو نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ اسے ابھی زندہ رہنا تھا۔ اسے ابھی دو بوڑھی آنکھوں کے لئے بہت بہت جینا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر حرکت میں آ چکی تھی۔ اس کے ساتھ فائرنگ کی تڑ تڑ بھی جاری تھی۔ ایکا ایکی فائرنگ رک گئی اور گاڑی اونچے نیچے راستے پر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

میں ایک خواب دیکھ رہی تھی' منظر چنگیزیوں کے ڈیرے کا تھا' میں نے دیکھا بدنصیب پہریدار شمشیر خاں رائیل بنگال ٹائیگر کے چنگل میں ہے۔ درندہ اس کے جسم کو ادھیڑ رہا ہے۔ پھاڑ رہا ہے۔ شمشیر خاں کے حلق سے کربناک چیخیں اور جسم سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ دفعتاً میں دیکھتی ہوں کہ شیر کے خدوخال وہاب چنگیزی کے خدوخال میں ڈھل رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اگلا نصف دھڑ حیوان کا بن جاتا ہے۔ وہ چنگھاڑ رہا ہے اور اپنے خوفناک دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ تب میں دیکھتی ہوں کہ پہریدار شمشیر خاں کی جگہ میں خود پڑی ہوں رو رہی ہوں' چلا رہی ہوں۔ وہاب سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہوں' مگر اس کی دم تیزی سے گردش کر رہی ہے اور اس کے پنجے میرے جسم کا گوشت ادھیڑے چلے جا رہے ہیں۔ اذیت کے بے پناہ احساس کے ساتھ میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے خود کو کھجور کی ایک چٹائی پر پایا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے اور دوران خون رکنے سے ہتھیلیوں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ کنپٹی پر لگنے والی چوٹ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں بدقت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ نیچی چھت والا ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ ایک کھڑکی اور دروازے کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا۔ کھڑکی میں زنگ آلود آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ درزوں سے آنے والی روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوپہر سے کچھ پہلے یا بعد کا وقت ہے۔ چٹائی

کے پاس ہی چمڑے کی بہت سی کترن پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا واٹر کولر اور المونیم کا ایک گلاس تھا۔ کمرے سے باہر مکمل خاموشی تھی۔ لگتا تھا قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں۔ پیاس سے میرا حلق کانٹا ہو رہا تھا۔

میں نے پکار کر کہا "کوئی ہے......... کوئی ہے" فوراً ہی دروازے کے بالکل پاس سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

"ذرا چھری تلے سانس لے بچی۔ ابھی تجھے پانی پلاتے ہیں۔" بولنے والے کا لہجہ مقامی تھا۔

اس کے سخت لب و لہجے نے مجھے ان گنت اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ نہ جانے مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ میرے کانوں میں دینو کی چیخ و پکار گونجی اور پھر اس کے گرنے کا منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھا۔ بچا بھی تھا یا نہیں۔ پھر خوش بخت کی چیخیں میرے ذہن میں ہلچل مچانے لگیں۔ اپنے شوہر کے سرہانے اس کے بین بڑے دلدوز تھے۔ کتنا خوشحال اور مطمئن جوڑا تھا وہ۔ غلام خاں پروگرام بنا رہا تھا کہ اس برس اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے اور بیوی کے ساتھ بیت اللہ جائے گا اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس نے اسے نرینہ اولاد کی نعمت سے نوازا لیکن اس کے تمام پروگرام دست اجل نے بیک جنبش قلم منسوخ کر دیئے تھے۔ میں اپنی سوچ میں کھوئی تھی۔ جب اچانک کمرے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔ یہ ٹاپیں بتدریج دروازے کے پاس پہنچیں اور پھر رک گئیں۔ کئی افراد گھوڑوں سے اترے اور دروازے کی جانب بڑھے۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر پیش آمدہ حالات کے لئے تیار کیا اور ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے سے باہر کسی نے تالے میں چابی گھمائی اور پٹ کھول دیئے۔ کمرہ اجلی روشنی سے بھر گیا۔ میرے سامنے کم از کم پندرہ افراد کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب مقامی لباس میں اور پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں ایک دراز قد درمیانی عمر کی عورت بھی تھی۔ اس کا رنگ بے حد اجلا اور آنکھیں نیلی تھیں اس نے چہرے کا زیادہ تر حصہ ایک سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سوگواری اس عورت کے چہرے پر ٹوٹ کر برس رہی ہے۔ اس کی نیلی جھیلوں میں اشکوں کا تلاطم تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس

کی کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی تھی اور خنجر لٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بھی بے پناہ رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا میرے سامنے پہنچا کچھ دیر درد ناک نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑک رہے تھے۔ دفعتاً وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور مجھ پر جھپٹا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور خنجر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک ساعت کے اندر خنجر کا پھل میرے سینے میں اترنے والا تھا اور میں موت کے ذائقے سے آشنا ہونے والی تھی۔ موت کے انتظار کی یہ ساعت صدیوں سے بھاری تھی۔ اس ساعت کے گزرنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ خنجر کو میرے جسم تک پہنچنے سے پہلے روک لیا گیا تھا۔ روکنے والا ایک درمیانی عمر کا باریش شخص تھا۔ وہ پوری قوت کے ساتھ خنجر بدست بازو سے لپٹا ہوا تھا اور پکار رہا تھا۔

"ہوش کرو صاحب جان' ہوش کرو' اس میں ہمارا ہی نقصان ہے۔" دیکھتے ہی دیکھتے پانچ چھ اور آدمی بھی قوی ہیکل صاحب جان سے لپٹ گئے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے نکل نکل کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے۔ خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دمک رہا تھا۔ اس نظارے کی دہشت لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ معلوم نہیں اس شخص کو مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ کیا صدمہ پہنچا تھا اسے میری ذات سے۔ میں تو خود ظلم کا ہدف اور صدموں کا نشانہ تھی۔ میں ہکی بکی اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک شخص مجھے دھکیل کر کمرے کے ایک کونے میں لے گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے خنجر والے سے بچانا چاہتا ہے۔ اسی دوران خنجر والا بے پناہ جوش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ غصے سے چنگھاڑتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا میرے اور موت کے درمیان اب کوئی چیز حائل نہیں۔ میں نے سمٹ کر دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن ٹھوکر کھا کر پہلو کے بل گری۔ میرا یہ گرنا ہی مجھے خنجر بردار کے پہلے "قاتل وار" سے بچا گیا۔ خنجر میرے کندھے سے چھوتا ہوا کچی دیوار میں لگا۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور دوبارہ مجھ پر وار کرتا' باریش شخص زندگی کا فرشتہ بن کر ایک بار پھر اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے حملہ

آور کے خنجر والے ہاتھ پر کوئی چیز ماری۔ میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی۔ بہرحال خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ باریش شخص نے اسے دبوچنا چاہا مگر وہ جھکائی دے کر تیر کی طرح میری طرف آیا اور خالی ہاتھ مجھے پیٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ ہتھوڑوں کی طرح تھے۔ مجھے اپنی ہڈیاں چٹختی محسوس ہوئیں۔

"صاحب جان!" باریش شخص نے ایک بار پھر پکار کر کہا اور بڑی دلیری کے ساتھ اس سے لپٹ گیا۔

اتنے میں دو تین اور افراد حرکت میں آ گئے لیکن وہ مجھے فربہ اندام شخص سے بچانے کے لئے حرکت میں نہیں آئے تھے۔ انہوں نے اس باریش شخص کو پکڑ لیا جو میری حمایت میں فربہ اندام شخص سے لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے کھینچ کر فربہ اندام سے علیحدہ کر دیا۔ میں ایک بار پھر اس غضبناک شخص کے سامنے تنہا رہ گئی جو میری جان کے درپے نظر آتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ سب اردگرد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کون سے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی تھی مجھے......... میں نیم بے ہوش ہو کر گر گئی تو اس شخص نے مجھے بازو سے کھینچ کر ایک کرخت چہرہ رائفل بردار کے حوالے کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔

"لے جاؤ اس بدبخت کو۔ لے جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے۔" کرخت چہرہ شخص جس کا نام عیدو خان تھا بڑی گھناؤنی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ناک کی ہڈی عجیب طرح سے مڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بازو سے کھینچا اور ایک ایسے جھٹکے سے جس کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکی مجھے اپنے کندھے پر ڈال دیا۔ اس موقع پر میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن عیدو کی گرفت بہت سخت تھی۔ چند فٹ یا چند گز چلنے کے بعد اس نے بے دردی سے مجھے ایک چارپائی پر پھینک دیا۔ یہ ایک دوسرا کمرہ تھا۔ میرا سر کافی شدت کے ساتھ چارپائی کے بازو سے ٹکرایا مگر نہ جانے کیوں میں پہلے سے نیم بے ہوش ہونے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوئی۔ میرے اندر کی عورت جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "ثناء تمہیں ہوش میں رہنا ہے' تمہیں مزاحمت کے حق سے دستبردار نہیں ہونا' تمہیں اپنی حفاظت کرنی ہے۔"

میں دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف خطرناک چہرے دیکھ رہی تھی۔

ان چہروں پر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ انتقام کی آگ میں تپے ہوئے یہ چہرے میری بدقسمتی کا کھلم کھلا اعلان کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کون مرد تھا یا عورت تھی جس کے بدلے میں مجھے یہاں لایا گیا تھا اور جس پر ہونے والی کسی زیادتی کا انتقام مجھ سے لیا جا رہا تھا۔

اچانک میں نے خود کو ایک ناپاک گرفت میں محسوس کیا اور پورے زور سے چلانے لگی۔ یہی وقت تھا جب اس کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ "کون ہے؟" عیدو خاں کی کرخت آواز مجھے اپنے پاس سے آئی۔

"میں ہوں توخی خانم دروازہ کھولو۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ نیلی آنکھوں والی وہی عورت ہے جو باہر فربہ اندام شخص کے ساتھ نظر آئی تھی۔ عیدو خان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے اندر آ گئی۔ یقیناً یہ عورت بھی میری دشمن تھی لیکن عورت تو تھی۔ اس کا وجود مجھے اپنی پناہ گناہ محسوس ہوا میں لپک کر اس کے پاس آ گئی۔ اس نے کندھے کے قریب سے میرا بازو تھام لیا اور عیدو خان سے بولی۔

"نہیں عیدو...... یہ بات ٹھیک نہیں۔ برے کے ساتھ برے نہیں بن جاتے۔"

"عیدو خاں نے کہا "لیکن ملکو......"

"بکواس بند کرو۔" توخی خانم دھاڑی۔

"ملکو سے میں خود بات کرلوں گی۔"

عیدو خان اور اس کے دو ساتھی مجھے چھوڑنے پر راضی نظر نہیں آتے تھے لیکن توخی خانم کسی نہ کسی طرح مجھے ان کے چنگل سے نکال ہی لائی۔ اس نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے آگے دھکا دیا اور ساتھ لے کر اس مکان سے باہر نکل آئی۔ ایک جانب سے وہی فربہ اندام شخص چند مسلح افراد کے ساتھ برآمد ہوا۔ مجھے توخی خانم کے ساتھ دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ اس نے پشتو میں توخی خانم سے کچھ کہا۔ مجھے آزاد علاقے میں رہتے ہوئے سات آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور میں کسی حد تک پشتو کے الفاظ سمجھنے لگی تھی۔ فربہ اندام شخص جس کا پورا نام حاجت خان ملکو تھا توخی خانم سے پوچھ رہا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ توخی خانم نے کہا "میں اس لڑکی کو گھر لے جانا چاہتی

ہوں۔"

حاجت خان ملکو بولا۔

"بہن...... یہ اس قابل نہیں کہ تم اسے اپنے گھر کی دہلیز پار کراؤ۔ اس کا مقام ہمارے پاؤں کے جوتے ہیں اور اس کی زندگی ہماری گردن کا بوجھ ہے۔"

توخی خانم نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ملکو...... میں بھی اسے جوتوں میں ہی بٹھاؤں گی۔ اگر زندہ رہی تو موت کو ترستی رہے گی......"

حاجت خان اور توخی خانم کے درمیان مکالمہ کچھ دیر جاری رہا۔ اس مکالمے سے مجھے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ توخی خانم کو اپنی نوجوان بیٹی کا غم ہے جو کسی وجہ سے اب اس دنیا میں نہیں۔ اس مکالمے کے اختتام پر حاجت خان مجھے توخی خانم کے ساتھ بھیجنے پر رضامند ہو گیا۔

توخی خانم مجھے لے کر ایک اصطبل پر چلی آئی۔ یہ جگہ اس جھونپڑا نما مکان سے نصف فرلانگ دور تھی جہاں مجھے مارا پیٹا گیا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور منہ میں رہ رہ کر خون کا ذائقہ گھل جاتا تھا۔ یہاں چار گھڑ سوار موجود تھے۔ ان سب کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا۔ بھاری شلوار نما پرتوگ' کڑھائی دار کھلی قمیضیں' سفید پھولوں والے لال پٹکے۔ توخی خانم کو دیکھتے ہی انہوں نے ادب سے سر جھکایا۔ ہمارے پہنچتے ہی دو خالی گھوڑے لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ توخی خانم نے ایک گھوڑے پر مجھے سوار کرایا اور دوسرے پر خود سوار ہو گئی۔ ہمارا یہ مختصر قافلہ اونچے نیچے پیچیدہ راستے پر سفر کرتا شمال کی جانب روانہ ہوا۔ گھڑ سواری کا مجھے تجربہ نہیں تھا' دوسرے راستہ بھی ناہموار تھا۔ میں گر گر جا رہی تھی۔ توخی خانم نے یہ دیکھتے ہوئے مجھے ایک گھڑ سوار کے پیچھے بٹھا دیا۔

قریباً پانچ میل فاصلہ دو ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے ہم ایک خیمہ بستی میں پہنچے۔ یہاں خیموں کے علاوہ نیم پختہ جھونپڑے بھی تھے۔ جن پر مکانوں کا گمان ہوتا تھا۔ خیموں اور جھونپڑوں سے باہر کتے اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے تھے۔ کتوں نے ہمیں دیکھتے ہی زور شور سے بھونکنا شروع کر دیا اور ملیشیا کی لمبی قمیضوں اور ننگی پنڈلیوں والے بچے جھونپڑوں سے نکل کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک ویسی ہی بستی ہے جہاں سے مجھے لایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے رہن سہن کا انداز خانہ بدوشوں جیسا تھا۔ بستی کے درمیان

سے گزر کر ہم ایک کشادہ جھونپڑے میں آئے۔ اس جھونپڑے کی دیواریں گارے اور پتھروں کی تھیں۔ جھونپڑے کے چاروں طرف سرکنڈوں کی ایک اونچی باڑ تھی۔ ایسی باڑیں بیشتر جھونپڑوں کے گرد نظر آتی تھیں۔ جھونپڑے سے باہر لمبے بھورے بالوں والے دو انتہائی خوفناک صورت کے کتے بندھے ہوئے تھے۔ گھڑسوار باہر ہی رہ گئے۔ توخی خانم مجھے لے کر اندرونی حصے میں پہنچی۔ یہ کشادہ جھونپڑا دو سے زائد حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے سے کسی کے کراہنے کی مدہم آواز آ رہی تھی' کراہنے والا کوئی مرد تھا۔ جھونپڑے میں دو عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک کے بارے بعد میں پتہ چلا کہ وہ توخی کی بیٹی ہے۔ یہ دونوں عورتیں مجھے بڑی نفرت انگیز نظروں سے گھورتی رہیں۔ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ دونوں مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ توخی خانم نے آگے بڑھ کر دونوں عورتوں سے دھیمے لہجے میں مختصر گفتگو کی۔ توخی خانم کی بیٹی اٹھی اور اندر سے ایک بوریا سا اٹھا لائی۔ یہ بوریا اس نے بڑے غصے سے میرے منہ پر مارا اور بولی۔

"اس کو پہن لے۔"

تب میں نے دیکھا کہ یہ بوریا دراصل ایک موٹا اور بھدا سا کپڑا ہے جسے لمبے کرتے کی شکل میں سیا گیا ہے۔ میں حیرانی سے کبھی کرتے کو دیکھتی تھی اور کبھی توخی خانم کو۔ اس کی بیٹی پھنکار کر بولی "تجھے سمجھ نہیں آئی ہماری بات؟" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ مجھ پر جھپٹی۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میرا لباس پھاڑ کر میرے جسم سے علیحدہ کر دے گی۔ میں خود کو اس کی زد سے بچانے کے لئے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ توخی خانم نے مجھے بازو سے پکڑا اور دانت پیستے ہوئے بولی۔

"بدبخت! جو تجھ سے کہا جا رہا ہے وہ کر۔"

جھونپڑے کے ساتھ والے حصے میں جا کر میں نے ریشم کی وہ پھولدار قمیص بدلی جو میرے جسم پر چاند رات کی نشانی تھی۔ آج روز عید تھا اور میں چاند رات کا ریشم اتار کر عید کا بوریا پہن رہی تھی۔ میری نگاہوں میں سلیم کا چہرہ گھومنے لگا۔ کل رات وہ باغ سے رات کی رانی کے پھول لے کر خوشی خوشی واپس لوٹا ہو گا۔ پھر اس نے اپنا آشیانہ شعلوں پر پایا ہو گا اور اپنے عزیز دوست غلام خاں کی خونچکاں لاش دیکھی ہو گی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اس پر کیا بیتی ہو گی۔ یہ کیسی عید آئی تھی ہمارے لئے؟ یہ وہ عید تو نہیں تھی جس کے

لئے کہا جاتا ہے "خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دکھائے" یہ تو ایک قیامت تھی جو ہم سب پر بیت گئی تھی۔

☆------------☆------------☆

اس جھونپڑے میں میری حیثیت ایک کنیز کی تھی۔ مجھ سے سارا دن کام لیا جاتا اور کھانے کو بچا کھچا ملتا۔ یہ پاؤندوں (خانہ بدوشوں) کی بستی تھی۔ عمر شاہ لندو نامی شخص یہاں کا سردار یا ملک تھا۔ توخی خانم ملک عمر شاہ لندو کی بیوہ بھاوج تھی۔ اس کے دو بچے تھے ایک لڑکی غلام سکینہ اور ایک لڑکا زرگل۔ یہ زرگل وہی تھا جس کی کراہیں میں نے جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی سنی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک گہرا زخم تھا اور یہ زخم میرا ہی دیا ہوا تھا۔ ان سب باتوں کا علم مجھے بعد میں غلام سکینہ کی زبانی ہوا۔ جب مجھے غلام خان کے گھر سے اغوا کیا گیا اور میں نے حملہ آوروں کی مزاحمت کی تو زرگل ہی وہ شخص تھا جس کے چہرے پر میں نے وزنی گلدان سے ضرب لگائی تھی۔ یہ ضرب بہت سنگین ثابت ہوئی تھی نہ صرف اس کا رخسار پھٹ گیا تھا بلکہ آنکھ کے نیچے بھی ایک گہرا زخم آیا تھا۔ اب اس واقعے کو دس روز ہونے کو آئے تھے لیکن زرگل کا زخم اچھا نہیں ہوا تھا وہ اکثر کراہتا رہتا تھا۔ شب و روز ایک لگے بندھے معمول کے ساتھ گزر رہے تھے' صبح اٹھ کر مجھے کم از کم پندرہ بھیڑوں اور بکریوں کا دودھ دوہنا پڑتا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے نورے گاذی سے دودھ دوہنا سیکھا تھا اس وقت کیا پتہ تھا جلد ہی یہ کام میری سخت ترین مشقت میں شامل ہو جائے گا۔ میری کلائیاں پھوڑے کی طرح دکھنے لگتیں۔ بعد ازاں مجھے غلام سکینہ اور چند دوسری عورتوں کے ساتھ پانی لانے کے لئے چشمے تک جانا پڑتا۔ چشمے کا فاصلہ ایک میل سے کم نہیں تھا اور راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ واپس آ کر غلام سکینہ تو ریوڑ کے ساتھ بستی سے باہر چلی جاتی اور میں سارا دن توخی خانم کی نگرانی میں کام میں جتی رہتی۔ گھر کا سارا کام مجھ سے لیا جاتا اور اگر کچھ وقت بچتا تو چٹائیاں بننے پر لگا دیا جاتا۔ یہ چٹائیاں کھجور یا اسی طرح کے کسی اور پودے کے خشک پتوں سے بنی جاتی تھیں۔ سارا دن بستی کی گلیوں میں کتے بھونکتے' بچے شور مچاتے اور بکریاں ممیاتی رہتیں۔ میں یہاں سے فرار ہونے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتی تھی۔ خونخوار کتوں اور ان گنت رائفلوں کی زد سے بچ کر اس نامعلوم مقام سے نکل جانا ناممکن تھا۔

غلام سکینہ اب مجھ سے تھوڑی بہت بات کر لیا کرتی تھی۔ ایک رات جب مطلع ابر آلود تھا اور بارش کی ہلکی ہلکی بوچھاڑیں ہوا کے زور سے جھونپڑے کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں۔ غلام سکینہ کے قریب لیٹے لیٹے میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ہولے سے کہا۔

میں نے اپنے لہجے میں التجا کا رنگ سمیٹ کر کہا "سکینہ! تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی دن بتاؤں گی۔"

"کیا بتاؤں گی؟"

"یہی کہ مجھے کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے۔"

"اب سو جاؤ......... آدھی رات ہو گئی ہے۔"

سکینہ نے بیزاری سے کہا اور کروٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں اپنی جگہ خاموش لیٹی رہ گئی۔ پھر پتہ نہیں کیوں سکینہ کو مجھ پر ترس آ گیا۔ چند منٹ بعد اس نے رخ دوبارہ میری طرف کیا اور مقامی لہجے میں بولی "ہاں! کیا پوچھنا چاہتی ہو تم؟"

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ سرگوشی میں بولی "دیکھو......... ماں کو کچھ نہ بتانا ورنہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی چمڑی ادھیڑ دے گی۔"

میں نے وعدہ کیا کہ کچھ نہیں بتاؤں گی۔

سکینہ نے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم بے قصور ہو لیکن ہمارے رواج کی مطابق ایسا نہیں ہے۔"

جھونپڑے کی تاریکی میں سکینہ نے سینے سے گہری سانس خارج کی اور بولی "آج سے ڈیڑھ برس پہلے ایک ایسی ہی ابر آلود رات کو ہمارے گھرانے پر قیامت بیت گئی تھی۔ ہمارا پڑاؤ اسی علاقے میں تھا۔ ساتھ والی بستی میں ایک شادی کی رسم تھی۔ حاجت خاں ملکو کی بہن کی شادی تھی۔ میرا والد میری ماں اور میری بڑی بہن نگینہ اس شادی میں گئے ہوئے تھے۔ رات کو کچھ گھوڑ سواروں نے شادی والے گھر پر حملہ کیا۔ اس حملے میں میرا باپ سینے میں گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا جبکہ دو اور شخص بھی شدید زخمی ہوئے۔ گھر سوار جاتے جاتے حاجت خاں کے گھر سے میری بڑی بہن نگینہ کو اٹھا کر لے گئے.........." یہاں

تک کہتے کہتے غلام سکینہ کا لہجہ بھیگ گیا اور وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "میری بہن کی لاش چوتھے روز ایک خشک پہاڑی نالے کے اندر سے ملی۔ ظالموں نے اسے بے آبرو کر کے مار ڈالا تھا......... اور یہ سارا کام اسی غلام خاں کے سگے بھائی نے کیا تھا جس کے پاس تم اور تمہارا شوہر مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمارے قبیلے کا قانون ہے کہ مہمان کے خون کا بدلہ مہمان کا خون ہوتا ہے۔ غلام خان کے گھرانے نے چونکہ حاجت خاں ملکو کے مہمانوں کو قتل کیا تھا لہٰذا حاجت خان بھی اس انتظار میں تھا کہ وہ غلام خاں گھرانے کے مہمانوں کو نشانہ بنائے۔ یہ تمہاری بدقسمتی کہ تم اس آگ کی لپیٹ میں آ گئیں۔ تمہارے اور تمہارے شوہر کے بارے میں حاجت خان کے کارندوں کو بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ صرف بہتر موقع کی تلاش میں تھے۔ تمہاے شوہر کی قسمت اچھی ہے کہ وہ پنجاب سے واپس آنے کے باوجود گھر میں نہیں تھا ورنہ......... اس کا انجام بھی غلام خاں سے مختلف نہ ہوتا۔"

میں نے لرز کر پوچھا "تو......... غلام خاں مر چکا ہے؟"

"ہاں۔"

سکینہ نے میرے بدترین شبہات کی تصدیق کی "غلام خاں اور اس کے بھائی شمشیر گل کی لاشیں ایک ساتھ گری تھیں......... شاید تم بھی اب تک زندہ نہ ہوتیں......... لیکن میری والدہ وہ ظلم نہ دیکھ سکیں جو تم پر میری بہن نگینہ کے بدلے کیا جانے والا تھا۔ انہوں نے تمہیں عیدو خان کے چنگل سے نکال لیا اور حاجت خاں ملکو سے کہا کہ تمہیں ان کے حوالے کر دیا جائے.........!

میں حیرت میں گم یہ روئیداد سن رہی تھی۔ دست قدرت مجھے کن راستوں پر کھینچتا ہوا کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ اب ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں میں اس جھونپڑے کے مکینوں کی قیدی تھی۔

میں نے غلام سکینہ سے پوچھا۔

"اب میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے تم لوگ؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"تمہارے انجام کا فیصلہ اب ماں اور تایا کے ہاتھ میں ہے' میں کچھ کہہ نہیں

سکتی۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ غلام خاں کے وارث مجھے چھڑانے کی کوشش کریں!؟"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"اگر تم غلام خاں کے وارثوں سے امید لگاؤ گی تو غلطی کرو گی۔ غلام خاں اور اس کے بھائی کی موت کے بعد اب ان کے گھرانے میں ایک بھی ایسا شہ زور نہیں بچا جو بدلہ چکا سکے اور اگر کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔"

میری نگاہوں میں سلیم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ وہ اپنی نئی رائفل تھامے غصے میں کھولتا ہوا ان لوگوں کی تلاش میں ہے جنہوں نے مجھے اس سے دور کیا اور اس کے عزیز دوست کو خاک و خون میں لوٹایا۔ اس کی مصیبت کا سوچ کر میری آنکھیں جلنے لگیں۔

"وہ کیا کرے گا؟"

"کہاں کہاں کی خاک چھانے گا؟"

"اس کی تلاش کا انجام کیا ہوگا؟"

بہت سے زہر میں بجھے ہوئے سوال میری سوچ کو زخمی کرنے لگے۔

.... پھر اسی طرح پورے دو ماہ گزر گئے۔ معلوم نہیں میرے پیچھے کیا ہوا اور کیا نہیں۔ میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ سلیم کو پتہ ہی نہ چل سکا ہو کہ مجھے اغوا کرنے والے کون تھے۔ ممکن تھا غلام خاں کے وارث بھی قاتلوں کو شناخت نہ کر سکے ہوں۔ بہت سے امکانات ہو سکتے تھے۔ توخی خانم کا بیٹا زر گل اب ٹھیک تھا اس کا زخم مندمل ہو چکا تھا مگر چہرہ ہمیشہ کے لئے مسخ ہو گیا تھا۔ رخسار کی ہڈی ٹوٹنے سے منہ عجیب ٹیڑھا سا ہو گیا تھا اور ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی رہ گئی تھی۔ وہ ایک خوش شکل نوجوان رہا ہو گا لیکن اب اس کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ وہ سارا دن جھونپڑے میں گھسا رہتا' ایک پٹکا اس کے سر پر رہتا۔ جب کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ پٹکے کا گھونگھٹ سا نکال لیتا۔ وہ بہت کم بولتا تھا میرے ساتھ بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنا رخ پھیر کر رکھتا۔ وہی بات کرتا جو بے حد ضروری ہوتی اور ضرورت سے زیادہ ایک لحہ مجھے

اپنے حجرے میں نہ رہنے دیتا۔ اس ڈیڑھ مہینے میں میں صرف ایک دفعہ اس کے پاس گئی تھی۔ سکینہ ریوڑ کو لے کر گئی ہوئی تھی جبکہ توخی خانم حکیم کے ہاں تھی۔ زر گل بخار میں پھنک رہا تھا' گہری غنودگی کی حالت میں وہ سکینہ سکینہ پکارنے لگا تھا۔ میں پاس آئی تو بولا "میرا سر پھٹ رہا ہے.......... میرا سر ٹکڑے ہو رہا ہے۔" میں اس کے پاس بیٹھ کر پیشانی دبانے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراہ کر بیدار ہو گیا مجھے اپنے سرہانے دیکھ کر جیسے اسے کرنٹ سا لگ گیا۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور زور سے بولا۔

"جاؤ.......... جاؤ.......... یہ کیا کر رہی ہو؟"

میں گھبرا کر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی آئی تھی۔

میں اب محسوس کرنے لگی تھی کہ سکینہ کے ساتھ ساتھ توخی خانم کا رویہ بھی مجھ سے نرم پڑ گیا ہے۔ مجھ سے پہلے جو کنیزوں والا سلوک ہوتا تھا اس میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ دوپہر میں مجھے ایک دو گھنٹے آرام کرنے کا موقع مل جاتا اور صبح دودھ دوہنے میں کبھی سکینہ اور کبھی توخی خانم میری مدد کر دیتیں۔ کھانا بھی اب مجھے پہلے سے اچھا ملنے لگا تھا۔ پھر ایک دن سکینہ نے میری ریشم کی قمیص بھی واپس دے دی اور یوں مجھے جسم کاٹ کھانے والے بوریئے نما کپڑے سے نجات مل گئی۔ میں ان مہربانیوں کی وجہ ٹھیک طرح نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ توخی خانم کیا چاہ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سفید سر عورت کے بارے میں میرے دل میں پیدا ہونے والے تمام اچھے جذبات ٹھٹھر کر مر گئے۔ عورت کی چھٹی حس ایسے معاملات میں بہت تیز ہوتی ہے اور میں تو پھر لحہ لحہ زمانے کی ڈسی ہوئی تھی۔ میں جان گئی کہ توخی خانم مجھے اپنے مجروح چہرہ بیٹے کی زندگی میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی صورت بگڑ چکی تھی' کوئی خوبصورت لڑکی تو کیا عام لڑکی بھی اسے اپنا شریک زندگی دیکھنا پسند نہ کرتی۔ اپنی اس پریشانی کا حل توخی نے یہ نکالا تھا کہ مجھے موت دینے کی بجائے میری زندگی کو استعمال کیا جائے۔ وہ ایک جہاندیدہ عورت تھی شاید پہلے دن ہی سے وہ اپنے ذہن میں اس مکروہ سوچ کا بیج ڈال چکی تھی۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ درست تھا کہ زر گل میرے ہاتھوں زخمی ہوا تھا لیکن یہ زخم میں نے نہیں اسے اس کے مجرمانہ رویے نے دیا تھا۔ میں اس زخم کا بدلہ چکانے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔

پھر ایک روز توخی خانم نے سکینہ کے ذریعے یہ بات مجھ سے کہہ ہی دی۔ سکینہ نے کہا۔

"بھائی زرگل بہت گم صم رہتا ہے۔ بیمار ہونے سے پہلے ایک جگہ اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی' وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ اس کی بیماری کا واحد حل اس کی شادی ہے۔ گھر گرہستی میں پڑ جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن اب اس سے شادی کرے گا کون؟"

میں نے سکینہ کی بات کا رخ پھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار گھوم پھر کر اسی طرف آ گئی۔ آخر کہنے لگی۔

"تایا جان تو تمہارے بارے کچھ اور ہی سوچ رہے تھے لیکن ماں نے انہیں روک دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں میری بیٹی کے ساتھ جو بیت گئی سو بیت گئی اب میں کسی اور کی جان کیوں لوں۔ ان کا خیال ہے کہ تم بیٹی بن کر ہمیشہ اسی گھر میں رہو۔"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"ماں کا خیال ہے کہ تم.......... بھائی سے.......... میرا مطلب ہے کہ بھائی کے نکاح میں آ کر عزت سے اس گھر میں رہو۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری خواہش کے سامنے سر جھکا دوں گی۔ کیسے لوگ ہو تم۔ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

سکینہ نے بھی ترش لہجہ اختیار کیا "یہ بات تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں' یہاں وہی ہوتا ہے جو بستی کا ملک کہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اگر بستی کا ملک ایسا ہی اندھا ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

سکینہ چنگھاڑی.......... "لعنت تجھ پر اور تیرے ہوتے سوتوں پر ہزار بار.........."

میری اور سکینہ کی آوازیں سن کر توخی خانم بھی وہاں چلی آئی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ آتے ساتھ ہی اس نے ایک چانٹا میرے منہ پر مارا اور برسنے لگی۔ وہ شاید مجھے بری طرح پیٹ ڈالتی لیکن اسی دوران وہ باریش شخص اندر آ گیا جس نے اس سے پہلے

حاجت خاں کی بستی میں مجھے حاجت خاں کی مار پیٹ سے بچانے کی کوشش کی تھی اور کوئی وزنی چیز مار کر حاجت خاں کے ہاتھ سے خنجر گرا دیا تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر نورانی صورت شخص تھا۔ ایسا شخص "نیکی" جس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ اس نے توخی خانم کا اٹھا ہوا ہاتھ روکا اور بڑی ہمدردی سے مجھے اپنے بازو کی آڑ میں لے لیا۔ پھر اس نے تحکم سے توخی خانم اور سکینہ کو باہر جانے کو کہا "بیٹی" کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اس کے جادو اثر لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل بھر آیا۔ ایک مدت بعد یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اپنے کسی بڑے کا قرب نصیب ہوا ہے۔ میں خاموشی سے بیٹھ گئی' باریش شخص نے کہا "میرا نام عصمت اللہ ہے یہاں کے لوگ مجھے ملا عصمت اللہ یا ملا جی کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں یہاں مدرسے میں بچوں کو قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم دیتا ہوں۔ دیکھو تم میری بیٹیوں کی طرح ہو میں تمہارا برا نہیں چاہ سکتا۔ انسان کو بعض اوقات حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں محدود عقل دی ہے ہم ایک حد سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ممکن ہے جس چیز کو ہم آج اپنے لئے برا سمجھتے ہوں وہی کل ہمارے حق میں مفید ثابت ہو .... تم جس جگہ آ گئی ہو وہاں سے اب واپس لوٹنا آسان نہیں۔ اگر کوئی انہونی نہ ہو جائے تو تمہیں اب یہیں رہنا ہے۔ انسان جس جگہ رہے وہاں کے رسم و رواج کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے اپنی زندگی اور آبرو کے لئے تمہیں خدا کے بعد توخی خانم کا احسان مند ہونا چاہئے۔ سچ پوچھتی ہو تو اس نے تمہیں ایک دردناک انجام سے بچایا ہے۔ یہاں کے رسم و رواج کے مطابق یہ لوگ اب تمہاری زندگی کے مالک ہیں لیکن یہ تم سے زندگی نہیں لے رہے زرگل کی زندگی کے لئے تم سے سہارا مانگ رہے ہیں تو تم ہر لحاظ سے سہارا فراہم کرنے کی پابند ہو۔"

مولوی عصمت اللہ خاں نے اپنی صدری کی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا' اس کاغذ پر سیاہ روشنائی سے کچھ لکھا تھا۔ مولوی عصمت اللہ نے کہا "یہ مقامی جرگے کے سربراہ کی طرف سے ہے۔ اس میں مقامی قانون کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے چہرے پر ایسا زخم لگایا جائے جس سے وہ بدشکل ہو جائے تو اس کے بدلے مضروب ایک عورت کا رشتہ مانگ سکتا ہے اور ضرب لگانے والا شخص یا گھرانہ یہ

رشتہ دینے کا پابند ہوگا۔ اب اس قانون کی رو سے ضروری ہے کہ وہ عزت جو تمہیں توخی خانم کی طرف سے دی جا رہی ہے اسے قبول کرلو۔"

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! اس بستی میں مجھے صرف آپ ہی کی آنکھوں میں سچی ہمدردی اور محبت نظر آئی ہے آپ کو تو میرا دکھ سمجھنا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور مجھے زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ میں توخی خانم کی خواہش کے سامنے کیونکر سر جھکا سکتی ہوں!"

مولوی صاحب میری بات میں وزن محسوس کر رہے تھے اور ان کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آتے تھے۔

وہ بولے "تم سو فیصد ٹھیک بات کر رہی ہو بیٹی.......... اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ میں بھی غلط نہیں کہہ رہا۔ ہم سب اپنی اپنی معاشرت کے قیدی ہیں۔ خود کو خدائی قوانین کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے ہم نے خدائی قوانین کو اپنی روایات اور خواہشات کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے۔ میں.......... میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے رویے میں تھوڑی سی نرمی پیدا کرو۔"

اس موقع پر مولوی عصمت اللہ صاحب نے اپنی آواز ذرا دھیمی کرلی اور بولے "اگر تم اپنی رویے میں نرمی پیدا کروگی تو توخی خانم سے تمہارے فوری تصادم کا خطرہ ٹل جائے گا۔ اس سے توخی خانم کو سوچنے کا موقع ملے گا اور تم بھی اپنے حالات کو بہتر طور پر جان اور پرکھ سکو گی۔ اللہ بڑا مہربان ہے' ہو سکتا ہے اس دوران کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

مولوی عصمت اللہ کی باتوں میں ہمدردی اور غمگساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب انہوں نے بڑی دلیری سے میرے اور حاجت خان کے درمیان آکر میری جان بچائی تھی۔ میرا دل چاہا کہ دل و جان سے انہیں اپنا بزرگ سمجھ کر ان سے مشورہ طلب کروں۔

میں نے کہا "مولوی صاحب! اب آپ بتائیں توخی خانم سے میرا رویہ کیا ہونا چاہئے؟"

وہ بولے "تم خاموش رہو تمہاری طرف سے میں بات کروں گا۔ میں اسے بتاتا

ہوں کہ تم نے سوچنے کے لئے کچھ وقت مانگا ہے۔ اور وہ دو تین ماہ تک اس معاملے کو چھیڑنے سے باز رہے' تم بھی کوشش کرو کہ توخی خانم اور سکینہ سے تعلقات ٹھیک رہیں.........."

☆==========☆==========☆

توخی خانم کے کہنے پر میں روز مدرسے میں مولوی صاحب سے دم کرانے جانے لگی۔ ایک دن میں گئی تو مولوی صاحب نے کہا "کل ذرا جلدی آنا۔ ہو سکے تو ظہر کے بعد ہی آجانا۔"

اگلے روز میں عصر سے تھوڑی دیر پہلے مدرسے پہنچی تو مولوی صاحب حجرے میں میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ وہ قدرے بے چین نظر آتے تھے۔ حسب معمول انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے "تم نے گھر میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی............؟"

"کیسی تبدیلی مولوی صاحب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی طرح کی تبدیلی!"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "توخی خانم نے کل جھونپڑے کی جھاڑ پونچھ کروائی تھی۔ دیواروں پر مٹی کا لیپ کروایا اور............ کل میں نے اور سکینہ نے سارے بستر وغیرہ دھوئے تھے۔"

مولوی صاحب نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولے "دراصل............ کل یہ لوگ زرگل سے تمہاری شادی کر رہے ہیں۔"

یہ اطلاع میرے سر پر بم کا دھماکہ تھی۔ میں حیرت سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ مولوی صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ساری صورت حال سے باخبر رکھوں گا۔ کسی نے تمہارے بارے میں بڑی سوچ بچار کی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارا تعلق ہمارے قبیلے سے نہیں۔ لہٰذا اس قبیلے

کے قوانین سے قطع نظر تمہیں اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ اب تم بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"

مجھ پر سراسیمگی طاری ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ ایک ایک بات جانتے ہیں پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

مولوی صاحب کچھ دیر سر جھکا کر سوچتے رہے۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"اٹھو............ آؤ میرے ساتھ" میں کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ وہ مجھے لے کر حجرے کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک برآمدہ نما جگہ سے گزر کر ایک جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چند عورتیں موجود تھیں میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں ایک مولوی صاحب کی بیوی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی بیٹی کو اشارہ کیا وہ اٹھی اور ایک ٹرنک میں سے سفید رنگ کا ٹوپی والا دیسی برقعہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے برقعہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"اسے پہن لو۔"

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ دوسری عورتیں بھی شاید میری ہی آمد کی منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جلدی جلدی برقعے پہن لئے یا چادروں کو اس طرح لپیٹ لیا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا کوئی حصہ ظاہر نہ رہا۔ یہ کل پانچ عورتیں تھیں اور پانچوں مولوی صاحب کے اپنے گھرانے سے لگتی تھیں۔ مولوی صاحب نے سب عورتوں کو باہر جانے کی ہدایت کی اور جب میں ان کے ساتھ جھونپڑے میں تنہا رہ گئی تو وہ بڑی شفقت سے بولے "تری پورہ کے مزار پر ایک بزرگ ہستی آئی ہوئی ہے۔ چارباغ سے پیر سید حسن صاحب کے مرید خاص ہیں۔ یہ سب عورتیں وہاں ان کا وعظ سننے جا رہی ہیں تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ۔ چھ سات میل کا فاصلہ ہے تری پورہ سے ایک میل ادھر ایک راستہ مغرب کی طرف نکلتا ہے۔ میری بیوی تمہیں بتا دے گی اس کا اشارہ پاتے ہی تم دوسری عورتوں سے پیچھے رہ جانا۔ وہاں تمہیں دو لڑکے ملیں گے ان کے نام انیس اور رحمان ہیں۔ دونوں حافظ قرآن اور میرے شاگرد ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے وہاں پہنچنے تک ایک خچر کا انتظام کر لیں گے۔ وہ اس علاقے کی ساری اونچ نیچ جانتے ہیں۔ رات رات میں وہ

تمہیں اس سڑک تک پہنچا دیں گے جو پل کی طرف جاتی ہے۔ صبح نو دس بجے وہاں سے پہلی بس گزرتی ہے' تم باآسانی اس پر سوار ہو سکو گی.........."

مولوی صاحب نے مجھے سب کچھ سمجھا بجھا کر اور کچھ نقد دے کر اپنی عورتوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ عورتیں ایک دوسرے گھر میں پہنچیں۔ یہاں دس پندرہ مزید برقعہ پوش عورتیں تیار بیٹھیں تھیں۔ کچھ دیر بعد عورتوں کا یہ قافلہ تین مسلح نوجوانوں کی معیت میں تری پورہ کے مزار کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ایک دو عورتوں نے مولوی صاحب کی بیٹی سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ اس مہربان عورت نے انہیں تسلی بخش جواب دے کر میرے سر سے خطرہ ٹال دیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ ایک نیک گھرانے کی نیک خاتون کو میری خاطر جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے۔

عصر کے کچھ دیر بعد ہم تری پورہ کی طرف تین چار میل کا فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا مگر پھر اچانک سارا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ اچانک عقب میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ دوسری عورتوں کے ساتھ ساتھ میں نے گھوم کر دیکھا سات آٹھ گھڑ سوار تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان میں چادر پوش توخی خانم کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس قافلے کے پیچھے توخی خانم کے آنے کا کیا کام تھا۔ توخی خانم کے ساتھ اس کا جیٹھ اور بستی کا ملک لندو خاں بھی تھا۔ لندو خاں کا چہرہ دور ہی سے بتا رہا تھا کہ وہ غصے سے بھرا ہوا ہے۔ ایک ساعت کے اندر اندر آنے والی مشکل کا سارا نقشہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اور عورتوں سے علیحدہ ہو کر تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مولوی صاحب کی بیوی یا بیٹی کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ مجھے دور سے لندو خاں کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے گھڑ سواروں کو پکار کر کہہ رہا تھا۔ "روکو ان کو.......... سب کو روکو.........." اس کا اشارہ قافلے کی عورتوں کی طرف تھا۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بستی میں میری غیر موجودگی کا پتہ چل چکا ہے۔ میں نے ٹوپی والا برقعہ اتار کر بغل میں لیا اور تیزی سے نشیب کی طرف بڑھنے لگی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں بس یہی خیال تھا کہ اس مقام سے دور چلی جاؤں۔

قریباً دو فرلانگ تک میں اسی طرح بھاگتی چلی گئی۔ پھر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ جس جگہ

میں بیٹھی وہاں قریب ایک کھوہ تھی۔ کھوہ کے دہانے پر پالک کے پتوں جیسی سبزی سی اگی ہوئی تھی۔ ان پتوں کو پھلانگ کر میں نے کھوہ میں جھانکا۔ یہ چھپنے کے لئے ایک نہایت موزوں جگہ تھی۔ لگ رہا تھا جیسے دست قدرت نے یہ پہاڑی اور یہ کھوہ خاص طور پر آج ہی کے دن کے لئے بنا رکھی تھیں۔ اس کی بناوٹ میں اندر چھپنے والے کی ہر سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔ نہ صرف وہ ہموار تھی بلکہ اس کا دہانہ بھی ایسے رخ پر تھا کہ نشیب سے بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ایسی جگہوں پر کیڑے مکوڑوں کا ڈر رہتا ہے لیکن کھوہ سے باہر بھی تو "زہریلے سانپ" پھنکار رہے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھوہ کے اندر چلی آئی اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔

چند ہی منٹ بعد مجھے نشیب میں زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس ویرانے میں توخی خانم' لندو خاں اور ان کے کارندوں کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ بلند آواز میں چیخ رہے تھے اور ایک دوسرے کو میری تلاش کے سلسلے میں ہدایات دے رہے تھے۔ نیم تیرگی میں اب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کھوہ کافی کشادہ ہے۔ قریباً ایک درمیانے سائز کے کمرے جتنی اور اس میں پہلے سے کوئی شخص موجود ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' ایک طرف بجھے ہوئے کوئلے اور راکھ پڑی تھی دوسری طرف ایک بوسیدہ کمبل ڈھیر تھا۔ کمبل کے ساتھ ہی پلاسٹک کی ایک بوتل رکھی تھی جس میں پانی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی چند منٹ پہلے کوئی اس کھوہ میں موجود تھا۔ میں دس منٹ تک یونہی گم صم بیٹھی رہی پھر مجھے دہانے کی طرف قدموں کی آواز آنے لگی۔ اب معلوم نہیں یہ کس کے قدموں کی آواز تھی۔ توخی خانم اور لندو خان کا کوئی کارندہ تھا یا اس کھوہ کا مکین واپس آ رہا تھا۔ کھوہ میں رہنا جتنا خطرناک تھا' کھوہ سے نکلنا اس سے زیادہ خطرناک تھا۔

میں اسی شش و پنج میں تھی کہ کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکا اور میرے بالکل پاس بیٹھ کر راکھ کے ڈھیر پر لکڑیاں جمانے لگا۔

غالباً وہ اس پناہ گاہ سے لکڑیاں ڈھونڈنے ہی نکلا تھا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر پہلے تو مجھے

شبہ ہوا کہ ایک بار پھر بخشو سولنگی سے ملاقات ہو گئی ہے لیکن نہیں وہ سندھی ڈاکو بخشو سولنگی نہیں تھا۔ ہاں اس کی طرح بھری بھری ڈاڑھی اور چوڑے شانوں والا کرخت چہرہ شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بہت موٹے تلے والے سینڈل تھے۔ کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے آگ روشن کر لی اور یہی وقت تھا جب اس کی نظر پہلی بار مجھ پر پڑی۔ چند لمحوں کے لئے وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ کا عکس تھا۔ اس ماحول میں وہ مجھے بڑا پراسرار سا لگا۔ بالکل کہانیوں کے کرداروں جیسا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے چونکنے انداز میں پوچھا۔ اس کا ہاتھ خود بخود کندھے سے لٹکی رائفل تک پہنچ گیا تھا۔ پھر جیسے میرے جواب دینے سے پہلے ہی ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً وہ پہاڑی سے نیچے گھڑ سواروں کو میری تلاش میں ادھر ادھر گھومتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور پھنکار کر بولا۔

"کون ہو تم؟ کیا چوری کر کے آئی ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں چھپی ہوئی ہو یہاں؟"

"وہ لوگ مجھے اغوا کر کے یہاں لائے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"پاؤندہ بستی والے۔"

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ اجنبی اور میں صاف شستہ اردو میں بات کر رہے ہیں۔ وہ شکل و صورت سے بھی پنجاب ہی کا باشندہ لگتا تھا۔ اس کے دو دانت دائیں جانب سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بات کرتے ہوئے یہ خلا صاف نظر آتا تھا۔ عمر کوئی پینتیس سال رہی ہو گی۔ وہ لہجے سے مجھے سیالکوٹ کے علاقے کا لگا۔ جتنی حیرت وہ مجھے دیکھ کر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے جو قانون سے بھاگ کر اس علاقے میں چھپا ہوا ہے۔ علاقہ غیر میں کسی ایسے چہرے کا نظر آ جانا بڑی بات نہیں تھی۔ اسے ایک سنگین اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ پاؤندہ بستی والوں سے بھاگ کر میں نے جس "محفوظ" پناہ گاہ میں پناہ لی تھی وہاں پہلے سے ایک شخص پناہ لئے ہوئے تھا'

اور اس جرائم پیشہ شخص سے اس تنہا مقام پر کسی بہتری کی توقع رکھنا عبث تھا۔ لیکن مسئلہ پھر وہی تھا اگر اندر سانپ تھا تو باہر بھی زہریلے حشرات تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ تونخی خانم اور عمر شاہ لندو اتنی جلدی میرا پیچھا چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ وہ ابھی یقیناً اسی علاقے میں موجود تھے۔

.... ہم زبان اور ہم لہجہ ہونے کے ناطے میرے اور اجنبی کے درمیان ایک بے نام سا تعلق پیدا ہو گیا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس پناہ گاہ میں کچھ وقت گزار سکوں گی۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں پنجاب میں کہاں کی رہنے والی ہوں۔ میں نے لاہور کا بتایا تو جیسے اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے گلی محلہ پوچھا۔ میں نے اچھرہ کا ایک فرضی پتہ بتا دیا۔ اس نے دریافت کیا کہ میں یہاں کیسے پہنچی ہوں۔ اس صورت حال کے لئے میں نے ایک مختصر سی کہانی پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔ یہ ایک ویسی ہی کہانی تھی جیسی اغواء کے حوالے سے ہر روز اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ وہ اس کہانی سے قدرے متاثر نظر آنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کی انگارہ آنکھوں میں شک کی چنگاریاں بجھ سی گئی ہیں۔

ہماری گفتگو کے دوران نشیب میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ یہ آوازیں میرے رگ و پے میں سردی کی لہر دوڑا رہی تھیں۔ یہ وہی کتے تھے جو میں نے تھوڑی دیر پہلے خانہ بدوش گھڑ سواروں کے ساتھ دیکھے تھے۔ اجنبی کی آواز نے مجھے چونکا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا نام ضامن علی ہے۔ کامونکی کا زمیندار ہوں۔ چچیرے بھائیوں سے پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔ دونوں طرف سے کئی آدمی مارے جا چکے ہیں۔ دشمنی کی اس آگ سے نکل کر یہاں آ گیا ہوں۔ پارہ چنار میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول رکھا ہے ہوٹل کے اوپر ہی رہائش ہے جہاں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ کل رات تری پورہ میں اپنے ایک واقف کار سے مل کر آ رہا تھا کہ تیز بارش شروع ہو گئی۔ مجبوراً اس جگہ رکنا پڑا۔ چند فرلانگ آگے ایک برساتی نالہ ہے۔ بارش کے بعد اس کا پانی بہت چڑھ گیا ہے۔ کل صبح تک پانی کا زور ٹوٹ جائے گا تو چلا جاؤں گا۔"

ضامن علی نے مجھے اپنی باتوں سے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کی

باتوں میں وزن بھی تھا لیکن اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس پر یقین نہ کر سکی۔ میرا خیال یہی تھا کہ جس طرح میں نے اسے ایک کہانی سنائی ہے۔ جواباً اس نے بھی ایک کہانی سنا دی ہے۔ ضامن علی نے مجھے مشورہ دیا کہ کم از کم آج رات مجھے یہاں سے نہیں نکلنا چاہئے۔ اس کی بات ماننے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میری نیم رضامندی دیکھ کر اس نے کھوہ کے ایک حصے سے کنکر وغیرہ ہٹا کر میرے لئے جگہ صاف کر دی اور بولا۔

"تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔ میں آج سارا دن سوتا رہا ہوں۔ اس لئے نیند نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "نیند تو مجھے بھی نہیں آئی" ضامن علی کے پاس سے اٹھ کر میں کھوہ کے دھانے کے پاس جا بیٹھی۔ یہاں سے تاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا اور کھوہ کے اندر جلتی آگ اور اس آگ میں دمکتا ہوا ضامن کا چہرہ بھی۔ کھوہ کی نیم گرم فضا کے مقابلے میں یہاں سردی تھی لیکن میں اس جگہ خود کو زیادہ آزاد اور با آرام محسوس کر رہی تھی۔ دور نیچے گھڑ سواروں اور کتوں کی چیخ و پکار سرد اندھیرے کے سمندر میں دم توڑ چکی تھی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر تو وہ موجود نہیں تھے۔ گرد و پیش پر چھائے ہوئے گہرے سکوت کو محسوس کر کے میرا خوف مسلسل کم ہو رہا تھا۔ پتھر سے ٹیک لگا کر میں گم صم بیٹھ گئی۔ ضامن آگ کے قریب نیم دراز ہو چکا تھا۔ میرے پاس وہ نقدی موجود تھی جو بوقت رخصت مجھے مولوی عصمت اللہ نے دی تھی۔ یہ تقریباً تین سو روپے تھے۔ میں نے سوچا مجھے یہ پیسے کہیں محفوظ کر دینے چاہئیں۔ بیٹھے بیٹھے میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ سنگلاخ دیواروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں جس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی ہوں اس کا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہل رہا ہے۔ میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ ایک تکونا سا پتھر کسی رخنے میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے پتھر کو باہر کھینچا تو ایک قدرتی طاق سا نظر آیا۔ یہ جگہ کچھ زیادہ محفوظ تو نہیں تھی لیکن نہ ہونے سے بہتر تھی۔ میں نے روپے اس سوراخ نما طاق میں رکھنے کے بعد پتھر دوبارہ اس کے منہ پر لگا دیا۔

وہ ساری رات میں نے اسی طرح بیٹھے ہوئے گزار دی۔ دو تہائی شب تک تو آنکھ بھی نہیں جھپکی لیکن آخری پہر کبھی کبھی اونگھ آتی رہی۔ اس نیم غنودگی میں عشرت، سلیم،

خان رحیمی اور دینو کے چہرے بار بار تصور میں ابھرے۔ میں نے عشرت کو دیکھا جو بستر مرگ پر اپنی بیماری سے دیوانہ وار جنگ کر رہی تھی۔ سلیم نظر آیا جو بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ مجھے ڈھونڈ رہا تھا اور میرا نام پکار رہا تھا۔ خان رحیمی، نواز حسنی اور دینو سب اپنے اپنے انداز میں مجھ سے ہمکلام ہوئے اور مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کہاں ہوں؟ مجھے کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ مجھے پرندوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ نظر آیا۔ جو سینکڑوں سنہری شاہین اور عقاب تھے وہ آسمان پر ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں چکرا رہے تھے۔ یہ دائرہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا تھا اور پرندوں کے خوبصورت پر سرما کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایک عجیب وضع کے درخت تلے مجھے اپنا ننھا فرحان بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ محویت سے پرندوں کی اڑان دیکھ رہا تھا۔ اس کے نرم ہونٹوں پر تبسم اور ننھی منی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا.......... حیرت جو بچے کی آنکھوں کا سب سے حسین عنصر ہوتی ہے۔ اچانک پرندوں کے جھنڈ سے وہاب چنگیزی کا شیطانی چہرہ نمودار ہوا۔ فرحان چیخ مار کر زمین میں سما گیا اور پرندے چلاتے ہوئے مختلف اطراف میں اڑ گئے۔

"اٹھو.......... اٹھو" کوئی میرا شانہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا ضامن علی یا جو بھی اس کا نام تھا کندھے سے بندوق لٹکائے کھڑا تھا۔ میرے کانوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ گونجی۔ طویل رات کٹ چکی تھی۔ کھوہ کے دہانے سے لے کر دور نیچے سرسبز پودوں تک اجالے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن روشنی کی ہراول کرنیں نشیب و فراز کو منور کر رہی تھیں۔

ضامن علی بولا "تم ابھی اندر ٹھہرو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر راستہ صاف ہوا تو ابھی نکل چلیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی چلی جانا۔ یہاں سے تو نکلو۔" وہ قدرے جھلاہٹ سے بولا اور لمبے ڈگ بھرتا نشیب کی طرف چلا گیا۔ میں کھوہ میں آ گئی۔ آگ دیر ہوئی سرد ہو چکی تھی۔ میں آگ جلانے کا سوچ رہی تھی جب اچانک مجھے وہ رقم یاد آئی جو رات میں نے طاق میں چھپائی تھی۔ ضامن کے لوٹنے سے پہلے مجھے وہ روپے نکال لینے چاہئے تھے۔ میں اس تکونے پتھر

کے پاس پہنچی اور احتیاط سے اسے باہر کھینچ لیا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو روپے موجود تھے۔ میں نے نکال کر لباس میں رکھ لئے۔ احتیاطاً جھک کر ایک بار پھر طاق میں دیکھا تو کچھ اور کاغذ نظر آئے............ یہ میں نے تو ہرگز نہیں رکھے تھے۔ دوبارہ ہاتھ ڈال کر میں نے یہ کاغذ نکالے۔ ایک شناختی کارڈ تھا ایک چھوٹی سی کاپی تھی' ایک لائسنس تھا۔ میں نے یہ کاغذات دیکھے اور جان کر حیران رہ گئی کہ ضامن علی وہ نہیں جو میں اسے سمجھ رہی ہوں اور نہ ہی وہ ہے جو وہ خود کو بتا رہا ہے۔ اس کی اصلی حقیقت ان کاغذات سے آشکار ہو رہی تھی۔
اس طاق نما جگہ کو محفوظ جان کر اس نے یہ کاغذات یہاں رکھے تھے اور اپنے روپے رکھنے کے لئے میری نگاہ انتخاب بھی اس طاق پر پڑی تھی۔ بالکل جیسے اس کھوہ کے سلسلے میں ہوا تھا......... ان کاغذات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جسے میں مفرور مجرم سمجھ رہی ہوں وہ ایک پولیس انسپکٹر ہے جو ایک مفرور کے بھیس میں یہاں کسی شخص کی تلاش میں آیا ہے۔
میں سر تاپا لرز گئی۔ اب میرا یہاں ایک لمحہ بھی رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے کاغذات جلدی جلدی طاق میں واپس رکھے' پتھر کو اس کی جگہ ٹکا کر واپس مڑی تو ضامن علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھوہ کی طرف آ رہا تھا۔ میں بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔
ضامن علی کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اچھی طرح دیکھ آیا ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ نالے کا پانی بھی اترا ہوا ہے۔ ہم با آسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔

میں نے پوچھا "یہاں نزدیک کوئی پولیس اسٹیشن ہے؟"

وہ بولا۔ "پولیس اسٹیشن تو ہے لیکن نزدیک نہیں۔ قریب ترین اسٹیشن ٹل پور کا ہے۔ جس کا فاصلہ کم و بیش تیس میل ہے۔"

میں نے چہرے سے مایوسی ظاہر کی لیکن دل میں مطمئن ہو گئی۔ وہ بولا "اور میرے خیال میں تمہارا براہ راست پولیس تک جانا ٹھیک بھی نہیں۔ بہتر ہے کہ تم پہلے اپنے وارثوں سے رابطہ قائم کر لو۔"

میں نے اس رائے پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھوہ سے نکل کر ہم نشیب میں پہنچے اور ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے برساتی نالے کے کنارے آ گئے پانی اتر چکا تھا۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں چل کر ہم نے نالہ پار کیا اور شمال مغرب کے رخ پر آگے بڑھنے لگے۔ ضامن علی ان پیچ دار راستوں کا شناور تھا۔ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جن

پر کسی سے مڈبھیڑ ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند میل آگے آ کر اس نے ایک واقف کار زمیندار کے ڈیرے سے دو خچر حاصل کئے۔ اب ہمارا سفر سہل اور تیز ہو گیا۔
اس رات نو دس بجے کے لگ بھگ ہم پارہ چنار کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک قابل زراعت علاقہ تھا۔ ایک اہرام نما پہاڑی کے دامن میں دو چھوٹی چھوٹی بستیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں ہماری مڈبھیڑ پانچ مسلح افراد سے ہوئی۔ پہلے تو میں ڈر گئی لیکن پھر پتہ چلا کہ یہ لوگ ضامن علی کو جانتے ہیں۔ انہوں نے ضامن علی سے میرے بارے میں چند سوال کئے اور آگے بڑھ گئے۔ ضامن نے بتایا کہ یہ پہریدار تھے۔ یہاں لوگ اس طرح گروہوں کی شکل میں رات کا پہرہ دیتے ہیں۔ بستی کی حدود کے پاس ایک اونچے مینار نما مورچے میں ایک پہریدار نظر آیا۔ اس نے اچھی طرح شناخت کرنے کے بعد ہمیں آگے جانے دیا۔

تھکاوٹ اور سردی سے برا حال تھا۔ جب ضامن علی نے خچر ایک بڑے دروازے کے سامنے روکا تو مجھے امید پیدا ہوئی کہ اب اس جان لیوا سفر سے جان چھوٹ جائے گی۔
میرا اندازہ درست نکلا۔ ہمارا یہ سفر اختتام پذیر ہو چکا تھا.......... اس پھاٹک کے پیچھے ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ کم از کم تین ایکڑ زمین تھی احاطے کے ایک کونے میں درمیانے سائز کا ایک مکان تھا۔ پھاٹک پر موجود مسلح چوکیدار ہمیں اس مکان تک لے گیا۔ یہاں ہمارا استقبال چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے ایک فربہ اندام پٹھان نے کیا۔ اس کا نام مان شاہ تھا۔
مان شاہ کی آنکھ میں پھولا تھا۔ دیکھنے میں وہ شخص بھدا لگتا تھا لیکن بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی "بہن جی.......... بہن جی" کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔
یہاں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ ضامن علی کا اصل ٹھکانہ یہی ہے۔ یہاں ایک کمرے میں اس کا بستر' اٹیچی کیس اور دیگر سامان بھی رکھا تھا۔ ضامن علی اور مان شاہ کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی اور مان شاہ مجھے لے کر مکان کے زنان خانے میں آ گیا۔ یہاں چند عورتیں اور بچے موجود تھے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ایک نوجوان عورت جو مان شاہ کی چھوٹی بیوی تھی مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ ان لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ میں پنجابی ہوں اور پشتو زبان نہیں جانتی۔ گھر کی عورتیں بس اتنا ہی جانتی تھیں کہ میں ضامن علی کے ساتھ آئی ہوں۔ ضامن علی ان کے نزدیک کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اس حوالے

سے میں بھی ان کے نزدیک مشکوک تھی۔ ایک بوڑھی عورت کا خیال تھا کہ میں اغوا ہو کر یہاں نہیں پہنچی بلکہ ضامن علی سے میرا پرانا ناطہ ہے۔ مجھے یہ سب باتیں خاموشی سے برداشت کرنا تھیں' اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ کھانا کھلانے کے بعد میرے لئے ایک کمرے میں بستر بچھا دیا گیا۔ میں تھکے ہوئے ذہن اور چور چور جسم کے ساتھ لیٹ گئی۔ آتش دان کی آگ کمرے کو نرم حرارت سے بھر رہی تھی اور توقع تھی کہ اجنبی مقام کے باوجود مجھے جلد ہی نیند آجائے گی لیکن پھر کہیں پاس سے آنے والی آوازوں نے مجھے جاگتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آوازیں گھر کی عورتوں کی تھیں۔ وہ کسی ساتھ والے کمرے میں بیٹھی تیز تیز لہجوں میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ ان کی گفتگو کا ایک موضوع تو میں تھی۔ دوسرا موضوع کچھ پراسرار اور چونکا دینے والے واقعات تھے۔ وہ علاقے میں ہونے والی قتل کی وارداتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ وارداتوں کا یہ سلسلہ پچھلے پانچ چھ ماہ سے جاری تھا۔ تمام افراد کو رات سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ بیشتر افراد کی پیشانی پر گولی ماری گئی تھی۔ طریقہ واردات سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ قتل ایک ہی گروہ یا شخص نے کئے ہیں۔ مان شاہ کے گھر کی عورتیں ان وارداتوں کا سلسلہ کسی اللہ والے کے مزار کی بے حرمتی سے جوڑ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قتل کسی انسانی ہاتھ سے نہیں ہوئے۔ ان کے لہجوں میں خوف تھا اور وہ گفتگو کے دوران بار بار اللہ توبہ کرنے لگتی تھیں۔ عورتوں کی گفتگو سے پتہ چلا کہ اس سلسلے کی آخری واردات (اگر یہ واقعی سلسلہ تھا) صرف تین روز قبل اسی بستی کے شمال میں ہوئی ہے' جہاں رحیم نامی ایک شخص کو پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا ہے۔ ایک ماہ پہلے رحیم کا ایک قریبی دوست بھی اسی طرح قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں دم توڑ چکا تھا۔ اس قتل نے رحیم کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا اور وہ سخت خوفزدہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آبائی مکان بیچ کر اس علاقے سے کہیں اور جانے کا سوچ رہا تھا۔ مکان کا سودا بھی ہو چکا تھا اور چند روز تک اسے رقم ملنے والی تھی۔ پرسوں رات وہ گھر میں اکیلا تھا۔ اس کی بیوی تین بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ رحیم کو تنہا رات گزارتے ہوئے خوف آرہا تھا۔ اس نے اپنے ہمسائے سے کہا کہ آج رات وہ اس کے گھر سو رہے۔ ہمسایہ آمادہ ہو گیا۔ وہ دونوں رات ایک ہی کمرے میں سوئے رہے۔ ہمسایہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔

علی الصبح وہ اٹھ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔ اجالا پھیلنے پر وہ واپس آیا تو رحیم اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا۔ اس بستی میں یہ دوسرا اور علاقے میں ساتواں قتل تھا۔ لوگ بے حد خوفزدہ نظر آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مقامی پولیس کاغذی کارروائی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہی۔ مجھے وہ پہریدار یاد آئے جو کل رات بستی میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دیکھے تھے۔ دراصل وہ لوگ حفاظت خود اختیاری کے تحت پہرے پر تھے۔ بے یقینی کی یہ فضا پوری بستی میں چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ ساری رات بھی میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ اگلی صبح ناشتے وغیرہ کے بعد مان شاہ مجھے زنان خانے سے مردانے میں لے گیا۔ یہاں ایک علیحدہ کمرے میں ضامن علی بھی موجود تھا۔ ضامن علی......... نے مجھ سے پوچھا کہ اب میں کیا چاہتی ہوں؟ وہ بولا۔

"اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ لاہور سے اپنے کسی وارث کو یہاں بلا لو تاکہ ساری صورت حال کا علم ہو جائے اور تمہارے لئے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔"

میں نے کہا "میں لاہور جانا چاہتی ہوں اور نہ کسی عزیز کو یہاں بلانا چاہتی ہوں۔"

ضامن اور مان شاہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جواب یونہی نہیں دے دیا تھا۔ رات میں نے اس بارے میں بے حد سوچ بچار کی تھی اور ایک آخری فیصلے پر پہنچ گئی تھی یہ وہی فیصلہ تھا جس نے آج تک مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا اور جس کے لئے میں نے ان گنت راتیں ذہنی کرب میں تڑپتے گزار دی تھیں۔ قدرت نے یہ فیصلہ میرے لئے خود بخود آسان کر دیا تھا۔ سلیم پر جو آفت ٹوٹنا تھی وہ ایک بار ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مجھے کھو چکا تھا۔ اس کے خواب بکھر چکے تھے۔ وہ سب کچھ ہو چکا تھا جو میرے "فیصلے" کے بعد ہونا تھا......... اب دانشمندی یہی تھی کہ میں اسے دوبارہ اس اذیت سے گزارنے کا سامان نہ کروں۔ اس نے جتنا رونا ہے ایک ہی بار رو لے۔ میری ذات کو جتنا کوسنا ہے ایک ہی بار کوس لے۔ ایک ہی بار دیوانہ ہو کر مجھے تلاش کر لے اور ایک ہی بار صبر و برداشت کے پتھر دل پر رکھ کر بیٹھ جائے۔ میں اب سلیم کی خاطر اس کی محترم والدہ کی خاطر اپنی ذات کو اور فریب نہیں دے سکتی تھی۔ جھوٹی محبت اور خود سپردگی کا کھیل اور نہیں کھیل سکتی تھی......... آہ کیسے عذاب ناک لمحے ہوتے تھے وہ جب رات کی تنہائی میں میرے اور

سلیم کے درمیان تاریک ریشم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ خاموشی نغمہ بن کر اس خوبصورت مکان کی دیواروں میں گونجتی تھی اور آتشدان کی حرارت فضا کو زندگی سے معمور کردیتی تھی۔ ایک ننھی سی آواز میرے کانوں میں ٹکراتی تھی۔

"امی دان! میں اکیلا ہوں۔ میری قبر تاریک اور ٹھنڈی ہے۔ میں سخت زمین پر پڑا ہوں۔ مجھے بھول گئی ہو امی دان.......... اپنے فرحان کو بھول گئی ہو نا؟"

میں لرز کر رہ جاتی تھی۔ گداز بچھونا اور نرم حرارت میرے لئے دنیا کی سب سے قابل نفرت چیزیں بن جاتی تھیں۔ میں خود کو ملامت کرتی تھی اور دل ہی دل میں آنسوؤں کے آبشار گراتی تھی.......... اب کسی بہانے سے ہی سہی میرے جسم کے گرد سلیم کی ازدواجی محبت کا پنجرہ ٹوٹ گیا تھا۔ اب میں دوبارہ اس پنجرے میں جانا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے کھوہ کی "پناہ گیری" کے دوران ضامن علی کو جو کہانی سنائی تھی اس میں بتایا تھا کہ ایک بھائی کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی قریبی عزیز نہیں اور شاید وہ بھی بہ احسن طریق میری حفاظت نہ کر سکے۔ (اور ایک طرح یہ بات درست تھی) لہٰذا جب مان شاہ اور ضامن علی کے سامنے میں نے یہ کہا کہ میں نہ لاہور جانا چاہتی ہوں اور نہ ہی کسی کو یہاں بلانا چاہتی ہوں تو ضامن علی کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

مان شاہ نے کہا "لیکن بیٹی، ہم تمہیں اپنے پاس کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"میں خود بھی آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ ایک دو ہفتوں میں میں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔"

مان شاہ بولا "ایک دو ہفتوں کی تو کوئی بات نہیں بیٹی.......... تم ایک دو ماہ بھی رہ سکتی ہو۔ لیکن بالآخر تمہیں کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہوگا۔"

.... اس بات چیت کے بعد میں نے وہیں مان شاہ کے گھر میں دو ہفتے گزار دیئے۔ وقتاً فوقتاً ضامن علی بھی نظر آجاتا تھا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ یعنی پارہ چنار میں اس کا کوئی ہوٹل تھا اور نہ بیوی بچے۔ وہ مفرور مجرم کے بھیس میں یہاں آیا تھا اور مان شاہ کے پاس رہ رہا تھا۔ اس کے پولیس انسپکٹر ہونے میں

مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں تھا۔ اس کی مصروفیات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر ہے اور کسی چکر میں یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ (گمان غالب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں میرے سوا اور کسی کو معلوم نہیں)

ایک رات جب مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی اچانک چھت پر دھم دھم کی آواز آئی۔ میں نے صحن میں نکل کر دیکھا ایک سایہ منڈیر کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا مردانے کی چھت پر کود گیا۔ وہ مقامی لباس یعنی شلوار کرتے میں نہیں تھا اور اس علاقے میں پتلون قمیض میں نے ضامن کے علاوہ کسی کے جسم پر نہیں دیکھی تھی۔ وہ یقیناً ضامن علی ہی تھا.......... اگلے دس پندرہ روز کے اندر چھوٹے چھوٹے کئی واقعات کے سبب میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ضامن علی کی یہاں موجودگی کی اصل وجہ وہی خوف و ہراس ہے جو علاقے کے لوگوں میں پھیلا ہوا ہے اور جس کا سلسلہ پر تشویش وارداتوں سے جوڑا جا رہا ہے۔

وہ ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ میں کنبے کی دوسری عورتوں کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھی گندم صاف کر رہی تھی۔ ہاتھ کام میں مصروف تھے اور ذہن سوچوں میں گم۔ مجھے یہاں آئے ہوئے اب تقریباً ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ میں جانتی تھی اس عرصے میں سلیم میرے لئے بہت بھاگ دوڑ کر چکا ہوگا۔ اس نے ہر وہ کوشش کر دیکھی ہوگی جو وہ کر سکتا تھا.......... اور اب وقت تھا کہ میں اپنی پناہ گاہ سے نکلوں اور اپنی تمام حسرتوں اور آرزوؤں کو سمیٹ کر جھنگ کے اس گاؤں میں پہنچ جاؤں جہاں مجھے اپنے بچے کے لئے انصاف مل سکتا تھا۔ جہاں وہاب کی منحوس گردن اس تیز دھار آلے کی زد میں آسکتی تھی جسے میں اب تک سنبھال سنبھال کر اپنے پاس رکھ رہی تھی۔ اس آلے کی دھار میرے پاس وہاب کی امانت تھی اور میں یہ امانت جلد از جلد اس کی منحوس شہ رگ کو لوٹا دینا چاہتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی جب میرے ساتھ کام کرتی ہوئی ایک نوکرانی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں یہ خبر سنائی کہ رات پستول صاف کرتے ہوئے مالک کے کندھے پر گولی لگ گئی ہے۔ مالک سے اس کی مراد مان شاہ تھا۔ یہ خبر سن کر مجھے حیرت ہوئی میرے پوچھنے پر نوکرانی نے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم آیا تھا۔ گولی بھی خود

نکل گئی تھی۔ اب مالک شہر ٹیکہ لگوانے گئے ہوئے ہیں.......... ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ ساری عورتیں کام چھوڑ کر اندر بھاگیں۔ کمرے میں مان شاہ کی چھوٹی بیوی زارو قطار رو رہی تھی اور پاس ہی ایک ادھیڑ عمر ملازم خاموش کھڑا تھا۔ وہ خود بھی سخت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ عورتوں نے مان شاہ کی چھوٹی بیوی کو گھیر لیا۔ کوئی اسے چپ کرانے لگی کوئی رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ وہ مسلسل دہائی دیئے جا رہی تھی اور ہاتھ مل مل کر کہہ رہی تھی۔ "خدایا اب کیا بنے گا' یا اللہ اب کیا ہوگا۔"

اس کمرے میں مان شاہ کی چھوٹی بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے انکشاف ہوا کہ رات مان شاہ کو گولی لگی نہیں بلکہ ماری گئی ہے.......... عورتوں سے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی گئی تھی اور اس سے بھی تشویشناک اطلاع یہ تھی کہ قاتلانہ حملہ اسی انداز میں ہوا تھا جس انداز میں اس سے پہلے سات آٹھ وارداتیں ہو چکی تھیں۔ قاتل حسب سابق ایک ہی تھا۔ اس نے 38 بور کے ریوالور سے مان شاہ پر گولی چلائی تھی۔ لیکن مان شاہ جاگ رہا تھا اس نے خود کو بچا لیا اور قاتل پر جھپٹا۔ قاتل نے اسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور کھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ موقع سے پاؤں کے جو نشان ملے تھے وہ کھوجی کے بیان کے مطابق وہی تھے جو اس سے پہلی وارداتوں میں دیکھے گئے تھے۔ یہ ایک ماہر کھوجی تھا اور علاقے میں اس کی بات پر بہت اعتبار کیا جاتا تھا۔ مان شاہ کی چھوٹی بیوی کو واردات کے بارے میں یہ ساری باتیں اس ملازم نے بتائی تھیں جو اب روتی پیٹتی عورتوں کے پاس خاموش کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد مان شاہ قصبے سے مرہم پٹی کرا کے واپس آگیا۔ ضامن علی کے علاوہ دو مسلح محافظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ مان شاہ کا سرخ و سپید چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ نامعلوم سفاک قاتل کے نشانے پر آجانا معمولی بات نہیں تھی۔ انسان ظاہری خطرے کا سامنا تو ہمت سے کرتا ہے لیکن اندھیرے کا تیر ہر کسی کو خوفزدہ کر دیتا ہے.......... جب ساری عورتیں مان شاہ کے گرد جمع تھیں اور اپنی اپنی ہراساں آوازوں میں واویلا کر رہی تھیں مان شاہ کی والدہ جس کی عمر پچاسی نوے کے لگ بھگ تھی صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ اسے زمین سے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا گیا۔ اس کی سانس

بڑی مشکل سے آ جا رہی تھی۔ سب کو فکر لاحق ہوئی کہ اماں جی کا چل چلاؤ ہو گیا ہے۔ اسی وقت بستی کے حکیم کو بلایا گیا۔ وہ چند الٹی سیدھی دوائیں دے کر چلا گیا۔ ان دواؤں سے بوڑھی عورت کی حالت اور بگڑ گئی۔ اس کے گلے کی خرخراہٹ سارے گھر میں گونجنے لگی۔ ماحول تو پہلے ہی خوفناک سا ہو رہا تھا اس نئی افتاد نے گھر کی سب عورتوں کو دہشت زدہ کر دیا اور انہوں نے وضو کر کے گھر کے کونے کھدروں میں مصلے بچھا لئے اور وظائف شروع کر دیئے۔ میں نے ایک عورت کو کہتے سنا وہ بڑے دعوے سے کہہ رہی تھی کہ بیمار کے گلے سے نکلنے والی ایسی آواز بھوت پریت کی نشانی ہوتی ہے' ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایک دوسری عورت نے تو مریضہ کے بستر کے گرد منڈلاتا ہوا ایک تاریک سایہ بھی دیکھ لیا۔ ان عورتوں کی توہم پرستی دیکھ کر میری حیرت گم ہو رہی تھی۔ سادہ لوحی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لگتا تھا یہ عورتیں ہر حد پار کر چکی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں بدروحیں گھس آئی ہیں اور اب کسی نہ کسی کی لاش لے کر جائیں گی۔ بوڑھی عورت جاں بلب تھی لیکن کوئی اس کے قریب نہیں آ رہا تھا۔ ضامن علی کے پاس کچھ ایلوپیتھک دوائیں تھیں اس نے بوڑھی عورت کو ایک اینٹی بائیوٹک دیا جس سے تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ یہ دیکھ کر مان شاہ نے ضامن علی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ رات زنان خانے میں اس کی ماں کے پاس رہے۔

آدھی رات کو ضامن علی نے اندرونی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں مان شاہ کی بیوہ بھاوج کے قریب چارپائی ڈالے سو رہی تھی' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ضامن علی نے باہر سے آواز دے کر بتایا کہ اماں جی کی طبیعت پھر بگڑ گئی ہے' گرم پانی کی ضرورت ہے۔ میں پانی گرم کرنے کے لئے باورچی خانے کی طرف چلی گئی بوڑھی عورت کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل کر پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی مگر گھر کا ماحول ایسا بن گیا تھا کہ خواہ مخواہ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر کی عورتوں کی حالت تو بہت بری تھی۔ اٹھ کر تیمارداری کرنا تو کجا' وہ اپنے لحافوں میں سے سر باہر نہیں نکال رہی تھیں۔ میں نے خود ہی پانی گرم کیا اور لے کر مریضہ کے کمرے میں پہنچی۔ ضامن علی نے پانی ربڑ کی بوتل میں ڈال کر عورت کے پہلو میں ٹکور شروع کی۔ ہم دونوں اہل خانہ کی سادہ لوحی اور بے حسی پر تبصرہ کرنے لگے۔ جیسے اہل خانہ کوئی بات چھپانے کے لئے ٹھیٹ

پشتو بولتے تھے ہم بھی رازداری کے خیال سے ٹھیٹ پنجابی بول رہے تھے۔

میں نے ضامن سے کہا "آخر یہ کیا چکر ہے۔ کیا واقعی یہ سارے قتل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں؟"

وہ پرسوچ لہجے میں بولا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم نہیں کہہ سکتے تو اور کون کہہ سکتا ہے۔"

بات میرے منہ سے نکل گئی تو اندازہ ہوا کہ نہیں نکلنی چاہئے تھی۔

"کیا مطلب.........؟" ضامن نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں......... میرا مطلب ہے تم اس علاقے کی ساری اونچ نیچ جانتے ہو۔"

"دیکھو تم بات بدل رہی ہو' میں اتنا بچہ نہیں ہوں۔"

"پتہ نہیں تمہارے دل میں کیا چور ہے۔ میں نے تو سیدھی بات کی تھی۔"

"سیدھی بات تم نے کی نہیں۔ تمہارے منہ سے نکل گئی ہے۔ میرا خیال ہے.........."

"کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر پراعتماد لہجے میں بولی "ہاں......... میں جان چکی ہوں۔ تم پولیس انسپکٹر ہو اور یہاں کسی کیس کی تفتیش کر رہے ہو۔"

اس نے منہ اوپر اٹھا کر ایک گہری اور طویل سانس لی۔ پھر نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھے میرے فرضی نام سے مخاطب کر کے بولا۔

"شاہدہ......... یہ بات صرف......... صرف تیرے اور میرے درمیان رہنی چاہئے۔"

"میری طرف سے بے فکر رہو انسپکٹر ضامن' میں جانتی ہوں تمہارے لئے رازداری ضروری ہے۔"

وہ کچھ دیر براہ راست میری طرف دیکھنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا "بہت شکریہ......... آئندہ ہم اس موضوع پر بالکل بات نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "ہاں آئندہ نہیں کریں گے لیکن اس وقت میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو!"

وہ بھاری آواز میں بولا۔

ہم دونوں بہت نیچے لہجے میں بات کر رہے تھے' بوڑھی عورت گہری نیند میں تھی۔

میں نے کہا "انسپکٹر ضامن! کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ تم قتل کی وارداتوں کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہو؟"

"ہاں......... تمہارا خیال درست ہے۔"

"کیا مان شاہ پر حملہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے؟"

انسپکٹر ضامن کی پیشانی پر سوچ کر گہری لکیریں پھیل گئیں۔ "شاید......... ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک دو شہادتیں اس خطرے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

"قاتل کا مقصد سامنے آیا؟"

"یہی تو پہیلی ہے۔ تیس چالیس میل کے علاقے میں وارداتیں ہوئی ہیں' آپس میں کوئی تعلق نہیں بنتا۔ کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی سلسلہ نہ ہو۔ عام طور پر لوگ سنسنی پھیلانے کے لئے مختلف واقعات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ بہرحال چند روز تک سب کچھ واضح ہو جائے گا۔"

"مجھے مان شاہ کی جان کی طرف سے بہت خطرہ ہے۔ کہیں.........."

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ شاید قاتل دوبارہ نہ آئے۔ ویسے بھی اب ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔"

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پتہ چلا کہ مان شاہ والدہ کو دیکھنے آ رہا ہے۔

میں اور ضامن علی خاموش ہو گئے۔

اگلے روز عشاء کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے مان شاہ کی والدہ نے وفات پائی اور اسی رات انہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کی قبر مکان کے پچھواڑے ایک باغ میں بنائی گئی۔ یہ باغ بھی اس وسیع احاطے کی طرح مان شاہ کی ملکیت تھا۔ مان شاہ کو اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی موت پر میں نے صرف مان شاہ کی آنکھوں میں ہی آنسو دیکھے۔ باقی آنکھوں میں تو شاید آنسوؤں کے لئے جگہ ہی نہیں تھی کیونکہ وہاں خوف و ہراس کوٹ

کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مرنے والے کا منہ عموماً کھلا رہ جاتا ہے۔ ماں شاہ کی والدہ کا بھی کھلا رہ گیا تھا۔ گھرانے کی عورتیں اسے بھی ایک برا شگون سمجھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مردے کا منہ کھلا ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے گھر میں کوئی اور حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ اہل خانہ کی بے حسی ملاحظہ فرمایئے کہ وفات کے صرف تین گھنٹے بعد متوفیہ کو نہلا دھلا کر قبر میں پہنچا دیا گیا۔ عزیز و اقارب کا عندیہ تو یہ تھا کہ مرحومہ کو بستی کے مضافاتی قبرستان میں دفن کیا جائے لیکن ماں شاہ کی ناراضگی کے خوف سے سب چپ رہے۔ ماں شاہ' والدہ کی وصیت کے مطابق انہیں اپنے ہی باغ میں والد کے پہلو میں دفن کرنا چاہتا تھا۔

کئی روز تک مرنے والی کے حلق سے نکلنے والی آواز اور اس کا کھلا ہوا منہ گھر کی عورتوں میں موضوع بحث بنا رہا۔ شاید ان عورتوں کو باتیں گھڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں تھا۔ ان کی چخ چخ سن کر مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ ایسے ایسے بیہودہ اور بے سروپا تبصرے کرتی تھیں کہ پاگل ہونے کو دل چاہتا تھا۔ ان کی باتوں سے ماحول عجیب آسیب زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ان دنوں مجھے احساس ہوا کہ گھر میں اگر کسی تشویش ناک موضوع کو مسلسل زیر بحث رکھا جائے تو بچوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ گھرانے کے بچے بڑی اماں کی پر اسرار موت کا احوال سن سن کر ہر وقت سہمے رہتے تھے۔

ایک دن ماں شاہ کی پہلی بیوی کی سات سالہ بچی بیٹھی بیٹھی بے ہوش ہو کر گر گئی۔ اس کا رنگ' ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ گھر میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا' بچی کے ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے ایک رومال تہہ کر کے اس کے جبڑوں کے درمیان رکھا کہ کہیں زبان نہ کٹ جائے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پر مساج کیا گیا میں نے اس کی بے حد تنگ قمیص قینچی سے کاٹ دی تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو۔ پانچ دس منٹ میں لڑکی ہوش میں آ گئی۔ اسے کچھ نہیں تھا وہ صرف خوفزدہ تھی۔ آسیب' اثر اور جادو ٹونے کی باتوں نے اس کے معصوم دل کو پتے کی طرح ہلکا کر رکھا تھا مگر گھر میں کوئی یہ بات سمجھنے والا نہیں تھا۔ فوراً پارہ چنار سے ایک پہنچے ہوئے عامل کو بلایا گیا جو کئی روز تک گھر کے کونوں کھدروں میں جھاڑ پھونک کرتا رہا' دھونیاں دیتا رہا' تعویذ دیتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حلوے مانڈے بھی کھاتا رہا۔

وہ ایک سرد شام تھی' دو روز سے مسلسل یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ یوں تو ہوا

وہاں ہر وقت ہی چلتی رہتی تھی لیکن دو روز سے زور کچھ زیادہ تھا۔ ماں شاہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر وہ مکان کے پچھواڑے والدہ کی قبر پر چلا جاتا تھا اور مغرب کے بعد واپس آتا تھا۔ اس دوران ملازمہ بختو اس کے لئے قہوہ بنا چھوڑتی تھی۔ قبر سے واپسی پر وہ زنان خانے میں آتا تھا اور قہوہ پی کر مردانے میں جاتا تھا۔ اس شام ملازمہ بختو بیمار پڑنے کی وجہ سے چھٹی کر گئی تھی' اس کی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے میں نے قہوہ بنایا اور ماں شاہ کا انتظار کرنے لگی۔ نماز کے بعد آدھ پون گھنٹہ گزر گیا لیکن ماں شاہ نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ ایسا ہو چکا تھا کہ ماں شاہ عشاء کے بعد تک قبر پر موجود رہا تھا۔ ایسی صورت میں بختو خود ہی قہوہ لے کر باغ میں چلی جاتی تھی۔ میں نے سوچا شاید آج یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے۔ اسی دوران ماں شاہ کی چھوٹی بیوی باورچی خانے میں آ گئی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے ہدایت کی کہ مالک نہیں آئے اور میں خود ہی قہوہ باغ میں پہنچا آؤں۔

میں نے موٹی اوڑھنی لی' قہوے کے برتن ٹرے میں رکھے اور زنان خانے سے نکل کر باغ کی طرف چل دی۔ اس وقت تک کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باغ میں دو تین جگہ آرائشی پول لگے ہوئے تھے۔ ان پر ٹیوب لائٹس تھیں اور ان لائٹس کی روشنی باغ کے محدود حصوں کو روشن کر رہی تھی۔ باغ کے بیرونی دروازے سے گزر کر میں نے دس پندرہ گز فاصلہ طے کیا تو خوبانی کے پیڑوں کے پیچھے وہ لائٹ نظر آئی جس کے نیچے دونوں قبریں تھیں اور نوافل وغیرہ پڑھنے کے لئے ایک سنگی چبوترا بنا ہوا تھا۔ میں تھوڑا سا اور آگے گئی تو ماں شاہ نظر آ گیا۔ وہ والدہ کی قبر پر جھکا ہوا تھا۔ اس قبر کو سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سیاہ اور سفید سنگریزوں سے پھول بوٹے بنے ہوئے تھے اور کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا.......... قبروں کی یہ آرائش یہاں کا رواج تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر قہوے کے برتن سنگی چبوترے پر رکھے۔ میرا خیال تھا کہ برتنوں کی آہٹ سن کر ماں شاہ قبر سے سر اٹھائے گا مگر وہ تو والدہ کی قبر پر بیٹھا بیٹھا خود بھی دار فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ برتن رکھ کر میں اس کی طرف گھومی۔ غور سے دیکھا تو قبر کے سفید سنگریزوں پر خون کے دھبے نظر آئے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے نتیجہ اخذ کیا اور اس کے ساتھ ہی دہشت کی ایک شدید لہر رگ و پے میں دوڑ گئی.......... مجھے

صرف مان شاہ کا ایک رخسار نظر آرہا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ مان شاہ اب اس دنیا میں نہیں۔ میں چند لمحے پتھر کی طرح ساکت کھڑی مان شاہ کی طرف دیکھتی رہی.......... پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ یوں لگا جیسے میں ابھی پورے زور سے چیخوں گی اور سرپٹ باغ کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگ نکلوں گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں' خوف جتنی سرعت سے مجھ پر طاری ہوا تھا اتنی ہی سرعت سے میں نے اس پر قابو پایا اور چند قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ دفعتاً میری نگاہ خون کے مزید دھبوں پر پڑی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں تراشیدہ گھاس پر یہ دھبے صاف نظر آرہے تھے ان میں چمک تھی اور تازگی بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے' ابھی ہوا ہے' چند لمحے یا ایک آدھ منٹ پیشتر۔ ممکن تھا مان شاہ کی آخری ہچکی کی بازگشت ابھی اسی فضا میں موجود ہو۔ میری نگاہوں نے خون کے دھبوں کا تعاقب کیا.......... چند گز آگے جا کر دھبے مدھم پڑ گئے تھے۔ سنگی چبوترے کے پاس ان کا سائز قریباً ایک ہتھیلی کے برابر تھا مگر خوبانی کے پودوں کے پاس پہنچ کر وہ دو انگل رہ گئے تھے۔
میں ان دھبوں کا رخ دیکھنے کے لئے چند قدم آگے بڑھی۔ خوبانی کے دو چھوٹے پودوں کے درمیان سے گزر کر میں ایک روش پر آئی۔ روش پر گھاس نہیں تھی اور دھبے نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔ یکایک میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے مجھے لگا جیسے قاتل ابھی اسی باغ میں ہے بلکہ کہیں میرے آس پاس ہی ہے۔ نہ جانے کیوں اس گھڑی میرے تصور میں مان شاہ کی مرحومہ ماں کا کھلا ہوا منہ آگیا اور میرے کانوں میں اس کے گلے کی عجیب و غریب خرخراہٹ گونجنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ ان چیزوں کا چند گز دور پڑی ہوئی مان شاہ کی لاش سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی ایک ہراس سا دل کو جکڑنے لگا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ مجھے فوراً انسپکٹر ضامن کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دینی چاہئے۔ میں واپس مڑی اور اس روش کی طرف بڑھی جو مجھے یہاں سے نکال کر باغ کے محرابی دروازے تک پہنچا سکتی تھی۔ ابھی میں نے واپسی کا سفر دو یا تین قدم ہی طے کیا تھا کہ اچانک شاخیں سرسرائیں۔ قدموں کی چاپ گونجی اور پہلو سے ایک سایہ نکل کر مجھ پر جھپٹا۔ مجھے یاد نہیں لیکن یقینی بات ہے کہ میں سینے کی پوری قوت سے چیخی ہوں گی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا خود کو ناقابل بیان دہشت کے اظہار سے نہ روک سکتا۔ ایک زور

آور ہاتھ میرے منہ پر آیا' میرے کندھوں کو شدید دھکا لگا اور میں اوندھے منہ پھولوں کی ایک کیاری میں گری۔ گرنے کے بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم ایک آہنی گرفت میں ہے اور ہونٹوں پر ایک سخت کھردری ہتھیلی یوں جمی ہوئی ہے جیسے اسے میرے منہ کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا ہو۔ میں نے پوری قوت سے مچل کر خود کو آزاد کرانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ میری پشت زمین پر گھسٹ رہی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ آور مجھے کسی جانب کھینچ رہا ہے۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باغ کے پچھلے دروازے سے باہر لے آیا۔ یہ ایک کھیت تھا۔ کھیت کے ایک حصے میں کٹے ہوئے درختوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا تھا اس ڈھیر میں دیودار' چیل' اور پڑتل کے چھوٹے بڑے درختوں کے بیشمار تنے شامل تھے۔ یہ بیش قیمت لکڑی نہ جانے کب سے یہاں پڑی تھی۔
کئی تنے پڑے پڑے زمین میں دھنس چکے تھے اور ان کی چھال پر پھپھوندی لگی ہوئی تھی۔ یہ ڈھیر کم از کم ایک ایکڑ رقبے میں تھا۔ حملہ آور باغ کے دروازے سے نکلتے ہی ان لکڑیوں میں داخل ہو گیا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے میری آنکھوں کے سامنے اب اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہونٹوں پر سے ہتھیلی کی گرفت ختم کرنے کے لئے میں نے شدید مزاحمت کی تو حملہ آور نے مجھے زمین پر پٹخ کر گھٹنا میری گردن پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے بائیں پہلو میں کوئی نوکدار شے چبھتی محسوس ہوئی۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس نوکدار شے نے لباس میں گزر کر میری جلد کو زخمی کر دیا ہے۔ حملہ آور معمولی سا دباؤ اور بڑھاتا تو وہ شے میری پسلیوں میں اتر جاتی۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ملگجے اندھیرے میں یوں لگا جیسے اس نے پیشانی اور ایک رخسار پر کیچڑ ملا ہوا ہے۔ اس بات کا پتہ بعد میں چلا کہ وہ زخمی تھا اور اس کے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اندرونی غضب سے چمک رہی تھیں۔ ناکافی روشنی کے باوجود میں اسے پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے دل کی دھڑکن تھمتی محسوس ہوئی۔ میری آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلے پر جو چہرہ تھا وہ ضامن علی کا تھا۔ وہ عجیب خوفناک آواز میں پھنکارا۔
"قسم پیدا کرنے والے کی' آواز نکالی تو پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔"
یہ ضامن علی کی آواز تھی لیکن یہ لہجہ کسی درندے کا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے

کہ اس وقت میں ایک انگلی کو بھی جنبش دیتی تو وہ دیوانگی کے عالم میں مجھے قتل کر دیتا۔ یہ دیکھ کر کہ میں خوفزدہ ہو گئی ہوں' اس نے نوکدار چیز کا دباؤ کم کیا اور بازو سے کھینچ کر مجھے بٹھا دیا۔ میں نے دیکھا اس کے بائیں ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا۔ چاقو میری آنکھوں کے سامنے نچا کر اس نے کہا "چلو اٹھو.......... میرے آگے آگے چلو۔"

میں کھڑی ہو گئی میں اس کی بات مان رہی تھی لیکن اتنی خوفزدہ نہیں تھی جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں زندگی کا اتنا سرد گرم دیکھ چکی تھی اور موت کو اتنی مرتبہ چھو کر گزری تھی کہ اعصاب سن ہو چکے تھے۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ لکڑیوں کے اس عظیم الشان ڈھیر میں قدرتی طور پر ایک سرنگ سی بن گئی تھی۔ پندرہ بیس گز آگے جا کر یہ سرنگ یک دم ایک چھوٹی سی دراڑ میں بدل گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ جہاں سرنگ ختم ہوئی وہاں بائیں جانب تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی جیسے کوئی نیچی چھت والی گیلری ہو۔ غالباً لکڑیاں ڈھیر کرتے ہوئے یہاں چھوٹا سا خلا رہ گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ضامن علی نے اپنا سگریٹ لائٹر جلایا تو گردو پیش روشن ہو گئے۔ ایک بلی اور اس کے بچے ہمیں گھورتے ہوئے کونے کھدروں میں رینگ گئے۔ آڑی ترچھی پڑی شہتیریوں اور کیلیوں سے بے شمار جالے چپٹے تھے۔ ایک طرف کسی مرغی کے پر پڑے تھے جیسے کوئی کتا یا بلا جھنجھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسری طرف کسی جانور کا خشک فضلہ پڑا تھا۔ ضامن علی نے لائٹر کو موم بتی کی طرح ایک پتھر پر رکھ دیا اور مجھے دھکیل کر زمین پر بٹھا دیا۔ میں نے پہلی دفعہ غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب دیوانگی ناچ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور لرزتے کانپتے لہجے میں کہا "انسپکٹر ضامن علی! تم.......... تم نے مان شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے اس کا خون کر دیا ہے؟"

وہ بڑی بے فکری سے مسکرایا اور تھوڑا سا لنگڑا کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ سر کے علاوہ اس کا پاؤں بھی زخمی ہے۔ اس زخمی پاؤں پر اس نے اپنا مفلر باندھ رکھا تھا۔ میں نے گھاس پر خون کے جو نشان دیکھے تھے وہ یقیناً اسی زخمی پاؤں کے تھے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی کہ مان شاہ کے باغ میں جو خونی واقعہ رونما ہو چکا ہے اس کا ذمے دار صرف ضامن علی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھیانک خیال میرے ذہن میں گھس آیا کہ علاقے میں مسلسل ہونے والی قتل کی وارداتوں میں

ضامن علی ہی کا ہاتھ ہے۔ تو کیا.......... اس وقت میں ایک جنونی شخص کی دسترس میں تھی۔

نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی' میں نے ہاتھ بڑھا کر ضامن علی کا گریبان پکڑ لیا اور جھنجوڑ کر کہا "تم قاتل ہو.......... تم خونی ہو۔ تم نے.......... صرف تم نے مان شاہ کو مارا ہے۔"

وہ بولا "مارا ہے تو پھر..........؟"

میں نے کہا "اور اس سے پہلے بھی جو قتل ہوئے ہیں' وہ تم نے کئے ہیں۔"

وہ بولا "یہ بات ٹھیک نہیں۔ وہ سارے قتل میں نے نہیں کئے۔"

میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑی "اس کا مطلب ہے.......... تم نے.......... قتل کئے ہیں۔"

"بالکل کئے ہیں اور اپنے ان گناہ گار ہاتھوں سے کئے ہیں۔" اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ مجھے اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید میں حسب معمول کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا ہے تم نے ایسا؟" میں نے چلا کر پوچھا "کیا اس لئے کہ تم پولیس انسپکٹر ہو؟ کس قانون نے تمہیں اس قتل و غارت کی اجازت دی ہے؟ کہاں سے اتھارٹی لے کر آئے ہو تم خون کرنے کی؟"

اس نے خون آلود چاقو کو مٹی سے صاف کر کے اپنی گرد آلود پتلون کی جیب میں رکھا اور اطمینان سے بولا "قانون سے اجازت لے کر نہیں' قانون کو توڑ کر قتل کئے ہیں اور اس لئے کئے ہیں.......... کہ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "شاید تم مجھے کوئی کہانی سنانے کے چکر میں ہو۔ لیکن میں تمہارے منہ سے ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری سانسوں سے گوشت خور درندے کی بو آ رہی ہے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے' میں یہاں سے باہر نکلنا چاہتی ہوں۔"

میرے جذباتی پن کو دیکھتے ہوئے اس نے چاقو جیب سے نکال کر ایک بار پھر گود میں رکھ لیا اور بولا "میری کہانی طویل نہیں' بہت مختصر ہے۔ تم نہ بھی سنو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میں اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سلوک کی وجہ سمجھ میں

آجائے جو میں تم سے کرنے والا ہوں۔"

"کیسا سلوک.........؟" میں نے پھر کر پوچھا۔

"حوصلہ رکھو......... ابھی سب کچھ سامنے آجائے گا۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور تنگ سی جگہ میں دھواں بکھیرتے ہوئے بہکی بہکی بے ربط باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اور جس کے ادھورے پن کو میں نے تخیل سے مکمل کیا کچھ اس طرح تھا۔

.... تقسیم ہندوستان کے وقت ضامن علی کا باپ کبیر علی ریلوے پولیس میں حوالدار تھا۔ وہ ایک باریش نمازی اور ایماندار شخص تھا۔ ایک مرتبہ اس نے چند ملزموں کو پکڑا جو گودام سے ریلوے کا لوہا چرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے جو حوالدار تھا وہ چوروں سے ملا ہوا تھا۔ ملزموں نے کبیر علی کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ ان کی رشوت ٹھکرا کر کبیر علی نے انہیں گرفتار کرا دیا۔ اس واقعے سے ایک خونی رنجش نے جنم لیا۔ جیل سے باہر آتے ہی ان لوگوں نے کبیر علی کو قتل کر دیا اور علاقہ غیر میں فرار ہو گئے۔ پولیس نے ان کی بازیابی کی بہت کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی تاہم کبیر علی کو قتل کر کے بھی قاتلوں کے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوئی۔ قریباً دو سال بعد انہوں نے پھر وار کیا اور کبیر علی کے چھوٹے بھائی نذیر کو جان سے مار دیا اور اس کے دوست کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ تاہم اس دفعہ ان کا بھی نقصان ہوا۔ نوجوان نذیر علی نے شکار ہونے سے پہلے حتی المقدور مزاحمت کی اور شکاریوں میں سے بھی ایک کو ڈھیر کر دیا۔ اس واقعے کے بعد ملزمان ایک بار پھر علاقہ غیر میں فرار ہو گئے تھے لہٰذا کوشش کے باوجود قانون کے ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے۔ ملزم پارٹی میں سے مرنے والے کا نام ادریس تھا۔ ادریس کا بدلہ لینے کے لئے ملزمان نے پورے آٹھ برس انتظار کیا۔ آٹھ برس میں حوالدار کبیر علی کا بیٹا ضامن علی جوان ہو چکا تھا اور پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچے تھے......... ایک روز صبح کو ضامن علی تھانے سے گھر روانہ ہوا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے راستے میں اپنے اور بیوی کے لئے ناشتے کا سامان خریدا۔ بچوں کے لئے دودھ لیا اور تھکے ماندے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر جو جائے سکون ہوتا ہے، جہاں نڈھال جسموں کے لئے آسودگی ہوتی ہے اور وہ توانائی ہوتی ہے جو

اگلے روز پھر "میدان کارزار" میں اترنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ جہاں حیات بخش نگاہیں ہوتی ہیں اور وہ معصوم چہکاریں ہوتی ہیں جو دلوں میں گداز اور مہر و وفا کے جذبے جگاتی ہیں۔ لیکن اس روز ضامن علی کو اپنی گھر کی چار دیواری میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ صرف تین خونچکاں لاشیں ملیں۔ خون سے لتھڑے ہوئے بستر ملے اور ایک ہجوم ملا جس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر ماتمی خاموشی تھی۔ آٹھ سال کی خاموشی کے بعد دشمن ایک بار پھر وار کر گیا تھا۔ یقیناً وہ اسے قتل کرنے آئے تھے اور اسے نہ پا کر انہوں نے اس کے اہل خانہ پر قیامت توڑ دی تھی۔ اس جانکاہ حادثے نے ضامن علی کو نیم پاگل کر دیا۔ کئی ہفتے تک اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے پھر ڈیوٹی پر جانا شروع کیا۔ اب اسے انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر کا پھول دیکھ دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ کاش یہ پھول دیکھنے والی آنکھیں زندہ ہوتیں۔ کتنا ارمان تھا زبیدہ کو یہ دن دیکھنے کا......... وہ زبیدہ اور اس کے بچوں کے قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ لیکن وہ درندے وار کرنے کے بعد ایک بار پھر آزاد علاقے کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکے تھے۔ حکام نے ایک ایس پی کی قیادت میں تفتیشی پارٹی ترتیب دے کر کرم ایجنسی میں بھیجی۔ ایس پی کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر صورت ملزمان کو برآمد کرے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔

اس پارٹی نے کئی ہفتے آزاد علاقے میں گزارے۔ پولیٹکل ایجنٹس، ملکوں، سرداروں اور جرگوں سے رابطہ قائم کیا لیکن ملزمان کی گرفتاری میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر یہ لوگ منہ لٹکا کر واپس آگئے۔ انہی دنوں ضامن علی کے ذہن میں ایک نئی سوچ کا بیج پڑا۔ یہ دیوانگی کی سوچ تھی اور اس سوچ کے پیچھے اس کی تین پشتوں کا دکھ شامل تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے خاندان پر ٹوٹنے والے مظالم کا ذمے دار "علاقہ غیر" ہے۔ وہ علاقہ غیر جس میں بسنے والے کچھ ناعاقبت اندیش لوگ مجرموں اور قاتلوں کے لئے اپنی باہیں کھول دیتے ہیں اور انہیں قانون کی پہنچ سے دور کوہستانی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا عہدہ، اس کی وردی اس کا اختیار سب بیکار ہے۔ جہاں آزاد علاقے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں یہ سب چیزیں بیکار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسے ان چیزوں سے کیا لینا تھا اسے تو اپنے مجرم درکار تھے۔ وہ مجرم جنہیں آزاد علاقہ

ایک بار پھر اپنی گود میں چھپا چکا تھا۔

ایک روز وہ چپکے سے خود بھی آزاد علاقے میں چلا آیا۔ ایک مفرور مجرم کا بھیس بدل کر اپنے مفرور مجرموں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اس نے راتیں ویرانوں میں گزاریں اور بھوکا پیاسا کوہستانی وسعتوں کو ناپتا رہا۔ بستی بستی' پہاڑ پہاڑ اور قبیلہ قبیلہ اس نے اپنے دشمنوں کی تلاش جاری رکھی۔ محنت اور مسلسل کوشش کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ ضامن علی کی آبلہ پائی بھی رائیگاں نہیں گئی۔ اسے اپنے دشمنوں میں سے اقبال نامی ایک شخص کا کھوج ملا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ ضامن کا پہلا قتل تھا۔ اس کے بعد اس نے پانچ قتل اور کئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ پانچوں افراد ضامن کے لئے اجنبی تھے۔ ان کی موت کا سبب صرف ایک ہی تھا وہ یا تو مفرور مجرم تھے یا انہوں نے کسی مفرور کو پناہ دی تھی۔ حد سے بڑھے ہوئے دکھوں نے ضامن کو نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ آزاد علاقے میں روپوش ہونے والا مجرم چاہے وہ کوئی بھی ہو' ضامن علی کو جہاں کہیں بھی کوئی مشکوک شخص نظر آیا وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ پھر جونہی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ وہ قانون سے بھاگا ہوا شخص ہے' ضامن علی موت کا فرشتہ بن کر اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چھ مقتولوں میں سے دو ایسے تھے جو خود مفرور مجرم نہیں تھے لیکن وہ مفرور مجرموں کو پناہ دیتے تھے۔ ان میں سے ایک "منگل قبیلے" کا ایک خانہ بدوش سردار تھا اور دوسرا خود مان شاہ تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ضامن علی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مان شاہ مفرور مجرموں کو پناہ دینے کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ ضامن علی کو بھی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پناہ دے دی تھی اور اس کی یہی "دلیری" بالآخر اس کی موت کا سبب بنی۔ خود پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد مان شاہ کافی محتاط ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مکان کے گرد مسلح پہرے کا انتظام کر رکھا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ قاتل اس کے گھر کے اندر ہی ہے بلکہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ضامن علی بہتر موقعے کی تلاش میں تھا۔ آج موقع ملتے ہی اس نے اپنا کمانی دار چاقو مان شاہ کے دل میں اتار دیا.........."

ضامن علی کی روداد ختم ہوئی تو لکڑیوں کے نیچے وہ مختصر سا خلا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ضامن علی کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ وہ ہنس کر بولا۔

"میں نے غلط تو نہیں کیا نا.......... بتاؤ غلط تو نہیں کیا؟ گناہ گار کو سزا تو ملنی ہی چاہئے.......... کیوں لوگ جرم بھی کرتے رہیں اور قانون سے بھی بچے رہیں..........؟ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کیوں اس آزاد علاقے میں پہنچ کر انصاف کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں؟ یہاں کے لوگ بھی انصاف پسند ہیں' اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں' قانون اور لاقانونیت کا مطلب سمجھتے ہیں پھر درمیان میں یہ دیوار کیوں حائل ہے؟"

میں اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ جواب بھی کیا دیتی۔ اس نے سگریٹ بجھا کر دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر باندھے اور لکڑیوں سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر خلا میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ضامن علی کی بھاری آواز نے اس سکوت کو توڑا۔ وہ بولا "تم بھی تو مفرور مجرم ہو نا.......... تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے؟"

میرے سر پر جیسے بجلی گر پڑی..... ضامن علی یہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا یہ سب کچھ۔ میں ہکلا کر رہ گئی۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ چاقو اس کی گود میں تھا۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ یہ چاقو میرے ہاتھوں سے بالکل محفوظ ہے۔ "میرا خیال ہے تم پریشان ہو گئی ہو۔ سوچ رہی ہو کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ یہ مت بھولو کہ میں ایک پولیس والا بھی ہوں۔ پولیس والے عام طور پر چہرے پہچاننے میں غلطی نہیں کرتے.......... یہ دیکھو یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا" اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا اخباری تراشہ نکال کر میری طرف پھینک دیا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے تراشہ اٹھایا۔ میری ایک چھوٹی سی تصویر میرا منہ چڑا رہی تھی۔ ساتھ ہی چار پانچ انچ کی ایک کالمی خبر بھی تھی۔ لکھا تھا۔

".......... واصف چنگیزی قتل کیس کی مفرور ملزمہ ثنا محمود کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یاد رہے کہ قریباً آٹھ ماہ قبل اس کی گرفتاری کے لئے بازار حسن کے ایک مکان پر چھاپہ مارا گیا تھا۔ چھاپے سے کچھ ہی دیر قبل وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ ملزمہ ثناء ایک بااثر غیر ملکی شخص کے ساتھ کراچی کے ایک نائٹ کلب میں دیکھی جاتی ہے۔ ایک پولیس پارٹی اس اطلاع پر کراچی روانہ کی گئی مگر تفتیش سے یہ خبر غلط نکلی.........."

خبر کا متن حیران کن تھا۔ کہاں کراچی کا نائٹ کلب اور کہاں خانہ بدوش قبیلے کی

قید۔ میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ جھوٹ بولنے والے جھوٹ بولتے بولتے کتنی دور نکل جاتے ہیں۔ وہ حقیقت کو رنگوں کی ایسی بھٹی چڑھاتے ہیں کہ اصلیت کی شکل پہچاننا مشکل ہو جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ رنگ ہی رنگ رہ جاتے ہیں حقیقت ناپید ہو جاتی ہے۔ میں جو صرف ایک بدنصیب ماں تھی' بے ضمیر رنگ سازوں کی بھٹی پر چڑھ کر ایک خطرناک عیاش "انٹرنیشنل" مجرمہ بن گئی تھی۔

ضامن علی نے اب آنکھیں کھول لی تھیں اور بغور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ میں نے تراشے سے نگاہ ہٹائی تو وہ زہریلے پن سے مسکرا دیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کا تاریک خلا کچھ اور بھیانک لگنے لگا۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کھلا ہوا چاقو اب اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ اس چاقو کے پھل پر کہیں کہیں اب تک مان شاہ کا خون لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ محسوس کر کے حیرانی ہوئی کہ میں اتنی خوفزدہ نہیں ہوں جتنا مجھے ہونا چاہئے۔ میں موت کے شکنجے میں تھی' جنونی قاتل مجھ سے دو فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا اور آلہ قتل اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے تو دہشت سے مر جانا چاہئے تھا یا چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ شاید وہاب چنگیزی کے دست ہوس کا شکار ہونے کے بعد اور رائل بنگال ٹائیگر کی آدم خوری دیکھنے کے بعد مجھ میں مزید دہشت زدہ ہونے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی........ تاہم موت پھر موت ہوتی ہے' ضامن علی جب چاقو تھام کر میری طرف سرکا اور میں نے اس کی آنکھوں میں جنون کی لہر دیکھی تو گھبرا کر پیچھے کو سرک گئی۔ لیکن زندگی پیچھے بھی نہیں تھی' پیچھے لکڑی کی دیوار تھی جسے پار کر کے نہ کوئی باہر جا سکتا تھا' نہ اندر آ سکتا تھا۔ ضامن علی کا خنجر حرکت میں آیا اور اس کی نوک میری ٹھوڑی کے نیچے چبھنے لگی۔ جان بچانا فرض ہے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس فرض سے کیسے سبکدوش ہوں۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "انسپکٹر ضامن! ہوش کرو۔"

اچانک اس نے خنجر میری گردن سے ہٹا دیا اور پیچھے ہٹ کر لکڑی سے ٹیک لگا لی "میں تجھے قتل نہیں کروں گا شاء محمود........ جانتی ہو کیوں نہیں کروں گا' جانتی ہو؟"

میں خاموش رہی۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجب وحشت زدہ سی ہنسی تھی۔

"میں کیوں قتل کروں تجھے........ کیا قصور ہے تیرا........ میں نے سب کچھ پڑھا

ہوا ہے۔ میں نے سب کچھ پڑھا ہوا ہے تیرے بارے میں۔ تو قانون سے فرار ہو کر نہیں چھپی ہوئی۔ قانون تجھ سے چھپا ہوا ہے........ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "میں جانتا ہوں بچے کی موت کیا ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں بی بی۔ کوئی بھی ماں ہوتی وہ ان حالات میں یہی کچھ کرتی جو تم کر رہی ہو۔ شاید زبیدہ بھی ہوتی........ تو وہ یہی کچھ کرتی۔"

ایک بار پھر ضامن نے ہاتھ گردن کی پشت پر باندھ کر سر کو سہارا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کے دو دھارے اس کے رخساروں پر پھیلتے چلے گئے۔ لکڑی کی درزوں اور بھول بھلیوں میں سے راہ بنا کر ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور میرے پاؤں میں پڑے ہوئے اخباری تراشے کو الٹ گیا۔ تراشے کی پشت پر ایک اور چھوٹی سی خبر میرے مطلب کی تھی۔ میں نے بیساختہ تراشہ اٹھا کر دیکھا۔ نیوز رائٹر نے ادبی انداز اختیار کرتے ہوئے سرخی جمائی تھی "پرندوں کی آزادی۔" نیچے لکھا تھا۔

"وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ کے ذرائع کے مطابق آئندہ چند روز میں وہ تمام پرندے آزاد کر دیئے جائیں گے جو چند ماہ پہلے اسمگلروں کے ایک بہت بڑے گروہ سے قبضے میں لئے گئے تھے۔ یاد رہے کہ ان تمام شکاری پرندوں کو ناجائز طور پر پکڑا گیا تھا اور ان کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے۔ ان میں نایاب شاہین' عقاب اور باز شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ پرندے جو اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں' محکمے کی تحویل میں رہیں گے اور انہیں بعد ازاں سرکاری طور پر فروخت کیا جائے گا۔ پرندوں کو چھوڑنے کی کارروائی محکمہ وائلڈ لائف اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں عمل میں لائی جائے گی۔"

یہ اخباری تراشہ چار روز پہلے کا تھا۔ اس کا مطلب تھا کروڑوں روپے مالیت کے وہ مسروقہ پرندے آزاد کئے جا چکے تھے یا کئے جانے والے تھے۔ وہاب چنگیزی کے خلاف یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان پرندوں کو بیرون ملک اسمگل کرنا چنگیزیوں کا ایک بڑا "پراجیکٹ" تھا اور ہم سب نے مل کر اس "پراجیکٹ" کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس خبر کو پڑھ کر میرے سینے کی جلن میں ذرا سی کمی واقع ہو گئی ہے۔

ضامن علی بدستور ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ آنسوؤں کی نمی ابھی تک اس کے رخساروں پر تھی۔ لالٹین کی جگہ اب ایک موم بتی رکھی ہوئی تھی۔ یہ موم بتی

ضامن نے یہیں کہیں سے تلاش کر کے جلائی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ اس سے پہلے بھی یہاں آتا رہتا ہے.......... میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس درندہ صفت شخص سے نفرت کا اظہار کروں یا ہمدردی کا۔ قانون کا محافظ ہونے کے باوجود اس نے قانون کو ہاتھ میں لے رکھا تھا اور خود ہی جج بن کر لوگوں کو سزائے موت دے رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ حق پر تھا یا باطل پر، بہرحال وہ ایک خطرناک شخص تھا اور اس کی قربت کا احساس میرے دل کی دھڑکن کو خوف سے بھر رہا تھا۔ وہ بولتا تھا تو اس کی باتوں سے دیوانگی جھلکتی تھی اور جب خاموش ہوتا تو زیادہ ڈر لگتا تھا کہ پتہ نہیں اب کیا کہہ دے گا۔ میں نے اس تشویشناک خاموشی کو توڑنے کے لئے کہا۔

"انسپکٹر ضامن! میں کوئی قانون دان نہیں کہ تمہارے کردار پر تبصرہ کر سکوں۔ بہرحال اتنا کہوں گی کہ تم ایک خطرناک راستے پر چل رہے ہو۔ ظاہر ہے اگر تم واقعی مفرور مجرموں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو تم نے کسی معمولی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایسے لوگوں سے ٹکراؤ کا نتیجہ موت کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل کسی کی گولی تمہیں چاٹ لے گی یا پھر پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گے۔ میرے خیال میں آٹھ دس یا بیس تیس قتل کر دینے سے یہ وسیع و عریض علاقے مفرور مجرموں سے خالی نہیں ہو جائیں گے۔ اگر تم واقعی اپنی سوچ میں مخلص تھے تو تمہیں قانون کا سہارا لینا چاہئے تھا۔"

ضامن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا........... زوردار اور طویل........... مختصر جگہ اس قہقہے سے گونج اٹھی۔ ہنس ہنس کر وہ دہرا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنستے ہنستے ہی بولا "بہت خوب........... واہ واہ۔ کیا بات کی ہے۔ مجھے قانون پسندی کا مشورہ دیا ہے۔ کتنی اچھی لگی ہے تمہارے منہ سے یہ بات۔ بہت شکریہ اس نیک مشورے کا۔ لیکن میں اتنا گدھا نہیں جتنا تم نے سمجھا ہے۔ میں نے جو راستہ چنا ہے اس پر چلوں گا۔ رہی دشمن کی گولی کی بات تو اس کا خطرہ تو ہم جیسوں کو رہتا ہی ہے.........."

چند لمحے خاموش رہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "ویسے میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ اب کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو جانا چاہئے۔ جنگل میں زیادہ شکار کھیلا جائے تو جانور بھاگ جاتے ہیں۔ ماہر شکاری تھوڑا سا وقفہ دے کر شکار پر نکلتے ہیں۔ لیکن........." کچھ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "لیکن وقفے سے پہلے میں ایک درندے کو ضرور مارنا چاہتا ہوں.......... بلکہ ایک نہیں دو درندے ہیں۔ نئے نئے آئے ہیں اس جنگل میں بڑی مستی کر رہے ہیں۔

"کون ہیں؟

ہیں دو عدد دو پائے۔ ایک بالوں والا ہے ایک بغیر بالوں کے بڑے چوکنے ہیں لیکن میں نے پہچان لگالی ہے۔ بچ کر نہیں جائیں گے۔ آج کل میں ہی ٹھائیں کر دوں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ مان شاہ جیسے دو اور افراد کا ذکر کر رہا ہے۔ دفعتاً کچھ فاصلے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ضامن علی ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور پھر اندھیرے میں اس کے چاقو کی کڑکڑاہٹ گونج اٹھی اس نے چاقو کھول کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"خبردار" وہ پھنکارا "آواز نکالنے کی کوشش کرو گی تو ڈھیر کر دوں گا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے میرا بازو گرفت میں لے لیا تھا۔ قدموں کی چاپ بتدریج قریب آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مدہم انسانی آوازیں بھی تھیں۔ ہم دونوں بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ یکایک سو گز کے فاصلے سے ایک زوردار آواز آئی۔ بولنے والے نے پشتو میں کہا۔

"جو کوئی بھی ہے باہر نکل آئے۔ ورنہ اندر ہی گولیوں سے بھون دیں گے۔"

یہ فقرہ سننے کے بعد شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ بستی والوں کو شک ہو چکا تھا کہ لکڑیوں کی اس لاٹ کے اندر کوئی چھپا ہوا ہے۔ ضامن علی نے میرا بازو کھینچا اور ٹٹولتا ہوا مخالف سمت میں بڑھا۔ دیا سلائی جلا کر اس نے مجھے ایک چھوٹا سا رخنہ دکھایا۔ اوندھے منہ لیٹ کر اس میں سے بمشکل گزرا جا سکتا تھا۔ ضامن علی نے ہدایت کی کہ میں اس میں سے گزر جاؤں۔ کھلا ہوا چاقو اس کے داہنے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد میں خلا میں سے گزر کر دوسری طرف آ گئی۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف لکڑی کا کھردرا پن تھا۔ جس وقت ضامن علی خلا میں سے گزر رہا تھا میں اس پر حملہ کر سکتی تھی لیکن میں نے اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اس نے بھی زیادہ موقع نہیں دیا اور ایک دو سیکنڈ میں رخنے سے گزرنے کا مرحلہ طے کر لیا۔ یہاں پہنچ کر

اس نے ایک بار پھر لائٹر کی مدد سے موم بتی روشنی کرلی اور لکڑی کے بیچوں بیچ رخنوں' درزوں اور خالی جگہوں سے گزر کر ہم آگے بڑھنے لگے۔ یہ ایک خطرناک عمل تھا۔ سینکڑوں من وزن کی دیو ہیکل گیلیاں بڑی بے ترتیبی سے ایک دوسرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور کسی کسی جگہ یوں لگتا تھا کہ اگر ہم نے انہیں ذرا بھی چھیڑا تو وہ ہمارے اوپر آگریں گی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ' ہم نے پندرہ منٹ میں طے کیا۔ ایک جگہ موزوں خلا دیکھ کر ضامن اوپر کی جانب باہر نکل گیا۔ بعد ازاں اس نے مجھے بھی کلائی سے تھام کر باہر کھینچ لیا۔ ہم لکڑی کے اس عظیم الشان ڈھیر کے جنوبی کنارے کے پاس تھے۔ گہری تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھے لے کر ڈھیر سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دور آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جونہی ہم کھیتوں میں داخل ہوئے ضامن علی مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا' اور زخمی پاؤں کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا میرے پیچھے چلنے لگا۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور میں جانتی تھی کہ وہ اتنا پھرتیلا ضرور ہے کہ زخمی ہونے کے باوجود میرے بھاگنے کی کوشش کو ناکام بنا دے۔

سردی بہت زیادہ تھی۔ رہی سہی کسر یخ بستہ ہوا پوری کر رہی تھی۔ میں نے گرم چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ پھر بھی کپکپی کم نہیں ہوئی پیدل چلنے کی وجہ سے ٹانگیں تو گرم تھیں لیکن اوپر کا دھڑ سن ہو رہا تھا۔ مان شاہ کا بے جان چہرہ رہ رہ کر نگاہ میں پھر رہا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ گھر کی وحشت زدہ عورتوں پر کیا بیتی ہوگی۔ صدمہ تو جو ہونا تھا وہ ہونا تھا لیکن جس دہشت کا انہیں سامنا تھا اس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" میں نے ضامن سے پوچھا۔

"بس خاموشی سے چلتی رہو۔" وہ غرایا۔

"اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

"تم سے ہمدردی ہونے کے باوجود مجھے تمہارے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

"کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ دو تین روز تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے اگلے شکار سے نبٹ لوں۔ اس کے بعد تم آزاد ہوگی۔"

میں کانپ گئی۔ "شکار" کی بات وہ ایسے کر رہا تھا جیسے کسی انسان کو نہیں خرگوش کو

مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کتنی درندگی تھی اس کے لہجے میں۔ میں سوچنے لگی ضامن کا نشانہ بننے والا اگلا بدنصیب کون ہے۔"

اب ہم کھیتوں سے نکل کر غیر آباد پہاڑیوں میں آچکے تھے۔ ان پہاڑیوں پر کہیں کہیں اکا دکا مکان تھے۔ سخت سردی میں دو میل کے دشوار گزار سفر کے بعد ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک بالکل تنہا مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ اس پہاڑی پر سبزہ کثرت سے تھا مگر چوٹی تک پہنچتے پہنچتے یہ سبزہ بالکل معدوم ہو گیا۔ مکان چار پانچ مرلے میں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک کتے نے زور شور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ بائیں طرف ایک کھڑکی کھلی اور اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا کہ کون ہے۔ جواب میں ضامن علی نے رعب سے اپنا نام بتایا۔ فوراً مکان کے اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور کسی نے تڑاخ سے دروازہ کھول دیا۔

یہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ ضامن علی سے بے حد مرعوب بلکہ خوفزدہ نظر آتا تھا۔ اس نے جھک کر ہم دونوں کو سلام کیا اور جلدی سے دروازہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹا تاکہ ہم اندر داخل ہو سکیں۔ ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر وہ فوراً چائے پانی کا انتظام کرنے چلا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے پہلی مرتبہ غور سے ضامن علی کا چہرہ دیکھا۔ اس کی پیشانی پر کسی پتھر کا زخم تھا اور خون اس کی دائیں کنپٹی اور داڑھی پر خشک ہو چکا تھا۔ غالباً اپنے قتل سے پہلے مان شاہ نے بھرپور مزاحمت کی تھی اور ضامن کا پاؤں بھی اس مزاحمت کے نتیجے میں گھائل ہوا تھا..........

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہے (تاہم اگلے چار پانچ گھنٹوں میں وہ عورت نظر آئی اور نہ اس کی آواز مجھے سنائی دی) جب گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان ہمارے لئے چائے بنانے جا چکا تھا۔ میں نے ضامن سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

وہ مسکرایا "اس کا نام بشر گل ہے۔ کسی رشتے دار کی لڑکی کو بھگا کر یہاں لایا ہوا ہے۔ اس کی ٹھوڑی پر چوٹ کا نشان دیکھا ہے تم نے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ضامن بولا "پچھلے مہینے میرے ساتھ لڑائی ہوئی تھی

اس کی۔ کم بخت راہزنی کرتا ہے۔ مسافر سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ دو تین میل نیچے برساتی نالے کے پاس مجھے روک لیا۔ کہنے لگا" نکالو جو کچھ ہے۔ میرے پاس یہی چاقو تھا میں نے نکال لیا۔ ٹھیک ٹھاک جنگ ہوئی۔ میں نے دھکا دے کر پہاڑی سے نیچے گرا دیا۔ رائفل اور گھوڑا بھی چھین لیا۔ میں غصے میں تھا۔ شاید جان ہی سے مار ڈالتا لیکن وہ لڑکی جو اس کے ساتھ تھی درختوں سے نکل آئی اور رو دھو کر مجھے روک لیا۔ میں نے کہا تم دونوں کی سزا یہ ہے کہ ایک ہفتہ میری میزبانی کرو۔ یہ دونوں مجھے اپنے گھر لے آئے۔ اب بھی جب کبھی مجھے ضرورت پڑتی ہے ایک آدھ روز یہاں رہ جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "ایسا میزبان تو کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

ضامن علی مسکرایا "یہی بات تو تمہیں معلوم نہیں۔ میں جتنا محفوظ اس گھر میں ہوں کہیں بھی نہیں۔ بشر گل پٹھان ہے اور میں جانتا ہوں جب تک میں بطور مہمان اس چار دیواری میں ہوں وہ مجھ پر وار نہیں کرے گا اور اب تو شاید وہ اس چار دیواری سے باہر بھی مجھے مہمان ہی سمجھنے لگا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد بشر گل چائے لے کر آگیا۔ اس نے خود ہی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ چائے کے علاوہ مونگ پھلی' بادام وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ مرغی کے آدھ درجن ابلے ہوئے انڈے تھے۔ میں نے دیکھا' بشر گل ایک مضبوط جسم کا نوجوان تھا۔ شکل و صورت سے جنگجو اور سخت گیر لگتا تھا۔ اگر ضامن علی نے صرف ایک چاقو کی مدد سے اس پر قابو پایا تھا تو واقعی ہمت کا کام کیا تھا۔ چائے رکھ کر وہ ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا۔ ضامن نے اسے ساتھ بٹھانا چاہا تو وہ بولا۔

"نہیں استاد جی۔ آپ پئیں۔"

وہ کچھ بے قرار سا نظر آتا تھا۔ جونہی ہم نے چائے ختم کی وہ بولا "استاد جی' ذرا میرے ساتھ آئیں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔"

ضامن علی نے ڈکار لے کر اطمینان سے مسہری پر پھیلتے ہوئے کہا "اوئے یہ کوئی غیر نہیں ہے۔ اپنے ہی قبیلے کی ہے۔ جو کہنا ہے کھلے دل سے کہہ۔"

بشر گل کچھ دیر میری طرف دیکھ کر جھجکتا رہا پھر بولا "استاد' بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔ میں تو شام سے آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک بڑی اچھی خبر ہے آپ کے

لئے۔"

"کیسی خبر؟"

ضامن نے اشتیاق سے پوچھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آج رات ملک بہاری خان اور اس کے کارندے کونج کے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ وہ شکرے کی آنکھوں والا بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں دو راتیں لگ جائیں۔ تاہم آج رات تو وہ کسی صورت واپس نہیں آئیں گے۔ گھر میں وہ پنجابی بابو اکیلا ہی ہو گا۔ بہت ہوئے تو دو تین رائفل مین ساتھ ہوں گے ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس اطلاع پر ضامن علی کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں۔ اس نے بے تابی سے پوچھا "تمہاری رائفل کہاں ہے؟"

"پاس ہی ہے۔" بشر گل نے جواب دیا۔

"لے آؤ" ضامن بولا۔

بشر گل گیا اور رائفل لے آیا۔ ساتھ گولیوں والی بیلٹ بھی تھی۔ ضامن نے رائفل ہاتھ میں لے لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں وہی دیوانگی نظر آئی جو چند گھنٹے پہلے مان شاہ کے قتل کے موقعے پر نظر آئی تھی۔

ضامن نے بشر گل سے پوچھا "اور وہ لڑکی؟"

"وہ بھی وہیں ہے۔ میرا خیال ہے اسے حویلی کی بالائی منزل پر رکھا گیا ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بس میرا قیافہ ہے جی۔"

مجھے اس گفتگو کی کچھ زیادہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ضامن علی جلدی جلدی کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بشر گل تھوڑی دیر کے لئے باہر گیا تو میں نے ضامن سے پوچھا "کس پنجابی بابو کی بات کر رہے ہو تم؟"

ضامن نے کہا "میں نے بتایا تھا نا کہ ایک آخری شکار کرنا ہے۔ یہی ہے وہ شکار۔"

وہ تفصیل چھپا رہا تھا۔ تاہم میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو افراد لاہور

سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لائے ہوئے ہیں۔ اٹک کے قریب انہوں نے ایک پولیس مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس وقت وہ دونوں قریبی بستی کے ملک بہاری خان کے پاس پناہ لئے ہوئے ہیں۔ بہاری خان ایک زور آور شخص ہے اور اس کے کسی مہمان کو قتل کر دینا آسان نہیں تھا۔ اس اقدام کے لئے کسی سنہری موقعے کی ضرورت تھی.......... اور آج یہ موقعہ ہاتھ آگیا ہے۔ میں بغور ضامن کی باتیں سن رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے ایک ایسی بات کہی کہ میں بری طرح چونک گئی۔ آناً فاناً دل و دماغ میں تہلکہ مچ گیا اور سوچ کے پرندے لمحوں میں طویل فاصلے طے کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ ضامن علی نے کہا کہ اغوا ہو کر آنے والی لڑکی کسی حکومتی عہدیدار کی بیٹی ہے۔ سنا ہے کہ وہ کوئی انڈر سیکرٹری وغیرہ ہے۔ یہ الفاظ سنتے ہی میرے ذہن میں ارسہ کا نام گونجا اور اس کی صورت آنکھوں میں گھوم گئی۔ میں نے بڑی کوشش سے اپنے تاثرات چھپائے اور ضامن علی سے لڑکی کے بارے مزید معلومات حاصل کیں۔ ضامن نے بتایا کہ وہ چودہ پندرہ برس کی لڑکی ہے۔ اس نے نیلی جرسی اور سفید پتلون پہن رکھی ہے۔ بال کٹے ہوئے ہیں اغوا کرنے والوں میں سے ایک شخص کا حلیہ سن کر میری نگاہوں میں وہاب چنگیزی کے اس کارندے کی صورت گھوم گئی جس کی گردن میں نے استرے سے زخمی کر دی تھی۔ اس کا نام بالم تھا۔ آنکھیں شکرے سے مشابہ اور چہرے و سر کے بال صاف تھے.......... انتہائی کرب کے عالم میں میں نے سوچا' تو گیا اس بے گناہ لڑکی کو پھر یرغمال بنا لیا گیا ہے..........

جوں جوں میں سوچتی گئی میرا یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ ابھی بشر گل اور ضامن جن لوگوں کا ذکر کر رہے تھے وہ وہاب کے کارندے ہیں اور ان کے قبضے میں آئی ہوئی لڑکی وہی بدنصیب ارسہ ہے جسے میں اور سلیم نے بمشکل موت کے چنگل سے نکالا تھا۔ میرا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس سے بڑھ کر بری خبر اور کیا ہو سکتی تھی۔

دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے وہ اخباری تراشہ گھوم گیا جو میں نے چند گھنٹے پہلے ضامن کے پاس دیکھا تھا۔ اس خبر کی تفصیل ذہن میں آئی جس میں پرندوں کو آزاد کرنے کا ذکر کیا گیا تھا.......... ایکا ایکی واقعات کی کڑیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ حالات نے کوئی سنگین رخ اختیار کر رکھا ہے۔ ایک طرف کروڑوں روپے کے پرندوں کو چھوڑنے کی بات کی جا رہی تھی اور دوسری طرف نواز حسنی صاحب کی صاحب زادی

مجرموں کے چنگل میں پھنس کر یہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا.......... اس کا ایک ہی مطلب تھا پرندوں کی رہائی سے پہلے ہی ان کی گرفتاری کا کوئی بندوبست کر لیا گیا ہے۔

قدموں کی چاپ نے مجھے میرے خیالوں سے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا ضامن ایک کمبل لپیٹے لمبے ڈگ بھرتا باہر جا رہا تھا۔ باہر جہاں تاریکی تھی' سردی تھی اور برفانی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ ایسے موسم' اور ایسی شب میں باہر نکلنا دل گردے کا کام تھا۔ میں اسے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ بیرونی دروازے پر پہنچا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا

"کیا بات ہے؟" اس نے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے پاس جا کر کہا۔

"انسپکٹر ضامن! میرا خیال ہے کہ .... میں اس لڑکی کو کسی حد تک جانتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔ مغویہ کو؟"

"ہاں مغویہ کو.......... میں نہیں چاہتی کہ تمہاری جلد بازی سے اسے کوئی نقصان پہنچے۔"

"کون ہے وہ؟"

یہ میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتی' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک دو روز صبر کر لو یہ معاملہ تمہارے تصور سے زیادہ سنگین ہے۔"

اس نے نفرت سے سر جھٹکا "تمہارا مطلب ہے یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے گنوا دوں!؟"

میں نے کہا "تمہارے اس سنہری موقعے میں اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو یاد رکھو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

"مجھے کسی نقصان کی پرواہ نہیں" وہ پھنکارا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پیاس ہی پیاس ہے۔ یہ خون کی پیاس تھی۔ وہ آزاد علاقے میں چھپے ہوئے دو مفرور افراد کا خون پینا چاہتا تھا اور بس۔ اس کے علاوہ اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔ اس گھڑی وہ مجھے بے حد خوفناک اور خطرناک لگا۔ ایک تیر کی طرح جو کمان سے نکل کر نشانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر میں اس کے راستے میں آتی تو شاید وہ مجھے بھی چھید ڈالتا۔ اس نے دروازے کو لات ماری اور تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھنے کی

ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ میں اس لڑکی کو کیونکر جانتی ہوں اور کیوں اس کے لئے پریشان ہوں۔ بشر گل بھی برآمدے میں خاموش کھڑا تھا۔ بشر گل کوئی شریف نوجوان نہیں تھا۔ اچھا خاصا منہ زور غنڈہ لگتا تھا مگر ضامن علی کے سامنے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس کی برتری اور بڑائی تسلیم کر چکا تھا۔

وہ سرد رات میں نے اس پہاڑی مکان میں بے قراری سے جاگتے گزار دی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس دور دراز علاقے میں اس طرح ارسہ کی موجودگی کا پتہ چلے گا۔ دل سے رہ رہ کر دعا نکل رہی تھی کہ خدا کرے میرے منحوس اندازے غلط ثابت ہوں۔ مگر جو کچھ میں سن چکی تھی اس کے بعد خوش فہمی میں رہنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ شواہد سے یہی ظاہر تھا کہ ارسہ ایک بار پھر چنگیزیوں کی قید میں ہے۔ معلوم نہیں ضامن علی کیا گل کھلانے والا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اسے مغویہ کی رہائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے وحشی جذبے کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو مغویہ کو کیا فائدہ پہنچتا تھا........ میں سوچتی رہی اور ضامن علی کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ کسی ساتھ والے کمرے میں بشر گل اور اس کی بیوی بھی جاگ رہے تھے۔ بشر گل دو تین دفعہ میرے لئے چائے لے کر آیا۔ جب سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تو بشر گل کا چہرہ تشویش کے گہرے سایوں میں چھپ گیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ استاد ضامن کو زیادہ سے زیادہ تین بجے تک آجانا چاہئے تھا۔ جب صبح کا اجالا پھیلا تو بشر گل نے سر پر اونی ٹوپی رکھی۔ کمبل لپیٹا اور ضامن علی کی خبر لینے روانہ ہوا۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ ہانپا اور ڈرا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "استاد ضامن مارا گیا ہے۔ بڑی رائفل کا پورا برسٹ لگا ہے اس کی چھاتی میں۔ بستی کے چوراہے میں لاش پڑی ہے اور لوگ جمع ہیں" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ضامن کی صورت نگاہوں میں پھر گئی۔ "آخری شکار" کے بعد وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے تاحشر کوئی بے آرام کرنے والا نہیں تھا۔ پرنم آنکھوں سے تفصیل بتاتے ہوئے بشر

گل نے کہا کہ استاد حویلی کے پچھواڑے سے دیوار پھلانگ کر اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بہاری خاں کے کارندوں نے اسے دیکھ لیا فائرنگ ہوئی اور نتیجے میں استاد چھلنی ہو گیا۔

میں نے دیکھا مسہری پر جہاں ضامن بیٹھا تھا ابھی تک سلوٹیں موجود تھیں۔ اور میز پر وہ پیالی بھی پڑی تھی جس کے پیندے میں اس کی چھوڑی ہوئی چائے تھی۔ انسان کتنا ناپائیدار ہے' برسوں کے منصوبے بنانے والا پل کی خبر نہیں رکھتا۔ بشر گل دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کھجور کی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا "کیا ضامن کی موت سے تمہیں بھی کوئی خطرہ ہے؟" اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ "کیا خطرہ ہے؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ بولا "استاد میری رائفل لے کر گیا تھا۔ بستی میں ایک دو شخص ایسے ہیں جو یہ رائفل پہچان سکتے ہیں۔"

بشر گل کے لئے صورت حال واقعی تشویشناک تھی۔ اتنے میں گھوڑوں کی بہت سی ٹاپیں گونجیں' بشر گل بدک کر کھڑا ہو گیا۔ اسلحے کے نام پر اس کے پاس اب صرف ایک چھوٹا سا پسٹل تھا۔ اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پسٹل نکالا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ میں بھی پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگی۔ قریباً بیس گھڑ سوار پہاڑی کی ڈھلوان پر درمیانی رفتار سے گھوڑے بھگاتے نظر آئے۔ تسلی بخش بات یہ تھی کہ ان کا رخ اس مکان کی طرف نہیں تھا۔

بشر گل بولا "بہاری خاں شکار سے واپس آیا ہے۔"

ان کے پاس لکڑی کے بڑے بڑے پنجرے تھے جن میں نو گرفتار شدہ کونجیں کائیں کائیں کر رہی تھیں۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بستی کی طرف جا رہے تھے۔ یقیناً انہیں اس واقعے کا علم نہیں تھا جو بستی میں رونما ہو چکا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک دراز قد گھڑ سوار پر پڑی۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ بالم ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی۔ اب اس بات میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہی تھی کہ چنگیزیوں کے دو کارندے اس دور دراز بستی میں موجود ہیں۔ اور ان کے جال میں پھنسی ہوئی لڑکی ارسہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ میرے لئے فیصلے کی

گھڑیاں تھیں۔ ایک یا دو منٹ کے اندر اندر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں تن تنہا ارسہ کو آزاد تو نہیں کرا سکتی تھی مگر اس کے وارثوں کو اس کا پتہ ٹھکانہ تو بتا سکتی تھی............ بشر گل دوسرے کمرے میں جلدی جلدی اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑ رہا ہے۔ موجودہ صورت حال میں اس کے لئے یہی بہتر تھا۔ میں نے بھی اپنی گرم چادر لپیٹی۔ جوتی پہنی اور جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

☆==============☆==============☆

میرا واپسی کا سفر بڑا طویل اور صبر آزما تھا۔ قبائلی علاقے سے نکلتے نکلتے مجھے چوبیس گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران ایک دو جگہ مجھے گرفتاری کا خطرہ بھی پیدا ہوا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں کوہاٹ شہر پہنچی اور وہاں سے براستہ بنوں و میانوالی جھنگ کی طرف روانہ ہوئی۔ اتفاقاً بنوں کے بس اڈے سے مجھے اپنے ہی جیسی ایک تنہا عورت مل گئی اور میں نے اسے ہمسفر بنا لیا۔ یوں سرگودھا تک میرا سفر بخیر و خوبی کٹ گیا۔ جوں جوں میں جھنگ سے قریب پہنچ رہی تھی میرے اندر ایک آگ سی پھیلتی جا رہی تھی۔ ان فضاؤں میں میرے فرحان کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہاں کی دھوپ اس کی مسکراہٹ کا عکس تھی اور چھاؤں اس کی گھنیری پلکوں کا سایہ۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اس کی معصوم یادوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے تھا۔ مجھے سینے میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ وہی دھند جو مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی تھی ایک بہت بڑی سفید چادر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کھلنے اور بند ہونے لگی۔

جس وقت میں جھنگ پہنچی صبح کے چھ بجے تھے۔ بس اسٹینڈ سے نکل کر میں تانگوں کے اڈے کی طرف آ گئی۔ میرا ارادہ یوسف کے گاؤں گوپور جانے کا تھا۔ یوسف سے میری آخری ملاقات کئی ماہ پہلے خان رحیمی کے ڈیرے پر ہی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بہت مطمئن تھا۔ صغراں کے ساتھ اس کی منگنی خان رحیمی کی زیر نگرانی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ خان رحیمی نے اسے نایاب باز پکڑنے کے انعام میں معقول رقم بھی دی تھی۔ اس رقم سے یوسف نے اپنی گروی پڑی ہوئی زمین چھڑا لی تھی اور اس پر کاشت شروع کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

جھنگ شہر سے دو گھنٹے کے کچے پکے سفر کے بعد میں سندری گاؤں پہنچی اور خان

رحیمی کے ڈیرے کے نواح سے ہو کر گوپور کی طرف نکل گئی۔ گوپور سے دو میل ادھر ہی خراب رستے کی وجہ سے مجھے تانگہ چھوڑنا پڑا............ جس وقت میں نے یوسف کے دروازے پر دستک دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا' دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ابھی میں نے دستک دی نہیں تھی کہ دوسری طرف کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز قدموں سے دروازے ہی کی طرف آ رہا تھا۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ کھلا اور سرخ کڑھائی دار چادر میں لپٹی ہوئی ایک دبلی پتلی لڑکی اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے چمکدار شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور ایک ہاتھ میں روٹی کے برتن تھے۔ میں دروازے سے پیچھے ہٹ چکی تھی اس لئے لڑکی نے مجھ پر زیادہ توجہ نہیں دی تاہم میں نے چادر کی اوٹ سے نہ صرف اسے دیکھ لیا بلکہ پہچان بھی لیا۔ وہ صغراں تھی۔ یوسف کے گھر سے اس کا یوں روٹی لے کر برآمد ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اور یوسف رشتہ ازدواج میں بندھ چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑی صغراں کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی چال میں دوشیزگی کا بانکپن اور محبت کی شوخی تھی۔ دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے اور اس کی نگاہیں بہت دور تک پرواز کر رہی ہیں۔ میں بھی کسی معمول کی طرح صغراں کے پیچھے چل دی۔ شاید دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ صغراں اور یوسف کو ایک ساتھ بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھوں۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں خوشبو کی طرح مہکتی اور چکراتی چلی جا رہی تھی۔ کسی کو "چاچا سلام" کہتی تھی اور کسی کو "بھائی جان سلام" کسی کو ماسی کہہ کر اس کی خیریت پوچھتی تھی اور کسی ہم عمر سہیلی سے ٹھٹھا کر کے آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ خوش بختی کا پیکر تھی اور میں بدبختی کے سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ کھیتوں میں پہنچ کر وہ نصف فرلانگ تک ایک پگڈنڈی پر چلی اور پھر وہ منظر میرے سامنے آیا جس کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ ایک پیڑ کے سائے تلے یوسف چارپائی ڈالے نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ صغراں کو دیکھتے ہی یوسف کی آنکھوں میں وہ چمک نظر آئی جو نخلستان کو دیکھ کر صحرا نورد کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ صغراں اور وہ ساتھ ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عمر رسیدہ شخص تھوڑی دیر ان کے پاس رہنے بعد ایک طرف چلا گیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ میں ان سے قریباً بیس قدم دور شیشم کے درختوں میں کھڑی تھی۔

جلد ہی یوسف کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ اتنی دور سے مجھے پہچان تو نہیں سکا لیکن اس کی نگاہوں میں جستجو نظر آنے لگی کہ یہ کون عورت درختوں میں سے جھانک رہی ہے۔ اب میرا یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں یوسف اور صغراں کی طرف بڑھی۔ جونہی یوسف نے مجھے پہچانا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت صغراں کے چہرے پر بھی دکھائی دی۔ صغراں نے "باجی" کہہ کر ہلکی سی چیخ ماری اور بھاگ کر مجھ سی لپٹ گئی۔ یوسف حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

باجی کہہ کر اس نے بے تابی سے میرا بازو تھام لیا اور بولا "تم کہاں تھیں باجی' ہم تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار چکے تھے۔"

میں نے کہا "ان سب باتوں کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔ تم کھانا کھالو۔ پھر میں صغراں کے ساتھ گھر چلی جاتی ہوں۔ شام کو تم آؤ گے تو سب کچھ بتاؤں گی۔"

وہ جھلا کر بولا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ یہ کام مجھے تم سے زیادہ......... پیارا ہے۔ لعنت ہے ایسے کام پر" اس نے پاؤں میں پڑی ہوئی درانتی کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ پھر چیخ کر عمر رسیدہ شخص سے بولا۔

"رحمو چاچا۔ مہمان آئے ہیں۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ اونچے کھیت میں اچھی طرح پانی لگوا لینا۔ میں اب نہیں آؤں گا۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے میرا بازو تھاما اور قریباً کھینچتا ہوا گھر کی طرف لے چلا۔

.... یوسف کے گھر میں اب کافی خوشحالی نظر آتی تھی۔ در و دیوار کی چمک گواہی دے رہی تھی کہ انہیں بنانے سنوارنے والی آ گئی ہے۔ یوسف کی والدہ نے بھی بڑے خلوص اور خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ وہ میرے حالات سننے کے لئے بے چین نظر آتے تھے لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دیا یوسف کی والدہ سے پتہ چلا کہ یوسف اور صغراں کی شادی دو ماہ قبل ہوئی ہے۔ ایک ماہ میکے میں گزارنے کے بعد صغراں پچھلے ہفتے ہی واپس آئی تھی۔ یوسف کی والدہ نے بتایا کہ مجھے شادی میں شریک کرنے کے لئے اس نے لاہور اور جھنگ کے کئی چکر لگائے لیکن میرا کچھ پتہ نہ چلا۔ ہماری گفتگو کے

دوران ہی یوسف اور صغراں صحن میں گھومتی مرغیوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ وہ ذبح کرنے کے لئے ایک مرغی پکڑنا چاہتے تھے۔ ان کی شوخ آوازیں کمرے کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ یوسف مرغی پکڑنا چاہتا تھا جبکہ صغراں ایک موٹے تازے مرغے کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے دو ننھے بچے اردگرد سے بے خبر اپنے حال میں مگن کھیل کود میں مصروف ہوں۔ میں نے اندر سے آواز دے کر یوسف سے کہا کہ وہ میرے لئے کوئی تکلف نہ کریں لیکن ان دونوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

وہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ رات گئے تک یوسف اور صغراں میرے چاؤ چونچلوں میں لگے رہے۔ صغراں کنویں سے گھڑوں میں پانی بھر بھر کر لائی اور مجھے نہانے پر مجبور کیا۔

بالکل نئے کپڑے پہننے کو دیے۔ اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔ یوسف کبھی میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگتا کبھی باورچی خانے میں جا کر بیوی کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ کہنے لگا۔

"پتہ ہے باجی! میں نے وہی کچھ پکوایا ہے جو میری شادی کے موقع پر پکا تھا۔ مجھے آج تک یہی محسوس ہوتا تھا کہ میری شادی کی دعوت ادھوری ہے۔"

میرے پوچھنے پر یوسف نے بتایا کہ خان رحیمی آج کل اپنے ڈیرے پر ہی ہے۔ اس کی کچھ زمین ایک سرکاری رکھ کے اندر آ گئی ہے۔ وہ بہت پریشان ہے اور ہفتے میں چار پانچ روز کچہریوں کے چکر میں گزارتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ سیاسی دشمنی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہاب چنگیزی کا آج کل بڑا زور ہے پورے علاقے میں اس کے نام کا ڈنکہ بج رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ الیکشن تو پال پور کے چودھریوں نے جیتا تھا لیکن ممبری کی طاقت چنگیزیوں کے پاس ہے۔ ابھی چار پانچ دن پہلے وہاب چنگیزی ہمارے علاقے میں آیا تھا۔ پولیس کی تین چار گاڑیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ پتہ نہیں کتنے گز لمبی کار تھی اس کے نیچے۔ شکل سے بڑا مومن نظر آ رہا تھا۔ کالی شیروانی ٹوپی اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اسے ایک بڑے افسر کے ساتھ کرسی دی گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "کیا کوئی جلسہ وغیرہ تھا؟"

یوسف حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا "باجی! تم کو نہیں پتہ؟"

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو انہوں نے پکھیرو اڑائے ہیں۔"

مجھے جھٹکا سا لگا اور اس کے ساتھ ہی یوسف کی بات میری سمجھ میں آئی۔ پکھیروؤں سے اس کی مراد پرندے تھے۔ وہی پرندے جن کی آزادی کی خبر میں نے چند روز پرانے اخبار میں پڑھی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم بازوں اور عقابوں کی بات کر رہے ہو؟"

"تو اور کیا" یوسف نے ترت کہا "یہ خبر تو اخباروں میں بھی چھپ چکی ہے۔ وہ سارے باز اور عقاب جو لائسنس کے بغیر پکڑے گئے تھے پولیس والوں نے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ساری کارروائی ہمارے ہی علاقے میں ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

وہ بولا "نہیں.......... لیکن چودھری صاحب دیکھ کر آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ لکڑی کے بڑے بڑے پنجروں میں بند کر کے اور ٹرکوں پر لاد کر وہ پکھیرو وہاں لائے گئے تھے پھر بہت سے لوگوں کے سامنے انہیں کھلی ہوا میں چھوڑ دیا گیا۔"

میں حیرت سے یوسف کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے کسی طور یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ ضرور کوئی پردہ تھا جو نظر اور منظر کے درمیان حائل تھا۔ کسی سازش کے تانے بانے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ارسہ سینکڑوں میل دور ایک پہاڑی بستی میں محبوس تھی اور یہاں وہاب چنگیزی چہرے پر نقاب ڈالے قانون کے محافظوں کے شانے سے شانہ ملائے چل رہا تھا۔ میں فوری طور پر نواز حسنی یا خان رحیمی سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور میں یہاں آئی بھی اس لئے تھی کہ یوسف کے ذریعے نواز حسنی تک اپنا پیغام پہنچا سکوں۔ ظاہر ہے یوسف کو لاہور میں کوئی نہیں پہچانتا تھا اور وہ وہاں چنگیزیوں کے بچھائے ہوئے جال میں آئے بغیر نواز حسنی تک پہنچ سکتا تھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ یوسف کو ایک مختصر تحریری پیغام دے کر لاہور روانہ کروں۔ مگر یہاں آکر میں مختلف انداز میں سوچنے لگی تھی۔ یوسف اور صغراں کی خوبصورت زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈال کر میں وہ غلطی دہرا رہی تھی جو میں نے اپنی دوست فرخندہ اور اس کے منگیتر عابد سے رابطہ قائم کر کے کی تھی۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس چہکتے مہکتے آشیانے

سے کوسوں دور رہنا چاہئے تھا.......... میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ یوسف کو اس آگ میں نہیں گھسیٹوں گی اور آج رات ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ یوسف اور صغراں میرے ارادوں سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کئی روز یہاں رکوں گی اور وہ جی بھر کر مجھ سے باتیں کر سکیں گے۔ وہ نادان تھے انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے پیچھے کیسی کیسی بلائیں لگا چکی ہوں اور میری میزبانی انہیں کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

رات گئے تک وہ دونوں میرے پاس رہے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ میں رنجیدہ ہوں۔ میری دلجوئی کے لئے انہوں نے ایک شاندار پروگرام بنایا۔ اگلے روز ایک قریبی گاؤں میں بہت بڑا میلہ شروع ہو رہا تھا۔ یوسف اور صغراں نے طے کیا کہ وہ کل مجھے ساتھ لے کر وہاں جائیں گے اور پورے چوبیس گھنٹے کے بعد لوٹیں گے۔ وہ دیر تک اس پروگرام کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ میں جسمانی طور پر ان کے ساتھ بیٹھی تھی لیکن ذہنی طور پر بہت دور تھی۔ وہ میلوں ٹھیلوں کی باتیں کر رہے تھے اور میرے کانوں میں قبرستان کی خاموشی گونج رہی تھی.......... قبرستان جہاں میرا بچہ پہنچ چکا تھا.......... اور جہاں شاید مجھے بھی پہنچ جانا تھا۔

رات گئے جب وہ دونوں سو گئے تو میں نے یوسف کے نام ایک چھوٹی سی تحریر چھوڑی اور ایک چھوٹا سا کمبل اور دری لے کر گھر سے نکل آئی۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ کھیتوں میں چھپتی چھپاتی محتاط قدموں سے میں پختہ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ اب میرا ارادہ لاہور جانے کا تھا۔

☆============☆============☆

اگلے روز سہ پہر تین بجے میں لاہور پہنچی۔ بس اڈے سے سیدھی نواز حسنی صاحب کے آفس روانہ ہوئی۔ وہ کمبل جو میں یوسف کے گھر سے لائی تھی میرے بہت کام آرہا تھا۔ اس چھوٹے سے کمبل کو گول لپیٹ کر میں نے دری سے ڈھانپ لیا تھا اور کسی شیر خوار بچے کی طرح کندھے سے لگا لیا تھا۔ حلئے کی اس معمولی تبدیلی سے میری خاصی ڈھارس بندھی تھی اور مجھے امید تھی کہ میں چنگیزیوں کی نگران آنکھوں سے بچ کر نواز حسنی صاحب تک پہنچ جاؤں گی۔ نواز حسنی صاحب ایک بڑے افسر تھے۔ ان تک رسائی حاصل ہو جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ دو تین مرحلوں سے گزر کر میں اس شخص تک

پہنچ گئی جو میری چٹ نواز صاحب کے کمرے میں پہنچا سکتا تھا۔ اس شخص نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔ میرا خستہ حلیہ اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب! خدا کے لئے دیر نہ کریں۔ بہت نقصان ہو جائے گا سیکرٹری صاحب کا۔"

میں نے چٹ پر اپنا نام شاہدہ لکھوایا تھا اور خان رحیمی کا حوالہ دیا تھا۔ وہ چٹ لے کر ایک راہداری میں گم ہو گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی وہ خاصی عجلت میں تھا کہنے لگا "آیئے بی بی جلدی آیئے" میں اس کے ساتھ نواز حسنی صاحب کے شاندار آفس میں داخل ہوئی مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ دفتر سے ملحقہ کمرہ نشست گاہ تھا۔ وہ مجھے نشست گاہ میں لے آئے۔ ان کی چہرے پر تعجب اور الجھن کے گھمبیر سائے تھے۔ وہ جھلاہٹ سے بولے۔

"ثناء محمود' یہ تم کیا کرتی ہو؟ کیوں ایک خلقت کو پریشان کر رکھا ہے تم نے! بتائے بغیر چلے جانا۔ مہینوں گم رہنا اور پھر اچانک آ دھمکنا۔ یہ سب کیا ہے؟"

میں نے کہا "سر' بس پاؤں میں چکر ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو.......... بہت شرمندہ ہوں کہ اپنے محسنوں کو اذیت میں مبتلا رکھتی ہوں۔ لیکن میرے بس میں کچھ نہیں ہے سر۔"

نواز حسنی صاحب نے کہا۔

"خان رحیمی نے مجھے تمہاری چھوڑی ہوئی چٹھی دکھائی تھی جس میں تم نے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ہم وہاب چنگیزی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور.......... یہ کہ تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے اسی میں تمہاری بہتری ہے.........."

میں نے کہا "ہاں جناب' میری اور میرے خیر خواہوں کی بہتری اب ایک دوسرے سے جدا رہنے میں ہی ہے۔ اس وقت بھی میں آپ کے پاس آئی ہوں تو صرف ایک اطلاع دینے کے لئے۔"

"کیسی اطلاع؟" نواز حسنی صاحب نے چونک کر پوچھا میں نے کہا "سر' ارسہ کہاں ہے؟"

نواز حسنی صاحب بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ "کک.......... کیوں کیا ہوا ارسہ کو۔ وہ اپنی پھوپھی کے پاس ملتان گئی ہوئی ہے۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ اس کا مطلب تھا نواز حسنی کو ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔ میں نے پوچھا "آپ کو یقین ہے کہ وہ پھوپھی کے گھر ہی میں ہے؟"

"بھئی کیسی باتیں کرتی ہو تم؟" نواز حسنی صاحب نے کہا "ابھی.......... ابھی ایک گھنٹہ پہلے میں نے اس سے فون پر بات کی ہے۔"

"ایک گھنٹہ پہلے" میں نے سخت حیرت کے عالم میں پوچھا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ نواز صاحب.......... ارسہ تو.........."

"کیا ارسہ ارسہ لگا رکھی ہے۔ کیا ہوا ہے اسے۔ کیا اطلاع ہے تمہارے پاس؟" انہوں نے جھلاہٹ سے کہا۔

اب میرے پاس تفصیل بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں نواز صاحب کو بتایا کہ میں لاہور سے آزاد قبائلی علاقے میں کیسے پہنچی۔ اس روئیداد میں میں سلیم کا ذکر گول کر گئی۔ میں نے صرف اتنا بتایا کہ سلیم کی والدہ سے مل کر میرے دل میں ان کی مدد کرنے کی خواہش جاگی تھی اور میں سلیم کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی.......... جب میں نے نواز حسنی صاحب کو یہ بتایا کہ پارہ چنار کے اس دور دراز گاؤں میں میں نے وہاب چنگیزی کے کارندے دیکھے ہیں اور ان کے قبضے میں آئی ایک نوجوان لڑکی کا تذکرہ سنا ہے تو نواز حسنی کی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھ گیا۔ معلوم نہیں وہ پریشان تھے یا الجھن کا شکار تھے انہوں نے سگار سلگا کر ایک دو گہرے کش لئے اور بولے۔

"تمہیں اس حد تک تو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ارسہ کو خدانخواستہ دوبارہ کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ لیکن اگر چنگیزی کے کارندے وہاں موجود ہیں تو ہمیں یقینی طور پر تشویش ہونی چاہئے۔"

اسی دوران فون کی گھنٹی بجی۔ نواز حسنی صاحب نے لپک کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف کی آواز سن کر ان کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا اور بولے "ایک منٹ ہولڈ کرو رب نواز" ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر انہوں

نے مجھ سے کہا "مس ثناء' پلیز تم دو منٹ باہر بیٹھو میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔"

میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ فون پر گفتگو کے دوران نواز حسنی صاحب کے منہ سے رب نواز کا نام سن کر اور ان کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر میرے ذہن میں ان گنت وسوسے سر اٹھانے لگے۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ نواز حسنی صاحب وہ نہیں ہیں جو وہ آٹھ ماہ پہلے تھے آج......... وہ مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے تھے۔ ان کے لہجے میں اجنبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے انتظار کرتے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو میں نے پی اے صاحب سے پوچھا کہ بڑے صاحب فارغ ہوئے ہیں یا نہیں۔ پی اے صاحب نے بتایا کہ وہ تو فون سننے کے فوراً بعد کہیں چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بٹھایا جائے۔ وہ واپسی پر آپ سے ملیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ ایک چوکیدار اور گن مین مجھ پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور شاید میں اپنی مرضی سے اس عمارت سے باہر نہ نکل سکوں۔ یہ احساس بے حد تکلیف دہ تھا میں یہاں خالص مدد کے جذبے سے آئی تھی۔ نواز حسنی صاحب یا ان کے عہدے اور اثر و رسوخ سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ میں ان تکلفات کی منزل سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ پھر مجھے تشکیک کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا تھا.........

میں نے پی اے سے کہا کہ میں باتھ روم تک جانا چاہتی ہوں۔ پی اے نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور مجھ سے کہا کہ "یہ آپ کو چھوڑ آتا ہے" میں چوکیدار کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ کمبل اور دری جو اب گٹھڑی کی صورت میں میرے پاس تھے۔ میں نے پی اے کے کمرے میں ہی رہنے دیے چوکیدار نے مجھے ٹوائیلٹ کا دروازہ دکھا دیا۔ یہ ویسا ہی ٹوائیلٹ تھا جیسے عموماً سرکاری دفاتر میں ہوتے ہیں۔ میں اندر داخل ہوتے ہی مردانہ والے پورشن کی طرف چلی گئی۔

جب دس منٹ تک میں باہر نہیں آئی تو چوکیدار شک بھری نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا اور جھجکتا ہوا لیڈیز پورشن کی طرف گیا۔ میں اسی موقعے کے انتظار میں تھی۔ باہر نکلی اور تیز قدموں سے کوریڈور طے کر کے لفٹ تک آ گئی۔ خوش قسمتی سے لفٹ کا دروازہ کھلا ملا۔ تیس سیکنڈ بعد میں گراؤنڈ فلور پر تھی۔ عمارت سے نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور لوئر مال روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ "کہاں جانا ہے بی بی!؟"

ڈرائیور نے تیسری بار مجھ سے پوچھا تو میں اپنے خیالوں سے چونک گئی۔ "کہاں جاؤں" میں نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا تو میں نے اسے قبرستان میانی صاحب چلنے کو کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور چوبرجی پہنچا اور وہاں سے بہاولپور روڈ کی طرف مڑ گیا۔ جلد ہی مجھے لب سڑک اپنے ابو کی قبر نظر آئی جس کے سرہانے سفید کتبہ دور ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی رکوائی اور سر پر چادر درست کرتی ہوئی قبرستان میں داخل ہو گئی۔ ابو کے پہلو میں چار اور قبروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان میں دو قبریں بڑی تھیں اور دو چھوٹی۔ ننھی منی دل ہلا دینے والی قبریں۔ یہاں میرا چہیتا بھائی اور اس کے معصوم بچے سو رہے تھے' جنہیں قریباً دس ماہ پہلے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اسے ایک ڈکیتی کا نام دیا گیا تھا۔ سب نے اسے ڈکیتی ہی کہا تھا۔ لیکن میرا دل ہر گھڑی گواہی دیتا تھا کہ وہ ڈکیتی نہیں تھی۔ اور اگر ڈکیتی تھی بھی تو ڈاکو وہاب چنگیزی ہی تھا......... میں ان پانچ قبروں پر دیر تک ماتم کناں رہی۔ میری آنکھیں بنجر تھیں لیکن دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ خونی آنسو کسی آبشار کی طرح میرے سینے کے اندر ہی اندر کہیں گر رہے تھے اور جذب ہو رہے تھے۔ میں آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھی ہچکیوں سے میرا پورا جسم دہل رہا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسی قبرستان میں کہیں فرخندہ اور عابد کی قبریں بھی تھیں اور یہیں کہیں وہ ننھی منی تنہا قبر بھی تھی جو روز مجھے بلاتی تھی میری ممتا کو آواز دیتی تھی۔

مجھ منحوس کے دم قدم سے کتنا اضافہ ہوا تھا اس شہر خموشاں کی آبادی میں۔ میرا جی چاہا کہ میں ہوا کی طرح اس قبرستان میں بکھر جاؤں اور اس ننھی قبر کو تلاش کروں جہاں میرا لخت جگر سو رہا تھا۔ پھر اپنے ناخنوں سے اس قبر کو ادھیڑوں۔ اسے کرید کرید کر کشادہ کروں اور اپنے بیٹے کے پہلو میں لیٹ کر مٹی اوڑھ لوں۔ عجیب عجیب خیال ذہن میں آ رہے تھے۔ میں دل کے سکون کے لئے آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ میری چھٹی حس نے کہا مجھے اس قبرستان سے نکل کر اپنے بچے سے دور چلے جانا چاہئے ورنہ نہ جانے میں کیا کر گزروں۔ تیز قدموں سے میں واپس مڑی اور ٹیکسی میں آ بیٹھی۔ پسینہ دھاروں کی صورت میری گردن سے بہہ رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور میری ابتر حالت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چار پانچ منٹ بعد جب میری

حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اسے اچھرہ چلنے کے لئے کہا۔ میرے دل میں یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ ایک دفعہ عشرت کے گھر کا دروازہ دیکھوں۔ کیا معلوم اس دروازے کے پیچھے عشرت ابھی تک زندہ سلامت موجود ہو۔ مجھے دیکھ کر چارپائی سے کھڑی ہو جائے اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ جائے۔ جب سے میں نے لاہور چھوڑا تھا اور سلیم کے ساتھ آزاد علاقے میں پہنچی تھی ماضی سے میرا ناطہ بالکل کٹا ہوا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہاں کیا ہوا ہے۔ کون مرا اور کون جیا ہے۔ میں عشرت کو بہت نازک حالت میں چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھے اس کی طرف سے بے حد فکر رہتی تھی لیکن ہزار خواہش کے باوجود مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اب عشرت کے پاس سے ہو کر واپس لوٹ جانا مجھے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور مزنگ چونگی سے اچھرے کی جانب مڑ گیا۔ مجھے ان گلیوں کا نقشہ ابھی تک یاد تھا۔ ڈرائیور کو ہدایات دیتی ہوئی میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گئی جہاں میڈم نادرہ سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی اور جہاں میں پہلی بار آنٹی صادقہ سے متعارف ہوئی تھی۔ وہ آنٹی صادقہ جس نے اپنی جوانی اور زندگی ایک قریب المرگ شاعر کی بچیوں کے نام کر کے محبت کی لافانی داستان رقم کی تھی۔ میں عشرت کے ساتھ ساتھ اس عورت کو بھی ایک بار نظروں سے چھونا چاہتی تھی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ اس گھر کے دروازے پر پہنچ کر میری ساری ہمتیں جواب دے گئیں.......... ایسا کیوں ہوا؟ شاید اس لئے کہ میں جانتی تھی' جب تک میں اس دروازے پر دستک نہیں دوں گی عشرت میرے لئے زندہ رہے گی اور جس گھڑی میں نے اس دروازے کو چھو لیا اور یہ دروازہ میرے سامنے کھل گیا عشرت مرجائے گی.......... اور میں.......... عشرت کو مارنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتی تھی میری اس بے خبری سے وہ زندہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ امید تو زندہ رہ سکتی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ اس گھڑی میری دلی کیفیت نجانے کیا ہو رہی تھی۔ میں اس دروازے کے سامنے سے ہو کر واپس لوٹ آئی۔ ڈرائیور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے واپس چلنے کو کہا..........

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں بذریعہ بس واپس روانہ ہو رہی تھی۔ میرے پاؤں سے

جیسے بگولے بندھ گئے تھے۔ مجھے کہیں قرار نہیں تھا۔ میں شہر شہر اور سڑک سڑک چکرا رہی تھی۔ اب میری منزل پھر جھنگ تھا لیکن اس دفعہ میں خان رحیمی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی تھی۔ خان رحیمی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسرار کے پردے میں یہ کون سی سازش چھپی ہوئی ہے۔ نواز حسنی صاحب کی لاڈلی بیٹی سینکڑوں میل دور درندہ صفت لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ اس خبر کو بڑے یقین کے ساتھ جھٹلا رہے ہیں۔ وہ بے خبر ہیں یا بے خبر بنے ہوئے ہیں۔

رات نو بجے میں سندری گاؤں پہنچی اور وہاں سے چھپتی چھپاتی خان رحیمی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ آج تقریباً ایک برس بعد میں نے اس ڈیرے کا رخ کیا تھا۔ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی یہ وسیع و عریض کوٹھی ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ کر گئی تھی۔ خان رحیمی کے خوفناک سینٹ برنارڈ کتے گیٹ کے قریب بھونک رہے تھے۔ ترشے ہوئے خوبصورت لان کے بیچوں بیچ اینٹوں کے سرخ برادے کی سڑک اندر تک چلی گئی تھی۔ کوٹھی کو چاروں طرف سے گھنے جنگل نے گھیرا ہوا تھا اور در و دیوار کو دیکھ کر ہیبت کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے سوچا ان ہیبت ناک دیواروں میں اگر رنگین مزاج اور ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والا خان رحیمی نہ رہتا ہو تو کتنی ناقابل برداشت ہو یہ عمارت۔ میں گیٹ پر پہنچی تو تھوڑی سی کوشش کے بعد چوکیدار نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے فوراً اندر اطلاع پہنچائی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے دینو کی شکل نظر آئی وہ بھاگتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اس کے پیچھے خان رحیمی کا ہیولا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر دینو کو جتنی حیرت ہوئی اتنی ہی مجھے بھی ہوئی۔ بلکہ میری حیرت اس سے شدید تھی۔ میں نے دو ماہ پہلے پہاڑی والے مکان میں دینو کو بری طرح زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا۔ میرے دل میں بارہا یہ وسوسہ سر اٹھا چکا تھا کہ کہیں دینو کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "مجھے تو لگتا ہے میں خواب ویندا پیا ہوں۔ آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا بی بی جی..........؟"

میں نے کہا "ہاں.......... میں تو ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟" اتنے میں خان رحیمی بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ اس نے بالکل نو عمر لڑکوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ سفید پتلون' سفید جوتے اور آدھی آستین کی شوخ دھاریوں والی شرٹ۔ چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور چند بار تھپکنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

کچھ دیر بعد ہم سب ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خان رحیمی کا بڑ حرام بھتیجا باقر' خاص ملازمہ شوقیہ اور سردار محمد وغیرہ بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ تاہم ایک چہرہ جس کی دید نے مجھے حیرت زدہ کر دیا میڈم نادرہ کا تھا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے غمزدہ انداز میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میری آمد پر بھی اس نے ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹائے۔ میڈم نادرہ کو دیکھتے ہی نفرت سے میرا جسم جلنے لگا۔ میں نے اپنے معصوم بھتیجوں کے صدقے اسے معاف کر دیا تھا اور دنیا والوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ عشرت اور میری بھابی ثمینہ کی اصل ماں یہی مکروہ صورت عورت ہے۔ لیکن دل سے میں اس عورت کی نفرت کو کیسے کھرچ سکتی تھی۔ یہ میرے لئے ناممکن تھا۔ میری بربادیوں کی جڑ یہی عورت تھی اور میرے بچے کے خون کے کچھ چھینٹے اس عورت کے ہاتھوں پر بھی تھے۔ میڈم نادرہ نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور نگاہیں ملتے ہی میرے غیض و غضب کو محسوس کر لیا۔ اس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے لڑکے کو اشارہ کیا اور وہ اس کی چیئر دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

میں نے بے انتہا تلخ لہجے میں خان رحیمی سے پوچھا "جناب' یہ عورت یہاں کیسے آئی ہے.........؟"

خان رحیمی کے چہرے پر پھر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ بولا۔

"ذرا سانس تو لے لو مائی ڈیئر گرل' سب کچھ بتاتا ہوں تم کو اور سب کچھ پوچھتا بھی ہوں۔"

میں بے دلی سے بیٹھ گئی کچھ ہی دیر بعد سب لوگ علیک سلیک کر کے رخصت ہو گئے۔ میں اور خان رحیمی ڈرائنگ روم میں تنہا رہ گئے میں نے تند لہجے میں کہا "سر! کچھ بھی کہنے سننے سے پہلے میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ عورت یہاں کیسے آئی ہے۔"

خان رحیمی بولا "گرل' سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ اچھی نیوز سنانا چاہتا ہوں کہ عشرت کا پتہ چل گیا ہے۔ اس کو کچھ لوگوں نے بلیک میل کیا تھا اور لاہور لے گئے تھے وہاں وہ سخت بیمار ہو گئی اور بلیک میل کرنے والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ وہاں سے اپنے

گھر پہنچ گئی۔ صادقہ نامی ایک عورت عشرت کی ماں ہے' میڈم نادرہ' صادقہ کی گہری دوست ہے۔ عشرت کو دل کا شدید مرض لاحق ہو چکا تھا۔ صادقہ اور نادرہ نے اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا اور آپریشن کے لئے اسے انگلینڈ لے کر گئیں۔ سرجری کے بعد عشرت صحت یاب ہو کر واپس آئی ہے اور اب لاہور میں ہے۔" عشرت کی زندگی کی نوید پا کر مجھے جو مسرت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ بظاہر میں خاموشی سے خان رحیمی کی باتیں سن رہی تھی۔ خان رحیمی کو کیسے بتاتی کہ عشرت کی ماں صادقہ نہیں بلکہ یہی فریبی عورت میڈم نادرہ ہے اور وہ عشرت کے ساتھ ساتھ میری بھابی کی بھی ماں ہے.......... میں نے پوچھا۔

"خان صاحب! میں نے آپ سے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ عورت یہاں پہنچی کیسے ہے؟"

خان رحیمی نے سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور بولے "اس سوال کا جواب کافی پیچیدہ ہے۔ آفٹر آل' میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ میڈم نادرہ اب ایک بدلی ہوئی عورت ہے۔ آئی ڈونٹ نو' یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ بہرحال ہو چکا ہے۔ میڈم نادرہ نے چنگیزی گھرانے سے اپنے تعلقات یکسر ختم کر لئے ہیں پچھلے چھ مہینوں میں اس نے دو بار عمرہ ادا کیا ہے اور اب بڑی نیک نیتی کے ساتھ معذور بچوں کے لئے ایک سکول کی بنیاد رکھ رہی ہے۔"

میں نے کہا "سر! میرا سوال اپنی جگہ برقرار ہے۔ اس عورت کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

خان رحیمی کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھنے کے بعد بولے "یہ عورت ایک مریضہ کے درد کا علاج تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچی ہے۔ میرا مطلب عشرت ہے۔ گو عشرت اب تندرست ہے لیکن ڈاکٹروں نے ہدایت کر رکھی ہے کہ اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ایک نارمل زندگی گزار سکے اور مرض عود کر آنے کا خطرہ موجود نہ رہے۔ عشرت کی والدہ اور میڈم نادرہ کو اندازہ ہوا ہے کہ عشرت کسی شخص کی شدید محبت میں گرفتار ہے۔ وہ شخص کون ہے؟ اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے میڈم نادرہ ماری ماری پھر رہی ہے۔"

"شدید محبت۔"

میں نے زیر لب دہرایا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں سلیم کا نام گونج گیا.......... اس کا مطلب تھا میڈم نادرہ سلیم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی.......... اپنی بیٹی کی زندگی کی خاطر اس شخص کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی جسے اس نے قدم قدم پر زخم لگائے تھے اور جس کی پوری زندگی کو طوفانوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سلیم کو چنگیزیوں کے عتاب کا شکار کرنے کے لئے میڈم نادرہ نے میرا رشتہ چنگیزی گھرانے میں کرایا تھا۔ وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو رہی تھی لیکن اب وہی معتوب سلیم میڈم نادرہ کو درکار ہو گیا تھا۔ خود کو عقل کل سمجھنے والے انسان کو قدرت کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔

اچانک میرے ذہن میں آیا کہ اگر دینو خان رحیمی کے پاس ہے تو خان رحیمی کو سلیم کے متعلق بھی علم ہو گا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"سر، سلیم کہاں ہے؟"

خان رحیمی نے ایک طویل سانس لی "اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ معلوم نہیں کہاں رہی ہو تم اتنے دن؟"

میں نے کہا۔ "سر میں اس کے ایک پٹھان دوست غلام خاں کے گھر میں تھی ایک رات غلام خاں کے کچھ پرانے مخالفین نے.........."

"سٹاپ اِٹ.......... سٹاپ اٹ" خان رحیمی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "میں اس بارے میں دینو کی زبانی سب کچھ سن چکا ہوں اور مجھے یقین ہے دینو نے کچھ بھی غلط نہیں بتایا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا تمہیں دوبارہ اپنے زخم کریدنے پڑیں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ غلام خاں کے مخالفین کے ہاتھوں سے نکل کر تم کہاں پہنچیں۔ میری معلومات کے مطابق توخی خانم اپنے بیٹے زرگل سے تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی تھی شادی کے انتظامات بھی ہو چکے تھے مگر صرف ایک دن قبل تم غائب ہو گئیں۔ تم چھپ چھپا کر ان عورتوں میں شامل ہو گئیں جو کسی مزار پر سلام وغیرہ کرنے جا رہی تھیں۔ توخی خانم اور عمر شاہ لندد کے آدمیوں نے تمہارا پیچھا کیا مگر تم نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ آئی تھنک یہاں تک تو میں باخبر ہوں۔"

مجھے خان رحیمی کی باخبری پر واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا "سر آپ کو یہ

سب کچھ.........."

"مجھے دینو نے بتایا ہے" خان رحیمی نے جواب دیا۔ "شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ غلام خاں کی موت اور تمہارے اغوا کے بعد سلیم نے کیا طوفان کھڑا کیا ہے۔"

میرے ذہن میں خطرے کی سینکڑوں گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"کیسا طوفان؟" میں نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

خان رحیمی نے سگار کا دھواں اڑا کر ڈرامائی لہجے میں کہا "گرل' اس نے پورے ایک خانہ بدوش قبیلے کو تہس نہس کر دیا ہے۔"

"تہس نہس؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں.......... تمہارے توخی خانم کے چنگل سے نکلنے کے صرف تین روز بعد غلام خاں کے قبیلے نے پاوندہ قبیلے کے پڑاؤ پر زور دار حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں سلیم پیش پیش تھا۔ شاید تمہیں جان کر حیرت ہو کہ اس لڑائی میں بھاری مشین گنیں اور دستی بم استعمال کئے گئے۔ پورے دس گھنٹے میدان کارزار گرم رہا۔ دونوں طرف کے کم از کم پندرہ افراد ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس خوفناک جھگڑے نے اس وقت عجیب صورت اختیار کر لی تھی جب بستی کے ملک عمر شاہ لندو کو خود اس کے برادر نسبتی نے ہلاک کر ڈالا اور حملہ آوروں کے ساتھ مل کر عمر شاہ لندد اور توخی خانم کے ساتھیوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ درحقیقت قبیلے کے اندر بھی سرداری کے لئے رسہ کشی پائی جاتی تھی۔ لڑائی شروع ہوئی تو اس رسہ کشی نے بغاوت کی صورت اختیار کر لی اور یوں ملک لندو خاں کو اس کے پرانے ساتھیوں کے ہاتھوں کئے کی سزا مل گئی۔ توخی خانم اور اس کا بیٹا بمشکل جان بچا کر بھاگ سکے۔"

میں حیرانی کے عالم میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ میرے آنے کے بعد پاوندہ بستی میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ توخی خانم کو اپنے جس جیٹھ پر فخر تھا کہ وہ غلام خان کے وارثوں کو ناکوں چنے چبوا دے گا وہ اپنے ہی بھائی بند کے ہاتھوں خاک و خون میں لوٹ گیا تھا اور توخی کو بھاگ کر جان بچانا پڑی تھی۔

میں نے خان رحیمی سے پوچھا "سلیم اب کہاں ہے؟"

خان رحیمی نے بتایا "بقول دینو وہ آزاد علاقے میں ہے اور اسی بستی میں ہے جہاں

تم نے اسے چھوڑا تھا۔ وہ دن رات تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ دینو کو بھی اس نے اس تلاش کے سلسلے میں یہاں بھیجا ہے۔ یہ سیکنڈ ٹائم ہے کہ وہ تمہاری کھوج میں آزاد علاقے سے یہاں آیا ہے۔"

میری اور خان رحیمی کی گفتگو جاری تھی کہ دینو اجازت لے کر اندر آگیا۔ اس نے خان رحیمی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جناب! وہ میڈم نادرہ کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بس روندی ہی جا رہی ہیں۔ کہیں ان کا دل شل ہی نہ گھٹ جائے۔"

خان رحیمی نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ ثناء........ دیکھیں کیا ہوا ہے؟" خان رحیمی گھٹنوں پر زور دے کر اٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ رنگ رنگیلا بوڑھا پچھلے چند مہینوں میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہے۔ شاید وہاب چنگیزی کی دشمنی کی دیمک نے اس کی تابندہ مسکراہٹوں کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

میں اور خان رحیمی اس کمرے میں پہنچے جہاں پر میڈم نادرہ بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میڈم نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر پچھتاوے اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خان رحیمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے میڈم؟"

میڈم بولی "پلیز خان صاحب! میں ثناء سے اکیلے میں دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میڈم کا عندیہ جان کر خان رحیمی نے کمرے میں موجود افراد کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر چلا گیا۔ سب سے آخر میں میں واپس جانے کے لئے مڑی تو میڈم نادرہ نے آگے بڑھ کر میرا پلو تھام لیا۔

"خدا کے لئے بیٹا' مجھ سے یوں منہ نہ پھیرو' میں تمہاری مجرم ہوں جو جی چاہے سزا دے لو مگر بے رخی نہ برتو۔"

میں نے کہا "میڈم' میرے نزدیک ایسی کوئی سزا نہیں جو تمہارے جرم کے شایان شان ہو' میں........ اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑتی ہوں۔"

میڈم نادرہ بلک اٹھی "نہیں بیٹا! ایسا مت کہو' مجھے بددعا نہ دو۔ زرینہ (عشرت) کی خاطر مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو وہ کبھی صحت یاب نہیں ہوگی۔ اس

کی زندگی کی خاطر میری خطائیں بخش دو۔"

میں نے بہ آہستگی اپنا پلو میڈم نادرہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اس سے زیادہ نرم رویہ میں اختیار کر ہی نہیں سکتی تھی۔

باہر نکلی تو دینو میرا منتظر تھا۔ اس نے اپنی لنگڑی اردو میں مجھے اطلاع دی کہ خان رحیمی کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بھوک کس کافر کو تھی تاہم خان رحیمی کے خیال سے میں میز پر جا بیٹھی۔

خان رحیمی کے بے حد اصرار کے باوجود میں تین لقموں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ خان خود بھی بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ کہنے لگا "کتنی عجیب بات ہے' تمہیں یہاں آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چلے ہیں اور میں ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ تم کہاں سے آ رہی ہو۔"

میں نے خان رحیمی کو مختصراً بتایا کہ کس طرح ایک کے بعد ایک واقعہ پیش آیا اور میں انسپکٹر ضامن علی کے ساتھ پارہ چنار کے نواح میں پہنچ گئی۔ پھر مان شاہ پر پراسرار قاتلانہ حملے سے لے کر ضامن علی کی موت تک سارے واقعات میں نے خان رحیمی کو بتا دیئے۔ آخر میں میں نے کہا۔

"بشر گل کے مکان میں پناہ کے دوران ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ضامن علی کی زبان سے جس لڑکی کے اغوا کی بات ہوئی ہے وہ ارسہ ہے۔ ضامن علی کی موت کے فوراً بعد میں بشر گل کے گھر سے نکل آئی اور آج سہ پہر تین بجے کے قریب نواز حسنی صاحب کے آفس پہنچ گئی۔ میں نے انہیں چنگیزی کارندوں اور ارسہ کے بارے میں تمام تفصیلات بہم پہنچائیں لیکن انہوں نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ارسہ تو بخیر و عافیت اپنی پھوپھی کے گھر ملتان میں ہے۔ بعد میں انہوں نے ٹیلی فون پر وہاب چنگیزی کے دست راست رب نواز سے بات کی اور مجھے کمرے سے باہر نکال کر اپنے گن مین کی نگرانی میں دے دیا۔ میں صاف محسوس کر رہی تھی کہ دال میں کالا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے موقع مل گیا اور میں اپنے نگران کو دھوکا دے کر نواز حسنی کے آفس سے نکل آئی........"

خان رحیمی بڑی محویت سے میری باتیں سنتا رہا۔ رہ رہ کر اس کے ہونٹوں کی سدا بہار مسکراہٹ (جو اب پھیکی پڑی ہوئی تھی) معدوم ہو جاتی تھی۔ اپنی کتھا ختم کر کے میں

سوالیہ نظروں سے خان رحیمی کو دیکھنے لگی۔ وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ سگار سلگا کر اس نے چند گہرے کش لئے اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر ٹیک لگاتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

"ڈیئر گرل! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے' حالات وہی ہیں جن کا خدشہ تم نے ظاہر کیا ہے......... یعنی ارسہ ایک بار پھر اغوا ہو چکی ہے۔"

میں سب کچھ جانتی تھی پھر بھی خان رحیمی کے منہ سے یہ بات سن کر دل کو دھچکا لگا۔ خان رحیمی نے نہایت دھیمے لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "حالات بڑے تشویشناک ہیں ڈیئر ثناء' جیسا کہ تم جانتی ہو ارسہ کے ساتھ یہ سانحہ دوسری بار پیش آیا ہے۔ ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں لیکن اگر ایسا ہو جائے تو اسے اغواء ہونے والے کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب نواز حسنی صاحب مجرموں سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اپنی بیٹی کی "لائف" بچانے کے لئے ان کے پاس ایک اور صرف ایک ہی راستہ تھا وہ اغواہ کنندگان کی ہدایات پر بے چوں چراں عمل کرتے جائیں......... اور وہ کر رہے ہیں۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ نواز حسنی کے لہجے میں اتنی غیریت کیوں تھی اور انہوں نے مجھ پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کیوں کی۔ درحقیقت وہ پوری طرح مجرموں کے جال میں جکڑے ہوئے تھے اور اپنی معصوم بیٹی کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے خان رحیمی سے کہا "سر! یہ کیسے ہو گیا' جہاں تک مجھے یاد ہے ارسہ کی حفاظت کے لئے دو باڈی گارڈز بھی رکھے گئے تھے۔ وہ گھر سے بھی شاذونادر ہی نکلتی تھی۔"

خان رحیمی نے کہا۔

"بس ہونی ہو کر رہتی ہے' دشمن تاک میں تھا' موقع ملتے ہی وار کر گیا۔ واردات کے بعد سے ایک گارڈ بھی روپوش ہے' خیال ہے کہ وہ مجرموں کے ساتھ مل گیا تھا۔"

میں نے کہا "سر! اس کا مطلب ہے کہ اخبار میں پرندوں کے بارے میں جو خبر چھپی تھی وہ غلط تھی؟"

"کون سی خبر؟"

"یہی کہ پرندے آزاد کر دیئے گئے ہیں۔"

"نہیں وہ نیوز صحیح تھی۔"

"تو پرندے آزاد کر دیئے گئے ہیں؟"

"ہاں' میری انفارمیشن کے مطابق تو ایسا ہی کیا گیا ہے۔ لیکن........." کچھ کہتے کہتے خان رحیمی رک گئے۔ میں سوالیہ نظروں سے خان رحیمی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سگار کا ایک گہرا کش لے کر انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "لیکن ایسا ہوا نہیں' جو کچھ نظر آیا ہے' ضروری نہیں کہ وہ حقیقت ہو۔"

"میں سمجھ نہیں پا رہی سر!"

خان رحیمی نے کہا "تم نے عموماً نیوز پیپرز میں پڑھا ہو گا کہ فلاں جگہ پولیس کی نگرانی میں اتنی مقدار میں منشیات کو آگ لگا دی گئی۔ انہیں تلف کر دیا گیا' وغیرہ وغیرہ۔ ایسی خبریں کبھی درست ہوتی ہیں لیکن کبھی گھپلا بھی ہوتا ہے۔ خانہ پری کے لئے منشیات کی تھوڑی سی مقدار نذر آتش کر دی جاتی ہے اور باقی پھر کالے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ پرندوں کے معاملے میں بھی کوئی ایسی ہی ہیرا پھیری ہوئی ہے۔ جو پرندے چھوڑے گئے ہیں وہ تعداد میں بہت کم تھے اور اصل پرندے بھی نہیں تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ مجرموں نے نواز حسنی کی طرح محکمہ وائلڈ لائف کے کسی اعلیٰ افسر کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔"

میں نے تقریباً چونکتے ہوئے کہا "خان صاحب! یہ کیوں ہو رہا ہے' کیوں قانون کے ہاتھ چھوٹے اور مجرموں کے لمبے ہو گئے ہیں؟ کیا آپ ایک قانون پسند شہری نہیں؟ کیا آپ کا فرض نہیں کہ چنگیزیوں کے کرتوتوں کا پردہ فاش کریں؟ کیونکر خاموش ہیں آپ سب؟"

خان رحیمی پر فلسفیانہ موڈ طاری ہو گیا۔ چھت کو گھورتے ہوئے بولا "کبھی کبھی کلمہ حق کہنا اور خودکشی کرنا ایک ہی فعل کے دو نام بن جاتے ہیں' ایسے وقت میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عمل کی بجائے لائحہ عمل کا مرحلہ ہوتا ہے......... ڈیئر گرل تمہارے لئے بھی میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ فی الوقت خاموشی

اختیار کرو۔ وہاب چنگیزی کا ستارہ اس وقت عروج پر ہے لیکن مظلوموں کی آہیں اس عروج کو تادیر برقرار نہیں رہنے دیں گی اور یہی وقت اس کو سزا دینے کا ہوگا۔ تم نے کبھی تلور اور باز کی کشمکش دیکھی ہے؟ تلور بہت پھرتیلا اور ہوشیار پرندہ ہے۔ باز سے بچنے کی بہت کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی جان بچانے کے لئے باز کے اوپر اوپر پرواز کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بلند پروازی اسے تادیر باز سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ چنگیزی بھی اپنے المناک انجام سے بچنے کے لئے بلندی پر پرواز کر رہا ہے لیکن آخر اسے نیچے آنا ہے۔ مکافات عمل کا باز اسے چیرے پھاڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "سر! لیکن آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی جب تلور اور باز کی کشمکش طویل ہوجاتی ہے تو تلور باز کو اندھا بھی کر دیتا ہے......... اور پھر سچائی تو سچائی ہوتی ہے سر۔ کیا اسے مؤخر کرنا اس کے منہ پر کالک ملنا نہیں؟"

یکسر خان رحیمی نے اپنا موڈ بدل لیا اور مسکرا کر بولا "اس وقت تم مجھے طویل ٹی وی ڈراموں کی ہیروئن لگ رہی ہو' مشکل مشکل الفاظ استعمال کرنے والی اور بات سے بات نکالنے والی......... مائی ڈیئر' اپنے ننھے ذہن کو اتنا دکھ نہ دو' ہم جو ہیں یہ سب کچھ سوچنے کے لئے......... تم بہت کٹھن شب و روز سے گزری ہو۔ بہتر یہ ہے کہ چند ماہ بڑی ہی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کوٹھی میں گزارو۔ میں تمہارے لئے ایک علیحدہ پورشن مخصوص کر دیتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ تم کہاں ہو......... اگر کہو تو تمہارے دولہے میاں کو بھی........."

"بس سر!" میں نے بیزاری سے کہا "مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا' اپنا آپ بھی اچھا نہیں لگ رہا' پلیز......... آپ ایسی باتیں نہ کریں۔"

خان رحیمی تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ایسے لہجے میں اس سے بات کی ہے۔ میں نے کہا "سر! شاید واقعی مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ بہت تھک گیا ہے میرا ذہن......... کیا میں سونے کے لئے جا سکتی ہوں؟"

خان رحیمی مسکرایا۔ "سونے کے لئے یا سوچنے کے لئے؟"

"نہیں سر! سونے کے لئے' بہت سوچ چکی ہوں' اب کیا سوچنا ہے۔"

"کیا اب کوئی خطرناک ارادہ کر لیا ہے؟"

"نہیں۔"

"اگر کوئی ایسا ارادہ ہے تو مجھے بتانا ضرور۔"

میں سر جھکا کر باہر نکل آئی۔

سونے کے لئے میں اسی کمرے میں آکر لیٹ گئی جہاں ایک برس پہلے میں نے کئی ہفتے گزارے تھے۔ اسی کمرے میں یوسف سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ الماری بھی اب تک وہیں تھی جس کے پیچھے یوسف آکر چھپ گیا تھا۔ اسی کمرے کی کھڑکیوں سے میں نے سلیم کو بہکے قدموں سے پہلی دفعہ عشرت کے کمرے کی جانب جاتے دیکھا تھا اور یہی وہ کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی بھابی کی ہم شکل کا راز جاننے کے لئے لاہور جاؤں گی۔ کمرے میں سب کچھ اسی طرح تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا' کھڑکیوں کے پردے برابر کئے اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس الماری کے نیچے پائیوں کے درمیان ایک درز سی تھی۔ میں اس درز میں اپنی ڈائری اس طرح پھنسا دیا کرتی تھی کہ وہ باہر سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس کوٹھی میں قیام کے دوران میں نے باقاعدگی سے ڈائری لکھنا شروع کی تھی۔ یہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ ڈائری یہیں رہ گئی تھی۔ میں نے الماری کے نیچے تاریکی میں ہاتھ گھمایا۔ مکڑی کے جالوں کے پیچھے ڈائری موجود تھی۔ میں نے اسے نکال لیا۔ ایک کپڑے سے گرد وغیرہ صاف کی۔ مسہری پر بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک سال پہلے کے واقعات ترتیب وار نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ کچھ باتوں پر شرمندگی ہوئی' کچھ پر رونا آیا اور کچھ بالکل بچکانہ محسوس ہوئیں۔ پرانے کاغذات دیکھنے کے بعد ہمیشہ میرا یہی حال ہوا ہے۔ ڈائری پڑھنے کے بعد میں دیر تک خیالوں میں کھوئی رہی اور پھر سونے کے لئے لیٹ گئی۔ کمرے کی کھڑکی کے پاس کوئی مسلسل منڈلا رہا تھا۔ میں نے پردے کی جھری سے دیکھا وہ دینو تھا۔ شاید کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ چونک گیا۔

"کیا بات ہے دینو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی" اس نے ہنس کر کہا "یونہی ٹہل رہا تھا۔"

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔ غالباً خان رحیمی کو خطرہ تھا کہ میں اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل جاؤں گی۔ میرے اردگرد بے اعتباری کی جو فضا پیدا ہو

رہی تھی اس کی ذمہ دار میں خود تھی۔ میرے اندر کی آگ نے مجھے باؤلا کر رکھا تھا اور کبھی کبھی میرا طرز عمل میرے خیر خواہوں کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس پھیکی مسکراہٹ بن کر میرے ہونٹوں تک آ گیا۔ میں نے دینو سے کہا کہ وہ اندر آ جائے۔ وہ تو جیسے پہلے ہی منتظر تھا۔ شڑپ سے کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سینے میں بڑا غبار بھرا ہوا تھا۔

کہنے لگا "بی بی جی! آپ کو معلوم نہیں آپ اپنے مجازی خدا کو کتنا دکھ دیندی پئی ہیں۔ آپ کو فوراً استاد (سلیم) کے پاس پہنچنا چاہئے۔ وہ ادھا رہ گیا ہے آپ کے وچھوڑے میں۔"

میں نے کہا۔ "دینو! مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ اب بھی وہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ قبائلی علاقے میں عداوت مول لینے کے بعد اسے وہاں نہیں رہنا چاہئے تھا۔"

"کیسی عداوت جی؟" دینو نے پوچھا۔

"وہی تو خی خانم اور عمر شاہ والا جھگڑا۔"

"بی بی جی! وہ تو مُکا ہی ختم ہو گیا ہے' عمر شاہ مارا گیا' تو خی خانم بھاگ گئی' ان کے جو دس پندرہ حمایتی تھے ان کو بھی کھڑچ کر دیا گیا۔ اب قبیلے کا نیا سردار استاد سلیم سے بڑا خوش ہے۔ وہ تو اسے کہتا ہے تم بھی میرے کول آ کر رہنے لگو۔ پر جی استاد سلیم وہ مکان کبھی نہیں چھوڑے گا جس میں آپ اور وہ رہتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"وہ مکان تو.......... جل گیا تھا۔"

جل تو گیا تھا جی' لیکن استاد سلیم نے سارا مکان پھر کھڑا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح' ہر شے بالکل ٹھیک ٹھاک بنادی ہے۔ اب تو کوئی کہہ نہیں سکدا کہ اس مکان کو کچھ ہوا تھا۔ فرنیچر' ٹی وی' فریج .... ہر چیز استاد نے پھر خریدی ہے اور وہاں سجائی ہے۔"

دینو دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے سمجھا رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد سلیم کے پاس پہنچ جانا چاہئے کیونکہ میری گمشدگی کی ہر گھڑی اس پر قیامت کی طرح گزر رہی ہے۔ سلیم کی باتیں کرتے کرتے اس کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ آنکھیں تو بہت دیر ہوئی بنجر ہو چکی تھیں۔ سینہ

بھی لق و دق صحرا محسوس ہوتا تھا۔ اس سینے میں دل کی جگہ آگ کا ایک گولہ تھا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یہ گولہ اپنے حجم اور اپنی شدت میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس آگ کی لپیٹوں سے ایک ہی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ "ثناء! بہت دیر ہو چکی تیرے فرحان کا وحشی قاتل کب تک زندہ رہے گا؟" میں دینو کی باتیں سن رہی تھی لیکن صرف سننے کی حد تک۔ میرا ذہن اس کی باتوں کے معانی سے کوسوں دور تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے دینو کسی اجنبی زبان میں بول رہا ہے۔ جلد ہی دینو نے میری عدم توجہی کو محسوس کر لیا۔ کہنے لگا۔

"بی بی جی' کی گل ہے' آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگدے ہیں؟" میں نے گہری سانس لی اور اداس سے لہجے میں کہا۔

"دینو! میری تو عقل خبط ہو گئی ہے تم ہی بتاؤ کیا کروں.......... کس کے پاس فریاد لے کر جاؤں' کس سے انصاف مانگوں؟ یوں لگتا ہے ایک ایک کر کے وہاب نے سب سہارے مجھ سے چھین لئے ہیں۔ کوئی دروازہ میرے لئے کھلا نہیں چھوڑا.......... اب خان رحیمی بھی مجھے خاموش رہنے کے مشورے دے رہا ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کیسے چپ رہوں۔ میں چنگیزی کے سارے ظلم بھلا سکتی ہوں۔ لیکن ایک ماں کیسے چپ رہ سکتی ہے۔ وہ کیسے بھول سکتی ہے کہ اس کے شیر خوار کو اس کی گود سے چھین کر اور رلا رلا کر مارا گیا تھا۔ بتاؤ.......... کیا بھول سکتی ہے ایک ماں؟"

دینو نے پریشانی سے سر جھکا لیا' میری جلتی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں' وہ دبے دبے لہجے میں بولا "بی بی جی' کیوں نہ پولیس کے کسی بہت بڑے افسر کو خط لکھا جائے اور اس کو ساری گل کھول کر بتائی جائے' ثبوت بھی دتے جائیں' ہو سکدا ہے.........."

"کچھ نہیں ہو سکتا دینو۔"

میں نے بیزاری سے کہا "ایسے خط بہت لکھے جاتے ہیں تم جس بڑے افسر کی بات کر رہے ہو' ہو سکتا ہے وہ اپنی ملازمت پکی رکھنے کے لئے اس وقت وہاب چنگیزی کے گھر بیٹھا اس کی چاپلوسی کر رہا ہو۔"

دینو کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میری الجھنوں کا کیا حل بتائے۔ کہنے لگا "بی بی جی' میں تو چھوٹی عقل کا بندہ ہوں۔ کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ میرا ایک ہی مشورہ ہے۔

آپ استاد سلیم کے پاس چلی جائیں۔ وہ آپ کے دکھ کو اپنے سے وکھرا نہیں سمجھدا' وہ کوئی نہ کوئی حل ضرور کڈ لے گا۔"

میں مسکرا دی "دینو! تیرے استاد سلیم کے پاس بھی میری طرح ایک نقد جان کے سوا اور کچھ نہیں' وہ یہی کرے گا کہ اس جان کو داؤ پر لگا کر میرے سر ایک اور قرض چڑھا جائے گا۔ قرضوں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے میرے سر پر کہ گردن ٹوٹ رہی ہے۔ سیٹھے کھچ گئے ہیں۔ یہ بوجھ اسی طرح رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی یا خود کشی کر لوں گی.........."

دینو سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ جیسے میرے انجام سے خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اسے سوجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اپنے دل کی بات کس طرح میرے دل میں ڈالے اور اس کے دل کی بات یہ تھی کہ وہ مجھے سلیم کے پاس پہنچانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد دینو باہر چلا گیا تو میں ڈائری تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ اب دینو اور خان رحیمی جلد از جلد سلیم کو میرے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کریں گے اور وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد میرے پاؤں میں ایک بار پھر وہی زنجیر پڑ جائے گی جس نے ازدواجی رشتے کے نام پر چھ ماہ مجھے سلیم کے گھر میں پابند رکھا تھا.......... سلیم کے یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے پھر گم ہو جانا چاہئے تھا۔ میں نے اپنے لباس میں چھپے ہوئے تیز دھار آلے کو چھوا۔ وہ اب جیسے میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے سوچا کیا میں اس آلے کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھنے کا مقصد پورا کر سکتی ہوں۔ کیا میری ایک دیوانہ وار کوشش مجھے تمام رکاوٹیں عبور کرا کے وہاب چنگیزی تک پہنچا سکتی ہے! دل کا جواب تھا "ہاں" ذہن کا جواب تھا "نہیں" اس ہاں اور نہیں کے درمیان بہت سی سوچیں تھیں' بے حد و شمار اور عجیب و غریب خیال تھے۔

جب سپیدہ سحر نمودار ہوا اور دور سندری گاؤں کی کسی مسجد سے "الصلوۃ خیر من النوم" کی صدا بلند ہوئی تو میں بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وضو کر کے نماز ادا کی۔ یہ بہت طویل نماز تھی۔ شاید میں دو ڈھائی گھنٹے تک مصلے پر رہی۔ مصلے سے اٹھی تو دل کا بوجھ کچھ ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ شبنم آلود درختوں کو چھو کر آنے والی ہوا میری جلتی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے آنٹی صادقہ کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ کتنا آسودہ اور مہربان چہرہ تھا وہ' یہ وہی آسودگی تھی جو

کسی نیک مقصد کے لئے زندگی قربان کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں وہی بات مان لوں جو آنٹی صادقہ نے کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اور جو کچھ وہاب نے کیا ہے سب کچھ کھول کر بیان کر دوں۔ اس کے بعد سب کچھ بھول جاؤں اور یقین کر لوں کہ سچائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ وہ اپنا آپ منوا کر رہتی ہے۔ جواب میں میں نے کہا تھا' آنٹی صادقہ' اس دور میں سچائی ناکام بھی ہوتی ہے' رسوا بھی ہوتی ہے اور اسے بناوٹ کے اصولوں سے چھپایا بھی جاتا ہے.........."

آنٹی صادقہ نے صحیح کہا تھا یا میں نے؟ کس نے صحیح کہا تھا؟ میں سر تھام کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ کس نے صحیح کہا تھا' کس نے غلط کہا تھا؟

دل کی گہرائیوں سے آواز آئی' تم نے صحیح کہا تھا' کیونکہ تم ایک ماں ہو اور ماں کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا "ہاں میں نے صحیح کہا تھا۔" میں نے ہم کلامی کے انداز میں کہا "صداقت کی فتح دیکھنے کے لئے عمر خضر چاہئے' دنیا بہت عیار ہو چکی ہے۔ سچائی کو زیر کرنے کے ہزار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ سچائی کو بیچ چوراہے کے لٹا کر ذبح نہ بھی کیا جا سکے تو اسے زندہ درگور ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سر پر جبر کی آہنی ٹوپی پہنا کر اس کو محدود اور مجبور کر کے سامان عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ "میرے سینے کے اندر آگ کا گھومتا ہوا اور پھنکارتا ہوا گولہ نیلگوں ہونے لگا.......... فرحان کی چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ کوئی آواز پکار پکار کر کہنے لگی "ثناء! قانون تجھے کیا دے سکتا ہے' کیا تم نے اور تمہارے خیر خواہوں نے قانون کے تقاضے پورے نہیں کئے تھے' وہاب کی سیاہ کاریوں کے کھلے ثبوت فراہم نہیں کئے تھے پھر بھی وہ بچ نکلا۔ وہ مکار شخص ہر بار بچ نکلے گا۔ ہر بار تمہاری ممتا ناکام ہو گی.........." یہی وہ لمحے تھے جب میں نے فیصلہ کیا کہ میں چنگیزی تک پہنچنے کی ایک اور کوشش کروں گی۔

خان رحیمی کی منشاء کے بغیر کسی مہمان کا اس ڈیرے سے نکل جانا آسان نہیں تھا' لیکن میں ایسا کر سکتی تھی' مجھے یہاں کے معمولات کا علم تھا اور پتہ تھا کہ نگران آنکھوں کو کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ ابھی اندھیرے پر اجالے کو غلبہ نہیں ہوا تھا کہ میں کمرے سے

نکلی اور خاموشی کے ساتھ اس ٹرک کے پچھلے حصے میں جا بیٹھی جو علی الصبح دودھ لے کر جھنگ شہر جاتا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچی تھی۔ ٹرک میں دودھ کے برتن رکھے جا چکے تھے اور وہ جانے کے لئے تیار تھا۔ مجھے دودھ کے برتنوں کے درمیان بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ٹرک اپنی جگہ سے حرکت میں آگیا' سڑک کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ جھنگ پہنچتے پہنچتے ہمیں قریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا اور سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ گو ابھی اتنا رش نہیں ہوا تھا' ٹرک ایک ٹریفک سگنل پر رکا تو میں بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ میرا سب سے بڑا سہارا چادر تھی جو میں نے اس طرح سر پر لے رکھی تھی کہ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔

جھنگ سے میں ایک دوسری بس میں بیٹھی اور بڑی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ بس نے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد مجھے اس موڑ پر اتار دیا جہاں سے ایک نیم پختہ راستہ میرے سابقہ سسرال کی طرف جاتا تھا۔ میں یہاں سے تانگے پر بیٹھ سکتی تھی لیکن پیدل ہی روانہ ہو گئی۔ چاروں طرف گندم کا سونا بکھرا تھا۔ کہیں کہیں اگیتی کاشت والی فصل کٹنا شروع ہو گئی تھی۔ میں کبھی پگڈنڈیوں پر اور کبھی کھیتوں میں چلتی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ شہر میں کوئی عورت اس طرح اکیلی جا رہی ہو تو سینکڑوں تفتیشی نگاہیں اس کی جانب اٹھتی ہیں لیکن دیہات میں بات اور ہوتی ہے......... بڑی حویلی کے مضافات میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ یہاں ترقیاتی کام تیزی سے ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ پکے کھال بن رہے تھے۔ سڑکوں کے لئے مٹی ڈالی جا رہی تھی اور بجلی کے کھمبے لگ رہے تھے۔ ایک جگہ میں نے ایک بڑا سا بورڈ لگا دیکھا' جس پر لکھا تھا "تعمیر سڑک جات' زیر سرپرستی جناب عزت ماب وہاب علی چنگیزی۔"

اس کا مطلب تھا یہ سب کچھ وہاب علی کروا رہا ہے۔ وہ الیکشن ہار گیا تھا تو کیا' سادہ لوح لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لئے اس کے پاس بہت کالا دھن تھا......... بڑی حویلی ابھی مجھ سے چار پانچ میل دور تھی۔ جوں جوں یہ فاصلہ کم ہو رہا تھا دل کی دھڑکنوں میں شدت آ رہی تھی۔ جونہی میں ایک کھیت سے نکل کر ایک کچے راستے پر آئی سامنے سے رنگین پگڑیوں والے چند لاٹھی بردار آتے دکھائی دیئے۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ وہاب چنگیزی کے پالتو غنڈے ہیں۔ میں تیزی سے چند قدم

چل کر راستے سے ہٹ گئی۔ قرب و جوار میں چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ ایک طرف سیوریج میں استعمال ہونے والے سیمنٹ کے پائپوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا تھا۔ میں اس ڈھیر کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ اردگرد کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ مٹی اور ریت کی دو بڑی بڑی ڈھیریوں کے درمیان ایک خیمہ لگا تھا۔ مجھے پائپوں کی اوٹ میں پناہ لئے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے عین پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تین چار فٹ کے فاصلے پر موٹی توند والا ایک سیاہ رنگ شخص کھڑا تھا۔ وہ شلوار قمیض میں تھا۔ سر پر گلابی رنگ کا تولیہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہ شخص سڑک کا ٹھیکیدار تھا۔ اس کے ساتھ ایک بابو نما شخص تھا۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ پاؤں سے لنگڑا تھا' ٹھیکیدار نے آگے بڑھ کر بے باکی سے میری گردن پکڑ لی۔

"کیا کر رہی ہے یہاں......... چوری کرنے آئی ہے؟"

لنگڑا بولا۔ "شکل سے تو چور نہیں لگتی' شاید کسی سے چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "چور کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا' میں اچھی طرح جانتا ہوں ایسی عورتوں کو۔"

اس نے مجھے کلائی سے تھاما اور کھینچتا ہوا اپنے خیمے کی طرف لے چلا۔ میں بلند آواز میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رنگ دار پگڑیوں والے آس پاس ہی تھے۔ میری خاموشی اور کمزور مزاحمت نے اسے زیادہ دلیر کر دیا اور وہ گھسیٹ کر مجھے خیمے میں لے گیا۔

لنگڑے نے خیمے کے پردے کو اندر سے ڈوری باندھ دی اور ٹھیکیدار نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر اپنا چہرہ میرے نزدیک کیا اور غرا کر بولا "ہاں بول کس نیت سے آئی تھی یہاں۔" اس کی آنکھوں میں ہوسناک سی چمک تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی لنگڑا بولا "ٹھہرو......... ٹھہرو میاں صاحب ٹھہرو......... مجھے شک ہو رہا ہے۔"

"کیا شک؟"

ٹھیکیدار کی گرفت میرے بالوں پر ڈھیلی ہو گئی۔

"کہیں یہ وہی تو نہیں......... میرا مطلب ہے بڑی حویلی والی......... جس کا نام اخباروں میں آ رہا ہے.........؟"

یکایک ٹھیکیدار کی آنکھوں میں تیز چمک نظر آئی' اس نے سرتاپا مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور بولا "یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

لنگڑے نے کہا "ہو نہیں سکتا جی......... ہے۔ میں نے ایک دفعہ اخبار میں تصویر بھی دیکھی تھی' مجھے تو اسی کی لگتی تھی۔ بڑی خطرناک عورت ہے جی۔ اس کی تلاشی لینی چاہئے فوراً۔"

اس کے ساتھ لنگڑے نے لپک کر عقب سے میرے دونوں بازو دبوچ لئے۔

ٹھیکیدار میری طرف بڑھا لیکن پھر ارادہ بدل کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ خیمے سے کچھ دور جا کر اس نے کسی کو "اوئے کاکا......... اوئے کاکا" کہہ کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھ سات سالہ لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر پہلے گندم کے کھیت میں داخل ہوتے وقت میں نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ وہ ایک جوہڑ کے کنارے گھاس پر بیٹھا تھا اور اس کے گرد چار پانچ گدھے چر رہے تھے۔ اب اس لڑکے کو میری تلاشی کے لئے یہاں بلایا گیا تھا۔ غالباً میرا "احترام" سابقہ جاگیردارنی ہونے کی وجہ سے کیا جا رہا تھا۔ ٹھیکیدار کی ہدایات کے مطابق لڑکے نے میری تلاشی لی اور لباس کے اندر سے وہ تیز دھار آلہ برآمد کر لیا جو میرے پاس وہاب چنگیزی کی امانت تھا۔ اس آلے کو دیکھتے ہی ٹھیکیدار امام دین اور لنگڑا رزاق معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹیں تھیں۔ بچہ واپس چلا گیا تو ٹھیکیدار زہرخند لہجے میں بولا۔

"بڑی رستم کی بیٹی بنتی ہے' لباس میں استرے چھپا چھپا کر پھرتی ہے' چنگیزی صاحب کو مارنا چاہتی ہے؟"

میں خاموش رہی' گم صم اور بے حس و حرکت۔ لنگڑا بولا "میاں صاحب' میرا خیال ہے فوراً نواز صاحب کو اطلاع دینی چاہئے وہ فوراً شناخت کر لیں گے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "جاؤ یہیں بلا کر لے آؤ۔"

لنگڑا ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا باہر نکل گیا۔ لنگڑے نے مجھے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن میں کئی بار دیکھ چکی تھی۔ یہ بدبخت اس سے پہلے چودھری شہاب کا کارندہ تھا۔

منشی کا کام کرتا تھا اور اس کے علاوہ الیکشن کے لئے بڑے دھواں دھار قسم کے پوسٹر لکھتا تھا۔ مثلاً "یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی" "باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم" "جیت ہماری ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ قابل فروخت گھوڑا وہاب چنگیزی کے تھان پر بندھا ہوا تھا۔ دولت کی جھلک دیکھ کر وفاداریاں بدلنے والے ایسے ابن الوقت لوگوں کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں۔ اس سے پہلے ایک ایسے ہی غدار کے فریب میں آ کر میں ایک غلط گاڑی میں سوار ہو گئی تھی اور نتیجے میں مجھے بازار حسن کی دیواروں کا اسیر ہونا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا وہاب چنگیزی دولت پانی کی طرح بہا رہا ہے اور اس دولت کی طاقت سے وہ سب دوستوں دشمنوں کی وفاداریاں خریدتا چلا جا رہا ہے......... وہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا تھا لیکن وہ کتنا بھی مقبول اور ہر دلعزیز ہو جاتا' اس کی اڑان کتنی بھی اونچی ہو جاتی' میں جانتی تھی وہ کیا ہے' اور اس کا شمار کس درجے کے انسانوں میں ہونا چاہئے۔

ٹھیکیدار اب کافی مطمئن نظر آتا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ میرے ساتھ فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت اور تضحیک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھنکار کر بولا۔

"تو ہے کیا چیز جو چنگیزی صاحب سے ٹکر لینے نکل کھڑی ہوئی ہے! کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو! میری طرف دیکھ۔ میں چنگیزی صاحب کے نوکروں کا نوکر ہوں۔ میں ایک آواز دوں تو دو درجن آدمی میری خاطر لڑنے مرنے کے لئے یہاں آ سکتے ہیں۔ اسلحے کی چھاؤں کر سکتے ہیں میرے اوپر......... تیرے ساتھ کون ہے؟ میرا تو خیال ہے پھانسی کے بعد تیری لاش لینے بھی کوئی نہیں آئے گا........."

ٹھیکیدار کا خیال تھا کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دوں گی' وہ جلتی ہوئی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری خاموشی نہیں ٹوٹی تو وہ ایک بار پھر زہریلے انداز میں مسکرانے لگا۔ استرے کو ہاتھوں میں الٹ پلٹ کرتا ہوا بولا۔

"استرے لئے پھرتی ہے' آفت کی پرکالی بنتی ہے' بڑا زور ہے تیری بانہوں میں؟ بڑی پھرتیلی ہے تو؟ یہ لے......... یہ پڑا ہے استرا چلا میرے اوپر......... میں دیکھوں کتنی جیالی ہے۔"

اس نے استرا میرے پاؤں کے سامنے پھینک دیا۔ جتنا فاصلہ استرے سے میرا تھا اتنا ہی اس کا تھا۔ دیکھنے میں ٹھیکیدار فربہ اندام تھا لیکن وہ کاہل الوجود نہیں تھا۔ اس کا اعتماد گواہی دے رہا تھا کہ وہ میرے نیچے جھکنے سے پہلے استرے کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے۔ میری نگاہیں استرے پر تھیں اور ٹھیکیدار بھی اسی نقطے پر دیکھ رہا تھا۔ میں بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ آخر میں نے ہمت کی اور ایک دم استرے پر جھپٹی۔ ٹھیکیدار نے کرسی پر آگے کو کھسک کر ٹانگ گھمائی اور استرا میرے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی دور جا گرا۔ ٹھیکیدار کا بھرپور تھپڑ میرے گال پر پڑا اور میں اچھل کر خیمے کے دروازے کے پاس گری۔ اس سنگدل نے ایک زوردار ٹھوکر میری پسلیوں پر ماری۔ یہاں پہلے بھی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ شاید وہ خبیث مجھے اور بھی پیٹتا لیکن اسی وقت خیمے کا پردہ اٹھا اور لنگڑے رزاق کی صورت نظر آئی۔ اس کے پیچھے کوئی اور شخص بھی تھا۔ میں ہونٹوں سے خون پونچھتی اور کراہتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک پہلو مٹی میں لتھڑ گیا تھا۔ حالت اتنی دگرگوں تھی کہ خود مجھے بھی اپنے اوپر ترس آرہا تھا۔ لنگڑے رزاق کے پیچھے جو شخص داخل ہوا اس کی صورت دیکھ کر میں چونک گئی......... وہ رب نواز تھا۔ وہاب چنگیزی کا ملازم خاص۔ یہی شخص تھا جس نے کم از کم دو مرتبہ مجھے نہایت سنگین صورت حال سے بچایا تھا۔ ایک دفعہ اس نے عابد کی موت کے بعد مجھے سرکنڈوں میں دیکھ کر نظرانداز کر دیا تھا اور دوسری دفعہ مجھے پہچاننے کے باوجود میرے لئے باغ والے ڈیرے میں گھسنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ڈیرے میں لڑائی شروع ہونے کے بعد جس شخص نے میری طرف بھرا ہوا پستول پھینکا تھا وہ بھی رب نواز ہی تھا۔ آج ایک بار پھر میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے پہچانتے ہی اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ٹھیکیدار امام دین نے لنگڑے رزاق کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اب وہ خیمے کے وسط میں کھڑا کبھی مجھے اور کبھی رب نواز کو دیکھ رہا تھا۔ رب نواز کو دیکھ کر وہ کچھ مودب سا ہو گیا تھا۔ خوشامدی لہجے میں کہنے لگا۔

"نواز صاحب! پہچانو جی اس عورت کو' کون ہے یہ؟"

رب نواز کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ اسے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے میں بلا کی مہارت حاصل تھی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔

"کون ہے؟"

ٹھیکیدار اور رزاق کے چہرے بجھ سے گئے' رزاق نے آگے بڑھ کر کہا "نواز صاحب' ذرا غور سے دیکھیں' مجھے شک پڑ رہا تھا........."

"نہیں......... نہیں' وہ نہیں ہے یہ" رب نواز نے بیزاری سے لنگڑے رزاق کی بات کاٹی "کہاں سے پکڑا ہے اسے؟"

ٹھیکیدار نے کہا "یہ ان سامنے والے پاپوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑوں سے وہ استرا بھی نکلا ہے۔"

"خود کیا کہتی ہے؟"

"خود تو بولی ہی نہیں جی"

"کیا بات ہے گونگی ہو؟" رب نواز نے کڑک کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے گونگے پن میں ہی عافیت جانی۔ رب نواز نے کہا "مجھے تو کوئی سڑی لگتی ہے......... دفع کرو اس کو' پتہ نہیں کون ہے۔ شاید بابے مستان کے مزار سے آئی ہے۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بابے مستان کے مزار سے آئی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا "جوان جہان ہو' ایسے گھومو گی تو اچھا نہیں ہو گا' دنیا پاگلوں سے بھری ہوئی ہے اور کوئی پاگل دوسرے پاگل کو رعایت نہیں دیتا۔ جاؤ شاواش........." اس نے مجھے دھکیل کر خیمے کے در سے باہر نکال دیا۔

میں خیمے سے نکلی' درد سے کراہتی ہوئی درختوں کی طرف چل دی۔ اٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ پسلیوں میں درد کا خنجر اتر جاتا تھا۔ بدبخت نے بڑی بے دردی سے ٹھوکر ماری تھی۔ درد کا تقاضا تھا کہ رک جاؤں' لیکن رکنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس جگہ سے جتنی دور چلی جاتی بہتر تھا۔ کوئی چار فرلانگ آگے آ کر میری ہمت جواب دے گئی اور میں ایک کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ خیمے میں میرے تیز دھار ہتھیار اور میری نقدی کے ساتھ ساتھ جوتی بھی چھن گئی تھی۔ میں ننگے پاؤں یہاں تک آئی تھی۔ تلوؤں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے شاخوں سے جھانکتے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ خشک لبوں پر فریاد مچل گئی۔ "اے مالک' ایک ماں سے اور کتنا امتحان مقصود ہے تجھے؟ ۔رے سینے میں آگ جل

رہی ہے میرے مالک.......... مجھے موت دے یا اس آتشیں گولے کو سینے سے نکال دے جس نے مجھ پر ہر گھڑی قیامت کر رکھی ہے.......... میں درد کے اس سمندر میں تنہا رہ گئی ہوں مالک' تو میری مدد کر.........."

خشک ویران آنکھوں میں انگارے سے دھرے گئے۔ میں نے گھٹنوں میں سر دیا اور درد کی لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اچانک کسی نے نہایت نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا خان رحیمی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے تاسف اور ہمدردی کے جذبات تھے۔ اس کے پیچھے دینو کھڑا رو رہا تھا۔ خان رحیمی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور آہستگی سے بولا۔

"دیکھ لیا نا اپنی جلد بازی کا نقصان' جو لوگ اپنے بزرگوں کی باتوں کو رد کرتے ہیں ان کو ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے.........." میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ خان رحیمی نے عجیب مشفق انداز میں اپنے بازو سے میری پشت کو سہارا دیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا درختوں کی طرف بڑھا۔ وہاں اس کی ٹویوٹا جیپ کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیپ کو درختوں میں چھپا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ خان رحیمی کے سہارے میں جیپ میں چڑھی تو پتہ چلا کہ پچھلی نشستوں پر چھ مسلح افراد دم سادھے بیٹھے ہیں۔ یہ وہاب چنگیزی کا علاقہ تھا اور خان رحیمی کا یہاں چلا آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میرے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ ہوئی اور کچے پکے راستے پر آگے بڑھنے لگی۔

جس وقت میں خان رحیمی کی کوٹھی میں داخل ہوئی شام کے چھ بج چکے تھے۔ راستے میں خان رحیمی نے مجھے ایک میڈیکل اسٹور سے درد کی دوا لے دی تھی۔ دو گولیاں کھا کر میری پسلیوں کو کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً اس دوا میں ایک خواب آور گولی بھی شامل تھی۔ میرا سر شدت سے چکرا رہا تھا۔ میں سو جانا چاہتی تھی۔ میرا ارادہ بھانپتے ہوئے خان رحیمی مجھے سیدھا میرے کمرے میں لے گیا۔ اندر گھستے ہی میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ خان رحیمی نے پنکھا چلا دیا اور مدھم روشنی کا بلب جلا کر کمرے سے نکل گیا۔ جلد ہی میں نیند کی آغوش میں چلی گئی.......... میں نے ایک خواب دیکھا' کسی کی نرم انگلیاں میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ یہ سلیم تھا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھا تھا اور اس

کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس نے میرا سر اٹھا کر بڑی محبت سے اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ثناء!" کہیں دور اس کی آواز آئی "جانتی ہو' میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا ہوں۔"

"مجھے مت ڈھونڈا کرو سلیم' جس تلاش کا حاصل تلاش ہو' اسے ختم کر دینا چاہئے۔" وہ کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح نظر آنے لگا۔ ناراض لہجے میں بولا۔

"ایسی باتیں کر کے مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہو' کیا یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنا راستہ الگ کر لوں!"

میں نے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھام لیا "نہیں سلیم' میرے بس میں ہو تو اس کائنات کی آخری حد تک تمہارا ہاتھ تھام کر چلوں' مگر یہی میری قسمت میں نہیں' لگتا ہے بہت جلد میری مسافت ختم ہو جائے گی اور تم اس راستے میں تنہا رہ جاؤ گے' میں تمہیں اس تنہائی کے لئے تیار کرنا چاہتی ہوں.......... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے جبڑے بھینچ لئے۔ اس کی سرخ آنکھ سے جدا ہونے والا ایک آنسو خود رو داڑھی میں رینگتا ہوا میرے رخسار پر گرا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ سلیم سچ مچ میرے سرہانے بیٹھا ہے اور اس کی انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی ہیں۔ یہ احساس اس قدر سنسنی خیز تھا کہ لمحوں میں نشہ آور دوا کا اثر جاتا رہا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سلیم.......... سلیم یہ تم ہو!" میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور خان رحیمی اندر آ گیا۔ میں نے اپنے لرزاں ہاتھ سلیم کے شانوں سے ہٹا لئے۔ ہم دونوں کے تاثرات دیکھ کر خان رحیمی نے اپنی تمام تر توجہ نیا سگار سلگانے پر مرکوز کر دی اور اعلان کرنے والے لہجے میں بولا۔

"آپ دونوں کے لئے ایک نہایت اہم نیوز ہے۔"

میں اور سلیم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ خان رحیمی نے کہا

"چودھری شہاب اور اس کا چچا حکم دین تم سے ملنے آئے ہیں۔"

چودھری شہاب کا نام سن کر میں چونکی۔ ایک عرصہ ہوا اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ چودھری شہاب کے ساتھ اس کا چچا حکم دین بھی تھا۔ حکم دین نے کچھ ہی عرصہ پہلے

وہاب چنگیزی کے خلاف الیکشن جیتا تھا۔ وہ اب علاقے کا منتخب نمائندہ تھا چوہدری شہاب کے ساتھ حکم دین کا یہاں آنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا۔

سلیم نے پوچھا "وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

خان رحیمی بولا "یہ تو تمہیں وہی بتا سکتے ہیں۔"

سلیم سوچ میں پڑ گیا۔ خان رحیمی نے کہا "میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں تم جلدی آجاؤ۔"

خان رحیمی باہر نکل گیا تو سلیم عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت سوال مچل رہے تھے۔ سوال تو میرے پاس بھی بہت تھے لیکن یہ وقت سوال جواب کا نہیں تھا۔ میں صرف اتنا کہہ سکی۔

"سلیم! تم کب آئے ہو؟"

وہ بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ تم نیند میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ تمہیں جگانے کے لئے میں تمہارے سرہانے بیٹھ گیا۔"

سلیم کے دائیں ہاتھ پر چند دن پرانا زخم تھا۔ غالباً یہ زخم پاوندہ قبیلے سے ہونے والی لڑائی کی نشانی تھا۔ میں اس زخم کے بارے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ باہر سے دینو پکار کر بولا۔

"استاد جی! اب آ بھی جاؤ۔ خان صاحب واج تے واج مار ی جاندے نیں۔"

میں نے کہا "سلیم! تم چلے جاؤ۔"

وہ بولا "انہوں نے ہم دونوں کو بلایا ہے۔"

سلیم کے اصرار پر میں اپنی جگہ سے اٹھی تو دائیں پہلو سے زبردست ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ تاہم اپنی یہ تکلیف میں نے سلیم پر ظاہر نہیں ہونے دی اور چادر اوڑھ کر سلیم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ چودھری شہاب اور چودھری حکم دین اپنے میزبان خان رحیمی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ چودھری شہاب نے اٹھ کر سلیم سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں کو شادی کی مبارکباد دی۔ چودھری حکم دین نے بھی سلیم سے ہاتھ ملایا۔ چودھری شہاب کی نگاہیں ایک ساعت کے لئے میری نگاہوں سے ٹکرائیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کے بعد جتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہم سے خفا تھا۔ اس کے دل میں میرے اور سلیم کے لئے بے پناہ ہمدردی تھی اور

یہ ہمدردی ہی تھی جو اسے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔

چودھری حکم دین نے پدرانہ شفقت سے کہا "بیٹی! میں جانتا ہوں تم اس وقت کیسے حالات سے گزر رہی ہو۔ تیرا دکھ ہم سے چھپا ہوا نہیں۔ تیرا مجرم بھی ہمارے سامنے ہے اور یہی زیادہ تکلیف کی بات ہے کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن یہ مجبوری وقتی ہے۔ بیری کا درخت زیادہ دیر ہرا نہیں رہتا۔ بڑی جلدی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اس وقت جو بات کہنے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ چنگیزی کی طرف سے تم دونوں کو خطرہ ہے۔ تلاش تو وہ تمہیں پہلے بھی کر رہا تھا لیکن اب اس نے زیادہ سرگرمی دکھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پرسوں ڈی سی کے آفس میں علاقے کے انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کا ایک اجلاس ہوا ہے۔ مجھے اپنے ذریعے سے پتہ چلا ہے کہ اس میٹنگ کا سب سے اہم مقصد تم دونوں کی گرفتاری کے لئے منصوبہ بندی کرنا تھا۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو گے؟"

سلیم نے اثبات میں سرہلا دیا۔ چوہدری حکم دین نے حقہ گڑگڑا کر کہا۔

"پرسوں ہفتہ ہے۔ تمہاری گرفتاری کے لئے یہ نئی مہم پرسوں سے شروع ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد یہ علاقہ چھوڑ دو۔ خان رحیمی صاحب مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس وقت تمہارے لئے آزاد علاقے میں چلے جانا بہتر ہے۔ لیکن یہ مت سمجھ لینا وہاں تم بالکل محفوظ ہو جاؤ گے۔ چنگیزی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کے مخبر بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ دور تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہ ایک ضمنی الیکشن لڑ کر اسمبلی میں بھی پہنچ رہا ہے۔ یوں اس کا اثر و رسوخ مزید بڑھ جائے گا.......... دیکھو سلیم پتر' تم ہمارے گروپ کے آدمی ہو۔ تمہارا بھلا سوچنا میرا فرض ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ تم دونوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ ایک دو سال کے لئے ملک سے باہر چلے جاؤ۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں باہر بھیجنے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ فرضی ناموں سے تمہارے پاسپورٹ بن جائیں گے۔ نواز حسنی صاحب اپنے ہی آدمی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری بہت مدد کر سکتے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں پاکستان چھوڑنے میں کوئی دشواری پیش آئے گی.......... کیا خیال ہے تمہارا؟"

سلیم گہری سوچ میں تھا۔ میں نے خان رحیمی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی حکم دین کی رائے کو درست سمجھتا ہے۔ سلیم نے کہا۔

"چاچا جی! آپ ہمارے بڑے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارا برا نہیں سوچیں گے لیکن............؟"

حکم دین نے کہا۔ "پتر جی......... میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ یہ مت خیال کرو کہ تم بزدلی دکھا کر بھاگ رہے ہو۔ یہ تو بس ایک چال ہے۔ ابھی ہماری لڑائی جاری ہے۔ لڑائی لڑتے ہوئے کبھی سپاہی کو پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ کبھی سرنگ میں بھی چھپنا ہوتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ پیچھے ہٹنے والا یا سرنگ میں چھپنے والا سپاہی بزدل ہے۔"

خان رحیمی نے کہا "حکم دین صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ سلیم تم لوگ ایک دو سال ملک سے باہر گزار آؤ۔ آئی ایم شوئر۔ اتنے عرصے میں چنگیزیوں کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ جونہی حالات بہتر ہوئے ہم تمہیں واپس بلالیں گے۔"

سلیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً میرے چہرے پر اسے کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ اس نے نیم رضامندی کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے چاچا جی۔ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔"

حکم دین نے کہا "ضرور سوچو پتر جی......... پر صبح تک فیصلہ کرلو۔ اچھا سپاہی وہی ہوتا ہے جو دشمن کے وار سے پہلے اس کی نیت پالے۔ ہم آج رات یہیں ہیں۔ صبح تمہارا فیصلہ جان کر ہی جائیں گے.........؟"

چودھری شہاب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ثناء؟"

میں نے کہا "میرا خیال سلیم سے جدا نہیں ہوگا۔" چودھری حکم دین نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "دھی رانی! تم خود بھی سیانی ہو۔ ہربات سمجھتی ہو۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔ مجھے پکا یقین ہے تمہاری رائے ہم سے وکھری نہیں ہوگی۔"

.... اس رات میں اور سلیم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ چاند کی کرنیں کمرے کے روزن سے چھن چھن کر اندر آرہی تھیں۔ چیزوں کے سائے پراسرار تھے۔ اس

ماحول میں میری اور سلیم کی سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔ سلیم کا خیال بھی یہی تھا کہ ہمیں اپنے بڑوں اور خیر خواہوں کی بات مان لینی چاہئے۔ تاہم وہ مجھ پر زور نہیں دے رہا تھا۔ اس نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر میں چنگیزی سے ٹکرانا چاہتی ہوں تو وہ دل و جان سے میرے ساتھ ہے اور آخری سانس تک پیچھے نہیں ہٹے گا۔

سوچوں کی یلغار سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ حالات نے مجھے فیصلے کی صلیب پر چڑھا دیا تھا......... میں اب کوئی نادان لڑکی نہیں تھی۔ ان دو برسوں میں میں نے زمانے کا بہت سرد گرم دیکھ لیا تھا۔ مجھے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ اپنے بچے کے انتقام تک پہنچنے کے لئے مجھے جوش کے علاوہ ہوش سے کام لینا ہوگا۔ ٹریفک کے حوالے سے سڑکوں پر لکھا ہوا ایک فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا "کبھی نہ پہنچنے سے دیر سے پہنچنا بہتر ہے۔" میرے حالات اسی فقرے کے مصداق تھے۔ میری منزل چنگیزی کی موت تھی اور میں ہر صورت اس منزل تک پہنچنا چاہتی تھی' کسی صورت ناکامی نہیں چاہتی تھی۔ آخر ایک جان لیوا ذہنی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ تاخیر کا عذاب برداشت کرلوں گی۔ کچھ اور راتیں دہکتے انگاروں پر گزار لوں گی لیکن اپنے مجرم کو اپنی جلد بازی کے سبب کوئی رعایت نہیں دوں گی۔ میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا ذہن ڈھیلا چھوڑ دیا' اپنی سوچوں کی طنابیں کھول دیں۔ سر گھٹنوں پر رکھا اور سلیم سے کہہ دیا کہ وہ خان رحیمی اور چودھری حکم دین کے مشورے پر عمل کر سکتا ہے۔

سلیم نے میری گردن کے گرد ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے کندھے سے لگا لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا "مجھے یقین تھا ثناء ہمارے اجڑے ہوئے گھر میں ایک دفعہ بہار ضرور آئے گی......... تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی لیکن یہ بہار تو ہوگی۔"

نصف رات کے بعد جب پوری کوٹھی نیند کی آغوش میں تھی۔ سلیم بھی مہمان خانے میں جا کر سو چکا تھا' میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور خان رحیمی کے نام ایک مختصر تحریر لکھی۔ اس تحریر میں میں نے پہلی دفعہ خان رحیمی کو انکل کہہ کر مخاطب کیا اور لکھا کہ "انکل آپ معلوم نہیں مجھے کیا سمجھتے ہیں لیکن میں وہی سمجھتی ہوں جو میں نے اوپر آپ کے نام کے ساتھ لکھ دیا ہے۔"

اس خط میں مَیں نے خان رحیمی سے ایک چھوٹی سی درخواست کی۔ یہ درخواست

مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنی ڈائری نکالی اور اپنے دل کا بوجھ قلم کے سہارے کاغذ پر بکھیرنے لگی۔ ڈیپریشن کے لمحوں میں لکھنا میرے لئے ہمیشہ سکون بخش ثابت ہوا ہے۔ میں نے صبح صادق تک ڈائری کے بے شمار صفحے بھر دیئے' اپنی پوری داستان ان صفحوں پر بکھیر دی۔

رات کے تاریک بطن سے اجالے کی اولین جھلک نمودار ہونے والی ہے۔ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ کمرے کی کھلی کھڑکیوں سے خنک ہوا کے جھونکے داخل ہو رہے ہیں۔ میرا قلم کاغذ پر چلتا جا رہا ہے۔ مجھے کل سلیم کے ساتھ پھر ایک ان چاہے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے بار بار وعدہ کر رہی ہوں۔ میرے بچے مایوس نہ ہونا۔ میں تیرے لئے انصاف ضرور حاصل کروں گی۔ جب تک انصاف حاصل نہیں کر لوں گی تیرے پاس نہیں آؤں گی۔ میرا راستہ دشوار ضرور ہے لیکن میں اسے طے کروں گی۔ آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنا پڑا تو بھی گزروں گی۔ بس تھوڑا انتظار کر.......... تھوڑا اور انتظار۔ تیری ماں نے ہمت نہیں ہاری ہے میرے لال.......... بس ذرا دم لینے کے لئے رک گئی ہے۔ شکر دوپہر میں کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے پاؤں کے کانٹے نکالنے لگی ہے۔ وہ پھر چلے گی۔ وہ پھر روانہ ہوگی۔ اس کی منزل چنگیزی کی گردن ہے۔ وہ اس گردن تک ہر صورت پہنچے گی۔ دنیا کی ساری طاقتیں اور سازشیوں کی ساری سازشیں مل کر بھی اسے اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ میرے بچے تیرا سارا درد' تیری ساری تڑپ تیری ماں کے وجود میں منتقل ہو چکی ہے۔ اب اس وجود کو قرار کہاں آ سکتا ہے۔ یہ عارضی قرار ہے' آخری قرار نہیں ہے۔ اس عارضی قرار کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ شاید دو سال.......... شاید تین سال۔ شاید اس سے بھی تھوڑی.......... بہت تھوڑی۔ ممکن ہے اس قرار کی عمر ایک دو دن سے زیادہ نہ ہو۔ مجھے کچھ پتہ نہیں میں کیا کروں گی۔ کبھی کبھی ایک دھند دماغ پر چھا جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ اس دھند سے نبھا کر سکوں۔ اس دھند کو اپنے ذہن سے جھٹک سکوں۔ یہ دھند مجھے اچھی لگتی ہے لیکن کبھی کبھی اس سے خوف بھی آتا ہے۔ اپنی ناکامی کا خوف۔ اے رب العزت مجھے ناکامی سے بچانا۔ مجھے اپنے بیٹے کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔ مجھے سرخرو کرنا اے رب العالمین۔ میری تمام [illegible] صدقے اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے سرخرو

کرنا.........."

قارئین کرام ثناء محمود کی کہانی اس کی اپنی زبانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بتانے کے لئے میں یعنی اس کہانی کا راوی طاہر جاوید حاضر ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ چند آخری واقعات ناقابل یقین محسوس ہوں لیکن ہمیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ ثناء محمود ایک ماں تھی۔ ایک ایسے شیر خوار کی ماں جس نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا اور لفظ لفظ بولنا سیکھا تھا ایسے کمسن مقتول ماؤں کو زندہ درگور کر جاتے ہیں۔ پھر وہ ماں انسان ہو یا حیوان اس کی وحشتوں کا کنارہ نہیں رہتا۔

یہ چند واقعات بتانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں اور یہ بتا دوں کہ یہ کہانی مجھ تک کیسے پہنچی۔ اس کہانی کا اصل ماخذ ثناء محمود کی اپنی ڈائری ہے' اس کے علاوہ خان رحیمی اور سلیم نے بھی کچھ تاریک گوشوں سے پردہ اٹھایا۔ اس کہانی سے میرا بنیادی تعلق انڈر سیکرٹری نواز حسنی صاحب کے حوالے سے ہے۔ نواز حسنی صاحب کی بیٹی ارسہ کو دوسری بار اغوا کر کے غیر علاقے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس حادثے نے حسنی صاحب پر جو قیامتیں ڈھائیں ان کا ذکر بیان سے باہر ہے.......... نواز حسنی صاحب نے چونکہ مجرموں کے تمام مطالبات مان لئے تھے اس لئے اغوا کے تین ہفتے بعد نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ ارسہ کو حسنی صاحب کے پاس واپس پہنچا دیا گیا۔ وہ بالکل خیریت سے تھی۔ نواز حسنی صاحب کی ہدایت کے مطابق میں ارسہ کی رہائی کی اطلاع خان رحیمی کو دینے کے لئے جھنگ روانہ ہوا جس روز میں جھنگ پہنچا یہ وہی دن تھا جب ثناء محمود اپنے شوہر سلیم کے ساتھ آزاد علاقے میں جانے کے لئے کوٹھی سے روانہ ہوئی۔

وہ دونوں نہایت رازداری کے ساتھ کوٹھی سے نکلے۔ ثناء برقعے میں ملبوس تھی۔ سلیم نے پتلون قمیض پہن کر چہرے پر نظر کے چشمے کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ ایک پڑھا لکھا شخص دکھائی دیتا تھا۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش ہو گا۔ اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس کی امیدوں کی شاخ پر پھول کھلنے والے تھے۔ وہ ثناء کے ساتھ پھر اس پہاڑی مکان کا رخ کر رہا تھا جہاں ان دونوں نے شادی کے بعد چھ ماہ گزارے تھے۔ ان چھ مہینوں کی سنہری یادیں لمحہ لمحہ سلیم کے سینے میں محفوظ تھیں۔ خان رحیمی نے ان دونوں کے لئے

لاہور سے بائی ائر پشاور جانے کا انتظام کیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق سلیم' ثناء کے ساتھ خوشگوار موڈ میں لاہور پہنچا' وہاں سے وہ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوئے.......... ایک بجے فلائٹ جانا تھی۔ وہ دونوں ڈیپارچر لاؤنج کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جانب لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ لوگ ہار وغیرہ لئے کھڑے تھے۔ ثناء نے سلیم سے پوچھا یہ کیسا ہنگامہ ہے۔ سلیم نے بتایا کہ کوئی اہم شخصیت کراچی کی فلائٹ سے آنے والی ہے۔ قریباً دس پندرہ منٹ بعد لوگوں کا ہجوم زیادہ ہو گیا۔ اس دوارن سلیم اٹھ کر ٹوائیلٹ کی طرف چلا گیا۔ دفعتا اسے چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ ٹوائیلٹ سے باہر آیا تو ایک دہشت ناک منظر اس کے سامنے تھا۔ ایک نوجوان خون میں لت پت فرش پر پڑا تھا اور لوگ چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں زیادہ ہجوم کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ اور کیا ہو رہا ہے؟ سیکورٹی کے آدمی چلا چلا کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔ دفعتا سلیم کی نگاہ وہاب چنگیزی پر پڑی۔ وہ حواس باختہ سا ایک جانب کھڑا تھا۔ اس کے گرد اس کے کارندوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ پلک جھپکتے ہی ساری بات سلیم کی سمجھ میں آگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم لرز اٹھا۔ اس نے ثناء کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ کرسی خالی تھی جہاں وہ ثناء کو چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف وہ اٹیچی کیس پڑا تھا جو سلیم نے جاتے وقت ثناء کو تھمایا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر ثناء کو آوازیں دے لیکن پھر اسے اپنی حیثیت کا خیال آیا۔ وہ دیوانوں کی طرح لوگوں کے ہراساں ہجوم میں ثناء کو ڈھونڈنے لگا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں چنگیزیوں کا کوئی کارندہ اسے پہچان نہ لے۔ وہ سٹپٹایا ہوا باہر پارکنگ میں آگیا۔ ایک شخص اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ سلیم پہچان گیا' وہ چودھری شہاب کا کوئی کارندہ تھا۔ وہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں سلیم کے بدترین شبہات کی تصدیق کی۔ اس نے بتایا کہ ثناء نے وہاب چنگیزی پر حملہ کیا ہے۔ لوگ وہاب چنگیزی کو ہار ڈال رہے تھے اچانک ایک چیخ سنائی دی اور کوئی چنگیزی پر جھپٹا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد سلیم کو کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ چودھری شہاب کے آدمی کے ساتھ مل کر دو تین گھنٹے ثناء کو تلاش کرتا رہا پھر مایوس ہو کر نواز حسنی کی رہائش گاہ پر آگیا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ثناء ایک بار پھر اس سے

جدا ہو چکی ہے۔

چنگیزی پر قاتلانہ حملے کی خبر نے سنسنی پھیلا دی۔ اخباروں میں پھر اس کیس کا چرچا ہو گیا۔ بھگڈر میں کوئی بھی حملہ آور عورت کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا' تاہم زیادہ کا خیال تھا کہ وہ مفرور مجرمہ ثناء محمود ہی ہے۔ اس کا بچ کر نکل جانا بھی اپنی جگہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا۔ ایک اخبار نے چنگیزیوں کے حوالے سے لکھا "ملزمہ اپنا ذہنی توازن مکمل طور پر کھو چکی ہے۔ اس تازہ واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس سے پہلے ملزمہ نے اپنے بچے کا خون بھی پاگل پن کے دورے میں کیا تھا۔"

ثناء پاگل تھی یا ہوشمند کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یقینی بات صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ چنگیزی پر ہونے والے قاتلانہ حملے نے بڑی حویلی کے جاگیرداروں میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ ائرپورٹ والے واقعے کے صرف تین دن بعد ایک اور چونکا دینے والا واقعہ رونما ہوا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ کوئی شخص چنگیزیوں کی حویلی میں گھس گیا۔ حویلی کے عقب میں گودام تھا۔ وہاں کئی ٹن گندم ذخیرہ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی مقدار میں بھوسہ بھی تھا۔ اندر گھسنے والے نے اس گودام کو آگ لگا دی۔ پلک جھپکتے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور اور انہوں نے حویلی کے ایک رہائشی حصے کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ جب گاؤں کے مرد و زن تندہی سے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے انہوں نے ایک اور عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حویلی کے ایک حصے سے بہت سے پرندے فضا میں بلند ہوئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھے ان پرندوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ وہ پرندے سینکڑوں میں تھے۔ چاند کی چاندنی اور آگ کی روشنی رات میں دن کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ وہ پرندے ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں چکرانے لگے۔ ان میں عقاب تھے' شاہین اور باز تھے ان کے پر روشنی میں چمک رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ پرندے آزاد اڑتے فضاؤں میں گم ہو گئے.......... لوگوں کی بروقت کوشش سے آگ کو حویلی تک بڑھنے سے روک لیا گیا اور گودام میں گندم کا کچھ حصہ بھی بچ گیا۔

اس خبر نے بھی مقامی اور غیر مقامی حلقوں میں خوب سنسنی پھیلائی۔ لوگ دور دور سے چنگیزیوں کا جلا ہوا گودام دیکھنے آئے۔ ظاہر ہے لوگوں کا دھیان فوری طور پر ائرپورٹ

والے واقعے کی طرف گیا۔ وہ اس تازہ واقعے کو بھی اسی سلسلے سے جوڑنے لگے۔ خاص طور پر پرندوں والا معاملہ بڑی شدت سے موضوع بحث بنا ہوا تھا.......... وائلڈ لائف کے ذمہ دار حلقوں پر چنگیزیوں کا فریب کھل گیا تھا اور یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ چند ہفتے پہلے جو پرندے آزاد کئے گئے تھے وہ اصل مال مسروقہ کا صرف ایک حصہ تھے۔ اس واقعہ کے تیسرے روز مقامی کھوجیوں نے اپنی تفتیش کے نتیجے میں اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ حویلی میں ایک نامعلوم عورت کا کھرا موجود ہے۔ اور یہی وہ کھرا ہے جو گندم کے گودام تک گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مقامی شخص نے بھی بیان دیا کہ آگ لگنے کے فوراً بعد اس نے ایک عورت کو گودام کی سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر صحن میں کودتے دیکھا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور وہ دوپٹے کے بغیر تھی.......... ان بیانات کے بعد اس شک کا معقول جواز تھا کہ یہ واقعہ ائرپورٹ والے واقعے کی کڑی ہے۔ لوگوں میں پھیلی ہوئی سنسنی خوف و ہراس میں بدلنے لگی۔ خاص طور پر بڑی حویلی اور اردگرد کے دیہات پر دہشت کی فضا طاری ہو گئی۔ ایک جنونی عورت کا خوف افواہوں کے پر لگا کر اڑا اور ہر گھر کی منڈھیر پر جا بیٹھا۔ لوگوں نے پورے یقین کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ اب اور وارداتیں ہوں گی۔ اور ممکن ہے چنگیزیوں تک پہنچنے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ عورت عام لوگوں کو نشانہ بنانے لگے۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کی بے چینی باقاعدہ احتجاج کی صورت اختیار کرتی' پولیس حرکت میں آگئی اور تندہی سے' مذکورہ بالا کیسوں کی تفتیش شروع کر دی۔ دس پندرہ روز تک جب کوئی نئی واردات نہیں ہوئی تو لوگوں کا خوف کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس دوران پولیس نے بھی چند مشتبہ افراد کو پکڑ لیا۔ ان میں زیادہ تر حکم دین پارٹی کے آدمی تھے۔ ان گرفتاریوں کی تشہیر ہوئی تو لوگوں کا خوف مزید کم ہو گیا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں حالات معمول پر آگئے۔ اس کے بعد جیسا کہ ہوتا ہے لوگوں کے ذہنوں سے ایک بار پھر تمام واقعات محو ہونے لگے۔ پرانے واقعات کے نقوش پر نئی خبروں اور تازہ ہنگاموں کی اڑائی ہوئی گرد پڑنے لگی۔

☆=============☆============☆

چند ماہ میں لوگ سب کچھ بھول گئے۔ بڑی حویلی اور نواح میں حالات معمول پر آگئے۔ بس کسی کسی کو یاد رہ گیا کہ ایک پاگل ماں کا خوف عفریت بن کر لوگوں کے

اعصاب پر سوار ہوا تھا۔ مقتول بچے اور پاگل ماں کی کہانی پس منظر میں چلی گئی' پیش منظر میں روز و شب کے ہنگاموں اور زندگی کی رنگا رنگ افراتفری نے جگہ سنبھال لی۔ اب بڑی حویلی کے کھیتوں میں کسان اسی طرح ہل چلاتے تھے۔ پیر محمد کے کھوہ کے پاس کھلے میدان میں ریچھوں اور کتوں کی لڑائیاں ہوتی تھیں' کبڈی کھیلی جاتی تھی۔ باز اڑائے جاتے تھے۔ رہٹ چلتے تھے' عورتیں پانی بھرتی تھیں' لڑکے تاکا جھانکی کرتے تھے۔ رات کو قبرستان کے پاس نادر حسین کے دائرے میں گرما گرم محفلیں جمتی تھیں' عورتیں ہوا خوری کے لئے نکلتی تھیں اور لڑکے آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔"

وہ دسمبر کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ صبح سویرے سورج کا سرخ تھال مشرق سے نمودار ہوا اور اس کی نرم کرنیں شبنم آلود نشیب و فراز پر پھیل گئیں۔ جوں جوں سورج بلندی پر آتا گیا بڑی حویلی کے گلی کوچوں میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اس ہجوم میں وہاب چنگیزی کے سرخ پگڑیوں والے کارندے پیش پیش تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور کیوں نہ تمتماتے آج ان کا چودھری وہاب وزیر بننے کے بعد پہلی بار گاؤں آرہا تھا۔ اس کے استقبال کے لئے گلیوں میں رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور جگہ جگہ زمین پر چونے سے خوش آمدید اور ویلکم کے الفاظ لکھے تھے۔ بڑی حویلی کے مکینوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ سب اس خوشی میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ بھی جنہیں چنگیزی سے فائدہ پہنچا تھا اور وہ بھی وہ جو اس کے ہاتھوں ستم اٹھا چکے تھے۔ سب نے خود کو خوشی کے اس دریا میں بہا دیا تھا۔ خوشی کی اس کان پر ہر شہ خوش ہو گئی تھی۔ جب جبر اپنی جبروت کو منوا لیتا ہے' تو اس کے لئے ہزار ہا رعایتیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ آج ہر شخص خوش تھا' چودھری وہاب زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج رہی تھیں۔ ہر پرامید نگاہ مشرق کی طرف لگی تھی جہاں سے چودھری وہاب کی سواری باد بہاری نمودار ہونے والی تھی۔ اس وقت سورج نصف النہار پر تھا جب کاروں کا ایک مختصر قافلہ بڑی حویلی کے راستے پر نظر آیا۔ چار کاروں کے درمیان ایک گل پوش مرسیڈیز تھی یہی چودھری وہاب کی سواری تھی۔ اس سواری کو دیکھ کر لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ مسکین لوگوں نے بھی چہروں پر زبردستی مسکراہٹیں بکھیر لیں۔ کاروں کا قافلہ پیر محمد کے کنویں کے سامنے برگد کے بڑے بڑے پیڑوں کے نیچے رکا۔ مرسیڈیز کے اندر سے چودھری وہاب برآمد ہوا۔ مسلح محافظوں نے اسے چاروں طرف سے

گھیر لیا۔ کالی شیروانی سفید شلوار اور جناح کیپ میں وہ بڑا باوقار اور بارعب دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑے۔ بڑی حویلی کے ملازمین اور مقامی تھانے کے اہلکاروں نے چھڑیاں مار مار کر ہجوم پر قابو پایا۔ چودھری وہاب زندہ باد کے نعروں سے در و دیوار لرز گئے وہاب چنگیزی کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھچ گئے۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر نعروں کا جواب دیا۔ اسی دوران اس پر پھولوں کی بارش کر دی گئی اور کچھ لوگوں نے جوش سے بے قابو ہو کر وہاب چنگیزی کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ ہاروں سے لدا ہوا لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا۔ ہر طرف زندہ باد کی گونج تھی......... اور یہی وقت تھا جب ایک خستہ حال کچی دیوار کے پیچھے سے ایک عورت چیختی ہوئی وہاب چنگیزی کی طرف لپکی۔ اس کا لباس چیتھڑوں کی صورت میں تھا' چہرے پر مہینوں کی گرد تھی اور لمبے بال جٹاؤں کی صورت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکدار چیز تھی' کوئی تیز دھار آلہ تھا۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ چند ساعتوں کے لئے ہر شخص سکتے میں آ گیا۔ یہ عورت وہاب کے سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ دو رویہ کھڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ آندھی کے کسی منہ زور جھکڑ کی مانند یہ عورت وہاب کی طرف آئی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ عورت کون ہے؟ کسی کے ذہن میں چند ماہ پرانے واقعات کا نقش نہیں ابھرا۔ لوگ بھول جاتے ہیں۔ ان کے حافظے کمزور ہوتے ہیں۔ ظلم ڈھانے والوں کو کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں' لیکن ایک ماں نہیں بھول سکتی۔ روح اپنے جسم کو کیسے بھول سکتی ہے۔

یہ عورت بھی ایک ماں تھی......... بدنصیب فرحان کی ماں۔ اس نے دس پندرہ قدم کا فاصلہ مبہوت کر دینے والی تیزی سے طے کیا اور بلائے ناگہانی کی طرف وہاب چنگیزی پر آئی۔ اس کا پہلا وار وہاب چنگیزی کے پیٹ پر ناف کے قریب تھا۔ اس وقت وہ پھولوں سے لدا پھندا لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا۔ زخم کھانے کے بعد وہ تڑپ کر نیچے گرا۔ عجیب الوضع عورت اس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کی بجلی لپکی اور دیکھنے والوں نے وہاب کی گردن پر ایک گہرا گھاؤ دیکھا۔ یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا......... جبر کے "سومنات" پر دستِ اجل کا یہ حملہ جتنا اچانک تھا اتنا ہی تند بھی تھا......... پھر لوگوں کا سکتہ ٹوٹا اور وہ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگے۔ کچھ تو بھاگے

چلے گئے اور کچھ چند قدم پیچھے ہٹ کر سنبھلے۔ وہ زیادہ تر چنگیزی کے محافظ تھے۔ خوف کی جگہ غیظ و غضب نے لی۔ وہ ہتھیار تول کر عورت کی طرف لپکے۔ اس وقت تک وہ چودھری وہاب چنگیزی کو کم از کم ایک درجن مہلک زخم لگا چکی تھی۔ چوہدری وہاب ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ پہلے بارہ بور رائفل کے دو فائر عورت کو لگے۔ پھر ریوالور کی مسلسل تڑ تڑ سنائی دی' پھر بے شمار لاٹھیوں نے عورت کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ محافظوں کا پورا ایک جتھا اس تنہا عورت پر ٹوٹ پڑا۔ چند لمحوں کے لئے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ موقعہ واردات پر ایک قیامت سی برپا ہو گئی۔ آخر گھبرائے ہوئے پولیس انسپکٹر نے اپنے ریوالور سے ہوائی فائرنگ کی اور اس کے مسلح عملے نے لوگوں کو دھکیل دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

منظر صاف ہوا تو زمین پر دو گرد آلود لاشیں نظر آئیں۔ دونوں لاشوں کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔ ان میں ایک لاش چودھری وہاب چنگیزی کی تھی اور دوسری......... فرحان کی ماں کی۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ لوگ بے پناہ خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اپنے گھروں کو بھاگ چکے تھے' جیسے اس قتل کا الزام ان کے اپنے سر آنے والا ہو۔ میرے قریب کھڑے ہوئے لوگ فرحان کی ماں کی لاش کو جنونی عورت کی لاش کہہ رہے تھے اور ہراساں انداز میں اس کی طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت نہ جانے کیوں......... میری نگاہ میں ایک بہت پہلے دیکھی ہوئی انگلش فلم کا منظر تازہ ہونے لگا۔ اس فلم میں ایک لنگڑی شیرنی دشوار گزار راستوں پر اس سفید فام شکاری کا تعاقب کرتی ہے جس نے اس کے بچے کو ہلاک کیا تھا۔ آخر شکاری کو مارتی ہے۔ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ سے خود بھی ہلاک ہوتی ہے۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر لاشوں پر قریب سے نگاہ ڈالی۔ ان لاشوں کے گرد خون نے کیچڑ سا کر دیا تھا اور اس کیچڑ میں گلاب کی بے شمار پتیاں لتھڑی ہوئی تھیں۔ وہاب کے پیٹ سے نکل آنے والی انتڑیوں کا منظر خوفناک تھا۔ دونوں لاشوں کے درمیان وہاب کے ایک خون آلود جوتے کے پاس وہ آلہ پڑا تھا جس نے چنگیزی کو جہنم واصل کیا۔ یہ ایک زنگ آلود استرا تھا۔ میں نے دیکھا مردہ ثنا کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں جو اپنے بھائی اور بھابی کے دھکے کھا کر خشک رہی تھیں جو فرخندہ اور عابد کی اندوہناک موت پر نمی کو

ترسی تھیں اور جنہیں اپنے گھر کے صحن میں جنازوں کی قطار کا منظر بھی بھگونہ سکا تھا' آج بھیگ گئی تھیں.......... وہ تربتر تھیں انہیں اپنے گمشدہ آنسو واپس مل چکے تھے۔

وہاب چنگیزی کی موت سے ظلم و ستم کا ایک تاریک باب ختم ہو گیا۔ ثنا محمود کی لاش نواز حسنی' خان رحیمی اور چودھری حکم دین نے مشترکہ طور پر وصول کی اور موت کے تیسرے روز اسے آہوں اور سسکیوں کے درمیان میانی صاحب میں اپنے بیٹے کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ جب تجہیز و تکفین مکمل ہو گئی اور لواحقین و اعزا مرحومہ کو خیرباد کہہ کر واپس چل پڑے تو ایک شخص پھر بھی اس تازہ قبر پر بیٹھا رہا.......... وہ سلیم تھا۔ اسے وہاں سے اٹھانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ آخر خان رحیمی خود بھی اس کے ساتھ قبرستان کی تاریکی میں رہ گیا۔

ثناء کے بارے میں پولیس نے جو معلومات حاصل کیں ان سے معلوم ہوا کہ وہ وقوعہ سے صرف چند گھنٹے قبل بڑی حویلی پہنچی تھی۔ اس سے قبل وہ کہاں تھی؟ یہ کھوج قصبہ "کلور" کے ایک نواحی دیہہ سے ملا۔ اس علاقے میں بھی وہاب چنگیزی کے زیر سرپرستی ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ ایک جگہ سیوریج کے بڑے بڑے پائپ رکھے تھے۔ ایسے ہی ایک کشادہ پائپ کے اندر اس نیم پاگل عورت کی پناہ گاہ تھی جسے کبھی ثنا محمود کہا جاتا تھا اور جو اجلے کپڑے پہن کر کالج جانے والی اور شاعری و نثر کی خوبصورت کتابیں پڑھنے والی خوش اندام لڑکی تھی۔ اس ٹوٹے پھوٹے پائپ کے اندر سے کچھ عجیب چیزیں ملیں۔ پیال کے ایک غلیظ ڈھیر کے اندر سے چند استرے ملے۔ فرحان کی پاگل ماں نے یہ استرے نہ جانے کہاں کہاں سے حاصل کئے تھے۔ اس پائپ میں پلاسٹک کا ایک بڑا گڈا بھی تھا۔

اس گڈے کا صرف ایک بازو تھا۔ پاگل ماں نے یہ گڈا غالباً کوڑے کے کسی ڈھیر سے اٹھایا تھا۔ کوڑے کے ڈھیروں سے اٹھائی ہوئی کپڑے کی بے شمار دھجیاں بھی اس پائپ میں موجود تھیں۔ وہ سوئی دھاگے سے ان دھجیوں کو سی کر گڈے کے کپڑے بناتی تھی۔ بہت سے ننھے منے لباس یہاں بکھرے ہوئے تھے۔ پائپ کے اندر کی ہموار سطح پر کوئلے سے ناقابل فہم نقش و نگار بنے تھے۔

☆==========☆==========☆

ڈھائی تین ماہ بعد کی بات ہے ان دنوں میں ثناء محمود کی ڈائری مکمل طور پر پڑھ چکا تھا۔ یہ ڈائری ثناء محمود نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے مکمل کی تھی اور خان رحیمی نے مجھے رازداری کی کڑی شرط کے ساتھ پڑھنے کے لئے دی تھی.......... اب ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں جھنگ' خان رحیمی کے پاس پہنچا تھا۔ وہ خوبرو بوڑھا ان دنوں دنیا کا سنجیدہ ترین انسان دکھائی دیتا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہی وہ شخص ہے جسے ثناء نے اپنی ڈائری میں "ہیپی اولڈ مین" کا خطاب دیا ہے۔ خان رحیمی مجھے اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں ملا۔ اس کی میز پر شکاری پرندوں سے متعلق ایک موٹی سی انگلش کتاب کھلی پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ پوچھنے لگا "سلیم سے ملنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں.......... مجھے معلوم ہے آج کل وہ آپ کی ہدایت پر مری میں مقیم ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے جو کچھ بتانا تھا بتا چکے ہیں۔ اس وقت میں اپنی ایک الجھن رفع کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"کہو" خان رحیمی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

میں نے کہا "خان صاحب! ثناصاحبہ نے اپنی ڈائری میں اپنے ایک آخری خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے آپ کو لکھا تھا اور جس میں آپ کو پہلی بار انکل رحیمی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"

خان رحیمی نے کہا "ہاں.......... ڈائری میں یہ ذکر موجود ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ڈائری میں اس خط کی وضاحت نہیں ہے۔"

خان رحیمی کے ہونٹوں پر وہی پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے بڑے انہماک کے ساتھ اپنے پائپ میں سے تمباکو کھرچنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو یکسر فراموش کر گیا ہے۔ ایسے میں مخاطب خجل سا ہو جاتا تھا۔ غالباً یہ خان رحیمی کی کوئی بہت پرانی عادت تھی۔ قریباً ایک منٹ بعد نیا پائپ بھرتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"اس سوال کے جواب کے لئے تمہیں آٹھ دس روز انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے قدرے ترشی سے کہا۔

وہ بولا "ایسا کرو، اگلے سنڈے کو آجانا۔ میں تمہیں بتادوں گا۔"

وہ کچھ چھپانا چاہ رہا تھا۔ اس کی سیماب طبعی کے پیش نظر میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دس پندرہ روز میں نے بے قراری سے گزارے اور اتوار کے روز پھر جھنگ کا رخ کیا۔ ان دنوں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی۔ میں جھنگ خان رحیمی کی کوٹھی پر پہنچا تو وہاں روشنیاں نظر آئیں اور ہلچل کے آثار دکھائی دیئے۔ پارکنگ میں دوسری گاڑیوں کے علاوہ چند ایک سرکاری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں حیرانی پر جھیلتا خان رحیمی تک پہنچا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض دالان میں وہ چند مہمانوں سے مصروف گفتگو تھا۔ سلیم بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ پتلون کوٹ میں اسمارٹ اور باوقار نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کی ایک مستقل کیفیت رقم ہو چکی تھی۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ کر ہی بتا سکتی تھی کہ یہ "انمٹ کیفیت" ہے۔ مہینوں گذر چکے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی، چند منٹ پہلے ثناء کو سپرد خاک کر کے لوٹا ہے۔ میں بھی ان لوگوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں ہونے والی گفتگو سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ گہما گہمی شادی کی ہے۔ دوسرا انکشاف جو چند منٹ بعد ہوا یہ تھا کہ یہ شادی سلیم کی ہے۔ ثنا کی موت کے صرف چند ماہ بعد سلیم کی شادی؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ بڑی کوشش کے ساتھ میں نے خان رحیمی کو ایک تنہا مقام پر گھیر لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ میں نے کہا۔

"خان صاحب، یہ سب کیا ہے؟"

وہ بولا "تمہارے سوال کا جواب، سلیم کی شادی ہو گئی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"عشرت کے ساتھ۔" خان رحیمی نے آہستگی سے جواب دیا۔ "یہی ثناء کی خواہش تھی۔" میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ کل چند افراد خاموشی سے لاہور جا کر دلہن کو لے آئے تھے۔ آج ایک مختصر سے ولیمے کا انتظام کیا گیا ہے۔ پھر خان رحیمی نے اپنی نفیس واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس لفافے میں ثنا کا آخری خط تھا۔ خان رحیمی نے کہا "یہ خط بھی دوسرے ریکارڈ میں لگا دینا۔"

میں نے اسی وقت پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کا رخ کیا۔ گاڑی کی اندرونی

روشنی میں میں نے یہ خط پڑھا۔ مختصر سی تحریر تھی۔ ثنا نے خان رحیمی سے درخواست کی تھی کہ اگر کسی وقت اس کے ساتھ "کچھ ہو جائے" تو وہ سلیم کے ساتھ عشرت کی شادی کرا دے۔ کیونکہ عشرت سے بڑھ کر سلیم کو دنیا میں شاید ہی کوئی عورت چاہ سکے۔ عشرت حالات سے مجبور ہو کر گناہ کی دلدل میں ضرور دھنسی رہی ہے لیکن اس کے اندر ایک پاک اور معصوم روح کا بسیرا ہے۔ وہ سلیم کی زندگی میں آگئی تو اس کی ہر محرومی کا مداوا کر دے گی۔ خط میرے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ ثناء نے یہ ریمارکس اس عشرت کے بارے دیئے تھے جو میڈم نادرہ کی بیٹی تھی۔ وہ میڈم نادرہ جس نے اپنی دشمنی نبھانے کے لئے ثناء کی زندگی کا شگفتہ پھول باپ کے آنگن سے اکھاڑ کر ایک جلتے صحرا میں پھینک دیا تھا اور خود سائے میں بیٹھ کر دیر تک اس پھول کے جھلسنے اور گلنے سڑنے کا تماشہ دیکھا تھا۔ آج اسی میڈم نادرہ کی بیٹی کو ثناء کے طفیل نئی زندگی کی نوید مل رہی تھی...... اس خط کی پشت پر ثناء نے سلیم کے لئے چند الفاظ لکھے تھے۔ اس نے لکھا تھا "سلیم" میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں لیکن خبر نہیں کب اور کس گھڑی ہمارے راستے الگ ہو جائیں۔ اگر ایسا کچھ ہو گیا تو میری ایک التجا ہے سلیم......... تم عشرت سے شادی کر لینا۔ میں جانتی ہوں تمہارے لیے خود پر یہ جبر کرنا بڑا دشوار ہو گا لیکن میری خاطر سلیم .... میری خاطر.......... میری خاطر۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اس ولیمے کی مصروفیات میں شریک ہونے کو نہیں چاہا۔ ایسے نمناک پس منظر والی شادیوں میں شرکت میرے لئے ہمیشہ سوہان روح رہی ہے۔

میں نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور وہیں نشست سے ٹیک لگا کر خیالوں میں کھو گیا۔ سفر کی تھکان نے مجھے اونگھنے پر مجبور کر دیا۔ نیم غنودگی کے عالم میں میری سوچ تصور کے پر لگا کر اڑی اور اسی تاریک قبرستان میں پہنچ گئی جہاں چند روز پہلے میں نے ایک قبر کے ساتھ ایک ننھی سی قبر پیوست دیکھی تھی۔ میں نے خود کو پھر ان قبروں کے سرہانے کھڑے پایا۔ دیر تک وہاں گم صم کھڑے رہنے کے بعد میرے تصور کے پاؤں مجھے قبرستان کی بھول بھلیوں میں گھمانے لگے۔ تصور ہی تصور میں گھنے جنتروں کے اندر سے میں ایک سفید چمکدار پتھر ڈھونڈ لایا اور اسے دونوں قبروں کے سرہانے ایک ہی کتبے کی صورت میں گاڑ دیا۔ اتنے میں درختوں کے اندر سے ایک نورانی ہیولا برآمد ہوا۔ اس نے اپنے

لبادے کے اندر سے ایک چمکتا ہوا قلم نکالا اور کتبے پر لکھ دیا" ماں اور بچہ " نیچے والی سطر میں اس نے لکھا" وہ بچہ، جس نے مر کر اپنی ماں کو ایک امتحان میں ڈالا تھا، اور وہ ماں جس نے اس امتحان میں سرخرو ہو کر ممتا کی لاج رکھی۔"

پھر اس ہیولے نے چمکدار قلم میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا "تم لکھنے والے ہو، تم بھی کچھ لکھو۔"

میں نے کہا "محترم! اس سے بڑھ کر اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں لکھا جا سکتا" اور قلم اس نورانی ہیولے کو واپس تھما دیا۔

=========**ختم شد**=========

وہ نوجوان تھی، وہ بہت حسین تھی اور سب سے بڑھ کر وہ معصوم تھی، ایک سرپھرا شوریدہ سر نوجوان اُس کی زندگی میں آندھی طوفان کی طرح داخل ہوا......... پھر اُس سے جوانی کی پہلی بھول ہو گئی۔ اُس بھول نے اُس کی پُرسکون زندگی میں طوفان برپا کر دیے۔ حالات کی خوفناک آندھی چلی اور اُسے اپنے ساتھ اُڑا کر لے گئی۔ پھر اُس کے پاؤں کہیں نہ جم سکے۔ ہر قدم پر ایک نیا ہنگامہ اُس کا منتظر تھا۔

ایک معصوم لڑکے کی کہانی جس کے ہاتھ لاکھوں کا قیمتی عقاب آ گیا تھا۔ دولت کے بھوکے اس کے پیچھے تھے۔

اربوں روپے کے قیمتی عقابوں کی سمگلنگ کی واردات۔

ایک شریف زادی کی کہانی جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔

ہر صفحے پر ایک نیا ڈرامہ، ہر سطر حیرت انگیز، نان سٹاپ ایکشن۔

ایک آپ بیتی، طلسم ہوشربا، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان